مینڈا سائیں
تہمینہ دُرّانی
مصطفیٰ کھر، یہ وہ خود سوانح ہے جو تم کبھی نہ لکھو گے!

حقوق اشاعت محفوظ

وین گارڈ بکس پرائویٹ لمیٹڈ
45 - شاہراہِ قائد اعظم لاہور

ناشر: وین گارڈ بکس پرائویٹ لمیٹڈ

طابع: آرٹ ٹریک پرنٹرز
10 A/42 لوئر مال لاہور۔ فون: 7245307

مندرجات

انتساب
پیش لفظ از عاصمہ جہانگیر
اظہار تشکر
1۔ قائد 13
2۔ گھر بمقابلہ گھر 45
3۔ جہنم کے نشیب و فراز 73
4۔ سیاسی حیوان 163
5۔ مامتا بھی ہے ستم ایجاد کیا 230
6۔ مینڈا سائیں 263
7۔ دیکھا جو تیر کھا کے 341
8۔ اندھیرے دور ہوتے ہیں 381
9۔ بے وفائی 437

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اظہارِ تشکر

اس کتاب کو لکھنا آسان ثابت نہیں ہوا۔

چار افراد ایسے ہیں جن کے بغیر یہ کتاب طباعت کا مرحلہ طے نہ کر سکتی۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس سلسلے میں کن خطرات کا سامنا ہے لیکن انہوں نے بڑی جرأت مندی سے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

ایک غیر معمولی مرد اور دو عورتوں نے میرا حوصلہ بڑھایا، میری مدد کی تاکہ میں اپنے ماضی کے روح خراش تجربوں کی یاد تازہ کر سکوں۔

پھر اس شخص کا کردار بھی کسی سے کم نہیں جس نے اسی طرح کی پابندیوں میں رہ کر مسودے کو ٹائپ کیا۔

میں ان کے نام بتانے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔

میں ان سب کی مرہون منت ہوں۔

ت۔د

مارچ 1991ء

باب - ۱

قائد

(1986ء - 1988ء)

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیزرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اتوار کے اتوار صبح ساڑھے چھ بجے کی پرواز سے لاہور سے اسلام آباد جاتے مجھے سال بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ لیکن آج کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میں جوش سے سرشار تھی۔ میری چال سے اعتماد ٹپکتا تھا۔ آج اس جھنجھلاہٹ کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا جو مجھے پہلے اس بنا پر محسوس ہوتی تھی کہ اب اس چیز کا ایکس رے مشین سے معائنہ کیا جا رہا ہے، اُس چیز پر مہر لگائی جا رہی ہے، جامہ تلاشی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی اور بورڈنگ کارڈوں کو بے دلی سے چاک کیا جا رہا ہے۔ اپنا مقصد حاصل کر لینے کے احساس نے میری جھنجھلاہٹ کو ہٹا کر پرے کر دیا تھا۔ میرے شوہر کو قیدخانے سے رہا کیا جانے والا تھا۔ زیادہ اہم بات یہ کہ میرا قائد آزاد ہونے والا تھا۔

ہوائی اڈے پر زمینی عملے نے مسکرا کر میرا خیرمقدم کیا۔ وہ صحیح معنی میں میری آمد سے خوش تھا۔ طیارے پر تعینات عملے کے افراد مجھے مبارک باد دینے آئے اور جب میں آرام سے بیٹھ کر، سیٹ بیلٹ باندھنے کے بعد، جسم سیدھا تانے اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئی تو ایک مسافر نے میری طرف جھک کر کہا: "تہمینہ بی بی، آپ کے شوہر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

یقیناً آپ پر فخر کرتے ہوں گے"۔ میں مردتاً مسکرا دی۔ مجھے احساس تھا کہ ہماری جدوجہد کی بس ابتدا ہی ہوئی ہے۔

میں کھڑکی سے باہر دُور فاصلوں پر نظر جمائے رہی۔ آسمان پر ایک جگہ ٹھہری ہوئی چھوٹی سی آوارہ بدلی پر جب سورج کی پہلی کرنوں کی پھوار پڑی تو یوں لگا جیسے وہ تمتما اٹھی ہو۔ میں خود بھی یہ محسوس کر رہی تھی کہ میرا جوش و خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔

اسلام آباد کا ہوائی اڈا مسرتوں میں نہایا ہوا تھا۔ جن چہروں پر میں، سالہاسال پر محیط جدوجہد کے دوران میں، پُرعزم متانت دیکھتی آئی تھی، وہ آج مسکراہٹوں سے سجے ہوئے تھے۔ وہ لوگ میری طرف بڑھے اور پاسِ ادب سے ایک خاص فاصلے پر آ کر رک گئے۔ ہم سب کی عادات و آداب پر اسلام کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ میں انہیں گلے لگانا چاہتی تھی۔ انہوں نے جس طرح ہمارا ساتھ دیا تھا اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرنے کی آرزومند تھی۔ لیکن وہ سب مرد تھے۔ اسلام ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ اپنے بھائی، باپ یا شوہر کے سوا کسی مرد سے لگاؤ کا اظہار کریں۔ اس سے پہلے کبھی الفاظ اتنے ناکافی اور لاحاصل معلوم نہ ہوئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو مجھے پتا چلا کہ انسانوں کو الفاظ کے جس ذخیرے پر عبور ہوتا ہے وہ کس قدر محدود ہے۔ میری کامیابی میں ان لوگوں کا کتنا زیادہ حصہ تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ روایت کی قدغنوں کی وجہ سے میرا دم گھٹتا جا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی میری طرح ہی محسوس کر رہے ہوں گے۔

تقریباً کسی معجزے کی طرح ہجوم نے میرے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ اب میں جانے پہچانے رستوں پر کاروں کے ایک جلوس کی قیادت کر رہی تھی۔ وہاں جشن کا سا سماں تھا۔ ہم سُست رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کاروں کے ہارن بجائے جانے کا شور اور بلند ہونے والے نعرے وقفے وقفے سے ہمارے سفر میں خلل انداز تھے۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ ہم راولپنڈی مرکزی جیل کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی۔ فوجی آمر ضیا دُنیا سے رخصت ہو چکا تھا لیکن ہوائی حادثے میں فوت ہونے سے پہلے اس نے جیل ڈھا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بھٹو کو پھانسی دے کر اس نے ایک شہید پیدا کر دیا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ جیل بھی زیارت گاہ بن جائے۔

جب ہم آرمی ہیڈکوارٹرز کے سامنے سے گزرے اور میری نظر اس ٹینک پر پڑی جو اس کے دروازے کے باہر کھڑا رہتا ہے تو میں دل ہی دل میں مسکرائی۔ اس ٹینک نے مجھے خوفزدہ کیے رکھا تھا۔ وہ ہمارے ملک میں فوجی راج کی علامت تھا۔ آج وہ عجیب

انداز میں بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ عوام کی طاقت بندوق کی نادرشاہی پر غالب آ گئی تھی۔ مجھے اس بات سے بڑی بے رحمانہ لذت محسوس ہوئی کہ عوامی طاقت کے روبرو فوج کتنی غیرمؤثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں نے اپنا رشتہ ایسی طاقت سے جوڑ لیا تھا جو بہت آگے کی بات تھی۔

کاروں کا قافلہ مڑ کر اڈیالا روڈ جا پہنچا۔ وہی لمبی، بظاہر ختم نہ ہونے والی سڑک جو اڈیالا جیل کی طرف جاتی تھی۔ چلنا کہاں، ہم تو رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری رفتار کا تعین وہ لوگ کر رہے تھے جو ہزاروں کی تعداد میں پیادہ پا ہمراہ تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ جاڑوں کا موسم تھا کیونکہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اگلا گھنٹہ کار ہی میں گزارنا پڑے گا۔ کسی اور کو دیرسویر کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ ساری ہارن بازی اور دھکم پیل جمہوریت کی ریت کا حصہ تھی۔ ایک طرح کی بڑبڑی مچی ہوئی تھی۔ میری کار میں جھانکنے والوں کی ناکیں ونڈ شیلڈ سے لگ کر پچکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ فتح کی علامت کے طور پر بار بار (V) کا نشان بنایا جا رہا تھا۔ لوگ جوش میں آ کر کار کے بونیٹ کو پیٹ رہے تھے۔ گرد و غبار کے بادل اٹھنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے پامال اور پچ، جنہیں صدیوں سے روندا جا رہا تھا، بالآخر سر اٹھا رہے ہوں۔

لوگوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ کار کا شیشہ نیچے کرنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ ہجوم کا اظہار عقیدت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ میں سلام کرنے کے روایتی انداز میں ہاتھ اٹھا کر ماتھے تک لاتی رہی۔ ہجوم نے ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دیا۔ یہی وہ عوام الناس تھے جن کا ذکر میرے شوہر اور میں کرتے رہتے تھے۔ انہیں کی تقدیر کو نئی شکل دینا ہمارے ذمے تھا۔ کوئی زیادہ پرانی بات نہیں تھی جب عوام الناس میرے لیے ایک مجرد اصطلاح تھے۔ ڈرائنگ روم میں ہونے والی سیاسی بحثوں میں ان کا ذکر آتا تھا۔ اب وہ حقیقت میں بدل گئے تھے۔ انہوں نے میرا تمام زاویۂ نظر بدل ڈالا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ بالآخر ہمارے تعلقات کچھ لو کچھ دو کی سطح پر استوار ہو گئے ہیں۔ یہ پہلے کا سا معاملہ نہ تھا جب وہ دینے والے تھے اور میں لینے والی۔ میں انہیں میں شامل ہو گئی تھی۔ عوام الناس موضوع گفتگو نہ رہے تھے اب ان کی اپنی حیثیت تھی۔ وہ معنی رکھتے تھے۔ ان کا ہم پر انحصار نہ تھا۔ ہم ان پر تکیہ کرتے تھے۔

امید کا یہ کارواں آخرکار منزلِ مقصود پر جا پہنچا۔ انسانوں کے اس جم غفیر کے سامنے جو ہر طرف سے ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ اڈیالا جیل نہایت ہی غیر محفوظ نظر آنے لگا، جیسے ٹھوکر لگتے ہیں ڈھیر ہو جائے گا۔ جیل کی مہیب، بلند و بالا دیواریں، جنہیں دیکھ کر میرے دل میں ہمیشہ برے برے خیالات آیا کرتے تھے، اب ڈراؤنی معلوم نہ ہو رہی تھیں۔ جس

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

لمحے کا ہمیں انتظار تھا وہ آ پہنچا تھا۔ مصطفےٰ کھر کو، جو پندرہ سال سے میرا شوہر تھا، ڈھائی برس قیدِ تنہائی میں گزارنے کے بعد رہا کیا جا رہا تھا۔

نعرے اور بھی جوشیلے ہوتے گئے۔ ہجوم پر جنون طاری تھا۔ انہیں اپنا نجات دہندہ، کچلے ہوئے لوگوں کا زبردست حمایتی، پنجاب کا دلیر شیر، مصطفےٰ کھر نظر آ گیا تھا۔

ان ہزاروں افراد کے لیے، جو وہاں اسے آزاد فضا میں قدم رکھتے دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے، مصطفےٰ کی ذات امید کی علامت تھی۔ وہ ہم سب کا قائد تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے ایک ایسے اخلاقی طور پر دیوالیہ معاشرے کو للکارا تھا جس میں ناانصافی، بدعنوانی، کمزور کا استحصال، ذلت آمیز غربت اور افلاس معمول بن چکا تھا۔ ہاں، اس کے خمیر میں عناصر کچھ اس طرح گوندھے گئے تھے کہ فطرت خود اعلان کر کے رہے گی کہ یہی صاحبِ وقت ہے۔ اس نے اپنے عوام کی خاطر دکھ جھیلا تھا۔ سالہاسال اس نے جلاوطنی کی شامِ غربت میں روشنی کو گل ہوتے دیکھا تھا۔ اسے زندان میں ڈالا گیا تھا۔ لیکن اس کا سرخم نہ ہوا تھا۔ وہ لڑنا جانتا تھا۔ اس کے پاس ہمارے تمام عوارض کا تریاق تھا۔ وہ سیاسی مسیحا تھا۔ ہم اس کے پیغام کے منتظر تھے۔ ہمارے لوگ سیاسی طور پر حکومت جیسے اداروں کے وفادار نہیں۔ وہ ایک ذاتِ واحد کے وفادار تھے۔ کھر کی ذات سے وفا کرنے والے۔ لیکن اس طرح کی باتوں کے لیے کوئی سیاق و سباق بھی ہونا چاہیے۔

میرا ذہن ایک بند گلی سے دوچار ہو گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے اب شدت سے جیل کے دوسرے قیدیوں کا خیال آیا۔ ہر بار جب میں اس جیل میں آتی تو مجھے لگتا جیسے میرا ست نکل گیا ہو۔ جذباتی طور پر جیسے میں گُٹ جایا کرتی۔ مجھ میں قیدیوں کے لیے ایک عجیب سا ہمدمی کا احساس ابھر آیا تھا۔ ان کی آنکھیں مجھے خوابوں میں ستاتی رہتی تھیں۔ میں اس امید کو بھول نہیں سکتی تھی جو انہوں نے میرے شوہر سے وابستہ کر رکھی تھی۔ انہوں نے اپنی جنگیں اس کی معرفت لڑی تھیں۔ آج جب ان کا قائد جیل سے باہر قدم رکھ رہا تھا تو وہ اچانک بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ میں نے ان ملے جلے جذبات کو لگام دینی چاہی۔ آخر ہم سبھی ایک بہت بڑے قید خانے میں بند تھے۔ مصطفےٰ کو ہمیں بھی رہائی دلانی تھی۔ قید خانہ تو قوم کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا۔ مصطفےٰ نے قید و بند کے دوران میں اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو کسی جمے جمائے نظام کو جھنجھوڑ ڈالنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ مجھے جیل میں ہر طرف پھیلی ہوئی بدعنوانی کے بارے میں بتاتا: "یہاں ایک بلیک مارکیٹ چل رہا ہے۔ قیمت دے کر ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ جیل کی انتظامیہ مافیا کے مانند ہے۔ سپرنٹنڈنٹ دادا ہے۔ جو کچھ یہاں ہوتا رہتا ہے سب میرے علم میں ہے۔ میں اس برائی کو جڑ سے

اکھاڑ پھینکوں گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔ اپنی کوٹھری میں تنہا بیٹھے بیٹھے اس نے بدعنوانی کے اس پیچ درپیچ جال کو بھانپ لیا تھا جو جیل خانے میں پھیلا ہوا تھا۔ لیکن یہ بات تو مصطفےٰ کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ وہ جزئیات جان لینے کی ایک پراسرارا سمجھ کا مالک تھا۔ وہ نہ دیکھتے ہوئے بھی سب کچھ دیکھتا رہتا، چشمِ تصور میں ہر چیز کی تصویر بناتا جاتا۔ اس نے ہر قیدی کا اتاپتا معلوم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ان کے حالات سدھارنے کے لیے کاروائی شروع کی۔ وہ اس کے خاندان کے افراد کی طرح تھے۔ وہ ان کا جاگیردار مائی باپ تھا جو انہیں انصاف بھی دلا رہا تھا اور پورے اعتماد کے ساتھ ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے پیش پیش بھی تھا۔

ہر بار جب میں اس سے ملنے جاتی تو وہ گزرے ہوئے ہفتے کے دوران میں پیش آنے والے واقعات سنا کر مجھے بہلاتا۔ ان میں سے ہر چھوٹے سے چھوٹا سانحہ بھی میری روح پر نقش ہے۔ "یہاں کا سپرنٹنڈنٹ، مفتی، سب قیدیوں سے بھتا وصول کرتا ہے جو بنیادی طور پر جگا ٹیکس ہے۔ یہ رقوم اسے ہفتہ وار یا ماہوار ادا کی جاتی ہیں۔ جو قیدی یہ زبردستی کا ٹیکس نہیں دینا چاہتا یا نہیں دے سکتا اسے سزا ملتی ہے۔ اسے یا تو بے دردی سے مارا پیٹا جاتا ہے یا بیڑیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔" عذاب دینے کے تمام طریقے اس کے علم میں تھے۔ بعض اتنے بھیانک ہیں کہ ان کا ذکر نہیں ہو سکتا۔ "بہت سے قیدیوں کو کھانے پینے سے محروم کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ مفتی کو رقم ادا کرنے کے قابل نہیں۔ پورے پورے خاندان یہ منہ مانگی رقم ادا کرنے پر مجبور ہیں اور قرضے کے بوجھ تلے کراہ رہے ہیں"

اس کی آنکھوں میں ایسا رنگ اتر آتا جو کھڑکی کی سلاخوں سے نظر آنے والے خوں رنگ افق سے مختلف نہ ہوتا۔ "تہمینہ، یہ مفتی جو ہے، یہ سالا دوسروں کا خون چوستا رہتا ہے۔ یہ انسانوں کے دکھ درد سے اپنی جیب گرم کرتا ہے۔ لوگوں کو تکلیف پہنچا کر پھل پھول رہا ہے۔ دنیا کے ان مصیبت کے ماروں سے ہر مہینے پچاس ہزار سے اسی ہزار روپے تک اینٹھ لیتا ہے۔ اس رقم کا کچھ حصہ مالِ غنیمت کی طرح ان ماتحتوں میں بانٹ دیا جاتا ہے جو اس کے نمائندے ہیں۔ یہ ایسا قید خانہ نہیں جس کی اصلاح ہو سکے۔ یہ خرکار کیمپ ہے جہاں روز روز کی ناانصافیاں مجرموں کو جنم دے رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں سیاست میں حصہ لیتا ہوں۔ جب تک اس غیر انسانی نظام کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجا دی جائے گی میں چین سے نہیں بیٹھوں گا"۔

مجھے اس سے کم غصہ نہیں آتا میں بہت کچھ دیکھ چکی تھی، بال بچوں والی قیدی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی تھی۔ انہیں مارا پیٹا جاتا تھا۔ انصاف میں نفرت آمیز تاخیر پہ تاخیر ہوتی رہتی تھی۔ بے گناہوں کو جھوٹے الزامات لگا کر قید میں ڈال دیا جاتا تھا۔ وہ من گھڑت شہادتوں کے مارے ہوئے تھے۔ اگر دنیا میں کہیں پہ دوزخ تھی تو وہ یہیں تھی۔ اس بے بسی پر میں سہمی جاتی تھی۔ میں بے قرار تھی کہ مصطفے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے۔ "ہمیں اقتدار میں آنے دو۔ میں تمہیں جیلوں کا وزیر بنا دوں گا۔" اس نے مذاق میں کہا "تمہیں اپنا قول نبھانا ہو گا۔" میں نے کہا۔ میں اس وقت بھی ذہن میں اصلاح کے منصوبوں کو شکل دے رہی تھی۔

ایک روز ہماری ملاقات میں ایک چیخ سے خلل پڑا۔ چیخ سن کر یوں لگا جیسے کس کے جسم سے اس کی روح کو نوچ کھسوٹ کر کھینچا جا رہا ہو۔ میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مصطفے کی آنکھیں غصے سے سلگ اٹھیں۔ اس نے خاصی دیر انتظار کیا۔ پھر اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور ڈگ بھرتا ہوا مقفل دروازے تک گیا۔ اس نے دروازے کو زور زور سے کھٹ کھٹایا اور حکم دیا "کھولو" سہمے ہوئے پہرے دار نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ مصطفے نے اس آدمی کو کسی کیڑے کی طرح ایک طرف دھکیلا اور غضب آلود شیر کی مانند ادھر لپکا جدھر سے چیخوں کی آواز آ رہی تھی۔ بیچارہ پہرے دار دبی آواز میں کچھ کہتا اور ذرا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلتا رہا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہی تھی جس پر ایسا لگتا تھا کہ بھوت سوار ہے۔

ہم ایک بڑے احاطے میں جا نکلے جہاں قیدی دو دو کی ٹولیوں میں اکڑوں بیٹھے تھے۔ وہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی طرف سے دکھائے جانے والے ایک دل خراش منظر کے خاموش تماشائی تھے۔ قیدیوں کو سبق سکھایا جا رہا تھا تاکہ آئندہ انہیں حکم عدولی کی جرات نہ ہو۔ ان کا ایک ساتھی زمین پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کے ہاتھ پیر پھیلے ہوئے تھے۔ پولیس والے اسے لاتیں مار رہے تھے اور ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے۔ اس کے جسم سے جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ اس کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ اب بھی تکلیف کو محسوس کر سکتا تھا جس کا اظہار خوف ناک چیخوں کی صورت میں ہو رہا تھا۔ پہرے داروں نے اس کی ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ وہ کیسی روح فرسا اذیت سے گزر رہا ہو گا۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی پتلیاں اتنی اوپر چڑھ چکی تھیں کہ نظر نہ آتی تھیں۔ اس کے بعد ایک دہشت ناک، موت جیسی، خاموشی چھا گئی۔

اب مصطفے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں دھمکی تھی۔ اس نے عذاب دینے والے کو کالر سے دبوچ لیا۔ میں نے ایک زور دار تھپڑ کی آواز سنی۔

پھر ایک اور تھپڑ پڑا۔ ڈپٹی کے اوسان خطا ہو گئے لیکن اس میں ہمت نہ تھی کہ پلٹ کر کچھ کہتا یا کرتا۔ مصطفے کھر لاکھ قیدی سہی، ایسا آدمی تھا جس کا لحاظ کرنے پر ڈپٹی مجبور تھا۔ مصطفے نے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا: "اگر میں نے دوبارہ کوئی چیخ سنی تو میں مار مار کر تمھارا کچومر نکال دوں گا۔" اتنا کہہ کر وہ مڑا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا۔ مشن مکمل ہو چکا تھا۔ اگر قیدیوں میں حوصلہ ہوتا تو وہ واہ واہ کر اٹھتے۔ ان کی نگاہوں سے تحسین کی کیفیت چھلک رہی تھی۔ مصطفے نے یہ دکھا دیا تھا کہ وہ تنہا نہیں ہیں۔ وہ ان کا نگہبان ہے۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مصطفے کے پاس کوٹھری میں آیا۔ تین پولیس والے اس کے ہمراہ تھے۔ وہ ابھی تک حواس باختہ تھا۔ "سر (مصطفے کو ہمیشہ سر ہی کہا جاتا تھا)، آپ کو اتنے سارے قیدیوں کے سامنے مجھے تھپڑ نہیں مارنے چاہئیں تھے۔ اب وہ کبھی میری عزت نہیں کریں گے۔" "تم ان کی عزت کے مستحق ہی کب ہو۔ تم خوف اور تشدد کے بل بوتے پر حکومت نہیں کر سکتے۔ میں تمھیں ملازمت سے نکلوا دوں گا۔ تمھیں معاف نہیں کیا جائے گا۔ حرامزادے، ہمارے پاس سے چلے جاؤ۔ میں تم سے گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ وقت آنے پر تم سے نمٹ لوں گا۔" یہ حاکمیت بھرا لہجہ تھا جس میں قہاری بھی تھی اور یہ اشارہ بھی کہ جاؤ، دفع ہو، مصطفے نے، جو کبھی پنجاب کا گورنر رہ چکا تھا۔ اپنے ماضی کا لب ولہجہ پھر سے اپنا لیا تھا۔ اس بدبخت افسر نے زیر لب بڑبڑا کر معافی مانگی اور شرمندگی سے وہاں سے چلا گیا۔

مصطفے انگ بولی کا قائل تھا یعنی یہ نظریہ کہ خود جسم بھی، زبان کا سہارا لیے بغیر، اپنی حرکات وسکنات سے بہت کچھ کہہ سکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اعتماد سے بھر پور ظاہری وضع قطع اپنا لی جائے تو سامنے آنے والے بیشتر لوگوں کا حوصلہ اسی وقت پاش پاش ہو جائے گا۔ مشق کے ذریعے وہ اس فن میں طاق ہو چکا تھا۔ محض اپنے اٹھنے بیٹھنے دیکھنے بھالنے کے انداز سے لوگوں کو مسخر کرنے کا یہ طریقہ جاگیردارانہ خوبو کا ایک اہم عنصر تھا۔

میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ میرے چیمپین نے ابھی ابھی میرے سامنے اپنی بے جگری کی مثال پیش کی تھی۔ میں نے اس بارے میں سوال کیا: "آپ نے ابھی جو کچھ کیا اسے کر گزرنے کے فیصلے تک کیسے پہنچے؟ آپ تو ان کے قیدی ہیں مگر انہیں نیچا دکھا دیا"۔

"نپولین بونا پارٹ نے ایک بار اپنے قید خانے کا دروازہ ٹھوکر مار کر کھولا اور اپنے گرفتار کرنے والوں کے سامنے، جو ہکا بکا کھڑے تھے، اعلان کیا کہ وہ نپولین ہے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ اس کی شہرت اس سے دو قدم آگے تھی۔ یاد رکھو سیاست کی بنیاد یقین پر ہے۔ جو میں نے کیا وہ درست تھا۔ اخلاقی لحاظ سے مجھے بالادستی حاصل تھی۔ اگر میرے اعتماد میں لمحے بھر کے لیے بھی فرق آ جاتا تو ڈپٹی مجھ پر وار کر جاتا۔ ہم ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جو دوسروں کو اعتماد میں لے کر چکما دیتے ہیں۔ یہ لوگ چہرے پر متانت طاری کر کے اور خلوص اور کھرے پن کا تاثر دے کر جال میں پھنسنے والوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم لوگوں کو یہ پتا چل جانے دیں کہ ہماری زرہ بکتر میں رخنے کہاں کہاں ہیں تو ہمارا کام چلنے سے رہا۔"

مصطفے کا ڈپٹی سے ٹکر لینے کا عمل لوک حافظے کا حصہ بن گیا۔ اب وہ نگران تھا۔ اپنے مسائل کے حل کے لیے قیدی اس کی طرف دیکھتے تھے۔ اس نے وفاداری اور اتحاد پر زور دے کر قید خانے پر کنٹرول حاصل کرنا شروع کیا۔ سپرنٹنڈنٹ کی نفرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر وہ مصطفے کی روز افزوں مقبولیت کے سامنے بالکل لاچار تھا۔ وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ قیدی اس کی کسی بات پر مشتعل ہو کر جیل میں بلوا کر دیں۔ مصطفے کا ایک لفظ سلگتی آگ پر تیل ڈالنے کا کام کر سکتا تھا۔

اڈیالا جیل میں مصطفے کے نظر بند ساتھیوں میں فلسطین کے وہ حریت پسند بھی تھے جنھوں نے کراچی میں پین ایم کا ایک جیٹ اغوا کیا تھا۔ ان کے رہنما علی نے اسے بتایا کہ وہ کس زبردست اذیت میں مبتلا ہیں۔ کسی بدیسی ملک میں قید ہونا بجائے خود ان سدا کے بے وطن نوجوانوں کے لیے المیہ تھا۔ مستزاد یہ کہ ان کے کام و دہن کو قید خانے کی خوراک کی مصیبت سہنی پڑتی تھی۔ جس میں غذائیت کم اور مرچیں زیادہ تھیں۔ مصطفے نے ان کی بے ڈھب مصیبت کو محسوس کیا۔ وہ اپنے پاس سے انھیں کھانا بھجوانے لگا۔ یہ ایک معنی خیز سیاسی کنایہ تھا وہ شاید ان کے طریق کار سے اتفاق نہ کر سکتا لیکن ان کے مقصد وحید کو بڑی شدومد سے اپنا مقصد وحید سمجھتا تھا۔ فلسطین اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ اسرائیلی قبضے کے خلاف ان کا کبھی نہ رکنے والا جہاد اسے جوش دلاتا رہتا۔ یاسر عرفات ان چند گنے چنے قائدین میں سے تھا۔ جو اس کی روح میں ولولہ پیدا کرتے تھے۔

مصطفے کوئی عام قیدی نہ تھا۔ اسے قید خانے میں سات کمرے دیے گئے تھے۔ اس کی اپنی کوٹھری ایرکنڈیشنڈ تھی۔ ایک اور کوٹھری میں اس کے لیے فریج اور ڈیپ فریزر رکھا ہوا تھا۔ اسے ٹیلی وژن دیکھنے کی اجازت تھی اور پڑھنے کے مواد تک لامحدود رسائی حاصل تھی۔ وہ برآمدوں میں یوگا کی مشقیں کرتا اور اس نے احاطے کو ایک ننھے منے پولٹری فارم میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس بات پر اسے خاص طور پر ناز تھا کہ ناشتے

کے لیے انڈے اس کے اپنے چھوٹے سے فارم سے آتے ہیں۔ مرغیاں اور چوزے اپنے فطری ماحول میں پل رہے تھے۔ پرندوں، خصوصاً تیتروں سے اس کا لگاؤ جاگیردارانہ ماضی کی باقیات سے تھا چند قیدی اسے مشقتیوں کے طور پھر دیے گئے تھے۔ وہی اس کے پرندوں کی دیکھ بھال کرتے اور گھر کو صاف ستھرا رکھتے۔ مصطفے اپنی اس محدود سی سلطنت کا بے تاج بادشاہ تھا۔ وہ کام کی نگرانی کرتا اور اکثر دل بہلانے کے لیے کھانا خود پکاتا۔ طباخی میں ماہر ہونے کی وجہ سے طرح طرح کے لذیذ کھانے تیار کرنے کی اسے خوب سوجھتی تھی لیکن خود دالوں اور سبزیوں پر مشتمل نہایت سادہ غذا کھا کر بہت خوش رہتا۔

اس سے جو خصوصی برتاؤ روا رکھا گیا تھا اس کے حوالے سے اکثر میرے ذہن میں خلفشار پیدا ہوتا۔ میں اس بارے میں سوچتی رہتی۔ میں محسوس کرتی تھی کہ ایک کھرے سیاسی قائد کو حقیقی قیدوبند کی زحمت اٹھانی چاہیے۔ اپنی تطہیر کے لیے دکھ جھیلنا چاہیے۔ لیکن میں ایسے خیالات کو دین داری اور نیکی سکھانے والے ان اسباق سے پیدا ہونے والی بچی کھچی خلش سمجھتی جن سے مجھے کونونٹ سکول میں واسطہ پڑا تھا۔ مصطفے کوئی مجرم نہ تھا۔ آج کے سیاسی قیدی کے بارے میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ کل کو وہ قائد بن کر ابھرے گا۔ اہل اقتدار کو یہ جرات ہو ہی نہیں سکتی کہ اسے شکنجے میں کس سکیں۔ اس کے عروج کا وقت آنے ہی آئے۔ اہل اقتدار تو صرف اس بات کو یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ مستقبل میں ان سے کسی قسم کا انتقام نہیں لیا جائے گا۔ کچھ دیر کے لیے جیل کی ہوا کھانا تو سیاست دان کے لیے اہلیت کی ایک لازمی سند کا درجہ رکھتا تھا۔ یہی کافی تھا کہ مصطفے کو قید میں رکھا گیا تھا۔ وہ رائے دہندگان میں اپنا حلقۂ اثر قائم کر رہا تھا۔ وہ تنہا رہ کر مستقبل کی چالیں اور گھاتیں ترتیب دے رہا تھا۔ اس نے ان کا ہاتھ نہ چھوڑا جو اس کے ساتھ قید کو صعوبت اٹھا رہے تھے۔ وہ ایک علامت بن چکا تھا۔

جو تضاد مجھے دکھائی دیا تھا اسے میں نے کھڑے کھڑے مسترد کر دیا۔

ہر سحرآفرین قائد کی طرح مصطفے اس قول پر یقین رکھتا تھا کہ "لکھا تو یہ ہے------ لیکن میں تم سے کہتا ہوں" وہ اپنے قواعد وضوابط خود وضع کرتا تھا۔ اپنے لیے گنجائش آپ نکالتا تھا۔ وہ کسی کی حاکمیت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ قانون کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کے لیے قانون کے پیچ ڈھیلے کرتا رہتا۔

اس نے اپنے مخصوص انداز میں پیغام رسانی کا ایک بہت ہی مفصل جال بچھانے کا "بندوبست" کیا۔ خصوصی پیغام مجھ تک فون کے ذریعے پہنچائے جاتے۔ خط دستی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

موصول ہوتے۔ اگر اسے تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ من مانی کرتا۔ اسے گرفتار کرنے والے اس کی خواہش کی تعمیل پر مجبور تھے۔ میں جب بھی اس سے ملنے جاتی وہ ہاتھ کے اشارے سے پہرے دار سے کہہ دیتا کہ وہ ہمارے پاس سے چلا جائے۔ جیل کے قوانین کی رُو سے اسے کسی سے علیحدگی میں ملنے کی اجازت نہ تھی۔ مصطفےٰ نے ان قوانین کو ٹھکرا دیا۔ وہ شیر کی طرح تھا جس کا یہ اصول ہوتا ہے کہ اُس کے علاقے میں صرف اُس حکم چلے گا۔ وہ کسی قسم کی گستاخی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کا تمام رویہ کسی ایسے آقائے نامدار کا سا تھا۔ جسے وقتی طور پر معزول کر دیا گیا ہو۔ اس کا ماضی ہر کسی کو یاد تھا۔ اس کے مستقبل کو کوئی نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ ماضی و مستقبل کی ان تابانیوں کے روبرو اس کے ٹمٹماتے حال کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

یہی کچھ اس نے فیصل آباد جیل اور ملتان کے نشتر ہسپتال میں کیا تھا جسے کچھ دیر کے لیے ضمنی جیل قرار دے دیا گیا تھا۔ فیصل آباد میں اسے جلاوطنی سے لوٹنے کے فوراً بعد رکھا گیا تھا۔ پندرہ روز کے اندر ہر طرف مصطفےٰ کا حکم چلنے لگا۔ وہ محفلوں کا بندوبست کرتا، جس سے جی چاہے ملتا، اس کی خلوت میں مخل ہونے کی کسی کو مجال نہ تھی۔

مصطفےٰ میرا مرشد تھا۔ اس نے مجھے لیکچر دیے، سیاست کا فن سکھایا، سیاسی چالوں گھاتوں کی تشریح کی اور میرے ذہن پر اپنے سیاسی عقائد اور ترجیحات کا پکا رنگ چڑھا دیا۔ یہ اپنا ایک جانشین تیار کرنے کا عمل تھا۔ اسے ضرورت تھی کہ جیل سے باہر بھی کوئی ہوبہو اس جیسا ہو۔ مجھے یہ کردار ادا کرنے کے لیے سنوارا سدھایا جا رہا تھا۔ مصطفےٰ کی ہنر مندی کے سامنے ساچی اینڈ ساچی جیسی تعلقات عامہ کے گُر سکھانے والی مشہور برطانوی فرم کا تعلیم دینے کا سارا اہتمام گرد تھا۔ ہمیں جو کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ ان کے پیچھے اس کا دماغ اور میرا یہ یقین کارفرما تھا کہ وہ صحیح مقصد کے لیے کوشاں ہے۔ میں مصطفےٰ کا نفس ثانیہ بن چکی تھی۔

اپنے جس وژن کو اس نے دوسروں سے بچا بچا کر رکھا تھا وہ مجھ پر ظاہر کیا جا رہا تھا۔ اس نے سالہاسال خاموشی سے، صبر سے کام لے کر، جو سوچ بچار کی تھی اب اسے عمل کے ایک ٹھوس پلان کی شکل دینے میں مصروف تھا۔ اس کا نقطہ آغاز عوام تھے۔ اس نے بتایا کہ خود غرض سیاست دانوں نے ماضی میں کس طرح عام آدمیوں کی امنگوں اور توقعات کو بیچ کھایا تھا۔ اس نے استحصال کی بات کی اور اس ناپاک گٹھ جوڑ کا ذکر کیا جس کے پیچھے سول اور فوجی افسروں، دیہی جاگیرداروں اور شہری سرمایہ داروں کے مفادات کام کر رہے تھے۔ وہ ان لوگوں کی مضبوطیوں سے واقف تھا۔ اور یہ ٹھیک ٹھیک بتا سکتا

تھا کہ کہاں چوٹ کھانے سے وہ ڈھیر ہو سکتے ہیں۔ اس نے زور دیا کہ دیہی عوام کی سطح پر تنظیمی کام کیا جائے اور ایک ایسی سیاسی حکمت عملی کا تصور پیش کیا جس میں اقتدار نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرتا ہو۔ "ہم اقتدار کے اس واژگوں اہرام کو الٹا دیں گے"۔ اس نے اسلام کے ابتدائی دور سے مثالیں میرے سامنے رکھیں اور اولیں اصولوں کی طرف لوٹنے کی وکالت کی۔ مارکسزم کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اس نے مارکسزم کے نقائص بھی گنائے اور ہمہ گیر اپیل کی طرف بھی توجہ دلائی۔ اس نے مجھے اس بات کا قائل کر لیا کہ فوج کے ادارے کو کاٹ چھانٹ کر کم کیا جانا چاہیے۔ "ہمیں اپنے محدود وسائل اس عفریت سے بچانے ہیں۔ ہمارے عوام کو خوراک، مکان، لباس، طبی سہولتوں، پینے کے قابل پانی اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ فوج ہماری قومی دولت ہڑپ کر گئی ہے۔ اگر میں اقتدار میں آیا تو فوجیوں کو سڑکوں اور پلوں کی تعمیر پر لگا دوں گا۔ ہمہ وقت موجود فوج افرادی قوت کا زیاں ہے۔ علاوہ ازیں، وہ آئینی حکمرانی کے لیے ہر وقت خطرہ بنی رہتی ہے"۔

جہاں تک مطالعے کی عادت کا تعلق ہے اس کا انتخاب بہت وسیع اور گوناگوں ہوتا تھا۔ کبھی مولانا مودودی کی "تفہیم القرآن" پڑھی جا رہی ہے تو کبھی ماؤ کے طویل مارچ کی روداد۔ وہ حضرت عمر کے حسن انتظام کا بڑا مداح تھا اور ہٹلر کی بعض اصلاحات کو قبول کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتا تھا۔ "ہر وہ پروگرام قبول ہے جس سے دکھ درد میں کمی آئے اور جو ترقی کی طرف گامزن رہے"۔

مصطفےٰ محسوس کرتا تھا کہ ہمیں خود کو عالمی طاقتوں کے بلاکوں سے ذرا دُور رکھنا ہو گا۔ اس نے سوویت یونین سے برادرانہ رشتے قائم کرنے کی والہانہ وکالت کی اور افغانستان پر روسی یلغار کے بارے میں پاکستانی مؤقف کو ٹھکراتے ہوئے پاکستان میں افغان مہاجرین کی آبادکاری کی مخالفت کرتا رہا۔ "مختصر مدت کے فوائد کی خاطر ضیا نے ہمارے مستقبل کو قربان کر دیا ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ یوں خواہ مخواہ ملوث ہونے سے کیسے ہولناک نتائج کی رو چوری چھپے ملک میں سرایت کر جائے گی۔ روسی ہمارا کردار کبھی نہ بھلائیں گے۔ بندوق پر مبنی کلچر اور منشیات کا بیوپار اس تصادم کے فطری فروعی ثمرات ہیں۔ جنرل کوتاہ بیں ہیں۔ امریکیوں کی ڈالر ڈپلومیسی سے ان کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔" وہ قائل ہو چکا تھا کہ پاکستان کو ایک مختصر مدت کے لیے دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر جینا چاہیے۔ یہ قوم کو آزادی کے شعور سے روشناس کرانے کے لیے ضروری تھا: "چین کو دیکھو۔ بھارت کو دیکھو۔ وہ اپنی مقامی ٹیکنالوجی کو ترقی دے رہے ہیں۔ ہاتھ میں کشکول لے کر دربدر نہیں پھرتے۔ عظیم قومی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

غیرت کے مالک ہیں۔ ہم نے اپنے لیے اسان رستہ چن لیا ہے۔ ہر چیز باہر سے منگائی جاتی ہے۔ ہم اپنے افکار تک درآمد کرتے ہیں۔"

مصطفےٰ ہمیشہ پُرجوش انداز میں پورے یقین کے ساتھ بات کرتا۔ اس کی گفتگو پرگمان ہوتا جیسے وہ اقتباسات سنا رہا ہو۔ اس کے دلائل صائب ہوتے۔ انہیں پیش کرنے سے پہلے وہ ان کے تمام پہلوؤں پر اول تا آخر غور کر چکا ہوتا تھا۔ اس میں مسیحائی کی کوئی صفت پائی جاتی تھی، جسے اس کی زنجیروں نے چار چاند لگا دیے تھے۔ مجھ پر اسے رہا کرانے کا جنون سوار ہوگیا۔ اس جیسے ذہن کا مالک اور یوں قید خانے میں پڑا رہے! یہ تو قبول نہیں۔ وہ ایسا شخص تھا جسے تجربات نے تراش خراش کر تاریخ کے اس لمحے کے لیے تیار کیا تھا۔ اس موقع پر وہ ایک فیصلہ کن اور بحران شکن کردار ادا کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ اس کے خلاف صف آرا قوتیں بہت طاقتور تھیں۔ اگر انہوں نے یہ سمجھا کہ اس کی ذات سے ان کے اپنے وجود کو خطرہ لاحق ہے۔ تو وہ اس کا کام تمام کر دیں گی۔ لگتا تھا کہ تمام سوالوں کے جواب اسے معلوم ہیں۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ ہم جس مشکل صورت حال میں پھنسے ہوئے ہیں اس سے کیسے نکلا جا سکتا ہے اس کے لیے یہ بھی اہم تھا کہ میں اس پر اور اس کے مقصد وحید پر یقین لے آؤں۔ اس نے مجھے اپنا وفادار حلیف بنانے کے لیے سخت محنت کی۔ میری حیثیت اگر ڈمی کی تھی تو وہ میری آواز بننا چاہتا تھا۔ آواز اس کی ہوتی اور سننے والوں کو لگتا کہ میں بول رہی ہوں۔ بس میری تربیت مکمل ہونے کی دیر تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے حریفوں کے خلاف میدان میں لانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی باتیں جذب کیں، اس کی تعلیمات کو جزو ذہن بنا لیا، ان پر عمل کیا لیکن راہ عمل پر چلتے چلتے میں بدلتی جا رہی تھی۔ میں آزادانہ طور پر جوابی رویہ اپنانے کے قابل ہو چلی تھی۔ میرے جوابی رویوں میں، جو کسی قسم کی سکھائی پڑھائی یا تربیت کا نتیجہ نہ تھے، اور خود مصطفےٰ کے جوابی رویوں میں بہت کم فرق رہ گیا تھا۔

مصطفےٰ نے سیاست کے گر اپنے پیرومرشد ذوالفقار علی بھٹو سے سیکھے تھے۔ وہ سیاسی عتبار سے بھٹو کا حقیقی وارث تھا۔ بھٹو نے اپنے پیچھے توازن سے محروم ورثہ چھوڑا تھا۔ بھٹو کی شخصیت میں بعض خامیاں تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ اپنے ہی منشور کی آپ خلاف ورزی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ اس کے اقدام سے ہر بار ثابت یہی ہوتا کہ وہ مخلص نہیں۔ عوام دوست رہنما کی حیثیت سے اس کے پاس بڑے کام کے نعرے تھے اور ان نعروں کی مدد سے وہ لوگوں میں نئی روح پھونک سکتا تھا۔ لیکن دوسری طرف ارادے کی پختگی سے محروم تھا۔ وہ ان انتہائی سخت اصلاحات کو کبھی

نافذ ہی نہ کر سکا جن کی ملک کو اشد ضرورت تھی۔ بھٹو کے رخصت ہو جانے کے بعد مصطفےٰ کو، لوئی چہار دہم، کی طرح یقین تھا۔ کہ "پارٹی میری ہے" مصطفےٰ اپنے عقائد میں مخلص تھا۔ وہ اصولوں پر سودے بازی نہ کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پیپلز پارٹی کے منشور کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ اور یہ منشور محض ووٹ بٹورنے کا ڈھکوسلا نہیں۔ اس خیال تھا کہ پارٹی کے کارکنوں پر اب تک اس منشور کا سحر طاری ہے اور اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ اس کے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں گے۔ مصطفےٰ کی سحر آفرینی میری ذات کے حوالے سے سیاسی معمولات میں ڈھلتی گئی۔ اگر وہ بھٹو سے زیادہ مخلص تھا تو میں اس سے دگنی مخلص تھی۔ میرے پاس اس کے جوش و خروش پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

میری اور اس کی سوچ ایک ہو چلی تھی۔ میں نے اس کے جملے برتنے اور چالیں چلنا شروع کر دی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی پارٹی کے کارکن میری طرف کھچے آ رہے ہیں۔ ان کی کاروائیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا، ان کے حوصلے کو ہمیشہ بہت بلند رکھنا میرے لیے ممکن ہو گیا۔ میں عوامی جلسوں میں خود بخود مصطفےٰ کے انداز میں تقریر کرنے لگی اور میں نے دیکھ کہ سننے والوں پر میری تقریروں کا وہی اثر ہوا جو مصطفےٰ کی تقریر کا ہوتا۔ میرا انداز خطابت ہوبہو ان جیسا تھا۔ نہ اس میں کھوکھلا پن تھا اور نہ اس پر کسی خوب اچھی طرح تیار کی ہوئی تقریر کا گمان ہوتا تھا۔ مصطفےٰ قید خانے کی دیواروں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنی عقل و دانش کو سمگل کر کے جیل سے باہر پہنچا دیا۔ سمگلنگ کی اس کاروائی میں میں اپنی خوشی سے اس کا کارندہ بنی۔ بغاوت کے جراثیم پھیل رہے تھے۔ قرنطینہ کی پابندیوں کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ اس نے مجھے اپنا جیسا بنا لیا تھا۔

رفتہ رفتہ میں اپنے فیصلے آپ کرنے کے قابل ہو گئی۔ میں کسی کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی نہ رہی۔ جب میں خود اپنے طبقے پر تنقید کرتی تو ذرا گڑبڑا جاتی۔ جو لوگ طبقاتی نفرت کی بہ نسبت طبقاتی حسد کے مارے ہوتے ہیں وہ امیر لوگوں پر زیادہ چبھتے ہوئے فقرے کس سکتے ہیں۔ مصطفےٰ سمجھتا تھا کہ بے روک ٹوک دولت اکٹھی کرتے جانے کی اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ وہ رابن ہڈ والے طریقے کے حق میں بھی نہ تھا (کہ امیروں کو لوٹ کر ان کی دولت غریبوں میں بانٹ دی جائے) وہ ایسے نظام کا خواہاں تھا جو دولت کی مساوی تقسیم کی ضمانت دے اور جس میں سب کو برابر کے مواقع حاصل ہوں۔ "قوم پر سوار ان پیران تسمہ پا کے پاسپورٹ الٹی میٹم دے کر ضبط کر لینے چاہییں۔ بھٹو نے ان سے بہت نرمی کا برتاؤ کیا۔ اس نے ان سے صرف اتنا کہا کہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

باہر کے ملکوں میں رکھا ہوا زرِ مبادلہ ملک میں واپس لے آئیں۔ یہ کہہ تو دیا لیکن یہ نہیں دیکھا کہ اس پر کسی نے عمل کیا بھی کہ نہیں۔ ان کو گرفتار کر کے اس وقت تک جیل میں رکھنا چاہیے جب تک یہ اپنی ناجائز طور پر کمائی ہوئی دولت واپس نہ لے آئیں۔"وہ ٹریڈ یونینوں اور دوسری اتنی ہی موثر طاقتوں کے حق میں تھا جو سرمایاداروں کو لگام دے سکیں۔ "پرولتاری طبقے کی دیکھ بھال صنعت کار کی ذمے داری ہے۔ صنعت کار کو چاہیے کہ غریبوں کے بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرے۔ ملازمت کا تحفظ، بہبود کا بندوبست، طبی سہولتوں کی فراہمی ضروری ہے۔ کام پر جانے والی ماؤں کے لیے ایسے مرکز ہونے چاہییں بڑے بڑے صنعتی اداروں پر فرض ہے کہ وہ سکول، کالج، ہسپتال اور یتیم خانے بنا کر ثقافت کی ترقی میں ہاتھ بٹائیں۔ ہر وقت اپنی ہی جیب گرم کرتے رہنے کے بجائے انہیں وہ قرض چکانا چاہیے جو معاشرے کی طرف سے ان پر عائد ہوتا ہے"۔ میں نے محسوس کیا کہ جس طرح کے آدمی کو میں منظرِ عام پر آتا دیکھنے کی خواہاں تھی وہ بالآخر سامنے آ گیا ہے۔ مصطفےٰ کی صورت میں ایک بے غرض سیاست دان میرے روبرو تھا جو مجھے اپنے ذہن میں جھانکنے کی دعوت دے کر اصل سچائی دکھا رہا تھا۔

جب میں جاگیردارانہ نظام پر کڑی نکتہ چینی کرتی تو میری تنقید زیادہ کھری معلوم ہوتی۔ مصطفےٰ خود جاگیردار تھا۔ اس کے باوجود وہ سمجھتا تھا کہ اس دقیانوسی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ اسے معلوم تھا کہ "ایسے ماحول میں جو بڑی حد تک جاگیردارانہ ہو جمہوریت پروان نہیں چڑھ سکتی۔" اس نے ان نشستوں کی سختی سے مذمت کی جہاں سے انتخاب لڑ کر جاگیردار آسانی سے جیت جاتے تھے۔ اور جو اس بات کی ضمانت تھیں کہ انھیں پارلیمنٹ تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وڈیرا دہشت پھیلا کر راج کرتا تھا۔ "وڈیرے کے حق میں ووٹ نہ ڈالنا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف ہے۔"میرے پس منظر کے پیش نظر، جاگیرداروں کے خلاف میری تقریروں کو وزن رکھنا ہی چاہیے تھا۔ اور یہی ہوا بھی۔

اب میں بڑی روانی سے چلنے والی سیاسی مشین بن چکی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے قیدی فلسطینیوں کو ایک بار خط لکھا جس میں کہا کہ مجھے ان کے مقصدِ وحید پر پورا یقین ہے۔ خط کے آخر میں یہ دعا تھی۔: "میں چاہتی ہوں کہ کاش میرے بچے بھی آپ جیسے بہادر ہو سکیں۔"

میری کایا پلٹ مکمل ہو گئی۔ میں اس کے ہر اہم مقصد کی حمایت کرنے پر اتر آئی اور بڑی جذباتی شدت کے ساتھ اسے رہا کرانے کی کوششوں میں جٹ گئی۔ مصطفےٰ جانتا تھا کہ میں دل کش ہوں۔ لیکن میں اسی کی خاطر لڑ رہی تھی۔ اس بنا پر میرا ایسے معاشرے میں آنا جانا اٹھنا بیٹھنا ناگزیر تھا جس میں مردوں کو غلبہ حاصل تھا۔ وہ مجھے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ شروع شروع میں وہ میری آزادی کے حوالے سے غیر مطمئن رہا لیکن اسے یہ بھی پتہ تھا کہ اس کے ہاتھوں میں ایک ایسی سیاسی ہستی بن چکی ہوں جو ہمیشہ اس کی وفادار رہے گی۔ جب تک میں اس کی سیاسی زندگی میں شریک اور اس کے مقصد کی راستی کی قائل رہوں گی، اس وقت تک راہ راست سے ہرگز نہ بھٹکوں گی۔ میں مصطفےٰ سے صرف اسی صورت میں محبت کر سکتی تھی کہ مجھے اس پر مکمل یقین ہو۔ وہ بھی جانتا تھا کہ جب تک میرا یقین سلامت ہے میری محبت ہر قسم کی ترغیبات پر غالب آ سکتی ہے۔

مصطفےٰ بڑی زبردست حسِ مزاح کا مالک تھا۔ بڑے بڑے اوٹ پٹانگ موقعوں پر بھی وہ مجھے ہنسانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اپنے لطیفوں سے مجھ پر چوٹ کر کے اسے بڑا مزہ آتا لیکن میرا مذاق اڑانے میں کسی طرح کی کینہ پروری کو دخل نہ تھا۔ میں اسے چھیڑ چھاڑ کے خاصے مواقع فراہم کرتی رہتی۔ وہ مجھے میرے لباس یا حلیے یا ان "بے اثر" لوگوں کے حوالے سے چھیڑتا جن سے، اس کے قید میں ہونے کے باعث، مجھے ملنا پڑتا تھا۔ میرے بالوں اور ان کی نوبنو بناوٹوں کو دیکھ کر (کہ بال بنانے کا مجھے شوق تھا) اسے ہمیشہ حیرت ہوتی۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا کہ "تم ایسی ماڈل معلوم ہوتی ہو جو کسی میگزین کے فیشن والے صفحات سے نکل کر سامنے آ کھڑی ہوئی ہو"۔ خیر اس میں ہرج ہی کیا تھا۔ تاہم قید خانے کے حوالے سے میرا حلیہ قدرے بے تکا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بہت سنجیدہ زندگی گزار رہی ہو۔ اپنے روزمرہ میں تھوڑی سی رنگینی شامل کرنے کے لیے تم یہ عجیب وغریب حرکتیں کرتی رہتی ہو۔" دل لگی کی خاطر اور اسے متحیر کرنے کے لیے میں نے رنگ برنگی دھاریاں ڈال کر بال رنگنے شروع کر دیے۔ ان تانبے کے رنگ کی اور زرد اور خاکستری دھاریوں کو دیکھ کر اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اتنا حیران ہوا کہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ بار بار مجھ سے کہتا رہا کہ "تم دوبارہ انہیں لمبے لمبے گھنے گیسوؤں کی طرف لوٹ جاؤ جنھوں نے پندرہ سال پہلے مجھے اپنا اسیر کر لیا تھا"۔

مصطفےٰ بڑے ہی لطیف پیرائے میں مجھے ایک ایسے ملک میں سرِ عام زندگی کے لیے تیار کر رہا تھا جہاں ظاہری حلیہ، خصوصاً عورت کا، معنی رکھتا ہے۔ ایک بار جب میں گجرات میں کسی سیاسی جلسے میں شرکت کر کے آئی تو مصطفےٰ نے مجھے میرے لباس پر طعنہ دیا۔ اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور بولا: "پتہ ہے تم آج کیسی لگ رہی ہو؟ جیسے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مارگریٹ تھیچر نے لال پراندا پہن رکھا ہو۔ تمہارا جلسہ کہاں پہ تھا؟ برمنگھم یا ساؤتھال میں یا گجرات میں؟" میں مسکرا کر رہ گئی کھسیانی سی ہو کے۔

ایک اور مرتبہ اس نے مجھے جیل کے احاطے میں دوپٹے کے بغیر چلے آنے پر ڈانٹا۔ "یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ بیگم صاحبہ جیل میں چلی آ رہی ہیں، ارد گرد اتنے بہت سے مرد موجود ہیں اور سر پر دوپٹا لینا بھی یاد نہیں۔ میں نے کہا "بھول گئی۔" "یہ کوئی بھولنے والی بات ہے؟ عام طور پر تو لوگ ایسی باتیں نہیں بھولتے۔ تم نے ایک بہت ہی بنیادی بات بھلا دی۔ دوپٹا تمہاری شرم یا حیا کی علامت ہے۔" میں جھجک گئی۔ مصطفے نے بڑا اہم نکتہ اٹھایا تھا۔ آزادی کا مطلب من مانی کرنا نہیں۔

جیل میں قیام کے دوران مصطفے مجھے مسلسل خط لکھتا رہا جو ہمیشہ کسی نہ کسی کے ہاتھ مجھے بھجوائے جاتے۔ یہ خط سیاسی طور پر سبق آموز تھے۔ وہ اسی خط و کتابت کے ذریعے مجھے تعلیم دیا کرتا۔ اس نے مجھے سکھایا کہ گفت وشنید کے دوران میں اپنے حقیقی جذبات کبھی ظاہر نہ کرنے چاہئیں۔ "چہرے کو احساس سے بالکل عاری رکھو تاکہ مدمقابل تمہارے ردعمل کے بارے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ جائے۔" اس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ اہم جلسوں میں اپنی بات پر قائم تو رہنا چاہیے لیکن شائستگی کے ساتھ۔ اس نے یہ بھی کہا کہ "آپ تو سب کچھ پوچھو لیکن اپنی طرف سے بالکل کچھ نہ بتاؤ اس نے مجھے یہ بھی سکھایا کہ اخباری کانفرنسوں کے دوران پُرفریب سوالوں سے جھٹ پٹ نمٹنے کی کیا ترکیب ہے اور یہ بھی سمجھایا کہ غیر ضروری تنازعات کھڑے کرنے میں کیا خطرات پوشیدہ ہیں۔

اس کے خط رومانی باتوں سے بھی سجے ہوتے تھے۔ وہ میرے اندر چھپی نسوانیت کو چھونا چاہتا تھا اور اپنے والہانہ عشق کا برملا اظہار کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں اس کے لیے کتنی اہم ہوں، اسے میری کتنی ضرورت ہے، مجھ پر کتنا ناز ہے۔ "تم نہ ہو تو میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا" اس نے مجھے ملکہ نورجہاں سے تشبیہ دی اور کہا کہ میری عدم موجودگی میں اس کی دنیا سونی سونی نظر آتی ہے۔ "جب تم میرے پہلو میں ہوتی ہو تو مجھے لگتا ہے کہ میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتا ہوں۔ اگر یہ پتا چل جائے کہ تم ہمیشہ میری وفادار رہو گی تو مجھے مرنے کا ذرا رنج نہ ہو چاہے آج ہی مر جاؤں۔"

ایسے شخص کی طرف سے، جسے دنیا سے الگ تھلگ رکھا جا رہا ہو، ان خطوں کا ملنا طبیعت کو جوش سے بھر دیتا تھا۔ یہ خطوط اس کی ذہنی کیفیات کے غماز تھے۔ اپنی سیاسی سوچ میں یکسو مزاج اور متوازن تھا اور جب مجھے، بطور بیوی، مخاطب کرتا تو بلا کا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

رومان پسند نظر آتا۔ ایک ایسے آدمی کے ان کلمات نے، جس کا مستقبل تک داؤ پر لگا ہوا تھا، مجھے یہ حوصلہ بخشا کہ ہاتھ پیر مارتی آگے بڑھتی جاؤں۔ رومان پسند انقلابی میں ہمیشہ ہی ایسی کشش پائی جاتی ہے جس سے بچنا محال ہے۔ مصطفے کے خطوں نے مجھے اس سے قریب تر کر دیا۔ میرے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا کہ وہ مصائب کو پرے جھٹک کر اپنے اندر چھپے ہوئے شاعر کا اظہار کرنے پر قادر ہے۔

قید خانے میں ہم جب بھی ملتے تو مستقبل کے بارے میں بات چیت کرتے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس زبردستی کی جدائی نے ہمیں اپنی ترجیحات کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مستقبل وہ نہیں تھا جو پہلے کبھی نظر آتا تھا۔ ہم نے یہ سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ بس اقتدار حاصل کرنا ہی ہمارا مقصد ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اقتدار حاصل ہو جانے کی صورت میں ہم پر خود اپنے طبقے سے لاتعلق ہونا لازم ہو جاتا۔ ہم نے قسم کھائی کہ سادہ زندگی گزاریں گے، خدا سے ڈریں گے اور عوام کی خدمت کریں گے۔ "ہم اپنے موجودہ چھوٹے مکان ہی میں رہیں گے"۔ مصطفے نے کہا۔ "جو کچھ مجھ پر بیت چکا ہے اس کے بعد اپنی محل نما رہائش کا رخ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ ہم سوزوکی رکھیں گے، پجیرو نہیں۔ ہمیں مثال قائم کرنی ہے۔ لوگوں کو بتانا ہے کہ مثالی کردار کیسے ہوتے ہیں۔" ہم اپنے خوابوں میں سادگی کا رنگ بھرتے رہے۔

میں جب بھی مصطفے سے ملنے گئی وہ ہمیشہ خوب بنا سنورا نظر آیا۔ میں نے ایک بار بھی اسے میلے یا سلوٹوں پڑے کپڑوں میں نہیں دیکھا نہ اس کی شیو بڑھی دیکھی۔ اس کا لباس سادہ مگر بالکل بے داغ ہوتا۔ وہ ہمیشہ پرسکون دکھائی دیا۔ پریشان یا مضطرب کبھی معلوم نہ ہوا۔ اپنے سکون کو وہ یوگا اور مراقبے کا نتیجہ بتاتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ حلیے کی ظاہری صفائی ستھرائی میں اس درجہ احتیاط صرف میری خاطر تھی۔ اسے پتہ تھا کہ میں کتنی نفاست پسند ہوں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے دکھ پہنچے۔ وہ مجھے توانا رکھنا اور میرے حوصلے کو بلند سے بلند تر دیکھنا چاہتا تھا۔ یہی اس کے نزدیک اہم تھا۔ میرے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا کہ ذرا ذرا سی بات میں میرا خیال رکھا جا رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کسی کو میری بھی ضرورت ہے۔ وہ جان بوجھ کر خود کو باقی دنیا سے الگ تھلگ کر رہا تھا۔ تاکہ اپنے لیے موزوں ترین مقام تلاش کر سکے۔ اسے امراء کے مدرسوں میں پڑھنے والے اشراف، گلبرگ کی گھمنڈی بیگمات اور لاہور کے لال بجھکڑ دانشوروں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے رشتے عوام سے تھے۔ باقی سب لوگ معاشرے کے سر پر بالوں میں خشکی کے مانند تھے۔ اس کی نظر میں عام آدمی مثالی شخصیت تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ وہ خود بھی بر ایسے جھونپڑے میں رہ چکا ہے جس کی چھت ٹپکتی ہو اور جس کے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گرد افلاس نے گھیرا ڈال رکھا ہو۔ وہ غلطی پر نہ تھا۔ مقدر، اپنے پراسرار انداز میں، یہ دکھانے والا تھا۔ کہ عوام کے دل میں اس کی کتنی قدرو منزلت تھی۔

ہم نو برس جلاوطن رہے تھے۔ اس عرصے میں بہت لوگوں نے ہماری کمی محسوس کی لیکن جس شدت سے مصطفےٰ کو اس کی ماں جی نے یاد رکھا اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ کھر خانوادے کے کسی فرد کا اپنی زمینوں سے دور رہنا انہونی سی بات تھی۔ اور یہ تو بالکل ہی سمجھ نہ آ سکا تھا کہ ان میں سے کسی کو زبردستی دور رکھا جا سکتا ہے۔ جلاوطنی کے اس چکر میں مصطفےٰ کی ماں جی اپنے دو بیٹوں سے محروم ہو گئی تھیں۔ وہ ان کی یاد میں کڑھتی رہتی تھیں۔ مصطفےٰ ان کا چہیتا تھا۔ وہی ان کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا اور صحت کا خیال رکھتا تھا۔ فرائیڈ کے اس جملے سے بیٹے پر ماں کے اثر کی ماہیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے: "جو مرد بلاشرکت غیرے اپنی ماں کا منظور نظر رہ چکا ہو وہ عمر بھر خود کو فاتح محسوس کرتا ہے۔ اور یہ اعتماد رکھتا ہے کہ وہ کامیاب ہو کر رہے گا۔ اور یہی اعتماد اکثر اس کی کامیابی کا سبب بنتا ہے۔" ماں جی کی نظر میں مصطفےٰ بہت ہی قابلِ تحسین تھا اور انہوں نے اپنی تمام امنگیں امیدیں اسی کی ذات سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

اچانک ان کی آنکھ کے تارے کو زبردستی کہیں اور پہنچا دیا گیا۔ مصطفےٰ نے کوشش کی کہ وہ لندن چلی آئیں لیکن حکومت نے انہیں پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا۔ اہلِ اقتدار کو پتہ تھا کہ مصطفےٰ کو ان سے بہت پیار ہے اور اس پیار سے فائدہ اٹھا کر اسے کبھی نہ کبھی بہلا پھسلا کر پاکستان لایا جا سکتا ہے۔ مصطفےٰ پر جیسے پہاڑ گر پڑا۔ وہ اکثر آنکھوں میں آنسو لیے بیٹھا اپنے اس المیے پر غور کرتا رہتا۔

ادھر بڑی بی غم کے مارے گھلی جا رہی تھیں۔ اتنے میں خبر آئی کہ ان کا بیٹا واپس آ رہا ہے۔ ان کا حوصلہ بلند ہونے لگا۔ جلد ہی ان کا "غلام مصطفےٰ" ان کے پاس آ جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ طیارے سے اترتے ہیں مصطفےٰ کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔ اسے اپنی ماں جی سے ملنے کا موقع ہی نہ دیا گیا۔

ایک روز مجھے پیغام ملا کہ ماں جی بیمار ہیں اور مجھے گاؤں جا کر ان کی خیر خبر لینی چاہیئے۔ میں اپنی کار میں کوٹ ادو پہنچی۔ ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ان پر مکمل غشی طاری تھی۔ وہ تقریباً مرگ آسا سکون کی حالت میں چارپائی پر پڑی تھیں۔ ان کے بھانجے بھتیجے ارد گرد بیٹھے تلاوت کر رہے تھے۔ عجیب ڈراؤنا منظر تھا۔ وہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے ان کے مرنے کے منتظر تھے۔ نہ وہاں کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ انہیں ہسپتال پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی ایک طرف بیسویں صدی کا آخری زمانہ دوسری طرف جہالت اور تقدیر پرستی کا یہ عالم!

میرا پارہ فوراً چڑھ گیا۔ میں نے اصرار کیا کہ میری ساس کا مناسب علاج کیا جائے مصطفےٰ کے بھائی، غلام غازی کھر، نے مجھے ٹوکا: "کچھ حاصل نہ ہو گا۔ یہ مرنے والی ہیں یہ میری ماں ہیں۔ فیصلہ میں کروں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔" "مجھے آپ کے خیالات کی کوئی پروا نہیں۔ میرے لیے یہ مصطفےٰ کی ماں جی ہیں۔ میں یہاں مصطفےٰ کی نمائندگی کرنے آئی ہوں۔ مصطفےٰ ان کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ چوں کہ وہ موجود نہیں اس لیے اس کی غیر حاضری میں یہ فیصلہ میں کروں گی کہ کیا کیا جانا چاہیے۔ میں زور دے کر کہتی ہوں کہ ابھی ڈاکٹر کو بلایا جائے اور انہیں ہسپتال پہنچایا جائے۔ اپنی طرف سے ان کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کیے بغیر ہم انہیں مرنے نہ دیں گے"۔

سب بھائی وہاں موجود تھے۔ غازی کو تاؤ تو بہت آیا لیکن میرے لہجے سے کچھ ایسا ضرور ظاہر ہوا ہو گا کہ میں دھن کی پکی ہوں۔ خاندان والے ڈاکٹر کو بلانے پر آمادہ ہو گئے۔ میری ساس کے آکسیجن دی گئی۔ ان کا بلڈپریشر تھوڑا سا گھٹ گیا اور گو انہیں ہوش نہیں آیا لیکن ان کی بے چینی میں بظاہر کمی آ گئی۔ انہیں ملتان کے نشتر میڈیکل ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مصطفےٰ بھی پیرول پر پولیس کی تحویل میں ملتان آ پہنچا۔ ہسپتال میں ایک ضمنی جیل قائم کر دی گئی۔ ایک پورے کا پورا وارڈ مصطفےٰ کے حوالے کر دیا گیا۔ ہسپتال میں بھی ہمارے پاس ایک کمرا تھا۔ جہاں بیٹھ کر ہم راتوں کو جاگتے تھے اور جہاں ہم سب کے لیے کھانے پینے کا انتظام تھا۔ مصطفےٰ کے پورے خاندان نے ملتان میں ڈیرے ڈال دیے۔ سب لوگ ہسپتال کے کمرے میں جمع رہتے۔ اتنے بڑے خاندان کو کھلانے پلانے کے لیے لمبا چوڑا بندوبست کرنا پڑا پارٹی کے کارکن ہمیں کھانا بھجواتے رہے۔ مجھے یاد ہے میں نے مصطفےٰ سے اس بارے میں جھگڑا کیا کہ ایک پورا وارڈ اس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ "جو واقعی بیمار ہیں ان کا کیا ہو گا؟ وہ کہاں جائیں گے؟" اس مرتبہ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اسے اپنی ماں جی کے علاج معالجے کے سوا کسی بات کا ہوش نہ تھا۔

وہ بیہوش ماں جی کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہتا اور کوشش کرتا کہ میٹھی میٹھی باتیں کر کے کسی طرح انہیں اس جھٹپٹے کی دنیا سے واپس لے آئے جس میں وہ کھو چکی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ ان کی طرف سے جواب ملے گا۔ وہ بولتا رہتا۔ انہیں بتاتا رہتا کہ وہ واپس آ گیا ہے اور اب انہیں کبھی چھوڑ کر نہ جائے گا۔ وہ ان کی منت ساجت کرتا رہا کہ آنکھیں کھول کر اپنے اس بیٹے کو دیکھ تو لیں جس کے غم میں انہوں نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مایوسی کے باوجود ڈٹے رہنے پر تلا ہوا ہے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی ہمت نہ ہاری۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جب بھی مصطفیٰ اپنا نام لیتا اور انہیں بتاتا کہ وہ ان کے سرہانے موجود ہے تو بڑی ہی جواب میں کراہ دیتیں۔ اکثر ان کے آنسو نکل کر رخساروں پر بہنے لگتے۔ انہیں مصطفیٰ کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ تھا۔ ان کے جسم کے بس میں تو اب کچھ نہ رہا تھا۔ لیکن ذہن نے کسی نہ کسی طرح، اظہار کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ میری ساس کو کبھی ہوش نہ آیا۔ وہ اپنے لاڈلے "غلام مصطفیٰ" کو دیکھے بغیر فوت ہو گئیں۔ مصطفیٰ ان حالات کو کبھی نہ بھلا سکا جن میں ان کی موت واقع ہوئی تھی۔

اسے جنازے میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ جب وہ ہسپتال جیل سے باہر آیا تو لوگ ہر طرف سے دوڑ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ سٹیرنگ وھیل پر اپنی جگہ سنبھال کر وہ ایسا چھوٹا سا بچہ معلوم ہونے لگا جسے اپنا من بھاتا کھلونا مل گیا ہو۔ گو ہمارے پیچھے پولیس کے سپاہیوں سے بھری کئی جیپیں تھیں لیکن کار چلانے کا یہ موقع آزادی کے جھونکے کی مانند تھا۔ مصطفیٰ نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے ساتھ بیٹھوں اور اپنے بھائی غلام غازی کو پیچھے بٹھایا۔ یہ ایک ترقی پسندانہ ادا تھی۔ وہ عوام کو اشارتاً بتا رہا تھا کہ میں اور وہ اب برابر ہیں۔ میرا مقام اس کے پہلو میں ہے۔ گھر خاندان کی خواتین اپنی اوقات سے خوب واقف تھیں۔ جب وہ گاؤں جاتیں تو انھیں پردے کی سختی سے پابندی کرنی پڑتی۔ مصطفیٰ ایک قدیم روایت سے انحراف کر رہا تھا۔ سارا کھیل اپنے پر اعتماد کا تھا۔ اس کے بھائی غلام غازی نے بڑی خفت محسوس کی کہ اسے پیچھے بٹھا دیا گیا ہے۔ وہ میری بالادستی پر آزردہ ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کا بھائی اتنا "ماڈرن" کب سے ہو گیا ہے۔

چلتے چلتے مظفر گڑھ آ گیا۔ مصطفیٰ گیارہ سال بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ جب ہم سناواں پہنچے تو سب سے پہلے میری نظر دھول پر پڑی جو بادلوں کی طرح لہراتی، بل کھاتی اٹھ رہی تھی۔ دھول اس طرح شام کو جھٹپٹا ہونے پر اٹھتی ہے جب مویشی چراگاہوں سے گھر پلٹتے ہیں۔ اسی رعایت سے شام کی یہ ساعت "گودھولی" کہلاتی ہے۔ لیکن اس وقت گرد کے اس پردے کے پیچھے، ان ارواح کی طرح جو قیامت کے روز یکجا ہوں گی، انسانوں کا ایک سمندر تھا۔ وہ لوگ لٹے پٹے اور بے یارومددگار نظر آ رہے تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو نم نہ ہو۔ اور اس کے باوجود آنسوؤں کی اس چلمن کی اوٹ میں امید کا سایہ بھی تھا۔ یہ اُمید کہ نجات کی گھڑی قریب آ پہنچی ہے۔ کہنے کو تو وہ مصطفیٰ کی والدہ کے جنازے میں شریک ہونے آئے تھے لیکن ہم سب کو علم تھا کہ یہ اس کے اپنے عوام ہیں۔ یہ سارے لوگ اسے اپنے علاقے میں واپس آنے پر خوش آمدید کہنے جمع ہوئے تھے۔

پھٹے حالوں، چیتھڑے لگائے، ننگے پاؤں، وہ آتے گئے۔ زندگی کی رونقوں سے دور رہنے پر مجبور وہ لوگ، اپنے اپنے دکھ درد کے پیوند سجائے، آئے۔ اپنے قائد کی جھلک دیکھنے کے لیے ریل پیل کرتے آگے لپکے۔ وہ کھلم کھلا رو رہے تھے، سینہ کوبی میں مصروف تھے۔ انہوں نے اپنے سینے چاک کر ڈالے اور اپنے خوں فشاں دل دنیا کے سامنے رکھ دیے۔ ان کی آہیں بلند ہو کر آسمان کو لپکنے لگیں۔ اس روز انہوں نے آنسوؤں کی زبان سے اپنے ووٹ ڈالے۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح منتظر تھے۔ مصطفیٰ کو بڑا دکھ ہوا کہ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ لوگ اسی طرح ایک ظالمانہ نظام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ اسی آمر کے فوجی بوٹ تلے پس رہے تھے۔ ان پر آج بھی مصطفیٰ کے وعدے کا سحر طاری تھا۔ والدہ کی موت اسے اپنے گھر تک لے آئی تھی لیکن زیادہ اہم بات یہ تھی کہ یہاں آ کر عوام پر اس کا ایمان تازہ ہو گیا تھا۔

زمین مصطفیٰ کی والدہ کے جسدِ خاکی کو آغوش میں لینے کے لیے وا ہوئی۔ مجمع مصطفیٰ کو آغوش میں لینے کے لیے سمٹ آیا۔

مولوی آخری رسوم ادا کر چکا تو مصطفیٰ نے اپنے عوام سے خطاب کیا۔ واپس آنے کے بعد مجمع عام کے سامنے یہ اس کی پہلی تقریر تھی۔ ماحول پر غضب کا جذباتی تناؤ طاری تھا۔ ہر طرف مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جنازے اکثر سیاسی سرگرمیوں میں شدت پیدا کرنے کا کام دے جاتے ہیں۔ مصطفیٰ بڑا زیرک تھا۔ وہ بھلا ایسا موقع ہاتھ سے جانے دیتا۔ اس میں تازہ جوش پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے ہی لوگوں کے درمیان تھا۔ اس کے سامنے ساٹھ ہزار سے زیادہ لوگ موجود تھے۔ "میں نے گیارہ طویل برس اس دن کا انتظار کیا۔ میری یہی آرزو تھی کہ میں آپ لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں۔ قسمت نے میرے ساتھ عجب ہاتھ کیا ہے۔ میں اللہ سے دعا مانگتا رہا کہ مجھے آپ کے لیے کچھ کرنے کا موقع ملے۔ میں یہاں پہنچا بھی تو کس طرح؟ اپنی والدہ کی موت کا ماتم کرنے کے لیے۔ آپ لوگ جو میرے غم میں شریک ہونے آئے ہیں اور میں پھر آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ میں آج بھی آمر کا قیدی ہوں۔ میں ابھی آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ اس بے پایاں پیار کو دیکھ کر جو آپ کو مجھ سے ہے مجھ پر عاجزی طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے تو اس محبت کا حقدار بننے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ کے حالات بدلنے کے لیے میں نے کیا کیا؟ جن لوگوں کے پاس اقتدار ہے انہوں نے مجھے کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ انہوں نے ہمیشہ مجھے آپ لوگوں سے دور رکھنے کی سازش کی۔ جب میں اس صوبے کا گورنر تھا تو آپ کے لیے صرف اتنا کر سکا کہ میں نے گورنر ہاؤس کے دروازے مظفر گڑھ کے عوام کے لیے کھول دیے۔ آپ اس بات کو آج تک نہیں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بھولے۔ آپ سے ووٹ لے کر میں نے آپ کی تھوڑی سی خدمت کی تھی۔ اس وجہ سے آپ لوگ میرے اس لگاؤ پر بھروسہ کرتے ہیں جو مجھے آپ سے ہے۔ آپ نے کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میں نے آپ لوگوں کو اپنے خیالوں میں، اپنی دعاؤں میں یاد رکھا ہے۔ میں نے اپنے وطن، اپنی مٹی اور مظفر گڑھ کے عوام کے لیے آنسو بہائے ہیں۔ آج میں اپنی والدہ کی قبر کے سامنے کھڑے ہو کر عہد کرتا ہوں۔ میں واپس آؤں گا۔ میں آپ لوگوں کے پاس واپس آنے کے لیے جدوجہد کروں گا اور ہم سب مل کر اس بدعنوان اور استحصالی نظام کا تختہ الٹ دیں گے۔ ہم ایسا نظام تعمیر کریں گے جو آپ کی دلی امنگوں کے زیادہ مطابق ہو گا۔ آپ کے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔ مصطفٰے کھر کو آپ نے بنایا ہے۔ مظفر گڑھ کی مٹی سے وفاداری کی، نمک حلالی کی مہک آتی ہے۔ میں اس مٹی کا فرزند ہوں۔ میں آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گا"۔

ہر طرف ادھم اور ہاہاکار مچ گیا۔ لوگوں کے بے قابو ہو کر سسکیاں لینے کے شور سے فضا دہل اٹھی۔ لوگ اپنے قائد کو چھونے کے لیے گتھم گتھا دوڑ پڑے۔ بہت سے ٹھوکر کھا کر گرے اور کچلے گئے۔ کتنے ہی ہاتھ التجائیہ انداز میں بلند ہوئے۔ مصطفٰے ثابت قدمی سے وہاں کھڑا ان کی محبت کا جواب دیتا رہا۔ اس نے ان کی ڈھارس بندھائی۔ انہیں صبر کی تلقین کی اور واپس آنے کی قسم کھائی۔ غیر موجودگی سے اس میں دراڑیں نہیں پڑی تھیں۔ عوام کو اب بھی یقین تھا کہ وہ مسیحائی طاقتوں کا مالک ہے۔ اب وہ قید خانے لوٹ کر اپنا وقت آنے کا انتظار کر سکتا تھا۔ عوام بھی اس کے منتظر رہیں۔ گے۔ وہ کسی کراماتی آندھی کی طرح آئے گا اور انھیں اور ان کی امنگوں کو اپنے دوش پر اٹھا کر بلندیوں کی طرف لے جائے گا۔

اس غل مچاتے ہجوم میں کہیں فوج کا کوئی مخبر بھی ہو گا کہ وہ ہر جگہ ہی موجود ہوتا ہے۔ اس دن کے واقعات کے بارے میں اس کی رپورٹ فوجیوں کو بڑی کھٹکی ہو گی۔ تین دن بعد مصطفٰے کو اپنی والدہ کے قلوں پر آنے کی اجازت نہ مل سکی۔ مصطفٰے نے جس طرح والدہ کی موت سے فائدہ اٹھا کر اپنا رنگ جمایا تھا اس پر اس کے بھائی بہت پریشان تھے۔ "میں سیاست داں ہوں۔ تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے۔ تم سیاست کو میری ذات سے الگ تھلگ نہیں کر سکتے۔ چاہے میں کچھ بھی کروں، چاہے کہیں بھی جاؤں لوگوں کا رویہ میرے حق میں ویسا ہی رہے گا جیسا آج تھا"۔

جب ہم کار میں ملتان لوٹے تو میں نے محسوس کیا کہ مصطفٰے کو قرار آ گیا ہے۔ عوام کی تلون مزاجی کے بارے میں اگر اس کے دل میں کچھ خدشات تھے تو وہ رفع دفع ہو چکے تھے۔ اس واقع کی یاد قید خانے میں اس کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے کافی

تھی۔ جب بھی اسے ذہنی طور پر کوئی پریشانی لاحق ہو گی تو عوام کے ہر طرف سے اس کے گرد جمع ہونے کے مناظر اسے سہارا دیتے رہیں گے۔ قید خانے کی دیواریں اس خوشی کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں گی۔

مصطفٰے اب زیادہ دھیمے اور سلجھے ہوئے مزاج کا آدمی بن چکا تھا۔ جن حالات سے اس کا واسطہ پڑا تھا ان کی وجہ سے اس کے تکبر میں کمی آ گئی تھی۔ اب وہ اپنی غلطیاں اور سیاسی حماقتیں گناتے ہوئے ذرا نہ ہچکچاتا۔ وہ خدا کے قہر سے ڈرتا تھا۔ اس کا سچ مچ خیال تھا کہ جن آزمائشوں اور صعوبتوں سے اسے گزرنا پڑا تھا وہ سب اس کے تکبر کا نتیجہ تھیں۔ "پتہ ہے جب میں گورنر تھا تو میں نے ایک جلسۂ عام میں محمد خان ڈاکو کے بارے میں کہا تھا: "میں اس پر اپنی گرفت اتنی سخت کردوں گا کہ اسے پنجاب میں کہیں انچ بھر ٹھکانا نہ مل سکے گا۔ خدا نے مجھے غرور کی سزا دی۔ پہلے مجھے دیس نکالا ملا اور واپس آیا تو اس ڈربے میں بند کر دیا گیا"۔

اسے پتہ تھا کہ وہ سخت گیر اور بے درد مشہور ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اب اس کے بارے میں اور طرح سوچیں۔ وہ لوگوں پر حکم چلانے کا خواہاں نہ رہا تھا۔، ان کی خدمت کرنے کا متمنی ہو گیا تھا۔ اس کے مزاج میں یہ تبدیلی میرے مشاہدے میں آئی۔ لگتا تھا کہ قید خانے میں جو عرصہ بسر کرنا پڑا اس کی وجہ سے اس نے اپنے ماضی کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنی ذات سے ورثے میں ملی ان تمام خواہشوں کو دور کر دینا چاہتا تھا جن سے اس کا جاگیردارانہ کردار تعمیر ہوا تھا۔

خدا کی طرف سے اسے طاقت کے اس سرچشمے کی ایک جھلک اور دیکھنے کا موقع ملا اس سرچشمے کی جو اس کے حکم کا منتظر تھا۔ اس کا بھائی غلام غازی کھر اچانک فوت ہو گیا۔ ابھی میں جنازے میں شرکت کے لیے اسے پیرول پر چھڑانے کی جان توڑ کوشش کر رہی تھی کہ مصطفٰے کو بتایا گیا کہ جنرل ضیاء اسے غلام غازی کی آخری رسوم میں شریک ہونے کی اجازت دینے پر راضی ہو گئے ہیں۔ جنازہ اٹھنے کا وقت چونکہ سر پر آ گیا تھا اس لیے جنرل نے از راہ کرم مصطفٰے کو آرمی چیف کا طیارہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ مصطفٰے کے نزدیک یہ گویا کوئی بڑی بات ہی نہ تھی۔ اسے پتہ چلا کہ میں ابھی لاہور میں ہوں۔ اسے ہوائی اڈے لے جایا گیا جہاں اس نے بڑے اطمینان سے اپنے نگران کو ہدایت دی کہ طیارے کا رخ لاہور کی طرف موڑ دیا جائے۔ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ملتان جانا چاہتا تھا۔ "میں تہمینہ کے بغیر جنازے پر نہیں جا سکتا۔ اسے لینے کے لیے لاہور جانا ہی پڑے گا۔" حکام نے اس کا مطالبہ مان لیا۔

مجھے بڑا تعجب ہوا۔ بطور قیدی مصطفٰے کو جو خصوصی مرتبہ حاصل تھا وہ میرے لیے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہمیشہ حیرت کا باعث رہا۔ وہ اس وقت پرانے دنوں کا مصطفٰے لگا، وہی ذاتی طیارہ، وہی تمام سہولتیں، طیارے پر سوار ہوتے وقت مجھے عجیب انداز میں محسوس ہوا کہ جو کچھ کبھی دیکھا تھا شاید اسی کو دوبارہ دیکھ رہی ہوں۔

مصطفٰے اس موت سے واضح طور پر دہل کر رہ گیا۔ غلام غازی مقبول سیاست داں اور قومی اسمبلی کا رکن تھا۔ مصطفٰے اس کا بڑا بھائی تھا۔ وہ اس وجہ سے پریشان تھا کہ موت نے اب اس کی نسل کے افراد پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ "میں نے اللہ کے حضور میں بڑی التجا کی ہے کہ مجھے تولسہ شریف میں اپنے پیر صاحب کے مزار کی زیارت کا موقع نصیب ہو جائے۔ جانے مجھے وہاں سے بلاوا کب آئے گا؟"

ملتان پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ جنازہ تو جا بھی چکا۔ غلام غازی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے تولسہ شریف میں دفنایا جائے! مصطفٰے سجدے میں گر گیا۔ جس معجزے کے لیے اس نے دعائیں مانگی تھیں وہ ظہور میں آ چکا تھا۔

ہم کار میں تولسہ شریف پہنچے۔ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ اس سے پہلے کسی بے پردہ عورت نے اس مقدس شہر میں قدم رکھا ہو۔ مصطفٰے نے روایت کو بالائے طاق رکھ دیا۔ بس اتنی رعایت برتی کہ مجھ سے کار ہی میں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا۔ اچھا ہی ہوا کہ میں کار سے نہ اتری۔

سائرن بجنے کی آوازیں سن کر ہجوم میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ لوگ سیلاب کی طرح امڈے چلے آئے۔ لگتا تھا ہماری کار ان کے ریلے کی تاب نہ لا سکے گی۔ مصطفٰے ہجوم میں غائب ہو گیا۔ میں نے جنازے کو ایک سسکیاں بھرتے، جذباتی طور پر بے چین، موج در موج ہجوم کے دوش پر جاتے دیکھا۔ ایک طرف ایک اور کھر کو دفنایا جا رہا تھا۔ دوسری جانب ان کا قائد، قید میں ہوتے ہوئے بھی، ان کے درمیان تھا۔ یہ سرشاری اور غم کا عجیب ملاپ تھا۔

موت اور وصال، میں نے سوچا، صوفیاء ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر ولی اللہ کی موت پر جشن منایا جانا چاہیے کیوں کہ وہ اس کی روح کے ذاتِ سرمدی سے واصل ہونے کا لمحہ ہوتا ہے۔ صوفی پیر کی وفات پر برپا ہونے والا جشن "عرس" کہلاتا ہے جس کے لفظی معنی شادی ہیں۔ کار میں بیٹھے بیٹھے، اپنے شوہر کے گرد جمع جنونی ہجوم کو دیکھتے وقت، میری سمجھ میں آیا کہ صوفیاء کے عشق میں اتنی شدت کیوں ہوتی ہے۔ آگہی کے اس لمحے کا بدیہی پس منظر تولسہ شریف ہی کو ہونا چاہیے تھا۔ یہ نوشتۂ تقدیر تھا۔

ہم اسی دن لوٹ آئے۔ مصطفٰے کے اس خیال کو بہت زیادہ تقویت پہنچی کہ تقدیر

واضح طور پر اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ مافوق الفطرت قوتیں اب اس کے لیے مصروف عمل ہیں۔ ان کسانوں کی طرف سے ملنے والی محبت کی وجہ سے، جو اس کے عمل دخل کے بغیر کسی تبدیلی کی امید کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے، اس کے دل میں دوبارہ یہ احساس جاگا کہ قدرت اس پر مہربان ہے۔

بعض دوسری طرح کے میل ملاپ کی تجدید بھی اتنی ہی متاثر کن تھی۔ میرے ذمے چار بچوں کی نگہداشت تھی۔ ابھی وہ کمسن تھے اور انہیں یہ سمجھانا مشکل تھا کہ ان کے والد کو کیوں قید کیا گیا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے ہم جماعتوں کے طعنوں کا کس طرح جواب دیں۔ میں نے انہیں بتانے کی مقدور بھر کوشش کی کہ ایک مجرم میں اور ایسے شخص میں فرق ہوتا ہے جسے اپنے سیاسی عقائد کی بنا پر جیل میں ڈالا گیا ہو۔ میں نے نیکی و بدی کی کائناتی کشمکش کی تصویر ان کے سامنے کھینچی جیسے ان کا باپ خیر مجسم بنا ہوا شیطانی ظلمت سے برسرپیکار ہو۔ میری بیٹیوں کو اس مسئلے کی سیاسی جہت کی واضح طور پر زیادہ سمجھ بوجھ تھی لیکن ان کے لیے اپنی سہیلیوں کو، جو غیر سیاسی، بورژوا اور جاگیردارانہ پس منظر سے تعلق رکھتی تھیں، یہ سمجھانا دقت سے خالی نہ تھا کہ ان کے باپ کو صرف مارشل لا کی مخالفت کرنے پر قید رکھا جا رہا ہے۔ میرا بیٹا علی، جو آٹھ سال کا تھا، کئی بار اپنے ساتھیوں سے ہاتھا پائی کر چکا تھا۔ وہ اس بات پر زور دیتا تھا کہ اس کا باپ اچھا آدمی ہے، بدمعاش نہیں۔ زندگی کا ہر لمحہ ان کے لیے دلچسپیوں سے بھرا تھا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ بچے ہر طرح کے حالات اور کیفیات سے مطابقت پیدا کرنے کی پُراسرار صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن میں اس بارے میں کوئی پیش گوئی کرنے سے قاصر ہوں کہ جو چرکے انہیں لگنے تھے آنے والے دنوں میں ان سے کتنے مندمل ہو سکیں گے۔

ننھا حمزہ ہمیشہ بوکھلایا رہتا۔ جب مصطفٰے کو جیل ہوئی تو وہ صرف آٹھ ماہ کا تھا۔ اسے بس اتنا ہی معلوم تھا کہ اس کا باپ "بڑا آدمی" ہے جو کسی ناقابل فہم وجہ سے گھر نہیں آ سکتا۔ میری یہی آرزو رہی کہ کسی طرح اس کا ذہنی انتشار دور کر سکوں۔ مصطفٰے ہر وقت بچوں کے بارے میں فکر مند رہتا اور چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس رہا کریں۔ اس کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ خاندان ایک ساتھ رہے۔ میں بڑی باقاعدگی سے، جس میں کبھی فرق نہ آیا، بچوں کو اس سے ملانے لے جایا کرتی تھی۔

میں بچوں کے خیال سے اس کی کمی زیادہ محسوس کرتی تھی۔ انہیں باپ کی ضرورت تھی جس کے حوالے سے وہ اپنی شناخت مکمل کریں۔ جسے پیار کر سکیں۔ میں نے ان کے دل میں یہ بات کبھی نہیں بیٹھنے دی کہ ان کا باپ کسی اعتبار سے بے بس

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہے۔ یہ بات نفسیاتی طور پر بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ انہیں اس کی سب پر چھا جانے والی موجودگی یاد تھی۔ اس کی شخصیت اور حیثیت میں کسی طرح کی کمزوری یا کمی سے عہدہ برا ہونا ان کے لیے ہمیشہ کے واسطے مشکل ہو جاتا۔ میں نے چھوٹے چھوٹے واقعات سنا کر اس کی شخصیت کی عظمت کو اجاگر کیا۔ میں نے اپنے کردار کو گھٹا کر پیش کیا کیوں کہ میں خود کو ایسی ہستی کے روپ میں سامنے لانا نہیں چاہتی تھی جو ان کے باپ کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ انہیں کبھی اپنا باپ تحفظ کا محتاج نظر نہ آنا چاہیے تھا۔ میں نے انہیں بتایا کے میں محض اس کی جدوجہد کو آگے بڑھا رہی ہوں اور جب وہ جیل سے باہر آ جائے گا تو ہم سب کو تحفظ دے گا۔ ان کے باپ نے آمر کے سامنے ڈٹ جانے میں جس دلیری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ بچوں کو قابلِ تحسین معلوم ہونے لگی تھی۔ ننھا حمزہ ان بڑی بڑی دیواروں کے بارے میں ہر کسی کو بتاتا جو اس کے باپ کے محل کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اور جن پر پولیس والوں کا پہرہ تھا۔ اس کی نظر میں آڈیالا جیل مصطفے کا گھر تھا اور اس کا باپ شہزادہ جو پولیس کی حفاظت میں رہتا تھا۔

مصطفے دور بیٹھ کر ریموٹ کنٹرول کے ذریعے گھر کے ناخدا کا کردار کرتا رہتا۔ اسے ہمیشہ یہ تجسس رہتا کہ ہم کیا کھاتے پیتے ہیں اور آیا وہ کوالٹی کے لحاظ سے اچھا ہوتا ہے۔ جب اس نے کہا کہ میں لاہور سے انڈے، چوزے اور پکانے کا تیل خریدنا چھوڑ دوں تو مجھے خاص حیرت ہوئی۔ کہنے لگا کہ وہ میری ضرورت کی تمام چیزیں جیل سے بھجوا دیا کرے گا۔ اس کے چھوٹے سے پولٹری فارم کی بدولت ہمارے گھر میں تازہ چوزوں اور انڈوں کا اچھا بھلا ذخیرہ ہمہ وقت موجود رہتا۔ میں اس بارے میں اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی کہ پکانے کا تیل وہ کہاں سے حاصل کرتا تھا۔

میرے دیکھنے میں آیا کہ اس کا سیاسی طریق کار بھی ایسا بے تکا تھا کہ اس کے بارے میں پہلے سے کچھ کہنا ممکن ہی نہ تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اپنا پروگرام قلم بند کر دے تاکہ ہم اسے پمفلٹوں کی شکل میں چھپوا کر ہر طرف پھیلا دیں۔ انھیں پڑھتے ہی معاشرے کے محروم طبقوں کے دل و دماغ میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ وہ قید خانوں پر دھاوا بول دیں گے۔ میں اس موضوع پر مصطفے کو مسلسل دق کرتی رہتی لیکن اس پر میری چھیڑ چھاڑ کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس کا تذبذب میری سمجھ سے باہر تھا۔ جب وہ مجھ سے گفتگو کرتا تو اپنا مفہوم ادا کرنے پر اتنا قادر نظر آتا اور اس کا وژن اتنا شفاف اور روح گرما دینے والا ہوتا لیکن جب میں کہتی کہ یہ باتیں لکھ کیوں نہیں ڈالتے تو وہ ٹال مٹول کرنے لگتا۔

میں جب سیاست کے حوالے سے رائے عامہ کو اپنے حق میں منظم کرنے کے لیے روپے پیسے کا ذکر کرتی تو وہ کہتا کہ مراعات یافتہ اقلیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں دلیل دیتی کہ اس اقلیت نے حال ہی میں پی این اے تحریک کو روپیہ فراہم کیا تھا۔ اور تحریک بھٹو کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اسے میری بات سے اتفاق نہ تھا۔ وہ کہتا کہ بھٹو کا تختہ عوام کی لاتعلقی نے الٹا تھا۔ بھٹو کی حرکتیں ایسی تھیں۔ کہ اس کے اپنے حمایتی اس سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ اس نے اپنے اور عوامی طاقت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر لی تھی۔ رضائے عوام روپے پیسے سے نہیں خریدی جا سکتی۔ عوام پر صرف خیالات کا اثر ہو سکتا ہے۔ "ہمارے عوام آن پڑھ ہیں۔ انھیں پمفلٹوں سے کوئی دل چسپی نہیں۔ انہیں ایسا رہنما چاہیے جو ان کے مطالبات کو الفاظ کا جامہ عطا کر سکے۔ جو ان کی ضرورتوں کا ادراک کر سکے۔ ہمیں ان میں گھل مل کر ان کے ساتھ اس زبان میں بات کرنی ہو گی جو وہ سمجھتے ہوں جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اگر وہ حرف بہ حرف لکھ ڈالوں تو اہل اقتدار میرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے وہی میرے لکھے پر چونکیں گے اور اس کا نوٹس لیں گے۔ میں انہیں پہلے سے خبردار کیوں کروں؟ میں کالموں اور انچوں کے حساب سے ان پر حملہ آور ہونا نہیں چاہتا۔ میں میدانِ عمل میں اتر کر ان سے ٹکراؤں گا"۔

میں ان طاقتوں کا اندازہ لگا سکتی تھی جن کا اس کے خلاف صف آرا ہونا یقینی تھا۔ وہ روس دوست، فوج دشمن، جاگیردار دشمن، صنعت کار دشمن اور افسر شاہی کی بدعنوانیوں کے خلاف تھا۔ اقتدار پر فائز طاقتوں کو سوشلسٹ مصلح کبھی قبول نہ ہو سکتا تھا۔ غالباً کسی قسم کے پروگرام کی تشکیل کرنا اور اسے عوام میں پھیلانا ابھی قبل از وقت تھا۔ تبدیلی لانے کا بلیو پرنٹ مصطفے کے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ کبھی کبھار اس کی بس جھلک دکھا دیتا تھا پروگرام کی تفصیلات ظاہر کرنے کا وقت تب آئے گا جب سیاسی مہم آرائی شروع ہو گی اور وہ ان فوجیوں کے کمان سنبھال لے گا جو اس کی خاطر لڑنے مرنے کو تیار تھے۔ اس کی فوج کو صدیوں کے ظلم و ستم نے جنم دیا تھا۔ وہ اس کے گرد اکٹھے ہو کر انقلاب دشمن طاقتوں سے جنگ کریں گے۔ اس کی مبہم اور بے ربط سیاسی سوچ بچار محض پُر فریب ڈھول تھی جسے وہ رجعت پسند طاقتوں کی آنکھوں میں جھونکنا چاہتا تھا تاکہ وہ نچنت ہو کر بیٹھی رہیں اور جب مصطفے اچانک حملہ آور ہو تو ان کے چھکے چھوٹ جائیں۔

مصطفے نے ایک بار اور، جیل سے پیرول پر رہا ہو کر ہمیں بوکھلا دیا۔ عبدالرحمن کی شادی ہونے والی تھی جو اس کی پہلی بیوی کی اولاد تھا۔ شادی سے ایک دن پہلے اسلام

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

آباد پر موت کی بارش ہونے لگی۔ اوجھڑی کیمپ میں گولا بارود کے ذخائر کو آگ لگ گئی جہاں میزائلوں، بموں اور ہتھیاروں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اس نیم خفیہ ذخیرے سے افغان مجاہدین کو چوری چھپے ہتھیار فراہم کرنے کے عارضی مرکز کا کام لیا جا رہا تھا۔ کیمپ میں دھماکے سے مزائل چالو ہو گئے اور اڑ اڑ کر ہر طرف برسنے لگے۔ سینکڑوں افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ کوئی شخص محفوظ نہ رہا۔ دارلحکومت میں کاروبار زندگی معطل ہو کر رہ گیا۔ یہ انتہائی بھیانک قسم کی اندھا دھند خونریزی تھی۔ لوگ میزائلوں اور بموں کے پرخچوں سے جان بچانے کے لیے ہر طرف بھاگے جا رہے تھے۔ دھماکے کئی دن جاری رہے اور دھماکوں کی طرح اس بارے میں افواہیں بھی پھیلتی رہیں کہ یہ المیہ کیوں اور کیسے رونما ہوا۔ بہت سے لوگوں کی نظر میں اوجھڑی کیمپ کا سانحہ اس بات کا اشارہ تھا کہ ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور حکومت کے خاتمے کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ دھچکا اسے ایسا لگا جس کے بعد وہ سنبھل ہی نہ پایا۔ اس تباہی کے بعد ضیاء نے جو قدم بھی اٹھایا اس کا نتیجہ غلط نکلا۔

مصطفٰے نے اس صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ وہ بیٹے کی شادی میں شرکت کے بہانے چوبیس گھنٹے کے لیے پیرول پر قید خانے سے باہر آیا۔ ہم اسے لینے لاہور کے ہوائی اڈے پر گئے جہاں لگتا تھا کہ حفاظتی عملے کا ہر فرد حاضر ہے۔ ہم کاروں کے جلوس میں اس طرح گھر آئے کہ سائرن بج رہے تھے۔ اور مسلح پولیس والے ٹرکوں میں ساتھ ساتھ تھے مجھے وہ زمانہ یاد آیا جب مصطفٰے گورنر تھا اور یہی حفاظتی عملہ شہر میں اس کے آگے پیچھے پھرا کرتا تھا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کر عملے کے افراد اب صرف اس لیے ساتھ لگے ہوئے تھے کہ وہ فرار نہ ہونے پائے۔

میں نے گھر پر اخباری کانفرنس کا انتظام کیا۔ وہ رائے عامہ پر اثر انداز ہونے والے اخباروں کے مدیروں سے ملا۔ اس روز جو لوگ اس سے ملنے آئے ان میں مجید نظامی کے علاوہ صحافیوں کی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے دو مدیر، عارف نظامی اور شکیل الرحمن بھی شامل تھے۔ مصطفٰے نے اسی روز نوابزادہ نصراللہ خان، معراج خالد، راؤ رشید اور شاعر حبیب جالب سے بھی ملاقات کی۔

شام کی مصروفیات شادی کی رسومات کے لیے وقف تھیں۔ مصطفٰے نے یہ کہہ کر ہمارے ہوش اڑا دیے کہ اوجھڑی کیمپ کے المیے کے پیش نظر شادی کا ملتوی کیا جانا ضروری ہے۔ اس کی نجی زندگی کو اس کی سیاست سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

ہم سب عجب شش وپنج میں پڑ گئے۔ دلہن والوں نے بڑے زبردست انتظامات کر رکھے تھے۔ شامیانے لگ چکے تھے۔ دلہن شاہانہ جوڑا زیب تن کر چکی تھی۔ نازک رنگین

قمقمے جل رہے تھے۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔

عبدالرحمن کی پریشانی قابلِ فہم تھی۔ باپ کے اس فیصلے پر وہ بہت گڑ بڑایا۔ مصطفٰے اور میں لڑکی والوں کے گھر گئے۔ اس نے انہیں سمجھایا کہ شادی کن وجوہ پر ملتوی کی جا رہی ہے۔ ان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ہم نے زیوروں سے لدی پھندی، شرمائی شرمائی دلہن سے بات کی۔ مصطفٰے نے اسے سمجھایا کہ ایسے موقع پر جب قوم ایک المیے سے دوچار ہے خوشیاں منانا ٹھیک نہیں بدنامی کا یہ داغ اس پر لگ گیا تو کبھی اتر نہ سکے گا۔ اور نہ وہ اپنے پیروکاروں کے سامنے شادی کا کوئی معقول جواز پیش نہ کر سکے گا۔ مصطفٰے نے لڑکی کو بتایا کہ وہ کسی عام سے خاندان میں بیاہی نہیں جا رہی۔ "میں سیاست داں ہوں، لوگوں کی طرف سے مجھ پر ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگر یہ شادی ایسے نامبارک دن ہوئی تو میں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا"۔

اپنا مدعا بیان کر کے وہ رخصت ہوا۔ اب وہ کوئی بڑی غلطی کرنے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ اس واقع کے بعد سے غلطیوں پر غلطیاں کرنے کا سارا ٹھیکا ضیا نے لے لیا۔ مصطفٰے کے عالی ظرفانہ فیصلے پر اخباروں اور رسالوں میں بڑی واہ واہ ہوئی۔ اس نے سیاست کو اپنی ذات سے زیادہ اہم جانا تھا۔

اور آخر کار لوگ اب اس سیاست دان کا استقبال کرنے ہجوم در ہجوم قید خانے کے دروازے کی طرف دوڑے آ رہے تھے۔ زمانے کی دھند چھائی بھی اور چھٹ بھی گئی۔ اور آزادی کی دنیا میں اس کی آمد کا ڈنکا بجانے کے لیے ہمارے ارد گرد لوگ ناچتے رہے، گاتے رہے۔ میں نے کار کی کھڑکی میں اپنے عکس پر نظر ڈالی۔ یہ کون ہے جس نے سفید پوشاک پہن رکھی ہے؟ کیا یہ واقعی میں ہوں؟ میں اپنی ذات میں موجود تمام تضادات سے دست و گریبان ہونے کے بعد ان میں سے بہت سوں کو ٹھکانے لگا چکی تھی۔

مجھ پر کہ میں برس ہا برس سے ایک نئی دنیا سے دوچار چلی آ رہی تھی اس طرح کا اثر پڑنا ہی تھا۔ میں نے اس تمام اوپری سج دھج کو تج دیا جو معزز اور باعزت نظر آنے کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ مجھے بدل ڈالنے میں مصطفٰے کا ہاتھ تھا۔ اس نے اپنے قول وفعل کی مدد سے مجھے سنجیدہ شخصیت بنا دیا جسے اپنے مشن کا شعور ہو۔ میں نے اپنے قیمتی ملبوسات، جو معروف ڈیزائن کاروں کی کاوشوں کا نتیجہ تھے۔ صندوقوں میں بند کر دیے اور اپنی خودنمائی اور اتراہٹ کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ارمانی اور ورسیس اور کین زو اور اسی لیے میا کو جیسے فیشن ڈیزائنرز کا تعلق چھچھورے، خوبصورت لوگوں سے تھا۔ میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اب اور ہی طبقے کی فرد تھی، اس طبقے کی جو سوچ بچار کا عادی ہے اور اپنے فیصلے شعوری طور پر کرتا ہے، جو اس کا قائل نہیں کہ امیری غریبی اتفاق کا نتیجہ ہے (یعنی امیر گھرانے میں پیدا ہوئے تو امیر ہو گئے، غریب گھرانے میں جنم لیا تو غریب ہی رہے)۔ جو اپنا صحیح مقام تلاش کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے میرا تعلق ان لوگوں سے تھا جو کچھ بن سکتے تھے اور نہ بن پائے "۔ میں پہلے ہر وقت یہی چاہتی رہتی تھی کہ یہ بھی مل جائے، وہ بھی ہاتھ آ جائے اب مجھے اپنی اس سرشت پر شرم آنے لگی۔ میرے وارڈ روب میں موجود ڈھیر ساری چیزیں میری ضروریات سے کہیں زیادہ تھیں۔ اور بھی شرم ناک یہ کہ میرے پاس جوتوں کے بے شمار جوڑے تھے، اتنے کہ انہیں دیکھ کر مارکوس میاں بیوی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ایک دن مجھ میں کوئی چیز چٹ سے ٹوٹ کر الگ ہو گئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میرے نفیس وضع کے، لباس کے ہم رنگ دستی بیگ اب خالی رہا کریں گے۔ اب میں لباس کے حوالے سے بننے ٹھننے کی زحمت اٹھانے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ رنگ اب بھی میرا دل لبھاتے تھے لیکن صرف اسی وقت جب وہ میرے بدن پر نہ سجے ہوں۔ میں نے مصطفٰے سے مل کر اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اسے قطعاً کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے مجھ سے اسی بات کی توقع تھی۔۔ وہی مجھے اس راستے پر لے آیا تھا۔ اس نے فخر سے میرے فیصلے پر صاد کیا۔ میں نے طے کر لیا کہ آئندہ سے صرف سفید سوتی رنگ کے کپڑے پہنا کروں گی۔

مصطفٰے کے ردعمل پر مجھے تعجب نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ چاہتا تھا کہ میں اپنا روپ بدل لوں لیکن جانتا تھا کہ اگر مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا تو میں بغاوت کردوں گی۔ تبدیلی خود میرے اندر آنی چاہیے تھی۔ ایسا ہی ہوا۔ مجھے ذرا ابھی دکھ نہ پہنچا بلکہ ایسا لگا جیسے مجھ پر سے کوئی بہت بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اس معاملے کا کوئی علامتی پہلو نہ تھا۔ بلکہ یہ اپنے آپ کو خود دریافت کرنے کے طویل اور تکلیف دہ عمل کا نقطۂ نظر انجام تھا۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں جڑاؤ زیورات اور جواہرات پہننا چھوڑ دوں گی۔ میں نے پلٹ کر اس ماحول کی طرف دیکھا جس میں میری جڑیں پیوستہ تھیں۔ میں نے اپنے لیے چاندی پسند کی کیونکہ غریب سے غریب عورت بھی چاندی کی بنی چیزیں پہنتی ہے۔ میں نے جواہرات اور سونے کو ٹھکرا دیا کیوں کہ وہ ایک ایسے ماضی کی یاد گار تھے جس سے میں قطع تعلق کرنا چاہتی تھی۔

میں نے کار کا شیشہ نیچے کیا۔ میری شبیہ آہستہ آہستہ غائب ہو گئی۔ لوگوں کو خوشیاں مناتے سنا جا سکتا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں بھنگڑا ڈال رہی تھیں۔ ڈھول کی تھاپ زیادہ سے زیادہ جنون خیز ہوتی گئی۔ مصطفٰے ان کے سامنے آ پہنچا تھا۔

فضا پر امید کا سایہ تھا۔ جیسے اچھا وقت آنے کو ہو۔ پاکستان بھر سے اس کے دوست اور ساتھی آ کر اکٹھے ہوئے تھے۔ آمر کے قہر و غضب نے ان کی وفاداریوں کا امتحان لیا تھا۔ آج ان کے اور مصطفٰے کے عزم کی جیت کا دن تھا۔ ان میں سے بہت سوں نے جیل کی ہوا کھائی تھی انہیں عذاب دیا گیا تھا اور کوڑے مارے گئے تھے۔ آزمائش کی تاریک ترین گھڑیوں میں انہوں نے اسی لمحے کا خواب دیکھا تھا۔ آج ان کا خواب حقیقت بن چکا تھا۔

ہم اڈیالا جیل سے پجیرو میں روانہ ہوئے جو رسوخ اور امارت کی نئی علامت تھی۔ جب مصطفٰے ہاتھ ہلا ہلا کر ہجوم کی داد و تحسین کا جواب دے رہا تھا تو میں اس کے ساتھ کھڑی تھی۔ ہم دونوں اس تاریخی لمحے میں برابر شریک تھے۔ ہجوم ڈھول کے آہنگ پر ناچتا رہا۔ آخر کار ہم آزاد تھے۔ چاروں بچے میرے ساتھ تھے۔ پریوں کی کہانی نے اچانک حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ہجوم کس طرح ان کے باپ کے ہر ہر اشارے کا جواب دے رہا ہے۔ ہجوم کی طرف سے اس طرح کی دیوانہ وار شیفتگی صرف کسی پوپ کنسرٹ ہی میں دیکھنے کو مل سکتی تھی۔ بچوں کی نظر میں مصطفٰے "سٹار" بن چکا تھا۔

مجمع ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ وقفے وقفے سے رک کر لوگوں سے ہاتھ ملانا پڑتا تھا۔ بوڑھے بوڑھے لوگ ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے آتے۔ اس کے ہاتھ چومتے، چہرے کو چھوتے اور روتے رہتے۔ ان کے چہروں پر جھریاں نہ تھیں۔ لگتا تھا غم نے بہنے کے لیے نہریں بنائی ہیں انہیں مصطفٰے سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے الفاظ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے۔ کہ اسے معلوم ہے وہ کس لیے وہاں جمع ہوئے ہیں۔ آنسو ہی کافی تھے۔ ان کی کہانی آنسوؤں کی زبانی بیان ہوتی رہی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہ سڑک تھی جس پر میں نے بار ہا سفر کیا تھا۔ اور میرا اس قدر باقاعدگی سے آنا جانا اتنا بے رنگ اور بیزار کن ہوا کرتا تھا۔ وہی سڑک آج نئی امید کا استعارہ معلوم ہو رہی تھی۔

ہم اسلام آباد میں مسٹر صدیق بٹ کے گھر کی طرف جا رہے تھے جو مصطفٰے کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جتنی دیر مصطفٰے اڈیالامیں قید رہا تھا۔ ان کے گھر کو میں نے اپنے اڈے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ان کے خاندان کی طرف سے مجھے ڈھیروں محبت ملی تھی۔ اس دن کے واقعات سے واضح طور پر بے حال ہو کر مصطفٰے نے مجھ سے کہا: "تہمینہ، تمہیں پتہ ہی ہے۔ اگر تم میرا ساتھ نہ دیتیں تو آج میں یہاں نہ ہوتا"۔

مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں کہنا چاہتی تھی کہ یہی بات مجھ پر بھی صادق آتی ہے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اگر وہ میرا ساتھ نہ دیتا تو آج میں یہاں نہ ہوتی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے جو کیا ٹھیک کیا اور صحیح وجہ سے کیا۔ مصطفیٰ نے جو کیا ٹھیک کیا لیکن غلط وجہ سے کیا۔

باب - ۲

کھر بمقابلہ کھر

(1985ء - 1986ء)

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میں مصطفیٰ سے دوسرے بار علیحدہ ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے منانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا کے دیکھ لیا۔ اس نے اپنی چرب زبانی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جن لوگوں نے سارے معاملے کو بہت قریب سے دیکھا تھا اس نے نہیں باور کرا دیا کہ حقیقت کچھ اور تھی۔ ہم سب کو جو فریبِ نظر میں مبتلا تھے نظر کچھ اور آ رہی تھی۔ سچ وہی تھا جو مصطفیٰ کی زبان پر تھا۔ مجھے احساس تھا کہ مصطفیٰ اسی قسم کی چالیں چلے گا اور میں نے بساط بھر دل کڑا کر کے خود کو اس کے سامنے ڈٹے رہنے کے لیے تیار کر لیا۔

وہ میرے دوستوں اور میرے اہلِ خاندان کو اپنا ہم نوا بنانے میں مصروف رہا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ خود کو بدلے گا، پچھلی زیادتیوں کی تلافی کرے گا۔ اس نے انہیں یقین دلا کر چھوڑا کہ میرا رویہ غیر حقیقت پسندانہ ہے، میں اڑیل پنے پر اتر آئی ہوں اور رائی کا پہاڑ بنا رہی ہوں۔

رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آنے لگا کہ شادی کو جو مرکزی نکتہ دوام بخشتا ہے وہ لازمی طور پر یہ نہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے سوا کبھی کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ شادی کی پائداری باہمی اعتماد اور باہمی عزت پر منحصر ہے۔ مجھے مصطفیٰ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پر جو بھروسا تھا اسے مصطفیٰ نے خود ہی ٹھیس پہنچا کر ختم کر دیا تھا۔ اب وہ میرے لیے قابلِ احترام ہستی نہ رہا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا اور اس بنا پر میرے دل میں اس کی عزت اور بھی تھوڑی ہو گئی۔

مصطفیٰ نے دل موہ لینے والی خوش خلقی سے کام لے کر میری امی کے ناز اٹھانے شروع کر دیے۔ اسے ان کی حمایت درکار تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ مجھے سہارا دینا چھوڑ دیں تو میں اس کی بانہوں میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ وہ بڑی استادی سے ان کے ذہن میں میرے خلاف زہر گھولتا رہا۔ ان سے کہتا کہ وہ جو کچھ ان کے علم میں لا رہا ہے اسے اپنے تک ہی رکھیں۔ مجھے منا لینے کا جو تھوڑا بہت امکان ابھی موجود تھا وہ اسے بھی اپنی حرکتوں سے زک پہنچا رہا تھا۔ مجھے نظر انداز کرنا اس کی غلطی تھی۔ اگر وہ اپنی تمام توجہ براہ راست میرے ذہن پر مرکوز کیے رکھتا تو شاید بہت پہلے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔

جو کچھ وہ میری امی کے بارے میں مجھ سے کہتا رہتا تھا میں کبھی اسے امی کے گوش گزار کرنے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ انہیں نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ خاندان میں انہیں جو بالادستی حاصل تھی اس کے بارے میں اس کی رائے حد درجہ مکروہ تھی۔ جب کبھی میں مصطفیٰ کے سامنے ڈٹ جاتی تو وہ کہتا کہ "گھر میں ثمینہ گردی کے اس دور دورے کو ختم ہونا چاہیے" (ثمینہ میری امی کا نام ہے)۔ وہ بالکل نہ چاہتا تھا کہ میں اپنی امی جیسی بن جاؤں اور جب بھی ہم میں تو تو میں میں ہوتی وہ میری امی کو گالیاں دینے لگتا۔ وہ بڑے یقین سے کہتا کہ ہمارے خاندان کو تباہ و برباد کرنے کی تمام تر ذمے داری انہیں پر عائد ہوتی ہے۔

اس کے باوجود ان سے بات کرتے وقت وہ ان کا پورا احترام ملحوظ رکھتا اور انہیں یہ احساس دلاتا کہ وہ بہت اہم ہیں۔ ان کی انا کو تسکین پہنچاتا، انہیں ماں جی کہتا اور بتاتا کہ ان کے سوا وہ دنیا میں کسی عورت کی عزت نہیں کرتا اور یہ کہ "آپ ہی ہیں جو تہمینہ کے معاملے میں میری مدد کر سکتی ہیں"۔

جب ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں تو اس نے غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جتوئی صاحب مصطفیٰ کے سب سے پرانے اور سب سے قریبی دوست تھے۔ انہیں یہ سکھا پڑھا کر بھیجا گیا کہ ہمارے تعلقات کی تجدید کی شرائط طے کریں۔ میرے والد نے صورتحال کا اندازہ لگاتے ہوئے کوئی لگی لپٹی نہ رکھی۔ "میں سمجھتا ہوں کہ یہ شادی ناکام ہو چکی ہے۔ بہتر یہی ہو گا کہ طلاق کی شرائط پر گفت و شنید کی جائے"۔

جتوئی صاحب نے جا کر مصطفیٰ کو مطلع کر دیا کہ مصالحت ممکن نہیں اور اب اسے طلاق کے معاملات طے کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

مصطفیٰ سمجھ گیا کہ شادی ختم ہو گئی۔ لیکن شکست قبول کرنا اس کی سرشت میں نہیں۔ اسے لگا کہ اس کی مردانہ انا خاک میں ملنے کو ہے۔ اس کے اندر جو جاگیردار چھپا بیٹھا تھا وہ ایک شیطانی منصوبہ گانٹھتا ہوا باہر نکل آیا۔

کچھ عرصہ یہ منصوبہ طاق پر دھرا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ میری طرف سے کچھ اور اشارے مل جائیں جن سے ظاہر ہو کہ کوئی امید باقی نہیں رہی تو پھر وہ عملی قدم اٹھائے۔ میں نے اسے ایک ایسا ہی اشارہ فراہم کر دیا۔

میرے گھنے بال اتنے لمبے تھے کہ گھٹنوں تک آتے تھے۔ مصطفیٰ ان پر دیوانہ وار فدا تھا۔ وہ جاڑوں میں مجھے آگ کی طرف پیٹھ کر کے کبھی نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس طرح میرے بالوں پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ وہ قطعاً نہ چاہتا تھا کہ انہیں ذرا سا بھی کٹوایا جائے اور اس نے متعدد بار مجھ سے وعدہ لیا کہ میں نہ تو انہیں کبھی کٹواؤں گی نہ گندھواؤں گی۔ میرے بالوں پر وہ دل و جان سے گرویدہ تھا۔

ایک صبح آنکھ کھلتے ہی میرے دل میں یہ عجیب خواہش بیدار ہوئی کہ مجھے اپنے بالوں سے، جن پر وہ فریفتہ تھا، چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ میں نے ایک ہیئر ڈریسر کے پاس جا کر کہا کہ ان کی ایسی تیسی کر دو۔ بیچارے ہیئر ڈریسر نے مجھے باز رکھنے کی بتیری کوشش کی۔ وہ بہت پریشان ہوا اور اپنا سر جھٹکتا رہا۔ میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ مجھے اپنے بالوں سے پیار تھا۔ چودہ سال کی ہونے کے بعد میں نے انہیں ایک بار بھی نہیں کٹوایا تھا۔ لیکن جب ان پر قینچی چلنی شروع ہوئی تو مجھے لگا کہ مصطفیٰ کا بھاری دباؤ دور ہٹتا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بال نہیں کٹ رہے بلکہ بدروح اتارنے کا کوئی عمل جاری ہے۔ اب میں اس کی خبیث روح کے حصار سے باہر نکل آئی تھی۔

جب مصطفیٰ تک یہ خبر پہنچی کہ میں نے بال کٹوا دیے ہیں اور وہ گھٹنوں تک آنے کے بجائے صرف کندھوں تک رہ گئے ہیں تو وہ میری اس حرکت کی معنویت سمجھ گیا۔ میرا یہ فعل یقیناً ہماری شادی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف تھا۔ میرے بالوں کے بغیر مصطفیٰ پر کسی ناتواں سیمسن کا گمان ہوتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ میں اس کی گرفت سے نکلی جا رہی ہوں۔ اسے کچھ کرنا پڑے گا اور وہ بھی ڈرامائی انداز میں۔ اسے مجھ پر یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ مجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے دنیا بھر سے ٹکر لینے کو تیار ہے۔ اس نے دوبارہ ڈرائینگ بورڈ کا رخ کیا اور مجھے منانے کی اپنی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

زبردست سکیم کی نوک پلک کو آخری بار سنوارا۔

میرے بچے ان دنوں میرے ساتھ میری والدہ کے ہاں رہتے تھے۔ میں نے انہیں عدالت کی سرپرستی میں دے رکھا تھا۔ یہ کارروائی مصطفےٰ کے کردار کے پیش نظر ناگزیر ہو گئی تھی۔ میں بچوں کی حد تک اب اس پر اعتبار نہ کر سکتی تھی۔ میں محسوس کرتی تھی کہ بچوں کو باپ سے ملتے تو رہنا چاہیے لیکن اس طرح کہ انہیں قانونی تحفظ حاصل رہے۔ اسے اتنی اجازت ملی تھی کہ وہ ہر اتوار انہیں گھمانے پھرانے لے جا سکتا ہے۔ بچوں اور باپ کی ملاقات کے اوقات متعین کر دیے گئے تھے۔ وہ تینوں بڑے بچوں کو صبح لے جا سکتا تھا اور انہیں اسی شام گھر پہنچانا ضروری تھا۔

عید سے ایک دن پہلے کی بات ہے۔ مصطفےٰ اور بچوں نے لِورپول میں ایک تفریحی پارک جانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ بچوں پر بڑا جوش طاری تھا۔ مصطفےٰ آیا۔ اس نے بچوں اور میری والدہ کے ملازموں کو عیدی دی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح مجھے بھی عیدی بھجوائی۔ اس بات نے میرے دل پر اثر کیا۔ حالات نے جو کروٹ لی تھی اس کا مجھے غم تھا۔ میں اس کے ساتھ ہمدردی کر سکتی تھی۔ میں نے ذہن ہی ذہن میں اس کی تصویر بنائی کہ وہ ایک لٹا پٹا آدمی ہے جو جلاوطنی میں تن تنہا نامساعد حالات سے نبردآزما ہے۔ اس نے بچوں کو کار میں لادا اور تفریحی پارک کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے توقع تھی کہ بچے اسی شام ساڑھے چھ بجے تک گھر آ جائیں گے۔ کوئی ساڑھے سات کے قریب مجھ پر پہلی دفعہ گھبراہٹ کا دورہ پڑا۔ بچے ابھی تک گھر نہ لوٹے تھے۔ میں نے مصطفےٰ کے ایک دوست کو فون کیا تو مجھے بتایا گیا کہ مصطفےٰ اور بچے دیہات کی طرف نکل گئے ہیں۔ وہ صرف اڑتی اڑتی سی بعض تفصیلات بتا سکا اور میرے قدرے بڑبڑائے ہوئے اعصاب کو تسلی نہ دے پایا۔ میں نے محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ کوئی بری خبر آنے کو ہے۔

کوئی آٹھ بجے فون بجا۔ میں اچھل کر فون کی طرف لپکی۔ مصطفےٰ بول رہا تھا۔ کہنے لگا کہ واپس آتے ہوئے کار ہائی وے پر خراب ہو گئی تھی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کار ٹھیک کرنے میں لگا ہوا تھا، میل بھر پیدل چل کر ایک فون بوتھ تک پہنچا تھا اور مجھے اس لیے فون کر رہا تھا کہ میں زیادہ نہ گھبراؤں۔

میرا پہلا ردعمل یہ تھا: "بچے کہاں ہیں؟" "میں ابھی ہائی وے سے آ رہا ہوں۔ انہیں سڑک کنارے بنی ایک اِن میں چھوڑ آیا ہوں۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ بس ذرا تھکے ہوئے اور نندائے ہیں۔ اس وقت وہ ڈنر کھا رہے ہیں۔" "تم نے تو ابھی کہا تھا کہ میل بھر چل کے آئے ہو۔ کہاں سے میل بھر چل کے آئے ہو؟" "کار سے، تہمینہ۔

لیکن کیوں؟ کیا ان میں ٹیلی فون نہیں ہے؟" "یہ بالکل ناقابل یقین بات تھی۔ اس کی سنائی ہوئی کہانی من گھڑت لگتی تھی۔ "نہیں۔ وہاں پہ فون نہیں ہے"۔ "یہ میں کیسے مان لوں۔ یہ انگلستان ہے، پاکستان کا کوئی دورافتادہ اجڑا ہوا علاقہ نہیں"۔ "وہاں پہ ٹیلی فون نہیں ہے" وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ "میں بچوں میں سے کسی سے بات کر سکتی ہوں؟" "نہیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ انہوں نے آج خوب مزے کیے۔ تھک کر چور ہو گئے ہیں۔ مجھے میل بھر واپس جانا اور پھر انہیں لے کر یہاں آنا پڑے گا۔ اب اتنی مصیبت کون اٹھائے۔ چین سے بیٹھو۔ بچے بالکل ٹھیک ٹھیک ہیں۔ سنو اب واپس جا کے دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں تقریباً گھنٹے بھر میں فون کروں گا"۔

فون بند ہو گیا۔ میں بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ اسے کیا سوجھی ہے؟ وہ یہ آنکھ مچولی کیوں کھیل رہا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ سچ بول رہا ہو؟ میں نے جان بوجھ کر کوئی برا خیال دل میں نہ آنے دیا۔

ساڑھے نو بجے رات۔ فون کی جھنکار نے میرے دکھتے ہوئے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مصطفےٰ دوبارہ بات کر رہا تھا۔ لہجہ بالکل پرسکون، دل جمعی سے بھرپور۔ "بچے گہری نیند سو رہے ہیں۔ میں پیدل چل کر واپس تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ پریشان مت ہو۔ انہیں اتنی دور ساتھ پیدل لے کر آنا مشکل تھا"۔ "تم ٹھیک کہاں پہ ہو مصطفےٰ؟ میں کار بھجوائے دیتی ہوں۔" اس نے بتایا کہ وہ ایم پندرہ یا ایسی ہی کسی سڑک پر ہے اور کہا کہ کار بھیجنے کی زحمت نہ کروں۔ وہ کار ٹھیک کرا کے جلد ہی گھر پہنچ جائے گا۔ اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ صورتحال مجھ پر عیاں ہو چلی تھی۔

میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے ایک دوست کو فون کیا کہ آیا ایم پندرہ کے راستے میں تفریحی پارک آتا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے برعکس، یہ سڑک بالکل ہی مختلف سمت میں جاتی ہے۔ میں نے سوچا، مصطفےٰ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا جھوٹ پکڑا گیا ہے۔ لیکن اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ بچے اس کے پاس ہیں۔ مجھ پر اب مکمل سراسیمگی غالب آ چکی تھی۔ ڈرا دینے والے خیالات موج درموج میرے ذہن پر وار کر رہے تھے۔ میں بیٹھ گئی۔ خوب گہرا سانس لو۔ سوچو، تہمینہ، سوچو۔

ساڑھے گیارہ بجے رات۔ مصطفےٰ کی طرف سے کوئی فون نہیں۔ ہمارے درمیان اب تک جو بات چیت ہوئی تھی میں نے اس پر اچھی طرح غور کیا۔ کوئی عجیب چکر چلایا جا رہا تھا۔ حالات پر مصطفےٰ کو ضرورت سے زیادہ کنٹرول حاصل ہو چکا تھا۔ اس کے لہجے سے اطمینان سا جھلکتا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس نے پھر فون کیا۔ اس بار میں نے امی سے اس کی بات کرائی۔ وہ انتہائی پُراعتماد تھا اور اس کی باتیں قائل کر دینے والی تھیں۔ اس نے میرے خدشات کو اعصاب زدگی کا نتیجہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اس نے امی کو بتایا کہ بچے بالکل خیریت سے ہیں۔ کار خراب ہونے کی پوری وجہ بڑی تفصیل سے انہیں سمجھائی۔ موقع محل کے لحاظ سے کہانی اس نے خوب گھڑی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھی طرح گھڑی تھی۔ وہ یہ سارا کھیل اس لیے کر رہا تھا کہ اسے کچھ مہلت مل جائے۔ وہ کرنا کیا چاہتا ہے؟

اس نے اپنی کہانی کو زیادہ قابلِ یقین بنانے کے لیے اس میں کئی پھندنے لگانے شروع کیے۔ "میں نے گھر پر ملازم سے کہہ دیا ہے کہ ہمارے لیے پائے تیار رکھے۔ میں نے اسے فون پر ہمارے انتظار کرنے کے لیے کہا ہے۔ میرا پورا ارادہ ہے کہ ڈنر کے وقت تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ اگر کار بگڑ گئی تو اس میں میرا کیا قصور؟"

مصطفیٰ کے فون بند کرتے ہی میں نے اس کے اپارٹمنٹ فون کیا۔ کسی نے فون اٹھایا تو سہی مگر جواب نہیں دیا۔ میں نے بار بار فون کیا۔ ہر بار فون اٹھایا جاتا مگر جواب نہ ملتا۔ آخر ملازم، جس کا نام فرید تھا فون پر بولا۔ میں نے پوچھا۔ "آج تم نے پائے پکائے ہیں؟" "نہیں، بیگم صاحب۔"

میں نے ریسیور نیچے رکھ کر ذہن پر زور دیا۔ وہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے؟ وہ ہے کہاں؟ میرے بچے کہاں ہیں؟ میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن اتنی مجھے خبر تھی کہ مصطفیٰ دھوکے اور فریب کا جال بننے میں مصروف ہے۔ اگلے دو گھنٹوں کے دوران کوئی فون نہ آیا۔

دو بجے رات۔ میں نے دوبارہ اپارٹمنٹ فون کیا۔ ملازم اتنا سہما ہوا تھا کہ بات ہی نہ کر سکا۔ مجھ پر لازم ہو گیا کہ میں کوئی ایسی زوردار بات کہوں جسے سنتے ہی وہ میرا پیغام فٹافٹ اپنے صاحب کو پہنچا دے۔ "فرید، میں تمہاری طرف پولیس بھیج رہی ہوں۔ پولیس والے تمہیں الٹا لٹکا کر اتنا ٹھوکیں گے کہ تم بک دو گے، چکر کیا ہے؟ اپنے صاحب کو بتا دو کہ مجھ سے پانچ منٹ میں بات کرے ورنہ میں پولیس کو ہر اس جگہ بھجوا دوں گی جہاں میرے بچوں کے موجود ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ سمجھ میں آیا؟" بیچارے نے کہا کہ وہ صاحب کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں نے فون بند کر دیا۔ تقریباً فوراً ہی گھنٹی بجی۔ مصطفیٰ بول رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ فرید نے اس تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مصطفیٰ اپنے ہی فلیٹ میں فرید کے پاس بیٹھا یہ ساری کہانیاں اس لیے گھڑ رہا تھا کہ ہم اس کا سراغ نہ لگا

سکیں؟ مصطفیٰ سے کچھ بعید نہ تھا۔

میں نے اس اثنا میں اپنے وکیل اور پولیس کو مطلع کر دیا اور پاکستان اپنے والد کو فون کیا۔ پورے خاندان کو چوکنا کر دیا گیا۔ ہماری عید عاشورے میں بدلتی جا رہی تھی۔

مصطفیٰ کے پاس کہنے کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس نے کہا کہ میں اپنے بگٹٹ تخیل کو لگام دوں اور مشورہ دیا کہ مجھے سو جانا چاہیے۔

پانچ بجے صبح۔ کافی کی ان گنت پیالیاں، ختم نہ ہونے والی قیاس آرائیاں۔ میری امی اور بہنیں منو اور روبینہ میرے پاس موجود تھیں۔ ہم سوچتے رہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ لندن میں پی آئی اے کے سٹیشن مینجر کو جگا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ میرے بچے کہیں کسی پرواز سے پاکستان نہ جا چکے ہوں۔ میرے والد ایئرلائن کے چیئرمین رہ چکے تھے۔ ہم ان کے عہدے کا رعب ڈال سکتے تھے۔ ہمیں اچانک خیال آیا کہ مصطفیٰ نے بچوں کو شاید پاکستان روانہ کر دیا ہو۔

سٹیشن مینجر نے ریکارڈ چیک کر کے ہمیں بتایا کہ تین بچے مختلف ناموں سے ہیتھ رو سے اسلام آباد جانے والے اس طیارے پر سوار ہوئے تھے جو پیرس رکتا تھا۔ بچوں کے ہمراہ ایک خاتون تھی اور مصطفیٰ کا بھائی، مسٹر غلام عربی کھر تھا۔ خاتون دائی عائشہ تھی، میرے بچوں کی آیا۔

مصطفیٰ صرف مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بچے جا چکے تھے۔ اس نے انہیں اغوا کر لیا تھا۔ جس ملک نے اسے سیاسی پناہ دی تھی اس ملک کے قوانین کی اس نے خلاف ورزی کی تھی۔ یہ ایک ایسے شخص کا فعل تھا جس نے جان پر کھیل جانے کی ٹھان لی ہو۔ اس نے مجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اپنی طرف سے آخری بڑا جوا کھیلا تھا۔ وہ اپنا کیریر، شہرت، آزادی، غرض کہ سب کچھ داؤ پر لگا چکا تھا۔

میں نے اپنے والد کو فون کیا۔ انہوں نے امی گریشن کنٹرول سے چیک کرنا چاہا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ مسافر کبھی کے جا چکے تھے۔

صبح چھ بجے۔ عید کا دن۔ مصطفیٰ کا فون آیا۔ اس نے میری امی سے بات کی۔ وہ رو رہا تھا۔ اس کے باوجود بات کرتے وقت اس کے لہجے سے خباثت جھلکتی تھی۔ "میں اپنے بچے لے گیا ہوں۔ میں نے انہیں پاکستان بھجوا دیا ہے۔ اب انہیں کسی طرح واپس نہیں لایا جا سکتا۔ اس مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ تہمینہ میرے پاس لوٹ آئے۔ میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ میں جانتا ہوں وہ کبھی میرے پاس واپس نہیں آئے گی۔ اسے واپس لانے کا یہی طریقہ رہ گیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بچوں کے بغیر نہیں رہ سکے گی"۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پھر اس نے مجھ سے بات کی۔ اس کا ضبط جواب دے گیا اور وہ رونے لگا۔ میرے لیے یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ وہ اذیت میں مبتلا ہے۔ اس نے جو کچھ کیا تھا وہ اس قدر خودغرضانہ تھا۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم سے بچے چھین لیے ہیں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے پاس لوٹ آؤ"۔

اس شخص کے ساتھ گفتگو جو میرے بچے اٹھا کر لے گیا تھا، بہت ہی ٹھٹھرا دینے والا تجربہ تھا۔ اس نے میرے بچوں کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ تاوان میں مجھ سے محبت مانگی جا رہی تھی۔ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مصطفےٰ کی اس حرکت سے میرے پاس اپنی مرضی سے کچھ کرنے کے امکانات کم رہ گئے ہیں۔ میرے سامنے اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ یا تو اس کے پاس لوٹ جاؤں یا اپنے تینوں بچوں کی صرف یاد کے سہارے جینا سیکھ لوں۔ معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ میرے سامنے عمل کے دونوں راستے سنگین اور دہشت ناک تھے۔ مجھے پتا چلا کہ بچے تو اسی صبح رخصت ہو گئے تھے اور مصطفےٰ نے پیرس سے واپس آ کر سارے فون ہمارے ہالینڈ پارک اپارٹمنٹ سے کیے تھے۔ اسے صرف یہ انتظار تھا کہ رات گزر جائے اور مجھے خبر ہونے اور میری طرف سے کوئی جوابی قدم اٹھائے جانے سے پہلے پی آئی اے کا طیارہ اپنی منزل پر پہنچ چکا ہو۔

مصطفےٰ کو پتہ تھا کہ اس حرکت کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔ اس نے احتیاط سے ذرا بھی کام نہ لیا۔ وہ ایک بار پھر یہ جتانا چاہ رہا تھا کہ قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور یہ کہ قانونی باریکیوں کے لیے اس کے پاس صرف حقارت ہی حقارت ہے۔ اسے پتہ تھا کہ میں نے وکیلوں سے رابطہ قائم کر لیا ہے اور پولیس کو خبردار کر چکی ہوں۔ فون پر مجھ سے بات کر کے وہ انگلینڈ چھوڑ گیا جہاں اس نے عدالت کے زیرِحفاظت بچوں کو اغوا کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ بذریعہ طیارہ پیرس جا کر روپوش ہو گیا۔ پیپلز پارٹی کے جس نیٹ ورک کو اس نے سالہا سال کی محنت سے تشکیل دیا تھا وہی اب اس کی نگہداشت اور حفاظت کا ذمے دار تھا۔

وہ ہمیں برابر فون کرتا رہا۔ فون کرنے کے لیے ہمیشہ مختلف بوتھ استعمال کرتا۔ اس نے میری امی سے، مجھ سے، ملازموں سے، غرض کہ ہر کسی سے جو اس کی بات سننے پر آمادہ ہو گفتگو کرنی چاہی۔ ہمارے گھر میں اب اس کی حیثیت اچھوت سے زیادہ نہ تھی۔

میں نے اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ مجھے قانون کی تائید حاصل تھی۔ مصطفےٰ

قانون کو کچھ زیادہ ہی بار لات مار چکا تھا۔ اسے سبق سکھانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے انٹرپول کو یورپ میں موجود تمام پارٹی ورکروں کے ٹیلی فون نمبروں کی فہرست فراہم کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے انہیں کے پاس پناہ لے رکھی ہو گی۔ پولیس نے پیرس، برسلز اور جینیوا میں چھاپے مارے۔ پولیس پکڑ دھکڑ کی غرض سے جتوئی صاحب کی ڈنر پارٹی میں بھی مخل ہوئی۔ جتوئی صاحب کو مصطفےٰ کی حرکت کا علم اس وقت ہوا جب وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ پورے یورپ میں مصطفےٰ کو سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا تھا۔

"شکاری" خود "شکار" بن گیا تھا۔ مصطفےٰ کہیں ایک جگہ نہ ٹھہرتا۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ تلاش میں نکلے جاسوسوں سے ایک قدم آگے رہتا تھا۔ اس کی ہر طرح کمبختی آئی ہوئی تھی۔ انگلینڈ جائے تو وہاں جیل ہو سکتی تھی۔ پاکستان جائے تو پھانسی چڑھنے کا اندیشہ تھا۔ یورپ محفوظ نہ رہا تھا۔ اس کے پاس وقت بہت کم بچا تھا۔ مجھے منانا اس کے لیے انتہائی ضروری ہو گیا تھا تاکہ اسے جاسوسوں سے بھی نجات مل جائے اور میں بھی اس کے پاس لوٹ آؤں۔ میری ہی طرح اس کے لیے بھی راہ عمل بہت محدود اور دشوار ہو کر رہ گئی تھی۔

میں بچوں کی خیروعافیت کے بارے میں سخت فکرمند تھی۔ وہ ایک اجنبی ماحول میں جا پہنچے تھے اور والدین ان کے ساتھ نہ تھے۔ مجھے یہ فکر لاحق رہنے لگی کہ انہیں خوراک کیسی ملتی ہو گی، تعلیم کا کیا بندوبست ہو گا، گرمی کتنی لگتی ہو گی، حفظانِ صحت کا کتنا خیال رکھا گیا ہو گا۔ ان کے اچانک چلے جانے کی وجہ سے مجھے فرصت ہی فرصت تھی۔ میں بیٹھی ان کے بارے میں سوچتی اور پریشان ہوتی رہتی۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کراچی یا لاہور میں نہیں۔ میڈیا کے وارے نیارے ہو گئے۔ میرے بچوں کی تصویریں روز اخباروں میں چھپنے لگیں۔ انہیں کسی شہری مرکز میں رکھنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مصطفےٰ کے گاؤں میں ہیں جہاں انہیں لامحدود عرصے تک رکھا جا سکتا تھا۔

میرے والد نے بچوں کی واپسی کے لیے پاکستان میں اقتدار اعلیٰ پر فائز شخصیتوں سے رابطہ قائم کیا۔ وہ جنرل ضیاء سے ملے۔ انہوں نے پیر پگاڑا، جنرل فضل حق اور جنرل عارف سے بات کی۔ انہوں نے وزیراعظم، مسٹر جونیجو سمیت ان تمام شخصیات سے ملاقات کی جو اس سلسلے میں مدد کر سکتے تھے۔ کوئی بھی ان کی مدد نہ کر سکا۔ اغوا ہونے والے بچوں میں دو لڑکیاں تھیں۔ جاگیردار کسی ایسی کارروائی کی حمایت کرنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے جس کے ذریعے کسی ساتھی جاگیردار کو اپنی بیٹیاں اپنے پاس رکھنے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ کسی عورت کے اغوا سے تشدد کے ایسے پیچ در پیچ سلسلے کا آغاز ممکن تھا جو نسل درنسل جاری رہ سکتا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مصطفےٰ کھر فوجی حکومت کا سیاسی حریف تھا۔ جنرل ضیاء ہماری مدد کرنے سے اس لیے گریزاں تھا کہ اس کے خیال میں اس طرح کی کارروائی سے مصطفےٰ سیاسی فائدہ اٹھائے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ وہ بے گناہ ہے اور حکومت اسے ستا رہی ہے۔ اہل اقتدار کو اس مقدمے کے حقائق کے بارے میں بھی یقین سے کچھ پتہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ ایسے معاملے میں، جو ان کی نظر میں محض گھریلو لڑائی جھگڑا تھا، فریق نہ بننا چاہتے تھے۔ مصطفےٰ نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بیٹیاں مغرب میں پلیں بڑھیں۔ وہ چاہتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اسلامی روایت کے مطابق ہو۔ اسے پتہ تھا کہ اتنا کہنے کے بعد راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ اس سے کوئی بازپرس نہ ہوگی۔ وہ درمیانے طبقے کے اس بہت بڑے حصے کی جذباتیت سے کھیل کر اپنا الّو سیدھا کر رہا تھا جو سمجھتا ہے کہ مغرب بدکاری اور اخلاقی انحطاط کا گڑھ ہے۔ اس طرح اس نے اہل اقتدار کو دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں عوام کے اس طبقے کو ناراض کرنے کا حوصلہ کہاں تھا جس کے طفیل وہ حکومت کر رہے تھے۔

اتنے میں مصطفےٰ نے پھر مجھے فون کیا۔ اس نے بڑے سکون بھرے لہجے میں مجھ سے کہا کہ مسئلے کا حل بہت سادہ ہے۔ مجھے بس اتنا کرنا ہے کہ اس کے پاس چلی آؤں اور ہم پہلے کی طرح مل جل کر رہنے لگیں گے۔ بحران کو حل کرنے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ خاندان کی پرانی حیثیت بحال کر دی جائے۔ میں اس شخص کی ڈھٹائی پر دنگ رہ گئی۔ مجھے اس کی جوڑتوڑ کی ان باتوں سے نفرت تھی۔ یہ سارا ڈراما، جو صرف اس لیے کھیلا جا رہا تھا کہ مجھے اس کے پاس لوٹنے پر مجبور کر دیا جائے، نہایت خودغرضانہ تھا۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں کس قسم کے احساسات رکھتا ہو گا۔

اخبارات مصطفےٰ کے بیانات سے بھرے پڑے تھے جن میں اس نے خود کو قدامت پسند کے روپ میں پیش کیا تھا۔ یہ بھی اپنے اصل مقاصد چھپانے کے لیے دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف تھا۔ میں نے قسم کھائی کہ اس سے لڑتی رہوں گی۔

اس نے دوبارہ یورپ کی کسی جگہ سے فون بوکس سے فون کیا۔ میں بولی: "اگر تم مسٹر کھر ہو تو میں بھی مسز کھر ہوں۔ اگر تم نے بھٹو سے چال بازی سیکھی ہے تو میں نے تم سے۔ تم مجھے بلیک میل کرو گے تو میں بھی بلیک میل کروں گی۔ میں صورحال کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گی۔ تمہیں بچ کر نہ جانے دوں گی"۔ میں نے مصطفےٰ کے خلاف اغوا کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا۔ میں نے پولیس سے کہا

کہ اسے گرفتار کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ میرے بچوں میں سے دو برطانوی شہری تھے۔ ہم نے پاکستان میں برطانوی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ بچوں کو ڈھونڈ کر انگلینڈ ہمارے پاس بھجوانے میں ہاتھ بٹائیں۔

مجھ پر جنون سوار تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے نفرت محسوس کی۔ خالص ترین نفرت جس میں کسی اور چیز کی آمیزش نہ تھی۔ میری امی پہلے چاہتی تھیں کہ میں مصطفےٰ کے پاس واپس چلی جاؤں لیکن اب انہیں بھی اس کی ناہنجاریوں کا یقین آ گیا تھا۔ لیکن انہوں نے مصطفےٰ سے نفرت کرنے کی انوکھی ہی وجوہ تلاش کر لی تھیں۔ انہیں اس مکروہ جرم سے اتنی پریشانی نہیں تھی، زیادہ غصہ اس بات کا تھا کہ مصطفےٰ بچوں کو ان کے گھر سے بھگا کر لے گیا تھا۔ یہ بات ناقابل معافی تھی۔ کسی شریف آدمی سے اس طرح کی حرکت متوقع نہیں۔ اس نے ان کے بھروسے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی جسارت کی تھی۔ ان کے ذہن میں شائستگی کے جتنے تصورات تھے یہ حرکت ان سب کی نفی تھی۔ انہوں نے اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور میری ہر کارروائی کی حمایت کی۔ وہ اسے سیاسی طور پر خاک میں ملا دینا چاہتی تھیں۔

ہماری یہ جنگ روزانہ چوبیس گھنٹے جاری رہنے والی جنگ تھی۔ میری بہن منّو بھی میرے پاس آ گئی تھی۔ میرے پاس آ جانے سے اس کی شادی کشیدگی کا شکار ہو گئی لیکن اس نے اپنی تمام ترجیحات میرے لیے وقف کر دیں۔ جب یہ ہنگامہ جاری تھا تو میں نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے یہ ہوش ہی نہ تھی کہ میں فاقہ کر رہی ہوں لیکن جب پانچ دن گزر گئے تو سب لوگوں پر انکشاف ہوا کہ میں نے تو اس عرصے میں کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔ جب میں نے کھانے کی کوشش کی تو قے ہو گئی۔ مجھے ولنگٹن ہسپتال لے جایا گیا جہاں میرا اشتہا بستگی (ANOREXIA) کے شعبے میں علاج ہوا۔ میں ہفتے بھر ہسپتال میں رہی۔

مصطفےٰ براعظم یورپ میں ڈانواں ڈول پھرتا رہا۔ انٹرپول اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس نے ہم سے میل رکھا لیکن اس کی بات چیت زیادہ تر ہمارے ملازموں سے ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں اس نے ہر اس شخص سے رابطہ قائم کیا جو مجھ پر اثرانداز ہو کر مجھے اس کے پاس لوٹ جانے پر راغب کر سکتا ہو۔

اس موقع پر مجھے صرف یہی فکر تھی کہ کسی طرح مصطفےٰ گرفتار ہو جائے۔ میں نہ صرف حیران تھی کہ بچوں کا کیا حال ہے بلکہ یہ بھی ٹھیک ٹھیک جاننا چاہتی تھی کہ انہیں اغوا کیسے کیا گیا تھا۔ تفصیلات کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا۔ بظاہر مصطفےٰ نے بچوں سے کہا تھا کہ وہ انہیں ڈزنی لینڈ دکھانے لے جائے گا۔ وہ اس منصوبے کے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بارے میں چپ سادھے رہے۔ مصطفٰے نے کہہ دیا تھا کہ اگر انہوں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تو ممکن ہے میں جانے کی اجازت نہ دوں۔

اس فیصلہ کن صبح وہ انہیں کار میں بٹھا کر ہوائی اڈے لے گیا۔ سازش میں اس کا بھائی، غلام عربی کھر، شریک تھا جو چند روز پہلے چھٹیاں گزارنے انگلینڈ پہنچا تھا۔ بچے اپنے والد، چچا اور آیا کے ساتھ پی آئی اے کے ایک طیارے پر سوار ہوئے۔ مصطفٰے خود کو بڑے بھاری خطرے میں ڈال رہا تھا۔ وہ پی آئی اے کی پروازوں کے کبھی پاس بھی نہ پھٹکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر پاکستان میں حکام کو خبر ہو گئی کہ مصطفٰے کھر طیارے پر سوار ہے تو وہ حکم دیں گے کہ پی آئی اے کی پرواز کا رخ پاکستان کی طرف موڑ دیا جائے۔

رستے میں مصطفٰے انہیں بتاتا رہا کہ ڈزنی لینڈ کتنا حیرت انگیز ثابت ہوگا اور مکی ماؤس سے مصافحہ کرنے میں کتنا مزا آئے گا۔ طیارہ شیڈول کے مطابق پیرس رکا۔ مصطفٰے نے بچوں سے کہا کہ اسے پیرس میں کچھ کام ہے۔ اس لیے وہ طیارے سے اتر رہا ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ امریکہ میں ان سے آملے گا۔ بچے بہت پریشان ہوئے اور رونے لگے۔ مصطفٰے پیرس اتر گیا اور کسی اور پرواز سے لندن چلا آیا۔

بچے اکیلے رہ گئے۔ چچا ان کے لیے نسبتاً اجنبی تھا۔ وہ اس سے دوسرے دفعہ ملے تھے۔ دائی عائشہ سے وہ مانوس تھے۔ انہیں ڈر تو لگ رہا تھا لیکن ڈزنی لینڈ کے تماشوں کے خیال سے خوش خوش بیٹھے رہے۔

طیارہ اسلام آباد اترا، جولائی کا مہینہ تھا۔ درجۂ حرارت سو سے بھی اوپر پہنچا ہوا تھا۔ میرے بچوں کو اس سے پہلے جولائی کی کسی واقعی جھلس دینے والی سہ پہر سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ ان کے چہروں پر لو کے تھپیڑے لگنے شروع ہوئے۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ وہ حیران رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ امریکہ اتنا گرم اور اتنا--- یوں کہہ لیجیے، پسماندہ ہوگا۔

میرے بیٹے علی نے مجھے بتایا کہ سب سے پہلے اسے کئی پاکستانی ڈھیلی ڈھالی شلواروں میں ملبوس نظر آئے جو کسی طرح امریکہ پہنچے ہوئے تھے۔ اسے اتنا پتہ تھا کہ وہ غریب پاکستانی ہیں کیوں کہ انہوں نے میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اگر ان کے دل میں مواقع سے پُر سرزمین کے بارے میں کچھ خوش فہمیاں تھیں بھی تو وہ شدید گرمی کی لہر سے پہلی بار دوچار ہونے کے بعد مرجھا کر رہ گئیں۔

بچوں کو لینے کے لیے ہوائی اڈے پر ایک اور چچا یعنی غلام مرتضٰے کھر موجود تھا جو

قومی اسمبلی کا رکن بھی تھا۔ وہ کوئی ترکیب لڑا کر انہیں اڈے سے نکال لے گیا اور ان کے پاسپورٹوں پر مہر لگنے کی رسمی کارروائی کی نوبت بھی نہ آنے دی۔ مصطفٰے نہیں چاہتا تھا کہ بچوں کی آمدورفت کے حوالے سے کہیں پر اس طرح کے شواہد باقی رہنے دیے جائیں جن سے بعد میں الجھنیں پیدا ہوں۔

پھر انہوں نے چھ گھنٹے تک کار میں سفر کیا۔ انہیں سیدھے مصطفٰے کے گھر لے جایا گیا۔ وہ نئے لوگوں کے درمیان تھے۔ ممی اور ڈیڈی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ انہیں یہ علم تھا کہ یہ سارا ڈراما صرف اس لیے رچایا گیا ہے کہ میں نے ان کے باپ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ وہ خوفزدہ تھے کہ ممکن ہے مجھ سے دوبارہ کبھی ملنے کا موقع نصیب نہ ہو۔ اس بات کا سب سے شدید احساس میری بیٹی نصیبہ کو تھا۔ لیکن وہ نڈر بنی رہی اور اپنے ہراس کو پی گئی، صرف اس لیے کہ چھوٹا بھائی اور بہن دونوں دہشت زدہ نہ ہوں۔

انہیں گاؤں میں چھپا دیا گیا۔ میری بیٹیوں نے اس بات کا برا مانا کہ انہیں گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ میرے بیٹے، علی، کو گھر سے باہر کھیلنے کی اجازت تھی۔ وہ کھڑکی میں سے اسے کھیلتے دیکھتی رہتیں۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ لڑکیاں صرف چھ اور آٹھ سال کی تھیں۔ وہ لڑکیاں تھیں اور انہیں نظروں سے اوجھل رہنا چاہیے تھا۔ جاگیردارانہ ریت یہی تھی اور اس پر عمل کیا جا رہا تھا۔ لڑکیوں کو باقی عورتوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا جو بظاہر اپنی تقدیر کے لکھے کے سامنے سر جھکا چکی تھیں۔

بچوں کو اپنا دیسی گھر بہت گندا اور حفظان صحت کے لحاظ سے بہت نامعقول نظر آیا۔ ان کا پہلی بار ڈھیٹ مکھیوں اور مچھروں سے واسطہ پڑا۔ جو انہیں ملتا وہ میلا کچیلا ہی ہوتا۔ بچے ہمیشہ گندے دکھائی دیتے۔ ان کے کپڑے گھسے پٹے اور عموماً سلوٹوں بھرے اور پھٹے ہوتے۔ سڑکیں کچی تھیں۔ کھلے گٹروں نے گارا اور گندگی ابل ابل کر باہر پھیلی ہوتی تھی اور ہر طرف کیچڑ اور گردوغبار کا راج تھا۔ نہ وہاں کوئی پارک تھا نہ ہرے بھرے قطعات جہاں جا کر کھیلا جا سکے۔ اس کے برعکس بچے تنگ گلیوں میں کھیلتے رہتے جہاں خارش زدہ نیم باؤلے کتے بیٹھے اپنی ہر وقت ہلتی دموں سے مکھیاں اڑایا کرتے۔ یہ دیہی حسن اور امن سے مالا مال کوئی مثالی گاؤں نہ تھا بلکہ بے برگ و نوا اور کٹھور سی جگہ تھی اور ہر اس چیز سے جو انہوں نے کبھی دیکھی ہو گی یا جس کے بارے میں سوچا ہو گا قطعی طور پر ماورا معلوم ہوتی تھی۔

بچوں کی نگرانی ان کے سوتیلے بھائی عبدالرحمن کے ذمے تھی۔ غلام عربی نے اس

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سارے بیہودہ معاملے سے خود کو الگ تھلگ کر لیا۔ مصطفےٰ نے اسے غالباً منا لیا تھا کہ ہماری شادی بچانے کی خاطر اغوا کے جرم میں اس کی اعانت ضروری ہے۔ بہرحال، پاکستان لوٹنے کے فوراً بعد عربی کی سوچ میں تبدیلی آ گئی۔ وہ اتنی آسانی سے مصطفےٰ کے فقروں میں آجانے پر پچھتایا اور ضمیر اس پر ملامت کرنے لگا۔ اس کے سننے میں آ چکا تھا کہ میں ہسپتال میں پڑی ہوں اور اس نے محسوس کیا کہ کسی ماں کے پاس سے بچوں کو چرا لانا بالکل غلط حرکت ہے۔ عربی جانتا تھا کہ اس ضمن میں مصطفےٰ کے محرکات قطعی خودغرضانہ ہیں۔ بچوں کے مفاد کا اسے کوئی خیال نہیں۔

غلام غازی کھر بھی گاؤں میں موجود تھا۔ اس نے بچوں کا خیال رکھا اور انہیں نئے ماحول کا عادی بننے میں مدد دینے کے لیے خاصا وقت ان کے ساتھ گزارا۔ اس کی مصطفےٰ سے بول چال نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنی بھتیجیوں اور بھتیجے کے لیے چاہت کا اظہار کیا۔ وہ بچوں کو اپنے گھر لے جاتا اور شکار کھیلنے نکلتا تو علی کو ساتھ رکھتا۔ اس نے میرے بیٹے کو ایک ٹٹو خرید دیا اور اسے سواری کرنی سکھائی۔

وڈیو فلموں کی مسلسل دستیابی سے لڑکیوں کا دل بہلا رہتا۔ کتابیں تو وہاں تھیں نہیں۔ لہذا ٹیلی وژن کا زور تھا۔ غلام مرتضےٰ کھر کی دونوں بیٹیاں میری بچیوں کی ہم عمر تھیں۔ ان میں گہری دوستی ہو گئی۔ مصطفےٰ کے بھائی بچوں سے بہت شفقت سے پیش آئے اور بڑی فیاضی سے ان کی ضروریات پوری کرتے رہے۔

جونہی مصطفےٰ کو خبر ملی کہ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ بچے کہاں پر ہیں اور میرے والد نے صدر سے رابطہ قائم کیا ہے تو اس نے فی الفور کارروائی کی۔ بچوں کو لاہور کے ہوائے اڈے لا کر فرضی ناموں کے تحت کراچی جانے والی پرواز پر سوار کرا دیا گیا۔

طیارے میں نصیبہ راز فاش کرتے کرتے رہ گئی۔ ایک ایرہوسٹس نے اس سے اس کا نام پوچھا۔ بچی کے منہ سے اصلی نام بس نکلتے نکلتے رہ گیا۔ اخباروں میں ان کے بارے میں بہت کچھ چھپ چکا تھا اور ان کے نام گھر گھر مشہور ہو چکے تھے۔ بچوں کا کہنا ہے کہ وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ کاش کوئی انہیں پہچان لے۔ جانے کیا بات ہوئی کسی نے انہیں پہچانا نہیں حالانکہ پریس میں ان کے اِدھر اُدھر دیکھے جانے کا ذکر آتا رہا۔

کراچی سے انہیں بذریعہ کار نواب شاہ میں جتوئی صاحب کے گاؤں پہنچا دیا گیا۔ وہاں وہ جتوئی صاحب کے بیٹے، مسرور، اور اس کی امریکی بیگم سارہ کے مہمان تھے۔ یہ جائے روپوشی زیادہ آرام دہ تھی۔ انہیں سارہ اچھی لگی کہ وہ انگلینڈ میں اسی جیسی عورتوں سے ملنے جلنے کے عادی تھے۔ وہ سارہ کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر سیر کرنے گئے اور

آزاد ہونے کے مزے لوٹے۔ بلحاظ سازوسامان اور صفائی یہ گھر اس جگہ سے بہتر تھا جہاں پہلے پہل انہیں چھپا کر رکھا گیا تھا۔

بچوں کو معلوم تھا کہ انہیں چھپا چھپا کر رکھا جا رہا ہے۔ جب ان کی کار کسی ٹریفک سگنل پر رکتی تو ان سے نیچے دبک جانے کو کہا جاتا تاکہ انہیں کوئی پہچان نہ لے۔ ان سب باتوں پر انہیں لازماً کسی بہت بڑی آنکھ مچولی کا گمان ہوا ہو گا جو دو براعظموں پر کھیلی جا رہی تھی۔

میں سمجھتی تھی کہ اس دوران میں بچے بہت پریشان اور ناخوش رہے ہوں گے۔ لیکن بچوں کو باتیں زیادہ دیر تک یاد نہیں رہتیں۔ جب وہ خود ان واقعات اور حادثات کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے ساتھ پیش آئے تھے تو انہیں یاد کر کے ہنستے ہیں اور ایسے کے ہلکے پھلکے اور مزاحیہ پہلو پر توجہ دینے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ کردار کا یہ رنگ انہیں مجھ سے ورثے میں ملا ہے۔ میرا رویہ بھی انہیں جیسا ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے سب سے صبرآزما اور کٹھن ادوار کی طرف مڑ کر نظر ڈالتی ہوں تو انہیں مزاحیہ سچویشنوں (SITUATIONS) میں بدل دیتی ہوں۔ چارلی چپلن والا انداز اپنا لینے سے زخموں کے اندمال میں مدد ملتی ہے۔

بہت سارے مہینے گزر جانے کے بعد مجھے اپنی آنکھوں یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ اس دوران میں میرے بچوں کا رویہ اور ذہنی کیفیت کیا تھی۔ غلام غازی نے انہیں ویڈیو پر ریکارڈ کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ جو کچھ پہلے پہل میں نے دیکھا اس پر مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا کہ میرے بچے جس سنگ دلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس کی مجھے ان سے امید نہ تھی۔ وہ نارمل معلوم ہو رہے تھے اور انہیں اس دکھ درد کا ذرا بھی احساس نہ تھا جو مجھے ان سے زبردستی بچھڑ جانے سے پہنچا تھا۔ میں حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگی کہ میں آخر واپس آئی ہی کیوں؟ وہ تو میرے بغیر بھی خوب مزے سے رہ رہے تھے۔ یہ تو میں تھی جو ان کے بغیر نہ جی سکتی تھی۔ ویڈیو میں وہ پلنگوں پر اچھلتے، کودتے اور کھیلتے نظر آئے۔ ان کے لیے ہر دن گویا عید، ہر شب شب برات تھی۔ علی بھی ہشاش بشاش تھے جن میں اسے بندوقیں صاف کرتے اور یابو پر چڑھے دکھایا گیا تھا۔ میں نے صورتحال کی عقلی توجیہہ کرنی چاہی۔ یہ خوشی عارضی نوعیت کی ہے۔ اس کے دیرپا رہنے کا امکان نہیں۔ اپنی دانست میں وہ ایک ہنگامہ خیز تماشے میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ تمام وقت کسی نہ کسی شغل یا تفریح میں محو رہتے ہیں۔ لیکن والدین کی علیحدگی سے پیدا ہونے والی کشیدگیاں ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہیں گی۔ اگر گوشۂ غفلت میں پڑے رہنے کا یہ عرصہ کچھ زیادہ طول کھینچ گیا تو وہ ناشاد اور دلگیر ہو کر رہ جائیں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تصیم اور نشا

گے۔ ان کی تعلیم کا حرج ہو گا اور ذہنی ترقی کا عمل رک جائے گا۔

ابھی میں ہسپتال میں تھی۔ اتنے میں خبر آئی کہ مصطفےٰ کو بروسلز کے ہوائی اڈے پر گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ سن کر مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ میری طبیعت الجھنے لگی۔ مجھے یاد ہے میں رو پڑی تھی۔ میں اس کے لیے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ مجھے دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں عام مجرم بن گیا تھا۔ اس شخص کی تہہ تک پہنچنا میرے لیے ناممکن تھا۔ ہماری شادی میں جو بگاڑ پڑا تھا اس میں تمام قصور اسی کا تھا۔ اسی کے اکسانے پر میں اسے چھوڑ کر آ گئی تھی۔ اب وہ زبردستی مجھے واپس بلانے کے درپے تھا۔ یہ آدمی جو وطن لوٹ کر سیاسی قیدی بن سکتا تھا اب گھٹیا قسم کے مجرموں کے ساتھ جیل میں بند تھا۔

مصطفےٰ جعلی پاسپورٹ پر بیلجیئم سے سوئٹزرلینڈ جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے زیرزمین روابط سے کام لے کر پاکستانی سفارت خانے سے کسی آدمی کا پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ پھر اس نے اس آدمی کا فوٹو اتار کر اپنا فوٹو چسپاں کر دیا۔ بروسلز میں امی گریشن کے حکام نے ایک مشین کی مدد سے اس جعل سازی کا سراغ لگا لیا اور مصطفےٰ پکڑا گیا۔ اسے نشہ خوروں اور معاشرے کے دوسرے اسفل ترین بچوں کے ساتھ حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ کہاں اڈیالا جیل کا مصطفےٰ کھر اور کہاں یہ مصطفےٰ کھر۔ دونوں میں کس قدر بعد تھا۔ واضح فرق یہ تھا کہ بروسلز میں وہ اس اخلاقی حوصلے سے محروم تھا جو اسے پاکستانی جیل میں سہارا دیتا تھا۔ صحیح رابطے قائم کرنے پر دو روح فرسا دنوں کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ مصطفےٰ اب بھی بڑے رسوخ والا آدمی تھا اور اس کے روابط ایسی جگہوں سے تھے جہاں کا کہا وزن رکھتا تھا۔ اسے بروسلز بدر کر کے جینیوا چلتا کر دیا گیا۔

ڈیڑھ مہینہ گزر چکا تھا۔ میں بچوں سے بات کرنے کو ترس گئی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اصل میں ہیں کہاں۔ یہ کہانیاں ہمارے سننے میں آتی رہتی تھیں کہ انہیں کسی ایک جگہ نہیں رکھا جا رہا۔ آج کہیں ہیں تو کل کہیں۔ آہستہ آہستہ میرے اوسان جواب دینے لگے۔ غصہ رفتہ رفتہ مایوسی میں بدلتا جا رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس بے یقینی کی کیفیت کو میں اور کتنی دیر برداشت کر سکتی ہوں۔

مصطفےٰ کو معلوم تھا کہ ایک دوسرے کو ستانے اور دق کرنے کی اس جنگ میں، جو ہم لڑ رہے تھے، میرا حوصلہ جواب دیتا جا رہا ہے اور وہ مجھے گفت و شنید پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اس نے مجھے فون کیا۔ اب وہ براہ راست بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ثالثوں کا ٹنٹا ختم کر دیا۔ یہ دو طرفہ مسئلہ تھا۔ اس کا تعلق صرف ہم دونوں سے تھا۔ ہم نے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بات چیت شروع کر دی۔

گفت و شنید کے ذریعے معاملے طے کرنے میں اسے کمال مہارت حاصل تھی۔ اس نے صاف صاف بتا دیا کہ میرے اختیار میں کیا ہے، کیا نہیں۔ کیا میں بچوں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر زندگی گزار سکتی ہوں؟ کیا میں انگلینڈ میں اکیلی خوش رہ سکوں گی، خاص طور پر جب مجھے یہی معلوم نہ ہو کہ بچوں پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا یہ بچوں کے ساتھ زیادتی نہ ہو گی؟ "میں پاکستان نہیں جا سکتا۔ بچوں کی پرورش میرے خاندان والے کریں گے"۔ مصطفیٰ معروضی حقیقت تشکیل دے کر میرے سامنے رکھ چکا تھا۔ ایجنڈا اس کا تیار کردہ تھا۔ مجھے اس کی چنی ہوئی حدود میں رہ کر فیصلے کرنے تھے۔

اس وقت تک میں جان چکی تھی کہ حکومت پاکستان ہماری مدد کرنے کے موڈ میں نہیں۔ وہ ایک ایسے معاملے کی خاطر جو ان کے نزدیک خالصتاً گھریلو اور نجی تھا مصطفیٰ کھر سے الجھنا نہ چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا احساس جرم مجھے کبھی نارمل زندگی بسر نہ کرنے دے گا۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ میرے بچے سامنے کھڑے ہو کر مجھ پر خودغرضی کا الزام لگا رہے ہیں۔ ایک بار پھر میں نے محسوس کیا کہ مصالحت کیے بغیر چارہ نہیں۔ اپنی انا کو قربان کرنا ہی پڑے گا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میری توانائی میں آہستہ آہستہ کمی آتی جا رہی ہے۔ میں نے جان لیا کہ داخلی طور پر مجھ میں اتنا دم خم نہیں کہ میں یہ ختم نہ ہونے والی پیکار جاری رکھ سکوں۔ کسی نہ کسی چیز نے تو جواب دے ہی جانا تھا۔ مصطفیٰ اس بات کو تاڑ گیا تھا۔ وہ میرے احساس جرم کو دوچند کرنے اور میرے اندیشوں کو ہوا دینے میں مصروف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر میری قوت مدافعت پر وہ اسی طرح مسلسل تھوڑا تھوڑا رندہ پھیرتا رہا تو میں مات کھا جاؤں گی۔ اس نے جلدی نہیں کی بلکہ بڑے اطمینان سے کارروائی جاری رکھی۔ وہ بالکل سیدھی سی چال چل رہا تھا یعنی مجھ سے ایک طرف تو گفت و شنید جاری رہے، دوسری طرف بچوں کو مجھ سے دور رکھا جائے۔ جتنا وقت درکار ہو لے لو۔ ذہن بالآخر ہتھیار ڈال دے گا۔ یہ وہی چال ہے جس سے کام لے کر بحرانی صورتحال میں گفت و شنید کے ماہر دہشت پسندوں اور ہائی جیکروں کے حواس شل کر ڈالتے ہیں۔

مصطفیٰ نے بتدریج اپنی ساکھ دوبارہ جما لی۔ شروع شروع میں اس کی باتیں مجھے غلط اور جھوٹی معلوم ہوئیں۔ میں اس کی گفتگو میں پوشیدہ طعنوں اور ذومعنی باتوں کو تلاش کرتی رہتی۔ جو کچھ وہ کہتا اسے ذہن میں دہراتی تاکہ اس کے بچھائے ہوئے خفیہ جال ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو سکوں۔ اس نے مجھے اپنی راز کی باتیں بتانی شروع کر دیں۔ وہ پاکستان لوٹنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ بات میں اپنی امی کو نہ بتاؤں۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

وہ محسوس کرتا تھا کہ اس انکشاف کے بارے میں ان کا ردعمل منفی نوعیت کا ہوگا۔ "تمہاری ماں تم سے جلتی ہے۔ اسے یہ بات ہضم نہیں ہو سکتی کہ میری بیگم کے طور پر تم پاکستان پہنچ کر کس قدر اہمیت کی مالک بن جاؤ گی۔ اسے پتہ ہے کہ میں بدل چکا ہوں۔ اسے پتہ ہے کہ میں سچ مچ ان زیادتیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں جو میں نے تم سے کی ہیں۔ وہ ہماری شادی کو توڑنا چاہتی ہے۔ اسے ہمارے بچوں کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی نظر میں وہ بالکل غیراہم ہیں۔ وہ صرف اس لیے تلملا رہی ہے کہ اس کی انا کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اسے زیادہ غصہ یہ ہے کہ میں اس کی موجودگی میں اس کے گھر سے بچوں کو لے گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی"۔

میری قوتِ مدافعت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ میری طرف سے لڑنے کی ذمے داری امی نے سنبھال لی۔ ان کا لہجہ میرے لہجے کے مقابلے میں زیادہ کڑا اور تلخ تھا۔ ان کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ مصطفٰے کے ناقابل تسخیر ہونے کے ڈھکوسلے کا قلع قمع کیے بغیر چین سے نہ بیٹھنا چاہتی تھیں۔ ان سب باتوں کا مجھ پر منفی اثر مرتب ہو رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ مجھے کچھ ذہنی سکون نصیب ہو۔ میں بچوں کو دیکھنے کے لیے ترس گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ امی نے جو رویہ اپنایا ہے اس سے مسئلے کا کوئی حل کیسے ممکن ہے۔ سب سے پہلے تو باہمی نوک جھونک اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے کے اس مقابلے کو ختم ہونا چاہیے تھا۔

مجھے پتہ تھا کہ مصطفٰے کی زد میں آنا خطرناک ہے۔ وہ اپنی منطق سے میرے عزم کو کمزور کرتا گیا۔ وہ رفتہ رفتہ میرے ذہن پر قبضہ جما رہا تھا اور ایک بار پھر مجھے برین واش کرنے میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر وہ باز نہ آیا۔ میرے خیال میں یہ جوا جیتنے میں وہ اس لیے کامیاب رہا کہ اِکا (یعنی بچے) اس کے ہاتھ میں تھا۔ جب اسے محسوس ہوا کہ میں موم ہو چلی ہوں تو اس نے مجھے بچوں سے بات کرنے کا موقع دیا۔

دو مہینے جوں توں کر کے گزر گئے تھے۔ 29 جولائی کو نصیبہ کی مجھ سے بات کرائی گئی۔ اس دن وہ آٹھ برس کی ہو گئی تھی۔ یہ ایک بہت جذباتی لمحہ تھا۔ اس کی وجہ سے میں بچوں کے اور زیادہ قریب ہو گئی اور طرفہ تماشا یہ کہ اسی نے مجھے مصطفٰے کی آغوش میں دھکیل دیا۔ "ہیلو، ممی۔" "نصیبہ، تمہارا کیا حال ہے؟" "ممی، یہاں بہت گرمی ہے۔" "بے بی، تم ہو کہاں؟" "میں یہ نہیں بتا سکتی۔ مجھے بتانے کی اجازت نہیں۔ آپ کو فون کرنے کے لیے ہمیں بڑی دور آنا پڑا۔ یہاں بہت ہی سخت گرمی ہے"۔ مجھے اس کے رونے کی آواز سنائی دی۔ "تمہارے پاس پڑھنے کے لیے کتابیں

ہیں؟" "نہیں۔" "تمہیں سالگرہ پر کوئی تحفہ ملا؟" "ہاں، مجھے روپے کے نوٹوں کا بنا ہوا ہار ملا۔ بڑا گھناؤنا ہے یہ ہار۔ مجھے اس سے گھن آتی ہے۔ ممی، یہاں اتنی زیادہ گندگی اور گرمی ہے۔ چاروں طرف اتنی ڈھیر ساری مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں۔ مجھے مکھیاں زہر لگتی ہیں"۔

اس بار میرا ضبط جواب دے گیا۔ "ممی، آپ سے کب ملنا ہوگا؟" "جلدی، نصیبہ"۔ "ممی، ہم واپس کیوں نہیں آ سکتے۔ ہم آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں۔ ہم گھر آنا چاہتے ہیں۔ مہربانی کر کے ہمیں واپس بلا لیں"۔ "جلدی"۔ میرا وعدہ مبہم اور کھوکھلا معلوم ہوا۔ اس نے تقاضا کیا کہ میں ٹھیک ٹھیک بتاؤں کہ جلدی سے کیا مراد ہے"۔ ہمیں یہاں اور کتنی دیر رکنا ہوگا؟" اور اس کے بعد ایک طویل خاموشی۔

مجھے لگا کہ میں بہت خودغرض ہوں۔ بھلا ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو دنیا میں لانے کی مجھے کیا پڑی تھی! وہ ہماری حماقتوں کی وجہ سے دکھ جھیل رہے تھے۔ میرے لیے ممکن نہ تھا کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دوں۔ آنول نال ایک دفعہ کٹنے کے بعد دوبارہ نہیں کاٹی جا سکتی تھی۔ میں نے جو موقف اختیار کر رکھا تھا اس کا میرے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ میری استقامت اسی میں پنہاں تھی کہ میں، صرف بچوں کی خاطر، اس شخص کے پاس لوٹ جاؤں۔

اس آدمی کی حیثیت کو گھن لگ چکا تھا۔ پولیس اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ اس کی شہرت گپ شپ کے اخباری کالموں کی زینت بنی ہوئی تھی۔ اس کا سیاسی کیریر جمود کی زد میں آ چکا تھا۔ جس ملک نے اسے سیاسی پناہ دی تھی اسی ملک کی میزبانی سے اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی خاصی درگت بن چکی ہے۔

اگلے دن جب اس نے مجھے جینیوا سے فون کیا تو میں نے پُرسکون اور نپے تلے لہجے میں اسے مطلع کیا کہ میں اس کے پاس لوٹ آؤں گی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور رو پڑا اور کہنے لگا کہ منشائے ایزدی یہی تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مثالی شوہر ثابت ہوگا اور ماضی میں جو طرزِ عمل اس نے اختیار کیے رکھا تھا اس کی تلافی کر دے گا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہیں کھڑے کھڑے فتح کا ناچ ناچنے لگتا۔ مجھے یقین ہے کہ جینیوا میں فون ہاتھ کی تنگی اس کے جوش و خروش کی راہ میں آڑے آئی ہوگی۔

یہی وہ آدمی تھا جس نے مجھے دھمکایا تھا کہ اگر میں ضد پر اڑی رہی تو مجھے خوفناک نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ اس سے پہلے ایک مرتبہ اس نے فون پر ایسی بات مجھ سے کہی کہ میں حواس باختہ ہو گئی۔ بہت ہی متانت آمیز اور خباثت بھرے لہجے میں مجھے لگا کہ میں نے تمہیں اغوا کرنے کا منصوبہ بنا یا ہے۔ "تہمینہ، میں تمہیں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

چھوڑنے والا نہیں۔ میں طیارہ چارٹر کر کے انگلینڈ میں اتروں گا۔ تمہیں اغوا کر لیا جائے گا۔ میں تمہیں قبائلی علاقے میں لے جاؤں گا جہاں قانون کی رسائی نہیں۔ ہم وہاں بچوں کے ساتھ رہیں گے۔ تم کھانا پکانا۔ میں شکار مار کے لاؤں گا اور چولہے کے لیے ایندھن بھی۔ میں سنجیدہ ہوں، تہمینہ۔ میں یہ کر کے رہوں گا۔ دیکھتی جاؤ۔" اس نے ساری باتیں اس قدر سنجیدگی سے کہیں کہ میرے ہوش جاتے رہے۔ میں نے فوراً پولیس انسپکٹر کو فون کر کے اس تازہ دھمکی کی خبر دی۔ مجھے پتہ تھا کہ مصطفیٰ اس سے بھی بری حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

مجھے ہمت نہ ہوئی کہ میں کسی کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر سکوں کہ میں مصطفیٰ کے پاس واپس جا رہی ہوں۔ امی نے میرے رویے میں آنے والی تبدیلی کو سونگھ لیا۔ انہیں بہت پریشانی ہوئی۔ اس صورتحال کی وجہ سے ان پر جنون کے دورے سے پڑنے لگے۔ ان کا موقف غیر معقول تھا۔ ان کے ساتھ ساتھ استدلال سے بات کرنا دیوار سے سر پھوڑنے کے مترادف تھا۔ لوگوں کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا جائے تو پھر، کسی نہ کسی طرح، انہیں آپ پر قبضہ جما بیٹھنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ جب آپ کوئی ایسا فیصلہ کریں جو ان کی مرضی کے خلاف ہو تو وہ اپنی گرفت اور سخت کر دیتے ہیں۔ میں نے طے کیا کہ آج کے بعد میں اپنے فیصلے آپ کیا کروں گی۔ میں دوسروں کی ٹھہرمی ہوئی صورتیں اختیار کرتے رہنے سے تنگ آ چکی تھی۔ مجھے حقیقت پسندانہ رویہ اپنانا تھا۔ ہم بچوں کو حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔ کوئی چیز ان کی بہبود سے زیادہ اہم نہ تھی، خاص طور پر میری اپنی انا تو بالکل اہم نہ تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ ایک نہ ایک دن مصطفیٰ اس ذلت کا انتقام لے کر رہے گا جو اسے میری وجہ سے اٹھانی پڑی تھی۔ لیکن میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاطر، جنہیں کوٹ ادو میں چھپا کر رکھا گیا تھا، یہ خطرہ مول لینے کو تیار تھی۔

امی نے کوشش کی کہ مجھے امریکہ لے جائیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ میرے والد، جو پاکستان میں تھے، سمجھ گئے کہ اس معاملے میں اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے میرا زیادہ ساتھ دیا اور کہا "اپنا دل پتھر کر لو اور بھول جاؤ کہ تمہاری کوئی اولاد بھی ہے۔ تمہارے بچے کسی نہ کسی دن تمہارے پاس لوٹ آئیں گے۔ اپنی زندگی گزارو۔ نئے سرے سے جینا شروع کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکتیں تو پھر صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔ اپنے میاں کے پاس واپس چلی جاؤ"۔

منو اور اس کے شوہر کو، جنھوں نے اس ساری آزمائش کے دوران میرا ساتھ نبایا تھا، میرے فیصلے سے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ سخت آزردہ ہو گئے۔ انہوں نے اسے اپنی

شکست سمجھا۔ میری شکست اس لحاظ سے کھوکھلی نہ تھی کہ مجھے اپنے بچے واپس ملنے والے تھے۔ ان کی شکست اس لحاظ سے کھوکھلی تھی کہ ان سے میں بھی چھننے والی تھی۔

مصطفیٰ نے جتوئی کو میرے والدین کے پاس بھیجا تاکہ ہمارے تجدید تعلق کی راہ ہموار ہو سکے۔ جتوئی صاحب نے اس امر کی ضمانت دینی تھی کہ مصطفیٰ آئندہ میرے ساتھ تمیز سے پیش آئے گا۔ وہ انگلینڈ سے ابھی ابھی پاکستان واپس گئے تھے۔ دو دن بعد وہ دوبارہ انگلینڈ آئے۔ انہوں نے میرے والدین سے ملنا چاہا۔ جس دن ان کا آنا طے تھا امی تو امریکہ چلی گئیں اور والد صاحب کہیں اِدھر اُدھر کھسک لیے تاکہ ملنا نہ پڑے۔ جتوئی صاحب نے ہمارے قضیے کو اپنا ہی قضیہ سمجھا تھا اور مجھے اور مصطفیٰ کو ساتھ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ وہ اپنی نئی سیاسی پارٹی کا اعلان کرنے والے تھے اور ہمارا سکینڈل ان کے لیے خفت کا باعث ہوا تھا۔ وہ ہمارے جھگڑے میں مستقل طور پر الجھ گئے تھے کیونکہ ان کے سب سے اچھے دوست اور پارٹی کے نمبر دو قائد پر کڑی تنقید ہو رہی تھی۔ جتوئی صاحب نے ہوٹل میں مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر اب مصطفیٰ نے میرے ساتھ بدسلوکی کی تو وہ اس سے دوستی ختم کر دیں گے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آئندہ میرے ساتھ زیادتی نہ ہو گی۔

میرے اب تک کے حلیف ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اپنا سامان باندھا۔ جتوئی صاحب مجھے لینے میرے والدین کے گھر آئے اور ہم ہالینڈ پارک اپنے اپارٹمنٹ چلے گئے۔ میں نے مصطفیٰ کے خلاف تمام الزامات واپس لے لیے اگرچہ میرے وکلاء کا کہنا تھا کہ میں ایسا نہ کروں۔ گرفتاری کا وارنٹ بھی واپس لے لیا گیا۔ اب مجھے پچھلی تمام بدمزگیاں بھلا کر نئے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔

مصطفیٰ اب لندن میں قدم رکھ سکتا تھا۔ ہوائی اڈے پر بعض دوست اسے لینے کے لیے پہنچے۔ وہ اپارٹمنٹ آیا۔ ہم ایک بار پھر آمنے سامنے تھے۔ میری جلد پر چیونٹیاں سی چلنے لگیں اور میری گدی کے بال کھڑے ہو گئے۔ بظاہر وہ مطمئن اور بے غم دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے باوجود کمرے میں دہشت کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ مجھ میں اس آدمی کو دیکھنے کی تاب نہ تھی جس نے بلیک میل سے کام لے کر میرے عزم کو شکست دے دی تھی۔

اس کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ رونے لگا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری توقعات پر پورا اترے گا اور ان تمام خوابوں کو، جو ہم نے مل جل کر دیکھے تھے، حقیقت میں بدل دے گا۔ میں جانتی تھی کہ اب وہ بطور سیاستدان بات کر رہا ہے۔ اس نے بڑی رسانیت سے ایک نئے کردار کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ وہ میری آدرش پسندی کو تقویت دینا چاہتا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں روئی تک نہیں۔

ہمارے جزوی میل ملاپ کے بعد کا ہفتہ بڑا مصروف ہفتہ ثابت ہوا۔ مصطفیٰ دن رات سوچ میں پڑا رہا۔ میرے لوٹ آنے کے بعد اب اسے وہ تمام شرطیں پوری کرنی تھیں جو مصالحت کے حوالے سے اس پر عائد ہوئی تھیں۔ بچوں کو انگلینڈ بلا لینا بھی ہمارے اختیار میں تھا اور پاکستان جاکر ان کے ساتھ رہنا بھی ہمارے اختیار میں تھا۔ بہرصورت، کسی فیصلے پر پہنچنا مشکل تھا۔

میں جان گئی کہ اسے کیا فکر لاحق ہے۔ وہ یہ حساب لگا رہا تھا کہ اس تمام کام میں اس کے لیے جوکھم کتنا ہے۔ وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کرنا کیا چاہتی ہوں۔ اسے پتہ تھا کہ اگر بچوں کو واپس بلا لیا گیا تو میں بڑی آسانی سے اسے خداحافظ کہہ کر اس پر دوبارہ مقدمہ دائر کر سکتی ہوں۔ اس کے پاس لوٹ آنا شاید میری چال ہو جو میں نے بچوں کو حاصل کرنے کے لیے چلی ہو۔ اس کے سامنے بساط پر ایسا نقشہ جما ہوا تھا جو اس سے پہلے اس کی نظر سے نہ گزرا تھا اور وہ تذبذب کا شکار تھا۔ میرے سردمہر رویے نے معاملے کو اور الجھا دیا۔

مصطفیٰ کو پتہ چل چکا تھا کہ مجھے اس سے محبت نہیں رہی۔ میری نظر میں وہ قابلِ احترام نہ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں آدرش پسند ہوں۔ اس نے اپنی توجہ میری آدرش پسندی کو جلا دینے پر مرکوز کر دی۔ میرے اپنے بھی عزائم تھے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح مصطفیٰ کی ذات اور اس کی سیاست میں اس طرح پیچ در پیچ پیوست تھے کہ انہیں الگ نہ کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اس کی شہرت کا سہارا درکار تھا۔ میں عملی سیاست میں صرف اس کی بیوی کے حوالے سے قدم رکھ سکتی تھی۔ میرے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ میں زندگی میں کوئی ایسا کام کر جانا چاہتی تھی جو وقیع اور قابل قدر ہو۔ مصطفیٰ جان گیا تھا کہ میرے آدرشوں کے حوالے سے وہ کتنا کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے مجھے اپنی سیاست میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے نے ہماری زندگیاں بدل ڈالیں۔ اسے پتہ تھا کہ سیاست ہی وہ میدان ہے جہاں میں اس کا احترام کر سکتی ہوں۔ یہ سامنے کے بجائے پہلو سے آ کر حملہ کرنے کے مترادف تھا۔ مصطفیٰ کی اس چال کا کامیاب ہونا مقدر بن چکا تھا۔

مصطفیٰ نے پاکستان لوٹنے کا فیصلہ محض اس بنا پر کیا کہ میں جو اس کے پاس واپس آ گئی ہوں تو ضرور اس میں کوئی راز ہے۔ اسے میرے محرکات پہ شبہ تھا۔ تاہم وہ وطن واپسی سے بھرپور سیاسی فائدہ اٹھانے کا متمنی بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ میری نظر میں ایک عظیم قائد بن جائے، ایسا قائد جو اچھی طرح یہ جاننے کے باوجود کہ وطن پہنچتے

ہی اسے قیدخانے میں ڈال دیا جائے گا اپنے عوام کے پاس واپس جا رہا تھا۔

اس عظیم فیصلے کی ذمے دار میں تھی۔ مصطفیٰ نے جس سے بھی مشورہ کیا اس نے خبردار کرتے ہوئے یہی کہا کہ واپس جانے کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ جتوئی صاحب نے واشگاف الفاظ میں بتا دیا کہ اگر وہ واپس گیا تو جنرل اسے بخشیں گے نہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ اسے وطن پہنچتے ہی جیل بھیج دیا جائے گا۔ کیا پتہ ہمیں جیل سے کبھی زندہ سلامت باہر آنا نصیب ہو گا یا نہیں۔ مصطفیٰ نے وطن واپسی کے ان جوکھوں سے مجھے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پاکستان واپس جانے کے فیصلے کی ذمے داری کا بوجھ میں بھی اٹھاؤں۔

میں سامان پیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ میں بچوں سے ملنے کے لیے بے کل ہو رہی تھی۔ ہماری واپسی کا دن آ پہنچا۔ جتوئی صاحب نے یہ کہنے کے لیے فون کیا کہ مصطفیٰ ہرگز اس طیارے سے سفر نہ کرے۔

ہم دونوں کا ایک ڈرامائی آمنا سامنا ہوا۔ مصطفیٰ میرے کمرے میں، بکھرے ہوئے سامان سے بچتا بچاتا، داخل ہوا۔ اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں جذبے کی شدت سے چمک رہی تھیں: "تہمینہ، ہر کسی نے مجھ سے کہا کہ واپس مت جاؤ۔ میری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اب یہ فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کی طرف سے فیصلہ تم ہی کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم فیصلہ کرو کہ جن آزمائشوں سے مجھے گزرنا ہو گا آیا تم ان میں میرے ساتھ نباہ کر سکو گی؟ کیا تم میری خاطر جدوجہد کر سکو گی؟ اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو کیا تم یہ قسم کھانے کو تیار ہو کہ تم میرے مقصدِ اعلیٰ کو آگے بڑھاؤ گی؟ اگر مجھے بھٹو صاحب کی طرح قتل کر دیا گیا تو کیا تم میری وفادار رہو گی؟ کیا تم قسم کھا سکتی ہو کہ اپنی زندگی میرے کاز کے لیے وقف کر دو گی اور دوبارہ شادی نہیں کرو گی؟ بولو۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ واپس جانا میرے حق میں ٹھیک ہو گا؟ میرے لیے اپنی جلاوطنی کا مزید کوئی جواز پیش کرنا ممکن نہیں۔ مارشل لا اٹھا لیا گیا ہے۔ میرے عوام چاہتے ہیں اور مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ میں ان کے درمیان پہنچ جاؤں"۔

اس کے الفاظ، اس کے سوالات، ٹھیک نشانے پر جا لگے۔ وہ میرے ذہن کے اس خفیہ حصے تک سرایت کر گیا جہاں میں نے اپنے آدرشوں کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے ذہن میں لگے ہوئے جالوں کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر رہا ہے۔ میں اس کی واپسی کی اصل وجہ بھول گئی---- کہ اسے میری نیت پر اعتبار نہ تھا۔ یکایک مجھے ایک ارفع و اعلیٰ تصور---- یعنی جلاوطن قائد کی واپسی---- سے عشق ہو گیا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مجھے پتہ تھا کہ جلاوطنی کے سبب مصطفےٰ کی مسلسل غیرحاضری اسے سیاسی طور پر غیرفعال بنا دے گی۔ سیاسی خلا کو پُر کرنے کے لیے پہلے ہی نئی طاقتیں اور نئے چہرے تیزی سے سامنے آ رہے تھے۔ ہماری سیاست میں تغیرات کی ایک عظیم رو کارفرما تھی۔ سیاسی ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں جن سے نمٹنے کے لیے نئی طرح سے پہل کرنے کی ضرورت تھی۔ نئی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے مصطفےٰ کو اپنی اہمیت منوانی پڑے گی۔ دور بیٹھے بیٹھے حکم چلاتے رہنا کافی نہ تھا۔ خود اپنے ہی پالے میں اپنی لڑائیاں لڑنے کے لیے اس کا موقع پر موجود ہونا ضروری تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے پاس بہادری سے ڈٹے رہنے کے سوا چارہ نہیں۔

میں نے یاد کیا کہ جب وہ پاکستان سے فرار ہوا تھا تو مجھے کتنی مایوسی ہوئی تھی۔ میرے خیال میں جنگی حیلے کے تحت اس کی وہ پسپائی بزدلانہ فعل تھا۔ بھٹو صاحب نے اکیلے جان دی تھی۔ اب مصطفےٰ کے پاس اپنی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کرنے کا موقع تھا۔

میں نے ذمے داری قبول کر لی۔ میں نے کہا کہ میں اس کا ساتھ دوں گی۔ میں اس کے کاز کے لیے جدوجہد کروں گی۔ جب تک اس کی سیاست پر مجھے یقین اور اس کے آدرشوں کے لیے میرے دل میں احترام رہے گا میں اس کی رفاقت سے کنارہ کش نہ ہوں گی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ میرے سامنے ثابت کر کے دکھائے کہ اس کی جرأت مندی کی جو داستان مشہور ہو گئی ہے وہ عوام کی گھڑی ہوئی کہانی نہیں۔ یہ ثابت کرنا صرف اسی طور ممکن تھا کہ وہ اپنے سیاسی اعتقادات میں استقامت سے کام لے اور فوجی حکومت کے ساتھ کچھ لو کچھ دو کی پالیسی کے تحت سازباز نہ کرے۔ میں نے کہا کہ میری نظر میں وہ طاقتور انسان ہے۔ لیکن میں ٹھہری کمزور۔ اس لیے میری کیا رائے۔ اب وقت ہے کہ وہ کسی دیو سے پنجہ لڑا کر دکھائے۔ اب وقت ہے کہ اپنے متعلق وہ جو کچھ کہتا رہتا ہے اس کے مطابق جی کر دکھائے۔ اب آمر سے دوبدو ہونے کا وقت ہے۔

اُس کمرے میں ہم نے ایک فیصلہ کیا، اور وہ بھی صرف اس لیے کہ میں اڑ گئی کہ ہمارا فیصلہ یہی ہونا چاہیے۔ میں نے اصرار کیا کہ ہمیں پاکستان چلنا چاہیے۔ میں نے قسم کھائی کہ چاہے کچھ ہو جائے میں ہر حال میں اس کا ساتھ دوں گی۔

جتوئی صاحب نے دوبارہ فون کیا۔ وہ مصطفےٰ کے بارے میں بہت فکرمند تھے۔ مصطفےٰ نے انہیں نہایت پرسکون آواز میں جواب دیا کہ اس نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے تیور ایسے آدمی کے سے تھے جو اپنے کسی عظیم خواب میں سانس لے رہا ہو۔ ہم نے اپنا سامان اٹھایا۔ دروازے پر پہنچ

کر وہ رکا، کمرے پر آخری نظر ڈالی اور بولا: "یاد رہے تمہارے سوا ہر کسی نے مجھے واپس جانے سے باز رکھنا چاہا۔ میں تمہاری خاطر واپس جا رہا ہوں"۔

مصطفےٰ اور میں چلتے ہوئے کار تک گئے۔ اب وہ محض میرا شوہر نہ تھا۔ میرا قائد بن چکا تھا۔ مجھے پہلے اس سے محبت تھی۔ اب محبت کی جگہ اس کے مشن پر یقین لے چکا تھا۔

کھر بمقابلہ کھر نامی مقدمہ عدالت سے باہر طے اور رفت گزشت ہو چکا تھا۔ اب ہم ایک اعلیٰ تر عدالت کے سامنے جا رہے تھے۔ عوام کی عدالت کے سامنے۔

ایک ایسے مرد کے ساتھ پاکستان واپس جاتے ہوئے مجھے خجالت محسوس ہونے لگی جسے میں اخباروں میں "راسپوٹین" کے نام سے یاد کر چکی تھی۔ میں اس پریس کا سامنا کیسے کروں گی جس نے ہمارے ازدواجی لڑائی جھگڑے کو رقت آمیزی اور جذباتیت سے چھپڑا ہوا ڈراما بنا کر رکھ دیا تھا؟ میں اس بات کی وضاحت کیسے کروں گی کہ میں نے اسی مرد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں جس نے میرے بچوں کو اغوا کر لیا تھا؟ میں نے اپنے اندیشوں کا ذکر کیا۔ مصطفےٰ مسکرایا: "شرمندہ مجھے ہونا چاہیے، تمہیں نہیں۔ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ میں نے تمہیں واپس آنے پر مجبور کیا۔ تمہیں اپنی پوزیشن کی صراحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے وہی کیا جو درست تھا۔ عوام بھیڑبکریوں کی طرح ہیں۔ ان کو ہر وہ شخص ہانک سکتا ہے، جسے راستے کا علم ہو"۔

میری سمجھ میں آنے لگا کہ سیاستدان کی کھال موٹی ہی ہونی چاہیے۔ وہ اپنے پر کیچڑ اچھالے جانے کا عادی ہوتا ہے۔ اگر کیچڑ لگ بھی جائے تو وہ بس اسے جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ سیاست دان تشہیر کی آکسیجن میں سانس لیتے ہیں۔ اخباروں میں بالکل ذکر نہ آنا نقصان دہ ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر یہ ہے کہ بدنام کرنے والی خبریں ہی چھپتی رہیں۔ مصطفےٰ نے خطرہ تو بے شک مول لیا لیکن اس سارے بیہودہ واقعے کو ایسا رخ دے دیا جس سے اس کی منفعت کا پہلو نکلتا تھا۔ وہ لوگوں کو ایسا قدامت پسند شخص دکھائی دیا جو اپنے بچوں کے اخلاق پر مغرب کے اثر کے بارے میں پریشان تھا۔ یہ اس طرح کی خبر تھی جو لوگ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ مجھے مغرب زدہ، آزاد خیال عورت کے روپ میں دیکھا گیا۔ ایسا شاذ ہی دیکھنے میں آیا تھا کہ اس سماجی طبقے سے، جس کا میں حصہ تھی، تعلق رکھنے والی کسی عورت نے اپنے شوہر پر مقدمہ دائر کیا ہو یا اسے گرفتار کرانے کا منصوبہ گانٹھا ہو۔ ان تمام باتوں سے چڑنا تو کجا، مصطفےٰ کچھ محظوظ ہی ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ مستقبل ہمارا ہے۔

یہ باتیں میرے لیے معنی رکھتی تھیں۔ میں اپنے آدرشوں کی وفادار تھی۔ جب

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں بچوں کی بازیابی کے لیے آپ سے باہر ہوئی جارہی تھی تو میرے والد نے مجھ سے زبردستی جنرل ضیاء کے نام خط لکھوایا۔ میرے لیے یہ خط لکھنا بڑا مشکل ثابت ہوا۔ حالات سے مجبور ہو کر مجھے ایسا قدم اٹھانا پڑا جو میرے مزاج کے منافی تھا۔ میں ایک ایسے شخص سے مدد کی طلبگار تھی جو ان تمام چیزوں کی علامت بن چکا تھا جن کے خلاف ہم برسرِپیکار تھے۔ یہ میری آدرش پسندی کے ساتھ ظلم تھا، دھوکا تھا۔ میں نے یہ خط ماں کی حیثیت سے لکھا۔ میں اسے سیاستدان یا ایسے فرد کے طور پر خط لکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی جس نے مصطفٰے کے دبستانِ سیاست میں تربیت حاصل کی ہو۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ اقتدار کی سیاست میں آدرش پسندی کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

وطن جاتے ہوئے پورے ہوائی سفر کے دوران مصطفٰے مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے یہ عہد دہرانے کو کہا کہ میں اس کی خاطر جدوجہد کروں گی۔ اس نے مختلف سیاسی منظر ناموں پر تبادلۂ خیال کیا اور سمجھایا کہ ہمیں ان سے کس طرح نمٹنا ہو گا۔ وہ واضح طور پر مضطرب اور بہت جذباتی نظر آ رہا تھا۔ جب اس پر تھکن غالب آ جاتی تو وہ ننھے حمزہ کو ساتھ لے کر سونے کے لیے بڑے مزے سے فرش پر دراز ہو جاتا۔

میں ابھی تک مخبوط الحواس تھی۔ مجھے دم لینے یا اپنی موجودہ صورتحال کا تجزیہ کرنے کی مہلت ہی کہاں ملی تھی۔ واقعات تتلیوں کی طرح گریزاں تھے۔ میں نے ان کے متعلق سوچنا ترک کر کے اپنی نظر بے کراں نیلاہٹ پر جما دی۔ طیارے سے باہر کی فضا کتنی پُرامن معلوم ہو رہی تھی۔

ہم نے جو سوچا تھا کہ پاکستان پہنچیں گے تو ہمارا استقبال ہو گا۔ سو وہ کچھ بھی نہ ہوا۔ بالکل الٹ معاملہ دکھائی دیا۔ جلاوطنی کے دوران ہم جن ہجوموں کا خواب دیکھا کرتے تھے ان کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ ہمیں کسی لحاظ ملاحظے کے بغیر ہوائی اڈے کے ایک دفتر میں لے جایا گیا جہاں ہم انتظار کرتے رہے۔ اتنے میں خبر پھیل گئی۔ چند لوگ اپنے قائد کی جھلک دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ چند ایک مقامی اخبار نویس بھی کسی طرح اندر آنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم ہدایات کے منتظر بیٹھے تھے۔ اس اثناء میں ہمیں لنچ پیش کیا گیا۔

مصطفٰے، حمزہ اور میری ایک تصویر ہے جو اس وقت اخباروں کے صفحۂ اول پر چھپی تھی۔ مصطفٰے حمزہ کو گود میں لیے بیٹھا ہے۔ اب وہ اصولوں کی خاطر مر مٹنے والے آدمی کی طرح اپنے لیے مصائب و آلام کا ایک ہالہ بہم پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہے جسے اپنے گرد کسی ولی جیسے تیقن کے ساتھ تانے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی تکبر، کوئی غصہ

نہیں۔ البتہ ایک متمرد سی اطاعت ضرور ہے۔ انداز سے اعتماد ہویدا ہے۔ اگر ہجوموں کی غیرموجودگی سے اسے کوئی مایوسی ہوئی ہے تو وہ اس کے چہرے کی کیفیت سے ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ پاکستان پہنچ چکا ہے۔ بیوی اس کے ہمراہ ہے۔ گھریلو بحران اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ مستقبل اس کے سامنے ہے۔

حمزہ حیرت زدہ نظر آ رہا ہے۔ میں "ماڈل" بیوی دکھائی دے رہی ہوں۔ میں نے اپنا لباس احتیاط سے چنا تھا۔ میری قمیض اصلی وائی ایس ایل ہے جس کے آر پار دہکتے رنگوں میں شیر بنے ہیں۔ یہ میرے "شیرِ پنجاب" کی وفادار ہونے کی علامت ہے۔ میں نے لوئی فرائیڈ کی بنی ہوئی بغیر آستینوں کی قبا پہنی ہوئی ہے۔ اس شاہ خرچی پر مجھے جرم کا احساس ہو رہا تھا۔ جب ہم اس ملک سے رخصت ہوئے تھے تو ہمارے پاس صرف پچاس ہزار روپے تھے اور اب واپسی پر ان دو.ئی پلٹ لوگوں جیسے نظر آ رہے تھے جن کی چھچھوری امارت ضرب المثل بن چکی ہے۔ بہرکیف، اس وقت مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میری پوشاک بالکل بے تکی ہے۔

میں باہر جا کر جتوئی صاحب کی بیگم، خلیقہ، سے ملنا چاہتی تھی جو کار میں بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے روکا گیا۔ میں گارڈ پر دہاڑی: "تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے۔ میری گرفتاری کا وارنٹ تو دکھاؤ"۔ میں وہاں سے نکل آنے میں کامیاب ہو گئی۔ فوجی افسرشاہی سے یہ میری پہلی جھڑپ تھی۔ ایسی بہت سی جھڑپیں اور بھی ہوئی تھیں۔ مجھے پتہ چلا کہ بے دھڑک ہو کر ڈرانے دھمکانے سے کام بن جاتا ہے۔

میں واپس آئی تو ہمارے تمام بیگ کھلے پڑے تھے اور چیزیں کاؤنٹر پر ادھر سے ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ میں بہت پریشان ہوئی۔ پہلے وہ مصطفٰے کے کپڑے اور کتابیں لے گئے۔ پھر وہ اسے بھی ساتھ لے گئے۔ اسے کراچی کے ایک ریسٹ ہاؤس میں رکھا گیا۔ میں لاہور چلی آئی۔

میری جتوئی صاحب اور ان کی نئی نئی تشکیل یافتہ نیشنل پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے ملاقات ہوئی۔ وہاں پریس والے بھی تھے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ یہ اخباری نمائندوں کے ساتھ میری پہلی مڈھ بھیڑ تھی۔ "کیا آپ اپنے شوہر کی خاطر جدوجہد کریں گی؟" "ہاں۔" "کیا آپ ان کی سیاست پر یقین رکھتی ہیں؟" "ہاں"۔ جو وعدہ میں نے مصطفٰے سے کیا تھا میں اسے نباہ رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ بھی اس وعدے کو نباہے گا جو اس نے مجھ سے اور عوام سے کیا تھا۔

جب ہم باہر آئے تو میں جذبات کے وفور سے بے حال ہو گئی۔ یہی وہ دن تھا جس کے خواب ہم دیکھتے آئے تھے۔ اس نے سالہاسال ہمیں سہارا دیے رکھا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اچانک مصطفیٰ کے ساتھ گزاری ہوئی ازدواجی زندگی کی تمام چھوٹی چھوٹی ہولناکیوں نے، ایک ایک کر کے، میرے ذہن پر یلغار کر دی۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ میں اس شخص کی زبردست حامی اور واحد امید بنی یہاں کھڑی تھی؟ میں، جہنم جا کے لوٹ آئی تھی۔ میں جہنم کے نشیب و فراز سے اتنی اچھی طرح آشنا تھی۔

باب - ۳

جہنم کے نشیب وفراز

(1985-1977)

ذکر اس پری وش کا پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

ہم جرنیلوں کے ساتھ کسی طرح کی ان کہی مفاہمت کے بعد پاکستان سے روانہ ہوئے تھے۔ فوجی انقلاب کے بعد سیاسی مخالفین کی پکڑ دھکڑ جاری تھی بھٹو صاحب کو قتل کے ایک الزام میں دھر لیا گیا تھا۔ اسی الزام کی وجہ سے انہیں آخر جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ مصطفیٰ نے پاکستان چھوڑنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس پر میں بے کل سی تھی۔ جس سہولت سے ہم پاکستان سے نکل آئے اس سے یہ بے کلی اور بڑھ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم غداری کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی بے اطمینانی کو لفظوں میں ادا کر سکوں۔ مصطفیٰ نے میری بے کلی کو بھانپ لیا اور کہا کہ ہمارا پاکستان سے نکل آنا بزدلی کا فعل نہیں۔ اپنی جان بچانے کے لیے سیاست میں اس طرح کی مفاہمت کرنی ہی پڑتی ہے۔ مردہ سیاست داں جلد ہی میراث کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عوام کے لیے اپنی میراث آپ تیار کرنا مصطفیٰ کی سب سے بڑی ضرورت بن چکا تھا۔

ہم صبح سویرے اسلام آباد سے روانہ ہوئے۔ ہمارے لیے صورت حال بڑی کشیدہ تھی۔ مجھے اپنے ملک ہی کو نہیں اپنی تین ماہ کی بیٹی نصیبہ کو بھی چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ مصطفیٰ کے خیال میں نصیبہ کو ساتھ لے جانے میں خطرہ بہت تھا۔ ہمارے سامنے کوئی قطعی منصوبہ نہ تھا۔ ہمیں بس اتنا ہی معلوم تھا کہ ہماری اولیں منزل لندن ہے۔ ہمارے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پاس صرف پچاس ہزار روپے تھے۔ جو پاؤنڈوں میں تبدیل ہونے کے بعد حقیر سی رقم بن کر رہ جاتے تھے۔

جب طیارہ رن وے کے آخر پر رکا پرواز کی اجازت ملنے کا انتظار کر رہا تھا تو میں نے مصطفٰے کے ماتھے پر پسینہ پھوٹتے دیکھا۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ اس کی کنپٹیاں دھک دھک کر رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جنرل متلون مزاج ہیں۔ وہ اپنا ارادہ بدل بھی سکتے ہیں۔ بہر حال، انہوں نے ارادہ بدلا نہیں۔ طیارہ حرکت میں آیا۔ فضا میں بلند ہوا۔ میں نے نیچے اپنے ملک کو دور ہٹتے دیکھا۔ مصطفٰے کی نظر اب مستقبل پر جمی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اس کی جان میں جان آ گئی ہے۔ وہ تختۂ دار کو جُل دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

انگلستان میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں ہم جا کر ٹھہر سکتے۔ مصطفٰے نے طیارے میں ایک پاکستانی تارک وطن کو، جس پر انگریزیت اتنی غالب آ گئی تھی کہ وہ خود کو بیری کہنے لگا تھا، باتوں میں لگا لیا۔ چھ گھنٹے بعد بیری ہمارا دوست بن چکا تھا۔ وہ ہمارے کاز کی حمایت پر آمادہ ہو گیا۔ ملک سے باہر رہنے کے باوجود ابھی تک دل سے پاکستانی تھا۔ اس نے کہا کہ ہم اسے شرف میزبانی بخشیں۔ مصطفٰے نے یہ پیشکش قبول کر لی۔

بیری ارلز کورٹ میں ایک کونسل فلیٹ میں مقیم تھا۔ ہم ایسے غریبانہ علاقے میں اپنی خوشی سے نہ ٹھہرے تھے۔ مجبور کی کیا مرضی۔ فلیٹ چھوٹا سا تھا۔ میں وہاں بہت تنگ تھی۔ میزبان نے ہمارا بڑا خیال رکھا۔ مصطفٰے نے خود کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔ آخر وہ جلا وطن ہی تو تھا اور بے آرامی اور جلاوطنی لازم و ملزوم ہیں۔

میں راتوں کو زیادہ وقت جاگتی رہتی۔ میں مضطرب تھی۔ میں پاکستان سے بھاگ آنے پر مضطرب تھی۔ میں بھٹو صاحب کو موت کی کوٹھری میں بے یارومددگار چھوڑ کر چلے آنے پر مضطرب تھی۔ مجھے اس مشکوک لین دین کی وجہ سے اضطراب تھا جس کے نتیجے میں ہمیں پاکستان سے باہر جانے کی اجازت ملی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم نہ تھا کہ مصطفٰے نے کیا ٹپس لڑائی تھی لیکن میرا دل کہتا تھا کہ اس نے زندگی بچانے کی خاطر اپنی عزت کا سودا کیا ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر مجھے کبھی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا تو میں وطن ہی میں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گی۔ جلاوطنی، اپنے تمام رومانی اشاروں کنایوں کے باوجود مشکلات سے بچنے کا آسان طریقہ ہے۔ مصطفٰے کی سیاسی سوجھ بوجھ سے مایوس ہو کر مجھے نیند آ گئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ انقلاب برپا ہو چکا ہے اور میں سر اٹھائے، سینہ تانے، پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ جب پھانسی کا پھندا میرے گلے کے گرد تنگ ہوا تو مجھے لرزش تک نہ ہوئی۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پہلے چند ہفتے برطانیہ اور یورپ میں دوسرے جلا وطنوں سے رابطہ استوار کرنے میں گزرے۔ مصطفٰے دوسروں کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ جلاوطنی کی سیاست کا آغاز ہو گیا۔ اس دوران میں ہم نے میرے روٹھے ہوئے والدین سے صلح صفائی کی کوشش کی میرے والد ابھی تک اس بات کو قبول کرنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکے تھے کہ میں نے ایک ایسے شخص سے شادی کر لی ہے جو نہ صرف مجھ سے بیس سال بڑا ہے بلکہ پہلے ہی کئی شادیاں کر چکا ہے۔ امی ہم سے راضی ہو چکی تھیں۔ مصطفٰے کو بڑی تشویش لاحق ہو گئی کہ میں اپنے والدین سے اختلاف دور کیوں نہیں کرتی۔ مجھے لگا کر وہ مالی طور پر خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے اور مزید کسی مفاہمت کے لیے تیار ہے۔ گویا اس کے کردار کے رش پرنٹ میری نظر سے گزر رہے تھے۔ میں نے اس کی وہ کمزوریاں دیکھ لیں جنہیں وہ اپنی سخت گیر ظاہری وضع کی اوٹ میں چھپائے رکھتا تھا۔ ادھر اپنی بچی کے بغیر مجھے کچھ ہوش نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اور کسی بات کا مجھے دھیان ہی نہ تھا۔ ہر بار جب میں سڑک پر یا پارک میں کسی بچے کو پرام میں لیٹا دیکھتی تو میری مامتا بیدار ہو جاتی۔ میرے لیے ہر بچہ پر کشش تھا اور محض اسے دیکھتے رہنے سے مجھے اتنا لطف آتا جیسے میں اپنی ہی بیٹی کو دیکھ رہی ہوں مصطفٰے غالباً اسے کمزور، نسوانی جذباتیت کا ایک اور مظاہرہ سمجھتا تھا۔ دو کمزور افراد نامعلوم کے روبرو۔

میرے والدین سپین میں ماربیلا نامی جگہ مقیم تھے۔ میں نے امی سے بات کی۔ انھوں نے کہا کہ میرے والد ہمیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں۔ میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا، میں جانتی تھی کہ وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں اور میں اس اذیت کو محسوس کر سکتی تھی۔ جو انہیں پہنچی تھی۔ میں ان کے اصولوں کی عزت کرتی تھی اور مجھے اس بات پر دل میں فخر تھا کہ اپنے تمام کرب کے باوجود انہوں نے اپنے اصولوں کو کبھی ترک نہ کیا تھا۔

ہم ملاگا کے ہوائی اڈے پر اترے اور کار سے ماربیلا پہنچے۔ وہاں ہم نے ہالیڈے ان میں کمرہ لیا۔ میرے والدین نے ہمارے لیے اپنی کار بھجوا دی تھی ان کا ولا سمندر کنارے واقع تھا۔ ہمیں ڈنر پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس وقت مجھے کیا خبر تھی کہ آگے چل کر اس ڈنر سے کیسا فساد برپا ہوگا۔

میری بہنیں منو زرمینہ اور عدیلہ، جو سب غیر شادی شدہ تھیں۔ ان دنوں میرے والدین کے پاس رہتی تھیں۔ گھر میں منو جیسی نٹ کھٹ کوئی نہ تھی۔ وہ (O) لیول کی تیاری کر رہی تھی۔ اتنی مدت کے بعد مجھ سے ملنے پر اسکا جوش و خروش دیدنی تھا۔ زرمینہ ابھی پندرہ سال کی تھی۔ مگر ملبوسات ڈیزائن کرنے میں مہارت حاصل کرنے کی

اس روز اس نے عروسی گون بڑا شوق تھا۔ اس روز اس نے عروسی گون

پہننے کا بڑا شوق تھا۔ اسے اچھے کپڑے پہننے کا بڑا شوق تھا۔ اس روز اس نے عروسی گون ٹھان چکی تھی۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پہننے کا بڑا شوق تھا۔ اس روز اس نے عروسی گون

ٹھان چکی تھی۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پہننے کا بڑا شوق تھا۔ اس روز اس نے عروسی گون سے مشابہ، ڈھیر ساری جھالروں والی، عجوبہ پوشاک پہن رکھی تھی۔ بالوں میں ایک گلاب اڑسا ہوا تھا۔ وہ کوئی ہسپانوی سینیورا لگ رہی تھی۔ اس نے ہمیں متاثر کرنے کے لیے اپنے بہترین کپڑے زیب تن کیے تھے۔

عدیلہ نے کالی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ بھی اپنی بہن سے مل کر خوشی اور جوش سے پھولی نہ سما رہی تھی اور میری سرکشی کو چوری چوری تحسین کی نظر سے دیکھتی تھی۔ میں نے امی سے، جن کا مزاج آمرانہ تھا، لڑجھگڑ کر ایک ایسے شخص سے شادی کر لی تھی۔ جو مشہور تو تھا لیکن اپنے ماضی کے حوالے سے بدنام بھی خاصا تھا۔ عدیلہ کو بڑا تجسس تھا کہ دیکھے تو سہی یہ مقتدر آدمی، جو اب اس کا بہنوئی بن چکا ہے کیسا ہے۔

میرے والد نے شفقت بھرے انداز میں مجھے گلے لگایا۔ میں رو پڑی۔ وہ کہنے لگے۔ "تمہارے فیصلے سے مجھے پریشانی بھی ہوئی تھی اور دکھ بھی پہنچا تھا۔ اس کے باوجود آج میں پرانی رنجشیں بھلا کر تمہیں دوبارہ دل میں جگہ دے رہا ہوں۔ یہ تمہاری دوسری شادی ہے اور میری یہی خواہش ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو تم اپنے میاں کو ہرگز نہ چھوڑو۔ اب تمہیں اس کے گھر سے مر کر ہی نکلنا چاہیے۔ میں اسی شرط پر تمہیں خاندان میں پھر سے جگہ دے رہا ہوں"۔ میں نے عہد کیا کہ چاہے کوئی وجہ ہو، حالات چاہے کیسا بھی رخ اختیار کرلیں، میں مصطفٰے کا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ اس وقت مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ میں کتنی مشکل کمٹ منٹ کر رہی ہوں۔

ماحول میں جو تھوڑی بہت کشیدگی باقی تھی وہ تحلیل ہو گئی۔ منو بغیر رکے بولے جا رہی تھی۔ زرمینہ کا رویہ بہت ہی پیار بھرا تھا۔ وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھنا چاہتی تھی۔ بس عدیلہ کی کسمساہٹ ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اس وقت وہ صرف تیرہ سال کی تھی۔

عدیلہ اور مصطفٰے میں کوئی بات بڑی عجیب سی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا مجھے محسوس ہو رہا تھا دو خبیث ذہن ایک دوسرے سے متھی ہو گئے ہوں۔ زیادہ عمر والا ذہن جسے ایک نوخیز شکار ہاتھ آ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر خوش تھا کہ جسے اس نے اپنی مدعا گردانا ہے وہ بھی اس کی طرف اتنی ہی شدت سے مائل ہے یہی وہ عورت تھی جسے وہ اتنے بہت سے آلودہ بستروں اور مسلے روندے جسموں میں ڈھونڈتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جس عورت کے لیے وہ ترستا رہا تھا وہ اچھی یا نیک یا معزز یا حساس یا رحمدل نہیں تھی۔ وہ تو پھانسنے پھنسانے میں طاق ایک کمسن تھی۔ وہ خود اسی

کا عکس تھی۔ کمپلکسوں اور نفرتوں سے اٹی ہوئی شخصیت۔ تقاضائے فطری بھی یہی تھا۔ شیر صرف شیرنی سے تعلق قائم کرتا ہے اور کتا کتیا سے۔ شیطان مجسم کا کسی فانی بندے بشر کے ساتھ گزارا کہاں ہو سکتا ہے۔ عدیلہ میں اس طرح کے سبھی گن بھرے ہوئے تھے۔ ان کے مابین عہد و پیمان ہو گئے۔

وہ مل جل کر وار کرتے تو ان کا مارا پانی نہ مانگتا۔ ان کی فریب کاریوں کے فسانے ہر طرف مشہور ہو گئے۔ جو کوئی ان کے جال میں آ جاتا وہ کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ رہتا۔ وہ دوسروں کے دلوں پر چھریاں چلاتے اور انہیں تڑپتا دیکھ کر لذت کے مارے کلبلاتے۔ وہ اپنے شکار کو بہلا پھسلا کر دیوانگی کے کنارے تک لے آتے اور پھر جب وہ قعر مذلت میں لڑھکنیاں کھاتا تو کھڑے بغلیں بجاتے۔ اس دن کے بعد میں بھی ان کے لیے ایک ایسا ہی شکار ثابت ہوئی۔

ہم ماربیلا میں ٹھیرے رہے۔ اپنی بچی کی وجہ سے میرا جی مٹی ہوا جا رہا تھا۔ والد صاحب نے اسے بلانے کا بندوبست کیا۔ ہماری خوشی اور جوش کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ہم اسے لینے گئے۔ نصیبہ کو اپنی تینوں خالاؤں سے ملوایا گیا تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میری گڑیا کو دیکھ کر وہ لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ دائی عائشہ میری ننھی کے ساتھ آئی تھی۔ لگتا تھا کہ اب میری زندگی بڑی حد تک مکمل ہو چکی ہے۔ مجھے دوبارہ اپنے خاندان پر رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ میرے شوہر پر کسی قسم کی ہڑبڑاہٹ طاری نہ تھی۔ امی اور مصطفٰے کی خوب نبھ رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ امی کے ساتھ میرے تعلقات بھی خاصے سدھر چکے ہیں۔

میرے والدین نے پیش کش کی کہ ہم انگلینڈ میں ان کے اپارٹ منٹ میں اٹھ آئیں۔ ہم ماربل آرچ چلے گئے۔ اس جگہ کا اور ہیری کی ارلز کورٹ کی کھولیوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ منو، زرمینہ اور عدیلہ بھی ماربیلا سے ہمارے ساتھ واپس آئیں۔ وہ ہیچ ہل، ہیڈلے وڈ میں اپنے گھر میں رہنے لگیں۔

یہاں میں آرام سے تھی۔ گویا میں ایسی جگہ پہنچ گئی تھی جہاں مجھے اپنے طبقے کا مخصوص تحفظ حاصل تھا۔ مصطفٰے کو ذرا زیادہ تذبذب کا سامنا کرنا پڑا اور نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے میں کچھ دیر لگی۔ اب ہم نے بڑے ٹھاٹ باٹ سے لوگوں کو دعوتوں پر بلانا شروع کر دیا۔

ایک شام ہم نے پاکستان سے آنے والے بعض پرانے دوستوں، ماریا جتوئی، مسنی اور چند لوگوں کو ڈنر پر مدعو کیا۔ میں نے امی کے ہاں سے قیمتی کٹلری منگوائی۔ عدیلہ اور زرمینہ کٹلری لے کر آئیں۔ مصطفٰے کھانا تیار کرنے میں مصروف تھا۔ میں

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دعوت کے انتظامات کی دیکھ بھال میں لگی تھی۔ زرمینہ جا کر بچی سے لاڈ پیار کرنے لگی اور عدیلہ چپ چپاتے شراب پر پل پڑی۔ ہمیں اس کی حرکات سے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ اس طرح غٹاغٹ شراب پی رہی تھی جیسے یو کے میں شراب پر پابندی بس عائد ہی ہونے والی ہو۔ جلد ہی وہ نشے کی دھند میں ادھر اُدھر ڈولنے لگی۔ ہمیں دیر میں پتا چلا۔ ووڈکا اس کے سر کو چڑھ گئی۔ اس نے فی الفور اپنے تمام حجابات کو پس پشت ڈال دیا۔ زرمینہ اور مجھے اس پر سخت طیش آیا۔ اس نے ہمیں گھاس بھی نہ ڈالی اور ایسی حرکتیں کرتی رہی جن سے ہمیں زیادہ سے زیادہ اشتعال آ جائے۔ وہ لونگ روم میں لڑکھڑاتی پھرتی رہی۔ بار بار گر جاتی۔ ہم اسے گھسیٹ کر بیڈ روم میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے ہمارا مقابلہ کیا اور ہمیں پرے دھکیلتی رہی۔ مجھے یہ پریشانی تھی کہ مہمان آ گئے تو وہ اسے اس حالت میں دیکھ لیں گے۔ بڑا ڈر یہ تھا کہ کہیں یہ بات ہمارے والدین تک نہ پہنچ جائے۔ شرمندہ ہو کر بادل ناخواستہ میں نے مصطفےٰ کا سہارا لیا تاکہ وہ اسے ٹھیک کرے۔ "مصطفےٰ تمہیں اس سلسلے میں کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کی اچھی طرح خبر لو اور یہاں سے چلتا کرو"۔

مصطفےٰ عدیلہ کی طرف بڑھا۔ اسے اپنے پر کچھ زیادہ اعتماد نہ تھا اور بظاہر ہچکچا رہا تھا۔ اس نے عدیلہ کو پکڑنا چاہا۔ عدیلہ نے ہاتھ پیر مارے۔ بظاہر مصطفےٰ کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں وہ اس کے زیادہ قریب ہو گئی۔ ایک پل کے لیے وہ ٹھٹکے۔ عدیلہ ڈھیلی پڑ گئی اور گھر جانے پر آمادہ ہو گئی۔

تینوں بہنوں نے جلدی سے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ہم متفق تھے کہ یہ واقعہ امی سے چھپانا پڑے گا کیوں کہ ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہمارے ملنے جلنے پر پابندی لگا دیں گی۔ اس طرح کی دیدہ دلیرانہ بے اعتدالی پر پردہ پڑا رہا۔ میں اسے اپنے ذہن سے فراموش نہ کر سکی۔ بدگمانی کا بیج بو دیا گیا تھا وہ جلد ہی پھوٹ آنے کو تھا اور بڑھ کر میرے پورے وجود میں پھیل جانے والے شک کی صورت اختیار کرنے والا تھا۔

میرے والدین کی خواہش تھی کہ ہم بچ بل آ کر ان کے ساتھ رہنے لگیں۔ امی کو سیاست سے بڑی دلچسپی تھی اور مصطفےٰ کی رفاقت سے بہت لطف اندوز ہوتی تھیں۔ مصطفےٰ چھوٹے چھوٹے پر لطف واقعات سنا کر انہیں بہلاتا رہتا اور سیال سیاسی صورت حال کا بڑی بصیرت سے تجزیہ کرتا۔ وہ اس سے بے تکلف ہو گئیں۔ میرے والد نے زیادہ محتاط رویہ اپنایا۔ انہوں نے میزبانی کا حق تو پورا پورا ادا کیا، مصطفےٰ کو ڈیویڈوف سگار پیش کرتے اور موقع محل کی مناسبت سے "ہوں ہاں" "واہ" "خوب" وغیرہ کہتے رہتے لیکن اپنی اور مصطفےٰ کے درمیان فاصلہ برقرار رکھا۔ ان کے تعلقات رسمی سطح سے آگے نہ بڑھے۔

میں ذہن میں مصطفےٰ اور امی کا موازنہ کرتی تو مجھے اپنی حالت پر ہنسی آتی۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ امی کے غلبے سے نجات پا کر میں ایک ظالم کی گود میں جا گری تھی۔ امی نے تو مجھے کھا ڈالا تھا۔ ان کا مزاج آمرانہ تھا۔ ان کی زندگی میں دوسرے لوگوں کی آراء کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہی حال مصطفےٰ کا بھی تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے ہاں یہ آمرانہ خصوصیات کچھ زیادہ ہی بڑھی چڑھی نظر آتی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے خدا کی طرف سے مجھے اپنے پہلے شوہر سے بے وفائی کرنے کی سزا مل رہی ہے۔

رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ میں سب سے کٹ چکی ہوں۔ میرے خاندان پر مصطفےٰ نے قبضہ جما لیا تھا۔ وہ اسی خاندان کا فرد بن گیا تھا جس سے میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں اور باقی گھر والوں میں اب کوئی فرق نہ رہا تھا۔ امی کو بھی میری طرح اس کی ذات میں ایک آدرش پسند انسان نظر آیا اور وہ اس کی گرویدہ ہو گئیں۔ انہوں نے اس کی شادیوں، بہت السیٹوں اور قلابازیوں اور اس کی خراب شہرت کو نظر انداز کر دیا۔ وہ پوری طرح اسکے سحر میں گرفتار ہو چکی تھیں۔

ہر روز وہ منہ اندھیرے اٹھ کر یوگا کی مشقیں کرتا اور پھر میرے والدین کے پاس ان کے کمرے میں جا بیٹھتا۔ وہ خبروں پر تبادلہ خیال اور صورت حال کے بارے میں قیاس آرائی کرتے۔ ان کا تعلق ایک ہی نسل سے تھا اور ان میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ میرے والدین کو خبر بھی نہ تھی کہ اس دلآویز شخص نے، جو ان کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا ہے، کل رات ان کی بیٹی کو ستایا اور مارا پیٹا تھا۔

مصطفےٰ انتہا کا بدمزاج تھا۔ وہ پہلے بھی مجھے مار پیٹ چکا تھا۔ والدین کے گھر آ کر میری زیادہ دھنائی ہونے لگی کیوں کہ میں تکلیف، تضحیک اور تذلیل سے پہنچنے والی سخت اذیت کو چپ چاپ پی جانے پر مجبور تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات کا بہانہ بنا کر مجھے گالیاں دیتا اور مارتا۔

ماضی میں میری ٹھکائی میری پہلی شادی کے بہانے کی جاتی تھی۔ وہ مجھ پر الزام لگاتا کہ میں اپنے سابقہ شوہر کے عشق میں مبتلا ہوں، بدکاری کرنے کی اہل ہوں، میں نے [illegible] اور مرد کے ساتھ بیاہے جانے کے بعد اس سے شادی کی تھی۔ میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کے رہ جاتی۔ میرے ذہن میں ابتری کے سوا کچھ نہ رہا۔ مجھے کسی بھی طرح کے جذبات کا اظہار کرنے سے خوف آنے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے جواب میں ذرا سی بھی ثبوت دیا تو اس کے ذہن میں یہ گمان اور پختہ ہو جائے گا کہ میں [illegible] عام قسم کی آوارہ عورت ہوں۔ یہ الجھن جاگیردارانہ ذہن کی خصوصیت ہے۔ جاگیردار سمجھتے ہیں کہ عورت صرف انہیں لذت پہنچانے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر اس کی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

حرکتوں سے کبھی یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ خود بھی مزہ لے رہی ہے تو یقیناً اس کے اندر کوئی چھنال چھپی ہوئی ہے جو کسی وقت بھی کھل کر سامنے آ سکتی ہے۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں۔ مصطفٰے کو یہ احساس تک نہ تھا کہ وہ میری کامنا کو کچل چکا ہے۔ اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کے نتائج بہت ہولناک تھے۔ میں اس گورکھ دھندے کو یہ سمجھ کر برداشت کرتی رہی کہ میں اس کے کسی کام تو آ رہی ہوں۔ میری یہی افادیت سہی۔

ہماری لڑائیاں اب خاندان والوں کے حوالے سے ہونے لگیں۔ وہ کھانے کی میز پر ہونے والی بات چیت میں سے اپنے مطلب کی باریکیاں چھانٹ کر انہیں میرے خلاف استعمال میں لاتا۔ جو باتیں میں ہرگز کسی کو نہ بتاتی اور جو میں نے، اپنے حق میں کانٹے بوتے ہوئے، اسے اعتماد میں لے کر بتادیں تھیں، وہ انہیں کے ذریعے ٹوہ لیتا رہا کہ خاندان کے بارے میں میرے احساسات کیا ہیں۔ میں نے امی سے اپنے تعلقات کا تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ مصطفٰے نے اس بات سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ان انکشافات کی جانب اشارے کر کر کے مجھے ذہنی عذاب دینا شروع کر دیا۔ اب وہ ہر بات کو امی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا۔ اس نے یکایک مجھے احسان فراموش اور ناقابل اعتبار بیٹی قرار دے ڈالا۔ وہ بڑے طریقے سے ماں اور بیٹی کے درمیان حائل خلیج کو وسیع تر کرنے لگا۔ درحقیقت وہ میری تمام کشتیوں کو نذرِ آتش کرنے میں مصروف تھا تاکہ میں پابستہ اور لاچار ہو کر اس کے جزیرے سے کہیں نہ جا سکوں اور اس کا ظالمانہ راج سہے جاؤں۔ اس نے مجھے اپنے گھر والوں سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ماضی کو کرید کرید کر مجھے وہ تمام مشکلیں یاد دلاتا رہا جن کا مجھے اپنے خاندان کی وجہ سے سامنا کرنا پڑا تھا، اور یہ سب اس نے ایسے وقت کیا جب مجھے ان باتوں کو ذہن سے مٹا دینے کی سعی کرنی چاہیے تھی۔ وہ مجھے گھسیٹ کر میرے ماضی میں لے گیا اور مجبور کیا کہ میں اسے دوبارہ بسر کروں۔ میرے لیے آگے جانا ممکن نہ رہا۔ میں اپنے ہی انکشافات کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔

پھر کبھی کبھار وہ حلیف کا روپ دھار لیتا۔ "میں سوچتا ہوں کہ ان بدگمانیوں کے بارے میں جو تمہیں اپنی امی سے پیدا ہو گئی ہیں مجھے تمہاری امی سے بات کرنی چاہیے۔ ان ساری باتوں کا جو تم نے مجھے سنائی ہیں، سامنے آنا ضروری ہے۔ انہیں یہ احساس تو ہو کہ ان کی وجہ سے تمہیں کتنی تکلیف پہنچی ہے"۔

یہ سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو جاتے۔ یہ مصطفٰے کو معلوم تھا۔ وہ مجھے صاف صاف بلیک میل کر رہا تھا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ امی اور مصطفٰے دونوں سے ٹکر لے

سکتی۔ میں اس کی منت سماجت کرتی کہ امی سے کچھ نہ کہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح چپ رکھنے کے لیے میں اس کی ہر جفاکارانہ من موج کو سہتی رہتی۔

عذاب گاہ سے باہر آتے ہی مجھے مجبوراً ایسی وضع اختیار کرنی پڑتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بدن پر جہاں جہاں نیل پڑے ہوتے ان پر تو میں جوں توں کر کے پردہ ڈال دیتی لیکن جو تذلیل میرے حصے میں آتی تھی وہ میری روح میں گھاؤ ڈالتی جا رہی تھی۔ امی کو پتہ چل گیا کہ میں کس مشکل میں ہوں لیکن انہوں نے کبھی اس بات کا کھل کر اظہار نہیں کیا۔ وہ اس چیز کی بڑی سختی سے قائل تھیں کہ آدمی کو اپنی، نجی زندگی سات قفلوں میں چھپا کر رکھنی چاہیے۔ میرے اعصاب ادھڑنے لگے۔ میں نے ویلیم کھانی شروع کر دی۔ والد صاحب کو اس پر حیرانی ہوئی اور انہوں نے مجھے ٹوکا۔ اس کے برعکس امی نے میری ویلیم خوری کو حق بجانب قرار دیا۔ کہنے لگیں کہ اپنے ذہنی کھچاؤ کو کم کرنے اور اعصاب کو تسکین دینے کے لیے اسے ویلیم کی ضرورت ہے۔ انہوں نے میری ذہنی کیفیت کی ممکنہ وجہ کی طرف کبھی بھول کر بھی اشارہ نہ کیا۔ وہ اس طرح بات کرتیں جیسے عام سا مشورہ دے رہی ہوں: "اگر شوہر کوئی عجیب یا غیر معقول رویّہ اپنا لے تو اسے بیمار سمجھو اور اس سے وہی سلوک کرو جو بیماروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بیمار کو طبی نگہداشت اور علاج معالجے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے میاں سے اسی طرح نمٹو"۔

میں نے ان کا مشورہ مان لیا۔ سوچا کہ شاید یہ نئی حکمت عملی کارگر ثابت ہو۔ میں نے مصطفٰے کے تشدد اور بدمزاجی کو بیمار ذہن کا شاخسانہ قرار دیا۔ اس پر غصے کا دورہ پڑتا تو میں طرح دے جاتی۔ میرے جسم کو اذیت پہنچتی رہی لیکن ذہن کی خلاصی ہو گئی۔

جلاوطنی کے پہلے دو مہینوں کے دوران مصطفٰے کو اپنی سیاسی مصروفیات سے نسبتاً فراغت حاصل رہی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فی الحال پاکستان واپس نہیں جائے گا۔ اس نے بھٹو صاحب کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ وہ خود کو دوسروں سے الگ تھلگ محسوس کر رہا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ حالات کروٹ لیں گے۔ اسے اپنی پرانی زندگی کے ٹھاٹ باٹ کی یاد ستانے لگی۔ وہ دوسرے درجے کا شہری بن کر جینے کا عادی نہ تھا۔ اسے اپنے ملازموں اور جھک جھک کر سلام کرنے والے چیلوں چانٹوں اور یاروں دوستوں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنے "حضور والا" ہونے کی یاد ستا رہی تھی۔ اسے بدیس میں زیادہ اچھا نہ لگتا تھا۔

بدلے ہوئے ماحول کا حصہ بننے میں مجھے کم دقت ہوئی۔ مجھے انگلینڈ میں رہنے میں مزہ آتا تھا۔ مجھے ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے خاصے مواقع ملے تھے اور کسی غم

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ملک میں قیام میرے لیے عام سی بات تھی۔ اجنبی ماحول مانوس معلوم ہوتا سینڈوچ کھانا اور ساتھ ہی ساتھ کوک پیتے ہانا برا بجاتا۔ مجھے آزادی کے اس احساس سے لگاؤ تھا جو پاکستان کے گھٹے گھٹے ماحول میں میسر نہ آ سکتا تھا۔ جتنی دیر ہم والد صاحب کی کوٹھی میں رہے، جو گولف کورس کے بالمقابل دو ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی، ہمیں کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ ہمارے معیارِ زندگی میں کوئی فرق آیا ہے۔ ہماری خدمت بجا لانے کے لیے دو نوکرانیوں، ایک عدد باورچی، ایک شوفر اور ایک بٹلر موجود تھا۔ مصطفٰے کو میرے والدین کی امارت سے چڑ تھی۔ ان کی وضع داری اور خوش اسلوبی سے، جو یوں لگتا تھا جیسے ان کی گھٹی میں پڑی ہو، وہ جل جاتا تھا۔ لیکن اس خوش سلیقگی اور رکھ رکھاؤ کو اپنانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے اجڈ پن اور ناشائستگی کی، ٹی شرٹ پر جلی حروف میں لکھے کسی نعرے کی طرح، نمائش کرتا پھرتا۔ بعض لوگوں کا وتیرہ ہے کہ اپنے سے برتر افراد سے جھک جھک کر اور اپنے سے کمتر لوگوں سے خروانہ بے نیازی کے ساتھ ملتے ہیں۔ مصطفٰے نے بڑے فنکارانہ انداز میں اس سے بالکل الٹ روش اختیار کی یعنی برتر افراد کے ساتھ خسروانہ بے نیازی سے اور کمتر لوگوں سے جھک جھک کر ملنے لگا۔ اس نے اس خاندان سے انتقام لینے کی ٹھان لی جو محض اپنی وضع قطع پر قائم رہ کر نادانستہ طور پر اسے کھِا رہا تھا۔ مصطفٰے نے ہمیں یہ کبھی نہ بھولنے دیا کہ اسے ہم سے کتنی کد ہے۔

میں جانتی تھی کہ اس پر کیا افتاد پڑی ہے۔ میں نے اسے سہارا دینا چاہا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ وہ بیمار ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ بچ بچ وطن کے لیے کلپ رہا تھا۔ وہ اس جاہ و حشم کی کمی محسوس کرتا ہے جو برسرِ اقتدار ہونے کے وقت اسے حاصل تھا۔ مجھے اپنے پر خاصی حیرت ہوئی۔ میرے تھکے ہارے ذہن نے گاہے گاہے تجزیہ کرنا اور حالات کی عقلی تاویلات ڈھونڈنی شروع کر دی تھیں۔ میں اس ماؤف حالت سے رفتہ رفتہ ہوش میں آ چلی تھی جو نامعقول تشدد اور احتیاط سے چنے وقفوں سے کی جانے والی تذلیل کی وجہ سے مجھ پر طاری تھی۔

اس کی محرومی، دربدری اور ناتواں ہو کر رہ جانے کے احساس کو اپنے پر طاری کر لینا اب میرے لیے ممکن ہو گیا۔ جب پاکستان میں اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی اور سیاست میں تازہ تازہ بار پانے والے اوچھوں نے اس کی طاقت ملیامیٹ کر ڈالی تو میں نے اس سے ہمدردی محسوس کی۔ جب ایک فوجی عدالت نے، اس کی غیر موجودگی میں، اسے چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی تو اس کی طرح مجھے بھی غصہ آیا۔ جب اس نے سنا کہ اس کی ماں جی اور اہل خانہ کو بےدری کے ساتھ اس کے گھر سے نکال دیا گیا ہے اور اس کے تمام منقولہ اثاثے ضبط کیے جا چکے ہیں تو میں جان گئی کہ اسے کتنا

قلق ہوا ہے۔ جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کے اپنے بھائیوں نے اس کے انتخابی حلقے میں دخل دیا ہے تو میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس کا حوصلہ بلند رکھنے کی کوشش کی۔ مصطفٰے خود کو بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی سرزمین کے اور اپنے درمیان جو دوری پیدا کر لی تھی اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی بدمزاجی اور دریدہ دہن فطرت کو معاف کرنے کی عادت ڈال لی۔ میں نے لاشعوری طور پر اپنے لیے یہ کردار چن لیا کہ غلطی چاہے کوئی کرے، غلطی کی سزا بھگتنا میرا کام ہے۔ میں نے اس شخص کو جس نے کبھی ایک پورے صوبے کے نظم و نسق کو انتہائی سخت گیری سے چلایا تھا۔ یہ اجازت دے دی کہ وہ میرا بندوبست بھی سنبھال لے۔ اس کا ہاتھ ایک دفعہ بھی نہ کانپا۔

خوش قسمتی سے نصیبہ اس کی پہنچ سے دور تھی۔ وہ ہر وقت میری بہنوں کے پاس رہتی جنھیں روایتی خالاؤں کی طرح اس کے ناز اٹھانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ یہ صورت حال میرے لیے اس لحاظ سے تسکین کا باعث تھی کہ غیر نارمل حالات میں رہنے والے اس غیر نارمل آدمی سے کم از کم نصیبہ کو بچاتے پھرنے کے دردِ سر سے تو مجھے نجات ملی۔

یہ بڑے صبر آزما دن تھے۔ اپنی حالت چھپانے کے لیے میں ہر وقت اداکاری کرتی رہتی۔ اس خیال سے میرا خون خشک ہوا جاتا تھا کہ کہیں میری ازدواجی زندگی کا بھرم نہ کھل جائے۔ میں نے مصطفٰے کو خوش رکھنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی۔ اس امر کو یقینی بنانے کی خاطر کہ ہم میں کوئی تصادم نہ ہو میں نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ میں تعلقات کو خوشگوار رکھنے کے لیے مسلسل جتن کرتی رہی۔ مصطفٰے نے میرے ذہنی انتشار کو بھانپ لیا اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ میں اپنے دردِ پنہاں کا کسی سے ذکر کرتی تو کیوں کر۔ مصطفٰے نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتایا جائے میں کسی پر تکیہ نہ کر سکتی تھی۔

میں گھر سے کہیں جاتی تو وہ خواہ مخواہ میرے بارے میں بدگمان ہوتا رہتا۔ میرا کہیں اکیلے جانا تو اسے سرے سے گوارا نہ تھا۔ وہ مجھ پر بھروسا کر ہی نہ سکتا تھا۔ متعدد بار امی نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ساتھ لنچ پر یا ڈاکٹر کے پاس یا محض شاپنگ کرنے چلوں۔ میں نے ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیا۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ یہ انکار صرف میری خودغرضی کا نتیجہ ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ اصل وجہ انہیں بتا دوں لیکن اس خوف سے کہ اس طرح میری دکھ بھری ازدواجی زندگی کا راز فاش ہو جائے گا، دل کی دل میں رہ جاتی۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہر پھر کر میں اس کے گن گانے پر اتر آتی۔ مصطفٰے تھوڑی دیر کے لیے سدھر جایا کرتا۔ اس وقت وہ ٹوٹ کر پیار کرنے لگتا۔ اکثر جب اس کی طبیعت میں وقتی طور پر گداز پیدا ہو جاتا، وہ مجھے اور میرے صبرو تحمل کو سراہتا: "تمھیں پتہ بھی ہے تم میرے لیے کتنی اہم ہو۔ تمھارے بغیر میں نامکمل ہوں۔ یہ میری زندگی کا ایسا دور رہا ہے جس میں میرے حصے میں ناکامیوں کے سوا کچھ نہیں آیا۔ یہ دور بھی گزر جائے گا۔ دیکھ لینا۔ میں بدل جاؤں گا اور اپنی تمام زیادتیوں کی تلافی کردوں گا۔ قریب تھا کہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے۔ صرف تمھاری محبت اور ارادت کی وجہ سے میرے ہوش وحواس بحال رہ سکے"۔

وہ جذباتی ہو جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے: "تم ایک بہت ہی مشکل وقت میری زندگی میں آئیں۔ میرے ارد گرد ہر چیز ڈھے چکی ہے لیکن تم میرے شانہ بہ شانہ کھڑی رہی ہو۔ کاش تم میری زندگی میں ذرا پہلے آئی ہوتیں تاکہ میں تمھیں زندگی کی تمام آسائشیں فراہم کر سکتا۔ میں نے تمھاری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے۔ مجھے سچ مچ افسوس ہے۔ کیا تم مجھے کبھی معاف کر سکو گی؟"

وہ میرے قدموں میں بیٹھ کر آنسو بہاتا۔ اعتراف کرتا کہ وہ مجھے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کر چکا ہے اور میری قوتِ برداشت اور لچک پر حیرت زدہ ہے۔ "میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تم اس تشدد کی تاب لا سکو گی جو میں نے تمھارے ساتھ روا رکھا ہے۔ میں ہمیشہ سمجھتا رہا کہ تم بہت نازک اور چھوئی موئی ہو۔ تم نے مجھے غلط ثابت کر دیا۔ تم طاقتور عورت ہو۔ تم واحد عورت ہو جس میں مجھ سے ذہانت کے ساتھ نمٹنے کی قوتِ برداشت موجود ہے۔ میں تمھیں ہرگز کبھی دغا نہ دوں گا۔ تم بھی وعدہ کرو کہ میرا ساتھ چھوڑنے کا خیال کبھی دل میں نہ لاؤ گی۔"

اس کے آنسوؤں سے پگھل کر، جو گویا مجھے گرداب سے نکال کر ساحل تک لے آتے، میں وعدہ کر لیتی۔

عدیلہ کو لاڈ پیار نے بگاڑ دیا تھا۔ اسے ہوکا تھا کہ لوگ ہر وقت اس کی طرف متوجہ رہیں اور اسے حسب منشا توجہ ملتی بھی رہتی تھی۔ اس کا قد پانچ فٹ چار انچ تھا اور جسم اتنا پُرکشش کہ نظر نہ ہٹے۔ مصطفٰے اور اس میں خوب نبھنے لگی۔ میری دوسری بہنوں نے مصطفٰے سے رسمی سا فاصلہ برقرار رکھا۔ وہ ابھی اس کے بارے میں اندازہ لگا رہی تھیں۔ عدیلہ سمجھ گئی کہ وہ اور مصطفٰے اصل میں یک جان دو قالب ہیں۔ عدیلہ کے لیے مصطفٰے کے پاس بہت وقت تھا۔ وہ اس کی ناز برداری کرتا اور شرارتوں اور چٹکلوں کا لطف لیتا۔ وہ اس کی ایسی ایسی شوخیاں معاف کرنے پر آمادہ رہتا جو اگر میں کرتی تو

لامحالہ میرے منہ پر زناٹے کا تھپڑ پڑتا۔

ابتدا میں تو میں نے اس میل جول کو بڑھنے دیا۔ یہ دل کو بھلا لگتا تھا کہ مصطفٰے نے اپنا آمرانہ مکھوٹا اتار کر رکھ دیا ہے اور بڑا بھائی بنا ہوا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ میری بہنوں میں سے اس نے اپنے خصوصی التفات کے لیے صرف عدیلہ کو کیوں چنا ہے۔ میں جان گئی کہ یہ التفات دو طرفہ ہے۔ عدیلہ کو اپنے التفات کے بدلے میں کہیں زیادہ التفات مل رہا ہے۔ میری دوسری بہنوں کی نظر میں مصطفٰے ایک جاگیردار تھا۔ انھیں احساس تھا کہ ان کی اور ان کے بہنوئی کی عمر میں بہت فرق ہے۔ اس کی موجودگی میں یا اس سے گفتگو کرتے وقت ان کا رویہ شائستہ رہتا۔ انھوں نے اپنے اور اس کے درمیان ایک بڑی واضع لکیر یہ جتانے کے لیے کھینچ دی تھی کہ ان کے تعلقات کی بس ایک حد ہے۔ عدیلہ کسی قسم کی حدود کی پابند نہ تھی۔ ہم نے اس کے کھلم کھلا عشووں غمزوں کو لڑکپن کی خودرائی پر محمول کیا۔

میرے والدین مشرق وسطیٰ چلے گئے۔ عدیلہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔ اب ہم دونوں کے علاوہ گھر میں یا نصیبہ تھی یا ملازم تھے۔ ان پندرہ دنوں کے دوران مصطفٰے بہت چڑ چڑا اور بے چین رہا ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر مجھ سے ہولناک انداز میں لڑتا جھگڑتا۔ اب سارا گھر اس کی تحویل میں تھا اور اسے پتہ تھا کہ وہ بلا خوف وخطر ٹھکائی کر سکتا ہے۔ ایک بار میں نے فون پر اپنے بھائی سے بات کی تو اس پر بگڑ بیٹھا۔ اس کے خیال میں ہم فون پر بہت دیر بات کرتے رہے تھے۔ "تم اس سے اتنی دیر کیوں باتیں کرتی رہیں؟ وہ تمھارا بھائی ہے یا تمھارا یار ہے؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "وہ میرا بھائی ہے، مصطفٰے "حد ہو گئی" "مجھے جواب دے رہی ہو تم؟" میں یہ سیکھ چکی تھی کہ اسے جواب دینے کی جرات کبھی نہ کرنی چاہیے۔ جواب دنیا گستاخی کی انتہا تھا۔ بغاوت کی پہلی سرسراہٹ، جسے جاگیردارانہ پاؤں تلے کچل دیا جانا ضروری تھا۔ وہ میری جانب سے اس برائے نام جسارت کو بہانہ بنا کر مجھے مارا پیٹا کرتا۔

ایک بار مجھ پر پل پڑنے کے بعد اس نے مجھے اتنے زور کی لات ماری کہ میں سیڑھیوں پر لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری۔ میں ابھی وہاں نیچے مڑی تڑی گٹھری بنی پڑی تھی کہ وہ سیڑھیوں سے دوڑتا ہوا اترا اور پہلے کی طرح وحشیانہ انداز میں مجھے گھونسے اور لاتیں مارنے لگا۔ میری پسلیاں ہل گئیں لیکن تکلیف کا احساس تو اضافی چیز ہے۔ جب اس کے مکے اور لاتیں میرے جسم پر کھیں اور برسنے شروع ہوئیں تو میں پسلیوں کو بھول گئی۔ اس بے رحمانہ تشدد کے دوران مصطفٰے سے میں نے پہلی بار کہا: "میرے اباجی کا گھر ہے۔اور میرے خیال میں تمھیں یہاں مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرات نہیں ہونی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

چاہیے۔" سناٹا چھا گیا جیسے مصطفٰے کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ میری زبان پر پہلی بار وہی کچھ آ گیا تھا جو میرے دل میں تھا۔ اتنا کہہ کر میں نے ایک بات اور اس پر واضح کر دی تھی۔ میں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ میں اس کی ملکیت نہیں بلکہ میرے اور بھی رشتے ہیں جو اس بندھن سے، جس نے مجھے اس کے ساتھ نتھی کر دیا تھا، کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ خون کے رشتے۔ یہ ایسی بات ہے جسے جاگیردار سمجھ سکتا ہے اور بورژوا طبقے کے لوگ ہیچ پوچ قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ میں نے پہلی بار دیدہ و دانستہ اسے الٹ کر جواب دیا تھا۔

اب اس کا غیظ وغضب اور بڑھا تو نشانہ میں ہی بنی۔ اس روز اس نے مجھے اتنا مارا اتنا مارا کہ میں تقریباً بیہوش ہو گئی۔ میری چیخیں کمزور پڑتے پڑتے تھکی ہاری آہوں میں تبدیل ہو گئیں۔

بعد ازاں، مزید پٹائی سے بچنے کے لیے، میں نے اپنے کہے پر معافی مانگ لی۔ مجھے احساس تھا کہ مصطفٰے اندر سے بل گیا ہے۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے کچل ڈالنے کے لیے اب کوئی اور منصوبہ بنائے گا۔

میرے والدین واپس آ گئے۔ عدیلہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ دیر کے لیے داتا کلکل سے میری جان چھوٹ گئی۔ پھر میرے والدین، عدیلہ کو ہمارے پاس چھوڑ کر دو دن کے لیے گلمبرگ چلے گئے۔ عدیلہ کو سکول سے چھٹی کرنے کی سوجھی۔ ایک دن پہلے اس نے مجھے منا لیا کہ میں اسے کلاسیں گول کرنے دوں۔ اس نے ہم دونوں کے لیے پروگرام ترتیب دیا۔ "میں نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ جب وہ باز نہ آئی تو میں نے اس کی بات مان لی۔ اس دن رات گئے وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اس نے اپنا پروگرام بدل لیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ سب نوجوانی کی تلون مزاجی کا اظہار ہے۔

اگلی صبح ہمارا ڈرائیور ایرک نہیں آیا اور عدیلہ پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی مصطفٰے کو لندن جانا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ وہ عدیلہ کو سکول اتارتا جائے۔ وہ چلے گئے۔ میں نے انہیں رخصت کیا اور دوبارہ نصیبہ اور اس کے معمولات میں الجھ گئی۔

سہ پہر کو عدیلہ کا فون آیا: "آج میں سکول نہیں گئی۔ میں اپنی ایک سہیلی کے گھر اتر گئی تھی۔" "تم نے ایسی حرکت کیوں کی؟" "ابھی تو آدھے دن کی کلاسیں چھٹی ہیں۔ میں اب چلی جاؤں گی۔ شام کو مجھے لینے کے لیے ایرک کو سکول بھجوا دو گی؟" اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے شوفر کو بھیج دیا کہ اسے لے آئے شام کو عدیلہ گھر آ گئی۔ بات رفت گزشت ہوئی۔

عدیلہ اب اور ہی راستے پر چل نکلی تھی۔ وہ میرے مصطفٰے کے درمیان تفرقہ ڈالنے

میں مصروف تھی۔ پہلے میں سمجھی کہ وہ یہ سب کچھ بھولے پن میں کر رہی ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی حرکات کو محض اتفاق قرار دینا ممکن نہ رہا۔ بھولے پن کی آڑ میں ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کیا جا رہا تھا۔ اسے ہماری زندگیوں کے ان تمام گوشوں کا علم تھا جن میں کسی کو جھانکنے تک کی اجازت نہ تھی اور وہ بڑی ڈھٹائی سے ان میں دندناتی پھرتی تھی۔ میرا سابق شوہر، انیس، انہیں حساس موضوعات میں سے ایک موضوع تھا۔ چنانچہ وہ اٹھتے بیٹھتے انیس کا ذکر کرتی رہتی۔ بڑی معصومیت سے مصطفٰے کو بتاتی کہ میں انیس سے شادی کرنے کے لیے کس طرح مری جا رہی تھی۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی چٹکیاں وہ بڑے حساب سے مصطفٰے کی دکھتی رگوں میں بھرتی رہتی۔ مصطفٰے کے غضب کا نشانہ مجھے بننا پڑتا۔ تشدد کا جو راتب روز رات کو مجھے ملتا تھا اس کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

عدیلہ کی دیدہ ودانستہ بے حسی میری دوسری بہنوں سے چھپی نہ رہ سکی۔ انہوں نے اسے ٹوکا۔ عدیلہ نے ان کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی حرکتیں جاری رکھیں۔ اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ مصطفٰے کو میرے خلاف زیادہ سے زیادہ برافروختہ کیا جائے۔ جس طرح وہ میرے ماضی میں مخل ہو رہی تھی اور اس کی مداخلت کا جو نتیجہ میرے حال پر مرتب ہو رہا تھا وہ مجھے بہت برا لگا۔ مصطفٰے جس طرح اس کے ناز اٹھاتا تھا اس کی وجہ سے بھی میں کبیدہ خاطر ہوئی۔ میں نے مصطفٰے کو بتا دیا کہ اس بارے میں میرے جذبات کیا ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ عدیلہ کی طرف بہت زیادہ متوجہ ہے اور عدیلہ اس بات سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ میں نے کہا کہ میں عدیلہ کو ڈانٹوں گی اور کہوں گی کہ اپنی کم عمری کا لحاظ کرے اور ایسی حرکتوں سے باز رہے جو اسے زیب نہیں دیتیں۔

پہلا دھماکا منو نے کیا۔ اس نے امی کو بتایا کے عدیلہ میرے اور مصطفٰے کے درمیان مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ امی نے یہ الزام کھڑے کھڑے مسترد کر دیا۔ عدیلہ ان کی سب سے لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ کوئی غلط بات کیسے کر سکتی تھی! انہوں نے الٹا ہم پر الزام دھرا کہ ہم خواہ مخواہ کی خواہرانہ رقابت کو جنم دے کر ان کی "چاند سی بٹو" کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔

ادھر "چاند سی بٹو" اب کھلم کھلا یہ ظاہر کرنے لگی جیسے مصطفٰے پر اس کے سوا کسی کا حق نہ ہو۔ وہ دونوں خاصا وقت ساتھ گزارتے۔ بظاہر مصطفٰے اسے کوئی پٹی پڑھا رہا تھا۔ وہ آپس میں ایسا ہنسی مذاق کرتے جسے کوئی اور نہ سمجھ سکتا اور میرا تمسخر اڑانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو یکجا کر لیتے۔ "دیکھو عدیلہ، تہمینہ کی حرکتیں تو دیکھو۔ یہ تم سے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جلتی کیوں ہے؟" ہاں، میں نے سوچا۔ پہلے چاقو گھونپو اور پھر اسے بل پر بل دو تاکہ ایذا دونی ہو۔ جب بھی میں بڑی ہونے کے ناتے عدیلہ پر رعب ڈالنا چاہتی تو وہ فوراً اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوتا اور سب کے سامنے اعلان کرتا کہ "تہمینہ عدیلہ سے حسد کرتی ہے" اب مجھے بے سبب مارپیٹ اور نامعقول رویے کے علاوہ عدیلہ کی پیدا کردہ مشکلات سے بھی نمٹنا پڑتا۔ غرض کہ ایک لمحے کے لیے بھی چین نہ تھا۔

جب ہم نے والدین کی رہائش گاہ چھوڑی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہم جام صادق علی کے مکان میں اٹھ آئے جو ہیمپ سٹیڈ میں واقع تھا۔ جام صاحب بہت مہربان آدمی تھے۔ میں ان کی بہت گرویدہ ہو گئی۔ وہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے رہے۔ اس بڑے مکان میں، جہاں ان کا پورا کنبہ تھا، ہمارے پاس اپنا بیڈروم تھا۔ نصیبہ اور دائی عائشہ کو میں پیچھے ہی چھوڑ آئی تھی۔

مصطفٰے بے چین تھا۔ لگتا تھا کہ جگہ کی تنگی سے پریشان ہے ہم لامحالہ خاصا وقت میرے والدین کے پاس گزارتے۔ مصطفٰے کو بیشتر وقت سسرال چلنے کی پڑی رہتی۔ مجھے وہاں جانے کا اتنا اشتیاق نہ تھا۔ وہ بضد ہو کر اس بات کو بھی وجہ نزع بنا لیتا۔ مجھے ہار ماننی پڑتی۔ عدیلہ کی وجہ سے میں اپنے گھر جانے سے متنفر تھی اور مصطفٰے عدیلہ ہی کی وجہ سے وہاں جانا چاہتا تھا۔ ہمارے اس مثلث کی ایک مشترکہ اساس موجود تھی۔

ابھی کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی جس پر گرفت کی جا سکتی۔ اس وقت تک مجھے صرف عدیلہ کی لگائی بجھائی سے چڑ تھی۔ مصطفٰے کا جی ایسی باتوں میں بہت لگتا تھا۔ وہ میرے بارے میں حاصل ہونے والی ہر طرح کی معلومات کو خود میرے خلاف استعمال کرنے کے فن میں طاق تھا۔ عدیلہ ہنسی خوشی اسے خام مواد فراہم کرتی رہتی جسے وہ زہر بھرے بغض میں ڈھالتا جاتا۔

ایک اتوار کا ذکر ہے۔ ہم دن گزارنے میرے والدین کے ہاں پہنچے ہوئے تھے۔ مصطفٰے پاتیو میں یوگا کی ورزشوں میں مشغول تھا۔ عدیلہ مسحور ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ میرا بھی اس پُرسکون ماحول میں گزر ہوا۔ "اگر تمہیں یہ ورزشیں کرنی ہی تھیں تو آنے سے پہلے گھر پر کر لیتے۔ یہاں کس لیے کر رہے ہو؟" وہاں عائشہ دائی بھی موجود تھی۔ مصطفٰے بے پروائی سے اس سے مخاطب ہوا اور بولا: "بیگم صاحبہ کو ان کے لمبے لمبے بالوں سے پکڑ کر باہر پھینک دو۔" شرم کے مارے میری تو جان ہی نکل گئی۔ عدیلہ کھی کھی کرنے لگی۔ میں کوئی ردعمل تک ظاہر نہ کر سکی۔ مصطفٰے نے ایک زندہ عضو کو اپنا تختۂ مشق بنا کر گاجر مولی میں تبدیل کر دیا تھا۔ میرا ذہن باقی نہ رہا تھا۔ دماغ مردہ ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ میں کہاں پہ ہوں یا میرا کوئی وجود ہے بھی۔ میں مبہم سے انداز میں موجود تھی۔

دھندلی سی شبیہ۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا میں وجود رکھتی ہوں۔ اول اول تو میری دونوں دنیائیں ایک ایسے راستے پر چل رہی تھیں جہاں ان میں تصادم ناگزیر تھا۔ اب وہ دونوں ساز باز کر کے میرے خلاف صف آرا تھیں۔ مصطفٰے اور میرے گھر والے درپے تھے۔ میرے سکتہ زدہ ذہن کے خلاف کبھی نہ رکنے والی جنگ لڑ رہے تھے۔ میرے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ مجھے بڑی استادی سے بے یارومددگار چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں اس تحفظ سے محروم ہو چکی تھی جو مجھے میکے کی طرف سے ملنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنی بیٹی نصیبہ، کا سہارا لیا۔ میں اس سے لپٹ کر سسکیاں بھرتی رہتی۔ میری سونی دنیا میں صرف اس کی ذات ایسی تھی جو میرا دکھ درد سمجھ سکتی تھی۔ اس کی گرماہٹ کے سوا میری دل جوئی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔

مجھے چاہیے تھا کہ اپنا سامان اٹھاتی اور مصطفٰے کو چھوڑ کر چلی آتی۔ میں نے یہ کیوں نہ کیا؟ معاملہ اتنا سیدھا نہ تھا۔ میں ایک کنویں میں جا گری تھی اور باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کیچڑ میں اٹی دیواریں بہت پھسلواں تھیں اور باہر نکلنے کے لیے جتنا زیادہ زور درکار تھا وہ مجھ میں کہاں تھا۔ میں کبھی ابھرتی کبھی ڈوبتی۔ بمشکل تیراکی۔ میرا دم گھٹنے میں ذرا سی کسر رہ گئی۔ اتنی مہلت ہی نہ ملی تھی کہ بچ نکلنے کی کوئی ترکیب سوچ سکتی۔ انہوں نے فرش پر پینٹ کر کے مجھے ایک کونے میں دھکیل دیا تھا اور مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ تازہ پینٹ پر چلتی ہوئی آزادی کی فضا میں جا نکلتی۔

والد صاحب کے گھر میں نیند میں چلنے والی کسی عورت کی طرح قدم اٹھاتی میں غسل خانے میں گئی اور کھڑی کھڑی دواؤں کی الماری کو تکتی رہی۔ میں نے الماری کھولی۔ چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی کیپسولوں سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے شیشیوں کا جائزہ لیا۔ ان میں سے بعض پر صلائے عام کے انداز میں "زہر" لکھا ہوا تھا۔ ایلس* کی طرح میرا تجسس بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میرے لیے اب زندہ رہنا ممکن نہیں۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ یکایک ایک کوندا سا لپکا اور سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ میں نے دواؤں کی الماری کے سامنے کھڑے کھڑے ایک بے لحاظ فیصلہ کیا۔

میں جس وبال میں پھنس چکی تھی اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ ممکن ہی نہ رہا تھا کہ میں زندہ لوگوں کی نقل اتارے چلی جاؤں۔ کوئی تعلق تڑاخ سے ٹوٹ گیا تھا۔ میں بالکل تنہا تھی۔ اپنی زندگی کے لیے ذمے دار صرف میں ہی تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ہمارا خدائے بزرگ و برتر فوت ہو چکا ہو اور اپنے پیچھے جو خلا چھوڑ گیا ہو وہ انتہائی ہولناک ہونے کی وجہ سے ناقابلِ برداشت ہو۔ آدمی خودکشی اس وقت کرتا ہے جب اسے سہارا

---

*"ایلس ان ونڈر لینڈ" کی ہیروئن

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

دینے والی تمام جہات منہدم ہو چکی ہوں۔ یہی وہ پل تھا جس کے دوران میں نے جان لیا کہ میرا فیصلہ حتمی ہے۔ یہ فیصلہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

میں جام صاحب کے گھر لوٹی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔ سوچتی رہی۔ مجھے نصیبہ کا خیال آیا لمحے بھر کے لیے میں ڈانواں ڈول ہوئی۔ لیکن میرے

ذہن میں برپا ہیجان اس قدر مہیب تھا کہ یہ نہی تک، جس کے میں ہر رات خواب دیکھتی تھی اور اس ادھیڑبن میں مبتلا رہتی تھی کہ اس کے ناشتے کے لیے کیا تیار کرنا ہے، اس طرح دھندلا کر غائب ہو گئی جیسے شام کے جھٹپٹے میں سائے ماند پڑ جاتے ہیں۔

میں نے شیشی کھولی۔ گولیاں نگل لیں۔ میں اپنی کوشش کو بالکل یقینی بنانا چاہتی تھی۔ میری یہ مرضی قطعاً نہ تھی کہ اتفاقاً کچھ اور ہو جائے۔ جو کچھ میں کر رہی تھی وہ نہ تو کوئی خالی خولی دھمکی تھی نہ مدد یا توجہ حاصل کرنے کے لیے میرے بھٹکے ہوئے ذہن کی پکار۔ میں نے جتنی گولیاں ہتھیلی میں سما سکیں شیشی سے انڈیل لیں۔ میں نے ہتھیلی پر لکیروں کو لہراتے اور جگہ بدلتے دیکھا۔ میں اپنی قسمت کی لکیر کو بدل رہی تھی۔ میں لڑکھڑائی اور میں نے ایک موج کو بل کھا کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ مجھے امن چین میں نہلاتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئی۔

تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مصطفےٰ کو اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تو میں فرش پر چت پڑی تھی۔ مجھے وہاں اس طرح بے سدھ پڑے پڑے آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ میری جان دھیرے دھیرے نکلتی جا رہی تھی۔ مصطفےٰ نے جام صاحب کو بلایا اور ان دونوں نے میرے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر مجھے ہوش میں لانا چاہا۔ میں بدستور لازمانیت کی امواج میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان موجوں کی ختم نہ ہونے والی گرج مجھ پر لوری کا سا اثر کر رہی تھی۔ انہوں نے کسی ڈاکٹر قریشی کو بلایا جو جام صاحب کا جاننے والا تھا۔ اس نے فوراً ایمبولنس طلب اور مجھے جھٹ پٹ ہیمپ سٹیڈ میں رائل فری ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ مجھے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں لے جایا گیا اور میں زندگی سے چمٹی رہی۔ وہاں ڈاکٹر نے مصطفےٰ کو بتایا کہ زہریلے مادے میرے خون سرایت کر چکے ہیں۔ "کیا یہ بچ جائے گی؟" "کیا یہ جی دار ہے؟" "ہاں۔" تو پھر بس ہم اس کی جی داری پر ہی تکیہ کر سکتے ہیں۔" میں جی داری نہیں دکھا رہی تھی۔ لیکن ابھی میرا وقت نہیں آیا تھا۔ اس رات میری حالت انتہائی تشویش ناک رہی۔

مصطفےٰ نے میری بڑی بہن، روبینہ، کو فون کیا جو ان دنوں امی اور ابا سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ "تہمینہ نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے"۔ اس نے روبینہ کو بتایا "خدا [illegible] ہے۔ وہ پاگل ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم آ جاؤ اور ہاں۔۔۔۔۔ اپنے والدین سے

اس کا ذکر نہ کرو تو اچھا ہے۔ وہ گھبرا جائیں گے"۔ روبینہ دوڑی چلی آئی۔

رات گزر گئی۔ میں اپنے جسد خاکی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ زندگی اور موت کے درمیان واقع جھٹپٹوں کی اس دنیا میں کس طرح کے خواب دکھائی دیتے ہیں؟ میرے خواب تو سہانے نہ تھے۔ دن گزرا۔ ایک اور رات آئی۔ میں ابھی تک موت سے نبرد آزما تھی۔ میں ہار ماننے کو بالکل تیار نہ تھی۔

بالآخر مجھے ہوش آ گیا۔ میں گھر لوٹ آئی۔ مجھ پر دہشت چھائی تھی۔ مصطفےٰ مجھے امی کے گھر لے گیا۔ میں ابھی تک مدہوش سی تھی اور مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ امی ایسی بن گئیں جیسے انہیں کچھ علم ہی نہ ہو۔ تجاہلِ عارفانہ کی اس سے زیادہ مکمل مثال پیش کرنی مشکل ہے۔ والد صاحب نے وہی کیا جو انہیں بتایا گیا تھا اور اس موضوع کو چھیڑا تک نہیں۔

میں مصطفےٰ کے ردعمل کے بارے میں پریشان تھی۔ وہ مجھ سے بہت ناراض تھا۔ اس نے مجھ پر غصہ اتارنے میں کسر باقی نہ رکھی۔ اس نے مجھے میری بے حسی پر لتاڑا۔ "تمہاری وجہ سے میری سبکی ہوئی" وہ درشت لہجے میں بولا"۔ تمہیں پتہ بھی ہے مرد ڈاکٹر تمہارا معائنہ کرتے رہے ہیں۔ مرد ڈاکٹر! تم نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ تمہیں اس احمقانہ فعل کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ دیکھتی جاؤ"۔

جب میں بیہوشی کی گہرائیوں سے ابھر کر سطح پر پہنچی تو مصطفےٰ کا قہر سر پر منڈلاتا دکھائی دیا۔ میرا خون خشک ہو گیا۔ جان بچ جانے کی مجھے کوئی خوشی نہ تھی۔

امی کی خواہش تھی کہ رات میں انہیں کے پاس گزاروں۔ ان کے ہاں کچھ اور مہمان بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ سٹڈی روم میں ہمارے لیے بستر لگا دیا گیا۔ مجھے فوراً ہی نیند آ گئی۔ بڑی دیر بعد کہیں آدھی رات گئے، مجھے لگا کہ کمرے میں کوئی ہے۔ مجھ پر ابھی تک سکون آور دواؤں کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ یونہی سا یاد پڑتا ہے کہ مجھے ایک صورت دکھائی دی۔ مصطفےٰ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ مجھ پر نیند کا بڑا غلبہ تھا اور مجھے ٹھیک طرح کچھ علم نہ تھا کہ میں ہوں کہاں پر۔ میں دوبارہ سو گئی۔ خاصی دیر بعد میری آنکھ پھر کھلی۔ میں نے جبلتاً مصطفےٰ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ بستر میں نہ تھا۔ بستر میں وہ جگہ، جہاں وہ لیٹا تھا، ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ کمرے میں کوئی آیا تھا اور مصطفےٰ اٹھ کر چلا گیا تھا۔ کیوں چلا گیا تھا؟ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ میں گرتی پڑتی بستر سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ میں نے لڑکھڑاتی چال سے کچن کا رخ کیا۔ میرے دیکھتے دیکھتے ایک سایہ دوڑ کر سیڑھیاں چڑھا۔ مصطفےٰ، جس نے پورے کپڑے نہیں پہنے ہوئے تھے، تیزی سے قدم اٹھاتا میری طرف آیا۔ "تم باہر کیوں آ گئیں؟" اس کی آواز واضح طور پر کھسیانی ہوئی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

علی کی پیدائش سے پہلے، لندن میں

معلوم ہو رہی تھی۔ "میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔" "جا کے سو جاؤ۔ تمہیں اس حالت میں ادھر اُدھر نہیں پھرنا چاہیے"۔ میں اتنی تھکی ہوئی تھی کہ اس وقت اس پر الزام دھرنے کی نیت سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ کر سکی۔ صبح مجھے زیادہ ہوش تھا۔ "رات کیا ہوا تھا؟ کوئی کمرے میں آیا تھا۔ کون آیا تھا؟" "اوہ، وہ تو عدیلہ آئی تھی۔" "عدیلہ؟" "ہاں، اس پر ایک مشکل آ پڑی ہے۔ اس کا کسی ایرانی لڑکے سے میل جول ہے۔ اس میل جول کے حوالے سے اسے بعض مسائل کا سامنا ہے۔ اسے کچھ مشورہ چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے بات چیت کرنے آئی تھی۔" "اچھا؟" "تم سو رہی تھیں۔ میں تمہاری نیند خراب نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اسے لے کر ناشتے کے کمرے میں چلا گیا"۔ "تمہیں اس سے یہیں بات کرنی چاہیے تھی۔ آدھی رات گئے اس سے اکیلے میں باتیں کرنا تمہارے لیے نامناسب تھا۔ فرض کرو، اس وقت میرے والد صاحب نیچے آ جاتے"۔

مصطفےٰ اپنی کہانی پر اڑا رہا۔ اس نے مجھے یقین دلا کر چھوڑا کہ عدیلہ کا واقعی کسی ایرانی لڑکے سے میل جول تھا اور وہ اس ضمن میں بات چیت کرنے کی خواہاں تھی۔ وہ مصطفےٰ پر، اسے اپنا بڑا بھائی سمجھ کر، اعتماد کرتی تھی۔ اور اپنی راز کی باتیں صرف اسی کو بتاتی تھی۔ وہ اسے صحیح مشورے دیتا رہے گا تاکہ عدیلہ کو نہ تو کوئی دکھ یا ضرر پہنچے اور نہ اس سے کوئی احمقانہ حرکت سرزد ہو۔ مصطفےٰ نے اب خاندان کی عزت آبرو کے محافظ کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔

دوسروں سے اپنی بات منوا لینے میں مصطفےٰ کا جواب نہ تھا۔ میں صرف اسی سمت میں قدم اٹھا سکتی تھی جو اس نے میرے لیے متعین کر دی ہو۔ اپنے طور پر کچھ سوچنا جرم تھا جس کی سزا دینے کا حق اسے حاصل تھا۔ اس نے اپنے اصول، اپنے آدرش مجھ پر تھوپ دیئے۔ اس کے بعض عقائد ان تمام باتوں کے بالکل الٹ تھے جو میری دانست میں درست تھیں۔ ان عقائد سے سراسر ازمنۂ وسطیٰ کے ماحول کی بو آتی تھی۔ وہ تعصبات، توہمات اور بڑی بوڑھیوں کے روایتی معتقدات کے ایک آمیزش کی پیداوار تھے۔ لیکن اسے تعقل پسندانہ اور مدلل مباحثے میں حصہ لینے پر کسی طرح آمادہ کیا ہی نہ جا سکتا تھا۔

جن اوامر کی پابندی اس کے نزدیک لازمی تھی ان کی فہرست میں ان خیالات کی جگہ بہت اوپر تھی جو عورت کے رول کے حوالے سے اس کے ذہن میں تھے۔ عورت کی عزت اسی میں تھی کہ وہ شوہر کی امنگوں اور اوٹ پٹانگ ترنگوں کے مطابق زندگی گزارے۔ عورت مرد کی کھیتی ہے۔ "یہ قرآن میں آیا ہے" وہ کہتا۔ میں اس آیت کی اور طرح تشریح کرتی۔ میرے خیال میں کھیتی سے صرف اسی صورت میں کچھ حاصل ہو سکتا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

...ی بہن عدیلہ، اسکی شادی رئیس مطلوب کے ساتھ 1982ء میں ہوئی

مصطفےٰ کھر لندن میں، 1983ء

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

حمزہ کی پیدائش سے پہلے

میرا بیٹا علی 1988ء میں

میری بیٹی نصیبہ

مصطفےٰ کھر سے پہلی بار علیحدگی کے بعد۔ "مار بیلا" میں سکونت کے دنوں میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہے جب اس کی اچھی طرح دیکھ بھالی کی جائے اور اسے موسمی تغیرات کے اثرات اور کیڑے مکوڑوں سے بچایا جائے۔ یہ رومانی نقطۂ نظر تھا۔ جاگیردار اپنی کھیتی کو عزیز رکھتا ہے تو صرف یہ دیکھ کر کہ وہ اس کے کتنے کام آ سکتی ہے۔

وہ زمین کے گرد حصار کھینچے گا، اس کی حفاظت کرے گا۔ اگر وہ بنجر ہو گی تو اسے نظر انداز کر دے گا۔ اس کے قریب نہ پھٹکے گا۔ اس کی دیکھ بھال کا کام دوسروں پر چھوڑ دے گا۔ اس کے لیے زمین اقتدار اور جاہ کی نشانی ہے۔ زمین جاگیر ہے۔ لٰہذا جاگیردار کی عورت پر بھی فرض ہے کہ وہ خود کو سر سے پیر تک ڈھانپے رہے، مسکین دکھائی دے، بیٹے پیدا کرے، اجنبیوں کے سامنے نہ آئے اور جاگیردار کی ضروریات کو پورا کر کے اسے خوش رکھے۔

مصطفےٰ ایسا جاگیردار تھا جسے ایک مختلف دنیا کی ہوا لگ چکی تھی۔ اس کی اقدار میں تھوڑی بہت دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ اپنے ذہنی انتشار کی وجہ سے وہ مجھ سے ایسا سلوک کرنے لگا جیسے میں اس کی ساتھی ہوں۔ وہ میرے ساتھ اپنی سیاست پر بات چیت کرتا اور مجھ سے توقع رکھتا کہ میں سیاست میں سرگرمی سے حصہ لوں گی۔ اس کے باوجود وہ مجھے سر نہ اٹھانے دیتا۔ مجھے گھر میں بند رکھنا چاہتا۔ میں محض دیوار تھی جس پر وہ اپنے خیالات گیند کی طرح مارا کرتا اور وہ ٹکرانے کے بعد واپس اس کے پاس پہنچ جاتے۔ میرا کام بس وہاں موجود ہونا تھا۔ میری طاقت اسی جمود میں پنہاں تھی۔ اس کے خیالات کو کوئی نیا رخ دینا یا انہیں کسی طرح بدل ڈالنا میری بساط سے باہر تھا۔

شادی کے پہلے چند برسوں اور ہماری جلاوطنی نے مجھے ایسی ٹھوس عورت بنا دیا تھا جس کی اپنی کوئی مرضی، سوچ یا جذبہ نہ ہو، جو بس دوسروں کے اشاروں پر چلتی رہتی ہو۔ مجھے یہ حق بھی حاصل نہ رہا تھا کہ میں کسی چیز کی خواہش ہی کر سکوں۔ مسئلہ کوئی بھی ہوتا، میں نہ اس پر کبھی غور کرتی نہ اس کا تجزیہ۔ مجھے بس یہی فکر رہتی کہ کون سی ترکیب لڑا کر کسی نہ کسی طرح دن اور پہاڑ سی رات کاٹی جائے۔ یہ اندیشے میرے ذہن پر سوار رہنے لگے کہ مصطفےٰ مجھے سزا دینے کے لیے نصیبہ کو مجھ سے چھین لے گا۔ ہر روز ایک نیا معرکہ گرم ہوتا جس کے دوران دشمن کو میں یہ موقع نہ دیتی کہ وہ میری بیٹی نصیبہ کو جو میری ہوش مندی کی آخری اور رہی سہی نشانی تھی، کوئی تکلیف پہنچائے یا اٹھا لے جائے۔ میں اسے مصطفےٰ کی غضب ناکی اور بد مزاجی سے بچائے رکھتی۔ اسے مصطفےٰ سے دور رکھنے کی ترکیبیں اٹھانے پر خاصا وقت صرف کرتی۔ میں ایک بار پھر حاملہ ہو گئی تھی اور ان پستیوں سے بری طرح خوف زدہ تھی جن تک جان بچانے کے لیے مجھ اترنا تھا۔

ہم ہیمپ سٹیڈ میں کرائے کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ عدیلہ کے تازہ ترین

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

واقعے نے جن وسوسوں کو جنم دیا تھا انہوں نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک مبہم سا احساس تھا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ نسوانی وجدان کا کرشمہ جو ایک نیم مردہ ذہن میں معمول سے زیادہ سرگرم عمل تھا۔

مصطفےٰ نے میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کو دعوت دی کہ وہ ہمارے ساتھ آ کر رہیں۔ میں نے نصیبہ کو امی کے پاس چھوڑا۔ میرا دوسرا بچہ پیٹ میں یونہی سا محفوظ، میرے پاس رہا۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا تھا کہ میری ناکام خودکشی سے بچے پر کوئی مضر اثر نہ پڑا تھا۔ میرا اب پانچواں مہینہ جا رہا تھا۔

فلیٹ بہت گھساپٹا تھا۔ گنجائش کم، کمرے تنگ، اس میں دم گھٹتا جاتا تھا۔ بڑا بیڈروم میرے اور مصطفےٰ کے پاس تھا۔ دوسرے چھوٹے کمرے میں میر اور شاہنواز نے ڈیرے ڈال دیئے۔ فلیٹ میں ہر وقت ان کے دوست موجود رہتے جن کے نہ سونے کے اوقات متعین تھے نہ صبح اٹھنے کے جہاں جگہ ملتی وہیں پڑ کر سو جاتے۔ ایک وقت میں تو فلیٹ پر ہپیوں کے اجتماعی بسروں کا گمان ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان مل جل کر بسیرا کرنے والوں کو سچ مچ کے "اقتدار" سے دلچسپی تھی۔

مجھے ان دونوں آدرش پسند نوجوانوں سے لگاؤ ہو گیا جن کے اس کیریر کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا جس کے دوران انہوں نے ایسے اسیر کبیر دہشت پسندوں کے روپ میں سامنے آنا تھا جو دہشت گردی کے منصوبے تیار کرتے رہتے ہوں۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ میری کیا گت بنی ہوئی ہے۔ ان کا پس منظر وہی تھی جو میرے طبقے کا تھا اور انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میں سخت مشکل میں گرفتار ہوں۔ فلیٹ کو رہائش کے زیادہ قابل بنانے کی غرض سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آتے جاتے وقت میں شاذ ہی کسی سے بات کرتی۔ بس پیالیاں اٹھاتی، راکھ دانیاں خالی کرتی اور رکابیاں دھوتی رہتی۔ مجھے یقین ہے کہ میری موجودگی دخل در معقولات کے ذیل میں بالکل نہ آتی تھی۔ نہ جانے میں انہیں کیسی لگتی ہوں گی۔ ان کی جوشیلی سکیموں یا ہمارے ملک کے مستقبل کے بارے میں ان کے تندوتیز مباحثوں میں میرا کوئی حصہ نہ تھا۔ میں تمام کپڑے دھلنے کے لیے امی کے ہاں بھجوا دیتی تھی۔ شاہنواز دال کا رسیا تھا اور میں ان گنت ترکیبوں سے دالیں تیار کر کر کے اس کی عادت اور بگاڑتی رہتی۔ دال ہم مل کر پکاتے۔ وہ دال کھاتا اور ساتھ میں کوک پیتا جاتا۔ انہوں نے جو بہروپ بھر رکھا تھا اس پر بے رحم دہشت پسندوں کا کسی طرف سے شائبہ نہ ہوتا تھا۔ وہ تو صرف حوصلہ مند نوجوان تھے جو لگتا تھا کہ "دہشت دہشت" کھیلنے لگے ہیں۔

میرے ڈرائنگ روم کو چاند ماری کے میدان میں تبدیل کر دیا گیا۔ کمرے کے

ایک سرے پر ہدف نصب کر کے میر ہوائی بندوق سے نشانہ بازی کی مشق میں لگا رہتا۔ میرا قیاس ہے کہ وہ تھوڑے فاصلے سے قتل کرنے اور دست بدست لڑائی لڑنے کا شوق پورا کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ مجھ پر خاک بھی رعب نہ پڑا۔ مجھے صرف ان گولیوں کی فکر تھی جو قالین پر جابجا بکھری نظر آتی تھیں۔ جب چاندماری کا سیشن تمام ہو جاتا تو میں ان کے رخصت ہونے کا انتظار کرتی رہتی تاکہ انہیں بے آرامی محسوس نہ ہو اور ان کے جانے کے بعد گولیوں کے خول ڈھونڈنے میں لگ جاتی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ نصیبہ انہیں نگل نہ لے یا کہیں ان پر اس کا پاؤں نہ آ جائے۔ انقلاب سے بچ بچا کر چلنا ضروری تھا۔ یہی میں نے کیا۔

ہماری حسنیٰ شیخ سے دوستی تھی جس کا کہنا تھا کہ وہ بھٹو صاحب کی خفیہ بیگم ہے۔ بہر صورت، اگر نصرف بھٹو خاتون اول تھی تو حسنیٰ کو بھٹو صاحب کا پہلا عشق سمجھا جاتا تھا۔ حسنیٰ پہلی فرد تھی جس سے میں نے اپنے مسائل کے بارے میں گفتگو کی۔ مجھے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو میری باتیں سن کر مجھے یہ یقین دلا سکے کہ میں پاگل نہیں ہو چلی ہوں۔ حسنیٰ نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کسی لگی لپٹی سے کام نہ لیا۔ "چلتی بنو۔ کوئی وجہ نہیں کہ تم یہ سب کچھ برداشت کرو۔ مجھے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو میرے اپنے احساسات پر صاد کر سکے۔ حسنیٰ کی بات سن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ پہلی بار اس دنیا کی طرف دروازہ کھلا تھا جس سے میں نے تالا لگا کر خود کو الگ تھلگ کر لیا تھا۔ پہلی دفعہ میں نے اس شخص کو چھوڑنے اور اپنے نقصانات کو کم کرنے کے بارے میں سوچنے کی جرات کی۔ بیج بو دیا گیا تھا۔ اسے پروان چڑھانے کے لیے وقت درکار تھا۔

ہم دونوں نے میرے والدین سے قریبی رابطہ قائم رکھا میرا دل بہت شدت سے چاہنے لگا کہ پھر سے رحم مادر میں جا چھپوں۔ امی سے میرے تعلقات بہت الجھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود میں ان کی طرف کھنچ رہی تھی۔ میری نظر میں وہ طاقت کی علامت تھیں۔ میرے خیال میں مصطفےٰ کے شر کو پورے زور شور سے کاٹ کر سکنے کی طاقت صرف انہیں میں تھی۔ وہ جب بھی مجھے ایذا پہنچاتا میں دل ہی دل میں امی کی دہائی دیتی۔ میں انہیں یاد کر کے روتی اور دعا کرتی کہ کوئی ایسا معجزہ ہو کر وہ آئیں اور مجھے بچا لیں۔ میں انہیں تفصیل سے بتانا چاہتی تھی کہ میری زندگی کس طرح ملبے کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ہمارے باہمی تعلقات کے پیش نظر اس طرح کی قربت خارج از امکان ہے۔ میں ان تعلقات کو از سر نو آزمانے سے ڈرتی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں میں اس جڑ سے کٹ کر نہ رہ جاؤں جس سے میں اپنی تمام طاقت حاصل کرتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے المیے کو اتنی حقارت سے دیکھیں کہ وہ دو کوڑی کا ہو کر رہ جائے یا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میری لغزش کا تمسخر اڑائیں۔ میں امی کے ردعمل کے بارے میں پہلے سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی اور اس بے یقینی نے مجھے انہیں اعتماد میں لینے سے باز رکھا۔ میں اس سلسلے میں ان سے بات کرنے کو آج کل پر ٹالتی رہی اور ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ ہر طرح سے خیروعافیت ہے۔

میں بہت دیندار تھی۔ باقاعدگی سے نماز پڑھتی۔ حسنیٰ اور نصیبہ کے علاوہ میں نے جس کے سامنے اپنا دل چیر کے رکھ دیا وہ اللہ کی ذات تھی۔ جانماز پر بیٹھے بیٹھے میں نجات کی التجا کرتی۔ مایوسی کے عالم میں اللہ کی طرف رجوع ہوتی۔ میں تباہ حال تھی اور محسوس کرتی تھی کہ سب نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ میں نے اللہ سے یہ نہیں کہا کہ وہ میرے بحران کو خاص اس طرح یا اُس طرح حل کر دے۔ میں تو بس یہی دعا کرتی تھی کہ وہ مجھے اپنی الٹ پلٹ زندگی کو سلجھانے کی توفیق عطا فرمائے اور مصطفےٰ کو کسی طرح بہتر انسان بنا دے۔

میں اس پورے عرصے میں اس شخص کا مزاج بدلنے کے لیے نہایت جرات مندانہ کوشش کرتی رہی۔ میں اپنی شخصیت کو بار بار بدلنے پر آمادہ تھی کہ دیکھوں تو ان تبدیلیوں کا اس پر کیا اثر ہوتا ہے۔ میں محسوس کرتی تھی کہ "یہ نہیں تو پھر یہ سہی" کے عمل کے ذریعے بالآخر میں ایک ایسی شخصیت بن کر ابھر سکوں گی جس کے ساتھ وہ خوشگوار تعلقات قائم رکھ سکتا ہو۔

میں نے باری باری مختلف رول اختیار کیے۔ اس کی تمام سابقہ بیویوں کا روپ دھارنے کی کوشش کرتی رہی۔ ان بیگمات کی ہر وہ بات جو اسے قابلِ تعریف معلوم ہوئی تھی میں نے اپنا لی۔ یہ کوششیں ایسی تھیں جیسے کوئی ڈوبتے ڈوبتے پیر مارے۔ مراد یہ تھی کہ ان کی مدد سے کسی طرح مصطفےٰ کا قرب حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے بارے میں کوئی مثبت ردِعمل ظاہر کرنے پر راغب کیا جائے۔ میرے گھڑی گھڑی نئے سے نیا بھروپ بھرنے سے شاید اس کو ذہنی الجھن ہوئی ہو یا ہنسی آئی ہو لیکن اس کے وحشیانہ طرزِ عمل میں ذرا سا بھی فرق نہ آ سکا۔ ان دنوں عدیلہ ہی وہ واحد ہستی تھی جو اسے خوشی رکھ سکتی تھی۔

اپنی چھوٹی بہن سے میرے تعلقات کشیدہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی عمر کی بہ نسبت کہیں زیادہ پکی پیسی ہو چکی ہے۔ جس طرح کے چکر وہ چلاتی رہتی تھی ان سے مجھے بڑی کوفت ہوتی۔ میری ازدواجی زندگی کو کسی قسم کے بیرونی اثرات کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے شکوک وشبہات کو پاس نہ بھٹکنے دیا اور تمام توجہ گھر کا حلیہ درست کرنے پر مرکوز کر دی۔ عدیلہ کو یہ کب منظور تھا۔

ایک دن ہم میرے والدین کے ہاں گئے۔ جیسے ہی ہم نے لونگ روم میں قدم رکھا منو نے عدیلہ سے کہا کہ وہ کمرے سے چلی جائے عدیلہ نے بہن کا کہنا ٹال دیا اور جھوٹوں

شرمیلی لجیلی بنی وہیں ڈٹی رہی۔ مجھے تجسس ہوا کہ کمرے میں عدیلہ کی موجودگی پر منو کو اعتراض کیوں تھا۔ واپس آ کر میں نے منو کو فون کیا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے بات اگل دی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ مصطفےٰ نے عدیلہ کو سکول سے لیا اور دونوں کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ اسے یہ تو معلوم نہ تھا کہ وہ گئے کہاں تھے لیکن ان کی ملاقات تین گھنٹے جاری رہی تھی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ منو نے بات جاری رکھی "جب آپ اور مصطفےٰ بھائی کمرے میں داخل ہوئے تو میں عدیلہ کو غور سے دیکھتی رہی۔ میں اس کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ عدیلہ نے اس وقت بھڑکیلا لباس خاص طور پر زیب تن کیا تھا۔ اس نے کپڑے تب بدلے تھے جب اسے خبر ملی تھی کہ آپ دونوں آ رہے ہیں۔"

مجھے یاد آیا کہ میں اور مصطفےٰ تو اتفاقاً جا نکلے تھے۔ تو پھر عدیلہ نے لباس کے معاملے میں اتنا زیادہ اہتمام کیوں کیا تھا؟ وہ بڑی نمایاں نظر آ رہی تھی۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی عدیلہ کے ردعمل پر منو کا اس طرح نظر رکھنا ثابت کرتا تھا کہ اس کی آنکھ کسی فوٹوگرافر کی آنکھ ہے۔ "لگتا تھا کہ عدیلہ کا پورا وجود مصطفےٰ کا استقبال کر رہا ہے۔ اس کے بیٹھنے کا انداز، ان کے آنکھیں چار کرنے کا انداز، بتا رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ ان میں آپس میں ایسی کوئی بات ہے جس کی ہمیں خبر نہیں۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ مجھے اس سے کہنا پڑا کہ کمرے سے چلی جائے۔ اس قدر ڈھٹائی سے آنکھیں لڑانے اور پیار جتانے کی کوئی حد بھی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ کسی اور کا خیال ان باتوں کی طرف نہیں گیا۔" مجھے یقین تھا کہ مصطفےٰ کا خیال ضرور گیا ہو گا۔ "جب آپ لوگ چلے گئے تو میں نے اسے کھری کھری سنائیں۔ ایسا لتاڑا کہ یاد ہی کرے گی۔ می اور ڈیڈی بھی موجود تھیں۔ اس طرح کا رویہ نہیں چلے گا۔ وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔؟"

میں فون ہاتھ میں لیے اس طرح کھڑی کی کھڑی رہ گئی جیسے مجھ میں جان ہی نہ ہو۔ میں جا کے مصطفےٰ سے دوبدو ہوئی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اس واقعے کی صداقت سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ یہ سب منو کے ضرورت سے زیادہ [illegible] کا کمال ہے "بالکل فضول بات ہے یہ۔ میں کبھی عدیلہ کو کہیں لے کر نہیں گیا" اس کی تردید کے بعد تفتیش کی گنجائش نہ رہی۔ میں پوری طرح قائل تو خیر کیا ہوتی [illegible] بے بسی کے عالم میں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

اب مصطفےٰ نے ان لوگوں سے انتقام لینے کے منصوبے بنانے شروع کیے جو [illegible] کھری کرتے تھے۔ اس نے میرے ذہن میں منو کے بارے میں چھوٹے [illegible] داخل کر دیے۔ نتیجتاً میرے اور منو کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ ایک بار پھر [illegible] سے میرا رشتہ منقطع کرنے میں مصروف تھا جہاں میں مشکل وقت میں لنگر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

انداز ہو سکتی تھی۔ دشمن کو پہلے سب سے الگ تھلگ کردو اور پھر اسے کچل ڈالو۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون سی بات پر یا کس پر یقین کروں۔ کیا منو یہ سب کچھ اس وجہ سے کر رہی تھی کہ وہ مصطفے سے چڑتی تھی؟ کیا وہ مصطفے کے عدیلہ کی طرف کھلم کھلا جھکاؤ کی وجہ سے دکھی تھی؟ کیا میری ہر بہن مصطفے کے دل میں گھر کر کے سب سے چہیتی سالی بننا چاہتی تھی؟۔ منو کے مقاصد کے بارے یں شکوک کی موج در موج یلغار نے مجھے ہلا ڈالا۔ یہ کوئی معمولی سا الزام نہ تھا۔ اور اس کے باوجود درست بھی نہ معلوم ہوتا تھا۔ جن باتوں کے سچ ہونے کا مجھے علم تھا میں ان پر بھی یقین نہ کرنا چاہتی تھی۔

اگلی صبح امی نے بدحواس ہو کر مجھے فون کیا۔ عدیلہ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ کسی کو علم نہ تھا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔ مصطفے اس روز لورپول روانہ ہونے والا تھا۔ امی نے مدد کے لیے اس سے رجوع کیا۔ اس کے سوا وہ کسی پر بھروسا نہ کر سکتی تھیں۔ وہ سہمی ہوئی تھیں کہ بات بڑھتے بڑھتے کہیں سکینڈل کی شکل اختیار نہ کرے اور انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی بیٹی کی نامعقول حرکت پر پردہ ڈال کر رہیں گی۔ انہوں سے مجھ سے کہا کہ میں مصطفے سے کہوں کہ وہ عدیلہ کو ڈھونڈنے میں ہاتھ بٹائے۔

امی کہنے لگیں۔: "یہ سب منو کا کیا دھرا ہے۔ عدیلہ پر ہر طرح کے خوفناک الزام عائد کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ اسے بہت صدمہ پہنچا۔ منو دیوانی ہے۔ اس نے اشارتاً کہا کہ مصطفے اور عدیلہ کے درمیان کوئی چکر چل رہا ہے۔ عدیلہ محسوس کرتی ہے کہ ہم سب اس کے خلاف ہو گئے ہیں اور اس کے کردار پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔"

میں نے مصطفے کو بتایا کہ اسے لورپول کا سفر منسوخ کر کے عدیلہ کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کرنی ہو گی۔ وہ رضامند ہو گیا۔ کہنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح اس کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ گھر سے نکل پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ والد صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے امی کے گھر کی راہ لی تاکہ وقتی طور پر وہاں کا بندوبست سنبھالوں اور معاملات پر نظر رکھوں۔ پوری صبح گویا کانٹوں پر لوٹتے گزری۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔ امی کو ڈر تھا کہ اب کوئی بدترین خبر ہی آئے گی لیکن وہ ظاہری طور پر پُرسکون رہ کر اپنے ہیجان اور بوکھلاہٹ کو چھپانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں۔ منو فرار ہونے والی بہن کا کھوج لگانے کے لیے اس کی تمام سہیلیوں کو فون کرنے میں مصروف تھی۔ امی، جو اب خاصی بے اوسان دکھائی دے رہی تھیں۔ ادھر سے اُدھر ٹہلتی رہیں۔ اس گھریلو بحران کے دوران وقفے وقفے سے کافی کا دور چلتا رہا۔

مصطفے نے سہ پہر کے وقت فون کیا۔ امی کا ضبط فون سنتے ہی جواب دے گیا۔ انہوں نے مصطفے سے گڑگڑا کر کہا کہ تلاش جاری رکھے۔ یہ ان کے خاندان کے عزت کا

سوال ہے۔ خاندان میری شادی کا صدمہ جھیل کر ابھی ابھی سنبھلا تھا کہ یہ نئی آفت ٹوٹ پڑی۔ مصطفے نے ان کی بہت ڈھارس بندھائی۔ کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ گھر آ رہا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک پلان ہے۔

اس نے واپس آ کر اپنے منصوبے سے پردہ اٹھایا۔ کہنے لگا کہ وہ امی کے فون اور ہمارے فون پر ٹیپ لگا دے گا۔ اسے پورا یقین تھا کہ کسی نہ کسی مرحلے پر عدیلہ ہم سے رابطہ کرے گی۔" اس کے فون کرتے ہی ہم اس کا کھوج لگا لیں گے۔ میں نے متعلقہ انتظامیہ سے بات کر لی ہے۔ وہ عدیلہ کی تلاش میں ہماری مدد کرنے پر رضامند ہیں۔" جاتے وقت وہ مجھ سے کہہ گیا کہ میں گھر جا کر فون کے پاس بیٹھی رہوں۔ ہم روانہ ہوئے۔ جب ہم گھر جا رہے تھے تو راہ میں رک کر اس نے ایک آف لائسنس ("خریدو اور ساتھ لے جاؤ") دکان سے دو بوتلیں وائن کی خریدیں مجھے اس کی یہ حرکت بڑی بے تکی معلوم ہوئی۔ میں نے کہا "اس وقت تمہیں وائن کا خیال کیسے آ سکتا ہے؟ سب کچھ تو چوپٹ ہوا پڑا ہے۔ تمہیں وائن کی چسکیاں لگانے کی فرصت کب ملے گی؟" اس نے بڑا بڑاتے ہوئے کچھ اس طرح بات کی کہ اس کے پاس وائن کا سٹاک ختم ہو گیا ہے اور اس کا ذہن ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا۔ یہ بے سروپا جواب تھا جو دل کو نہیں لگا۔ اس کا طرز عمل فریب سے خالی نہ تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا ہی جانے والا تھا۔ اس لیے فاش غلطیاں سرزد ہو رہی تھیں۔ مجھے گھر اتار کر وہ چلا گیا۔

ہمارے فون بجتے رہے۔ عدیلہ کو کوئی فون نہ آیا تھا۔ بس دونوں گھر فون کے ذریعے آپس میں مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ ابھی نہ اُدھر کچھ پتہ چلا تھا نہ اِدھر۔ مصطفے بھی غائب تھا۔

کوئی دس بجے رات عدیلہ نے فون کیا۔ آواز سے لگتا تھا جیسے وہ بہت پژمردہ اور دکھی ہو۔ "وہ جو گھر ہے نا، میں وہاں ہرگز واپس نہیں جانے کی۔ وہاں سب کو مجھ سے نفرت ہے۔ انہوں نے الزام لگایا ہے کہ میں مصطفے بھائی پر ڈورے ڈال رہی ہوں۔ وہ تو میرے لیے بھائی جیسے ہیں۔ مجھ پر تو تمہیں بھی بھروسا نہیں۔ میں گھر نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں۔ میں بعد میں فون کروں گی۔"

میں نے ٹک کی آواز سنی، میں انتظار کرتی رہی۔ بیس منٹ بعد مصطفے کا فون آیا۔ کہنے لگا کہ عدیلہ کی کال کا کھوج مل گیا ہے۔ اب وہ کار لے کر عدیلہ کی طرف جا رہا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ مجھے دوبارہ فون کرے گا۔

میں نے امی کو مطلع کر دیا۔ گیارہ بجے رات عدیلہ نے دوبارہ فون کیا۔ میں نے ضد کی کہ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ ذرا تمیز سے کام لے۔ اگر اس

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کی اس چھوٹی سی ڈراما بازی کی خبر والد صاحب کو ہو گئی، جو جاپان گئے ہوئے تھے، تو وہ سخت ناراض ہوں گے۔ وہ نرم پڑ گئی۔ "آ کے مجھ سے ہلٹن ہوٹل کی لابی میں مل لو۔"

میں اس وقت پورے دنوں سے تھی۔ دائی عائشہ اور نصیبہ کو ساتھ لے میں لپک کر ہلٹن پہنچی۔ میں نے جو قفتان پہن رکھا تھا وہ زچہ گون کا کام بھی دے رہا تھا۔

میں ہوٹل کی لابی میں داخل ہوئی۔ دو منٹ بعد مصطفےٰ بھی وہاں آ گیا۔ میں نے اسے عدیلہ کے دوسرے فون کی خبر دے کر کہا تھا کہ وہ بھی ہلٹن پہنچ جائے۔ عدیلہ نے بڑے ٹھسے سے لابی میں قدم رنجہ فرمایا۔ لابی میں ایک اور مانوس چہرہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ چہرہ میر مرتضیٰ بھٹو کے ایک جگری یار نجیب اللہ کا تھا۔ وہ ہم سے دُور ایسی جگہ موجود رہا جہاں روشنی کم اور سائے زیادہ تھے۔

عدیلہ اور مجھ میں سخت بحثا بحثی ہوئی۔ میں اس کی چھپٹ بازیوں سے نہ صرف تنگ چکی تھی بلکہ خاصی پریشان بھی تھی۔ میں نے مصطفےٰ سے کہا کہ اسے پکڑ لو اور گھسیٹ کر کار تک لے جاؤ۔ "اگر یہ تمہاری بیٹی ہوتی تو تم اب تک اسے قتل کر چکے ہوتے۔ کسی میز کے گرد بیٹھ کر اس کی واپسی کے بارے میں مذاکرات نہ کرتے رہتے۔"

مصطفےٰ نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ عدیلہ بضد تھی کہ وہ گھر نہیں جائے گی۔ "مجھے ایک ایرانی لڑکے سے پیار ہو گیا ہے۔ میں اس کے پاس ہی رہوں گی۔ تم مجھے روک نہیں سکتیں۔"

میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ اتنے میں مصطفےٰ بول اٹھا: "سنو، میں کہتا ہوں اسے دائی عائشہ کی نگرانی میں ایرانی لڑکے کے پاس کیوں نہ بھیج دیا جائے۔" اب میں مصطفےٰ کو دیکھتی رہ گئی یہ ناقابل یقین تجویز تھی۔ مصطفےٰ کے مزاج کے بالکل برعکس۔ میں نے بھڑک اٹھی: "اس طرح کی تو بات بھی تمہیں نہیں کرنی چاہیے۔ عدیلہ کو گھر جانا پڑے گا۔ اور کوئی حل نہیں۔"

عدیلہ اور بھی اکڑتی جا رہی تھی۔ اس نے لابی میں میرا اور اپنا تماشا بنا لیا۔ میں نے اس تماشے میں مزید رنگ اس طرح بھرا کہ اسے دروازے کی طرف گھسیٹنے لگی۔ لیکن میری حالت ایسی نہ تھی کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکتی۔ عدیلہ نے میری مزاحمت کرتے ہوئے بڑے زور سے ہاتھ پاؤں چلائے اور قفتان کا پیچھے سے گلا پھاڑ دیا۔ یہ سب کچھ پارک لین میں، ہلٹن کی لابی میں ہو رہا تھا۔

مجھے زور آزمائی ترک کرنی پڑی۔ مصطفےٰ تقریباً ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماشا دیکھتا رہا۔ ہم نے طے کیا اور عدیلہ نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی کہ ہم رات ہوٹل میں گزاریں گے تاکہ کسی فیصلے پر پہنچ سکیں۔ میں نے عدیلہ کو رات بھر کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

میں نے ہوٹل کے ایکسچینج کے ذریعے امی سے بات کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ عدیلہ میرے ساتھ ہے اور ہم ہوٹل میں ہیں۔ عدیلہ دوڑ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ اپنا اطمینان کرنا چاہ رہی تھی کہ میں امی کو ہمارا اتاپتا تو نہیں بتا رہی۔ میں نے امی کو یہ بھی بتایا کہ ہم رات ہوٹل میں گزارنے کی سوچ رہے ہیں تاکہ بات چیت کے ذریعے عدیلہ کو گھر چھوڑنے کا فیصلہ بدلنے پر آمادہ کر سکیں۔

مصطفےٰ کمرہ بکُ کرانے چلا گیا۔ ریسپشن پر نجیب اللہ بھی اس سے آ ملا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل پر پہنچے۔ عدیلہ اور میں، نصیبہ کے ساتھ، بستر پر سوئے مصطفےٰ اور دائی عائشہ فرش پر لیٹ گئے۔

اگلے دن علی الصبح دیکھتی کیا ہوں کہ امی منو کے ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ وہ رات بھر سراغ رسانی میں مصروف رہی تھیں۔ انہوں نے ہر ہوٹل فون کیا اور وہاں کے سیکورٹی افسروں کے پاس ایک نابالغ مفرور لڑکی کے بارے میں شکایت درج کرائی۔ بالآخر انہیں پتہ چلا کہ یہ والا کمرہ پچھلی صبح "ثمینہ خان" کے نام بکُ کرایا گیا تھا۔ جس مرد نے کمرہ بک کرایا تھا وہ کوئی "مسٹر نجیب اللہ" تھا۔ کمرہ پورے دن استعمال میں رہا تھا۔ کمرے میں لنچ اور چائے منگائی گئی تھی۔

امی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئیں مصطفےٰ باہر چلا گیا۔ جب وہ جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ وہ بہت کھسیانا نظر آ رہا ہے جیسے اس کے دل میں چور ہو۔ سارا معما حل ہو گیا۔ میرے حواس جاتے رہے لیکن جو کچھ اب مجھ پر آئینہ ہو چکا تھا میں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

مختلف تصویریں تیزی سے میرے ذہن سے گزریں کس طرح انہوں نے صبح ساتھ گزاری ہو گی۔ وائن کی وہ بوتلیں۔ عدیلہ کا مجھے فون کرنا۔ جب اس نے فون کیا تو کیا مصطفےٰ اس کے پاس تھا؟ کیا وہ مل کر ہمارا مذاق اڑا رہے تھے؟ یہ کس طرح کا ذہن ہے جو ایسی لمبی چوڑی بوجھ بجھول کا تانا بانا بُن سکتا ہے؟ میں اسی بستر پر سوتی رہی تھی۔ انہیں چادروں پر۔ میرا جی متلانے لگا۔

ہم ہوٹل سے رخصت ہوئے۔ عدیلہ نے ہمیں تنگ کرنے کے لیے اپنی فتنہ پردازی جاری رکھی۔ ضد کرنے لگی کہ میں تو تہمینہ کے گھر جاؤں گی۔ جب امی نے سمجھا بجھا کر اسے میرے ساتھ جانے سے باز رکھنا چاہا تو وہ ہم دونوں میں پھوٹ ڈالنے پر اتر آئی۔ "میں تہمینہ کے پاس کیوں نہیں ٹھہر سکتی؟ اگر میں رات کو روبینہ کے پاس رہ سکتی ہوں تو تہمینہ کے پاس بھی رات کو رہ سکتی ہوں۔ میں گھر نہیں جاؤں گی۔ میں نے تہمینہ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ آپ لوگ مجھے اور تہمینہ کو ایک دوسرے سے قریب ہوتے نہیں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

دیکھ سکتے"۔ اب وہ میری دوست بنی تھی اور امی کی دشمن۔ امی اب مخالفین کی صف میں شامل تھیں۔ ایک طرف عدیلہ تھی اور میں، دوسری طرف امی۔

امی نے کہا کہ میں عدیلہ کو ساتھ لے جاؤں۔ مصطفےٰ، دن بھر مزے اڑانے کے بعد، لورپول جا چکا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ عدیلہ سے بات کروں لیکن اس نے خواب آور گولیاں کھا کر ایسی لمبی تانی کہ دن بھر سوئی رہی۔ مجھے اضطراب کے عالم میں نیند کہاں آتی مصطفےٰ اسی شام لوٹ آیا۔ عدیلہ جاگ گئی۔

مصطفےٰ نے آ کر مجھ سے کہا کہ عدیلہ اس کے ساتھ اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہے۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے اس کی تھوڑی سی خبر لینی چاہیے۔ اسے کچھ تمیز سکھانی پڑے گی۔ اس لیے اگر تھوڑی دیر تم ہمیں تنہا چھوڑ دو تو ہم دو دو باتیں کر لیں۔" "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ میری موجودگی میں بات کیوں نہیں کر سکتی؟ آخر میری بہن ہے۔ اسے ڈر کس بات کا ہے"۔ "اسے تم میں سے کسی پر اعتبار نہیں۔ تم اس کے مسائل سے اپنی امی کو آگاہ کر دینا۔ ضروری ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی سے بات کرے جس پر اسے اعتبار ہو، جو بڑی عمر کا ہو"۔ میں نے حسب معمول ہتھیار ڈال دیے۔ عدیلہ اور مصطفےٰ کو راز و نیاز کے لیے میرے اپنے گھر میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ انہیں تخلیہ فراہم کرنے پر میں مجبور تھی۔ میں یہ ماننا چاہتی تھی کہ میرے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ میری سوچنے کی صلاحیت قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ تمام تار مصطفےٰ ہلا رہا تھا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ اس نے جان بوجھ کر میرے تمام تار الجھا دیے ہیں۔ تاکہ میں کسی بے مصرف کٹھ پتلی کی طرح لٹکی رہوں۔

امی، قرآن ہاتھ میں لیے، غصے میں کھولتی ہوئی آئیں۔ انہوں نے مصطفےٰ پر الزام لگایا کہ اس نے ان کی نابالغ لڑکی کو برباد کر دیا ہے۔ "تم مکار اور خبیث آدمی ہو۔ تخریب تمہاری فطرت میں داخل ہے۔ میں تمہیں خبردار کرتی ہوں کہ ہمارے خاندان کی عزت سے مت کھیلو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میری بیٹی کو فی الفور میرے پاس بھیج دو۔ میں اسے تمہارے گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔"

مصطفےٰ پر اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا کہ اس کے کردار کی ایسی تیسی کی جا رہی ہے۔ "آپ کو کیا پتا؟ میں نے اس خاندان کی عزت کی حفاظت کی ہے۔" منو نے بات کاٹ کر مصطفےٰ پر الزام لگانا شروع کیا کہ وہ ایک نابالغ لڑکی کا اخلاق بگاڑتا رہا ہے۔ منو نے نہایت بد تمیزی سے گفتگو کی۔ میں مصطفےٰ کی حمایت کرنے اٹھ کھڑی ہوئی، محض اس لیے کہ ایسا کرنا اب میری جبلت کا حصہ بن چکا تھا۔ میں نے منو سے کہا کہ وہ میرے گھر سے نکل جائے کیونکہ اسے میرے شوہر کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ امی عدیلہ کو

گھسیٹ کر کار تک لے گئیں اور وہ تینوں رخصت ہوئیں۔

میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ حقیقت کیا ہے۔ مجھے اپنے ارد گرد صرف فریب کا جال نظر آ رہا تھا۔ میں نے مصطفےٰ کو بٹھا کر بات کی۔ اس کی منت سماجت کی کہ میرے شبہات دُور کر دے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کا دفاع صرف اسی صورت میں کر سکتی ہوں کہ مجھے حقائق کا علم ہو۔ اس اثناء میں مصطفےٰ ایک نیا سکرپٹ تیار کر چکا تھا۔ اس گھریلو داستان میں، جو ابھی جاری تھی، ایک نیا پیچ ڈالا گیا۔ "منو ٹھیک کہتی تھی۔ اس دن میں نے عدیلہ کو سکول سے پک کیا تھا۔ منو نے ضرور ہمیں دیکھ لیا ہوگا۔ میں کسی کو بتانا نہ چاہتا تھا کہ میں کس لیے عدیلہ کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اس لیے میں نے منو کی بات جھٹلا دی۔ عدیلہ کو حمل ٹھہر گیا تھا۔ اسی ایرانی لڑکے سے۔ میں حمل ضائع کرانے کے لیے اسے ایک کلینک لے گیا تھا۔ میں تمہارے خاندان کی عزت کا تحفظ کر رہا تھا۔ اس کے بدلے مجھے نابالغ لڑکی پھنسانے والے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ عجیب دنیا ہے جہاں نیکی کرنے کی بھی سزا ملتی ہے۔"

اپنے میاں کی بے گناہی کے اس تازہ ثبوت سے لیس ہو کر میں امی کے پاس پہنچی۔ جو کچھ مصطفےٰ نے کہا تھا ان کے گوش گزار کیا۔ امی کو اس کہانی پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے ثبوت طلب کیا۔ کہنے لگیں کہ انہیں اسقاط پر خرچ ہونے والی رقم کی رسید لا کر دکھائی جائے ایسی کوئی رسید مصطفےٰ کے پاس نہ تھی۔ امی نے جاننا چاہا کہ حمل کہاں ضائع کرایا گیا تھا۔ مصطفےٰ نے مجھے بتایا ہی نہ تھا۔ اس کی کہانی میں پھر جھول پڑنے لگے۔ وہ اپنی بے گناہی پر ضرورت سے زیادہ اصرار کر رہا تھا۔ وہ اس وقت تک مجرم تھا جب تک اپنی بے گناہی ثابت نہ کر دے۔ بارِ ثبوت اس کے ذمے تھا۔ اس کا دفاع بہت کمزور نظر آ رہا تھا۔

ان صبر آزما حالات میں میری بیٹی نشا پیدا ہوئی۔ ایک بار پھر میں بالکل اکیلی تھی اور عین اس وقت اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئی تھی جب مجھے ان کے جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ مصطفےٰ میرے پاس تھا۔

بچہ جننے کی دردیں اپنی جگہ، احساسِ جرم کی ٹیسوں نے بھی میرے اعصاب کا ناس مار دیا۔ میں نے خودکشی کی جو کوشش کی تھی وہ میرے ذہن پر سوار تھی۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ میرا بچہ نارمل نہ ہوگا۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ میری خود غرضی کو معاف فرما دے۔ وضعِ حمل کے دوران اس امکان نے پورے وقت مجھے عذاب میں مبتلا رکھا کہ میں غیر نارمل بچے کو جنم دے سکتی ہوں۔ پیدائش کے ذرا دیر بعد مجھے وھیل چیئر میں اپنی بچی کے پاس لے جایا گیا۔ میرا دل ڈر کے مارے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ بچی پر نظر پڑتے ہی میری تمام پریشانیاں ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ جو کچھ میں نے دیکھا اس پر مجھے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پیار آیا۔ میں نے گلے سے لاکٹ اتارا جس پر اللہ کا نام درج تھا اور بچی کے گلے میں ڈال دیا تاکہ وہ نظر بد سے محفوظ رہے۔ والد صاحب نے ایک کنگن بھجوایا جس پر دعا لکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے یا میری بچی کو دیکھنے نہیں آئے۔ ان کی یہ ادا میرے دل کو لگی۔ ان کی دعائیں میرے ساتھ تھیں۔

بچی کے پیدا ہونے کے دو گھنٹے بعد مصطفے کمرے میں آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے بشرے پر طیش اور تناؤ کے آثار تھے۔ اس کا یہ موڈ ایسا تھا جس سے مجھے خاصا خوف آتا تھا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ "مصطفے، تم نے میری زندگی تباہ و برباد کر دی ہے۔ میں یہاں ہسپتال میں بالکل اکیلی پڑی ہوں۔ تم نے سازباز اور توڑ جوڑ سے کام لے کر آفت برپا کی ہے۔ تم کسی ایسی بوڑھی کمینی گنوار عورت کی طرح ہو جو ادھر کی بات اُدھر لگا کر اور خاندانوں میں پھوٹ ڈلوا کر اپنا الو سیدھا کرتی ہے۔ تم نے مجھے میرے خاندان سے جدا کر دیا ہے۔ میری تین بہنیں ہیں۔ ایک بھائی ہے۔ والدین ہیں۔ وہ سب کہاں ہیں؟ آج وہ میرے پاس کیوں نہیں؟ اس بارے میں سوچو تو سہی۔ اس کا ذمے دار کون ہے؟ سوچو"

مصطفے نے جوں جوں میرا طول طویل گلہ شکوہ سنا اس کی تھرناکی بڑھتی گئی۔ اس نے اٹھ کر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اس شخص نے، جس کی بچی کو میں نے دو گھنٹے پہلے جنم دیا تھا۔ مجھے گھسیٹ کر دوبارہ پہلی سی اذیت میں لا ڈالا۔ اسی اذیت میں جس میں تھوڑی سی کمی واقع ہو چلی تھی۔ مجھے مارپیٹ اور نیلو نیل کر کے وہ اپنے بیٹے بلال کو لینے ہوائی اڈے چلا گیا۔ وہاں لیٹے لیٹے مجھے خیال آیا کہ عدیلہ اور بلال بالکل ہم عمر تھے۔ یہ سوچتے ہی میرا جی اوپر تلے ہونے لگا۔

میں ہسپتال میں مقیم رہی۔ شفایاب ہوتی اور سوچتی رہی۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ مصطفے کے بے وجہ اضطراب سے خود کو الگ تھلگ رکھا۔ ہسپتال سے فارغ ہونے سے ذرا پہلے مصطفے نے مجھے ایک بہت قیمتی سفید کشمیرا کوٹ خرید کر دیا۔ بچی کو لیے ہسپتال سے رخصت ہوتے وقت میں یہی کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ مصطفے میری زندگی کو تہ و بالا تو کر ہی چکا تھا۔ اب یہ کوٹ دے کر گویا میرے آنسو پونچھے گئے تھے۔

ہم ارگلی لین میں ایک چھوٹے سے کاٹیج میں اٹھ آئے جو میرے والدین کے گھر کے بہت قریب تھا۔ لیکن فاصلہ تو اضافی شے ہے۔ بہت پاس ہو کر بھی آدمی دور ہو سکتا ہے۔ اور بہت دور ہو کر بھی پاس۔ میرے والدین ہم سے کھچے کھچے رہے۔ ایک بار بھی ملنے نہ آئے۔

تین مہینے بعد میری سالگرہ پر والد صاحب نے مجھے مبارک باد دینے کے لیے فون

کیا۔ بچی کی پیدائش کے بعد گھر والوں کے ساتھ یہ میرا پہلا رابطہ تھا۔ وہ دوبارہ ہماری طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے اس سہارے کی ضرورت تھی۔ والد صاحب نے پوچھا کہ مجھے سالگرہ کے تحفے میں کیا چاہیے۔ "آپ سے ملنا" میں نے بلک کر کہا۔ "آج رات آ جاؤ" انہوں نے رُندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

میں نے مصطفے کو بتایا۔ وہ بڑی خوشی سے والدین کے پاس چلنے کو تیار ہو گیا۔ ہم وہاں پہنچے۔ جب ہم سیڑھیاں چڑھ کر مکان کے بالائی حصے کی طرف جا رہے تھے تو ہمیں عدیلہ ملی جو نیچے جا رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے یہ اس بات کا اشارہ ہو کہ میرا عروج اور اس کا زوال شروع ہے۔ مصطفے کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے اوپر چلا آیا۔ یوں میری خاندانی زندگی دوبارہ شروع ہوئی۔ پہلے پہل تعلقات ذرا اٹک اٹک کر آگے بڑھے۔ رفتہ رفتہ ان میں زیادہ ترتیب آ گئی۔

مصطفے کو ہر وقت میری پڑی رہتی -اس ختم نہ ہونے والے خبط نے عجیب مسخ شدہ صورتیں اختیار کر لیں۔ اپنے والدین سے میرے تعلقات کے بارے میں اس کا حاسدانہ رویہ بالکل واضح تھا۔ وہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی چین نہ لینے دیتا۔ جب بھی مجھے ان کے ساتھ ہنستے یا مذاق کرتے دیکھتا اس کا مزاج برہم ہو جاتا۔ پھر وہ ایسی بحث کے لیے، جو مارپیٹ پر ختم ہو، کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتا۔ میری قوت ارادی کو پاش پاش کرنے کے لیے اس نے ایک حیرت انگیز طریقہ وضع کیا تھا۔ وہ مجھ سے اس طرح بات کرتا جیسے میں کوئی ملزم ہوں اور کٹہرے میں کھڑی ہوں۔ مجھ سے ایسی ایسی باتیں منسوب کر دی جاتیں جو میرے وہم وگمان میں بھی نہ ہوتیں۔ الزامات کا یہ پیچ در پیچ سلسلہ مجھے تھکا دیتا۔ ہر رات کو جونہی اپنے کمرے میں قدم رکھتے یہ سلسلہ شروع ہو جاتا اور اس وقت تک جاری رہتا جب تک دن کی روشنی پردوں سے چھن چھن کر اندر نہ آنے لگتی۔ وقتاً فوقتاً وہ مجھے کوئی نکتہ سمجھانے کے لیے گھونسوں اور جوتوں سے کام لیتا۔ وہ خود میرے ہی کہے ہوئے لفظوں کو چن چن کر میرے منہ پر دے مارتا یہاں تک کہ آخر کا میری باتوں میں ان کا منطقی ربط نہ رہتا۔ میں گڑگڑا کر کہتی کہ بس کرو۔ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی۔ میں صرف اتنا چاہتی کہ یہ اذیت ختم ہو۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس کی جیت قریب ہے وہ سوال اور جرح جاری رکھتا۔ "کیا تمہیں سچ مچ افسوس ہے؟" "ہاں" "کیا تمہیں سچے دل سے افسوس ہے؟" "ہاں - ہاں" "تمہارا لہجہ درست نہیں۔ معلوم نہیں ہو رہا کہ تمہیں افسوس ہے"۔ "مصطفے، میں تھک چکی ہوں یقین کرو، مجھے افسوس ہے"۔ "لیکن درحقیقت تم محسوس نہیں کر رہیں کہ تم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔" "لیکن میں محسوس کر رہی ہاں محسوس کر رہی ہوں۔" "دو گھنٹے پہلے تم اپنے موقف کی وضاحت کر رہی تھیں، اپنی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

صفائی پیش کرنے میں مصروف تھیں" کہ تم اپنے کیے کا جواز پیش کر سکتی ہو۔ اب بھی تمہارا یہی خیال ہے--------" "میرا خیال تھا---" خیال تھا، خیال تھا۔ تم سمجھتی تھیں "نہیں۔ تم نے ثابت کر دیا کہ میں غلطی پر تھی۔" "کیا تم میرے دلائل کی پوری طرح قائل ہو چکی ہو؟" "ہاں مصطفےٰ" "تو اس سے پہلے تم اس کے برعکس کیوں سوچتی رہیں؟ یہ گستاخی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تم میری بیوی ہو؟ تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے سوا تمہاری کوئی زندگی نہیں؟-----"

صرف اس جرح سے جان بچانے کے لیے میں اس کوشش میں لگی رہتی کہ اس کے کہے کو جھٹلانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اسے معلوم تھا کہ میں آزاد رہنا، اپنی مرضی پر چلنا چاہتی ہوں۔ لگتا تھا کہ اسے میرے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے میں لطف آتا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہمارے تعلقات صرف انہیں بحث مباحثوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ مصطفےٰ کو مجھ سے جو بھی کہنا ہوتا انہیں لڑائی جھگڑوں کی زبانی کہتا۔ ان زبانی جھڑپوں کی مدد سے، جو راتوں کا معمول بن چکی تھیں۔ میری آزادی کو لگام دی جا رہی تھی۔ ان کے ذریعے مجھے اپنے قریبی ماحول سے الگ تھلگ کر دینا بھی مقصود تھا۔ میں ریگِ رواں پر عمارت کھڑی کرنے میں مصروف تھی۔

اپنے تعلقات کو نپاپوتی کر کے چھپانے کی تمام تر ذمے داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ میں ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی جو مستقل جھوٹ تھی۔ میں سوچتی تھی کہ اگر میں اپنی تذلیل کا عالم میں چرچا کروں گی تو رسوائی میری ہو گی۔ میں سمجھتی تھی کہ مصطفےٰ میں اتنی طاقت ہے کہ لوگ اس کے کہنے پر میری طرف انگلیاں اٹھانے لگیں گے۔ میں مجرم قرار پاؤں گی اور اس کے دامن پر چھینٹ تک نہ پڑے گی۔ جس معاشرے میں مردوں کو غلبہ حاصل ہو اس پر صرف اس لیے آنچ نہیں آتی کہ مرد کھل کر مرد کا ساتھ دیتے ہیں۔ عورت ہر طرف سے زد میں ہوتی ہے۔ گھر کی چہار دیواری کے اندر کوئی بھی خرابی واقع ہو مرد حقائق کو توڑ مروڑ کر ہمیشہ ایسا رنگ دے سکتا ہے کہ بدنامی صرف بیوی کے حصے میں آتی ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ان ہندسوں کی ترتیب کسی پر ظاہر نہ کروں گی جن کی مدد سے میرے ذہن کی آہنی تجوری کھل سکتی ہو۔

اب میری دونوں بچیاں میری دنیا تھیں۔ مجھے انہیں ان کے باپ سے بچانا پڑتا۔ مصطفےٰ ان سے پیار بھی کرتا، ان کے ساتھ کھیلتا بھی لیکن صرف ایک حد تک۔ جونہی ان کی توجہ بٹ جاتی یا وہ اس کے لاڈ پیار کا جواب پیار سے دینا چھوڑ دیتیں تو اس پر اضطراب طاری ہونے لگتا۔ ان کے رونے دھونے کی وہ تاب نہ لا سکتا تھا۔ میں نے بچیوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ رونے سے باز رہیں۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے سمندر کو مٹھی میں بند کرنے

کی کوشش کی جائے۔ میرا طریق کار یہ تھا کہ میں پہلے سے اندازہ لگا لیتی کہ ان کے لیے کب کیا کرنا ہو گا۔ میں چوبیس گھنٹے چوکس رہتی اور ان کی طفلانہ ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہمہ تن مستعد۔ اس دوڑاک کی طرح، جسے کسی مارا تھون دوڑ میں جھونک دیا گیا ہو، دن ڈوبنے تک میں تھک کر نڈھال ہو چکی ہوتی۔

اسے بچیوں کی ضرورت تھی تو صرف اس لیے کہ ان سے اپنی پدرانہ جبلتوں کو سہارا دے سکے۔ ایک بار وہ غسل خان میں تھا۔ نصیب اس کے پاس تھی۔ شیو کرتے وقت اس نے ڈیڑھ سال کی بچی کو ببل باتھ میں بٹھا دیا۔ بچی چھپا چھپ کرتی رہی لیکن تھوڑی دیر بعد پانی اس کے لیے عجوبہ نہ رہا اور بلبلے بھی اس کا دل موہ لینے میں ناکام ہو گئے۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ میں دوڑی دوڑی گئی تاکہ اسے غسل خانے سے لے آؤں۔ "بہتر ہے اسے باہر لے جاؤں۔ تھک گئی ہے۔" "نہیں" وہ ریزر ہاتھ میں لیے بولا۔ "اسے یہیں رہنے دو۔" "لیکن وہ تھک گئی ہے۔" "تم اسے باہر نہیں لے جا سکتیں۔ میں اسے ببل باتھ میں ٹھہرے رہنے کا حکم دے چکا ہوں۔" "حکم دے چکے؟ لیکن، مصطفےٰ، وہ تو صرف ڈیڑھ برس کی ہے"۔ "پھر کیا ہوا؟ جب تک میں کوئی اور فیصلہ نہ کروں اس کے حق میں بہتر یہی ہے کہ جہاں بٹھایا ہے وہیں تمیز سے بیٹھی رہے"۔

نصیبہ نے اس بے رحمانہ فرمان کا بڑا برا مانا۔ وہ زور زور سے رونے لگی۔ میں وہاں سراسیمہ کھڑی تھی۔ میرا کچھ بس نہ چل رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ کو کتنا غصہ آ رہا ہے۔ اس کی بیٹی کی یہ مجال کہ حکم نہ مانے! میں نے بچی کو تسلی دینے کی حتی الامکان کوشش کی جو گلے کا پورا زور لگا کر اپنا عندیہ ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے پانی کی چھپکوں سے اس کا دل بہلانا چاہا لیکن بچی وہی کرتی رہی جو اس کی سمجھ میں آیا۔ مصطفےٰ دھمکی بھرے انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ مصطفےٰ نے روتی دہاڑتی بچی کو پکڑ کر اس کا سر پانی میں ڈبو دیا۔ ننھے ننھے بلبلے اٹھ کر اوپر آنے لگے۔ اس نے بچی کا سر اسی طرح ڈبوئے رکھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسے مزہ چکھانے کا تہیہ کر چکا ہے۔ میں نے منت کی کہ نصیبہ کو چھوڑ دو۔ مصطفےٰ نے میری ایک نہ سنی اور بچی کا سر اتنی دیر تک ڈبوئے رکھا کہ مجھے لگا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ پھر جب اس نے محسوس کیا کہ بچی کی سکت جواب دینے کو ہے تو اسے چھوڑ دیا۔ میں نے جھٹ پٹ اسے ببل باتھ سے نکالا۔ وہ کھانسنے اور پانی اگلنے لگی۔ اس کی آنکھیں ڈر کے مارے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ میری بچی کو ایک روح فرسا تجربے سے گزرنا پڑا تھا مگر اس کی جان بچ گئی تھی۔ مصطفےٰ کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ اس قدر سودائی معلوم ہو رہا تھا۔ میں دوڑ کر باہر چلی گئی۔

نصیبہ کو پانی سے ہول آنے لگا۔ اسے نہلانا عذاب ہو گیا۔ اس کے ننھے ننھے ذہن

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں غسل خانہ عقوبت خانے کا روپ دھار چکا تھا۔ جب نہانے کا وقت آتا تو وہ خوف زدہ ہو کر بے اختیار چیخیں مارنے لگتی۔ ڈوب جانے کے اس خوف پر قابو پانے میں اسے خاصا عرصہ لگا۔

اس سانحے کے بعد میں بچیوں کو مصطفےٰ کے ساتھ اکیلے باہر بھیجتے ہوئے ڈرنے لگی۔ پارک میں تھوڑی دیر کی یہ چہل قدمیاں اچانک جہنم کی سیر میں بھی تبدیل ہو سکتی تھیں۔ اس کی شخصیت کبھی فرشتہ صفت نظر آتی تھی، کبھی ابلیس۔ اس وجہ سے وہ قابل اعتماد نہ رہا تھا۔ شخصیت کے اس سقم کا اس نے ایک اور ہی مصرف نکالا۔ اس سے مجھ پر غلبہ حاصل کرنے کا کام لیا گیا۔ وہ مجھے فرغے میں لیے رہتا۔ مجھے ہر وقت یہ محسوس ہوتا کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ اور ویل کے ناول "۱۹۸۴ء" کا "بڑا بھائی" معلوم ہونے لگا۔ دور رہ کر بھی مجھ پر نظر جمائے رکھتا۔ جب کسی کو یہ پتہ چلے کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے تو اس کا رویہ اوٹ پٹانگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسے اپنا فطری رویہ بناوٹی اور اکھڑا اکھڑا معلوم ہونے لگتا ہے۔ مصطفےٰ مجھے تلملاتے کسمساتے دیکھ کر بڑا خوش ہوتا تھا۔

اسے امریکہ جانا پڑا۔ وہ منہ اندھیرے مجھے فون کرتا اور اس بات کو بالکل بھلا دیتا کہ امریکہ اور انگلینڈ کے وقت میں کتنا فرق ہے۔ اگر میں نیند کے خمار میں کھوئی ہوتی تو وہ جھنجھلانے لگتا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے فون کے انتظار میں جاگتی رہا کروں۔ "تم جاگ رہی ہو؟" "ہاں"۔ "لہجہ تو نندا سا ہے۔ تم جھوٹ بول رہی ہو؟"۔

لیجیے، مصطفےٰ کو برتری حاصل! اس نے ہزاروں میل دور سے مجھے لتاڑنا شروع کر دیا۔ مجھ سے توقع یہ کی جاتی تھی کہ وہ موجود نہ بھی ہو تو بھی ایسے کام کرتی رہوں جن سے اس کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہو۔ فرض کر لیا گیا تھا کہ میں اس کی کمی محسوس کروں گی۔ اس کے بیرونی ملکوں کے مختصر دورے میرے لیے کبھی ستانے کے مواقع ثابت نہ ہوتے۔ میں ہر وقت حاضر خدمت رہتی اور خوف زدہ بھی کہ کہیں کسی بات پر وہ ناراض نہ ہو جائے۔

جب وہ امریکہ گیا ہوا تھا۔ تو ایک روز میں اور عدیلہ اور زرینہ دکانوں کا چکر لگانے اور چند ایک چیزیں خریدنے برنیٹ کراس گئے۔ میں بحراوقیانوس کے اس پار سے گھر سے باہر جانے کی "اجازت" حاصل کر چکی تھی۔

ہم نے خوب مزے کیے۔ جب میں نے چند ایک رسالے خریدے تو بہنوں سے کہا کہ مصطفےٰ کو رسالوں کا نہ بتائیں۔ یہ واحد مطالعاتی مواد تھا جس پر میرے لیے توجہ مرکوز کرنا آسان تھا اور مصطفےٰ کی رائے میں یہ وقت اور روپیے دونوں کا زیاں تھا۔ ہم سکول کی ایسی کم سن طالبات کی طرح گھر لوٹے جو مل جل کر کوئی "مفسدانہ" راز دل میں چھپائے

ہوئے ہوں۔

اگلے دن مصطفےٰ کا فون آیا۔ وہ خاصا ناراض معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے تفصیل سے بتایا جائے کہ ہم کیا کرتے رہے تھے۔ زیادہ برمحل یہ سوال تھا کہ ہم نے خریدا کیا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا"۔ تم نے اور کیا خریدا؟" اس کے لہجے میں وہ انداز تھا جو کسی پر فوقیت حاصل کر لینے کا غماز ہوتا ہے۔ "کچھ نہیں" میں جھوٹ بولی" میں نے تم سے پوچھا ہے کہ تم نے اور کیا خریدا۔ مجھے جواب دو۔ سچ سچ۔ اور کیا خریدا؟۔ ہیں؟" "کچھ نہیں" میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگی۔ میں جان گئی کہ اسے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ "مجھے معلوم ہے تم نے کچھ اور بھی خریدا تھا۔ مجھے معلوم ہے تم نے جو خریدا تھا۔ "یہ سن کر میں سہم گئی۔ پھر اس نے خباثت آمیز لہجے میں کہا۔ "مجھے ہمیشہ پتہ چل جائے گا۔ تم نے حکم عدولی کی ہے تم نے چند رسالے خریدے ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ خریدے ہیں نا؟ چلو، اب بک بھی دو۔ خریدے ہیں نا؟۔

مجھے اعتراف کرتے ہی بنی۔ اس نے مجھے گالیاں دیں۔ میرے چھکے چھوٹ گئے میں کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسے ہمیشہ پتہ چل جایا کرے گا۔ بیشتر اوقات، میں اسکی تابڑ توڑ جرح کے دباؤ کی تاب نہ لا سکوں گی۔ وہ آپ ہی مشغیث تھا، آپ ہی استغاثے کا وکیل، آپ ہی منصف، آپ ہی جیوری، بہرحال، اس معاملے کی حد تک مجھے یقین تھا کہ اس کے پاس میرے "جرم" کی ایک چشم دید گواہ بھی موجود تھی۔ عدیلہ۔

ہم خاصے لوگوں کو کھانے پر گھر بلانے لگے۔ پرانے ساتھی اور پاکستان سے آنے والے دوست ہمارے ہاں آ نکلتے۔ رفیع رضا اور ان کی بیگم روز میری باقاعدگی سے ہم سے ملنے آتے۔ انہیں احساس تھا کہ میں کس مشکل میں گرفتار ہوں۔ ہماری ملاقات اینڈریو نائٹ اور صبیحہ سے بھی ہوئی اور یہ ملاقات رفتہ رفتہ گہرے مراسم میں تبدیل ہو گئی۔ اینڈریو "دی اکونومسٹ" کے مدیر تھے ور ان کی بیگم صبیحہ کا تعلق پاکستان سے تھا۔

مصطفیٰ کو کھانا پکانے سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ طباخ اعظم تھا اور میری اور دائی کی حیثیت ٹکے ٹکے کی نوکرانیوں کی سی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایسے سارے کام ہم انجام دیں جن میں ہاتھ خراب ہوتے ہوں یا جان کھپانی پڑتی ہو۔ دائی چیزوں کو تراشنے، چھیلنے اور کاٹنے میں لگی رہتی۔ طباخ اعظم ایک سے ایک محیرالعقول کھانا تیار کرنے میں مست رہتا۔ کوڑا کرکٹ ہٹانا، برتن دھونا اور صفائی کرنا ہمیشہ میرے ذمے ہوتا۔ اس دوران میں تناؤ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا۔ کام میں معمولی سا بگاڑ بھی مصطفےٰ کی برداشت سے باہر تھا۔ اگر کھانے کی ترکیب کا کوئی جز موجود نہ ہوتا یا ہم دونوں میں سے کوئی اس کی تیزرفتاری کا ساتھ دینے میں ناکام ہو جاتا تو وہ آپے سے باہر ہونے لگتا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی ضرورت کی تمام

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

چیزوں کا گھر میں ڈھیر لگا رہے وہ چاہتا تھا کہ میں اس کا مافی الضمیر ازخود سمجھ جایا کروں اور اسی مناسبت سے اس کے احکام بجا لانے کے لیے خود کو تیار رکھوں۔ اگر ہم اس کے معیار پر پورے نہ اترتے تو باورچی خانہ "دلائی کیمپ" بن جاتا۔ کھانا تیار کرنے کے ان مواقع پر بڑے بڑے چاقوؤں کے آس پاس پڑے ہونے سے ماحول میں دہشت کچھ اور بھی زیادہ پھیل جاتی۔ ہمارا خون خشک ہوتا رہتا۔ بیچاری دائی عائشہ کی ٹھکائی بھی ہوتی۔ وہ نوکرانی ہی تو تھی۔ اس کے ساتھ مصطفےٰ کا تشدد آمیز برتاؤ، شدت اور تواتر کے اعتبار سے، میری اور اس کی گلچپ سے مختلف تھا۔ یہ آقا اور باندی کا رشتہ تھا۔ دائی عائشہ کو بے دردی سے مارتے پیٹتے ہوئے اسے اپنی حرکت کا کوئی جواز پیش نہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ کچھ بول ہی نہ سکتی تھی۔ پیدائشی باندی جو ٹھہری۔ اس کے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں دیکھ سکتی تھی کہ مجھے کس طرح آہستہ آہستہ ایک بے زبان اور فرماں بردار غلام میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ میں دل ہی دل میں یہ آس لگائے رکھتی کہ مجھ میں اتنی اخلاقی گراوٹ کبھی نہ آئے گی کہ میری اور دائی عائشہ کی سطح میں کوئی فرق نہ رہے۔ میں آزاد پیدا ہوئی تھی۔ مصطفےٰ مجھے زنجیریں پہننے پر اکسا رہا تھا۔

میں نے اپنے سوتیلے بیٹے، بلال، کو ہیمپ سٹیڈ کے ایک ٹیوٹوریل سکول میں داخل کرا دیا۔ میں مصر تھی کہ اسے تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ہمارے ایک قریبی حلیف، چوہدری حنیف، ہمارے ہاں مقیم تھے۔ انہوں نے لونگ روم میں ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ ان کا سامان پورے کمرے میں بکھرا پڑا تھا۔ جب ہم کسی کی دعوت کرتے تو چوہدری صاحب کو بے ٹھکانا ہونا پڑتا۔ میں اسی عارضی بیڈ روم کو بار بار لونگ روم میں بدلتی رہتی۔ مکان کی ظاہری وضع کو دیدہ زیب بنانا ضروری تھا۔ میڈیا کے لوگ، مقتدر سیاست داں اور پاکستان سے باہر مقیم پرانے دوست ہر وقت ہمارے ہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ہمیں دیواروں پر پینٹ کرانے کا مقدور تو تھا نہیں، اس لیے میں نے دیواروں کو دھونے پر اکتفا کیا۔ "سرف اور پانی" کے ایک پچارے کے بعد گھر کا حلیہ بہتر ہو گیا۔

کہتے ہیں کے قیدی بالاخر اپنے یکسانیت کے مارے ماحول کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس کا غصہ دھیما پڑتا جاتا ہے۔ حواس کند پڑنے لگتے ہیں، جوش وجذبے پر پسیہ پھرتا جاتا ہے۔ مجھ پر بھی اسی طرح کی علامات ایک ساتھ طاری تھیں۔ قیدی کی طرح میں بھی آزادی کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔ ہم دونوں جس آزادی سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ وہ بس آزادی کے خواب دیکھنے تک محدود تھی۔ میں ان بھولے ہوئے مزوں کا خواب دیکھتی کہ میں فلم دیکھنے گئی ہوں اور پوپ کارن کا پیکٹ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے ہرگز مان کر ہی نہ دیا کہ میرے خواب کبھی سچ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایسے ہر امکان کی راہ میں

حقیقت سنگین دیوار بن کر کھڑی تھی۔ میں چوری چھپے یہ امید کرنے لگی کہ مصطفےٰ مر جائے گا۔ میری نجات کی واحد صورت یہی تھی۔ میں سہم گئی کہ وہ کسی نہ کسی طرح معلوم کرے گا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ میں نے ان خطرناک خیالوں کو جھٹ پٹ لپیٹ لپاٹ کر چھپا لیا۔

طلاق تو سرے سے ممکن ہی نہیں تھی۔ طلاق کی صورت میں میں بچیوں سے بچھڑ جاتی۔ اس کی دشمنی الگ مول لینی پڑتی۔ مجھ میں اس سے ٹکر لینے کا بوتا نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ والدین کی طرف سے مجھے کوئی سہارا نہ ملے گا۔ مصطفےٰ اس کا پکا بندوبست کر چکا تھا کہ میرے اور والدین کے تعلقات متضاد کیفیتوں سے عبارت رہیں۔ وہ ان کے خلاف میرے ذہن میں زہر گھولتا رہتا۔

وہ بڑا بدزبان تھا۔ کسی کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس کے منہ سے زہر جھڑتا رہتا۔ اس کے پاس انتہائی گندی گالیوں کا ایسا ذخیرہ تھا جنہیں سن کر گشتیاں بھی شرما جائیں۔ وہ صرف زبان کے زور سے کسی شخص کے چیتھڑے اڑا سکتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ اگر میری بے عزتی کی جائے تو مجھے کتنا برا لگتا ہے اور یہ کہ مجھے اپنی آن کتنی عزیز ہے۔ وہ ہمیشہ زبانی وار وہاں کرتا جہاں وار کرنا غیر شریفانہ فعل ہے اور اس کی ایسی تمام باتیں جنسی اشاروں کنایوں سے خالی نہ ہوتیں۔ کسی کو بخشا نہ جاتا۔ مائیں، بہنیں، بھائی، بچے، خالائیں، ممانیاں وغیرہ سب اس کی رسوا کن باتوں کا نشانہ بنتیں۔ وہ کسی چیز کی تقدیس کا قائل نہ تھا۔ صرف مغلظات پر یقین رکھتا تھا۔ میں خود کو اپنے نجی دوزخ میں رہنے سہنے کا عادی بنا رہی تھی کہ عدیلہ نے دوبارہ سر اٹھایا۔ میرے کرب کا توازن بگڑ گیا۔

مصطفےٰ نچلی منزل میں ورزش کر رہا تھا۔ فون بجا۔ اس نے فون اٹھایا۔ میں نے بالائی منزل پر نصب ایکس ٹینشن سے کان لگا دیے۔ عدیلہ بول رہی تھی: "کیا تمہیں مجھ سے پیار ہے؟ بولو۔ کیا تمہیں مجھ سے پیار ہے؟" مصطفےٰ کی آواز مجھ تک پہنچی۔ "اتنا زیادہ کہ تمہیں کبھی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا"۔

میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی، بت بنی ہوئی۔ جو شکوک تھے، جو بے یقینیاں تھیں، وہ سب آناً فاناً ناپید ہو گئیں۔ میں نے انہیں پکڑ لیا تھا۔ فون ہمیشہ ہی ان کا بیری ثابت ہو گا۔ بعد میں، خاصی دیر بعد، میں نیچے آئی۔ مجھ پر اب تک سکتے کا عالم تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کانوں سنی پر یقین لے آؤں۔ مجھے یوں لگا جیسے میں گندگی میں لتھڑی ہوئی ہوں، برتی جا چکی ہوں۔ میں اب بھی اس سے دوبدو ہونے کے لیے خود کو تیار نہ پا رہی تھی۔ میں اب بھی کسی نہ کسی تنکے کا سہارا لیے ہوئے تھی۔ کس تنکے کا؟ میرے ذہن کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

فون دوبارہ بجا۔ مصطفےٰ نے کسی سے بات کی۔ فون کرنے والے سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے پاسپورٹ کا بندوبست کردے گا۔ مجھ پر لرزہ طاری ہوگیا۔

دوبارہ فون بجا۔ دائی عائشہ نے فون اٹھایا۔ کہنے لگی کہ چوہدری حنیف صاحب ہیں اور فون مصطفےٰ کو تھما دیا۔ میں اوپر چلی گئی۔ ایکس ٹینشن اٹھا کر سننے لگی۔ دل کو پتھر کر لیا۔ اس بار بھی عدیلہ بات کر رہی تھی۔ "میں تمہیں پاسپورٹ بنوا دوں گا۔ فکر مت کرو۔ یہ کام کروا کے رہوں گا۔ لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔" عدیلہ بضد تھی۔ "جلدی سے بنوا دو۔ تمہارے بغیر جینا میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ میں یہاں سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ ابھی میں تمہارے ساتھ نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔ صرف تمہارے ساتھ"۔ میں اب بھی کوئی ردعمل ظاہر نہ کر پا رہی تھی۔ میرا جی متلانے لگا۔

اس سہ پہر ہم دونوں میرے والدین کے ہاں گئے۔ غصے اور دکھ کی وجہ سے میرے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ اگر مصطفےٰ کو میری کیفیت کا احساس تھا تو اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے ایک گھریلو کانفرنس بلائی۔ امی اور عدیلہ کو لے کر میں امی کے بیڈروم میں چلی گئی۔ میں نے امی سے کہا۔ "مصطفےٰ نے مجھے عدیلہ کے بارے میں بتایا ہے کہ کس طرح یہ اس کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ اسے دق کرتی ہے۔ وہ تنگ آچکا ہے۔ عدیلہ میرے میاں سے پینگیں بڑھانے میں لگی ہوئی میری شادی کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ یہ سب عدیلہ کا قصور ہے۔ وہ اس سے پہلو بچا رہا ہے۔ اب یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ مصطفےٰ نے کہا ہے کہ آپ اپنی بیٹی کو قابو میں رکھیں۔ یہ لڑکی ہے۔ یہ میری بہن ہے۔ شائستگی کی تمام حدیں پھلانگ چکی ہے۔" عدیلہ نے میری کہانی کو درست ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ غصے سے تلملا اٹھی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ جو تہمت لگائی ہے اس کا کوئی ثبوت بھی پیش کیا جائے۔ "مصطفےٰ صاحب یہ سب کبھی نہیں کہہ سکتے۔ ان سے بولو کہ یہاں آ کے میرے روبرو ان باتوں کا اقرار کریں۔ جب تک وہ نہ آئیں گے میں اپنی صفائی میں ایک حرف بھی نہیں کہوں گی۔ اس معاملے کا ان سے بھی تعلق ہے۔ آئیں اور سامنے آ کر مجھ سے بات کریں"۔ اسے پورا یقین تھا کہ میرے پاس چال چلنے کے لیے پتے ہیں ہی نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ مصطفےٰ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کے بس میں ہے۔

امی نے اسے اخلاقیات پر ایک لیکچر دیا اور کہا کہ اپنی ان طفلانہ چھلوں سے باز آ جائے۔ اگر اس کے والد کو پتہ چل گیا تو وہ اسے جان سے مار دیں گے۔ میں نے کہا "عدیلہ، میں پہلے ہی بہت سے مسائل میں گھری ہوئی ہوں۔ تم ہو کہ حالات کو اور بگاڑے جا رہی ہو۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہم اپنی زندگی کے ایسے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ جو دشوار بھی ہے اور تذبذب آمیز بھی۔ ہم اکھڑے ہوئے لوگ ہیں؛ جلاوطنی کے دن کاٹ

رہے ہیں۔ تم ہماری زندگیوں کو عذاب بنانے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟ میں بے بس ہو گئی ہوں"۔ "میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ تم مصطفےٰ صاحب کو اندر کیوں نہیں بلا لیتیں؟ ہاتھ کے ہاتھ پتہ چل جائے گا کہ معاملہ اصل میں ہے کیا"۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ وہ سراپا یقین تھی۔ مجھے پسپا ہونا پڑا۔

جب ہم گھر لوٹے تو میں نے مصطفےٰ کو ٹیلی فون پر ہونے والی اس بات چیت کے بارے میں بتایا جو میرے سننے میں آئی تھی اور یہ بھی کہ کس طرح میں نے اس پر حرف نہ آنے دیا تھا۔ وہ مجھے گھورنے لگا۔ اس کے بعد اس پر سراسر جنون طاری ہو گیا۔ اسے اپنے حواس پر قابو نہ رہا۔ وہ دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگا۔ اس نے اپنی دونالی بندوق اٹھا کر اس کے کندے سے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں گر پڑی۔ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پے در پے مجھ پر ضربیں لگائیں۔ میرے سر میں زخم آ گیا۔ جب خون بہنے لگا تو اس نے ہاتھ روکا۔ غصے سے کانپتے ہوئے اس نے کہا "ابھی اسی لمحے اپنی امی کو فون کرو۔ انہیں بتاؤ کہ تم پاگل ہو۔ انہیں بتاؤ کہ یہ ساری باتیں تم نے دل سے گھڑی ہیں۔ فون اٹھاؤ۔" وہ دہاڑا۔ "میں......... میں یہ نہیں کر سکتی۔ انہیں میری بات کا ہرگز یقین نہ آئے گا۔ میں اپنا بیان کیسے بدلوں۔ انہیں شبہ ہو جائے گا کہ........" وہ پھر مجھے مارنے لگا۔ "کھڑی ہو جاؤ، کتیا کہیں کی"۔ میں بڑی مشکل سے اٹھی۔ "اپنے کپڑے اتار۔ ایک تار بھی بدن پر نہ رہے۔ اتار کپڑے"۔ میں کانپنے لگی۔ اس نے میری بانہہ اس طرح مروڑی جیسے بانہہ نہ ہو پیچ کش ہو وہ بیٹھا مجھے کپڑے اتارتے دیکھتا رہا۔ اب میں بالکل ننگ دھڑنگ لونگ روم کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ میرے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ اس سے بڑی تذلیل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دائی اور بلال کمرے کے باہر میری دونوں بچیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

مصطفےٰ نے میرا جائزہ لیا۔ سر سے پاؤں تک نظر ڈالی۔ وہ مجھے ننگا کر کے میرے ذہن میں زبردستی داخل ہونا چاہتا تھا۔ میں خود کو بے بس اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ مجھ پر مکمل مایوسی کا عالم تھا۔ میں جس مخمصے میں گرفتار تھی اس کی وجہ سے میرا یہ احساس دو چند ہو گیا تھا کہ میں باقی دنیا سے کٹ چکی ہوں۔ میں خود کو ڈھانپنا چاہتی تھی۔ اس آدمی کے سامنے جس کی زبان "شرم" اور "حیا" کی فضیلت کا پرچار کرتے نہ تھکتی تھی۔ اب اس نے مجھے اپنا بھی تماشا بنا چھوڑا تھا۔ "پلیز، مصطفےٰ مجھے کپڑے تو پہننے دو۔" "فون اٹھاؤ اپنی امی سے بات کرو۔ پھر ہم دیکھیں گے"۔ "میں کپڑے پہنے بغیر فون نہیں کر سکتی"۔ اس نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میرے پورے خاندان کو پُن کر رکھ دیا۔ میرے حواس اردگرد پھیلے ہوئے خلا میں گم ہو گئے۔ میں جدھر ہاتھ پھیلاتی کچھ ہاتھ نہ آتا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں بڑی مشکل سے کھڑی تھی۔ میرے گھٹنے آپس میں ٹکرار ہے تھے اور میرے ہاتھ اور بانہیں مجھے ڈھانپنے کے لیے کافی نہ تھیں۔ میں چاہتی تھی مجھے کوئی سہارا مل جائے۔ کسی بھی چیز کا سہارا، جسے تھام کر کھڑی رہوں۔ میں نے گھٹنوں کے بل جھکنے کی کوشش کی۔ مصطفےٰ نے مجھے یہ بھی نہ کرنے دیا۔ میں اپنی جگہ سے ہلتی تو وہ چنگھاڑ کر اچھل کھڑا ہوتا۔ میں اللہ کے حضور میں دعا کرتی رہی، گڑگڑاتی رہی۔

بالآخر میں ڈھے گئی۔ میں نے سوچنے کی کوشش بھی ترک کر دی۔ "ٹھیک ہے، میں فون کیے دیتی ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے کچھ پہننے تو دو"۔ میں نے اس حالت میں کپڑے پہنے کہ میرا جسم وجان ابھی تک شرم کے احساس سے تپ رہا تھا۔ میں نے فون کیا۔ میری باتوں میں ربط نہ تھا۔ کچھ کا کچھ کہہ گئی۔ امی کو بتانا تو یہ تھا کہ جو کچھ میں نے کہا تھا سب جھوٹ تھا لیکن کہہ یہ دیا کہ سب سچ تھا۔ درحقیقت اس وقت میرے لیے غلط اور صحیح کی تمیز مٹ چکی تھی۔

مصطفےٰ نے میرے ہاتھ سے فون چھین لیا۔ اسے بند کرنے کے بعد وہ مجھے اور بھی شدومد سے پیٹنے لگا۔ میں نے کہا کہ "مجھے معاف کر دو۔ میں دوبارہ فون کرتی ہوں۔" میں نے امی سے وہی کہہ دیا جو وہ مجھ سے کہلوانا چاہتا تھا۔ میں رو رہی تھی۔ مصطفےٰ من مانی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اس کی خوشی کا اوچھا پن چھپائے نہ چھپتا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے تہمینہ درانی کی آبرو خاک میں ملا دی ہے۔ اس کے چہرے سے خباثت عیاں تھی۔ مجھے اس کے خدوخال اب زیادہ واضح طور پر یاد آ جاتے ہیں۔ حالانکہ اتنی مدت گزر چکی ہے۔ اس وقت تو وہ مجھے دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ محض ایسی شے تھا جس سے، میں جانتی تھی، مجھے ڈرنا چاہیے۔ اور جس کا حکم کسی معقول وجہ کے بغیر بجالانا پڑے گا۔ "ہاں جی، تہمینہ کی حالت بالکل ٹھیک نہیں۔ وہ پاگل ہو چلی ہے۔" اس نے اشارتاً جتایا کہ میں بچپن میں گردن توڑ بخار میں مبتلا رہ چکی ہوں۔ اسے پتہ تھا۔ کہ میرے باغیانہ رویے کو امی بچپن کے اسی عارضے کا نتیجہ قرار دیتی ہیں۔ "بیٹھے بٹھائے فرض کر لیتی ہے کہ یہ ہو رہا ہے، وہ ہو رہا ہے۔ خیالی واقعات کے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ ہر کسی کے بارے میں واہیات قسم کی کہانیاں گھڑ لیتی ہے اور پھر خود ہی انہیں سچ سمجھنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ سے سب کی جان عذاب میں ہے لیکن زیادہ تکلیف خود اسے پہنچتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ میں گم ہو کر اس طرح سسکیاں بھرنے اور رونے لگتی ہے کہ اسے تسلی دینا ممکن نہیں رہتا۔ میں بڑے تحمل سے اس کی یہ حرکات برداشت کرتا رہتا ہوں۔ آج اس نے جو کچھ کیا اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ مجھے روزانہ کس عذاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ موصوفہ کو ملکۂ غم بننے کا بڑا شوق ہے"۔

برسوں بعد میں نے نواب پور کی عورتوں کے بارے میں پڑھا جنہیں بعض جاگیرداروں نے نواب پور کے شہر میں ننگا گھمایا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ انہوں نے کیا محسوس کیا ہو گا۔ اس بات کو یاد کر کے مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

مصطفےٰ کی اقدار اور ظاہری امیج محض منافقانہ لبادہ تھی۔ یہ تھا وہ شخص جو ہمیشہ ارفع و اعلیٰ الفاظ میں عورت کی حرمت کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ اگر میں غسل خانے میں سے کسی ملازم کی بات کا جواب دے دیتی تو اسے پریشانی لاحق ہو جاتی تھی؛ جو مجھے یہ تعلیم دیتا رہتا تھا کہ میرا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے اور اُٹھنے بیٹھنے کے آداب کیا ہونے چاہئیں۔ جس کا یہ عقیدہ تھا کہ عورت اگر مردانہ محفل میں بیٹھے تو اس کا جسم اچھی طرح ڈھکا ہونا چاہیے اور اسے نظریں نیچی رکھنی چاہئیں۔ یہ شخص رنگا سیار تھا۔ اس نے اپنی ہی بیوی کو، جو اس کی بچیوں کی ماں بھی تھی، بے ستر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اب مزے سے بیٹھا اس بارے میں بات چیت کر رہا تھا۔ کہ میرا ذہنی توازن درست ہے یا بگڑ چکا ہے۔

اپنے شوہر کو اپنے دوستوں اور خاندان کی نظر میں پذیرفتہ بنانا میرے لیے انتہائی دشوار کام ثابت ہوا تھا۔ لوگ مصطفےٰ سے بہت بچ کے رہتے تھے۔ یہ مشہور ہو چکا تھا کہ وہ عورتوں کا بڑا رسیا ہے اور اس معاملے میں اسے کسی قسم کا اخلاقی پس وپیش نہیں۔ وہ جہاں بھی جاتا، اس کی عورت بازی کا ڈھنڈورا وہاں پہلے چکا ہوتا۔ میں نے اس کے حق میں کلمۂ خیر کہہ کر اس کی شہرت کو بدلا۔ میری خواہش تھی کہ ہر کوئی اس پر اعتبار کرے، اس پر تکیہ کرے۔ میں نے (پی۔آر) PUBLIC RELATIONING کا بڑا زبردست کارنامہ انجام دیا تھا۔ لیکن میں جھوٹ بولتی رہی تھی۔ ستم ظریفی یہ کہ خود مجھے معلوم نہ تھا کہ مصطفےٰ کی ہوس اگر ایک دفعہ بیدار ہو جائے تو پھر کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ میرا اپنا گھر خود میری سگی بہنوں کے لیے محفوظ نہ تھا۔

عدیلہ کے فون آتے رہے۔ ایک بار بہت رات گئے اس نے فون کیا تو بالکل بوکھلائی ہوئی تھی۔ مصطفےٰ پریشان نظر آنے لگا۔ "تمہاری بہن بالکل پاگل ہے۔ گھر سے دوبارہ بھاگ جانے کی دھمکی دے رہی ہے۔ "میری پارٹی کے ایک کارکن پر، جس کا نام نعیم ہے، عاشق ہو گئی ہے۔ اس کی ذہنی حالت درست نہیں۔"

میری بات سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا مانوں، کیا نہ مانوں، اسی فکر میں الجھی رہی کہ یہ بات امی تک پہنچاؤں کہ نہ پہنچاؤں۔ اگلی صبح مصطفےٰ نے مجھے جانے تو دیا مگر تاکید کی کہ میں دائی عائشہ کو ساتھ لے جاؤں۔ میں جا کے عدیلہ سے دوبدو ہوئی۔ بظاہر وہ کوئی خاص فکرمند نظر نہ آئی۔ اس کے چہرے پر عیارانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ گھر سے بھاگ جانے کی دھمکی محض جھوٹ موٹ کا ڈراوا ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ دائی عائشہ نے زیرِ لب

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

عدیلہ سے کچھ کہا۔ ہم واپس آ گئے۔

اگلی صبح ہمارے پاس سپین سے فون کال آئی۔ امی بول رہی تھیں۔ ان کا پارا چڑھا ہوا تھا اور وہ مصطفے کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ غیظ و غضب کے اس اچانک اظہار پر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ بات کیا ہے۔ عدیلہ نے فون سنبھالا اور نپے تلے لہجے میں مجھے بتایا کہ وہ میرے شوہر سے عشق لڑاتی رہی ہے۔ "مجھے اس کے ساتھ ہم بستری کرتے ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔ یہ بات میں تمہیں سہیلی کے طور پر بتا رہی ہوں۔ بہن کی حیثیت سے نہیں۔ تہمینہ، مصطفے کو تم سے نفرت ہے۔ کون ہے جسے تم سے نفرت نہیں۔ امی بھی تم سے نفرت کرتی ہیں۔ تم میں ضرور کوئی نہ کوئی خرابی ہے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتی تو اس سے پہلے کہ مصطفے صاحب مجھے نکال باہر کرتے میں خود انہیں چھوڑ دیتی"۔

میں نے فون واپس چونگے پر دے مارا۔ اس سے زیادہ سننے کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ امی نے اپنا حوصلہ مجتمع کیا اور عدیلہ سے کہا کہ مجھ سے بات کرے۔ میرے لیے تفصیلات جاننا ضروری ہو گیا تھا۔ عدیلہ نے ہر چیز بالکل کھول کر بیان کر دی۔ "ملاقاتوں کا انتظام بلال کے ذمے ہے۔ وہ ہمارا بچولیا ہے۔ وہی ویسٹ لاج پارک ہوٹل میں ہمارے لیے کمرہ بک کراتا ہے۔ کل رات تمہاری آنکھوں کے آگے دائی نے مجھے ایک پیغام پہنچایا۔ مصطفے نے کہلوایا تھا کہ اگر میرا سپین جانا ہو تو رابطے کا کوئی نمبر چھوڑ جاؤں۔ میں اسے چھوڑ کر آنا نہ چاہتی تھی۔ دائی کو یہ ساری باتیں پہلے دن سے پتہ ہیں۔ اس سے پوچھ لو۔"

میں نے بلال اور دائی کو بلایا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ اس معاملہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ امی سے بات کریں اور اُنہیں بتا دیں کہ یہ ساری باتیں عدیلہ نے آپ گھڑی ہیں۔ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ میرے شبہات کی اب تقریباً پوری طرح تصدیق ہو گئی۔

مصطفے گھر آیا میں نے اسے یہ بات بتائی۔ وہ دہل گیا۔ اس نے ان تمام باتوں سے انکار کیا۔ میں نے کہا کہ وہ امی کو فون کر کے عدیلہ کو بے نقاب کر دے۔ وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔

عدیلہ نے ہمیں فون کیا اور بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگی کہ اس کی مصطفے سے بات کرائی جائے۔ مجھے اپنے پر قابو نہ رہا۔ میں نے کہا کہ اس کا کوئی کام نہیں کہ میرے شوہر کو فون کرتی پھرے۔ یہ سن کر وہ بکنے جھکنے لگی۔ میں نے فون چونگے پر پٹخ دیا۔

پھر میں نے مصطفے سے کہا کہ عدیلہ کو فون کرو اور کہو کہ وہ باز آ جائے۔ اس نے فون کیا۔ میں ایکس ٹینشن اٹھا کر سننے لگی۔ مصطفے نے کہا۔ "مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے۔ تم میرے لیے بہن کی طرح ہو۔ تمہیں اس طرح کی حرکتیں نہیں کرنی چاہیئں۔ تم اپنے رویے سے بہت سے لوگوں کو دکھ پہنچا رہی ہو۔"

وہ میری طرف مڑا۔ سمجھ رہا تھا کہ اس کی گلو خلاصی ہو گئی۔ "تمہیں زیادہ سختی سے بات کرنی چاہیے تھی۔ عدیلہ نے ہمارا گھر برباد کرنے کی کوشش کی ہے۔" میں بولی "تہمینہ، تمہاری بہن کے دماغ میں فتور آ چکا ہے۔ اگر میں اس پر گرجتا برستا تو وہ خود کشی کر لیتی۔ میں یہ خون سر پر لینے کو تیار نہیں"

پھر اس نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ یہ سارا قصہ عدیلہ کے مخبوط ذہن کی اختراع ہے۔ مجھے اس کے ایک حرف پر بھی یقین نہ آیا۔ لیکن میں اسے اپنی اصلاح کرنے کا ایک اور موقع دینے پر آمادہ تھی۔ میں جھوٹ پر یقین کر کے جیے جانے کو تیار تھی۔

امی اور میں نے ایک دوسرے سے تمام تعلقات ختم کر لیے۔ میں نے کہا کہ اگر امی میری بہن بد چلن ہے تو پھر میرے میاں کا کوئی قصور نہیں۔ میں نے دوبارہ اپنے خاندان سے رشتہ توڑ لیا۔ اس قطع تعلق سے پیدا ہونے والے خلا کو صبیحہ اور اینڈریو نے پُر کیا۔ صبیحہ نے میرے کنبے کی جگہ سنبھال لی اور اینڈریو کی ذات میرے حق میں استقامت کا ستون ثابت ہوئی۔ انہوں نے مجبور کیا کہ میں اپنے ذہن سے دوبارہ کام لوں میرے ذہن کو، جو مر چلا تھا، بچا لیا، اس نے میرے دکھ کو سمجھا اور مجھے اپنی زندگی کے حوالے سے مثبت انداز میں سوچنے پر اکسایا۔ "صبیحہ، میں اسے پکڑ نہ پائی اگر وہ صرف اپنے کیے کا اعتراف کر لیتا تو ہم اپنی زندگیاں ازسر نو شروع کر سکتے تھے۔ میں اسے معاف کر دیتی۔ اب میں معاف نہیں کر سکتی۔ بھول نہیں سکتی۔ ہمارے تعلقات کے آگے بہت بڑا سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ بنیادیں ہل چکی ہیں۔ مجھے اس پر بھروسا نہیں رہا۔ بہت سی رسوا کن باتیں ہو چکی ہیں جن پر ہم نے پردہ ڈالا ہوا ہے۔ کاش مجھے پتہ چلے کہ حقیقت کیا ہے؟ وہ تو کبھی اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا۔" وہ بہت کائیاں تھا۔ ایسے نشان مٹا دیتا تھا جن سے اس کا کھوج لگ سکتا تھا۔ اس کی ALIBIS پر کہیں حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ اس کی استادیوں کی وجہ سے میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ عدیلہ صرف ہماری شادی کا ستیاناس کرنے کے لیے جھوٹ بولتی رہی تھی۔ عدیلہ مجھ سے حسد کرتی تھی۔

اس روح فرسا واقعے کے ہو چکنے کے بعد جو دن آئے میں ان کے دوران حاملہ ہو گئی۔ صبیحہ اور اینڈریو کے ساتھ بات چیت نے میرے ذہن کے خلیوں میں، جن پر مسکن دوویات کا خمار چڑھا ہوا تھا، ازسر نو جان ڈال دی۔ میں نے اپنی صورت حال کا تجزیہ شروع

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کر دیا اور یہ جائزہ لینے لگی کہ کون کون سی راہِ عمل میرے لیے کھلی ہے۔ ان خیالی تصویروں میں، جو میں پینٹ کرتی رہتی تھی۔ دھندلے سرمئی رنگ کی جگہ کالے رنگ نے لے لی۔ میں نے دوبارہ اپنی آواز کو پا لیا جسے دبا دیا گیا تھا۔ میں مصطفےٰ کو پلٹ کر جواب دینے لگی۔ تشدد کے خوف کے باوجود میں اس پر جرح کرنے سے باز نہ آتی۔ میرے اس نو یافتہ اعتماد کا جواب مصطفےٰ نے یہ دیا کہ مجھے پہلے سے زیادہ تواتر سے اور زیادہ شدت سے زدوکوب کرنے لگا۔ دم لینے کی مہلت تک نہ ملتی۔ میرے بدن پر ہر وقت نیل پڑے رہتے۔ ہر وقت گالیاں کھانی پڑتیں۔ لیکن میں نے بھی چپ سادھ لینے سے انکار کر دیا۔ میری آرا اس پر گراں گزرتی تھیں۔ میں اپنے خیالات کا زیادہ سے زیادہ اظہار کرنے لگی۔ میں نے اس پر واضح کر دیا کہ اس کی ذات، اس کے دوستوں، اس کے پس منظر کے بارے میں میری کیا رائے تھی اور ہمارے تعلقات میں کس چیز کی کمی آ گئی تھی۔ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ میں اس کے اصولوں کے مطابق زندگی تو گزار سکتی ہوں لیکن اس کی من مانیوں سے نباہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اپنی جس بلاجواز بالادستی کی بنیاد اس نے دہشت اور خوف پر رکھی تھی میں اسے نکتہ چینی کا نشانہ بنانے لگی۔

مجھ میں جو تبدیلی آئی اس کی رفتار سست سہی لیکن تھی وہ مستحکم۔ میرے بتدریج نشوونما کا عمل جاری تھا۔ میں اب وہ ڈرپوک، مسکین اور منکسرمزاج چھوٹی لڑکی نہ رہی تھی۔ جس سے اس نے شادی کی تھی۔ میں عورت کا روپ اختیار کر رہی تھی۔ میں محسوس کرتی تھی کہ میری بات سنی جانی چاہیے تاکہ اسے پتہ تو چلے کہ وہ کہاں غلطی پر ہے۔ میں سرتابی تو نہ کر سکتی تھی۔ اس کا حکم بجا لانے پر مجبور تھی لیکن میری اطاعت میں ایک طرح کا فرق آ گیا تھا۔ میرے تیوروں سے ظاہر ہوتا کہ میں اس کے کہے پر طوعاً و کرہاً عمل کر رہی ہوں۔ میں نے ایک ایسا انداز اپنا لیا تھا جس سے سرکشی اور اختلاف کی بو آتی تھی۔ مصطفےٰ تبدیلی کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے آزمودہ داؤ پیچ بے اثر ثابت ہونے لگے۔ وہ اپنی چالوں گھاتوں کا نئے سرے سے جائزہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ اور اسے میری نیم دلی سے نمٹنے کے لیے نئی تدبیریں وضع کرنی پڑیں۔ وہ سمجھ گیا کہ مارپیٹ کا اب مجھ پر پہلا سا اثر نہ ہوگا۔ کہ میں زدوکوب کی عادی ہو چکی ہوں۔ اس نے اپنی توجہ، کلی طور پر، میرے ذہن پر مرکوز کر دی۔ وہ مجھے ذہنی طور پر ڈرانے دھمکانے لگا۔ مڑ کر ماضی پر نظر ڈالتی ہوں تو سوچتی رہ جاتی ہوں کہ کون سی تدبیر زیادہ موثر تھی۔ مارپیٹ یا وہ اذیت جو میرے ذہن کو پہنچائی جاتی تھی۔

اس کے موڈ میں تبدیلی ہمیشہ اچانک واقع ہوتی میری ٹھکائی کے بعد وہ میرے سامنے ناک رگڑنے لگتا۔ زاروقطار روتا، میرا جی ستانے لگتا۔ انجام کار اسے اس قدر پیچ طرز

عمل سے باز رکھنے کے لیے مجھے ہی کہنا پڑتا کہ بس بہت ہو گیا، مجھے بخشو۔ جتنی نفرت مجھے اس کی ظالمانہ شخصیت سے تھی اتنا ہی اس کا عاجزانہ روپ زہر لگتا تھا۔ میں گڑبڑا کر رہ جاتی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم مان جائیں اور پچھلی بدمزگیوں کو بھلا دیں۔ لیکن پچھلی باتوں کو بھلانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ ہر بار مجھے جو اذیت برداشت کرنی پڑتی وہ پچھلی اذیتوں سے مختلف ہوتی اور ہر بار میری ذات کا کچھ حصہ ختم ہو جاتا۔ نتیجتاً ہم ان لڑائیوں کے حوالے سے جھگڑتے رہتے تھے جو ادھوری رہ گئی تھیں۔ یہ ایک مضمحل کرنے والا عمل تھا جو ہمیں چوٹ لگا کر رہتا۔ بعض اوقات ان لڑائیوں پر نشہ آور چیزوں کے ٹیکوں کا گمان ہوتا۔ ہم لڑنے جھگڑنے کے تقریباً اسی طرح عادی ہو چکے تھے جس طرح نشئی ہیروئن وغیرہ کے۔ خاندان والوں سے کٹ کر میرا اپنے گھر کی حالت سدھارنے کا جوش غلو کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔

دو سال گزر گئے۔ زرینہ کی شادی کا وقت آ پہنچا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھی۔ اس کی خوشی میری خوشی تھی۔ اس کا دولھا اور تمام سسرالی عزیز لاہور سے آ گئے۔ مجھے مدعو نہیں کیا گیا۔ شادی کی تقریب میں میری موجودگی امی کو منظور نہ تھی گھر میں کوئی میرا نام تک نہ لیتا تھا۔ اس بات سے مجھے دکھ پہنچا۔ یوں لگا جیسے میرا کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود مجھے قربان کر دیا گیا ہو۔ ایک بار پھر مجھ پر عیاں ہوا کہ مصطفےٰ کی دخل اندازی نے ہمارے گھرانے کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ ان حالات میں امی کا ردعمل اور کچھ ہو ہی نہ سکتا تھا۔ میں انہیں معاف کر سکتی تھی۔

ان دنوں مصطفےٰ انگلینڈ سے باہر گیا ہوا تھا۔ میں اکیلی تھی۔ میرا ساتواں مہینہ تھا۔ میں نے چشم تصور میں زرینہ، اس کے عروسی جوڑے، اس کے شوہر ریاض اور ان تمام چھوٹی چھوٹی رسموں کو دیکھا جن سے دھیرے دھیرے شادی کا سماں بندھتا ہے۔ میں وہاں جانے، ناچنے، گانے اور زرینہ کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے مچل رہی تھی۔ محروم رہ جانے کا دکھ کیا کم تھا کہ اتنے میں فون بار بار، ڈرانے والے انداز میں بجنا شروع ہو گیا۔ میں فون اٹھاتی۔ دوسری طرف کوئی بھی نہ ہوتا۔ گانے اور ہنسنے کی آوازیں آتیں۔ میں کان لگا کر سنتی۔ شادی کے گیت، ڈھولکی کی جانی پہچانی تھاپ، تال کو قائم رکھنے کے لیے رو پہلے چمچے کی الگ سے سنائی دینے والی جھنکار۔ یہ زرینہ کی شادی ہو رہی تھی۔ سب لوگ ادھر جمع ہنس رہے تھے۔ گا رہے تھے، جشن منا رہے تھے۔ پھر فون بند ہو جاتا۔

یہ ایک شیطانی کھیل بن گیا کوئی میرے ذہن سے چھیڑ خانی میں مصروف تھا، میرے دُکھے ہوئے دل کو اور دکھا رہا تھا۔ اس طرح کے فون برابر آتے رہے۔ میں انہیں سن سن کر روتی رہی۔ میری تنہائی کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ ذہن کو عذاب دینے کے بڑے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پُرکار طریقے مجھ پر آزمائے جا رہے تھے۔ جب فون بجتا، میں ریزہ ریزہ ہو جاتی۔

میں نے اس تکلیف دہ ذہنی کھیل کے بارے میں صبیحہ سے بات کی۔ ایک عجیب وغریب صورتِ حال نے مجھے دِق کر رکھا تھا۔ عدیلہ دوبارہ ہماری زندگیوں میں مخل ہو رہی تھی۔ صبیحہ نے میرے خدشات سے اتفاق نہ کیا۔ مصطفٰے لوٹ آیا۔ جب میں نے ان فون کالوں کا اس سے ذکر کیا تو یوں لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو لیکن اس نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ میرے ذہن کو گاہے گاہے بھٹک جانے اور دور کی کوڑی لانے کی عادت پڑ چکی ہے۔ اس نے تحائف اور ملبوسات کے ذریعے، جو وہ بیرونی دورے سے لایا تھا، میری توجہ بٹانی چاہی۔ اسے میرے لیے تحائف لانے کا بڑا شوق تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے، مادی ضرورتوں کی حد تک مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے دی ہو۔

میں نے ایک سہیلی کو خفیہ مبصر کے طور پر، شادی پر بھیجا۔ اس نے آ کر جو روداد بیان کی اس کے سہارے میں بھی، گویا غائبانہ، زرینہ کی شادی میں شریک ہو گئی۔ وہ زرینہ کی پولارائیڈ تصویریں بھی اتار کر لائی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ میکے سے رخصت ہوتے وقت وہ کیسی لگ رہی تھی۔ زرینہ کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، جیسے کسی منی ایچرپینٹنگ میں جان پڑ گئی ہو میں نے اسی سہیلی کی زبانی زرینہ کو پیغام بھجوایا۔ میں اپنی بہن کو بتانا چاہتی تھی کہ میں موجود نہ سہی پھر بھی اس کی بالغ زندگی کے آغاز کے موقع پر اس کے ساتھ ہوں، اس سے پیار کرتی ہوں اور ہمیشہ اسے خوش وخرم دیکھنے کے لیے دعاگو رہوں گی۔ زرینہ یہ سن کر رو دی۔

گونگے فون آتے رہے۔ فون کرنے والا صرف مصطفٰے سے بات کرتا۔ ہمارے پاس میاں ساجد پرویز اور ان کے بڑے بھائی میاں ریاض ٹھہرے ہوئے تھے۔ بلال اور دائی عائشہ بھی ہمارے پاس مقیم تھے۔ ان فونوں سے میرا ناک میں دم آ گیا۔ تقریباً ہر آدھ گھنٹے بعد فون آ جاتا۔ میں مصطفٰے سے جھگڑتی۔ یہ سارا معاملہ مجھے بچگانہ اور خام کارانہ معلوم ہوتا۔ میں نے مصطفٰے سے کہا کہ اس کی عمر کے آدمی کو اس طرح کے فون سننا زیب نہیں دیتا۔ "اگر اس طرح کے فون آتے ہی ہیں۔ تو پھر میرے پاس آنے چاہئیں۔ تم اب بزرگ ہو گئے ہو۔ بزرگ ہونے کا ثبوت دو"۔

مصطفٰے کوئی وضاحت پیش کرنے کے بجائے میرے بے بنیاد حسد پر ہنستا رہتا۔ پھر اچانک اس نے یہ کہہ کر مجھ پر بجلی گرا دی کہ بھارتی فلمی دنیا کی حسینہ، لاکھوں دلوں کی دھڑکن، زینت امان اس پر مرمٹی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مصطفٰے نے مجھے بتایا، اور اس کا احساس تفاخر چھپائے نہ چھپتا تھا، کہ وہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے، اسے تنگ کر رہی ہے۔ کہنے لگا کہ یہ تمام فون زینت امان کی طرف سے آتے ہیں اور یہ کہ وہ

اس عورت سے بالکل بیزار ہو چکا ہے۔

زینت امان سے ہونے والی بات چیت سے یہ تاثر بالکل نہ ملتا تھا کہ مصطفٰے اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک بار میں کمرے میں آ نکلی تو اتفاقاً معاملے کا ذرا سا حصہ میرے کان میں بھی پڑ گیا۔ "اگر اس شخص نے دوبارہ تمہاری طرف دیکھا تو میں تم دونوں کو گولی ماردوں گا۔" اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر جھینپی جھینپی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "تو گویا یہ اس سے پیچھا چھڑایا جا رہا ہے۔ کیوں؟ لہجہ تو کسی جلے بھنے عاشق سے زیادہ ملتا تھا" میں نے بدتمیزی سے کہا۔ "مجھے پتہ تھا کہ تم اِدھر پاس ہی موجود ہو۔ میں نے تمہاری آہٹ سن لی تھی۔ میں صرف تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ فون پر تو کوئی بھی نہیں تھا۔ ادھر آؤ۔" بانہیں پھیلی ہوئیں۔ چہرے پر مسکراہٹ۔ جیسے کسی لمبی جھپٹ کے بعد تنے ہوئے ذہن کے بل کھلتے جا رہے ہوں، جیسے وہ کسی غصے کو ٹھنڈا کرنے پر مسرور ہو۔

کوئی دو گھنٹے بعد خباثت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے وہ مجھے بتانے لگا کہ زینت امان نے اس کی زندگی حرام کر دی ہے۔ "جواب میں میری طرف سے انکار سننا اسے منظور نہیں۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں کیا کروں؟" میں نے جل کر کہا۔ "مصطفٰے، عزت اسی میں ہے کہ تم اپنا قول نباہو: یا اس سے نباہو یا مجھ سے۔ اگر تمہارے نزدیک میری، ہماری دو بچیوں کی یا اپنے اس بچے کی جو میرے پیٹ میں ہے، کوئی اہمیت نہیں تو پھر میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں ہمیں چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ تم نے زینت امان سے جو قول قرار کیا ہے وہ اس عہدوپیمان سے زیادہ قابلِ تعظیم ہے جو تم نے مجھ سے کیا تھا تو اس کے پاس چلے جاؤ۔ کسی کے ساتھ تو وفا کرو۔ میری دلی تمنا ہے کہ تم میں وفاداری کا کچھ احساس تو پیدا ہو۔ کسی سے وفاداری کا۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ کوئی اور عورت ہی سہی۔" "میں تمہیں یا بچیوں کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ان سے محبت ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ تمہارے بغیر میں مر جاؤں گا۔"

پہلے اس نے کچل کر مجھے پلپ میں تبدیل کر دیا اور اب اسی پلپ سے میں ازسرِ نو گھڑی جا رہی تھی۔ اس مستقل گھڑت اور توڑ پھوڑ، توڑ پھوڑ اور گھڑت سے میری جان آدھی رہ گئی۔ جو دراڑیں پڑ چکی تھیں انہیں لفظوں سے ڈھانپنا چھپانا ممکن نہ رہا تھا۔ مصطفٰے نے فیصلہ کیا کہ زینت امان کو بتا دے گا کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔

اس رات ہم ایک پب گئے۔ مصطفٰے کہنے لگا کہ اس نے زینت امان سے ملنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ کار میں پب آئے گی اور مصطفٰے پب سے باہر اس سے ملے گا۔ یہ ان کی آخری ملاقات ہو گی۔ اس نے مجھ سے اور ساجد سے ساتھ چلنے کو کہا۔ مصطفٰے نے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہمیں پب میں چھوڑا اور اپنی دوست کی راہ دیکھنے باہر جا کھڑا ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس شام میں اپنے حواس کھو بیٹھوں گی۔ میں نے بلڈی میری منگائی اور اس میں ڈھیروں کے حساب سے ٹباسکو اور ووسٹر ساس ڈال کر واڈکا کری بنانے میں مصروف ہو گئی۔ یہ ملغوبہ تیار کر کے میں نے غٹاغٹ پی لیا۔ ساجد میرے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آئے۔ وہ میری برداشت کی حد سے حیران رہ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے خود بھی ٹھیک طرح معلوم نہیں کہ میں مصطفےٰ کے ساتھ کیوں نباہ کیے جا رہی ہوں۔ "جب سے میری مصطفےٰ سے شادی ہوئی ہے میں زندہ درگور ہوں"۔

میں انتظار کرتی رہوں کہ دیکھوں ان دونوں کی گفت وشنید کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ زندگی میری، فیصلہ غیروں کے ہاتھ میں۔ مصطفےٰ اکیلا لوٹا۔ ان دونوں میں چیخ چیخ ہو گئی تھی اور وہ چلی گئی تھی۔ مصطفےٰ بہت دبلا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے نہ تو کچھ بتایا نہ کھل کر باتیں کیں۔ وہ خوف زدہ معلوم ہو رہا تھا۔

اس رات وہ کسی ہوئے سے ڈرے بچے کی طرح مجھ سے چمٹا رہا۔ اس نے نہایت جذباتی انداز میں مجھ سے باتیں کیں: "تم شاید مجھے چھوڑ جاؤ۔ میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ میں بڑا بیہودہ شوہر ثابت ہوا ہوں۔ تم سے زیادہ بردبار بیوی مجھے نہیں مل سکتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم نے کس طرح اور کیوں میرا اتنا ساتھ دیا ہے۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکا۔ جن وجوہ کی بنا پر تم نے مجھ سے شادی کی تھی وہ سب دھری کی دھری رہ گئیں۔ میری وجہ سے تمہیں جلاوطنی میں دکھ جھیلنے پڑے۔ میں نے تمہیں اپنے کمپلیکس، اپنے اندیشے اور مسائل برداشت کرنے پر مجبور کیا۔ میں نے اپنے تمام بوجھ تم پر لاد دیے۔ تم انہیں باوقار انداز میں اٹھائے رہیں۔ میری جو بھی محرومیاں تھیں ان کا بدلا میں نے تم سے لیا۔ پتہ نہیں تمہارے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکتا۔ میں جانتا ہوں تم مجھے چھوڑ جاؤ گی۔ اسلام آباد میں جو گھر ہے وہ تم لے لو۔ بچیوں کے ساتھ وہاں چلی جاؤ اور معاف کر دینے کی کوشش کرنا۔ تمہاری مہربانی ہو گی۔"

جذبات میرے تھے گر اس کی زبانی ادا ہوئے تھے۔ البتہ اس چھوٹی سی تقریر کا آخری حصہ غیر متوقع تھا۔ وہ سو گیا۔ فون بجا۔ مصطفےٰ جھٹ اٹھ بیٹھا۔ اس نے پنجابی میں بات کی۔ کہنے لگا کہ وہ فون کرنے والے کا مسئلہ صبح کو حل کر دے گا۔ اس نے مخاطب ہونے والے یا والی کو تاکید کی کہ اسے صبح گیارہ بجے فون کیا جائے۔

میں پریشان ہوئی۔ رات خاصی جا چکی تھی۔ میں نے پوچھا کہ فون کس کا تھا۔ "یہ زینت امان کی ماں تھی۔ کہہ رہی تھی کہ میں اس کی بیٹی سے شادی کروں ورنہ وہ میرے رومانس کی خبر "جنگ" لندن میں چھپوا دیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو میری سیاسی

موت واقع ہو جائے گی۔" "میرا خیال ہے کہ اس صورت میں تمہیں شادی کرنی ہی پڑے گی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "میرا بھی خیال ہے کہ شادی کرنی ہی پڑے گی"۔ اس نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔ جب وہ پڑ کر سو گیا تو میں نے نیچے جا کر اپنی دوست، منیرہ بصیر، کو فون کیا جو بمبئی کے فلمی سین سے بہت باخبر رہتی تھی۔ "کیا زینت امان لندن میں ہے؟" "نہیں بمبئی میں ہے۔ کسی فلم میں کام کر رہی ہے۔ درحقیقت کئی فلموں میں کام کر رہی ہے"۔ "یہ بتاؤ کیا اس کی ماں کو پنجابی آتی ہے؟" "مجھے اس میں شک ہے۔ وہ جرمن عورت ہے۔ اگر مجھے غلط یاد نہیں تو اس کا نام ہائنز ہے۔ یہ یقیناً کوئی شریفانہ پنجابی نام نہیں۔ تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟" "کبھی بتاؤں گی تمہیں۔" میں نے فون رکھ دیا۔

میں آ کر بستر میں لیٹ گئی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ میں نے مایوسی کے عالم میں اللہ سے دعا مانگی۔ مجھے نیند آ گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ زینت امان ہمارے گھر آئی ہے۔ وہ اندر آئی اور پھر غائب ہو گئی۔ اس کے بعد عدیلہ اور میری نانی اماں نمودار ہوئیں۔ جیسے ہی انہوں نے اندر قدم رکھا گھر شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہر طرف دھواں پھیل گیا اور گوشت پوست جلنے کی سراہند آنے لگی۔

میں جاگی تو مجھے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ سب پھر عدیلہ کی حرکتیں ہوں؟ ہماری آخری مڈھ بھیڑ کو، جو بے نتیجہ ثابت ہوئی تھی، ڈھائی سال گزر چکے تھے۔ کیا وہ کسی بدروح کی طرح مجھے دوبارہ ستانے آ گئی ہے؟ کیا وہ ابھی تک منظر پر موجود ہے؟ کیا مصطفےٰ اتنا احسان فراموش ہو سکتا ہے؟ میں نے اس کی حمایت کی تھی۔ اپنے خاندان سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ کیا وہ اب بھی عدیلہ سے ملتا رہتا ہے؟ کیا میری بالکل کوئی حیثیت نہیں؟

اس خواب کے اثرات مجھ پر مسلط رہے لیکن میں نے کسی سے بات نہیں کی۔ اگلی صبح دیکھتی کیا ہوں کہ نانی اماں چلی آ رہی ہیں۔ وہ پاکستان سے زرینہ کی شادی میں شریک ہونے آئی تھیں۔ اور انگلینڈ آنے کے بعد انہوں نے پہلی بار میرے گھر کا رخ کیا تھا۔ پہلے وہ خواب اور پھر ان کی آمد اسے اتفاق نہیں کچھ اور کہنا چاہیے۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ کیوں آئی ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ اس رات فون انہوں نے کیا تھا۔ مصطفےٰ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے اس کے دل میں چور ہے۔

نانی اماں رونے لگیں۔ انہوں نے مجھے وہ ساری طولانی داستان سنائی جو میرے والدین کے گھر میں جاری تھی۔ عدیلہ نے امی سے کہہ دیا تھا کہ وہ مصطفےٰ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مصطفےٰ اور عدیلہ دونوں دیوانہ وار ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار تھے۔ اس

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نے مصطفٰے کو الٹی میٹم دیا کہ اب شادی ہو جانی چاہیے۔ وہ چاہتی تھی کہ مصطفٰے مجھے طلاق دے دے۔ عدیلہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے کو تھا۔ اپنے کہے کی صداقت ثابت کرنے کے لیے اس نے مصطفٰے کو فون کیا اور پوچھا کہ اس کے کیا ارادے ہیں۔ امی سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ ایکس ٹینشن پر مصطفٰے کا جواب سنتی رہیں۔ مصطفٰے نے عدیلہ سے شادی کرنے کی قسم کھائی۔ اس نے کچھ مہلت مانگی۔ بہانہ یہ بنایا کہ میرے حمل کی وجہ سے تاخیر ناگزیر ہے۔ کہنے لگا کہ اسلام میں حاملہ بیوی کو طلاق دینے کی اجازت نہیں۔ علاوہ ازیں، دو سگی بہنوں سے ایک ساتھ شادی کرنا حرام ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ قرآن میں اس بات کی ممانعت آئی ہے کہ دو بہنوں سے بیک وقت تعلقات رکھے جائیں۔ اگر یہ ساری باتیں منظر عام پر آگئیں تو اس کا سیاسی مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ اس نے عدیلہ کی منت کی کہ وہ اس سلسلے میں احتیاط سے کام لے۔ احتیاط کا صلہ یہ ملے گا کہ وہ جلد ہی اس سے شادی کر لے گا۔

نانی اماں کے آنسو بہتے رہے۔ میری نہ ختم ہونے والی اذیت ان کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ مجھ سے خفا بھی تھیں اور اس بیمار آدمی کو خاندان میں جگہ دینے کی ذمے دار مجھے قرار دیتی تھیں۔ اس نے خاندان کی عزت آبرو کو اپنے وحشیانہ پن اور بہیمیت کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ انہوں نے ذرا بھی رو رعایت نہ کی۔ مجھے کھری کھری سنائیں۔

تمہاری ماں کا کہنا ہے کہ تمہاری زندگی ختم ہو چکی ہے۔ تم نے اپنی مرضی سے مصطفٰے سے شادی کی تھی۔ اس نے تمہیں برباد کر دیا۔ تمہاری بہن کمسن ہے۔ اس کی کسی بھلے مانس سے شادی ہو جائے گی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگے گی اور اس خبیث آدمی کو بھول جائے گی ۔ عدیلہ کو ہرگز مصطفٰے کے ہتھے نہ چڑھنے دینا۔ تم پر فرض ہے کہ باقی ماندہ زندگی اس مقصد کے لیے قربان کر دو۔ تم مصطفٰے سے کبھی الگ نہ ہونا۔ وہ عدیلہ کو نہیں چھوڑے گا۔ خاندان کی عزت بچانے میں تمہیں ہاتھ بٹانا پڑے گا۔ تمہارے والدین کا کہنا ہے کہ اگر تم نے مصطفٰے کو چھوڑا تو ان کے پاس واپس جانے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔

ان کی باتیں سن کر میرا اندر سُونا ہو گیا۔ مجھے نظر آنے لگا کہ میرے مستقبل میں اجاڑ پن کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے پھر اوروں کی خاطر سولی چڑھنا پڑے گا۔ مجھے اس خاندان کی ڈھال بننا ہو گا۔ جس مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اس بہن کی خاطر دکھ سہنا ہو گا جس نے میرے ساتھ فریب کیا تھا۔ مجھے بڑی چترائی سے دوبارہ اس ماحول کا حصہ بننا تھا۔ جو محرمات کے ساتھ بدکاری کے جرم سے آلودہ تھا۔

میں نے نیچے جا کر مصطفٰے سے بات کی۔ میں بالکل پُرسکون تھی۔ وہ کسی بھکاری کی طرح میرے قدموں میں گر گیا اور منت کرنے لگا کہ ایک بار اور اس کے کشکول میں معافی

کا کوئی روکھا سوکھا ٹکڑا ڈال دوں۔ اس نے گڑگڑا کر کہا کہ میں اسے چھوڑ کر نہ جاؤں۔ "میں تم سے وہ سلوک کروں گا جو کسی ملکہ سے کیا جاتا ہے۔ میں آئندہ تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ "میرا وعدہ۔ میں تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ میں تمہار حکم مانوں گا۔ جو تمہاری مرضی ہو وہی کرنا۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

کسی درندہ صفت آدمی کو، کسی بے رحم بلائے بد کو، پٹ جانے کے بعد، قابل رحم اور قدموں میں لوٹنے والے انسان میں بدلتے دیکھنا بجائے خود ایک روح فرسا تجربہ ہے۔ میں جانتی تھی کہ یہ کایا پلٹ تھوڑی دیر کے لیے ہے۔ اس کے باوجود میں نے وہی کیا جو مشہور ہے۔ کہ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا"۔

میں مصطفٰے کو ساتھ لے کر نانی اماں کے پاس پہنچی۔ انہوں نے اپنے الٹی میٹم کا اعلان کیا۔ کہنے لگیں کہ میری ماں کے لیے اب مزید صبر سے کام لینا ممکن نہیں۔ "اس خاندان کی گردن پر ایک تلوار جھول رہی ہے۔ اب اس تلوار کو گردن پر گرانے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ خونریز کاروائی ہو ہی جائے۔ ہم عدیلہ کو گھر سے نکال دیں گے۔ اگر تم چاہتے ہو تو اسے اپنے گھر لے آؤ۔" مجھے پتہ تھا کہ نانی اماں یہ باتیں صرف اثر ڈالنے کے لیے کہہ رہی ہیں۔ تاکہ انہیں سن کر اس شخص کا سر شرم سے جھک جائے۔ مصطفٰے کے ردعمل سے ان تمام باتوں کی نفی ہو گئی جو اس نے چند قابل رحم لمحات پہلے مجھ سے کہی تھیں۔ "بہت خوب۔ اگر آپ کا فیصلہ یہی ہے۔ بہت خوب۔ میں جا کر عدیلہ کو اپنے گھر لے آتا ہوں۔ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ جب تک تہمینہ میرے گھر میں موجود ہے میں عدیلہ کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا"۔

میں نے محسوس کیا کہ کوئی شے چٹ سے ٹوٹ گئی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں گرتی جا رہی ہوں، سانپوں سے بھرے گڑھے میں گرنے والی ہوں۔ میری بیتی زندگی کے لمحات کوندے کی طرح میرے سامنے سے گزرے تذلیل میں شرابور شبیہیں۔ مکمل لاچارگی۔ یہ ایک عظیم طغیانی تھی۔ میں کارٹونوں میں بنی ہوئی کسی صورت کے مانند مشینی انداز میں ایک لگر پر چلی جا رہی تھی، آگے ہی آگے، یہاں تک کہ اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں ہوا پہ چل رہی ہوں۔ اور اس کے بعد میرا نیچے جا گرنا۔ میرا اعصابی نظام جو گھس پس کر تار تار ہو چکا تھا بالآخر چیتھڑوں کا ایک گٹھر بن کر ڈھیر ہو گیا۔ میرے آنسو تھمے بغیر بہتے رہے۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں آنسو بہا رہی ہوں۔ یہ ۱۹۸۱ء تھا۔ میں نے اس شخص سے ۱۹۷۶ء میں شادی کی تھی۔ پانچ سال میرے پاس سے گزر گئے تھے۔ میرا اعصابی بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے وقت لگا۔ اس عمل میں ایک لمحے کی بھی ڈھیل کبھی نہ ملی۔ میں حیران ہوں کہ بریک ڈاؤن پہلے کیوں نہ ہو گیا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نانی اماں چلی گئیں۔ انہیں جا کے امی کے پاس رہنا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ امی کی آنکھوں کا ابھی ابھی موتیا بند کے لیے آپریشن ہوا ہے۔ جب سے یہ معاملہ نئے سرے سے شروع ہوا تھا۔ انہوں نے دن رات رو رو کر آنکھوں کا ناس کر لیا تھا۔ ہم سبھی صیدِزبوں تھے۔ اس ایک شخص نے ہم سب کو توڑ پھوڑ کر اور ملیا میٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

مصطفٰے نے عدیلہ کو فون کیا۔ میں سنتی رہی۔ اس بے ربطی کے عالم میں بھی جو مجھ پر طاری تھا میں سمجھ گئی کہ عدیلہ کے ساتھ اس کی گفتگو کا نچوڑ کیا ہے۔ "تہمینہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی ہے۔ تمہاری امی پر ان تمام باتوں کا بہت برا اثر پڑا ہے۔ ممکن ہے وہ صدمے سے جانبر نہ ہو سکیں۔ ہمیں ان سب لوگوں کی خاطر یہ سارا سلسلہ ختم کر دینا چاہیے۔"

مجھ پر اور زیادہ دیوانگی طاری ہو گئی۔ میں سمجھ گئی کہ معاملہ ختم کوئی نہیں ہوا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اسے جاری رکھنے کے لیے یہ وقت موزوں نہ تھا۔ ساجد اور میاں ریاض نے میری چیخیں سنیں۔ انہوں نے تسلی دینے کی مقدور بھر کوشش کی اور مجھے ولیم کھانے کو دی۔ ان کے قائد کی شخصیت ان کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ انہیں اچھا نہیں لگا۔

یہ نومبر کی یکم تاریخ تھی۔ اس دن اینڈریو کی سال گرہ تھی۔ ہم ان کے گھر ڈنر پر مدعو تھے۔ میرے لیے جانا ممکن نہ تھا۔ مصطفٰے مصر تھا کہ میں ساتھ چلوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ آزردہ ہو کر اکیلا چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کی ڈھٹائی ملاحظہ ہو۔ اسے توقع تھی کہ سب کچھ نارمل ہو چکا ہو گا۔ میں نے پہلی بار اسے اپنے پاس سے پرے دھکیل دیا۔ میرے انکار پر وہ آگ بگولا ہو کر اٹھا اور مجھے مارنے پیٹنے لگا۔ وہ بربریت کی تمام حدیں عبور کر گیا۔ میرا چہرہ زخمی ہو گیا۔ میرے ہونٹ کٹ گئے۔ بدن پر جگہ جگہ نیل پڑ گئے۔ وہ مجھے لاتیں مارتا رہا۔ کمرے میں اِدھر سے اٹھا اُدھر پھینکتا رہا۔ اس پر خون خوار موڈ سوار تھا۔ اس نے مجھ پر غصہ اتارنا ہی تھا۔ وہ میرے خاندان کی وجہ سے سخت سے بھنایا ہوا تھا۔ مجھے کسی صورت میں سر اٹھانے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔ میری طرف سے سرکشی کی ہر ممکنہ کوشش کو کچل دینا ضروری تھا۔ میری یہ مجال کیسے ہوئی کہ اس کی بات نہ مانوں۔ میں تو محض گوشت کا لوتھڑا تھی جسے اس نے اپنی بیوی بنا کر شرف عطا کیا تھا۔ میرے اندرونی اور بیرونی زخم ابھی تازہ تھے۔ اس رات ہمیں ہسپتال جانا پڑا۔ مجھے ٹانکے لگے مجھے تھوڑا سا مرہم ذہن پر لگانے کے لیے بھی درکار تھا لیکن یہ ایسی چیز ہے جو بازار سے نہیں ملتی۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ آدمی کی اپنی ذات ہی اس کے حق میں مسیحا ہے۔ اپنے درد

کی دوا مجھے خود ہی کرنی ہو گی۔

مصطفٰے نے پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدلا۔ مجھ سے معافیاں مانگنے لگا۔ ایسے الفاظ استعمال کیے جنہیں سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ لفظ جنہیں اتنی بار ناجائز استعمال کیا جا چکا تھا، کہ وہ اپنا مفہوم کھو بیٹھے تھے۔ "تمہارا دل بہت بڑا ہے۔ کیا تم واقعی سمجھتی ہو کہ میں عدیلہ کی خاطر تمہیں چھوڑ دوں گا۔ وہ عورت جس نے اپنے بہنوئی تک کو نہیں چھوڑا۔ میں تمہیں ہاتھ سے نہ جانے دو گا۔ تم غیر معمولی عورت ہو۔ عدیلہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کا تم سے موازنہ کیا جائے۔"

ہم میں سے کسی کو منتخب کرنے والا وہ کون ہوتا تھا؟ میں نے اس شخص کو یہ استحقاق کیوں دیا کہ وہ مجھے یا عدیلہ میں سے کسی کو چن لے؟ اسے یہ پوزیشن کیوں حاصل ہو گئی؟ کیسے حاصل ہو گئی؟ ہم اس کے سامنے قطار باندھے کیوں کھڑی تھیں؟ ہم کسی دکان کی کھڑکی میں شیلف پر اس انتظار میں کیوں بیٹھی تھیں کہ خریدار ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کرے؟

میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس خفت کی شدت میں کچھ کمی آنی چاہیے۔ جو مجھے اپنی چھوٹی بہن کے روبرو اٹھانی پڑی تھی۔ میں نے مصطفٰے سے نپے تلے لہجے میں کہا جس میں دھمکی بھی شامل تھی۔ "مصطفٰے، عدیلہ کو فون کرو۔ اسے صاف صاف بتا دو کہ تم مجھ سے اور بچیوں سے محبت کرتے ہو۔ اس سے کہو کہ ہماری زندگیوں سے نکل جائے۔ اس نے ہماری زندگیاں اجاڑ کر رکھ دی ہیں۔ تمہیں اس سے کہنا پڑے گا کہ دفان ہو جائے۔ ابھی ابھی۔" مصطفٰے نے انکار کر دیا۔ بلاتامل۔ "اگر یہ بات ہے تو مجھے میرے والد کے گھر چھوڑ آؤ۔" وہ کہنے لگا کہ تم جا سکتی ہو۔

وہ مجھے ساتھ لے گیا۔ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کا منصوبہ کامیاب جا رہا تھا۔ اس نے مجھے گھر اتار دیا۔ میری بچیوں کو میرے ساتھ جانے کی اجازت نہ ملی۔ میں انہیں چھوڑ کر چلی آئی۔

میں نے گھر میں قدم رکھا۔ مجھے وہاں ملازمہ کھڑی نظر آئی وہ عدیلہ کی بھیدی تھی۔ میرے شوہر کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرنے میں وہ عدیلہ کی مدد کرتی رہی تھی۔ یہ گھر اب میرے والد کا گھر نہ تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل بجھ سا گیا۔ وہاں ماضی کے بہت زیادہ کٹکھنے آسیب موجود تھے۔ میرا ذہن یادوں کی ریل پیل کو جذب نہ کر پایا۔ یہ میرا گھر نہ تھا۔ یہ وہ گھر تھا جہاں سے وہ دوسری عورت آئی تھی۔ بدقسمتی سے اور کوئی جگہ نہ تھی جہاں میں جا سکتی۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس بڑے گھر میں، کھڑے کھڑے، میں نے جو کہ چُور چُور اور لٹی پٹی تھی، ایک فیصلہ کیا۔ میں لوٹ کر یہاں نہیں آ سکتی۔ مجھے اپنے بچوں کے پاس واپس جانا ہو گا۔ میں بے وجود ہو چکی تھی۔ مجھ پر لازم تھا کہ اپنی جگہ ڈٹی رہوں اور شکستوں سے چُور اپنی زندگی کو ریزہ ریزہ جوڑ کر ازسرِنو صحیح سالم بناؤں۔ میں نے فون اٹھایا۔ مصطفےٰ سے بات کی۔ میں نے اس سے کہا کہ آ کے مجھے لے جائے۔ میں اپنے پاؤں چل کر جہنم لوٹ آئی۔ کہتے ہیں کہ آگ پاک کر دیتی ہے۔ میں غلام بن کر رہنے کے باوجود خود کو عجب انداز میں پاک صاف محسوس کرنے لگی۔

میں مصطفےٰ سے کھچی کھچی رہی۔ میری ہار پر اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ اوپر میرے کمرے میں آ کر مجھ سے کہتا کہ اگر میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہاں ہوں تو مجھے چاہیے کہ اس تمام واقعے کو بھول جاؤں۔ میں کفارے کے طور پر اپنے آپ کو اس کے سپرد کرتی رہی۔ برف کی سل بنی میں اسے سہتی گئی۔ میری نظر میں وہ عدیلہ کا میاں تھا۔ اس نے کوئی پروا نہ کی۔ اس نے میرے رویے میں تبدیلی کا نوٹس تک نہ لیا۔

جب وہ میرے بستر سے اٹھ جاتا تو میں غسل کرتی اور نیچے جا کر جانماز پر جا بیٹھتی۔ میں قرآن شریف پڑھتی اور روتی رہتی۔ کلام پاک کے صفحوں پر لکھا ہوا ہر مقدس لفظ میرے آنسوؤں سے تربتر ہو گیا۔ میں اس وقت تک اگلا لفظ نہ پڑھتی جب تک پچھلے لفظ پر میرا آنسو نہ ٹپک چکتا۔ دکھ کے ان کھاری قطروں سے میں نے وضو کیا۔ میں نے اللہ سے فریاد کی۔ میں تائیدِ ایزدی کے لیے تڑپ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ کوئی ایسا نہ تھا جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ میں شکستہ حال، ہر رات، یہ آس لگائے مصلے پر بیٹھی رہتی کہ کبھی تو اللہ کی مجھ پر نظر ہو گی اور مجھے اس کرب سے چھٹکارا مل جائے گا۔

پورا پندرھواڑا گزر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی تبدیلی آنے کو ہے۔ مجھے دردیں شروع ہو گئیں۔ مصطفےٰ مجھے نیشنل ہیلتھ ہاسپٹل چھوڑ آیا۔ میں نے مصطفےٰ سے کہا کہ وہ باہر انتظار نہ کرے۔ وہ کہنے لگا کہ ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے۔ اس کے خیال میں بچے کی پیدائش کے سلسلے میں ساری لے دے اور دوڑ دھوپ مغربی تصور تھا۔ وہ مجھے یہ بتاتے کبھی نہ تھکتا کہ اس کے گاؤں میں عورتیں کھیتوں میں بچہ جنتیں اور بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد دوبارہ کام میں لگ جاتیں۔ وہ اس کا قائل نہ تھا کہ حمل کے دوران یا وضع حمل کے بعد عورتوں کے ناز اٹھائے جائیں۔ مجھے آرام پہنچانے کے لیے وہ مال خرچنے پر راضی نہ تھا۔

میں نے جب اس سے چلے جانے کو کہا کہ تو میں خوف زدہ تو بہت ہوئی مگر یہ مجھے بالکل گوارا نہ تھا کہ وہ میرے پہلو میں موجود رہے۔ میں چاہتی تھی کہ اس بار جب میں بچہ جنوں تو مصطفےٰ کا سایہ تک ہم دونوں پر نہ پڑے۔ میں ابھی ڈریسنگ روم میں تھی۔ مجھے درد

لگ گئے۔ میں تکلیف کے مارے چیخنے لگی۔ رنگ دار نرسوں نے میری چیخ پکار کو ہسٹیریا پر محمول کیا۔ وہاں کوئی ڈاکٹر نہ تھا۔ میں چیختی رہی۔ سب کی نظروں میں تماشا بن گئی۔ وہاں کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں اعصابی بریک ڈاؤن کا شکار ہوں۔ انہوں نے اوپرے انداز میں گھرک کر کہا۔ "یہ فضول ہائے وائے بند کرو۔ ورنہ تمہیں گھر چلتا کر دیں گے"۔

"ڈاکٹر کو بلاؤ۔ میرے بچہ ہونے والا ہے۔ میں مر جاؤں گی۔"

دردوں کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرا جسم اندر سے کٹا جا رہا ہو۔ میں چیختی رہی۔ میرے ساتھ بیٹھی ایک خاتون نے پوچھا کہ کیا یہ میرا پہلا بچہ ہے؟ یہ سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئی کہ میں چوتھے بچے کو جنم دینے والی ہوں۔

وضع حمل کی ان کرب ناک ساعتوں کے دوران مجھے اپنے خاندان کی ضرورت نہ رہی۔ میں نے مصطفےٰ کا خیال چھوڑ دیا۔ اپنے تمام دوستوں سے بے نیاز ہو گئی۔ میں نے اللہ سے رجوع کیا۔ رسول اللہؐ کا دامن تھام لیا۔ میں نے رسول اللہؐ کی صاحب زادی، بی بی فاطمہؓ اور ان کے شوہر، حضرت علیؓ کا سہارا چاہا۔ میں نے گڑگڑا کر ان سے کہا کہ آئیں اور میرے پاس رہیں اور مجھے اپنی پناہ میں لے لیں۔ میری دعا قبول ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی معجزے کا ظہور ہوا ہو۔ کمرے میں ہر طرف سکون چھا گیا۔ مجھے محسوس ہوا وہ میرے پاس ہیں۔ میرے لیے وہی میرا خاندان ہیں۔ اللہ نے انہیں بھیجا ہے۔ میں نے بلا شک وشبہ یہ محسوس کیا کہ حضرت علیؓ اور فاطمہ میرے پاس موجود ہیں۔ میرا پہلا بوٹا نیشنل ہیلتھ سروس کے لیبر روم میں پیدا ہوا۔ میں نے اس کا نام علی رکھا۔

جب ڈاکٹر آیا بچہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کو مطلع کر دیا جائے۔ میں نے کہا نہیں۔ مصطفےٰ دو گھنٹے بعد یوگا کی ورزشوں سے فارغ ہو کر آیا۔ نصیبہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ یہ دیکھ کر جھوم اٹھا کہ میں نے بیٹے اور وارث کو جنم دیا ہے میں حیران ہوئی کہ کس کا وارث کیسا وارث؟

صبیحہ نے میرے کیوبیکل میں خاصا وقت میرے ساتھ گزارا۔ میرا بھائی عاصم بھی میری خبر گیری کے لیے آیا۔ یہ دیکھ کر اسے صدمہ پہنچا کہ میں نیشنل ہیلتھ کلینک میں پڑی ہوں۔ اس نے مصطفےٰ سے کوئی لگی لپٹی نہ رکھی۔ "مجھے کراہت آ رہی ہے۔ یہ توقع نہ تھی کہ میری بہن کو آپ کے ہاتھوں اس طرح دکھ اٹھانا پڑے گا۔ وہ یہاں پر کیوں ہے؟ اگر آپ بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے شکار کھیلنے جا سکتے ہیں اور مہنگی مہنگی شرابیں خرید سکتے ہیں تو اپنی بیگم کے لیے کمرہ کیوں نہیں لے سکتے؟"

اس زچگی کے بعد مجھ میں جیسے جان پڑ گئی۔ میرا تجسس پھر سے بیدار ہو گیا۔ میں نے ارد گرد دیکھنا شروع کر دیا لوگوں کی باتیں کان لگا کر سننے لگی۔ میرے آس پاس عام

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

عورتیں تھیں۔ وہی عورتیں جو ہمیں سڑکوں پر یا ان کاؤنٹروں کے پیچھے نظر آتی ہیں جہاں عطر فروخت ہوتے ہیں۔ یا پھر وہ بڑے بڑے امیرانہ بوتیکوں میں کام کرتی ہیں اور "مادام کی ضرورتیں" پوری کرنے کے لیے بھی جاتی ہیں۔ یکایک وہ میری سہیلیاں بن گئیں۔ ہمارے درمیان رشتہ ہمارے ابھرے ہوئے پیٹوں کے حوالے سے قائم ہوا۔ جو جو ہم پر بیت چکی تھی اس کا موازانہ کیا گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانیاں سنائیں مجھے پتا چلا کہ بیری کی بسیار نوشی ایک مسئلہ بن چکی ہے۔ سڈ کا باس بڑا ہولناک ہے، نینسی کے پاس نیا فریج اور ڈافنے کے پاس نئی واشنگ مشین ہے اور یہ کہ بائر پر چیز والے پاجی کس طرح ٹروڈی کا رنگین ٹی وی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ کیوں کہ فرنیک اس کی قسطیں بروقت ادا نہ کر سکا تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے المیے میری نظروں میں گھومنے لگے۔ ان کی خوشیاں میری خوشیاں بن گئیں۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ معاشرے میں کس کی کیا حیثیت ہے۔

میں گھر لوٹ آئی میں مصطفےٰ سے کٹ چکی تھی۔ میں اپنی ذات میں مگن رہنے لگی۔ میری اولاد میرے لیے توانائی کا سرچشمہ بن گئی۔ میں مصطفےٰ اور اس کی بدمزاجی سے بساط بھر بچتی پھرتی۔ میرے لیے وہ مر چکا تھا۔ ہمارے تعلقات کا وہ دور ختم ہو گیا تھا جس میں میری ایک ایک حرکت، میرا اٹھنا بیٹھنا سب اس کے تابع تھا۔

ہم ہِل ہِل میں ایک خوبصورت مکان میں منتقل ہو گئے۔ مصطفےٰ نے کتے پالنے کی ٹھانی کہ یہ اس کا پرانا مشغلہ تھا۔ اب ہم معاشرے میں رو بہ ترقی تھے اور ان مرعوب کن لمبے چوڑے ناموں سے ہمارا اڑوس پڑوس اٹا پڑا تھا ہمارے لیے انہیں جیسے ٹھاٹ باٹ سے رہنا ضروری ہو گیا تھا۔ کتے رکھنے کے اس خبط نے ہمیں پورے انگلینڈ کا چکر لگوا دیا۔ مصطفےٰ نے آئرش وولف ہاؤنڈ خریدنے کے لیے سکاٹ لینڈ اور ویلز کا سفر کیا۔

باقی تمام باتوں کی طرح اس خبط کی تہ میں بھی ملکیت کی ہوس کارفرما تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے پاس بہت سے کتے ہوں۔ کتا کتنا ہی انوکھا ہو وہ جلد ہی اس سے بیزار ہو جاتا۔ اگر کسی کتے کی دم ٹیڑھی ہوتی تو وہ اس کے شجرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتا اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سوچتا۔ اگر کوئی کتا اس کا کہا نہ مانتا تو اس کا صبر جواب دے جاتا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ کتوں کے پچھلے مالک ان کی کس طرح دیکھ بھال کرتے تھے۔ یا انہیں چاق وچوبند رکھنے کے لیے دوڑانے ٹہلانے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ جب ان کتوں میں سے کوئی سست پڑ جاتا یا زخمی ہو جاتا تو وہ آر ایس پی سی اے (حیوانوں کے ساتھ بے رحمی کے انسداد کے لیے شاہی انجمن) والوں کو بلاتا اور کہتا کہ کتے کو لے جائیں۔ مصطفےٰ کے اس نئے شوق نے میری مت مار دی۔ ہمارے پاس صرف اتنی رقم

تھی کہ ہم بمشکل گزر بسر کر سکتے تھے اور وہ تھا کہ سب کچھ ان کتوں پر لٹائے جا رہا تھا۔ ان میں سے ہر کتا دو سو تین سو پاؤنڈ کا تھا۔ ان کی دیکھ بھال پر بھی بہت خرچ ہوتا تھا۔ گھر میں اوجھڑی کی بو بسی رہتی۔ مجھے جو فرصت ملتی وہ زیادہ تر ان کتوں کی نذر ہو جاتی۔ میں اکثر ان کے بارے میں فکر مند رہتی۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کتنا غیر محفوظ اور درماندہ سمجھتے ہیں۔

ہمارے پاس ایک گریٹ ڈین پلا تھا۔ میں اس کے کینل میں ہیٹر جلا چھوڑ دیتی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ سردی سے اکڑ کر مر جائے گا۔ مصطفےٰ ہیٹر کو بجھا دیتا۔ اس کے بعد وہ جا کے ایک پوری عمر کا رہوڈیشین رج بیک خرید لایا۔

علی کی پیدائش کے بعد میں جھپ سے زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ڈر ڈر کر نہیں جینا۔ جو غفلت مجھ پر طاری تھی میں اسے جھٹک کر پرے کر چکی تھی۔ اپنے پہلے بیٹے کو دودھ پلاتے وقت مجھے روحانی سکون کا احساس ہوتا جو تکلیف میں نے سہی تھی اس نے کسی نہ کسی طرح مجھے خدا سے قریب تر کر دیا تھا اور مکمل طمانیت کا احساس ہر دکھ پر غالب آ چکا تھا۔

میں اپنے ماضی، اپنی شادی کا تجزیہ کرنے بیٹھ گئی۔ میرے ساتھ کیا بیتی تھی؟ میں اتنی خوف زدہ کیوں رہتی تھی؟۔ جو بے عزتی اور تذلیل میرے حصے میں آتی تھی اس کے بارے میرا ردعمل کسی نارمل انسان جیسا کیوں نہیں تھا؟ میں سمجھ گئی کہ میرے شوہر نے مجھے ڈرا دھمکا کر میرے حوصلے اور جوش کو کچل دیا تھا۔ اس نے ہر بات کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس شخص کی وجہ سے اپنے دوستوں اور اپنے خاندان سے میرے مراسم شدید کشیدگی کا شکار ہو گئے۔ اس نے مجھے لے جا کر ایک بھول بھلیاں میں کھڑا کر دیا۔ مجھے اس سے باہر نکلنے کی ترکیب معلوم نہ تھی۔ میں الکسائی الکسائی اس بھول بھلیاں میں ماری ماری پھرتی رہی یہاں تک کہ میں نے اپنے مقدر سے سمجھوتا کر لیا۔ میں آپ ہی معما بن کر، چیستان بن کر رہ گئی۔ جب وہ کہتا کہ ہماری شادی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے تو اس کے پاس سب سے قوی دلیل یہ ہوتی کہ میں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں نے اتنا کچھ سہنے کے بجائے (اور کچھ میں ہی جانتی تھی کہ میں کیا کیا سہتی رہی تھی) اسے چھوڑ کیوں نہ دیا، اپنے مصائب کم کیوں نہ کر لیے۔ اس نے میرے تمام سہارے مجھ سے چھین لیے تھے اور میری طنابیں اس طرح کس دی تھیں کہ میں اس کے تجزیے سے، جہاں صرف اس کا بہیمانہ حکم چلتا تھا، کہیں جا ہی نہیں سکتی تھی۔ میں مصالحت پر اتر آئی تھی۔ اس نے مجھے ذہنی طور تھکا دیا تھا۔ مجھ پر تھکاوٹ اتنی غالب تھی کہ بات کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

وہ کبھی ایک انتہا کو چھو لیتا، کبھی دوسری کو۔ اس بنا پر اس کی حقیقی شخصیت کو فوکس میں لانا مشکل تھا۔ اس کی شخصیت کے یہ دونوں پہلو اتنے جان دار تھے کہ ان پر یقین لانا ہی پڑتا تھا۔ وہ یا تو غضب ناک روپ میں سامنے آتا یا شرمسار روپ میں۔ مجھے اس کے پہلے روپ سے ڈر لگتا اور دوسرے روپ پر ترس آتا۔ میرا رد عمل کبھی اتنا تیز رفتار ہوتا ہی نہ تھا کہ اس کی شخصیت کی سیمابی تبدیلیوں کا ساتھ دے سکتا۔ کبھی وہ مجھ سے ایسا سلوک کرتا جیسے میں کوئی نافرمان بچی ہوں اور اس کے بعد مجھے ماں کا روپ عطا کر دیتا جس کے پاس بیٹے کی بے راہ روی کو معاف کر دینے کے سوا چارہ نہ ہو۔ اس نے بارہا مجھ سے استدعا کی کہ میں اس کے ساتھ اس طرح پیش آؤں جیسے وہ میرا بیٹا ہو۔ اس کی بے پناہ اداسی میرے دل پر اثر کیے بغیر نہ رہتی اور جواباً میں وہی کرتی جو وہ چاہتا۔

میں اس کے مرض کی تشخیص کر چکی تھی اب میں نے اس کی دوا تلاش کرنے کی ٹھانی۔ میں نے بات تقدیر پر نہیں چھوڑی بلکہ سرگرمی سے ایک طریق علاج پر عمل در آمد کرنے لگی۔ وہ میرا مریض بن گیا اور میں اس کی نفسیاتی معالج۔ مجھے یقین تھا کہ جس طرح بچے سے دودھ چھڑایا جاتا ہے۔ اس طرح میں اس سے بری عادتیں چھڑا دوں گی۔ مسئلہ بہت بڑا اور قابو میں نہ آنے والا سہی لیکن ایک تو مجھ پر اصلاح کا جوش سوار تھا اور دوسرے میری اپنی انا کا سوال تھا۔ مسئلے کو دیکھ کر میدان چھوڑ کر بھاگ جانا اور شکست قبول کر لینا بھلا میرے جوش اور انا کو کب گوارا ہو سکتا تھا۔

بچوں کے ساتھ اس کا برتاؤ دیکھ کر امید کی کچھ جھلک نظر آنے لگی تھی۔ دیوانگی کے ان دوروں کا اعادہ نہ ہوا تھا جن کا نصیبہ کو ابتدا میں سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب وہ لحاظ رکھنے اور پیار کرنے والا باپ بن گیا تھا۔ پہلے سے زیادہ متوازن، پہلے سے زیادہ بردبار۔ میں نے اسی تنکے کا سہارا لیا۔ شاید یہ وہی تنکا ہو گا جس کے لادے جانے سے اونٹ کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔

میں جانتی تھی کہ میری اپنی شخصیت میں تبدیلی آنی ضروری ہے۔ میری پچھلی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ میں اس کی باقی بیویوں سے کسی طرح مختلف ثابت نہ ہوئی تھی۔ میں اطاعت گزار اور ناتواں بن کر رہ گئی تھی۔ دیکھنے کی بات تو آخر یہی تھی کہ وہ اپنی ہر پچھلی بیوی کو دھتا بتا چکا تھا۔ میں نے طے کیا کہ میں اپنی صواب دید کے مطابق اس سے ٹکر لوں گی۔ میں روز روز کی اس جنونانہ جھک جھک کو ترک کر کے اس سے کھلم کھلا جنگ کرنا چاہتی تھی۔ سر تسلیم خم کیے رکھنا مسئلے کا حل نہیں تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ میں اتنی زیادہ اس کے زیر اثر نہ رہوں۔ مجھے کوئی ایسی چال چلنی تھی کہ اگلی بار لڑائی اس کے علاقے میں لڑی جائے۔

یہ دیکھ کر میں پھولی نہ سما رہی تھی کہ میرا ذہن پھر سے چونچال اور فعال ہو گیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ جمود کا جو گرد و غبار میرے ارد گرد تھا وہ اڑ کر دور ہونے لگا ہے۔ یہ خدا کا نیا کرم میرے حال پر تھا۔ لگتا تھا کہ علی اس خوش گوار اور حیرت ناک تبدیلی کا نقیب بن کر آیا ہے۔ اللہ نے میری اضطراب آمیز آہ وزاری سن لی تھی۔ اس نے میری خاطر ایک معجزہ کر دکھایا میں دوبارہ جی اٹھی۔

ہم مل جل میں اپنی کاٹیج کے کچن میں تھے۔ مصطفےٰ چاہتا تھا کہ ہم کہیں باہر چلیں۔ میں اس پر راضی نہ تھی۔ میں ابھی علی کو دودھ پلا رہی تھی اور اسے لے کر ٹھنڈ میں باہر نکلنا نہ چاہتی تھی۔ مصطفےٰ حسب سابق اڑ گیا کہ اس کی بات مانی جائے۔ میں نے مزاحمت کی۔ اس نے مجھے میرے لمبے لمبے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور میرا رخ اپنی طرف گھماتے ہوئے اپنی پسندیدہ دھمکی دہرائی۔ "تمہاری ساری ہڈیاں پسلیاں توڑ دوں گا۔" میں سٹوو کے پاس کھڑی بچوں کے لیے کھانا گرم کر رہی تھی۔ میں نے کھانے سے بھرا برتن اٹھایا جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی اور اس پر دے مارا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ نہ صرف اس کے اوسان خطا ہو گئے بلکہ وہ بری طرح جھلس بھی گیا۔ جب صدمے کا اثر کچھ کم ہوا تو اس نے مجھ سے بدلہ لینے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ "اگر اب کے تم نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا تو میں چاقو اٹھا کے تمہیں جان سے مار دوں گی۔" میرے لہجے میں زور بھی تھا اور اعتماد بھی۔ دل رکھنے کی خاطر جھک جانے کے دن گزر چکے تھے۔ میں نے جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اسے جلے ہوؤں پر لگانے کے لیے برنول دی۔ مرہم لگاتے ہوئے وہ بڑبڑا کر دھمکیاں دیتا رہا لیکن خوف زدہ اور شکست خوردہ نظر آ رہا تھا۔ "مصطفےٰ میں نے بہت برداشت کر لیا۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں برداشت کیے جاؤں۔ میرا تمہارا تعلق اختیاری ہے۔ ہم نے اپنی خوشی سے یہ تعلق قائم کیا ہے۔ میں تمہاری بہن یا ماں نہیں۔ تمہاری بیوی ہوں۔ میرا تمہارا کوئی خونی رشتہ نہیں۔ ہم نے مل کر زندگی گزارنے کا عہد کیا تھا۔ جب میرا جی چاہے گا میں اس عہد نامے کو جا کر پھینک دوں گی۔ کان کھول کر سن لو۔ میری عزت کرنا سیکھو اور شکر کرو کہ میں تمہارے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ مجھے اس بیگار کیمپ میں رہنے کی قطعی طور پر کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنے طور طریق کی اصلاح کرو اور ہماری زندگیوں کو اس قابل بناؤ کہ زندگی کا کچھ مزہ بھی آئے ورنہ میں چلی۔"

وہ سنتا رہا۔ اس کے بعد پرانے جانے پہچانے مصطفےٰ نے دوبارہ سر اٹھایا۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی بالادستی کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میرے برق رفتار حملہ کے اثرات زائل ہونے لگے تھے۔ "اگر تم نے کبھی مجھے چھوڑ کر جانے کا سوچا تو میں تمہیں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بخشوں گا نہیں۔ میں تمہارے چہرے پر تیزاب پھینک دوں گا۔ تمہیں اپاہج کر دوں گا اور اپنے بچے تم سے چھین کر لے جاؤں گا۔ میں تمہیں تمہاری خوبصورتی سے یوں محروم کر سکتا ہوں۔" اس نے گھمنڈی انداز میں چٹکی بجائی۔ میں ڈر گئی۔ یہ کوئی خالی خولی دھمکی نہ تھی۔ لیکن میں ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹی۔ میں اس کے ساتھ باہر نہ جانے کے فیصلے پر قائم رہی۔

اس رات وہ ڈنر کھا کے لوٹا۔ اس نے محسوس کیا کہ اندھیرا چھا جانے کے بعد میں کمزور پڑ چکی ہوں۔ وہ اندھیرے میں ہمیشہ مجھ پر غالب آ جاتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ رات اس کی حلیف ہے۔ ادھر سورج ڈوبا، ادھر میں نے خود کو زیادہ غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ ایسا نفسیاتی مسئلہ تھا جس سے میں ابھی تک نمٹ نہ سکی تھی۔

اس رات اس نے مجھے بڑی بےدردی سے مارا۔ میں نے بھی جواباً اس کی ٹھکائی کی۔ میں اس کے گھونسوں لاتوں کے سامنے نہ تو دبکی نہ سمٹ کر گٹھری بنی۔ میں اس تابڑ توڑ دھنائی کے سامنے ڈٹی رہی اور اپنی پوری طاقت سے جوابی حملہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا قہر شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ وہ غصے سے اندھا ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے اتنا مارا کہ میں ہوش میں نہ رہی۔ تب اس نے ہاتھ روکا۔ وہ مجھے تقریباً موت کے کنارے پہنچا چکا تھا۔ چند منٹ اور مارتا تو شاید میرے قتل کی نوبت آ جاتی۔ وہ رک گیا۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے کوس رہا تھا۔ میری مزاحمت سے خوف کھا کر وہ میرے پاس سے کھسک گیا۔ کھڑا دیکھتا رہا کہ میں کس طرح گرتی پڑتی بستر کی طرف جا رہی ہوں۔ میں نے جس نظر سے اسے دیکھا اس میں صرف تحقیر ہی تحقیر تھی۔ میں رو تک نہ رہی تھی۔ جتنی بھی تمکنت مجھ سے بن پڑی میں اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی بستر میں جا لیٹی، کروٹ لی اور سو گئی۔ میرا یہ سارا رویہ میرے اس کردار کے بالکل الٹ تھا جس کا وہ عادی تھا۔ اس نے میری طرف رخ نہ کیا۔

اس رات کے بعد سے ہماری دھینگا مشتی کا طرز بدل گیا۔ میں اس کی مارپیٹ سے نہ صرف خود کو بچاتی بلکہ اسے مارتی بھی جاتی۔ کسی عورت کو آج تک مصطفےٰ کھر کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی جرات نہ ہوئی تھی۔ میں اسے مارتی، کھسوٹتی اور بال کھینچ لیتی۔ اپنا پورا زور لگا کر اسے لاتیں مارتی اور دھکے دیتی۔ مصطفےٰ کو پتہ تھا کہ صورت حال جتنے ظلم و ستم کی متقاضی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ ظلم و ستم ڈھاتا رہا تھا اور اسی وجہ سے اس کی جارحانہ چالیں بے اثر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ اب یقین سے نہ کہہ سکتا تھا کہ میرا ردعمل کیا ہو گا۔ میں دیکھ سکتی تھا کہ وہ اپنے ذہن میں مجھے دہشت زدہ کرنے کے نئے منصوبوں پر کام کر رہا ہے۔

میری بے اعتنائی اس کے حق میں عذاب بن گئی۔ میں نہ تو منہ پھلا کر بیٹھی رہتی۔ نہ یہ چاہتی کہ وہ مجھ سے معافی مانگے۔ میں مکمل طور پر خود کو الگ تھلگ کر چکی تھی۔ میری دل جمعی سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے دیکھا کہ میں نے رونا دھونا چھوڑ دیا تھا۔ علی کی ولادت کے بعد دکھ درد کے تمام سوتے خشک ہو کر رہ گئے تھے۔ مصطفےٰ نے مجھے مارنا پیٹنا چھوڑ دیا۔ مجھ میں جو نئی نئی اکڑ آ گئی تھی اس سے جھنجلا کر وہ مجھے مارنے کے لیے اٹھتا۔ میں اونچی آواز میں کہتی۔ "بیوقوف مت بنو۔ بیٹھ جاؤ۔" اور وہ بیٹھ جاتا۔ رفتہ رفتہ ان لیوروں تک رسائی ہو رہی تھی جن کی مدد سے کسی دوسرے پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے اور جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ ٹھکائی کی تمہید کے طور پر وہ مجھ سے کھڑے ہو جانے کو کہتا۔ میں ڈھیٹ بنی، بے پروا سی، اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ ہاتھ سینے پر باندھے۔ "احمق نہ بنو، مصطفےٰ۔ بڑی عمر کا ہونے کا ثبوت دو۔ مجھے مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھ سے کسی بالغ آدمی کی طرح بات کرو۔ میں تمہارا مفہوم بہتر طور پر سمجھ سکوں گی۔"

وہ میرے سامنے سے ٹل جاتا۔ میرے غالب آجانے والے طنطنے سے ٹکرا کر اسے پیچھے ہٹنا پڑتا۔ میں ماں کا روپ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ لیکن اس معاف کر دینے والی، رقت آمیز اور جذباتیت میں ڈوبی ماں کا روپ نہیں جسے ہمارے فکشن اور سنیما نے مقبولِ عوام کر دیا ہے۔ میں کٹھور اور سخت گیر ماں تھی۔ کالی ماتا۔ ماں دیوی۔ تباہی کی دیوی، میں مصطفےٰ کو اپنے نئے خدوخال دکھا رہی تھی۔ اور اس کا جوابی رویہ اس لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے لونڈے کا سا تھا جسے کسی صابر ماں نے، اس کی حرکتوں سے بالکل زچ ہو کر، جھاڑ تو پلائی ہو مگر اوپر سے۔

میں اس کے سامنے جھجکے بغیر ڈٹی رہی تو اس کی گالیاں بکتے رہنے کی عادت بے جان ہو کر رہ گئی۔ ماضی میں اس کی ہر گالی ٹھیک نشانے پر لگتی تھی اور اس کا بڑی دیر تک مجھ پر اثر رہتا تھا۔ اب میں اس کی بدزبانی کو محض ایک پاگل آدمی کا ہذیان اور چنگھم دھاڑ سمجھ کر خاطر میں نہ لاتی۔ جب اس کی واہی تباہی ختم ہو جاتی تو میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی۔ "تم کوئی خاص اچھے تو نہیں لگ رہے تھے۔ ایسی زبان استعمال کرتے ہوئے تم بہت واہیات معلوم ہوتے ہو۔ گفتگو کا یہ انداز تمہارے شایانِ شان نہیں۔ اس سے تمہارے خاندانی پس منظر پر حرف آتا ہے۔"

اس کی طرف سے برسنے والے زبانی تیر تکوں گولی چھروں سے بالکل بے نیاز ہو کر میں اپنے کام میں مشغول رہتی۔ یہ دیکھ کر وہ جھلا اٹھتا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ میری بے اعتنائی کا کیا توڑ کرے۔ اس کی باتیں سننے میں کسی کو دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس پر اور

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بھی زیادہ آزردگی چھا گئی۔ ماضی میں میرے آنسوؤں، میرے دلائل اور میری منت سماجت سے اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کی بے محل مردانگی کے زبردست کارناموں کو خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہو۔ میرے سکوت نے اسے بربارد کر ڈالا۔

وہ اپنی فاضل توانائی کو کہیں نہ کہیں صرف کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ جس بورے پر وہ مکے بازی کی مشق کیا کرتا تھا وہ انٹ کر اس کے منہ پر آ لگا تھا۔ جسے تختۂ مشق بنایا جاتا تھا وہ اس کے ہاتھ سے کوڑا چھین چکی تھی۔ اپنے اندر بھری ہوئی محرومی کو دور کرنے کے لیے وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ چناں چہ یہی وہ دن تھے جب اسے کتے پالنے کا شوق چرایا۔

گریٹ ڈین پلے کو دیوقامت رہوڈیشین رج بیک کے ساتھ کھیلنے پر مجبور کیا گیا۔ پلے کی ہڈیاں ابھی نرم تھیں۔ وہ اتنے بڑے کتے کا ساتھ نہ دے سکا۔ اس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو گئیں۔ مصطفےٰ نے اسے بھی آر ایس پی سی اے کے سپرد کر دیا۔

اس کی جگہ ایک بل ٹیریر نے سنبھالی۔ وہ کوئی معمولی بل ٹیریر نہ تھا۔ عالی نسب بھی تھا اور زبردست چیمپین بھی۔ اسے کوئی خطاب بھی مل چکا تھا۔ جب اس کے نرالے پن سے جی بھر گیا تو اس کی بھی چھٹی ہو گئی۔ اس کے بعد مصطفےٰ چھ آئرش وولف ہاؤنڈ خرید لایا۔ ان کتوں کو حاصل کرنے کے لیے مصطفےٰ اور اس کی بیگم صاحبہ کو جا کے انٹرویو دینا پڑا۔ میں نے پہلے اپنی عالی نسبی کا ثبوت فراہم کیا۔ تب کہیں کتوں کے مالک نوازش خصوصی فرما کر کتے ہمارے ہاتھ بیچنے پر آمادہ ہوئے۔ میرے زرق برق ریشمی کپڑوں کا ان پر کوئی رعب نہ پڑ سکا۔ کسی طرف سے لگتا ہی نہ تھا۔ کہ مجھے کتوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ مزید یہ کہ مجھے کوئی غیر ضروری ذمے داری قبول کرنے کی فرصت بھی نہ تھی۔ مجھے کتوں سے ڈر لگتا اور میں ان سے پرے پرے رہتی کیونکہ وہ ناپاک تھے اور میں ٹھہری نمازی۔ چند ایک کتے مصطفےٰ میری وجہ سے خریدنے میں ناکام رہا کیونکہ میں ضرورت سے زیادہ "میم صاحب" نظر آ رہی تھی۔ جو مالک زیادہ سادہ لوح واقع ہوئے تھے میں انہیں خبردار کرنا چاہتی تھی کہ وہ اپنے کتے ہمیں نہ دیں۔

مصطفےٰ بہت جلد کتوں سے اکتا جاتا اور ان کی دیکھ بھال کی تمام ذمے داری میرے کندھوں پر ڈال دیتا۔ وہ ان کے ساتھ اس طرح پیش آتا جیسے وہ دیسی کتے ہوں۔ وہ انہیں باہر ٹھنڈے میں رہنے دیتا اور ان کے ساتھ محبت یا شفقت کا سلوک کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ وہ ان کتوں کو صرف اپنے ارد گرد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان میں شکاری کتوں کے شوقین حضرات کی خاص الخاص ٹولی کو اس پر رشک آ رہا ہو گا۔ ممتاز بھٹو کے پاس تقریباً ساٹھ شکاری کتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مصطفےٰ اپنے کتوں کو پاکستان بھجوانے کی سوچنے لگا۔ اس کا یہ خیال مجھے خارج ازامکان نظر آیا۔ لیکن جو خیالی پلاؤ وہ پکاتا رہتا تھا میں اس کھنڈت نہ ڈالنا چاہتی تھی۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

یہ بھی تو تھا کہ کتوں کی وجہ سے اس کی توجہ بٹ گئی تھی۔ اب اس کے ذہن پر صرف میں سوار نہ رہتی تھی۔

اس کا طرز عمل ہندوستان میں مقیم کسی ایسے انگریز جیسا تھا جو دھوپ سے بچاؤ کا ہیٹ پہنے بغیر جون کی جھلستی سہ پہر میں گھر سے نکل پڑا ہو۔ وہ اپنے ویلنگٹن بوٹ ڈاٹ کر کتوں کو ٹہلانے لے جاتا۔ دائی عائشہ کو بھی تین کتے گھمانے پھرانے لے جانا پڑتا۔ وہ شلوار کے پائنچے گم بوٹوں میں اڑسے چل دیتی۔ کتے بیچاری کو گھسیٹے لیے جاتے یہاں تک کہ ایسا لگتا جیسے وہ اسے ٹہلانے لے جا رہے ہوں۔ وہ بہت ناراض تھی کہ ناپاک جانور کو ہاتھ لگانا پڑتا ہے اور اس دن کو کوستی اور جھینکتی رہتی جب اسے زندگی میں پہلی بار کتوں سے واسطہ پڑا۔ ظاہر ہے، وہ یہ خیال رکھتی تھی کہ اس کا واویلا مصطفےٰ کے کان میں نہ پڑے۔ میں اپنے بچوں میں منہمک تھی۔ ہم سب مل کر کھیلتے اور ٹی وی دیکھتے۔ میں نے اپنا خیال رکھنا شروع کر دیا۔ بہتر لباس پہننے لگی اور پھر سے وہی پرانی تہمینہ بن گئی۔ یہ وہ دن تھے جب ہمیں نسبتاً زیادہ آرام نصیب تھا۔

ہم نے ایک بار پھر گھر بدلا۔ اب کے ہم برونڈز بیری پارک میں ایک بڑے سارے مکان میں منتقل ہوئے۔ مجھ میں کچھ کچھ خصلت کسی فوجی کی بیوی کی پیدا ہو گئی تھی۔ میں سامان باندھنے اور کھولنے میں ماہر ہو چکی تھی۔ میرا مزاج سیلانی نہیں۔ اس لیے جو کچھ میں نے سیکھا طبیعت پر جبر کر کے سیکھا۔ لیکن یہ سارا کام کرتے ہوئے میں نہ تو کبھی بڑبڑائی نہ شاکی ہوئی۔

نیا مکان بہت ہی طویل و عریض تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی عرب شیخ کے الف لیلوی خواب کو کھلی چھٹی مل گئی ہو۔ یہ مکان ہمیں سیٹھ عابد نے دیا تھا۔ اس میں چھ سونے کے کمرے اور چھ غسل خانے تھے جو انگلستان کے حساب سے عیش و آرام کی انتہا تھی۔ مکان کی وسعت مجھے اچھی لگی۔ وہاں نہ تو یہ احساس ہوتا تھا کہ ہم ڈربوں میں بند ہیں۔ نہ یہ کہ ایک دوسرے کے سر پر سوار ہیں۔ ہم وہاں اس طرح رہ سکتے تھے کہ ایک دوسرے کا ساتھ بھی ہے اور سب اپنی اپنی جگہ خوش بھی ہیں۔ ہمارے بیشتر مہمان جا چکے تھے۔ بلال بھی گھر پر نہ رہتا تھا اب اس نے اپنے دوستوں کے پاس ڈیرا لگایا ہوا تھا۔ ہم نے طے کیا کہ پاکستان سے اپنے باورچی کو بلا لیا جائے۔

برونڈز بیری پارک میں ہم لوگوں کو خاصا مدعو کرتے رہے۔ ہم نے بڑی اللے تللے والی ضیافتوں کا اہتمام کیا جن کے لیے ہمیں پرتکلف لباس پہننے پڑتے اور پروٹوکول کو ملحوظ رکھنا ہوتا۔ میں چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے مہمانوں میں گھوم پھر کر متواضع میزبان خاتون کا کردار بھرپور انداز میں ادا کرتی۔ ہمارے مہمانوں کی فہرست میں

پیپلز پارٹی کے اہل دانش اور اہل تابش کے نام، جنہیں بڑی سوجھ بوجھ سے چنا جاتا، جابجا نظر آتے۔ ہماری دعوتوں میں شو بزنس کی شہرہ آفاق شخصیتیں بھی موجود ہوتیں اور سیاسی لحاظ سے بھاری بھر کم افراد بھی۔

مصطفے نے میری بدلی ہوئی شخصیت سے سمجھوتا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ جس طرح وہ میری ٹھکائی کرتا ہے اسی طرح میں بھی اس سے بدلہ لیتی ہوں۔ لہذا اسے اپنے تشدد میں اضافہ کرنا ہو گا۔ یہ بہت خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ اس کا تشدد پہلے ہی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مزید درندگی کا ثبوت دیا گیا تو ممکن ہے میری موت واقع ہو جائے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ جو موڈ مجھ پر اب طاری ہے اس کے زیر اثر مجھے اس کے بھیمانہ رویے کو بے نقاب کرنے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔ اس طرح کے انکشاف سے اس کے سیاسی کیریر کو بہت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر کوئی بیوی خود ہی دنیا کو اپنی چوٹیں اور نیل دکھانے پر اتر آئے تو اخباروں کے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ یہ خطرہ مول لینے کو وہ تیار نہ تھا۔ وہ بے بس ہو چکا تھا۔

کتے اچانک غائب ہو گئے۔ مصطفے نے ان میں دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ اب اس نے کنیریاں اور فنچیں جمع کرنی شروع کیں۔ دیکھتے دیکھتے اس قسم کی سیکڑوں چڑیاں اکٹھی ہو گئیں۔ جن پنجروں میں یہ چڑیاں ہمارے پاس آئیں وہ بہت بد شکل تھے۔ میں نے فی الفور ان کے بجائے پیتل کے آرائشی پنجرے منگائے۔ چڑیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ ان کو رکھنے کے لیے کوئی نئی جگہ ڈھونڈنی پڑی۔ مصطفے نے کھانے کے کمرے کو چڑیا خانے میں بدل دیا۔ پنجروں کے مقابلے میں انہیں بہت کھلی جگہ ملی تو چڑیاں خوشی خوشی ادھر اُدھر اڑنے لگیں۔ قالین، فرش، کھانے کی میز، غرض کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں ان کی بیٹھیں نظر نہ آتی ہوں۔ شوق وہ پالتا تھا اور ہر بار گھر کی صفائی میرے حصے میں آتی تھی۔ چوں کہ کھانے کا کمرا دعوتوں کے لیے مخصوص تھا اس لیے چڑیوں کو دوبارہ ان کے پنجروں میں پہنچانا پڑتا۔ یہ روز کا معمول بن گیا۔ مصطفے اور دائی عائشہ چکر پر چکر کاٹتی چڑیوں کو پکڑنے کے لیے گھنٹوں لگے رہتے۔ میں حیران پریشان ہو کر انہیں دیکھا کرتی۔ اگلی صبح پرندوں کو دوبارہ کھانے کے کمرے میں لا کر چھوڑ دیا جاتا جو ان کا بڑا پنجرہ بن چکا تھا۔ مجھے مصطفے کے دم خم پر اور اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ اسے اپنا قیمتی وقت یوں ضائع کرنے میں کتنا مزہ آتا ہے۔ ہم نے برونڈز بیری پارک میں آٹھ مہینے ان چڑیوں کو پکڑنے اور کھانے کے کمرے میں لا چھوڑنے میں گزارے۔ آخر ایک دن مصطفے نے ان سب کو آزاد کر دیا۔ اور بڑے شکاری پرندے انہیں چٹ کر گئے۔

یکایک ہمیرے پاس ڈھیر ساری دولت آ گئی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ

رقم آئی کہاں سے ہے۔ ہم نے کوئی ایسا مکان ڈھونڈنا شروع کیا جسے خریدا جا سکے۔ مکان میری مرضی سے خریدا جانا تھا۔ مصطفے گھریلو امور کے قلم دان سے میرے حق میں دست بردار ہو چکا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ میرا ذوق اچھا ہے۔ اس کی واحد شرط یہ تھی کہ مکان دیہی علاقے میں ہونا چاہیے۔ ہمیں مغربی سیکس میں ہیزل میر میں ایک خوبصورت مکان ملا۔ میں دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو گئی۔ ساتھ میں گیارہ ایکڑ، جن کی ہریاول اتنی بھڑکیلی کہ کیا کہوں۔

مصطفے نے وہ گھر مشترکہ ملکیت کی بنیاد پر خریدا۔ اس وقت اس نے مجھ سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں تم اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تمہیں کبھی چھوڑوں گا نہیں۔ تمہارے سوا میں کسی عورت کو بیوی تسلیم نہیں کر سکتا۔" بالاخر مجھے تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ یوں لگا جیسے ہم کسی ڈراؤنے خواب سے نکل کر سہانے خواب میں قدم رکھ چکے ہوں۔ یہ پہلا گھر تھا جسے میں اپنا کہہ سکتی تھی۔ مصطفے نے کبھی کوئی جاگیر اپنی کسی بیوی کے نام نہیں کی تھی۔ وہ دو ٹوک انداز میں کہتا تھا کہ اسے کبھی یقین ہی نہ ہوتا کہ ان کے ساتھ شادی کتنی دیر چلے گی۔ جب ہم ہیزل میر منتقل ہوئے تو مصطفے نے عہد کیا کہ وہ خود کو بہتر شوہر ثابت کر کے دکھائے گا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ آئندہ کبھی نہ تو مجھے مارے گا۔ نہ گالیاں دے گا۔

وہ جب آپے سے باہر ہوتا تو مجھے گالیاں دینے پر اتر آتا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ جسمانی تشدد سے تو باز آ سکتا ہے لیکن منہ کو لگام دینا اس کے بس میں نہیں۔ جو چوٹیں روح کو لگتی ہیں، جو نیل روح پر پڑتے ہیں انہیں کون دکھا سکتا ہے۔ اب اس کے تشدد کا نشانہ دائی عائشہ بننے لگی جو اس کے نزدیک زرخرید باندی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ کس منہ سے مزاحمت کرتی۔ اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ گھونسوں پر گھونسے کھاتی رہے۔ مجھے اس پر رحم آتا اور میں اسے بچانے کی کوشش کرتی۔ میں جانتی تھا کہ مصطفے کی نظر میں وہ تہمینہ کی عوض ہے۔ اپنے اندر بھرے ہوئے مایوسانہ غصے کو اس نے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی پر تو نکالنا تھا۔

مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اندرونی، ڈیزائن کے لیے خداداد صلاحیت کی مالک ہوں۔ میں نے تمام کھڑکیوں کو اس طرح اب وہ لان، جو کہیں سے ذرا سے اونچے اور کہیں سے ذرا سے نیچے تھے، چوکھٹوں میں سما گئے۔ فطرت آرٹ کی نقل کرنے لگی۔ ہر کمرے سے ہمیں خوش نما منظر دکھائی دیتا۔ گھر کو ڈیزائن اس انداز سے کیا گیا کہ آپ کو یہ محسوس ہوتا جیسے کسی بنے سنورے باغ میں بیٹھے ہوں۔ اپنی تخلیقی استعداد کو بروئے کار لانے کا یہ زبردست موقع تھا۔ میں نے گھر کی آرائش وزیبائش پر خاصا وقت صرف کیا، یہاں تک کہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

وہ کمالِ فن کا نمونہ بن گیا۔ منتقل ہونے کے بعد پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ مرغیوں کے لیے ڈربا بنایا، ڈربا بھونڈا تھا۔ ضروری معلوم ہوا کہ وہ لان، ندی اور خود مکان کے سامنے گردوپیش میں اوپرا نہ دکھائی دے۔ چنانچہ میں نے اسے پہاڑی پر ایک درخت کی اوٹ میں بنوایا تاکہ ہمیں نظر نہ آیا کرے۔ بچے صبح سویرے پہاڑی پر چڑھتے اور انڈے اکٹھے کرتے۔ انہیں فطرت کے ساتھ صحیح معنی میں تھوڑی بہت میل جول کا پہلی بار موقع ملا تھا۔ اب انڈے ٹیٹرا پیک میں نہ آتے تھے۔ انڈے دینا مرغیوں کا کام تھا۔

تالاب میں ہم نے کینیڈا کے ہنس پالے۔ ہر شام وہ مٹکتے ہوئے ہمارے اگلے دروازے تک آ کر اس وقت تک ہونق ہونق شور مچاتے رہتے جب تک انہیں کچھ کھانے کو نہ دیا جاتا۔ ان کی مدد سے گھڑیاں ملائی جا سکتی تھیں۔ ہر صبح دس بجے وہ صحت بنانے کے لیے ہوا خوری کرنے نکلتے۔ تالاب سے باہر آ کر مٹکتے مٹکاتے پہاڑی پر چڑھتے۔ اور وہاں میٹھی دھوپ سینکتے رہتے۔ گھنٹے بھر بعد سب اٹھ کھڑے ہوتے اور پہاڑی سے اتر کر تالاب میں آ جاتے۔ شام کو وہ قطار باندھ کر چلتے ہوئے مکان کے اگلے لان میں آتے اور تھوڑی دیر وہاں بیٹھتے۔ پھر وہ اٹھ کھڑے ہوتے اور جب تک انہیں راتب نہ دیا جاتا اس وقت تک لان میں بطخا چال چلتے اِدھر سے اُدھر گھومتے رہتے۔

اس دیہی ماحول کے سکھ چین میں خلل ڈالنے کے لیے دو کتے بھی ہمارے ہاں آ موجود ہوئے۔ برونو نامی ایک لیبرا ڈور اور ایک انگلش سپر نگر ٹوبی۔ میں نے محسوس کیا کہ کتے محبت کے بھوکے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح مصطفےٰ ان سے کھچا کھچا رہا۔ نمازی ہونے کے باوجود میں کتوں کو تھپکنے اور چمکارنے بغیر نہ رہ سکی۔ انہیں گیرج میں جگہ ملی تھی۔ میں اس بارے میں فکر مند رہتی کہ گیرج میں ان پر جانے کیا گزر رہی ہو گی۔ کبھی کبھار آدھی رات گئے ایک پرانا فلوکاتی (ہاتھ کا بنا ہوا یونانی کمبل) اٹھا کر نکل پڑتی۔ میرا خیال تھا کہ وہ انہیں گرم رکھ سکے گا۔ بالآخر اپنی بے خوابی کا علاج کرنے کی غرض سے میں نے ان کے لیے ایک کینل بنوا دیا۔

برونو کا ایک پلا تھا۔ میں اسے "ڈھبو" کہتی کیوں کہ وہ یوں لگتا جیسے آس پاس کے ماحول پر کوئی دھبا پڑا ہوا ہو۔ میں اسے اینٹرنس ہال میں ایک پٹاری میں رکھتی۔ یہ ننھا سا جانور جاگیر پر اِدھر اُدھر گھومتا رہتا۔ ایک روز بھٹک کر وہ سڑک پر جا نکلا۔ وہاں ایک کار نے اسے ٹکر مار دی اور وہ لنگڑاتا ہوا گھر لوٹا۔ مصطفےٰ چاہتا تھا کہ اس کا قصہ پاک کر دیا جائے۔ میں نے مصطفےٰ کی تجویز ویٹو کر دی۔ ہم اسے جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کے بعد ضروری دیکھ بھال میں کرتی رہی۔

مصطفےٰ کو ایسے کتے سے کوئی دلچسپی نہ تھی جس میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو۔ وہ چاہتا

تھا کہ اس کے پالتو جانور ہر لحاظ سے بے عیب ہوں۔ اس نے بیچارے پلے سے بے رخی برتی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اسے کسی اور کے حوالے کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ جب ننھا ڈھبو اپنے نئے مالک کے ساتھ کار میں رخصت ہوا تو ہم سب نے بچشم نم اسے الوداع کہا۔

مصطفےٰ جب بھی دیکھتا کہ میں کتوں یا پرندوں کے بارے میں فکر مند ہو رہی ہوں تو اس کے چہرے پر حیرانی چھا جاتی۔ اس نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ اسے کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آیا تھا کہ جانور بھی کسی طرح کے رحم دلانہ سلوک کے مستحق ہیں۔ اس کی نظر میں کتے تو خالصتاً ایسی مخلوق تھے جس سے صرف کام لیا جاتا ہے۔ اور ان کا فرض بس اتنا تھا کہ مالک کا حکم پوری وفا داری سے بجا لایا کریں۔

اس کے بعد اس نے مجھے ایک واقعہ سنایا جسے یاد کر کے میرے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مصطفےٰ کی جوانی کے دن تھے۔ بظاہر وہ تیتر کا شکار کھیلنے نکلا تھا۔ شکار اٹھا کر لانے والے ایک کتے کو بھیجا گیا کہ وہ ایک مرے ہوئے پرندے کو اٹھا لائے اور اپنے آقا کے قدموں میں ڈال دے۔ اس بار کتے کے دل میں آئی کہ کچھ کھلنڈرا پن، تھوڑی سی دل لگی کرنی چاہیے۔ وہ مردہ پرندے کو جبڑوں میں دبا کر چمپت ہو گیا۔ مصطفےٰ غصے سے کانپنے لگا۔ اس نے اپنے گرگوں کو نافرمان کتے کے تعاقب میں روانہ کیا۔ "اسے ڈھونڈو اور پکڑ کر گاؤں لے آؤ۔" وہ دھول اڑاتا ہوا کار میں رخصت ہوا۔ لگتا تھا جیسے اس کا سارا غصہ دائیں پاؤں میں سما گیا ہے جس سے وہ ایکسلیٹر کو، زور زور دبا کر، سزا دے رہا ہے۔

گرگوں نے کتے کو ڈھونڈ نکالا اور کچے راستوں پر گھسیٹتے ہوئے گاؤں لے آئے۔ لمبے تعاقب کے بعد کتا پیاس کے مارے بے حال تھا۔ زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ منہ کے گرد سفید جھاگ کی جھالر تنی تھی اور لعاب کے چند قطرے زبان سے پھسل کر نیچے گر رہے تھے۔ اس پر خوف طاری تھا۔ لگتا تھا کہ اسے پتہ چل گیا ہے کہ کیا ہولناک عذاب اس کا منتظر ہے۔ مصطفےٰ باہر آیا۔ آگ بگولا بنا ہوا۔ کتے کو گھسیٹ کر سامنے لایا گیا۔ کتے نے اپنی ٹانگیں چوڑی کر کے پھیلا دیں اور خود کو پیچھے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ سزا سے بچنے کے لیے وہ آخری بار رہا سہا زور لگا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈر کے مارے باہر ابل آئی تھیں۔ انچ بہ انچ، گز بہ گز، اور ہر گز اپنی الگ ہیبت رکھتا تھا۔ اسے کھینچ کر وہاں لایا گیا جہاں مصطفےٰ کھڑا تھا۔ کتے کو زبردستی نیچے بٹھا دیا گیا۔ مصطفےٰ نے حکم دیا کہ اس کی چاروں ٹانگیں ملا کر باندھ دی جائیں۔ کتے نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ رحم کا طالب ہوا۔ اپنے مالک کی طرف نظر کی، ملتجیانہ انداز میں۔ اپنے کیے پر تقریباً شرمسار ہو کر۔ مصطفےٰ کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہ دے سکا کہ سامنے سرکشی کی ایک علامت ہے۔ مصطفےٰ کو ایک ہی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

قانون کا پتہ تھا اور اسی کے مطابق سزا دینا چاہتا تھا اور وہ قانون تھا: تشدد۔

اس نے حکم دیا کہ کتے کو کوڑے اور ڈنڈے لگائے جائیں۔ گرگے زمین پر چت پڑے کتے کے گرد جمع ہو گئے، جو یہ سمجھ کر کہ اس پر برا وقت آیا ہی چاہتا ہے رو اور چلا رہا تھا۔ گرگوں کے ہاتھ میں چمڑے کے کوڑے اور بانس تھے۔ کتے کے جسم پر تابڑ توڑ برسنے شروع ہوئے۔ وہ کرب کے مارے تڑپتا رہا۔ اس کی چیخوں سے کوٹ ادو کے ارد گرد کا سکوت چھلنی ہو گیا۔ اس کا جسم شاید ذہن کی منت کرتا رہا کہ ہار مان لے۔ ذہن نے ہار مان کر نہ دی۔ کم از کم پینتالیس منٹ تک تو نہیں مانی۔ آخر کار کتے کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور اسے ہوش نہ رہا۔

مصطفٰے کو فوراً کتے پر ترس آ گیا۔ اس نے اپنے ایک گرگے سے کہا کہ کتے کو لے جائے اور اس کی دوا دارو کرے۔ کتے کی طرف سے منہ پھیر کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر کے اندر چلا گیا۔ اب اچانک وہ خود کو مجرم محسوس کرنے لگا تھا۔

یہ وقعہ سن کر مجھے بڑا صدمہ پہنچا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ مصطفٰے کے غیر معقول تشدد کا نشانہ کوئی بے زبان جانور بھی بن سکتا ہے جس کے لیے اپنی صفائی میں کچھ کہنا، کوئی بہانہ تراشنا یا اپنی حرکتوں کا کوئی عذر پیش کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ مصطفٰے کی نظر میں کتے کا رویہ نافرمانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے مصطفٰے کھر سے ٹکر لینے کی جرات کی تھی۔ اگر کوئی کتا بھی خاک سے سر اٹھاتا تو اسے فضا سے بغاوت کی بو آنے لگتی۔ مصطفٰے صرف خوف کے زور پر حکومت کر سکتا تھا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس شخص میں تو کتے تک کی نافرمانی برداشت کرنے کی تاب نہیں، ہم تو انسان ہیں۔ ہمیں تک اپنے اضطراری افعال اور عقل وفہم کے باوجود اس کے احکام کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔ ہم بھی نہ تو اس سے یہ پوچھ سکتے تھے کہ ہمیں کیوں سزا دی جا رہی ہے نہ کوئی عذر پیش کر سکتے تھے۔ اس کی بیہودہ من مانیوں نے انسانوں اور حیوانوں دونوں کو یکساں طور پر اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا۔

میرے لیے یہ سارا واقعہ مصطفٰے کے ذہن کی گہرائیوں میں ایک اور سفر کے مانند تھا۔ کیا مصطفٰے کھر سچ مچ یہ سمجھتا تھا کہ کتے نے جان بوجھ کر اس کی بے عزتی کی تھی؟ کیا اس کا واقعی یہ خیال تھا کہ کتا سمجھ سکتا تھا کہ اسے اتنے بہیمانہ انداز میں کیوں پیٹا جا رہا ہے؟ کیا اس شخص کے ذہن میں اس حقیقت کا کوئی تصور نہیں کہ سزا ہمیشہ جرم کے تناسب سے ملنی چاہیے؟ اور کتے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا وہ سمجھ سکتا تھا کہ اسے بے دردی سے کیوں مارا جا رہا ہے؟ یا اس کے چھوٹے سے ذہن نے بس اتنا سمجھا کہ یہ جفا کار آمروں کے بہیمانہ رویے کا ایک نمونہ ہے؟ اگر وہ معافی مانگ سکتا تو کیا معافی مانگتا؟ لیکن کس بات کی معافی؟ زندگی تو اپنی مرضی پر چلنے کا نام ہے۔ کیا اسے اپنی مرضی

کی زندگی گزارنے سے باز رکھا جا سکتا تھا۔؟ میں بڑی آسانی سے کہہ سکتی تھی کہ کتے کا ذہن جن خیالات کی آماج گاہ بنا رہا ہو گا ان میں اور میرے خیالات میں کوئی فرق نہیں تھا۔

اگلے روز میں نے اس واقعے کے حوالے سے مصطفٰے سے بات کی۔ یہ واقعہ سن کر میری نیند حرام ہو گئی تھی۔ "مصطفٰے، پتہ بھی ہے، میرے خیال میں تمہارے مسائل اور مشکلات نتیجہ ہیں اس بدسلوکی کا جو تم نے کتے کے ساتھ کی تھی۔ میں نے رات خواب میں دیکھا کہ کتے نے تمہیں بد دعا دی ہے۔ سوچو تو سہی۔ تمہیں کتے کی بد دعا لگ گئی ہے۔ اس سے زیادہ ہولناک بات سوچنے میں آ سکتی ہے کیا؟ خدا تم سے ناراض ہے۔" اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہو گئے۔

چند روز بعد میرے سامنے اپنی خطاؤں کا اعتراف کرنے کا وقت پھر آ پہنچا اور اس نے جھینپتے ہوئے بتایا کہ میرے کہے کا اس پر واقعی اثر ہوا ہے۔ "مجھے راتوں کو وہ کتا روتا اور بھونکتا سنائی دیتا ہے۔ بڑی خوفناک بھوں بھوں ہے۔ ہولناک اور روح فرسا عو عو ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ جانماز پر بیٹھے بیٹھے آخر میں ہوتا یہ ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہوں کہ اللہ مجھے بخش دے۔ آخر میں ہوتا یہ ہے کہ میں گڑگڑا گڑگڑا کر کتے سے معافی مانگنے لگتا ہوں۔"

میں حیران ہوں کہ اس کتے نے مصطفٰے کو معاف کیا کہ نہیں۔

بلال کہیں سے مصطفٰے کے لیے کبوتروں کا جوڑا لے آیا۔ مصطفٰے کو وہ خوبصورت معلوم ہوئے اور انہیں ایک چھوٹی سی کابک میں رکھ لیا گیا۔ صاف ظاہر ہے مصطفٰے کو معلوم نہ تھا کہ کبوتروں کی نسل تیزی سے بڑھتی ہے۔ جاڑے آنے تک ہمارے پاس تیرہ کبوتر ہو گئے۔ وہ رات کو مکان کی چھت پر بسیرا کرتے۔ احساس جرم کی ٹیسوں سے رات کو میری آنکھ کھل کھل جاتی۔ برف پڑتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ کبوتر سردی سے اکڑ کر مر جائیں گے۔ پریشان ہو کر میں مصطفٰے کو اٹھا دیتی تنگ آ کر وہ گھر کے عملے کو جگاتا اور ایک زبردست تماشا شروع ہو جاتا۔

وہ اور حاجی، ہمارا ملازم، ٹارچ سے لیس ہو کر باہر ٹھنڈ میں نکل جاتے۔ میں باغ میں لگی ہوئی سرچ لائٹیں روشن کر دیتی۔ مصطفٰے کبوتروں کو تلاش کرتا۔ جب ٹھیک ٹھیک پتہ چل جاتا کہ وہ کہاں پہ ہیں۔ تو میں روشنیاں بجھا دیتی اور وہ کسی شکرے کی طرح اندھیرے میں ان کو دبوچ لیتا۔ اسے پتہ تھا کہ اگر ہاتھ تھوڑا سا بھی ادھر اُدھر پڑا تو کبوتر اڑ جائے گا اور اندھوں کی طرح ہر طرف بھٹکا پھرے گا۔ اس کا نشانہ بالکل ٹھیک ہونا چاہیے۔ جب پہلوان ٹانگوں پر کھیلا جانے والا یہ خطرناک کھیل ختم ہو جاتا تو وہ کبوتروں کو گھر میں لا کر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

غسل خانے کے ٹب میں چھوڑ دیتا۔ صبح ہونے پر کبوتروں کو غسل خانے سے رہائی ملتی۔ یہ روز کا معمول بن گیا اور اس وقت تک جاری رہا جب تک میں نے ان کے لیے بڑھئی کا بک نہ بنوادی۔ نہ تو میں یہ چاہتی تھی کہ کبوتر سردی سے مرجائیں۔ نہ یہ چاہتی تھی کہ ان کا پیچھا کرتے کرتے میرا میاں ٹائلوں سے پھسل کر نیچے آ گرے اور اپنی گردن تڑوا بیٹھے۔

ہم نے ہیزل میر میں بڑی ہوش ربا باربی کیو دعوتیں دیں۔ ان میں سے بہت سی دعوتوں میں سو سے زیادہ افراد کو مدعو کیا گیا۔ ہم باہر لان میں شامیانے لگوا دیتے اور کوئلوں سے بھرے ہوئے بڑے بڑے گڑھوں پر کھانا پکتا رہتا۔ مصطفےٰ کو بڑا زبردست بکاول سمجھا جانے لگا تھا۔ لوگ محض اس کے پکائے ہوئے لذیذ کھانوں کی خاطر ہیزل میر کھچے چلے آتے تھے۔

ایک بار مصطفےٰ باربی کیو ضیافت کے لیے پچاس زندہ چوزے خرید لایا۔ وہ انہیں کلمہ پڑھ پڑھ کر یکے بعد دیگرے ذبح کرتا گیا۔ وہ گردن کی رگ کاٹتا ور چوزے کو اٹھا کر دور پھینک دیتا۔ چوزہ انتہائی کرب کی حالت میں ادھر اُدھر اچھلتا اور مرنے سے پہلے بڑے ہولناک طریقے سے جھرجھری لیتا۔ میں مصطفےٰ سے کہتی رہی کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کرے جس سے چوزوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ مصطفےٰ قہقہہ لگا کر مجھے سمجھاتا کہ مرتے دم چوزے کی آخری جھرجھری اس بات کی دلیل ہے کہ روح جسم کو خالی کر رہی ہے۔ میں نے چکن کھانا چھوڑ دیا۔

ہر طرف خون کے چھینٹے نظر آتے جنہیں سوکھنے سے پہلے ٹاکیوں سے صاف کرنا پڑتا۔ پاتیو پر کسی قصاب خانے کا گمان ہوتا۔ وقت کم ہوتا اور کام زیادہ۔ ہم بچے کھچے پر اٹھانے، چھپا خون صاف کرنے اور گوشت بنانے میں جتے رہتے تاکہ بروقت فارغ ہو جائیں۔ یہ تعین مصطفےٰ کرتا کہ کون سا کام کس طرح اور کب ہونا ہے اور کس کے ذمے ہو گا۔ ان دعوتوں میں اس کے پکائے ہوئے کھانوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ وہ صرف کام کی نگرانی کرتا۔ ہر چیز کا انتظام مجھے کرنا پڑتا۔ کشن پھلا کر رکھنے، پھول سجانے، اچھی نظر کے لیے سنگھار کرنا اور دل موہ لینے والا انداز اپنانا۔ یہ سب میری ذمے داری تھی۔ مہمانوں کے آتے آتے میں تھک کر چور ہو چکی ہوتی۔ اپنی پوری طاقت کو بروئے کار لا کر میں مہمانوں کی ریل پیل میں ماری ماری پھرتی، ان کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی۔ جب دعوت ختم ہوتی تو ہمیں سونے کے کپڑے پہننا بھی دوبھر معلوم ہونے لگتا۔ ہم بستر پر جا گرتے اور صبح تک غافل سوتے رہتے۔ خدا کا شکر بجا لاتے کہ مہمان رخصت ہوئے۔ دعوتوں کے اس دور کو مستقل حیثیت حاصل ہو گئی۔ مہینے میں تین تین بار دعوتیں ہونے لگیں۔ مصطفےٰ کا یوگا اس کے بہت کام آیا۔ وہ لامحدود توانائی کا مالک تھا

اب جب کہ مارپٹائی اور لڑائی جھگڑے کچھ کچھ قصۂ پارینہ بن گئے تھے۔ تو وہ اپنی توانائی ان مہمل مشغلوں میں صرف کر رہا تھا۔

مصطفےٰ نامعقولیت سے اب بھی باز نہ آتا تھا۔ اب بھی وہ بعض حرکتیں صریحاً صرف مجھے کھجانے یا میرے توازن کو بگاڑنے کے لیے کرتا تھا۔ ایک شام ہم نے دلیپ کمار اور ان کی بیگم سائرہ کو ڈنر پر مدعو کیا۔ مصطفےٰ بالوں کو رنگ کر رہا تھا۔ میں نے سرسری طور پر اس سے کہا کہ وہ میرے سفید تولیے استعمال نہ کرے۔ میں نے برتنے کے لیے اسے رنگین تولیا لا دیا۔ اس نے مجھ پر نظر ڈالی، سفید تولیہ اٹھایا اور اس سے کام لینے لگا۔ وہ مجھے طیش دلا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تحقیر آمیز مسکراہٹ تھی۔ "مصطفےٰ، تم جان بوجھ کر یہ سب کچھ کر رہے ہو۔ ہمارا پورا دن بغیر کسی ٹنٹے کے گزر گیا ہے۔ اب تمہیں جھگڑا کرنے کی سوجھی ہے۔ ہمارے مہمان آنے والے ہیں۔ مجھے پریشان مت کرو۔" وہاں ایک جگ پڑا تھا۔ مصطفےٰ نے اسے اٹھا کر میری طرف پھینکا۔ میرے کندھے میں چوٹ آئی۔ میں غسل خانے سے نکل آئی اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے دروازے کو دھڑ دھڑایا اور دھمکی دی کہ مجھے جان سے مار دے گا۔ میں اسے نظر انداز کر کے نیچے چلی گئی اور اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ وہ پوچھنے لگے کہ مصطفےٰ کہاں ہے۔ میں نے کوئی بہانہ بنا دیا۔ میں انہیں یہ بتانے سے تو رہی کہ شیر پنجاب اوپر غسل خانے میں بند ہے۔

بیس منٹ بعد میں اوپر گئی۔ اس نے اپنے طیش پر اچھی طرح قابو پا لیا تھا لیکن اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ تھا۔ "اگر تم ایک بار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صرف اتنا سمجھ لو کہ میں یہاں تمہاری فضولیات برداشت کرنے کے لیے نہیں ہوں تو میں دروازہ کھول دوں گی۔" "ٹھیک ہے۔ مجھے باہر آنے دو۔" میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بہت تلملایا ہوا باہر آیا۔ "ذرا یہ لوگ چلے جائیں۔ میں تمہیں مزہ چکھا کر چھوڑوں گا۔" ہم نیچے آئے تو [illegible] نے جس پائے کی اداکاری کی اس پر دلیپ کو بھی فخر ہوتا۔ دلیپ اور سائرہ بلاشبہ یہ تاثر لے کر رخصت ہوئے کہ ہم جیسے ایک دوسرے سے راضی خوشی میاں بیوی ڈھونڈے نہیں ملیں گے۔ انہیں کیا خبر کہ ان کا میزبان، بڑی نفاست کے ساتھ چھری سے روسٹ کے ٹکڑے کرتے وقت، قتل کی نیت باندھ رہا تھا۔

مصطفےٰ نے مجھ سے اوپر چلنے کو کہا لیکن میرا کوئی ارادہ نہ تھا کہ سزا پانے کے لیے بالائی منزل کا رخ کروں۔ میں نے نچلی منزل کے ایک کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ اپنے شکار کا دس منٹ تک انتظار کرنے کے بعد وہ نیچے آیا۔ "تہمینہ، دروازہ کھول دو۔ تمہارا یہ رویہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ میں تمہیں ٹھیک بنا دوں گا۔" "مجھے پتہ ہے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کہ کمرے کے باہر ایک بیمار، جنونی آدمی موجود ہے۔ کیا تم واقعی یہ توقع رکھتے ہو کہ میں نہتی باہر آ کر خود کو اس کے حوالے کر دوں گی؟"

وہاں کھڑے کھڑے ہم عورتوں کے حقوق کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ ہمارے درمیان حائل دروازہ میری حفاظت کا ضامن تھا۔ چونکہ میں خود کو نسبتاً زیادہ محفوظ محسوس کر رہی تھی اس لیے میں نے بہت کھل کر باتیں کی۔ آخر کار اسے صورت حال کی مہملیت کا احساس ہو گیا۔ اس نے سپر ڈال دی۔ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہی ہوں۔ شیر کو خود اسی کے بھٹ میں ناچ نچایا جا رہا تھا۔

بلی چوہے کا یہ کھیل جاری رہا۔ فرق یہ تھا کہ ہماری یہ چھیڑ چھاڑ ٹام اور جیری کے تعلقات سے زیادہ مشابہ تھی۔ نئے سرے سے زور میں آئے جیری کے ہاتھوں نیم شمیم ٹام کی درگت بن رہی تھی۔ وہ مجھے اشتعال دلانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے اشتعال میں آنے سے انکار کر دیا۔ اس کی بدمزاجی غائب غلہ ہو گئی کیونکہ جس وجہ سے وہ تاؤ کھاتا تھا میں نے اسے باقی ہی نہ رہنے دیا تھا۔ اسے میری عاجزانہ اطاعت گزاری پر غصہ آتا تھا۔

مصطفٰے میں تبدیلی آ رہی تھی۔ اسے محسوس کرنا قریب قریب ناممکن ہی سہی لیکن بہرطور پر یہ تھی تو تبدیلی۔ وہ اپنے آپ کو مجھ سے ہم آہنگ کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے بہت باتیں کرنے لگا اور اس نے مجھ میں سیاسی سوجھ بوجھ ابھارنے کی کوشش شروع کر دی۔ میں بڑے شوق سے اس کی ان باتوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ یہ ایک ایسا میدان عمل تھا جو واقعی مجھے بہت بھاتا تھا۔

ہیزل میر ہمارے حق میں اچھا ثابت ہوا۔ مصطفٰے روزانہ سو صفحے اس طرح پڑھتا جیسے کوئی فرض ادا کر رہا ہو۔ میں کتابوں کی دکانوں کا جستہ جستہ جائزہ لیتی اور اس کے لیے وہ کتابیں لے آتی جو میرے خیال میں اسے پڑھنی چاہئیے تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے کن موضوعات سے دلچسپی ہے اور چاہتی تھی کہ جلاوطنی کے دوران میں وہ جتنی زیادہ باتیں اخذ کر سکتا ہے کر لے۔ وہ دن میرے خیال میں وطن واپسی سے پہلے غور وفکر اور تیاری کے دن تھے۔ مصطفٰے صورت حال کا تجزیہ کرتا۔ وہ اکثر جی بھر کر اپنی کوتاہیوں کو آپ تنقید کا نشانہ بناتا اور ہمارے جاری سیاسی بحران کی وجوہ کا ژرف بینی سے جائزہ لیتا۔ میں متجسس رہتی۔ میں نے اس سے سیکھا۔ سیاست کے میدان میں اس کی آرا پر صاد کیا۔

جب ہم دوستوں اور حلیفوں کے درمیان ہوتے تو وہ پورا اعتماد ظاہر کرتا کہ اس کی بیوی نہ صرف اس کے مقاصد پر یقین رکھتی ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر ان کا دفاع کرے گی۔ میں اپنی سیاسی زندگی کو اپنی نجی زندگی سے الگ تھلگ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

جن باتوں پر اسے پختہ یقین تھا میں بھی ان کی حمایت کرنے پر اتر آئی اور اس کے کیس کے حق میں مصطفٰے ہی کی طرح یقین اور شدت کے ساتھ دلائل پیش کرنے لگی۔ میرے بہت سے دوستوں کو میری یہ کایا پلٹ یاد ہے۔ پہلے پہل انہوں نے مجھے ایک دبی دبی گھریلو خاتون کے روپ میں دیکھا جو بیشتر وقت چپ بیٹھی رہتی تھی اور پھر میں ان کے سامنے ایک جوشیلی اور باحوصلہ عورت بن کر آئی جس کی گفتگو میں "مصطفٰے نے کہا" سے شروع ہونے والے جملے بار بار سننے کو ملتے۔ میں اس کا سیاسی دم چھلاہ بن گئی تھی۔

بیوی کی ٹھکائی کرنے کا اضطرار اب بھی اس پر کبھی کبھار غالب آ جاتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ وہ کار میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے آنے میں اس لیے ذرا سی دیر ہو گئی کہ اس کے ٹریول ایجنٹ کا فون آ گیا تھا۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ مصطفٰے کی سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔ ادھر مصطفٰے بیٹھا پھنپھنا رہا تھا۔ غصے کے مارے وہ پھٹ ہی پڑا۔ وہ اور کسی کا انتظار کرے۔ یہ اسے سخت ناگوار تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ذرا سکون سے کام لو۔ ایسی کون سی قیامت آ گئی ہے۔" اس نے الٹے ہاتھ سے مجھے طمانچہ مارا۔ میری آنکھ کے گرد فوراً نیل پڑ گیا۔ جس چھوٹی سی سیر پر ہم نکلنے والے تھے وہ دھری کی دھری رہ گئی۔

ہم اندر چلے آئے۔ مصطفٰے نے مجھ سے کہا کہ نیل چھپانے کے لیے کالی عینک لگائی جائے۔ میں نے عینک پہن لی۔ اس شام ہمارے کئی جاننے والے ملنے آئے تھے۔ علی محمود اور بلو تو میرے لیے اپنے گھر والوں کی طرح تھے۔ ان کے علاوہ رفیع کچیلو اور مسز چنوئے بھی تھیں۔ میں ڈنر میں شریک ہونے پہنچی تو کالی عینک کی وجہ سے بے تکی اور کچھ ہیبت ناک سی نظر آ رہی تھی۔ مصطفٰے نروس تھا۔ اسے اب پتہ نہ چلتا تھا کہ میں اگلا قدم کیا اٹھاؤں گی۔ میں نے بیٹھنے کے بعد بڑے اطمینان سے کالی عینک اتار دی۔ میں چاہتی تھی کہ ایک بار مصطفٰے بھی اپنے کیے کا مزہ چکھے۔ میں چاہتی تھی کہ اس بار رسوائی میرے حصے میں نہ آئے۔ چھپ چھپ کر بیوی کو مارنے پیٹنے والے اس شخص کو بے نقاب کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔

سب ہک دک رہ گئے۔ انہوں نے سٹپٹا کر مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی ہے۔ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ "مصطفٰے نے مجھے مارا" گلاس نیچے رکھ دیے گئے۔ حاضرین گلا صاف کرنے کی آوازیں نکالنے اور اپنی اپنی نشستوں پر کسمسانے لگے۔ مصطفٰے کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے بہانے لانے شروع کیے۔ مجھ پر الزام لگایا کہ میرا رویہ نامعقول ہے، میں گستاخ ہوں۔ اپنے فعل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی دلیلیں دینے لگا۔ اتنے مشکل حالات کا سامنا ہے اور میں نے غیر معقول رویہ اپنا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ تعاون نہیں کرتی ہوں۔ اس کے کہے پر کسی کو یقین نہ آیا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جو نقصان پہنچنا تھا۔ پہنچ گیا۔ بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کسی سے آنکھیں کیسے چار کرے۔

رات کو بعد میں وہ بیڈروم میں سے دو بدو ہوا۔ میرا رویہ وقار سے گرا ہوا ٹھہرا۔ کہا گیا کہ میں دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس طرح کے ڈھونگ رچاتی ہوں۔ ایسی عورت قرار دیا گیا جو بے شرم ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ "آج تمہاری تذلیل ہوئی ہے۔ میری نہیں۔ تمہیں غصہ آنا ہی چاہیے کیوں کہ تمہیں اپنی حرکت کی وجہ سے شرمندہ ہونا پڑا۔ اگلی بار جب تم سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جس کی وجہ سے بعد میں تمہیں خفت اٹھانی پڑے تو پہلے سے یہ اطمینان کر لینا کہ تم رسوائی کی تاب لا سکو گے۔ اب میں تمہیں تحفظ نہیں دیا کروں گی۔ اگر میرے چہرے پر نیل پڑے ہوں گے یا مار کھا کھا کر میری صورت بگڑ گئی ہو گی تو میں اپنا منہ چھپاؤں گی نہیں۔ میں چاہوں گی کہ دوسروں کو میں ویسی ہی نظر آؤں جیسی کہ ہوں۔ مجھے منافق بن کر جینا منظور نہیں۔"

یہ صاف گوئی کا دور تھا۔ میرا ستارہ عروج پر تھا۔ میرے اعتماد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ مصطفےٰ نے میرے بڑھتے ہوئے اعتماد پر قدغن لگانی چاہی مگر ناکام رہا۔ ایک دن مدتوں بعد امی کا فون آیا۔ وہ مجھ سے فوراً ملنا چاہتی تھیں۔ ڈھائی سال کے وقفے کے بعد ان کے اس طرح اچانک نمودار ہونے کے بارے میں میرے جذبات ملے جلے تھے۔ میں نے مصطفےٰ سے معلوم کیا کہ کیا میں امی سے ملنے چلی جاؤں۔ مصطفےٰ نے اجازت دے دی۔

سب سے پہلے عدیلہ نے میرا استقبال کیا۔ اس نے مجھ سے گلے ملنا چاہا۔ اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے اور وہ بہت مسکین بنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی پچھلی تمام حرکتوں کی مجھ سے معافی مانگی۔ مجھے بتایا کہ ضمیر پر بوجھ رہنے کی وجہ سے اسے بے خوابی کا مرض مستقل طور پر لاحق ہو چکا ہے۔ کہنے لگی کہ اب اس کی شادی کے پیغام آ رہے ہیں۔ لیکن جب تک میں ماضی میں ہونے والی تلخیوں کے حوالے سے اسے معاف نہیں کروں گی۔ وہ شادی نہیں کر سکے گی۔ "تم نے مجھے معاف نہ کیا تو خدا بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں شادی کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔ میں نے تمہیں اتنا دکھ جو دیا ہے۔ قدرت مجھ سے انتقام لے کر رہے گی۔ مہربانی کر کے مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔" اس نے اپنے اخلاق سوز رویے کا ذمے دار مصطفےٰ کو ٹھہرانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے سامنے میرے شوہر کی برائی کبھی نہ کرنا۔ اگر تمہیں اپنے رویے کے بارے میں کچھ کہنا ہے تو میں سن لوں گی۔

اسے بیچ میں مت لاؤ۔" جب بھی کوئی مصطفےٰ کو برا بھلا کہتا تو میں، جیسے کسی اندرونی دباؤ سے مغلوب ہو کر، اس کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ شخصیت کا یہ خاصہ مجھے امی سے ورثے میں ملا تھا۔

میں نے عدیلہ کو تہ دل سے معاف کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں مصطفےٰ کو معاف کرنے کے بعد اس کے ساتھ رہ سکتی ہوں تو پھر شریک جرم کے خلاف رنجش پالنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور مجھے یوں لگتا تھا کہ اب اپنی ازدواجی زندگی پوری طرح میری گرفت میں ہے۔

ذہنی طور پر بالکل بے حال ہو کر میں گھر لوٹی۔ عدیلہ کے ساتھ جو بات چیت ہوئی تھی وہ میں نے مصطفےٰ کو سنائی۔ وہ میری خاطر بہت خوش ہوا اور بظاہر اس بات پر بہت مطمئن نظر آیا کہ عدیلہ والا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔

میرے بچوں کو دوبارہ پتہ چلا کہ ان کے نانا نانی بھی ہیں۔ اپنے نواسے، علی کو انہوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرے والد کی توجہ اور شفقت کا مرکز بن گیا۔ والدین کے گھر جانا ہمیشہ خوشگوار تجربہ ثابت ہوتا۔ میں چاہتی تھی کہ مجھے وہاں جانے کا موقع بار بار ملے مگر میری یہ حسرت پوری نہ ہوئی۔ والدین سے میرا میل جول مصطفےٰ کو برا لگتا۔ وہ کہا کرتا کہ وہ مجھے اپنی اور صرف اپنی سمجھتا ہے اور اس تصرف میں کسی اور کی شرکت اسے گوارا نہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ ساری جلن صرف اس وجہ سے ہے کہ اس کی بے عزتی کی جا رہی ہے۔ میرے والدین کو اب یہ تک منظور نہ تھا کہ اس کا سایہ بھی ان کی دہلیز پر پڑے۔ مصطفےٰ مجھے ان کے گھر کے باہر اتار دیتا اور مقررہ وقت پر آ کر مجھے باہر ہی سے لے آتا۔ اسے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ جب بھی مجھے اس طرح چھوڑ کر آنے اور لینے جانے کا موقع آتا تو اس پر چڑچڑاپن طاری ہو جاتا۔ میں محسوس کرتی کہ جو سلوک اس کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ اسی کا مستحق ہے۔

کشیدگی پھر سر اٹھانے لگی۔ مصطفےٰ اب زیادہ زود رنج ہو گیا اور ہر وقت مجھ سے لڑنے جھگڑنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہمارا نہایت احتیاط سے استوار کیا ہوا مگر بہت نازک "جیو اور جینے دو" کے فلسفے پر قائم باہمی رشتہ سرد جنگ کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس خیال سے میرا دل بیٹھا جاتا تھا کہ جنگ از سر نو چھڑ گئی تو کیا ہو گا۔ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے میں والدین کے گھر جانے سے احتراز کرنے لگی۔ میری ترجیحات واضح تھیں۔ مجھے اپنی شادی برقرار رکھنی تھی۔ اس تعلق کو قائم رکھنے کی خاطر میں نے اتنا دکھ درد سہا تھا اتنے سمجھوتے کیے تھے کہ اسے توڑنا، خصوصاً جب کہ حالات سدھر رہے ہوں، میرے مفاد میں نہ تھا۔ یا میں نے یہی سمجھ رکھا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جتوئی صاحب کی بیٹی، شیریں، کے بچہ ہونے والا تھا۔ وہ ویلینگٹن ہسپتال میں تھی۔ بچے کی پیدائش سے پہلے مصطفٰے اور میں اس کی خیریت معلوم کرنے گئے۔ وہاں بہت سے دوست اور عزیز و اقارب موجود تھے۔ شیریں کی والدہ نے مجھے پہلی بار دیکھا۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا اور مصطفٰے سے کہا۔ "میرا خیال ہے تمہیں واقعی بہت اچھی بیوی مل گئی ہے۔ مجھے امید ہے تم اس کی قدر کرو گے۔"

مصطفٰے نے ان سب لوگوں کے سامنے خود پر بڑی دردمندی اور خلوص طاری کر کے میرا ہاتھ تھام لیا اور خطیبانہ لہجے میں اعلان کیا۔ "میں تمینہ کے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ میرے لیے کتنی اہم ہے یا اس نے مجھ سے کتنا اچھا سلوک کیا ہے۔"

مصطفٰے مجھے ہسپتال میں شیریں کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ اس سہ پہر کو شیریں نے میرے گھر سے کوئی چیز منگانی چاہی۔ چنانچہ میں نے گھر فون کیا کہ ملازم کو بتا دوں۔ فون مصروف ملتا رہا۔ میں نے سوچا کہ فون کرنا بیکار ہے۔ اسی شام چھ بجے شیریں کو درد زہ شروع ہوا۔ میری امی امریکہ گئی ہوئی تھیں۔ توقع تھی کہ عدیلہ ویک اینڈ پر اپنے بورڈنگ ہاؤس سے گھر آ جائے گی۔ یہ پتہ کرنے کے لیے کہ وہ گھر پہنچ گئی ہے یا نہیں میں نے ہسپتال سے فون کیا۔ اسے یہ بھی بتانا تھا کہ امی نے ہدایت کی ہے کہ وہ اگلی صبح کی پرواز سے امریکہ روانہ ہو جائے۔ مصطفٰے واپس آ چکا تھا۔ وہ ہم سب کے ساتھ کمرے میں موجود تھا جہاں جام صادق، مرتضٰے جتوئی، شیریں کا شوہر، تصویر اور دوسرے لوگ جمع تھے۔ عدیلہ نے فون اٹھایا اور کوئی تمہید باندھے بغیر اصل موضوع چھیڑ دیا۔ "تہمینہ، تمہارا میاں پوری سہ پہر مجھ سے فون پر بات کرتا رہا ہے۔ اس نے میری منت کی کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ یہ بتایا کہ اس جیسا مرد مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ اس بات پر اڑا رہا کہ میری زندگی میں چاہے کوئی بھی آ جائے میں اسے کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔ میں نے کہا کہ تہمینہ تو ہمیشہ یہی کہتی رہتی ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ کہنے لگا کہ تمہاری بہن تو بالکل بیوقوف ہے۔ جب میں اس سے کہتا ہوں کہ مجھے تم سے پیار ہے تو وہ میرے کہے پر یقین لے آتی ہے۔ اس نے منت سماجت کر کے کہا کہ میں اس سے مل تو لوں۔ کہنے لگا کہ میں آ رہا ہوں اور کار تمہارے دروازے کے باہر پارک کروں گا۔ وہ میری صرف ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے ذہن پر میں اور صرف میں سوار ہوں۔ مجھے بتانے گیا کہ میرے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ میں نے کہا کہ عمر کے لحاظ سے تو تم میرے والد کے برابر ہو۔ کہنے لگا کہ میرے والد نے جب شادی کی تھی تو وہ ساٹھ برس کے تھے اور امی سولہ سال کی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میری باتوں پر [illegible] نہیں آئے گا۔ اس لیے

میں نے گواہوں کا بندوبست کر رکھا ہے۔ میری سہیلی کلاڈیا یہاں ہے۔ وہ ہماری باتیں ایکس ٹینشن پر سنتی رہی ہے۔ ہمارے باورچی، رحمان، نے بھی ہماری گفتگو سنی ہے ان سے پوچھ لو۔"

مجھ یقین آ گیا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ عدیلہ سے بات کرتے وقت میں مصطفٰے کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک رنگ جا رہا تھا۔ وہ صاف صاف قصوروار تھا۔ اس کے چہرے پر جلی حروف میں لکھا تھا: میں مجرم ہوں۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ مجھے پتہ چل گیا ہے۔ میں نے فون واپس رکھ دیا۔ مجھ پر مکمل سکتہ طاری ہو گیا۔ میں جان گئی کہ میری جو نئے سرے سے تعمیر کی گئی تھی تو صرف اس لی کہ مجھے پھر سے ڈھایا جا سکے۔ میں نے اس شخص پر جتنی بار بھی تکیہ کیا اس نے ہر بار مجھے دھوکا دیا۔

میں کمرے سے باہر چلی آئی اور ویٹنگ روم میں، گویا میرے دکھ کا تمسخر اڑانے کے لیے، جشن کا سماں تھا۔ شیریں کے لڑکا ہوا تھا۔ کیا ظلم تھا کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی وقت میں پیش آئے تھے۔ میں زاروقطار رونے لگی۔ مجھے اپنے پر قابو نہ رہا۔ میرے ساتھ کیا مذاق ہو رہا تھا۔ اس احساس نے پہلے کبھی میرے رگ و پے میں اس طرح سرایت ۔ کیا تھا۔ میں شرمندہ بھی ہو رہی تھی۔ اور اس کے باوجود خود کو دوسروں کی نظر میں تماشا بھی بنائے چلی جا رہی تھی۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہاں سے بھاگ ہی جاتی مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پرلے درجے کی احمق ہوں۔

جتوئی صاحب کی بیگم مجھے بار بار سینے سے لگا کر پوچھتی رہیں کہ بات کیا ہے۔ میں اپنی نامرادی کا ذکر چھیڑ کر ان کے رنگ میں بھنگ نہ ڈالنا چاہتی تھی۔ مجھ جیسی عورت کا وہاں کیا کام تھا جس کی شادی غیر نارمل اور میاں نفسیاتی مریض۔ مجھ پر یہ عالم تھا جیسے میں نے مستقل طور پر اپنے اندر کسی جنونی کیفیت کو گھونٹ کر رکھا ہوا ہو۔ چشم نم نے [illegible] معذر خواہی کے بعد میں رخصت ہوئی۔ مصطفٰے میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ ہم کار میں [illegible] اور دل خراش خاموشی میں گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ پھر ایسا بن گیا جیسے اسے کچھ [illegible] ی نہ ہو اور معصوم لہجے میں پوچھنے لگا۔ "کیا ہو گیا؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔ کیا گڑبڑ ہے؟ [illegible] میں تمہاری منت کرتا ہوں مجھے بتاؤ۔ پلیز۔ عدیلہ کا کوئی چکر ہے؟ خدایا۔ وہ پاگل لڑکی۔ کیا اس نے کچھ کہہ دیا ہے؟ اس کی باتوں پر کان مت دھرو۔ وہ یہ ساری باتیں [illegible] تمہیں پریشان کرنے اور کچوکے دینے کے لیے گھڑتی رہتی ہے۔ اسے تم سے نفرت [illegible] وہ تمہاری شادی کو برباد کرنے کے درپے ہے۔ اسے مجھ سے محبت نہیں۔ وہ تمہیں [illegible] نا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہماری شادی ختم ہو جائے تاکہ اس کی لونی الٹی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سیدھی خواہشیں پوری ہو سکیں، تاکہ وہ تمہیں کچھ ثابت کر کے دکھا سکے۔ مہربانی کر کے اس کے کہے پر اعتبار مت کرو۔ اس نے کچھ کہا ہو گا، کہا ہے نا؟ اس نے کیا کہا ہے۔ مجھے بتاؤ"۔ میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔

میں سکتے کے عالم میں بستر پر جا بیٹھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ رینگ کر کسی کونے کھدرے میں جا گھسوں، رحمِ مادر کی ایمنی کی طرف دوبارہ لوٹ جاؤں۔ میں لاچار اور درماندہ تھی۔ میری زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر شیشے کی کرچیوں کی طرح فرش پر بکھری پڑی تھی۔ جب میں نے ان کرچیوں کو چننے کی کوشش کی تو وہ میرے دل وجان میں کھب کھب گئیں۔ میں چاہتی تھی کہ بس نسیان کے عالم میں جیسے جاؤں، خاک کے اس ذرے کے مانند جو سورج کی شعاع سے چھپتا پھر رہا ہو۔

مصطفےٰ میرے پیچھے پڑا رہا۔ اصرار کرنے لگا کہ میں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں نے تمام روشنیاں بجھا دیں، کمرے کے ایک کونے میں جا دبکی، جنین کے انداز میں منڈکری مار لی اور اس گھپ اندھیرے میں کمرے میں پڑی، آنسو بہاتی رہی۔

صبح کو میں مصطفےٰ کے اضطراب کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ میرے سکون سے خوف زدہ تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسے چھوڑنے والی ہوں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس بار میں وہی کروں گی جو کہہ رہی ہوں۔ پہلے تو اس نے اکڑفوں دکھا کر اپنا ردِعمل ظاہر کیا۔ پھر مجھے طعنے دینے لگا "کہاں جاؤ گی۔ تہمینہ؟ اپنے والد کے پاس؟ وہ تمہیں چچوڑی ہوئی ہڈی بھی نہیں ڈالیں گے۔"

میں نے طے کر لیا کہ اسے غلط ثابت کر کے رہوں گی۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ میں مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ میں اسے چھوڑ جانے کو تھی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر اسے یقین ہو گیا کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گی، تو وہ یا تو مجھے گھر میں بند کر دے گا یا میرے بچوں کو لے جائے گا۔ میں نے اپنے سکون سے اس کے خدشات کو رفع دفع کر دیا۔ اس نے میرے سکون کا غلط مطلب لیا۔

اس نے جو کچھ ابھی ابھی کہا تھا اس کے لیے مجھ سے معافی طلب کی۔ مجھے گلے لگانا چاہا۔ میں کنّی کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔ "تہمینہ، تم مکمل عورت ہو۔ تم غیر معمولی ہو۔ تم میں برداشت کا جو مادہ ہے اس کے سامنے میرے گاؤں کی عورتوں کا صبر کچھ نہیں۔ تم نے اتنا کچھ سہا۔ تم نے ان سب باتوں سے نمٹتے ہوئے وقار کا ثبوت دیا۔ تم نے خاموش رہ کر دکھ جھیلے۔ تم نے میری نیک نامی پر حرف نہ آنے دیا۔ تم کمال کی ماں ثابت ہوئی ہو۔ میں نے اس گھر کو اتنی زیادہ مرتبہ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ تم نے ہمیشہ اسے نئے سرے

سے بنا ڈالا۔ تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا ہی کیوں کہ میں اس ذرا سی شغتل کے لیے تمہیں چھوڑ دوں گا؟۔ مجھے پتہ تھا کہ برداشت اور صبر کے بارے میں یہ ساری باتیں میرا جی خوش کرنے کے لیے ہیں۔ ان کی اصلیت کچھ نہیں وہ یہی چاہتا تھا کہ میں پہلے کی طرح دروازے کے آگے بچھا پائیدان بنی رہوں۔ میں تھک چکی تھی اور اس بات کے لیے تیار نہیں تھی کہ جوتے رگڑ رگڑ کر گندگی مجھ پر تھوپی جاتی رہے۔

میں نے اسے بتایا کہ میں اسے آخری بار معاف کر رہی ہوں۔ اس نے میری بات پر یقین کر لیا۔ میں چاہتی بھی یہی تھی کہ اسے میرے کہے پر یقین آ جائے۔ "میری زندگی میں آئندہ خلل نہ ڈالنا۔ اس دفعہ تو میں کسی نہ کسی طرح صورت حال سے نمٹنے میں کامیاب ہو گئی۔ تم گائیڈ بن کر مجھے سارے جہنم میں پھرا لائے۔ اب مجھ میں نہ تو اتنی جان ہے نہ اتنی قوتِ ارادی کہ دوبارہ دغا فریب کی غلام گردشوں کے چکر کاٹ سکوں۔" اس نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ مجھے آئندہ کبھی دھوکا نہیں دے گا۔

مصطفےٰ خوش خوش لندن چلا گیا۔ وہ یہ سوچ کر پھولا نہ سما رہا تھا کہ ایک دفعہ پھر مجھے جُل دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں نے فون کر کے ٹیکسی منگائی۔ سامان پیک کیا۔ دائی عائشہ بوکھلا کر پچھاڑیں کھانے لگی۔ بیچاری کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اب میں مزید قربانی دینے کے موڈ میں نہ تھی۔ میں نے اپنے بھائی عاصم کو فون کر کے اپنے ارادے سے مطلع کیا۔ اس نے مکمل سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ چٹان بن کر میرے پہلو میں ڈٹا رہا۔ اس نے میرے لیے ایک ہوٹل میں سوئٹ بک کرا دیا۔ میں تینوں بچوں کو لے کر گھر سے نکل پڑی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی۔ میں تو پہلے ہی پتھر کی ہو چکی تھی۔

سوئٹ بہت نفیس تھا۔ زندگی کے چٹخاروں سے میری رغبت ماند پڑتی جا رہی تھی۔ اس رغبت میں از سرِ نو جان ڈالنے کے لیے عاصم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ میرے لیے ایک میز پر کیویار اور شیمپین چنی ہوئی تھی۔ عاصم وہاں آ گیا کہنے لگا کہ یہ سب بندوبست ایک پاگل آدمی کے چنگل سے میری رہائی کا جشن منانے کے لیے کیا گیا ہے۔ "تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے میں چاہتا ہوں یہ تمہاری باقی ماندہ زندگی کا پہلا دن قرار پائے۔ اب تمہیں خوش رہنا ہو گا۔ اس شخص کو بھول جاؤ" اس نے میرے بچوں کی طرف مڑ کر کہا۔ "آج سے میں تمہارا باپ ہوں۔" ہم نے جشن منایا۔ میں جا کر سو گئی۔ مجھے بڑے چین کی نیند آئی۔

میں نے مصطفےٰ کو فون کیا۔ دائی نے فون اٹھایا۔ میں نے پوچھا کہ صاحب کہاں تھے۔ کہنے لگی کہ وہ یوگا کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ جھٹکا لگا کہ اس کے معمولات میں ذرا سا بھی خلل پڑا تھا۔ اس نے آ کر ٹیلی فون سنبھالا۔ میں نے اطلاع دی کہ میں ہمیشہ کے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

لیے اسے چھوڑ چکی ہوں۔ کہنے لگا۔ "اچھا۔ امید کرتا ہوں کہ تم اپنی زندگی اچھی طرح گزار سکو گی۔"

میں نے وکیل کو فون پر ہدایت دی کہ طلاق کے کاغذات تیار کیے جائیں۔ مصطفےٰ کو خبر نہ تھی کہ میں کتنی سنجیدہ ہوں۔ جب وکیل نے اس سے رابطہ کیا تو وہ تاخیری حربے استعمال کرنے لگا۔ بالآخر اس نے کہا کہ طلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ مسئلے کو سلجھا لے گا۔ "یہ میرا اور تہمینہ کا آپس کا معاملہ ہے۔"

وکیل نے مجھے بتایا کہ کیا بات چیت ہوئی ہے۔ میرے ذہن میں ہر بات بالکل واضح تھی۔ میں اس سے ملنا نہ چاہتی تھی۔ میں ابھی کمزور تھی۔ وہ کوشش کرے گا کہ کسی طرح بہلا پھسلا کر مجھے واپس چلنے پر منا لے۔ وہ فریب دہی میں طاق ہو چکا تھا۔ میں ڈرتی تھی کہ اس کی فریب کاری سے دوچار ہونے پر میرا ردعمل جانے کیا ہو۔ میں نے وکیل سے کہا کہ مصطفےٰ کو بتا دیا جائے کہ میرے ساتھ رابطہ صرف میرے وکیل کے ذریعے قائم کیا جا سکتا ہے۔

میں ہفتے بھر لندن میں رہی۔ آزادی کے پورے سات دن، سات راتیں۔ میں نے وہ تمام چھوٹے موٹے کام کیے جو میری بساط میں تھے لیکن جن سے مصطفےٰ نے مجھے باز رکھا تھا۔ میں ہیروڈز میں لانگ ہیرالسٹی ٹیوٹ گئی۔ مجھے سات برس بعد کسی ہیرڈریسر کے پاس جانے کا موقع ملا تھا۔ میں نے خوب مزے کیے۔ مشاطگی کے زریعے اپنے چہرے کا رنگ روپ بدلوایا۔ اپنے اور بچوں کے لیے خریداری کی۔ نامل لوگوں کے درمیان دوبارہ پہنچ جانے پر مجھ پر وجد سا طاری تھا۔

میرے بھائی نے مجھے ہوائی جہاز سے ماربیلا بھجوانے کا بندوبست کر دیا۔ میں نے بچوں کے لیے ایک دوست کی کھلائی کو ساتھ لیا اور امی کے ولا میں جا اتری۔ میں نے والدین سے کوئی رابطہ نہ رکھا۔ میں وضاحتوں، الزاموں اور تہمتوں میں الجھنا نہ چاہتی تھی۔ میری آرزو تو یہ تھی کہ میرا ماضی اس گہرے نیلے سمندر میں غرق ہو جائے جو سپین میں مجھے اپنے ارد گرد نظر آتا تھا۔

میں ہر روز انکوسول جاتی جو ایک ہیلتھ ریزورٹ ہے۔ جو جو علاج وہاں دستیاب تھے میں نے ان سب سے استفادہ کیا۔ میں پڑی الکساتی رہتی اور کوشش کرتی کہ اپنے ذہن سے تمام یادوں کو کھرچ کر باہر پھینک دوں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی آزادی کا کیا کروں۔ چھوڑی ہوئی عادتوں کو دوبارہ اختیار کرنے پر جن دقتوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ سب یک وقت مجھے درپیش تھیں۔ وہاں میں نے دو بڑے کمال کے دوست بنائے۔ ان کے نام میسی اور نسرین تھے اور تعلق ایران سے تھا۔ ان کی وجہ سے مجھے بڑا سہارا ملا۔ میں نے

اپنے اور بچوں کے لیے ڈھیر سارے لباس اور جوتے خریدے اور بڑا اچھا وقت گزارا۔

میرے سننے میں آیا کہ مصطفےٰ کی حالت اب خاصی خستہ ہو چکی ہے۔ آخر کار اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ میرا فیصلہ حتمی ہے۔ وہ اس چڑیا کو دوبارہ پکڑنے کے لیے خاصا بے قرار تھا۔ جو پنجرے سے اڑ گئی تھی لیکن جب اس نے جب مجھے پکڑنا چاہا تو وہ مہارت بھی اس کے کسی کام نہ آ سکی جو وہ ہیزل میر میں کبوتر دبوچنے میں حاصل کر چکا تھا۔ ٹھکرائے ہوئے عاشق کی روایتی شکل صورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے داڑھی بڑھا لی۔ جب وہ دربدر پھر کر میرے دوستوں کو قائل کرنا چاہتا کہ وہ مجھے کسی طرح سمجھا بجھا کر لوٹ آنے پر راضی کریں تو اسے دیکھ کر ترس آتا۔ وہ ہر کسی سے اپنی درماندگی اور خستہ حالی کا ذکر کرتا۔ حد یہ کہ ہمارے مالی تک کے آگے اپنا رونا رویا۔

وہ میری یاد میں روتا رہتا۔ جہاں بھی جاتا آنسو بہانے سے کام تھا۔ وہ بے نظیر علی محمود اور بلو کے سامنے رویا۔ وہ حفیظ پیرزادہ اور میری سہیلی فاطمہ گیلانی اور احمد عبیدی کے سامنے رویا۔ اس امید پر کے شاید ان کے کہنے سے میں اپنا فیصلہ بدل لوں۔ اس نے صبیحہ اور اینڈریو کے ساتھ کتنی ہی طویل راتیں گزاریں اور ان سے مدد چاہی۔ وہ بے تحاشا شراب پینے لگا۔ راہ چلتے اجنبیوں کے آگے اپنی بیوی کا ذکر چھیڑ دیتا جس سے وہ پیار کرتا تھا اور جو اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور جس کے جانے کے بعد وہ بد حواس اور بے حال ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ عاصم سے ملا اور منت کی کہ وہ بیچ بچاؤ کرا دے۔ اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ امی کو فون کیا، رو پڑا اور معافی مانگتا رہا۔ میرے گھر والے اس مخاصمانہ سکوت کو توڑنے پر مجبور ہو گئے جو انہوں نے پانچ سال سے اختیار کر رکھا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے امی کو اپنی چوٹ کھائی ہوئی خودداری کو بالائے طاق رکھنا پڑا۔ مصطفےٰ نے کھانا چھوڑ دیا، کام کرنا چھوڑ دیا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔

وہ ایسے لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جن کے ووٹ فیصلہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔ میرے دوستوں نے فون کرنے شروع کر دیے اور مجھے یقین دلایا کہ وہ بدل چکا ہے۔ میں قائل نہ ہوئی مجھ پر دباؤ ڈالا گیا، گھر والوں کی طرف سے۔ وہ کہنے لگے کہ اور مجھ نہیں تو بچوں کی خاطر نباہ کرنے کی ایک کوشش اور کر دیکھو۔ اس نے اپنی اصلاح کر لی ہے۔ عاصم تک نے مجھ سے صلح صفائی کے امکان کے بارے میں بات کی۔ "اگر وہ بدل گیا ہے تو میرے خیال میں تمہیں ایک موقع اور دینا چاہیے۔ تم اس شادی میں اتنی مار کھا چکی ہو۔ اپنے کیے کرائے کو رائگاں کیوں جانے دیتی ہو؟ سوچو۔ عقل سے کام لو۔ مجھے نظر آنے لگا کہ انہوں نے میری طرف سے آپ سوچنا پھر شروع کر دیا ہے۔ بحالی دلانے کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ اولیت زندگی کے عملی تقاضوں کو

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

حاصل رہتی ہے۔ جذبات کی حیثیت ثانوی ہے۔

امی مجھے چھوڑ کر اس کی طرف دار بن بیٹھیں۔ میں حیران رہ گئی۔ لیکن کان دبائے سنتی رہی۔ کہ وہ کس بے احتیاطی سے معاملے کے اچھے برے پہلوؤں کا موازنہ کر رہی ہیں۔ کہنے لگیں کہ وہ بدل گیا ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے مصطفٰے کو قابل رحم بچے کے روپ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انہیں کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کس تیز رفتاری سے ایک روپ چھوڑ کر دوسرے روپ میں آ جاتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی یہ کایا پلٹ کتنی اثر انگیز اور فریب کارانہ ہے۔ ان باتوں کا انہیں کچھ علم نہ تھا۔ انہیں تو صرف اتنا نظر آ رہا تھا کہ ایک طاقتور شخص ہے۔ جو میرا نام سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ انہوں نے اسے گڑگڑاتے اور عاجزانہ وضع اختیار کرتے دیکھا۔ انہوں نے اسے پشیمان پایا۔ انہوں نے متن تو پڑھ لیا سیاق وسباق پر تفکر نہ کی۔

عاصم نے زیادہ عملی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وکیلوں سے ایک معاہدہ تیار کرنے کو کہا جائے۔ اس معاہدے کی رو سے مجھے یہ حق حاصل ہو گیا کہ اگر میں دوبارہ اسے کبھی چھوڑنا چاہوں۔ تو طلاق لے سکوں گی اور بچے میری تحویل میں رہیں گے۔ اگر مصطفٰے دوبارہ اپنے پرانے روپ میں آ بھی گیا تو یہ معاہدہ میرے تحفظ کی ضمانت ثابت ہو گا۔

جس تعطل سے ہم دوچار تھے۔ یہ اس کا اچھا حل تھا۔ اب میں کسی پر بوجھ نہ رہی تھی۔ مجھے اسی صورت میں واپس جانا تھا جب تمام شرائط کو توڑ مروڑ کر میرے مطلب کا بنایا جا چکا ہو گا۔ مصطفٰے نے آنکھیں میچ کر معاہدے پر دستخط کر دیے۔ وکیل نے خواہ مخواہ ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر کھر، میرے خیال میں دستخط کرنے سے پہلے آپ کو معاہدہ پڑھ لینا چاہیے" "مجھے متن پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر اس دستاویز کی مدد سے تہمینہ میرے پاس آ سکتی ہے تو یہ دستخط کرنے کے قابل ہے۔ میں یہ نہیں جاننا چاہتا کہ مجھے کیا قیمت ادا کرنی ہو گی۔"

میں انگلینڈ لوٹ آئی۔ مصطفٰے مجھے لینے امی کے گھر آیا۔ امی نے بزعم خود غیرت اور روایت کی ترجمان بن کر کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ وہ سمجھ لے کہ تم اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو رہی ہو۔ اس بار یہ بات وہ کبھی نہ بھولے تو بہتر۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اب کی دفعہ اس نے پہلی کی طرح تمہیں راہ جاتی کو نہیں اٹھایا ہے۔ تم کوئی گمورطی ناتھی نہیں ہو۔ تمہارا بھی اپنا گھر ہے۔ جہاں تم واپس آ سکتی ہو۔"

میں اس کے ساتھ رخصت ہوئی۔ میں چاہتی تھی کہ جا کر علی اور بلو، صبیحہ اور اینڈریو، فاطمہ اور عبیدی کا شکریہ ادا کروں۔ وہ سب بہت اچھے دوست ثابت ہوئے تھے۔

مصطفٰے چاہتا تھا کہ وہ ہو اور میں ہوں، کوئی تیسرا نہ ہو۔ میں اس کی خواہش کو سمجھ سکتی تھی۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ ہم ہیزل میر واپس آ گئے۔

مصطفٰے میرے ساتھ اس طرح پیش آیا جیسے میں کوئی ملکہ ہوں۔ ہم اگلی صبح، دوسری بار ہنی مون منانے، پام بیچ پرواز کر گئے۔ ہمارے گردوپیش میں شہر سے دور کی، کھلی فضا کی، رعنائی رچی ہوئی تھی۔ وہاں ماضی کسی طرف سے دخل انداز نہ ہو سکتا تھا کہ ہمارے ارد گرد حسن نے حصار باندھ رکھا تھا۔

مصطفٰے ایسا رام ہو گیا جیسے بھیڑ کا بچہ ہو۔ میرے آگے بولتا نہ تھا۔ صرف ہیں ہیں کرتا رہتا۔ مجھے کبھی انگلی تک نہ ہلانے دیتا۔ صبح کو اٹھتا تو میرے ساتھ اٹھتا، جب میں کھانا کھاتی تو وہ بھی کھا لیتا اور اسی وقت سوتا جب میں سونا چاہتی۔ ہم نے اپنے اپنے رول اول بدل لیے تھے۔ ہم ساحل پر شمعوں کی چھاؤں میں رومانی ڈنر تناول کرتے اور سمندر کی جھاگ بھری لہریں بل کھاتی آتیں۔ اور میرے خدشات کو بہا لے جاتیں۔

ہم خریداری کرتے پھرتے۔ مصطفٰے کو شاپنگ پر ساتھ لے جانا کبھی خوشگوار ثابت نہ ہوتا تھا کہ اس پر تمام وقت جھلاہٹ طاری رہتی تھی۔ بہر حال، اس بار وہ کسی زن مرید شوہر کی طرح میرے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ جب وہ تھک جاتا تو بڑے بڑے ڈیپار ٹمنٹل سٹوروں کے بڑے دروازے کے آگے زمین پر بیٹھ جاتا اور ان تمام پچھلے بلوں کے نتیجے جو میں مختلف کاؤنٹروں پر بول چکی ہوتی تھی۔ پیکٹوں کی صورت میں اس کے ارد گرد بکھرے نظر آتے وہ ہمدرد گاہکوں سے ہنسی مذاق کرتا جو اسے کوئی مثالی شوہر سمجھ بیٹھتے۔ "کتنے اچھے ہیں آپ" وہ کہتے مصطفٰے مسکراتا۔ "ملاحظہ فرمایئے یہ سب کچھ میرا جیسا شوہر اسے اور کہاں مل سکتا ہے۔"

اب وہ رومانی ہیرو کا کردار ادا کر رہا تھا۔ المیہ ہیرو قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ بد قسمتی سے اسے محبت کا جواب محبت سے نہ مل سکا۔ میں اس کی طرف سے چوکنی رہتی میں اس کے جذبات کا جواب نہ دے سکی۔ میں اب بھی دکھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دن اب کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے جب میں سادہ لوحی کی بنا پر ہر بات پر یقین کر لیتی تھی۔ مجھے اب مصطفٰے کھر سے محبت نہ رہی تھی۔ موجودہ صورت حال تو ایک سراب کے سوا کچھ نہ تھی جسے اس نے گویا کسی افسوں کے زور سے، ہماری زندگیوں کے صحرا میں برپا کر دیا تھا۔ یہ شعبدہ بازی تھی۔ ذہنی نیرنگ تھا میں اس کی روادار بھی نہ تھی کہ وہ مجھے چھو ہی لے۔ میں باتیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کی سیاست پر فریفتہ تھی۔ ہمارے درمیان ایک ہی جان دار رشتہ باقی رہ گیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ ہم پاکستان لوٹ چلیں۔ میں چشم تصور سے سب کچھ دیکھتی۔ ذہن میں منصوبے بناتی کہ اپنے اس مکان میں، جسے فوج نے ضبط کر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

لیا تھا، رنگوں کی کون سی سکیم برتوں گی، اس کی کس طرح زیبائش کروں گی۔ میں واپس جا کر اسے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا حلیہ بدل سکوں۔ وہ مکان میرے لیے وطن بن گیا اور اس کی اندرونی زیبائش میری سیاست۔

اسے میں نے صرف اتنی چھوٹ دی کہ وہ میرا ہاتھ تھام لیا کرے۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کرنے دیا۔ میں نہیں چاہتی تھی۔ کہ وہ مجھ سے عشق کا اظہار کرے۔ یہ اظہار مجھے کھوکھلا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے ماضی میں بے شمار باتیں ایسی تھیں۔ جن سے اس کے دعووں کی بالکل نفی ہو جاتی تھی۔ میں اس کی عشقیہ پیش دستیوں سے بدکتی رہتی۔ اس کی رومانی سلسلہ جنبانیوں سے مجھے وحشت ہوتی۔

پام بیچ سے ہم بوسٹن گئے جہاں ہم نے منو کے پاس قیام جس کی علی حبیب سے شادی ہو چکی تھی۔ ان کے ساتھ خوب مزے رہے۔ ہمارے لڑائی جھگڑے بالکل ختم ہو چکے تھے۔ منو کو بڑی خوش گوار حیرت ہوئی۔ میں پرسکون تھی اور اس کی بدمزاجی کا نام ونشان نہ رہا تھا۔ مصطفےٰ خلیق اور شائستہ بن چکا تھا اور اس نے گالیاں بکنی چھوڑ دی تھیں۔ وہ میری ٹانگیں اور سر دباتا۔ میری گرم پانی کی بوتل بھر لاتا۔ شیر سہمے سہمے بلونگڑے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

ہم لندن واپس آ گئے۔ میری نانی اماں پاکستان سے ہمارے پاس رہنے کے لیے آئیں۔ انہیں اپنے ہاں ٹھہرا کر مجھے بڑا لطف آیا۔ مصطفےٰ ان کی دیکھ بھال کرتا رہا مجھے بالآخر اپنے گھر میں خوش دیکھ کر انہیں بڑی تسکین حاصل ہوئی۔ کہنے لگیں۔ کہ انکی دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔

میں نے گھر میں ساؤنا باتھ لگوا لیا۔ میں محبت میں گرفتار تو نہ تھی مگر خود کو محفوظ محسوس کرتی تھی۔ میں مطمئن تھی۔ مصطفےٰ پر نئے اقرار نامے پر مہر تصدیق ثبت کرنے کا بھوت سوار ہو گیا وہ چاہنے لگا کہ میں اس کے ایک اور بچے کی ماں بنوں۔

مجھے یقین تھا کہ میرے سب حمل کسی کی بد دعا کے زیر اثر تھے۔ میں جب بھی حاملہ ہوتی مجھے انتہائی روح فرسا تجربات سے گزرنا پڑتا۔ کوئی حمل ایسا نہ تھا جو ڈراؤنے خواب سے کم ہو۔ مصطفےٰ نے منت سماجت کی، میرے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اسے ایک آخری موقع دیا جائے۔ ہماری ازدواجی زندگی کے اس دور میں پیدا ہونے والا بچہ بہت خاص ثابت ہو گا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ایک نارمل اور پرمسرت حمل کے تجربے سے گزروں۔ اس نے وعدہ کیا کہ میری ناز برداری کرے گا اور میرا ہر الٹا سیدھا حکم بجا لائے گا۔ مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا میں ان تمام بحرانی کیفیتوں کو کسی طور فراموش نہ کر سکتی تھی۔ جو بظاہر صرف اس وقت سر اٹھاتی تھیں جب مجھے حمل ٹھہرا ہوا ہو۔ مجھے جرم و سزا پر

یقین تھا۔ میں نے ایک حاملہ عورت کو دکھ پہنچایا تھا۔ مصطفےٰ کی بیوی، شیری کو، خدا نے مجھے معاف نہیں کیا۔ خدا نے ایسا بندوبست کیا کہ میں اس بات کو کبھی بھولنے نہ پائی۔ جب بھی میرے رحم میں کوئی بیج پرورش پانے لگتا خدا مجھے انتہائی کڑی ازمائشوں میں ڈال دیتا۔ شیریں جب میرے ہاتھوں اپنے شوہر سے محروم ہوئی تھی تو اس کا ساتواں مہینہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی درد بھری فریاد خدا نے سن لی ہو گی۔ ہر بار جب میں حاملہ ہوتی اس کی بددعا مجھے لگ جاتی۔

مصطفےٰ شیری کی بددعا کے آسیب کو میرے سر سے اتار دینا چاہتا تھا۔ میرے خیال میں عدیلہ کا بار بار منظر پر نمودار ہونا محض اتفاق نہ تھا۔ ہر بار مجھے دکھ جھیلنا اور کفارہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ مصطفےٰ کا اڑیل پن کام دکھا گیا۔ میں کمزور پڑ گئی مجھے پھر حمل ٹھہر گیا۔ میں پھندے میں پھنس چکی تھی۔

ایک حیرت ناک بات ہوئی جونہی میں نے اسے بتایا کہ میرے تمام طبی ٹیسٹ مثبت نکلے ہیں جن سے میرا حاملہ ہونا ثابت ہے اس کا رویہ یک لخت تبدیل ہو گیا۔ میں نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ وہ مجھے اس مقام پر لے آیا تھا جہاں لانا چاہتا تھا۔ میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔ جو راس رچائی جارہی تھی وہ ختم ہوئی۔ نقاب جھر سے پھاڑ کر اتار پھینکا گیا۔ اب جب کہ اس کا بچہ میرے پیٹ میں پل رہا تھا۔ میں کہیں بھی نہیں جا سکتی تھی۔ میں عاصم اور اپنے والدین کے سامنے اپنے حماقت کی کیا وضاحت پیش کروں گی۔ میں اس حالت میں کہاں جاؤں گی کہ ایک بچہ پیٹ میں ہو اور تین بانہوں میں۔ اس نے مجھے پھر جوت لیا تھا۔ میں *میڈیا نہیں تھی۔ میرے سینے میں دل تھا۔

اس نے پھر اس نامعقول انداز میں خواہ مخواہ لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ وہ گالیاں دینے پر اتر آیا گرداب میں پھر ابال آنے لگا۔ میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ جس معاہدے پر اس نے دستخط کیے تھے وہ اس کے حوالے کر دیا جائے میں نے انکار کر دیا۔ اس کی پاداش میں مجھے اپنے دوستوں سے ملنے ملانے سے روک دیا گیا۔ علی اور بلو، صبیحہ اور اینڈریو میرے لیے ناپسندیدہ شخصیتیں بن کر رہ گئے۔ جنھوں نے برے وقت میں میرا ساتھ دیا تھا وہ ان سب کی بوٹیاں نوچنے پر تلا ہوا تھا۔ بددعا پھر اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ مجھے ہراساں دیکھ کر مصطفےٰ کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ میرے اندیشوں کو اور ہوا دینے لگا۔ "تم جب بھی حاملہ ہو گی تمہیں بددعا لگ جائے گی۔ تم ٹھیک

---

* یونانی اساطیر میں ایک شہزادی جس نے شوہر سے ان بن کے بعد بچوں کو مار ڈالا تھا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہی کہتی تھیں۔ یہ اس بددعا کی طاقت کا ایک اور نمونہ ہے۔ تمہیں اپنی غلط کاریوں کی سزا بھگتنی ہو گی۔"

دھیرے دھیرے میری وہی پرانی حالت عود کر آئی میں پھر سے کوئی ٹس، بے حس چیز بنتی جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر مصطفےٰ بہت مطمئن اور محظوظ ہوا۔ اس نے ہالینڈ پارک میں ایک فلیٹ خریدا یہ ہماری مشترکہ ملکیت تھا۔ اس کی اس حرکت سے انتشار کی کیفیت دو چند ہو گئی۔ اس بارے میں پہلے سے کچھ کہنا ناممکن تھا کہ یہ شخص کیا کرے گا، کیا نہیں کرے گا۔ اس بے یقینی کی وجہ سے میں دوبارہ پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارا زیادہ سے زیادہ وقت فلیٹ میں گزرنے لگا جہاں ہم بظاہر اس کی سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔

جب میرا بیٹا حمزہ پیدا ہوا اور مصطفےٰ میرے پاس تھا۔ میرا قیام لندن میں تھا۔ حمزہ کی پیدائش کے دو دن بعد مصطفےٰ کو ملک سے باہر جانا تھا۔ وہ ایک ایسی جگہ جا رہا تھا۔ جہاں بہت گرمی پڑتی تھی۔ اسے ٹھنڈے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے کپڑوں کا انتخاب مجھے کرنا تھا۔ یہ حمزہ کے پیدا ہونے کے ایک دن بعد کی بات ہے۔

کسل مند ہونے کے باوجود اس کے لیے کپڑے خریدنے لبرٹی گئی جتنی دیر اس نے ملک سے باہر رہنا تھا اتنے عرصے کے لیے میرے گھر سے باہر جانے پر قدغن لگا دی گئی۔ مجھے امی کے گھر جانے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ "اگر تم وہاں گئیں تو تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔" مجھے ایک بار پھر الگ تھلگ کیا جا رہا تھا، ڈرایا دھمکایا جا رہا تھا۔

عدیلہ دوبارہ میری زندگی میں داخل ہوئی اور اس بار تبدیلی یہ آئی کہ اس کی آمد خوشی کے موقع کے حوالے سے تھی۔ اس کی مطلوب سے شادی ہو گئی۔ جو بہاولپور کا ایک جاگیردار تھا۔ وہ دلکش اور نفیس شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اور عدیلہ دونوں ایک دوسرے پر دیوانہ وار فریفتہ تھے۔

میں نے اس کا جہیز تیار کرنے میں امی کی مدد کی۔ میں نے اس کا تمام فرنیچر چننے اور پاکستان بھجوانے میں ہاتھ بٹایا۔ حاملہ ہونے کے باوجود سامان روانہ کرنے والوں کے پاس گھنٹوں یہ اطمینان کرنے کے لیے کھڑی رہی کہ تمام چیزیں ٹھیک حالت میں اور حفاظت سے بھجوائی جا رہی ہیں۔ اس کے گھر کا سارا سامان لندن سے پاکستان ہوائی جہاز کے ذریعے بھجوایا گیا۔

میں نے فون پر اس سے اس وقت بات کی جب وہ والدین کے گھر سے دلہن بن کر رخصت ہونے والی تھی۔ ہم دونوں رونے لگیں۔ دو کشتۂ ستم ایک شادی کا نشانہ بنی، دوسری بہیمانہ ہوس کا شکار ہوئی۔ میں نے دعا کی کہ اس کی زندگی خوشیوں سے عبارت

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہو۔ "میری تمنا ہے کہ تمہاری شادی اتنی ہی کامیاب ہو جتنی کامیاب میں اپنی شادی کو دیکھنا چاہتی تھی میری تمنا ہے تمہاری ازدواجی زندگی میں دکھ کا کوئی لمحہ نہ آئے۔ میری تمنا ہے کہ تمہیں وہ سب کچھ نصیب ہو جس کی زندگی میں مجھے حسرت رہی۔"

میں فون نیچے رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔ یہ وہی فون تھا جس نے مجھے اتنا دکھ پہنچایا تھا۔ مجھے امید تھی کہ یہ ہمیشہ کے لیے اپنی ٹیکن پر آرام سے دھرا رہے گا۔ اسی فون کی بدولت کئی سال بعد عدیلہ کو زک اٹھانی پڑی۔

حمزہ کی ولادت کے بعد مطلوب اور اس کی نئی نویلی دلہن لندن آئے۔ مصطفےٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ میں اپنے طور پر مطلوب سے ملوں۔ مجھے یہ بات بہت ناگوار لگی۔ میں نے بحث کی۔ اس نے میری دلیل رد کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس سے نہیں مل سکتیں۔ وہ میرے علاقے کا جاگیردار ہے۔ اگر میں اس کی بیوی سے نہیں مل سکتا تو وہ بھی میری بیوی سے نہیں مل سکتا" "تم تو کسی وجہ سے اس کی بیوی سے ملنا نہیں چاہتے۔ وہ کس وجہ سے نہ ملے؟" خاموشی۔ لیکن بحث میں میرا پلڑا بھاری رہنے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ مجھے حکم دیا جا چکا تھا۔

مصطفےٰ معاہدے کے کاغذات حاصل کرنے کے لیے مجھے دق کرتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے کسی قسم کا تحفظ حاصل نہ رہے۔ وہ ہر وقت مجھ سے کاغذات کے بارے میں جھگڑتا رہتا۔ "مصطفےٰ اگر تمہیں شرائط سے اتفاق نہیں تھا تو تمہیں ان کاغذات پر دستخط کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم نے غیر ذمے داری کا ثبوت دیا۔ اب نتائج خود بھگتو۔ میں عاصم سے کاغذات نہیں مانگ سکتی۔ اس کی نظر میں تمہارا کوئی احترام نہ رہے گا۔" اس نے مجھے تھپڑ رسید کیا۔ فلیٹ جا کر اس نے وکیل سے فون پر کہا کہ کاغذات اسے بھجوا دیے جائیں۔ "میری بیوی معاہدے کی تنسیخ پر آمادہ ہو گئی ہے۔ کیا آپ ہمیں ایسا ڈرافٹ بھجوا سکتے ہیں جس میں یہ صراحت کر دی گئی ہو کہ معاہدہ منسوخ ہو چکا ہے۔ وہ اس پر دستخط کر دے گی۔" وکیل نے کہا کہ وہ ایسا ہی کرے گا اور نیا معاہدہ اگلی صبح ڈاک سے بھجوا دیا جائے گا۔ مصطفےٰ نے کہا کہ اگر میں نے معاہدے کو منسوخ نہ کیا تو وہ مجھے جسمانی گزند پہنچائے گا۔

میں ڈاک کی منتظر تھی۔ میں نے معاہدہ وصول کیا۔ گھر جا کر بچوں کو لیا اس بار چاروں بچوں اور منو کے ساتھ، جو کار چلا رہی تھی، ہم امی کے ہاں چلے گئے۔

بظاہر مصطفےٰ جب گھر لوٹا اور اسے پتہ چلا کہ ہم سب جا چکے ہیں تو وہ رونے لگا۔ امی نے مجھے واپس جانے پر راغب کرنا چاہا۔ مصطفےٰ نے پھر ان سے بات چیت شروع کر دی اور اس بار کہا کہ میری دماغی حالت درست نہیں اور میرے کردار پر بھی ناشائستہ الزام

لگائے۔ میں نے امی پر واضح کر دیا کہ میں اب مصطفے کے وعدوں پر ہرگز یقین نہیں کر سکتی۔ مجھے بہت بار ڈسا جا چکا تھا۔

میں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ میرے بچوں کو عدالت کی تحویل میں دے دیا گیا۔

باب-۴

سیاسی حیوان

1977ء تا 1986ء

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مصطفے کھر نرا حیوان نہیں تھا۔ سب سے پہلے اور نمایاں طور پر وہ سیاسی حیوان تھا۔ جن دنوں وہ مجھے دھنتا اور مجھ پر دھونس جماتا رہتا تھا ان دنوں اصل میں انتہائی سنجیدہ سیاسی کاموں میں مصروف تھا۔ اس کی گھریلو زندگی تو اس تماشے کا ذرا سا ضمیمہ تھی جو بہت بڑی سٹیج پر کھیلا جا رہا تھا۔ اس کے جوہر اس وقت کھلتے جب وہ اتحاد قائم کرنے یا توڑنے، سازشیں کرنے، منصوبے گھڑنے اور بات کو شک کی نظر سے دیکھنے والوں کو بہلا پھسلا کر ہم خیال بنانے میں مشغول ہوتا۔ اپنی پیچ در پیچ سازشوں کی مدد سے وہ جلاوطنوں کی سیاست کے جنگل سے صحیح سلامت نکل آیا جہاں سیاسی رہنماؤں اور اقدام پسندوں کو اپنی قربانیوں اور اہمیت کے حوالے سے اس مغالطے میں مبتلا ہوتے دیر نہ لگتی کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔ مصطفے سدا سے اس کا قائل تھا کہ ہر کام کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہونا چاہیے، ورنہ اسے کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ اب اس نے حقیقت پسندی کا رشتہ ایک ورثن کے ساتھ جوڑنا شروع کیا۔ اسے اپنی اہمیت پر پختہ یقین تھا اور سمجھتا تھا کہ تمام جلاوطنوں میں صرف وہی ایسا ہے جو غاصب کا تختہ الٹنے کی جدوجہد کی قیادت کر سکتا ہے۔ جس سیاسی جماعت کی اس نے داغ بیل ڈالی تھی، جسے چھوڑ دیا تھا اور جس میں دوبارہ شرکت اختیار کر لی تھی۔ وہ جمود کا شکار ہو چکی تھی۔ مصطفے کو یہ بڑا کمال کا موقع ہاتھ آیا تھا وہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

چن کر پارٹی کو اپنی مرضی کے مطابق نئی شکل دے سکتا تھا۔

جس انداز سے ہم نے پاکستان چھوڑا تھا اس پر میں ناخوش تھی۔ حکمران ٹولے کے دو سینئر رکن، جنرل فیض علی چشتی اور جنرل راؤفرمان علی مصطفٰے پر مائل بہ کرم تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ مصطفٰے نے اپنی جان بچانے کے لیے سودا کیا ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ لندن سے چند ایسی دستاویزات لے آئے گا جن کی مدد سے بھٹو صاحب کو ملزم ٹھہرایا جا سکے گا۔ جنرلوں نے اسے بھروسے کے قابل سمجھا۔ یہ بات بجائے خود کلنک کا ایسا ٹیکا ہے جو مصطفٰے کے ماتھے پر ساری عمر لگا رہے گا۔

مصطفٰے نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا کہ اس کے اور جنرلوں کے درمیان کیا سودا ہوا ہے۔ مجھے بس اتنا علم تھا کہ دستاویزات لے کر ہمیں اسی سال نومبر میں پاکستان لوٹنا تھا۔ یہ بے وفائی میری سمجھ سے باہر تھی۔ بھٹو صاحب اور مصطفٰے میں اختلافات رہے تھے لیکن ان کو دور کیا جا چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر بھٹو صاحب کا قابل اعتماد ساتھی بن چکا تھا۔ لیکن اب جس وقت اس کا قائد اپنی زندگی کی خاطر ایک بے لحاظ حکومت سے جنگ لڑ رہا تھا مصطفٰے بظاہر جلادوں کے ساتھ کسی سازش میں ملوث ہو چکا تھا۔ کیا وہ واقعی کمزور طبیعت کا مالک اور سیاسی طور پر بے اصول آدمی تھا؟ میرے شبہات کا مصطفٰے کے پاس ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا۔ "آنے والا وقت بتائے گا۔" اور یہ جواب بہت معنی خیز، بہت چست اور ڈپلومیٹک انداز میں ذو معنی تھا۔

میں محسوس کر سکتی تھی کہ مصطفٰے بے چین ہے۔ وہ ایک دبدھے سے دست و گریباں تھا۔ وہ جنرلوں کے چنگل سے نکل چکا تھا ایک اجنبی ملک میں بے یارومددگار پڑا تھا۔ اس کی جیب خالی تھی۔ اس کے باوجود اسے لگتا تھا کہ یہ سب حالات بدل سکتے ہیں۔ اسے ایک بہت اہم اور کڑا فیصلہ کرنا تھا۔ اگر وہ وعدے کے مطابق پاکستان نہ لوٹا تو جنرل بڑے جھلائیں گے۔ وہ انہیں زبان دے کر آیا تھا۔ اگر وہ انگلستان میں ٹھہرا رہا اور اعلان کر دیا کہ وہ بھٹو کا حامی ہے تو پارٹی کے ملک سے باہر مقیم اقدام پسند اس کی طرف کھینچے چلے آئیں گے اور اسے سربلند کر کے اپنا قائد مان لیں گے۔ اسے پورا یقین تھا کہ آفت میں گرفتار وزیراعظم کے یہ پرستار اسے مالی طور پر بھی سہارا دیں گے۔ جو ادھر یا اُدھر قسم کا کڑا فیصلہ وہ کرے گا۔ اسی کو مدنظر رکھ کر تاریخ اسے اچھا یا بُرا قرار دے گی، غدار یا ہیرو؟۔ مصطفٰے نے ذہن میں سکہ اچھالا چند کی نظر میں غدار، عوام کی نظر میں ہیرو۔ اس نے لندن رک جانے کا فیصلہ کیا۔

اس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اسے انجام دینا آسان نہ تھا۔ اپنے ماضی کی وجہ سے مصطفٰے کی شخصیت کو داغ لگ چکا تھا۔ پیپلزپارٹی کے وہ افراد، جو سخت پالیسی اپنانے

کے حق میں تھے، اسے شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہیں یاد تھا کہ اس نے ان کے عظیم قائد کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے خیال میں وہ بہت نمود طلب اور احسان اموش تھا۔ جس انداز میں اس نے پاکستان چھوڑا تھا اس کے پیش نظر انہیں اس کی نیت پر بھی شبہ تھا۔ اپنی تاریخ کے اس دور میں پیپلزپارٹی والوں کو ہر شخص پر چھپے دشمن کا گمان ہوتا تھا۔ انہیں ہر طرف مخبر نظر آتے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ ان کی صفوں میں حکومت نے اپنے آدمی داخل کر دیے ہیں۔ مصطفٰے کا دفتر عمل بے داغ نہ تھا۔ جنرلوں نے اس کے پاکستان سے فرار کے وقت اغماض سے کام لیا تھا۔

مصطفٰے نے فیصلہ کیا کہ وہ شک اور شبے کی اس فضا کے خلاف جدوجہد کرے گا۔ میں نے اس کے موقف کو سراہا۔ میں نے کہا کہ وطن لوٹ کر سرکاری گواہ بننے سے بہتر ہے کہ ہم ملکوں ملکوں مارے پھریں اور روکھی سوکھی پر گزارا کریں۔ بھٹو صاحب اس کے قائد تھے۔ وہ جو بھی تھا انہیں کی وجہ سے تھا۔ اسے یہودا کا کردار ادا نہیں کرنا چاہیے۔ میری بھٹو صاحب سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی لیکن میں انہیں ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھتی تھی۔ مصطفٰے ان کا ذکر نہایت جوشیلے انداز میں کرتا رہا تھا۔ وہ میرے قائد کے قائد تھے۔

مصطفٰے جنرل چشتی کو فون کرتے ہوئے گھبرایا گھبرایا سا تھا۔ وہ جنرل کو دو ٹوک انداز میں یہ نہ بتا پایا کہ وہ کیا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس نے واپس کی مقررہ تاریخ میں توسیع کی آڑ لی۔ کہنے لگا کہ وہ دو مہینے میں قطعی طور پر لوٹ آئے گا۔ مصطفٰے اپنی کشتیاں جلانے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ پہلے ہوا کا رخ دیکھنا چاہتا تھا۔ صورت حال کے بارے میں وہ غیر یقینی کا شکار تھا۔

جیسے جیسے جنوری کا مہینہ قریب آیا مصطفٰے کو بھی وہی مرض لاگو ہو گیا جو جلاوطنوں میں عام ہے یعنی مزمن رجائیت۔ اس نے مجھے بتایا کہ جنرل ضیا کے دن گنے جا چکے ہیں۔ "وہ چھ مہینے سے زیادہ نہیں نکال پائے گا۔ دیکھ لینا"

ان نو برسوں میں جو ہم نے جلاوطنی میں گزارے اپنا یہ انداز اس نے اتنی بار دہرایا کہ سن سن کر کراہت آنے لگی۔ اس نے جرنل کو مطلع کر دیا کہ وہ واپس آنے کا آرادہ نہیں رکھتا۔

مصطفٰے نے ذوالفقار علی بھٹو کو بچانے کے لیے ملک سے باہر مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم کی ابتدا اور پاکستان میں مقدمے کی ابتدا ایک ہی وقت میں ہوئی۔ مقدمہ جس میں ذرا ذرا سی باتوں پر گرفت کر کے فیصلہ سنایا گیا اور جو عدالتی قتل کی صورت میں اختتام کو پہنچا۔

بھٹو کا بڑا بیٹا، میر مرتضٰے بھٹو، آکسفورڈ میں تھا۔ مصطفٰے نے اس سے رابطہ قائم کیا اور اسے آکسفورڈ چھوڑ کر لندن چلے آنے پر راضی کر لیا۔ مصطفٰے نے اسے فوجی حکومت کے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

خلاف پیپلزپارٹی کی مزاحمت کی علامت کے طور پر پیش کیا۔ اس نوجوان طالب علم کو سیاست کے فن کی اونچ نیچ سمجھانی شروع کی۔ مرتضے تھا تو مبتدی لیکن بڑی تیزی سے سبق سیکھنے لگا۔ وہ ہمیشہ اپنی بہن بے نظیر کے سائے میں رہتا تھا۔ جو بھٹو کے ترکے کی وارث تھی۔ مرتضے دل ہی دل میں بہن کی بالادستی سے خار کھاتا تھا اور بھٹو صاحب کی نظر میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے بہت بے چین تھا۔ میر مرتضے کو بھی، مصطفے ہی کی طرح کسی ایسے مقام کی تلاش تھی جس پر فائز ہو کر وہ اپنے جوہر دکھا سکے۔ ان دونوں کے ملاپ سے پیپلزپارٹی کے حوصلہ ہارے ہوئے اقدام پسندوں کو امید کی نئی کرن نظر آئی۔ مصطفے کے متانت آمیز رویے سے مرتضے کی تند خوئی میں اعتدال پیدا ہوا۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اگر مصطفے کو مرتضے کے ذہن کو کچھ عرصہ اور قابو میں رکھنے کا موقع مل جاتا تو اس کے انقلابی جوش وخروش کا رخ صحیح سمت میں موڑا جا سکتا تھا۔ جب اسے تنہا چھوڑ دیا گیا تو میر بھٹک کر سیاست کی سر بستہ گلی میں جا نکلا۔ جس میدان میں وہ غلبہ حاصل کر سکتا تھا اسے اپنی بہن کے لیے خالی چھوڑ دیا۔

مصطفے میر مرتضے کی خامیوں سے آگاہ تھا۔ بھٹو صاحب سمجھتے تھے کہ میر میں سیاسی کیریر اختیار کرنے کا کوئی رجحان موجود نہیں۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اس میں اتنی اہلیت نہیں کہ ان کی زندگی بچانے کے لیے کوئی تحریک چلا سکے۔ بھٹو صاحب کے ان خیالات کا مصطفے کو بھی علم تھا اور میر کو بھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کا سہارا لے کر اپنا اپنا کام نکالنا چاہا۔ بھٹو کے بیٹے کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے مصطفے کی ساکھ میں اضافہ ہوا۔ ادھر میر نے اس شخص سے سیاست کے گر سیکھنے شروع کیے جسے اس کے والد نے ایک بار برسرِعام اپنا جانشین قرار دیا تھا۔

بھٹو صاحب نے بہت سے عالمی رہنماؤں سے ذاتی سطح پر تعلقات استوار کیے تھے۔ اقتدار سے محروم ہو جانے کے باوجود ان تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اقتدار پر مبنی سیاست میں ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن خیال رہے کہ بھٹو صاحب کوئی معمولی شخص نہ تھے۔ مصطفے اور میر نے فیصلہ کیا کہ ان رہنماؤں سے ملنا چاہیے۔ ان کے مشن کا مقصد یہ تھا کہ ان رہنماؤں کو قائل کیا جائے۔ کہ وہ بھٹو صاحب کی جان بچانے کے لیے تگ ودو کریں۔ مصطفے کو یقین تھا کہ جنرل بین الاقوامی دباؤ کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ بھٹو صاحب کے دوست جلاوطنوں کو مالی امداد فراہم کریں گے۔ اور اس طرح بھٹو صاحب کی رہائی کے لیے جانے والی تحریک کا زور ٹوٹنے نہ دیں گے۔

میر اور مصطفے لیبیا جا کر قذافی سے ملے۔ بھٹو صاحب نے اس "مغربی دنیا کے اچھوت" کو بڑی عزت بخشی تھی۔ لاہور میں ایک سٹیڈیم اب تک قذافی کے نام سے

موسوم ہے۔ قذافی نے وفادار دوست ہونے کا ثبوت دیا۔ اس نے میر کو مہم چلانے کے لیے فنڈ فراہم کیا۔ متحدہ عرب امارات کے شیخ زید بن سلطان کی طرف سے بھی مالی مدد موصول ہوئی۔ میر اور مصطفے حافظ الاسد اور الجزائر کے بومدین سے بھی ملے جنھوں نے وعدہ کیا، کہ ضیا کی حکومت پر دباؤ ڈالتے رہیں گے۔

فنڈز وصول ہو گئے۔ نوجوان اور آدرش پسند شاہنواز بھٹو بھی آ پہنچا جس کے چہرے پر کسی انقلابی کی کھوئی کھوئی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ بھی ہمارے پاس ٹک گیا۔ مصطفے لینن کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کی کروپس کایا (لینن کی بیوی) بڑی حد تک ان تمام معاملات سے دور دور رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ تینوں انقلابیوں کے تعلقات میں بدمزگی پیدا ہو چلی ہے۔ روپیے نے آتے ہی نحوست پھیلائی اور فساد ڈلوا کر چھوڑا۔

ان کے دورے جاری رہے۔ وہ یاسر عرفات سے ملے اور اس کی تائید حاصل کی گئی۔ مصطفے آزمودہ کار مہم جو تھا۔ وہ اخفا اور راز داری میں یقین رکھتا تھا۔ اس کے برعکس میر اور شاہنواز کو بڑی جلد جوش آ جاتا تھا۔ ان سے بعید نہ تھا کہ کوئی غیر محتاط حرکت کر بیٹھیں۔

مصطفے نے سازشی لہجے میں‌ ہمیں مطلع کیا کہ یاسر عرفات نے بھٹو صاحب کو چھڑانے کا پلان تیار کر لیا ہے۔ فلسطینی کمانڈو پاکستان بھیجے جائیں گے۔ وہ راولپنڈی جیل پر حملہ کریں گے۔ اور جب لوگوں کی توجہ بٹ جائے گی تو بھٹو صاحب کو کوٹھری سے نکال کر لے جائیں گے۔ ایک اور دوست ملک کا طیارہ، بظاہر کسی وی آئی پی کو لے کر، چکلالہ کے ہوائی اڈے پر منتظر کھڑا ہو گا۔ بھٹو صاحب کو اس پر سوار کرا کے ملک سے باہر پہنچا دیا جائے گا۔ ان کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ رہے گا۔ وہ جلد ہی ہم سے آ ملیں گے۔ تاکہ ضیا کی ظالمانہ حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھ سکیں ایسی باتیں سن کر خوشی سے اچھلنے کو جی چاہتا تھا۔

جوش کے مارے میر کو خود پر قابو نہ رہا۔ اس نے کراچی اپنی بہن بے نظیر کو فون کیا اور فون پر، لہک لہک کر باتیں کرتے ہوئے، منصوبے کی تفصیلات ظاہر کر دیں۔ بے نظیر نے کرید کرید کر سوال کیے۔ میر نے مزید تفصیلات سے پردہ اٹھایا، فوج ان کی باتیں سن رہی تھی۔ سترکلفٹن کا کوئی فون ایسا نہ تھا جسے انٹیلی جنس کی تمام ایجنسیوں نے ٹیپ نہ کر رکھا ہو۔

سننے میں آیا ہے کہ اس نامراد فون کال نے بھٹو صاحب کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ غصے کے مارے مصطفے پیلا ہو گیا۔ میرے بیڈروم کی خلوت میں اس نے مجھے بتایا کہ میر اور بے نظیر کے بارے میں اس کی ٹھیک ٹھیک کیا رائے ہے۔ "یہ دونوں پرلے درجے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے گاؤدی ہیں۔ اس قدر بے عقلی کی حرکت کرنے ں انہیں کیا سوجھی۔ انہوں نے اپنی بچگانہ حرکت سے سارا منصوبہ چوپٹ کر دیا۔" اس رتے میر کے ساتھ کسی رورعایت سے کام نہ لیا اور صاف صاف بتا دیا کہ اس طفلانہ حرکت کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔ اس نے میر کو یہ بھی بتا دیا کہ اس کے کیے کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔

بھٹو صاحب کو بچانے کا منصوبہ رفت گزشت ہوا۔ قیدخانہ یکایک چھوٹے سے قلعے میں تبدیل ہو گیا۔ پہرے داروں کی تعداد بڑھا دی ں۔ دائیں بازو کی جماعت اسلامی کے پیکار طلب بازو سے تعلق رکھنے والے افراد نے آ کر سیل کا کنٹرول سنبھال لیا۔ نہ کمانڈو آئے نہ چکلالہ کے ہوائی اڈے پر کوئی طیارہ کھڑا نظر آیا۔ بھٹو صاحب کے گرد پھندا تنگ ہوتا چلا گیا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ اگر وہ فون نہ کیا جاتا تو انہیں بچایا جا سکتا تھا۔ آخرکار وہی پھندا پھانسی کا پھندا بن کر ان کے گلے میں پڑا۔

روپیہ دھڑا دھڑا ہمارے پاس رہا تھا۔ مجھے اک بریف کیس یاد ہے جو آغا حسن عابدی کی معرفت ہمیں ملا تھا۔ اس میں پچاس ہزار پاونڈ تھے۔ یہ رقم امی کے سیف میں رکھوا دی گئی۔ استاد اور شاگرد کے درمیان کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ مرتضےٰ زیادہ پُراعتماد نظر آنے لگا تھا وہ اپنے رابطے قائم کر چکا تھا اور مصطفےٰ سے جان چھڑانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ میر کو اپنی اہمیت کا علم تھا۔ وہ بھٹو خاندان کا فرد تھا۔ یہ خاندانی نام اس کی ساکھ کا ضامن تھا۔ نام کیا تھا چھومنتر تھا۔ اِدھر نام لیا نہیں، اُدھر کام ہوا نہیں۔ اسے یہ پسند نہ تھا کہ روز افزوں شہرت کے اس راستے پر وہ مصطفےٰ کو ساتھ لے کر چلے اور پھر یہ بھی ہے کہ مصطفےٰ کا طرزِعمل اسے شاید ضرورت سے زیادہ محتاط اور دقیانوسی معلوم ہوتا تھا۔

نوجوان مرتضےٰ اور شاہنواز کو جو نئی نئی اہمیت ملی اور دولت ہاتھ آئی تو ان کے عیش ہو گئے۔ وہ اپنی امیج پر آپ ہی ریجھ گئے۔ وہ بہت نوجوان تھے اور نوجوانوں کی رسائی اگر اچانک عورتوں اور تیز رفتار زندگی تک ہو جائے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ انہیں ایسے سیاست داں سمجھا گیا۔ جو اپنے والد کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلا لینے میدان میں اترے ہیں۔ اس بنا پر لوگ جوق درجوق ان کی طرف کھنچے چلے آئے لیکن یہ مقناطیسیت ان آسانی سے بھرے میں آ جانے والے بیڈروم انقلابیوں کے حق میں زہرِ قاتل ثابت ہوئی۔ ان کی زندگی کا پورا اسلوب بدل گیا۔ وہی انقلاب قابل قبول ٹھہرا جس کی باگ ڈور جیٹ طیاروں پر ملکوں ملکوں سفر کرنے والے امیر کبیر حضرات کے ہاتھ میں ہو۔ جھاڑ کھانے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے دلدادہ ہو چکے تھے۔ وہ ناولوں میں پائے جانے والے دہشت گرد معلوم ہونے لگے جیسے ان کی ذات میں چے گیویرا اور ہیرالڈ رابنز کے کسی کردار کو رلا ملا دیا گیا ہو۔

میر نے اب پانچ ستارہ ہوٹلوں کے شاندار سوٹوں میں ڈیرا جمایا۔ جینز کی جگہ مہنگے مہنگے سوٹوں نے لے لی۔ چال ڈھال میں اکڑفوں پیدا ہو گئی۔ لگتا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا لڑکا ماچس کی ان جلی تیلیوں سے کھیل رہا ہو۔ جن لڑکیوں سے اس کا کسی زمانے میں میل جول تھا وہ غائب ہو گئیں۔ اب انسانیات پڑھنے اور مارکس کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے والی نوجوان، آدرش پسند، خوش غلاف انڈر گریجویٹ لڑکیاں اس کے ارد گرد منڈلاتی نظر نہ آتیں۔ ان کی جگہ ایسی حسین وجمیل سمور پوش عورتوں نے لے لی جن کا اونچے اونچے سماجی حلقوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ انہوں نے اپنی ٹیلی فون کی کتاب سے عام لوگوں کے نام اور پتے قلمزد کر دیے۔ اب وہاں ایسی امیر کبیر عورتوں کے نام تھے جن کے نمبر تک ڈائرکٹریوں میں درج نہیں ہوتے۔ ان دنوں ایک یونانی وزیر کی بیوی تو ہر وقت مرتضےٰ کی بانہوں میں جھولتی رہتی تھی۔

مصطفےٰ نے میر کو حسنیٰ شیخ سے متعارف کرا دیا تھا۔ اپنے والد کی داشتہ اور خفیہ بیوی سے ملنا میر پر یقیناً گراں گزرا ہو گا۔ لیکن حسنیٰ کے اہم شخصیتوں سے روابط تھے۔ اس لیے حمیت کو بالائے طاق رکھتے ہی بنی۔ شیخ زید سے ملاقاتوں کا بندوبست کرنے کے لیے انہیں حسنیٰ کی مدد درکار تھی۔ حسنیٰ نے انہیں شیخ زید سے ملوا دیا۔ بھٹو کے بیٹے کی دستگیری کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ جس شخص سے اسے محبت ہے اس سے وفا کرتی رہے گی۔ حسنیٰ نے میر کو خبردار کرنا شروع کر دیا کہ مصطفےٰ سے بچ کر رہے اور رازدارانہ طور پر بتایا کہ اس کے والد نے مصطفےٰ پر کبھی پوری طرح اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس نے میر کو مشورہ دیا کہ اپنے لیے راہ خود نکالے کیونکہ وہ محسوس کرتی تھی کہ ان تمام رابطوں سے مصطفےٰ اپنی سیاسی حیثیت مستحکم کرنے کا کام لے گا۔ وہ مصطفےٰ سے بخوبی واقف تھی۔ مصطفےٰ کی سیاسی حرص اور موقع پرستی کا جو اندازہ اس نے لگایا تھا وہ ممکن ہے مبالغہ آمیز ہو لیکن میر کا اثر پذیر ذہن اس کی پڑھائی ہوئی پٹی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

بھٹو صاحب نے شیخ زید کے نام ایک خط مصطفےٰ کو دیا تھا۔ اس میں مصطفےٰ کو بھٹو صاحب کا بھائی کہہ کر متعارف کرایا گیا تھا۔ اور باتوں کے علاوہ خط میں شیخ زید سے یہ استدعا بھی کی گئی تھی کہ حامل رقعہ کی ہر طرح سے مدد کی جائے۔ انگلینڈ آنے کے بعد مصطفےٰ نے وہ خط حسنیٰ کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا۔ "میں نے تو اس خط سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا حسنیٰ نے غالباً اس کی مدد سے اپنا کام نکال لیا۔ خط کی عبارت سے بالکل واضح نہ تھا کہ لکھنے والا اصل میں کہنا کیا چاہتا ہے"۔

میر نے مصطفےٰ سے یارانہ ختم کر لیا۔ حسنیٰ نے جو کچھ کہا تھا وہ اس نے مصطفےٰ کو بتا دیا۔ مصطفےٰ کو بڑا دھچکا لگا۔ اس نے حسنیٰ سے تعلقات منقطع کر لیے۔ تھوڑے ہی عرصے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بعد میر اور حسنیٰ کا اتحاد بھی باقی نہ رہا۔
بھٹو کے بیٹے ہمارے چھوٹے سے فلیٹ کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ اب انہوں نے اپنے شایان شان علاقے میں بہت کشادہ اپارٹ منٹ حاصل کر لیا۔ جو لوگ کل تک مصطفےٰ کا دم بھرتے تھے اب ان دونوں کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ انہوں نے خود کو مصطفےٰ سے دور کر لیا۔ اور اپنی سٹریٹجی آپ مرتب کرنے میں مشغول ہو گئے۔ مہم جوئی کا چرچا ہونے لگا۔ بات ہوائی بندوقوں سے آگے نکل چکی تھی اور اب وہ سچ مچ کے ہتھیاروں کی خریداری میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے مسلح جدوجہد کے ذریعے ضیا حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنانا شروع کیا۔ ایسے لوگوں کی فہرستیں تیار کی گئیں۔ جنہیں مارڈالنا مقصود تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اگر دہشت گردی کی کوئی ایسی مہم باقاعدگی سے چلائی جائے جس کا مقصد حکومت کی کلیدی شخصیتوں کو ہلاک کرنا ہو تو اقتدار تک پہنچا جا سکتا ہے۔ کابل میں تربیتی کیمپ قائم کرنے کے فیصلے کی مصطفےٰ کو اطلاع تک نہ دی گئی۔ خیالی قسموں کے نشے میں ڈوبے انہیں دنوں میں الذوالفقار نامی تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ جب بسم اللہ ہی غلط ہو تو آگے چل کر بیڑا غرق ہونا ہی چاہیے تھا۔

مصطفےٰ خوب سمجھتا تھا کہ دہشت کے ذریعے جنرلوں کو اقتدار سے ہٹانے کی کوشش بے سود ثابت ہو گی۔ اسے علم تھا کہ ہمارے عوام سبوتاژ اور سیاسی قتل جیسی حرکتوں کو نفرت کی نظر سے دیکھے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ کٹر اقدام پسند الذوالفقار کی طرف کھچے آئیں گے اور یہ کہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے آدمی بہت جلد تنظیم میں سرایت کر جائیں گے۔ اسے ڈر تھا کہ حکومت جوابی جارحانہ کاروائی پر اتر آئے گی جس کے نتیجے کے طور پر سیاسی کارکنوں کو یا تو ختم کر دیا جائے گا یا وہ جیلوں میں سڑتے رہیں گے۔ الذوالفقار کو کچلنے کے بہانے اہل اقتدار کو اپنے تمام مخالفوں کو پکڑنے دھکڑنے کی کھلی چھٹی مل جائے گی۔ پیپلزپارٹی اتنی منظم نہ تھی کہ اس طرح کی خفیہ تحریک کو سہارا دے سکے۔ اسے یقین تھا کہ پیپلزپارٹی کے قانون شکن بازو کی سرگرمیوں سے اور کچھ ہو نہ ہو بحالیٔ جمہوریت کی پُر امن جدوجہد کی رفتار ضرور سست پڑ جائے گی۔ وہ بھٹو برادران کی بے صبری کو سمجھ تو سکتا تھا لیکن اس سے اغماض برتنے کو تیار نہ تھا۔ اب پارٹی پر مجموعی طور پر ایک ہی طرح کی سیاہی تھوپی جا سکے گی یعنی اس میں شامل سبھی لوگ دہشت گرد قرار پائیں گے۔ دہشت کا جواب دہشت سے دیا جائے گا۔ میرا اور شاہنواز کی انتشار پسند سرگرمیوں کی وجہ سے بے گناہوں کی شامت آ جائے گی۔ وہ عذاب سہیں گے۔ جیل جائیں گے اور پھانسی چڑھیں گے۔

مصطفےٰ کو سیاست کے ایک زیادہ سپاٹ اسلوب سے دلچسپی تھی۔ اس نے ملک سے

باہر کی پارٹی کی، جو ابتری کا شکار تھی، از سر نو تنظیم کا آغاز کیا۔ پارٹی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ اور اس میں کسی قسم کا نظم وضبط باقی نہ رہا تھا۔ مصطفےٰ نے یورپ کے متعدد ملکوں اور انگلینڈ بھر کا دورہ کیا۔ اس نے بڑے بڑے عام جلسوں سے خطاب کیا اور لوگوں کے نڈھال حوصلوں کو ابھار دیا۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر تو وہاں پہ تھیں نہیں کہ ان کا نام سن کر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔ ان کی نیابت کا فرض مصطفےٰ نے بطریق احسن انجام دیا۔ ان دونوں کے انگلینڈ آنے تک پیپلزپارٹی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی تھی۔ اور کچھ کر دکھانے کے لیے مچل رہی تھی۔ مصطفےٰ لوگوں کو جوق در جوق جلسہ گاہوں تک لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ نعرہ وہ لگاتا۔ اس کی آواز میں آواز لوگ ملاتے۔ اس کام میں وہ ان تھک تھا۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر جہاں بھی گئیں۔ انہوں نے جذبات سے سرشار ہجوموں کو اپنا منتظر پایا۔ یہ ساری کامیابی انہیں مصطفےٰ کے تنظیمی جوش وخروش اور ولولہ انگیز خطابت کی بدولت نصیب ہوئی۔

پرانے دوست اور ساتھی ملنے آ جاتے اور گفتگو کا محور ہمیشہ سیاست ہوتی۔ ہمیں رفیع رضا سے ملنے جلنے کے کافی مواقع ملے جو ایک زمانے میں بھٹو صاحب کے خصوصی معاون رہ چکے تھے۔ وہ پیپلزپارٹی کے پانچ سالہ دور حکومت کی کامیابیوں اور حماقتوں پر تفصیل سے بات چیت کرتے، نیویارک سے یوسف بچ آ جاتے جو اقوامِ متحدہ کے لیے کام کرتے تھے۔ رفیع کے مقابلے میں ان کے مزاج میں زیادہ ٹھہراؤ آ چکا تھا یعنی وہ سوچتے تھے کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب صبر کرنا چاہیے وہ مضطرب بھی نسبتاً کم تھے۔ اور بھٹو صاحب پر انہیں غصہ بھی کم تھا۔ یہ دونوں حضرات بہت ہی نستعلیق ذہن کے مالک تھے اور سیاست کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ میں ان کی فہم وفراست کی بڑی قائل تھی اور ان کی گفتگو سے محظوظ ہوا کرتی تھی۔

ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ جب بھی لندن آتے اہتمام کر کے ہم سے ملتے میں نے دیکھا کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ سیاسی منظر نامے میں تبدیلیاں آ گئی ہیں اور محسوس کیا کہ بھٹو صاحب کی اصلی پرانی ٹیم کی جگہ ایسے گھٹیا سیاست دانوں نے سنبھال لی ہے جن کے عزائم بے تکے ہیں۔ وہ اس دیوار کے نوشتے کو پڑھ ہی نہ پائے جس کی طرف جلد ہی پیٹھ کر کے انہیں اپنی بقا کی جنگ لڑنی تھی، اور اگر آپ کے پیچھے دیوار ہو اور سامنے دشمن تو لڑنے مرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

سمندر پار کی پیپلزپارٹی اب پراگندہ احساس کی تصویر نہ رہی تھی۔ وہ اب ایک واضح شکل اختیار کر کے ایک متعین سمت میں بڑھ رہی تھی۔ مصطفےٰ نے فیصلہ کیا کہ اصل طاقت کا مظاہرہ کرنے کا وقت آ پہنچا ہے۔ لوگوں کو دنیا کے سامنے یہ ثابت کرنا ہو

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گا کہ وہ اپنے پابزنجیر قائد کے ساتھ ہیں۔ برطانیہ نے اپنے ہاں مقیم جلاوطنوں کا ہمیشہ لحاظ کیا ہے۔ جو کاروائی پاکستان میں قتل عام کی کھلم کھلا دعوت کے مترادف ہوتی وہ انگلینڈ میں مہذب احتجاج کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔ انڈیز سکوئر میں پاکستانی سفارت خانے کے سامنے مظاہرے کے لیے لوگوں کو پکارا گیا۔ بڑا سوال یہ تھا: کیا عوام جوق در جوق آئیں گے؟

وہ آئے۔ وہ آپ سے آپ موج در موج خانہ ساز بینرز اور پلے کارڈ اٹھائے آئے۔ وہ اس طرح آئے کہ ان کی ٹی شرٹوں پر بڑے بڑے حرفوں میں "بھٹو کو بچاؤ" رقم تھا۔ وہ بریڈ فورڈ اور ساؤتھال سے اور یورپ کے ہر اس کونے سے آئے جہاں تک بھٹو کی داستان پہنچ چکی تھی۔ وہ اپنی گاڑیوں پر، پیدل چل کر اور ٹیوب ٹرین کے ذریعے آئے۔ وہ متانت کے ساتھ سپیکرز کارنر پر جمع ہو گئے۔ مصطفےٰ کو عام لوگوں پر جو بھروسہ تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ وہ سب ایک سنگین زیادتی کی تلافی کے لیے مل جل کر مارچ کریں گے۔ وہ اپنے قائد کو پھانسی چڑھنے سے بچانے کے لیے مارچ کریں گے۔

یہ پیچا پیچ جلوس، جو بل پر بل کھاتا لندن کے مرکز سے گزرا، اس امر کا جیتا جاگتا ثبوت تھا کہ عوام نے اس شخص کو بھلایا نہیں ہے۔ جس نے انہیں ظلم اور ناانصافی کے سامنے پُر وقار انداز میں ڈٹے رہنا سکھایا تھا۔ اہل جلوس سفارت خانے کے سامنے اکٹھے ہوئے جہاں انہوں نے دوسرے مقررین کے علاوہ مصطفےٰ، میر اور طارق علی کی آتش ناک تقریریں سنیں۔ ہجوم اطمینان کا یہ احساس لے کر منتشر ہوا کہ ان کی موجودگی نے ان کے سیاسی بیان کو وزنی بنا دیا ہے۔

جنرل مرعوب نہ ہوئے۔ بھٹو صاحب کا بھانجا، بھتیجا/طارق اسلام، اپنے ماموں/چچا سے ان کے قتل سے ذرا پہلے جیل جا کر ملا۔ اس نے واپس آ کر اطلاع دی کہ بھٹو اپنے سابقہ وجود کی پھیکی سی پرچھائیں نظر آتے ہیں۔ ان کا وزن نوے پاؤنڈ رہ گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں سوجے ہوئے تھے اور مسوڑھوں کی مزمن خرابی میں، بے توجہی کے باعث، مزید بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہتے تھے۔ کرب کی کیفیت کبھی ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ طارق کو محسوس ہوا جیسے اس نے بھٹو صاحب کی بجائے ان کا سایہ دیکھا ہو۔ لیکن سائے کا ذہن اسی طرح فعال تھا۔ بھٹو صاحب نے سیاست پر بات چیت کی اور یہ جاننے کا بڑا اشتیاق ظاہر کیا کہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ انہیں یہ سن کر خوشی ہوئی کہ میر اور شاہنواز سیاست کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں اور ان کی جان بچانے کے لیے مہم چلا رہے ہیں۔ انہوں نے طارق سے مصطفےٰ کا پوچھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کیا مصطفےٰ اچھی تقریر کر لیتا ہے۔ جب طارق نے

اثبات میں جواب دیا تو بھٹو صاحب کی شخصیت کا پرانا رنگ عود کر آیا۔ انہوں چہرے پر روکھی سی مسکراہٹ لا کر پوچھا۔ "مجھ سے بہتر نہیں؟" یہ سوال کم اور بیان زیادہ تھا۔

بھٹو صاحب اس وجہ سے الجھن اور اضمحلال کا شکار تھے کہ عوام نے انہیں دی جانے والی سزا پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان کی یہ امیدیں ہوا میں تحلیل ہو گئیں کہ اچانک شورش برپا ہو گی اور آمر کے پاؤں اکھڑ جائیں گے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عوام قید خانے پر دھاوا بول کر انہیں چھڑا کیوں نہیں لیتے۔ عوام کی بے رخی دیکھ کر وہ اداس ہو گئے۔

طارق نے ان سے کہا کہ وہ خود عوام سے اٹھ کھڑے ہونے کو کہیں۔ اس نے بھٹو صاحب کو مطلع کیا کہ پارٹی کی قیادت کسی وجہ سے آگے نہیں آ رہی۔ پارٹی کی قیادت سے کہنا چاہیے کہ وہ عوام کو آواز دے اور اٹھ کھڑے ہونے پر اکسائے۔ بھٹو صاحب کے قتل سے صرف ایک ماہ پیشتر ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ کو جیل سے رہا کرایا گیا تھا۔ اس موقع پر ان کی رہائی بھٹو صاحب کے لیے تعجب خیز تھی۔ "کیا وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے منہ میں چوگا دوں؟ انہیں علم نہیں کہ کیا کرنا چاہیے؟ ممتاز اور حفیظ بک چکے ہیں۔ وہ عوام کو اٹھ کھڑے ہونے کے لیے نہیں کہیں گے۔" طارق بضد رہا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ اگر عوام کی طاقت نے کوئی تدارک نہ کیا تو فوج بدترین حربوں پر اتر آئے گی۔ بھٹو صاحب پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو آزمانے پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے طارق سے کہا کہ وہ ان کا پیغام حفیظ تک پہنچا دے۔ اور پیغام یہ تھا کہ عوام سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہوں۔

طارق اپنے ماموں/چچا سے رخصت ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ثابت ہو گی۔ غداری کی ہوا کی شدت کے سامنے پاؤں اکھڑے جا رہے تھے۔ ایسے وقت میں طارق نے امید کے تنکوں کا سہارا لینا چاہا۔ وہ ڈاکٹر نیازی کو ساتھ لے کر حفیظ کے پاس گیا۔ اس نے غلط وقت چنا تھا۔ گھر کے باہر بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ حفیظ نئی شادی کر رہا تھا۔ وہ گھر سے نکل کر ڈرائیو تک آیا اور طارق سے ملا اس پر بدحواسی طاری تھی۔ پیغام پہنچا دیا گیا۔ حفیظ کی شکل دیکھنے کے لائق ہو گئی "تمہارا مطلب ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہم عوام سے اٹھ کھڑے ہونے کو کہیں؟" ہاں" "خوب۔ میں ایسا۔۔۔ ہی کروں گا۔۔۔ فوراً۔۔۔ کل صبح۔" دولھا کے ذہن میں اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ عوام کو کوئی پیغام نہ دیا گیا۔ اس آدمی کے گلے میں جس کی ذات پوری پارٹی پر محیط تھی، پھندا اور تنگ ہو گیا۔

ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ بھٹو کو پھانسی چڑھنے سے پہلے متعدد بار مرنا پڑا۔ جنرل

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ضیا نے اس کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ انہیں دو سال جیل میں صرف اس لیے رکھا گیا کہ ان کی قوت ارادی جواب دے جائے۔ ان کی تذلیل اور توہین کی گئی۔ ان کے ساتھ انتہائی بے رحمی کا سلوک کیا گیا۔ ایک بریگیڈیر کو مقید رہنما کی کوٹھری کے سامنے والی کوٹھری میں بٹھا دیا گیا۔ اس کا کام صرف بھٹو صاحب کو گالیاں دینا تھا تاکہ وہ غصے سے پاگل ہو جائیں۔ بریگیڈیر کو بھٹو صاحب کی کمزوریوں کا علم تھا۔ اس نے اپنے تمام زبانی حملوں کو انہیں رستے ہوئے زخموں پر مرکوز کر رکھا۔ بھٹو صاحب کی والدہ کو رسوا کرنے کے لیے نہایت ناشائستہ زبان استعمال کی۔ وہ طعنے دیتا رہتا یہاں تک کہ بھٹو صاحب ردعمل ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ بظاہر کبھی کبھار پاکستان کے سابق وزیراعظم کو جلال آ جایا کرتا لیکن بیشتر وقت وہ تحمل سے کام لیتے۔ بریگیڈیر ان پر قہقہے لگاتا اور گالیوں کی بوچھاڑ کرتا رہتا۔ فوجی جنرل انہیں نفسیاتی طور پر مفلوج کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

مغرور اور دماغ دار بھٹو صاحب کو ایک مضرِ صحت، کھلا ٹائیلٹ استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا جو تقریباً ان کی کوٹھری کے اندر تھا۔ انہیں اس کی بدبو سہنی پڑتی۔ کسی طرح کا تخلیہ میسر نہ تھا۔ جب وہ ٹائیلٹ استعمال کرتے تو ایک پہرے دار ان کی طرف منہ کیے کھڑا رہتا۔

مصطفےٰ کو معلوم تھا کہ بھٹو صاحب گو امیر گھرانے کے فرد ہونے کے ناتے نازونعم میں پلے ہیں لیکن مرد بحران ہیں۔ وہ سر نہ جھکائیں گے۔ تذلیل اور تعذیب کی اس اینچاتانی اور رکھ رکھاؤ سے ان کے حوصلے میں دوبارہ جان پڑ جائے گی، ان کی جرات پھر تازہ دم ہو جائے گی۔ وہ جانتا تھا کہ بھٹو صاحب جب دارورسن کا سامنا کریں گے تو خوف کا شائبہ تک ان کے چہرے پر نظر نہ آئے گا۔ وہ تقدیر پرست تھے۔ انہیں تاریخ کی عدالت پر یقین تھا اور یہ اعتماد بھی کہ بالآخر وہ بری ہو کر رہیں گے اور اسی یقین اور اعتماد کے سہارے وہ تختۂ دار تک آپ چل کر جانے کو تیار تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں گے۔

پاکستان سے آنے والی خبریں وحشت ناک تھیں۔ میر اور شاہنواز کا ملک سے رابطہ قائم تھا۔ جو خبر انہیں ملتی ہم تک پہنچا دیتے۔ اکا دکا افواہیں گشت کرتی رہتیں جن سے ہمارے حوصلے بلند ہو جاتے۔ ہمیں بتایا گیا کہ عالمی رہنماؤں نے ضیا سے کہا ہے کہ وہ رحم دلی سے کام لے۔ ضیا نے انہیں یقین دلایا ہے کہ وہ بھٹو کی جان نہیں لے گا۔

اس کے بعد ہمارے سننے میں آیا کہ بے نظیر کو اپنے والد سے ملانے لے جایا جا رہا ہے۔ بے نظیر کو بتایا گیا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہو گی۔ جب وہ ملے تو ان کے درمیان میز اور سلاخیں مائل تھیں۔ بے نظیر نے پہرے داروں کی منت کی کہ وہ اسے باپ سے گلے ملنے دیں۔ بھٹو صاحب نے اسے جھڑکا۔ "ان سے کبھی کسی بات کی التجا نہ کرو"۔ بے نظیر ان کی پسندیدہ خوشبو "شالیمار" لائی تھی جو انہوں نے لے کر رکھ لی۔ چند کتابیں بھی تھیں۔ بھٹو صاحب طنزیہ انداز میں مسکرائے اور کتابیں بے نظیر کو لوٹا دیں۔ "میں نہیں سمجھتا کہ میرے پاس انہیں ختم کرنے کا وقت ہو گا۔" بے نظیر نے انہیں ایک ریزر دیا۔ وہ انہوں نے لے لیا اور بولے۔ " اچھا ہے۔ میں یہ داڑھی مونڈ ڈالوں گا۔ میں کسی بدبخت ملّا کی طرح مرنا نہیں چاہتا"۔ وہ اپنے خالق کے حضور میں پیش ہونے کے لیے تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں اگلی صبح پانچ بجے پھانسی دے دی جائے گی۔

ہم نے بھٹو صاحب کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ان کے نیم جاں بلب دماغ میں کون سے خوف لپک رہے تھے؟ کیا ڈراؤنی جگہ بنا ہوا تھا ان کا دماغ جس میں قدم دھرتے جان نکلتی تھی۔ میں اللہ کی پناہ کی طالب ہوئی۔ مصطفےٰ نے اپنا غم بوتل سے غلط کیا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ وہی بریگیڈیر، جو انہیں ستاتا رہتا تھا، اندر آیا اس نے بھٹو صاحب کو چند کورے ورق اور قلم دیا۔ انہیں اپنی وصیت قلم بند کرنے سے محروم رکھا جا رہا تھا۔ وہ انہیں ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بھٹو صاحب تحریراً اپنے گناہوں کا اقرار کریں۔

بھٹو صاحب بیٹھ گئے۔ انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ ان کا ذہن بلاشبہ یادوں سے اٹا پڑا ہو گا۔ وہ ساری کامرانیاں، وہ دل وجان سے فدا ہجوم، وہ مداح سرائیاں۔ وہ سب آخر کہاں غائب ہو گئیں۔؟ یہاں وہ بالکل تنہا تھے۔ ہولناک انداز میں تنہا اور سامنے ایک کورا کاغذ رکھا تھا۔ جو انہیں ترغیب دے رہا تھا کہ سمجھوتا کر لو، جان بچا لو۔ جی دار رہنما کو پتہ چل گیا کہ یہ اس کی زندگی کا بہترین لمحہ ہے۔ اس لمحے کو اس نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کاغذ پھاڑ کر پھینک دیے۔ اپنی زندگی لٹا دی۔

بریگیڈیر غصے سے بھوت بنا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ بھٹو صاحب نے اسے مات دے دی تھی۔ اس نے سزا یافتہ قیدی کے پیٹ میں لات ماری۔ بھٹو صاحب گر پڑے، افسانہ بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی دیوہیکل شخصیت کی طرح آفاق پر چھا گئے۔ بریگیڈیر اور اس کے قبیل کے لوگوں کے حصے میں مر کر بھی ذلت اور خواری کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ یہاں آ کر حقیقت اور افسانہ آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔ حقائق افسانے سے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

عجیب تر ہیں۔ اس پر ہمیشہ پردہ پڑا رہے گا کہ اس رات اصل میں کیا پیش آیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب کی لاش کو پھانسی دی گئی تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب بھٹو صاحب کو اٹھا کر تختۂ دار کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو انہیں ہوش آ گیا۔ وہ لڑکھڑائے، گر پڑے، اٹھے اور پھر بساط بھر بے خوفی کے ساتھ، جیسے کسی کو خاطر میں نہ لا رہے ہوں، آپ چل کر تختۂ دار تک گئے۔ پارٹی کو اب ایک شہید مل گیا تھا۔ جذبات اور خیالات کو ولولۂ تازہ دینے کے لیے اور کیا چاہیے تھا۔

سی130 کے نوجوان پائلٹ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس کے سننے میں آیا تھا کہ بھٹو صاحب کو طیارے کے ذریعے لاڑکانہ لے جایا جا رہا ہے۔ یہ 4 اپریل 1979ء کی بات ہے۔ اس نے کیبن میں قدم رکھا تاکہ اس آدمی کو خوش آمدید کہہ سکے جس کا وہ شیدائی تھا۔ اس کی نظر لکڑی کے تابوت پر پڑی جس میں بھٹو صاحب کی میت رکھی تھی۔ نوجوان پائلٹ صدمے کے مارے نڈھال ہو گیا۔ ہم میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کی تھوڑی سی جان ضائع نہ ہو گئی ہو۔ وہی سی 130 نو سال بعد بہاولپور کے اوپر پھٹ کر تباہ ہو گیا۔ جلاد جہاز پر سوار تھا۔ اچھوں کا بول بالا اور بروں کا منہ کالا ہو کر رہتا ہے۔ تارا مسیح جس نے پھانسی دی تھی، غائب ہو گیا اور یہی حشر اس کے بیٹے کا ہوا جس نے اس کی جگہ سنبھالی تھی۔ حقیقت کیا ہے؟ اس کا آج بھی کسی کو علم نہیں۔

میر نے صبح پانچ بجے فون کر کے ہمیں خبر سنائی۔ مصطفٰے نے ہمیں جگا دیا۔ اس کا ردعمل دھیما دھیما تھا۔ ایسے مرد کی طرف سے، جسے زاروقطار رونے کی عادت تھی مجھے زیادہ جذباتی ردعمل کی توقع تھی۔ اس نے اپنے مرحوم قائد کے لیے کوئی آنسو نہ بہائے۔ مصطفٰے نے میر کے فلیٹ کا رستہ لیا۔ وہاں میز پر شواز ریگل کی بوتل رکھی تھی۔ پریس اور دوسرے لوگ جس وقت رہنماؤں کا انتظار کر رہے تھے وہ شراب پینے میں مشغول تھے۔ شہادت کو مردے کے لیے رت جگے کا رنگ دیا جا رہا تھا۔

بھٹو صاحب کو تن تنہا تختۂ دار کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں جو حمایت کبھی حاصل تھی اس سے وہ اپنے ہی اعمال کی بدولت ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ انہوں نے کیا یہ کہ اپنے صف اول کے تمام رہنماؤں کو آپس میں لڑاتے رہے۔ ہر شخص اور اس کی بیوی کے بارے میں ان کے پاس فائلیں کھلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ان لوگوں سے اتحاد کر لیا جو ان کے جانی دشمن تھے اور حقیقی وفاداری کی قدر کرنے میں ناکام رہے۔ اپنا فرقۂ قیادت اپنے ہی خاندان کو سونپ کر پارٹی کو زک پہنچائی۔ یہ غلط فیصلہ تھا۔ ان کی بیوی اور بیٹی میں اتنی سیاسی فراست نہ تھی۔ کہ وہ ان کی جان بچانے کے لیے جدوجہد کر سکتیں۔ ان دونوں کو پارٹی کی کوئی سمجھ نہ تھی۔ ان میں نام کو لچک نہ تھی۔ اور جو برے آثار نظر آ

رہے تھے وہ ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہیں۔ اس عمل کے دوران مصطفٰے، حفیظ، ممتاز، جتوئی اور کوثر نیازی جیسے لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ اب وہ بھٹو صاحب کے سحر سے آزاد ہو چکے تھے۔ بھٹو صاحب کی حقیقت ان پر عیاں ہو چکی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایسے فیصلہ کن موقع پر پارٹی کی باگ دوڑ ایک نحیف و نزار خاتون اور اس کی سیاسی طور پر نابالغ بیٹی کو تھما کر انہیں دھوکا دیا گیا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی حیثیت گھٹا دی گئی، ان کے ذریعے صرف اپنا مطلب حاصل کیا گیا۔ اگر ان جیالوں کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے دیا جاتا تو بھٹو صاحب کو بچایا جا سکتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیاست ممکنات کے فن کا نام ہے یعنی یہ جاننے کا کہ کیا ممکن ہے، کیا ممکن نہیں۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر کسی معجزے کی آس لگائے بیٹھی تھیں۔ کوئی معجزہ سرے سے رونما ہی نہ ہوا۔

بھٹو صاحب اس وہم کے مارے ہوئے تھے کہ ان کی دوسری صف کی قیادت پارٹی کو ہائی جیک کر لے گی اور ان کا پتا کاٹ دے گی۔ معاملہ جان بچانے کا ہو یا پارٹی کو بچانے کا، انہیں اپنے اہل خانہ کے سوا کسی پر اعتبار نہ تھا۔

رہنماؤں نے اس فیصلے کو رکوانا چاہا مگر ان کی ایک نہ چلی اور ان کی سمجھ میں آ گیا کہ بھٹو صاحب کی خاطر خطرہ مول لینے کی صورت میں فوج کا سارا نزلہ ان پر گرے گا۔ بیگم بھٹو اور بے نظیر کی ہدایات کے تحت کام کرنا قطعی طور پر ناممکن تھا کیوں کہ بھٹو صاحب خواتین کو ان کی طرف سے بدظن کر چکے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ سب کچھ بھٹو خواتین کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے۔ کوئی متبادل قدم اٹھا کر خطرہ مول لینے کا حاصل ہی کیا تھا۔

بھٹو صاحب کی موت سے عوام کی قوت ارادی اجتماعی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی۔ ملک میں ہر طرف خوف کی فضا نظر آنے لگی۔ ہم میں سے جو لوگ اس ناقابل تصور بات کے بارے میں سوچتے رہتے تھے بے یقینی اور پشیمانی کے عالم میں سن ہو کر رہ گئے۔ پارٹی کے سرگرم کارکنوں کو تسلی دینا ناممکن تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے صف اول کے رہنماؤں نے انہیں دھوکا دیا ہے۔ ان کی توقعات پر پورا اترنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ غلطی کس سے ہوئی، کیسے ہوئی۔ ان کے عظیم قائد کو تختۂ دار تک پہنچنے کیوں دیا گیا؟ کیا ان سیاسی بالشتیوں کی نظر میں، جو بھٹو صاحب کی باقیات تھے، زندہ بھٹو کی بہ نسبت مردہ بھٹو زیادہ کار آمد تھا؟ لوگ چاہتے تھے کہ جو قصور وار ہیں انہیں نہ بخشا جائے۔ لوگ محاسبے کا تقاضا کر رہے تھے۔ وہ یہ تاویل قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے کہ ضیا ضرورت سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا اور دنیا بھر کو قول دینے کے بعد اپنے وعدے سے پھر گیا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

قیادت نے ایسے آدمی پر اعتبار کیا ہی کیوں جو اپنا ارادہ بھی اپنی رودی کی طرح گھڑی گھڑی بدلنے کا عادی تھا؟ ان کے قہر وغضب کا نشانہ حفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو بنے۔ قیادت کا لبادہ بیگم بھٹو اور بے نظیر کے حصے میں آیا۔ یہی وہ آخری دو ہستیاں تھیں جنہوں نے بھٹو صاحب کو زندہ دیکھا تھا اور جن کے دل میں بھٹو صاحب کا آخری وصیت نامہ محفوظ تھا۔ جنوبی ایشیا میں ایک اور حکمراں خاندان نے جنم لیا۔ اس خاندان کی جڑیں جس مٹی میں پیوست تھیں، وہ ایک شہید کے لہو میں نہائی ہوئی تھی۔ اس لہو کو مقدس مانا گیا۔ اسے متبرک گردانا گیا۔۔ مسابقت کی سیاست کی جگہ انتقام کی سیاست نے لے لی۔ اب ایسا کھیل شروع ہوا جس میں جمع تفریق کا حاصل صفر تھا۔

جلاوطنی کے دنوں میں مالی طور پر ہمارا یہ حال تھا کہ کبھی رنج کبھی گنج۔ اکثر وبیشتر ہم کنگال رہتے اور رشتے داروں سے مانگ تانگ کر کام چلاتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پچاس پاؤنڈ کا نوٹ ہاتھ آ جاتا تو لگتا کہ عیش ہو گئے ہیں۔ بی بی سی آئی کے آغا حسن عابدی بڑی باقاعدگی سے ہر مہینے مصطفےٰ کو دوہزار پاؤنڈ بھیجا کرتے تھے۔ اس ترسیل کا انتظام جتوئی صاحب نے کیا تھا۔ مصطفےٰ اپنی مالی صورت حال پر شاذونادر مجھ سے تبادلۂ خیال کرتا۔ میں ان معاملات میں دخل نہ دیتی۔ میرے دیکھنے میں صرف اتنا آیا کہ ہماری آمدنی اور اخراجات میں توازن کی شدید کمی ہے۔

ایک واقعہ خاص طور پر میرے تجسس کو گدگداتا ہے۔ میں اب تک اس اسرار کی تہ تک نہیں پہنچ پائی۔

ایک بار کوئی پچیس برس کا ایک نوجوان مصطفےٰ سے ملنے آیا۔ میں کین زنگٹن میں علی محمود کے فلیٹ میں اکیلی تھی۔ نوجوان نے کہا کہ وہ مظفر گڑھ سے آیا ہے اور مصطفےٰ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ مصطفےٰ کو واپس آنے میں کچھ دیر لگے گی۔ کہنے لگا کہ میں انتظار کروں گا۔

جس طرح بعض لوگوں کو دیکھتے ہی کراہت سی محسوس ہوتی ہے مجھے وہ نوجوان اسی طرح برا لگا۔ مصطفےٰ سے جس قسم کے لوگ ملنے آیا کرتے تھے یہ کسی طرح ان سے مختلف تھا وہ بدتمیزی سے بات کرتا تھا اور مجھے کچھ اجڈ معلوم ہوا۔ اس کے رویے سے لگتا تھا جیسے وہ مصطفےٰ کا احسان اٹھانے کے بجائے الٹا اس پر کوئی احسان کرنے آیا ہو۔

میں نے اسے انتظار کرنے دیا۔ میں مزید باتیں کرنے کے لیے اس کے پاس نہ رکی اس نے مجھے منقبض کر دیا تھا۔

مصطفےٰ لوٹا تو میں نے نوجوان کا ذکر کیا۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ وہ دونوں گھنٹے بھر ساتھ رہے۔ اس کے بعد مصطفےٰ نے آ کر مجھ سے دو سو پاؤنڈ مانگے۔ میں ذرا

حیران ہوئی۔ لوگوں میں رقمیں بانٹتے پھرنا میرے میاں کا مزاج نہیں۔ اس طرح کی حرکت وہ صرف اس وقت کرتا ہے جب اسے بھی بدلے میں کچھ ملنے کی امید ہو۔ میں نے اس بارے میں کچھ پوچھ گچھ کی۔ "یہ بیچارہ نوجوان مظفرگڑھ سے چل کر یہاں مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔" دس دن بعد اسی نوجوان کا ہوائی اڈے سے فون آیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ اسے برطانوی حکام نے ہیروئن رکھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ کہنے لگا کہ کھر صاحب سے بات کرنی ضروری ہے۔ "کھر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ وہ آئیں گے تو میں ان سے تمھاری بات کرادوں گی۔ مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ۔" میں نے نوجوان سے کہا کہ گھبرائے نہیں اور اس کا بتایا ہوا ٹیلی فون نمبر لکھ لیا۔

نوجوان سے بات کرنے پر مصطفےٰ مجھ پر سخت ناراض ہوا۔ کہنے لگا کہ میری حماقت کی وجہ سے وہ بھی اس مقدمے میں پھنس جائے گا۔ "صرف اتنا کہنا چاہیے تھا کہ تمہیں پتہ نہیں وہ کون ہے۔ تم بہت باتیں کرتی ہو۔

اس کے کہے کی کوئی تک میری سمجھ میں نہ آئی۔ پچھلی بار تو مصطفےٰ کو لڑکے پر بڑا رحم آ رہا تھا۔ اس کی بات میرے پلے نہ پڑی۔ "میرا خیال تھا۔۔۔ کہ تم ہوتے تو اس کی مدد کرنا چاہتے۔ تم نے اسے خاصی اہمیت دی تھی۔ تم گھنٹے بھر اس کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ مجھے کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ اب تم اسے پہچان بھی نہیں سکتے۔ خصوصاً اب جب وہ مشکل میں پھنس چکا ہے۔ شاید تم اس کی مدد کر سکو"

کچھ دیر غور وفکر کے بعد فیصلہ کر لیا گیا۔ مصطفےٰ نے نمبر ڈائل کیا۔ فون پر متعلقہ افسر سے بات کی جس نے بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ نوجوان اعلیٰ قسم کی ہیروئن سمگل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اسے گرفتار کر لیا گیا تو اس نے پولیس سے درخواست کی کہ مصطفےٰ سے بات کرنے کا موقع دیا جائے۔ اسے دعویٰ تھا کہ مصطفےٰ اس کا دوست ہے۔ مصطفےٰ نے کہا کہ اسے لڑکے سے بات کرنے دی جائے۔ "تم نے یہ احمقانہ حرکت کس لیے کی؟ دیکھو اب تم کیسے جنجال میں پھنس گئے۔ ہو۔"

اس نے فون اچانک بند کر دیا اور ٹہلنے لگا۔ وہ بہت نروس اور پریشان تھا۔ مصطفےٰ کے نام سمن آیا۔ اسے عدالت نے گواہ کے طور پر طلب کر لیا۔ وہ عدالت میں پیش ہوا۔ عدالت میں نوجوان نے کہا کہ اس کے بعض دوستوں کو سابوتاژ کی ایک کاروائی میں ملوث کر دیا گیا ہے۔ فوجی آمر کے خلاف احتجاج کے طور پر ایک گاڑی پٹڑی سے اتار دی گئی۔ یہ ایک سیاسی عمل تھا۔ توڑ پھوڑ کے اس عمل کی تفصیلات پاکستانی پریس میں چھپیں۔ سابوتاژ کرنے والوں کی تلاش شروع ہوئی تو اس کے دوست بھی پھنس گئے اور انہیں جھوٹے الزامات کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ حکام نے وعدہ کیا کہ اس کے

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

دوستوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ نوجوان ہیروئن لے کر لندن جائے اور مصطفےٰ کے گھر تک رسائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیروئن گھر میں کہیں رکھ دے۔ "میں ہیروئن مجبوراً لے کر آیا تھا۔ مارشل لا حکومت چاہتی تھی کہ میں اسے کھر صاحب کے گھر میں کہیں چھپادوں تاکہ وہ مفت میں سمگلنگ کے جرم میں پکڑے جائیں"۔

یہ کہانی اخباروں کے لیے بہت موزوں تھی۔ ہر اخبار میں خبر چھپی کہ کس طرح ایک بے گناہ سیاست دان کو بدنام کرنے کی مذموم سازش ناکام بنا دی گئی ہے۔ مصطفےٰ کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا۔ اسے نشانہ بننے میں مزہ آتا تھا کہ اس طرح ایک تو اس کی وقعت کی تصدیق ہوتی تھی، دوسرے پتہ چلتا تھا کہ جنرل اس کے ہاتھوں کتنے دق آ چکے ہیں۔ اس نے جنرل ضیا کی گھٹیا چالوں کے بارے میں اخباری بیانات جاری کرنے پر خاصا وقت صرف کیا اور کہا کہ وہ جنرلوں کے لیے خطرہ بن چکا ہے اور وہ سیاست کے میدان سے اس کا قصہ پاک کرنے کے لیے کوئی نہایت گری ہوئی حرکت بھی کر سکتے ہیں۔

نوجوان کے بیان پر مجھے ایسی شہادت کا گمان ہوا جو اسے اچھی طرح رٹا دی گئی ہو۔ جس واقعے سے مصطفےٰ کے سیاسی کیریر کو سخت دھچکا لگنا چاہیے تھا وہ اس سے اپنی ساکھ بنانے میں مصروف تھا۔ اس کا انداز مجھے سراسر بناوٹی لگا۔ یہ عین اسی طرح کا بیان تھا جو مصطفےٰ سخت مشکل میں پھنس جانے پر گھڑنے کا ماہر تھا۔

میں بیٹھی حیران ہوتی رہی کہ پاکستان میں دوسو پاؤنڈ سے کتنی ہیروئن خریدی جا سکتی ہے اور وہ لندن کے بازاروں میں کتنے کی بکے گی۔؟

اس نوجوان کو خط لکھنے کا بڑا ہوکا تھا۔ اس کے خطوں میں رونے جھینکنے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ وہ مصطفےٰ کو لکھتا کہ اس کے گھر والوں سے رابطہ قائم کیا جائے۔ انہیں کوئی رقم بھجوائی جائے۔ درخواست کرتا کہ مصطفےٰ بیچ میں پڑ کر اسے رہائی دلا رہے۔ اس نے متعدد فون نمبر دیے اور مصطفےٰ کی منت کی کہ اس سے آ کر مل تو لیں۔

اس کی منت سماجت میرے شوہر نے اس کان سن کے اس کان اڑا دی۔ جونہی جج نے فیصلہ سنایا نوجوان کو بھلا دیا گیا۔ آخر وہ جنرلوں کے لیے مثنیات ہی تو لیے پھر رہا تھا۔ یا بات کچھ اور تھی؟ ایسا لگا جیسے اس میں اور کتوں، کیڑیوں یا کبوتروں میں کوئی فرق نہیں۔

ادھر مصطفےٰ تو بیرون ملک پیپلزپارٹی کے احیا کے لیے کام کر رہا تھا اُدھر بیگم بھٹو نے ان لوگوں سے، جو اب تک اس کے شوہر کے دشمنوں میں شمار ہوتے تھے، اپنے اختلافات رفع دفع کرنا شروع کر دیے۔ جنرل ضیاء نے سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا

دی تھی۔ سیاسی رہنماؤں کی نقل وحرکت کو ان کے متعلقہ صوبوں تک محدود کر کے اس نے ملک کو مزید تقسیم کر دیا۔

نہایت صبرآزما حالات میں، بڑی رازداری برتتے ہوئے، مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ ولی خاں، اصغر خاں، نوابزادہ نصراللہ ملک قاسم، خواجہ خیر الدین، غوث بخش بزنجو اور معراج محمد خاں بیگم بھٹو سے ملے۔ یہ سب رہنما اس پاکستانی قومی اتحاد کے روح رواں تھے جس نے بھٹو صاحب کی حکومت کو الٹ دیا تھا اور جس کے نتیجے میں مارشل لا نافذ ہوا تھا۔ یہ سیاست دان ضیا حکومت کی وعدہ شکنیوں کی وجہ سے روٹھے ہوئے تھے۔ جنرل ضیا کے نوے دن طول کھینچ کر چار لمبے برسوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ تحریک بحالی جمہوریت کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ آمر، جس نے بڑی چابک دستی سے اپنے مخالفین میں تفرقہ ڈال رکھا تھا۔ حیرت زدہ رہ گیا۔ لیکن قسمت اس کا ساتھ دیتی رہی۔

پی آئی اے کے ایک طیارے کو کراچی سے اغوا کر کے کابل لے جایا گیا۔ طارق رحیم نامی ایک مسافر کو اغوا کنندوں نے گولی مار کر باہر ٹارمیک پر پھینک دیا۔ میر مرتضےٰ جو کابل میں تھا، نہال ہوگیا۔ نہ تو اسے علم تھا کہ اغوا میں سلیم اللہ ٹیپو کا بھی ہاتھ ہے نہ اس سازش سے کوئی دور کا بھی واسطہ تھا۔ لیکن یہ موقع اچھا تھا۔ اتنا اچھا کہ وہ اسے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اغوائی جنرل ضیا کے قیدخانوں سے کوئی چالیس کے قریب سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ میر نے اغوائیوں سے ملاقات کی اور الذوالفقار نے اغوا کی ذمے داری قبول کر لی۔ ہائی جیکنگ اتنے دن جاری رہی کہ پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ فوجی حکومت کو جھکنا پڑا۔ اس نے قیدی رہا کر دیے۔ یہ تاریخ کے سب سے ہوشربا اور کامیاب ترین اغواؤں میں سے ایک تھا۔ جیت ہو گئی لیکن چند روزہ ثابت ہوئی۔

جنرل ضیا نے بڑی پھرتی سے جوابی کاروائی کی۔ الذوالفقار کو بہانہ بنا کر دہشت کا بازار دوبارہ گرم کر دیا گیا۔ پاکستان بھر میں چھاپے مارے گئے۔ اور ہر اس شخص کو پکڑ لیا گیا جس کا پیپلزپارٹی کے ترنگے جھنڈے سے دور کا بھی واسطہ تھا۔ ہزاروں کو جیل ہوئی، بہت سوں نے کوڑے کھائے اور جسمانی صعوبتیں برداشت کیں اور کئی نہایت نفیس طبع نوجوانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ناقابل یقین واقعے پیش آتے رہے۔ "کیا تم کمیونسٹ ہو؟" نوجوان فوجی افسر نے ایک ان پڑھ مگر سرگرم سیاسی کارکن سے پوچھا۔ "نہیں کمیونسٹ دشمن ہوں، جناب" "مجھے پرواہ نہیں کہ تم کس قسم کے کمیونسٹ ہو۔ اسے حوالات میں بند کر دو"۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بونس کے طور پر ضیا نے اغوا ہونے والے طیارے کے مسافروں کو سرکاری خرچ
پر ہوائی جہاز سے مکے بھجوایا تاکہ وہ عمرہ ادا کر سکیں۔ جس ابتلا سے مسافر گزرے تھے
اس کی یادوں کو انہیں کی زبانی ریکارڈ کرنے کے لیے ٹیلی وژن والے اپنے کیمرے لے
کر موقع پر موجود تھے۔ جنرل ضیاء کے ہاتھ ایسا ڈنڈا آ گیا تھا جسے وہ پیپلز پارٹی پر برسا
سکتا تھا۔ اسے دہشت گردوں کی پارٹی قرار دے دیا گیا۔ اس بات کی ضیا کو کوئی پروا نہ
تھی کہ خود اس نے پوری قوم کو ہائی جیک کر رکھا ہے۔

اغوا کے لیے جو وقت چنا گیا تھا اس کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوتی آئی ہیں۔
اس سے زیادہ موزوں وقت خیال میں نہیں آ سکتا۔ یہ واقعہ ٹھیک اس وقت پیش آیا
جب تحریک بحالی جمہوریت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک غیر موثر ہو
کر رہ گئی۔ جو تجزیہ نگار تاریخ کا شعور رکھتے ہیں انہوں نے یاد کیا کہ 1970ء میں کس
طرح "گنگا" نامی بھارتی جہاز کو اغوا کر کے پاکستان پہنچا دیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب نے خود
ہوائی اڈے جا کر طیارے پر قبضہ کرنے والے کشمیری حریت پسندوں کی پیٹھ تھپکی تھی۔
بہت برسوں بعد انکشاف ہوا کہ یہ اغوا تو "را" کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ اغوا کو بہانہ بنا کر
بھارت کے اوپر سے گزر کر مشرقی پاکستان جانے والی پروازوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اس
ایک ہی بے رحمانہ ضرب سے ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج اور
بھی وسیع ہو گئی۔ گیارہ برس بعد میر مرتضےٰ نے، ہوش کے بجائے جوش کے زیر اثر آ
کر اپنے والد کی تقلید کی۔ کیا یہ چھوٹا سا ڈراما خود ضیا نے رچایا تھا؟ آنے والا وقت ہی
بتائے گا۔

جس وقت اغوا کی خبر آئی تو ہم کار میں تھے۔ میں نے خوش ہو کر مصطفےٰ کی
طرف دیکھا بالاخر کسی نے کچھ کیا تو ہے۔ مصطفےٰ پر کوئی رعب نہ پڑا۔ "یہ غلط کام ہوا
ہے۔ اس سے بحالی جمہوریت کی تحریک کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ بڑے پیمانے پر مخالفین
کی تلاش شروع ہو گی۔ پارٹی کے جان نثار کٹر کارکنوں کو پکڑ لیا جائے گا۔ خدا کرے، اس
اغوا سے میر اور شاہنواز کا کوئی تعلق نہ ہو۔"

بے نظیر کو پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لیے شروع ہونے والی جدوجہد میں
مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ وہ اپنے والد کی وفات کے بعد لندن آئی۔ اسے ایک بہت
ہی روح فرسا تجربے سے گزرنا پڑا تھا اور اب وہ اپنے والد کی سیاسی جماعت کی رہنما بن
گئی تھی۔ وہ خود کو اپنے نئے کردار کے مطابق ڈھالنے میں مصروف تھی۔ پیپلز پارٹی کے
پرانے کارکن بھی ایک نوجوان لڑکی کے زیر قیادت کام کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور
پر تیار کر رہے تھے۔ بے نظیر کے بارے میں ان کے دل میں کچھ شبہات تھے۔ وہ ابھی

کھل کر اس کے ساتھ نہ تھے۔ وہ بے نظیر کو اس لیے تو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے کہ وہ
بھٹو کی بیٹی ہے۔ لیکن انہیں کچھ زیادہ یقین نہیں تھا کہ وہ اصل میں کیا ہے۔

ان دنوں انگلینڈ میں صف اول کے رہنما مصطفےٰ اور حفیظ پیرزادہ تھے بے نظیر کی
قائدانہ صلاحیتوں کے بارے میں ان کے جذبات ملے جلے تھے۔ مصطفےٰ نے بے نظیر کو
چھوٹی بچی کے روپ میں دیکھا تھا اور وہ انہیں "انکل" کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ ابھی
بے نظیر کو سیاسی طور پر باشعور ہوتے دیر لگنی تھی اور ناپختگی سے پختگی تک کا یہ سفر
خاصا اذیت ناک ثابت ہونے والا تھا۔ مصطفےٰ ہوائی اڈے پر لینے تو ننھی "پنکی" کو گئے
لیکن وہاں ملاقات کس سے ہوئی اپنی پارٹی کی شریک چیئرپرسن محترمہ بے نظیر بھٹو سے۔

بے نظیر نے ہوائی اڈے پر حفیظ اور مصطفےٰ کا خاصا احترام کیا۔ جب اس نے بی
بی سی سے گفتگو کی اور ہوا کی لہروں نے اس کی باتیں دنیا بھر میں پہنچائیں۔ تو وہ
دونوں اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہنی مون کی مدت بہت تھوڑی رہی اور وہ
کچھ ایسا خوشگوار بھی ثابت نہ ہوا۔

بے نظیر کے گرد سیاست دانوں کی ایک نئی نسل نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اپنے
والد کے ہم عصروں کی بہ نسبت وہ اپنے دوستوں، سہیلیوں، پرستاروں اور رشتے داروں کی
چیدہ منڈلی میں زیادہ خوش رہتی تھی۔ والد کے ہم عصروں کے بارے میں وہ سمجھتی تھی
کہ وہ اس کا بھٹو صاحب سے موازنہ کرتے رہتے ہیں۔ اس نے خود کو ان تمام لوگوں سے
دور کر لیا جو پیپلز پارٹی کے پرانے رکن تھے۔ اس کی کچن کابینہ ان لوگوں پر مشتمل
تھی: ڈاکٹر نیازی، دانتوں کا معالج جو اب اس کا مشیر خاص، جام صادق علی، یاسمین
نیازی، طارق اسلام جو اس کا کزن تھا، اور بہجت جو اس کی چچی/ممانی تھی۔

مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ بے نظیر کو اپنی تعریف سننے میں زیادہ مزہ آتا ہے اور
یہ پسند نہ تھا کہ اس پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ کچن کابینہ چاہتی تھی کہ پرانے راہنماؤں
کو بے نظیر سے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ کابینہ کے ارکان اسے مصطفےٰ حفیظ
اور ممتاز کے خلاف ورغلاتے رہے۔ گپ شپ سے بے نظیر کا دل بہلانا ان کا کام تھا۔
وہ اسے غلط اطلاعات فراہم کرتے رہتے۔ تاکہ وہ بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھی چین کی
بنسی بجاتی رہے۔ حقائق اس کے علم میں نہ آ سکیں۔ انہوں نے بے نظیر سے کہا کہ
مصطفےٰ جیسے لوگوں پر تکیہ نہ کیا جائے جن کے اپنے عزائم ہیں اور جنہیں پارٹی کی قیادت
سنبھالنے کے دعوے بھی ہیں۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر اس نے ان مکار سیاست دانوں
کا سہارا لیا تو وہ اسے دھکا دے کر پارٹی کو ہائی جیک کر لیں گے۔ جنگل کی آگ کی طرح
تیزی سے پھیلنے والی ان افواہوں کو ہوا دینے میں بھی ان کا ہاتھ تھا کہ حفیظ، جتوئی اور

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مصطفیٰ نے اس کے والد سے غداری کی تھی اور یہ کہ مصطفیٰ پاکستان سے مشکوک انداز میں روانہ ہوا تھا۔

بے نظیر پر ان باتوں کا اثر ہونا ہی تھا۔ وہ ہمیشہ سے پرانے وفاداروں (یا بے وفاؤں) کی طرف سے چوکنی رہتی تھی۔ اس کے یہ جو انکل تھے انہیں فالتو کہنا تو ابھی قبل از وقت تھا لیکن اس نے ٹھان لی کہ ان سے دب کر نہیں رہے گی۔

مجھ سے مصطفیٰ کی جو بات چیت ہوتی رہتی تھی اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بے نظیر کو موقع دینے پر آمادہ تھا۔ اس کی انگلینڈ آمد کے وقت وہ اسے اپنی قائد کے طور پر قبول کرنے میں بالکل مخلص تھا وہ سینیئر سیاسی مدبر کا کردار ادا کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا اور امید رکھتا تھا کہ بے نظیر اُس کی سیاسی فراست سے استفادہ کرے گی۔ انہیں پتہ تھا کہ اب وہ اس واحد سیاسی جماعت کی سربراہ ہے جو ضیا کو اقتدار سے ہٹانے کی تحریک کے ہراول کا کام کر سکتی ہے۔ لیکن بے نظیر کے رویے سے مصطفیٰ کے خلوص پر اوس پڑ گئی۔

مرکزی کمیٹی کے ہر اجلاس سے مصطفیٰ بے نظیر سے پہلے سے بھی زیادہ بددل اور مایوس ہو کر لوٹتا۔ پرانی یادوں نے پھر زور باندھا اور انہیں رہ رہ کر وہ اجلاس یاد آنے لگے جن کی صدارت بھٹو صاحب کرتے تھے۔ "جب ہم مرکزی کمیٹی کے کسی اجلاس میں شرکت کرتے تو ہمارے درمیان سنجیدہ بحث مباحثہ ہوتا۔ بتدریج کوئی سٹرٹیجی ترتیب دی جاتی۔ ہم قابل عمل فارمولے تجویز کرتے۔ مسائل کو نمٹاتے۔ نہ کبھی لاحاصل بحثیں ہوتیں نہ کبھی ساری کاروائی سے کسی زیربحث مسئلے کو ٹرخانا مقصود ہوتا۔ ہم اتنا کچھ سیکھتے۔ ہر اجلاس عظیم ذہنوں کے ٹکراؤ کے مانند ہوتا۔ فطین ذہنوں کا ٹکراؤ۔ بھٹو صاحب یکے بعد دیگرے ہم سے اس طرح کام لیتے، کسی کو بڑھاتے کسی کو گھٹاتے، کہ سماں بندھ جاتا۔ ہم بہترین کارکردگی کا ثبوت دیتے۔ جس ٹیم کو بھٹو صاحب نے اپنے گرد جمع کر رکھا تھا اس کے مقابلے میں پنکی تو انیس برس سے کم عمر کی الیون کی قیادت کر رہی ہے۔ طبیعت کو اس قدر الجھن ہوتی ہے کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جام صاحب ہو یا نوجوان مرتضٰے جتوئی یا وہ بریگیڈیر عثمان یا ڈاکٹر نیازی، ان جیسے لوگوں سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ ہر بات مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ حیرت ہی کیا جو ضیا آرام سے بیٹھا ہوا ہے۔ اس طرح حزب اختلاف ہو تو وہ سو سال تک حکومت کر سکتا ہے۔ ایکشن کا کوئی منصوبہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ ہر اجلاس اس فیصلے پر ختم ہوتا ہے کہ شورش میں شدت پیدا کی جائے۔ لیکن کس طرح؟" یہ شاید پہلی مرتبہ ہوا کہ "ضیا کے پاس چھ مہینے اور ہیں" والے مشہور نظریے کو بالائے طاق رکھنے کی نوبت آئی۔

ایک مرتبہ مصطفیٰ نے بے نظیر سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان لی۔ اجلاس میں شریک ہونے سے پہلے اُس نے ممتاز اور حفیظ سے مشورہ کیا اور ایک اہم مسئلے پر ان کی حمایت چاہی۔ مسئلہ یہ تھا کہ پیپلز پارٹی الذوالفقار کے بارے میں کیا موّقف اختیار کرے۔ مصطفیٰ کا استدلال تھا کہ الذوالفقار پارٹی پر بوجھ بن گئی ہے اور جنرل ضیا اس سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ پارٹی اپنے دہشت پسند بازو سے خود کو دُور کر لے۔ اس سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ یہ حساس معاملہ تھا لیکن مصطفیٰ محسوس کرتا تھا کہ اسے سلجھایا جانا چاہیے۔ حفیظ اور ممتاز کی ہمت نہ ہوئی کہ مصطفیٰ کا ساتھ دیں۔ مصطفیٰ نے اکیلے ہی حملے کا آغاز کیا۔ اُس نے کمیٹی کو بتایا کہ اُس کے خیال میں بھٹو کے صاحبزادگان اپنا رومانی مہم جوئی کا شوق پورا کر رہے ہیں۔ اُس نے کہا کہ پارٹی کی اتنی بساط نہیں کہ فوجی جنرلوں سے ٹکر لے سکے۔ "پیپلز پارٹی کو الذوالفقار کے بارے میں کوئی واضح بیان جاری کرنا ہو گا۔ ہم محض اس بنا پر ان کے جرائم اپنے سر نہیں لے سکتے۔ کہ ہمارے ان سے مراسم ہیں یا رشتے داری ہے۔ تمہارے بھائی کی جلد بازی کی وجہ سے ہم اپنے پکے اور ثابت قدم کارکنوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں"۔

بے نظیر بپھر گئی۔ پارٹی کی شریک چیئرپرسن کے بجائے وہ اچانک میر اور شاہنواز کی بڑی بہن بن بیٹھی۔ "میں اجازت نہیں دوں گی کہ میر مرتضٰے اور شاہنواز بھٹو کا ذکر اس ہتک آمیز انداز میں کیا جائے۔" مصطفیٰ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اس مسئلے پر تمہیں بات چیت کرنی ہی ہو گی۔ تمہاری پسند ناپسند یہاں نہیں چلے گی۔ اس بات کا ہماری پارٹی سے بڑا گہرا سروکار ہے۔ ہمیں اعلان کرنا پڑے گا کہ ہمارا دہشت پسندی سے بالکل کوئی تعلق نہیں۔" بے نظیر کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ رونے لگی۔ اور آنسو بہاتی ہوئی اٹھ کر اجلاس سے بھاگ گئی۔

جام صادق اور حفیظ نے اصرار کیا کہ مصطفیٰ جا کر بے نظیر سے صلح صفائی کر لیں۔ انہوں نے کہا کہ بے نظیر کے ساتھ یہ سمجھ کر پیش آنا چاہیے کہ وہ اڑیل لڑکی ہے جو اس تردد میں ایک لفظ سننے کو تیار نہیں۔ مصطفیٰ نے ان کی بات مان لی۔ انہوں نے [illegible] میں جا کر بے نظیر سے صلح جوانداز میں گفتگو کی۔ مصطفیٰ وضاحت کرتا رہا، وہ بات کرتی رہی۔ "آپ لوگ ہر وقت مجھے کونے میں دھکیلتے رہتے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس پر اعتبار کروں، کس پر اعتبار نہ کروں۔ آپ لوگوں کے طرز عمل کی [illegible] سے مجھے اتنی مشکل پیش آ رہی ہے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان سب معاملات سے کیسے نمٹا جائے۔"

مصطفیٰ نے وضاحت کی کہ سیاست میں اختلاف رائے کو اپنی ہتک نہیں سمجھنا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

چاہیے۔ "یہ سیاست ہے۔ تمہیں یہ باتیں سمجھنی ہوں گی۔ تم ایسے بہت سے لوگوں سے ملو گی۔ جو تم سے اختلاف کریں گے۔ ہر بار تم یوں بچوں کی طرح روٹھ کر فیل نہیں مچا سکتیں۔ اپنے جذبات پر ذرا قابو پاؤ اور زیادہ استقامت کا ثبوت دو"

اجلاس دوبارہ شروع ہوا۔ بے نظیر نے صدارت سنبھالی بہت جلد مصطفےٰ نے دوبارہ نکتہ چینی شروع کر دی۔ بے نظیر اٹھی اور آنسو پینے کی کوشش کرتی ہوئی دوڑ کر اپنے بیڈروم کے تخلیے میں چلی گئی۔ وہ بہت ہی حساس اور پریشان تھی۔ اسے اپنے پر اعتماد نہ تھا۔ شریک چیئرپرسن کے رو بیٹھنے کی کہانی ہر طرف کسی لطیفے کی طرح مشہور ہو گئی۔ جب بھی اس کی کسی کاروائی یا پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا پیپلز پارٹی کی قائد کے آنسو نکل آتے۔

جس منصبے کا اسے سامنا تھا وہ تھا بھی بے کراں۔ وہ نوجوان تھی، ناتجربہ کار تھی، اس کے باپ کو ناحق پھانسی دے دی گئی تھی، قید میں رہ چکی تھی۔ بیک وقت مارشل لاء، حزب اختلاف کے سرکھپ رہنماؤں سے اور خود اپنے والد کی پارٹی کے رہنماؤں سے چومکھی لڑ رہی تھی۔ کوئی ایسا نہ تھا کہ ترس کھا کر اسے تھوڑی سی مہلت ہی دے دیتا۔

بے نظیر کا چڑچڑاپن بڑھتا گیا۔ وہ ممتاز، حفیظ اور مصطفےٰ کی پہنچ سے باہر ہو گئی۔ اس نے ایک تازہ تازہ پر پرزے نکالنے والی افسر شاہی کو اپنے آگے حصار بنا کر کھڑا کر لیا اور خود اس کی آڑ میں چھپ گئی۔

مصطفےٰ کو اب بے نظیر سے ملنے کے لیے پہلے سے وقت لینا پڑتا۔ سرخ فیتے کی وجہ سے بعض نہایت اہم فیصلے بروقت نہ ہو سکے۔ مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ اس کی سبکی کی جا رہی ہے اُسے ڈاکٹر نیازی یا بشیر ریاض یا یزدانی یا ناہید خان کی وساطت سے اپائنٹمنٹ لینا برا لگتا تھا۔ ان لوگوں نے بھانپ لیا کہ مصطفےٰ کے دل میں غبار آ چکا ہے اور مصطفےٰ کی خیرہ سری اور پارٹی میں اس کے عزائم کے بارے میں بے نظیر کے کان بھرنے لگے۔ ہفتوں گزر جاتے۔ تب کہیں جا کر ان کی ملاقات کا بندوبست ہوتا اور ملاقات بھی ایسی جس میں دونوں کھچے کھچے رہتے۔

بے عملی کا اس سے زیادہ تیر بہدف نسخہ تجویز نہ کیا جا سکتا تھا۔ مصطفےٰ سمجھتا تھا کہ اگر پارٹی کو سیاسی طور پر قدم آگے بڑھانا ہے تو بے نظیر سے مستقل رابطہ نہایت اہم ہے۔ وہ پارٹی کا بزرگ ترین رہنما تھا۔ اس کڑی آزمائش میں وہ اپنے تجربے کو بروئے کار لا سکتا تھا۔ سیاست کے خارزار میں پہلے چند برسوں کے دوران بے نظیر کو راہ دکھا سکتا تھا۔ مصطفےٰ ریجنٹ کا کردار ادا کرنے کا خواہاں تھا۔ ادھر بے نظیر کا اپنا سر اتنا

بڑا نہیں ہوا تھا۔ غرور سے پھولا ہوا تھا۔

پارٹی کے عمائدین کے رتبوں میں یہ ردوبدل پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ کھر اب منظور نظر کی حیثیت سے محروم ہو چکا ہے اور جو اقتدار اُسے اب تک حاصل تھا وہ کھچ کر کسی اور گروپ کی طرف جا چکا ہے۔ اس گروپ کو نہ صرف شریک چیئرپرسن تک رسائی حاصل تھی بلکہ وہ ہر وقت اس کے گرد جمع رہتا تھا۔ کارکنوں نے یہ بھی دیکھا کہ مصطفےٰ کے ساتھ بے نظیر کا رویہ بدل گیا ہے۔ یہ تبدیلی بے نظیر کے لب و لہجے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور باتوں سے ان پر ظاہر ہو چکی تھی۔ وہ جان گئے کہ بے نظیر اب مصطفےٰ کو دقیع یا اہم نہیں سمجھتی۔ کارکن ہی وہ اساس تھے جس پر مصطفےٰ کے اقتدار کی عمارت کھڑی تھی۔ مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ یہ اساس اس کے پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے۔

کارکنوں کا ایک اور گروپ بھی رفتہ رفتہ بے نظیر سے بدظن ہوتا گیا۔ بے نظیر پارٹی کو جس طرح چلا رہی تھی وہ انہیں آزردہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ دوسرے اس کے انداز سیاست کا یہ خاصہ کہ بالکل پتہ نہ چلتا تھا کہ سفر کس سمت میں جاری ہے انہیں بہت گراں گزرنے لگا تھا۔ ان کارکنوں نے پارٹی سے رشتہ توڑ لیا۔ سابق ٹیسٹ کرکٹر آفتاب گل جیسے لوگ الگ ہو گئے۔ آفتاب پی پی پی کا بڑا مخلص اور گرم جوش رکن تھا اور جنرل ضیا کو قتل کرنے کی ایک سازش میں ملوث ہونے کی وجہ سے پاکستان سے بھاگ آیا تھا۔ جو کارکن بھٹو خاندان کے وفادار سمجھے جاتے تھے انہوں نے اچانک تعلق ختم کر لیا۔ سب کی زبان پر ایک ہی شکایت تھی اور وہ یہ کہ بے نظیر میں تکبر بہت ہے اور اس تک رسائی تقریباً ناممکن ہے۔ بہت سے کارکن کھر کے ساتھ مل گئے۔ پارٹی کے اندر، غیر رسمی طور پر، کھر گروپ وجود میں آ گیا۔ ایک دوسرا جوابی گروپ جام صادق علی کے گرد جمع ہو گیا جو بدستور بھٹو خاندان کا وفادار اور قابل اعتبار چیلا بنا رہا۔

نجی سطح پر بے نظیر بڑی کمال کی عورت تھی۔ وہ شیریں جتوئی اور مجھے گھر مدعو کرتی رہتی اور ایک دفعہ اس نے ہم سے کہا کہ اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلیں۔ وہ ٹارزن کے بارے میں نئی لگنے والی فلم دیکھنا چاہتی تھی جسے والہانہ داد دی جا رہی تھی۔ فلم کیا تھی اس بن مانس کی بلند ابرو دانشورانہ تفسیر تھی جس میں کچھ پہلو طبقاتی معنی آفرینی کا بھی نکلتا تھا۔ میں بے نظیر سے مصطفےٰ کے بغیر نہ مل سکتی تھی کیوں کہ اُس کی طرف سے مجھے ایسا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بے نظیر کا دکھ درد میرے لیے باعث کشش ہے اور میرے اور اس کے درمیان ہمدردانہ رشتہ قائم ہو جائے گا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ بے نظیر کے ساتھ میرے تعلقات کتنے دن اور استوار رہیں گے۔ تم

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جیسی عورت کو اس کی سیلی بنتے دیر نہ لگے گی۔ تمہاری وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات الجھ کر رہ جائیں گے۔ تمہاری ان فضول یاریوں اور میری سیاست کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ اس لیے بے نظیر سے دور رہو۔" میں اس سے دور رہنے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن اس کے دکھ درد اور بہت بھاری ذمے داری کو محسوس کرتی رہی۔

بے نظیر ہماری بعض ڈنر پارٹیوں میں شریک ہوئی۔ یاسمین نیازی اور اسلام طارق کی شادی کا جشن منانے کے لیے ہم نے بڑی زبردست ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ مصطفےٰ نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کامیاب سیاسی چال چلی۔ انہوں نے بے نظیر اور بیگم بھٹو اور اس سماجی حلقے کے افراد کو تو مدعو کیا جس میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور جہاں ان کی بڑے آرام سے گزرتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی سیاسی کارکنوں کو بلانا بھی نہ بھولے جو ضیافت میں ایسے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے ملکہ معظمہ کی گارڈن پارٹی میں زبردستی آ گھسے ہوں۔ مصطفےٰ نے عوام الناس اور اہل کروفر کے درمیان کوئی خط تفریق کھینچنے سے انکار کر دیا اور مساوات کے اس مظاہرے سے پارٹی کے ادنیٰ کارکنوں کے دل جیت لیے۔ اس خوش تدبیری پر انہیں اپنی پارٹی کی شریک چیئرپرسن سے کوئی نمبر نہ ملے۔ اسے اپنے کارکنوں کے ساتھ سوشل ہونے سے انکار تھا۔ لیکن سوشلسٹ انداز میں ان سے اپنا کام نکالنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ نصرت بھٹو اور بے نظیر دونوں ہمیشہ مجھ سے بہت محبت سے ملتیں۔ میں نے جس طرح اپنا گھر بار سنبھال رکھا تھا اس پر بے نظیر نے مجھے سراہا۔ وہ مصطفےٰ سے کہنے لگی۔ "انکل، آپ کی خوش نصیبی کا کیا کہنا کہ تہمینہ آپ کی بیگم ہیں۔" میرے خیال میں وہ سمجھ چکی تھی کہ مصطفےٰ خاصا ٹیڑھا آدمی ہے۔

مجھے احساس ہو چلا تھا کہ بے نظیر اور مصطفےٰ کی زیادہ دیر نبھ نہیں سکتی۔ مصطفےٰ اس کی خوشامد نہ کر سکتا تھا اور وہ مصطفےٰ کا احترام کرنے کو تیار نہ تھی۔ یہ اناؤں کا ٹکراؤ تھا۔ کسی نہ کسی چیز کو تو آخر ٹوٹنا ہی تھا۔ شاہنواز کا انتقال ہوا تو واقعات نے اچانک پلٹا کھایا۔

مصطفےٰ اگرچہ الذوالفقار اور اس کی سرگرمیوں کا نہایت سختی سے مخالف تھا، شاہنواز کی موت نے انہیں ہلا ڈالا۔ شاہنواز اس طرح کا آدرش پسند تھا جن کا تذکرہ قصے کہانیوں میں ملتا تھا۔ وہ بہت حساس تھا اور بظاہر لگتا تھا کہ ہمارے روبرو کوئی بہت شائستہ دہشت گرد موجود ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں، اپنی نرمی اور بھلمنسائی سے، رازفاش کر دیتی تھیں۔ اُن میں کوئی ایسی سرد مہر فولادی کیفیت نہ تھی جو دہشت گرد کی اس باقی امیج سے میل کھا سکتی جو اس نے اپنے پر طاری کر رکھی تھی۔ جلاوطنی کے ابتدائی ایام میں جب وہ

ہمارے یہاں مقیم تھا تو مجھے اس سے بہت انس ہو گیا تھا۔ جب میں ان کے مشاغل کے بعد گری پڑی چیزیں اٹھاتی، صفائی کرتی پھرتی وہ ہمیشہ مجھ سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اب وہ اس جہان سے رخصت ہو چکا تھا۔ جس طرح اس کی موت واقع ہوئی تھی اس سے سستے اخباروں کو اپنے صفحات الل ٹپ بھرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ نوجوان خوبرو دہشت گرد کا کام کس نے تمام کیا؟ کیا یہ اس کی دلکش افغان بیوی، ریحانہ، کا کارنامہ تھا؟ یا اسے جنرل ضیا کے مامور کیے ہوئے قاتلوں نے ٹھکانے لگایا تھا؟۔ یا شاہنواز نے، جسے اس زندگی کے بارے میں جو وہ گزارنے پر مجبور تھا، کوئی خوش فہمی باقی نہ رہی تھی، خودکشی کر لی تھی؟ زیادہ شک اس کی بیوی پر کیا گیا۔ مجھے "کس نے مارا" اور اسی قبیل کے سوالات سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ میری نظر میں یہ زندگی کا الم ناک زیاں تھا۔ وہ اتنا جوان، اتنا پُرعزم تھا۔ میں الگ جا بیٹھی اور روتی رہی۔

ہم جتوئی صاحب اور خلیفہ کے ساتھ بحری سیر پر روانہ ہونے والے تھے۔ ہم نے اپنی سیر منسوخ کر دی۔ جتوئی صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ بے نظیر کے ہمراہ شاہنواز کی میت کے ساتھ پاکستان جائیں گے۔ انہوں نے سوگوار بہن سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مل سکی۔ مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ تابوت کے ہمراہ جتوئی صاحب کا جانا نہایت ضروری ہے۔ بالآخر جتوئی صاحب اور مصطفےٰ بے نظیر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور اس سے اظہار افسوس کیا۔ وہ ایک ہی طیارے پر روانہ ہوئے مصطفےٰ تو طیارے کے پہلے سٹاپ پر اتر گیا اور جتوئی صاحب میت کے ساتھ کراچی چلے گئے۔

پارٹی اس افسوس ناک موت سے پورا سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے بہت بے چین تھی۔ پارٹی والوں نے صورت حال کا بڑا صحیح اندازہ لگایا تھا۔ جو مردنی اہل پاکستان پر بھٹو صاحب کی موت کے وقت طاری ہو گئی تھی وہ دُور ہو چکی تھی۔ شاہنواز کے جنازے کے وقت فراست کا ثبوت دے کر عوام کو اپنے حق میں صف آرا کرنا ممکن تھا اور لوگوں کے منظم ہو کر میدان میں اترنے سے برپا ہونے والے زلزلے کی لہریں فوجی حکومت کو لرزا سکتی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ اگر بے نظیر کراچی سے سڑک کے راستے لاڑکانہ جائے تو لوگ جوق در جوق اس کے ساتھ چلنے کے لیے امڈ آئیں گے۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں، بالخصوص ایسے دور میں جو مارشل لا اور اجبار سے عبارت ہو، بڑے بڑے ہجوم نفسیاتی طور پر بہت اہم ہوتے ہیں۔

پیپلز پارٹی کے ایک گروپ کا خیال تھا کہ شاہنواز کو کراچی میں دفنانا چاہیے۔ لاڑکانہ پہنچ سے بہت باہر ثابت ہو رہا تھا۔ نوڈیرو میں بھٹو صاحب کا مزار عوام کو یکجا کرنے کا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مقام نہ بن سکتا تھا۔ شاہنواز کی قبر کو ایسے متبرک مقام کے طور پر کام لانا ممکن تھا جہاں سے تحریکیں جنم لے سکیں۔

بے نظیر نے ان نقطہ ہائے نظر کو ماننے سے انکار کر دیا۔ طیارے سے اترتے ہی، جسے ٹرمینل سے محفوظ فاصلے پر پارک کیا گیا تھا۔ وہ ایک فوجی طیارے پر سوار ہوئی جس نے جھٹ پٹ اسے موہنجوڈرو کے ہوائی اڈے پر پہنچا دیا۔ وہاں حشر کا سا سماں تھا ہر طرف چیختے چلاتے ہجوم نظر آ رہے تھے۔ اس غضب کا جم غفیر اور لوگوں کی جذباتی حالت دیکھ کر بے نظیر کی سمجھ میں آگیا کہ اس نے فاش غلطی کی ہے۔ جن لوگوں نے لاڑکانہ میں ہجوم کی مجنونانہ کیفیت دیکھی انہوں نے جان لیا کہ بے نظیر کرشمہ آفرین شخصیت کی مالک ہے۔ وہ اپنے بھائی کو دفنانے وطن لوٹی تھی۔ اس نے سیاسی درجہ حرارت کو پرکھ لیا تھا۔ اب خود اس کی واپسی کا منصوبہ تیار کیا جا سکتا تھا۔ دس اپریل 1986ء کو لاہور میں اکٹھے ہونے والے ہجوم کا اور بھی بڑا ہونا لازم تھا۔

مصطفےٰ اور جتوئی صاحب نے محسوس کیا کہ بے نظیر نے ایک بار پھر ان کے معروضات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جتوئی صاحب اور بے نظیر کے درمیان اختلافات کی نوعیت سنگین ہو گئی۔ جتوئی صاحب سندھ میں پیپلزپارٹی کے صدر تھے۔ بے نظیر نے ہالہ کے مخدوم کے آدمیوں کو اہم عہدوں پر فائز کر کے پارٹی کو لولالنگڑا کر دیا۔ اپنی پارٹی کے دیوقامت حضرات کے قد کو گھٹاتے جانا بے نظیر کی سٹرٹیجی کا حصہ تھا۔

وہ مصطفےٰ کو بھی نیچا دکھا چکی تھی۔ مصطفےٰ کو یقین تھا کہ پنجاب میں پی پی پی کا صدر اُسے ہی مقرر کیا جائے گا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پنجاب بلاشرکت غیرے اُس کی قلمرو ہے۔ جب پتہ چلا کہ اُس کا نام اس عہدے کے لیے زیر غور ہی نہیں تو اُسے صدمہ پہنچا۔ اُس نے اس معاملے پر بے نظیر سے بات کی تو اُسے بتایا گیا کہ وہ بہت متنازع انتخاب ثابت ہو گا۔ "بہت زیادہ لوگ اس چناؤ سے اختلاف کریں گے۔" مصطفےٰ کو طیش آگیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی اختلاف کر کیسے سکتا ہے۔ میرے سوا اور کسی کو نہیں چنا جا سکتا۔ یہ مجھ پر آپ کوئی مہربانی نہیں فرمائیں گی۔ میں خالصتاً میرٹ کی بنیاد پر اس عہدے کا حق دار ہوں۔ سب کو تسلیم ہے کہ میں پنجاب کا قائد ہوں۔"

بے نظیر قائل نہ ہوئی۔ وہ جہانگیر بدر، فاروق لغاری، فیصل صالح حیات اور ڈاکٹر نیازی جیسے لوگوں کے ردعمل سے خائف تھی۔ مصطفےٰ ششدر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ بے نظیر کو اُس پر اعتبار نہیں۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ "پنجاب کے بالشتیوں" کے ردعمل سے خوف زدہ تھی۔ مصطفےٰ نے جان لیا کہ جب تک وہ پارٹی کی سربراہ ہے اُس کی سیاسی ترقی رکی رہے گی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُسے غیر موثر اور

فالتو بنانے کے لیے کوئی کاروائی کی جانے والی ہے۔

ان دنوں ہمیں بلوچستان کے عطاءاللہ مینگل سے ملنے جلنے کا خاصا موقع ملا۔ وہ بھی ہماری طرح جلاوطن تھے۔ مصطفےٰ سردار مینگل کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سردار صاحب بڑے پکے بلوچ قوم پرست تھے۔ انہوں نے پنجابیوں سے اپنے تنفر کو کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ "میں پنجابیوں سے اصولی طور پر نہیں ملتا۔ نہ میں ان کا کھانا کھاتا ہوں نہ ان کے گھر جاتا ہوں۔ وہ اعتبار کے قابل نہیں۔ لیکن مصطفےٰ صاحب مختلف ہیں۔ وہ لائق احترام ہیں۔ میں ان سے ملنے ملانے میں استثناء سے کام لیتا ہوں کیوں کہ وہ خود مستثنیات میں سے ہیں۔"

مینگل اور مصطفےٰ دونوں کو شکار کا بہت شوق تھا اور وہ ایک ساتھ شکار کھیلنے جایا کرتے۔ ہم ان کے گھر بھی جاتے رہتے۔ ان کی بیگم انگلستان میں بھی پردے میں رہتیں۔ مجھے سردار صاحب سے باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا۔

ایک دفعہ مصطفےٰ کی نظر سردار مینگل کی ٹیلیفون بک کے اندرجات پر پڑ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ حفیظ پیرزادہ کا نام اور نمبر کاٹ دیا گیا ہے۔ وجہ دریافت کی تو جواب ملا۔ "میں حفیظ پیرزادہ جیسے ناموں سے اپنی ٹیلی فون بک کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا"۔

ایک ہفتے بعد حفیظ، ممتاز اور سردار مینگل مصطفےٰ سے ملنے آئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ کنفیڈریشن کی ایک سکیم سامنے لانے والے ہیں اور مصطفےٰ کو قائل کرنا چاہا کہ وہ بطور پنجابی سکیم کی حمایت کرے۔ مصطفےٰ نے اس کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ سکیم پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا نسخہ ہے۔ اُس کے خیال میں یہ اور کچھ نہیں، مجیب الرحمن کے وہی چھ نکات تھے جن کے نتیجے میں پاکستان دونیم ہوگیا تھا۔ بس ان نکات کو نیا لباس پہنا کر سامنے لایا جا رہا تھا۔

مصطفےٰ کو بڑا تجسس تھا کہ حفیظ کے بارے میں سردار صاحب کی رائے اچانک یکسر کیسے بدل گئی۔ اُس نے اس خفگی اور حقارت کو یاد کیا جو ہفتے بھر پہلے مینگل کی آواز سے صاف جھلک رہی تھی۔ چند ہی دن میں ان کی رائے میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے واقع ہو گئی۔ مصطفےٰ کو یقین تھا کہ ان کی ڈور کوئی اور ہلا رہا ہے۔ کنفیڈریشن سکیم کسی بیرونی طاقت کی ذہنی اختراع تھی۔ اس کا مقصد پاکستان کی فیڈریشن کو ضعف پہنچانا تھا۔ یہ علیحدگی کی سازش تھی جس نے منہ پر خود مختاری کی نقاب ڈال رکھی تھی۔ اُسے سارا شک بھارت پر ہوا۔ بھارت کے سوا کسی اور طرف خیال جا ہی نہ سکتا تھا۔ یہی وہ غیبی ہاتھ تھا جس نے مینگل کو حفیظ کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ موقع پرستی اور عمل، پسندی پر مبنی سیاست میں کیسے کیسے عجیب جوڑے ہم آغوش ہوتے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نظر آتے ہیں۔

ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ نے جب کنفیڈریشن کے منصوبے سے اپنی وابستگی کا اعلان کیا تو وہ ابھی پیپلزپارٹی کے رکن تھے یہ پارٹی کے ڈسپلن کی خلاف ورزی تھی۔ مصطفیٰ بے نظیر کے پاس گیا۔ "ممتاز اور حفیظ کی ڈھٹائی ملاحظہ ہو۔ انہوں نے ہمارے پلیٹ فارم سے ایک نئے منشور والی نئی سیاسی جماعت کا اعلان کر دیا۔ آپ نے اس کی اجازت کیسے دی؟ اگر آپ اس بارے میں سکوت اختیار کیے رہیں گی تو یہ ان کی سکیم پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کے مترادف ہوگا۔"

بے نظیر ممتاز اور حفیظ سے الجھنے کو تیار نہ تھی۔ مصطفیٰ کو یقین ہو گیا کہ وہ ان سے ملی ہوئی ہے۔ کنفیڈریشن کی سکیم آزمائشی غبارہ تھی جسے ہوا کا رخ پہچاننے کے لیے اڑایا جا رہا تھا۔ مصطفیٰ حیران ہوا کہ پارٹی کی سب سے اونچی صف میں بھی بھارتیوں نے اپنے پاؤں جما لیے ہیں۔ ان کی چابک دستی دیکھ کر مصطفیٰ ضرور چکرا گیا ہوگا۔

بے نظیر نے یہ دلیل پیش کی کہ سندھی انتخابی حلقوں کی وجہ سے وہ ممتاز اور حفیظ سے ٹکر نہیں لے سکتی۔ اس نے مصطفیٰ کو بتایا کہ سندھیوں کی دشمنی مول لینے کے بجائے وہ اس مسئلے کو نظر انداز کرنے کو ترجیح دے گی۔

مصطفیٰ قائل نہ ہوا اپنی بات پر اڑا رہا۔ پارٹی کی سربراہ سے اپنے اختلاف کو اُس نے عام کر دیا۔ اُس نے کنفیڈریشن سکیم اور پارٹی کی قیادت کی بے تدبیری پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ حفیظ اور ممتاز کو پارٹی سے نکال دیا جائے۔

معاملہ رفع دفع ہونا تو کجا مصطفیٰ کو مظفر گڑھ کی پیپلزپارٹی کے صدر کی طرف سے اظہارِ وجوہ کا نوٹس موصول ہوا جس میں کہا گیا کہ وہ پریس کو ایسا غیر عاقلانہ اور عاجلانہ بیان جاری کرنے پر قیادت سے معافی مانگے اگر اُس نے معافی نہ مانگی تو اُسے پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔

معاملہ بہت سنگین ہو گیا تھا۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ مظفر گڑھ کے پیپلزپارٹی کے صدر نے سچ مچ مصطفیٰ کو پارٹی سے نکالے جانے کا نوٹس بھیج دیا تھا۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مصطفیٰ نے پارٹی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

رفیع رضا نے اس کتابچے کو لکھنے میں ہاتھ بٹایا جس میں مصطفیٰ نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام مصطفیٰ کھر نے ایک ساتھ اپنی پارٹی کو خیر باد کہا۔ انہوں نے نیشنل پیپلزپارٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایسی پارٹی تھی جس کی طرف پیپلزپارٹی کے کارکن کھچ آئے۔ اس کا منشور بھی پیپلزپارٹی کے منشور سے ملتا جلتا تھا۔ مصطفیٰ کو بھٹو کی شخصیت کی سحر انگیزی کا بہت اچھی طرح احساس تھا۔ اُسے امید تھی کہ

اولیں اصولوں کا دوبارہ ذکر چھیڑ کر وہ لوگوں کی پرجوش حمایت حاصل کر لے گا۔ وہ بھٹو کی میراث کے حقیقی جانشین کے طور پر ابھرنے کا خواہاں تھا، اور بھٹو خواتین کو بے وقعت کرنا چاہتا تھا جو اس کے خیال میں بھٹو پرستی کے رجحان کو جڑ سے اکھاڑنے کا عمل شروع کر چکی تھیں۔ مصطفیٰ سمجھتا تھا کہ جب وہ عوام سے بھٹو صاحب کی بات کرے گا اور ان اصولوں کا ذکر چھیڑے گا جن کے بھٹو صاحب علم بردار تھے تو عوام کی طرف سے مثبت جواب ملے گا۔ آخر بھٹو کے جانشین ہونے کا شرف تو اُسی کو حاصل تھا۔ جو کچھ اُس کا حق تھا اس سے وہ کشمکش کے بغیر دست بردار نہ ہوگا۔ سیاسی میدان میں آنے والے اوچھے نوواردوں کو یہ موقع نہیں دیا جائے گا کہ اُسے پس منظر میں دھکیل دیں۔

جتوئی صاحب اور مصطفیٰ پرانے حلیف اور اچھے دوست تھے۔ جتوئی صاحب مصطفیٰ کے مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دو مرتبہ ضیا نے انہیں وزیراعظم بنانے کی پیشکش کی اور دونوں بار انہوں نے، مصطفیٰ کی طرف سے منفی جواب ملنے پر، یہ پیشکش ٹھکرا دی۔

پہلی بار ہم دبئی میں تھے۔ اور جتوئی صاحب اس پیشکش کے بارے میں مصطفیٰ سے صلاح مشورہ کرنے آئے۔ مصطفیٰ نے کہا کہ پیشکش کو قبول کرنا سیاسی خودکشی کے مترادف ہوگا۔ جتوئی صاحب اس وقت جنرل کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش میں تھے کہ مصطفیٰ کو ملک میں واپس آنے دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ دونوں مل کر ملک کو چلا سکیں گے۔ پنجاب کی حمایت کے بغیر جتوئی صاحب غیر موثر ثابت ہوں گے۔ اور پنجاب مصطفیٰ کی قلمرو تھا۔ جنرل مصطفیٰ کے حوالے سے سودے بازی کرنے پر تیار نہ تھا۔ جتوئی صاحب نے پاکستان واپس جا کر پیشکش کو مسترد کر دیا۔

دو سال بعد جنرل نے جتوئی کو وزیراعظم کے عہدے کی دوبارہ پیشکش کی۔ ایک بار پھر جتوئی صاحب نے محسوس کیا کہ مصطفیٰ کے بغیر وہ وزارت عظمیٰ کی ذمے داریوں سے عہدہ برا نہ ہو سکیں گے۔ یہ بات تو ماننے کی نہیں تھی کہ جتوئی صاحب تو وزیراعظم ہوں اور مصطفیٰ جلاوطن رہے۔ انہوں نے اپنے بھائی، امام بخش، کو انگلینڈ مصطفیٰ کے پاس بھیجا۔ جتوئی صاحب کے گھر والے شدت سے اس کے حق میں تھے کہ یہ بلند عہدہ قبول کر لیا جائے۔ مصطفیٰ نے جتوئی صاحب کو مشورہ دیا کہ مارشل لا حکومت کے ساتھ کسی طرح کا تعلق پیدا نہ کریں۔ جتوئی صاحب نے کہا کہ یہ پیشکش وہ صرف اس صورت میں قبول کریں گے کہ مصطفیٰ کو واپس آنے دیا جائے۔ جنرلوں کی نظر میں مصطفیٰ اب بھی بڑی ٹیڑھی کھیر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسے قابو میں رکھنا مشکل ہوگا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جتوئی صاحب نے ایک بار پھر پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ اگر واپسی کی شرط مان لی جاتی تو مصطفےٰ کا مشورہ کچھ اور ہوتا۔

فوج کے پاس مصطفےٰ کو آزاد انسان کی حیثیت سے وطن لوٹنے سے باز رکھنے کی اپنی وجوہ تھیں۔ فوجیوں کی نظر میں وہ غداری کا مرتکب ہوا تھا۔ وہ پاکستانی فوج کے ادارے کو تباہ و برباد کرنے کے ایک شیطانی منصوبے پر کام کر رہا تھا۔

ہماری آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اس نظریے کا قائل ہے کہ ہمارے تمام مسائل کی بنیادی وجہ پاکستانی فوج ہے۔ یہ نظریہ اس بہت ہی بین اور مداخلت پسندانہ کردار پر مبنی ہے جو فوج ہماری سیاست میں ادا کرتی چلی آئی ہے۔ اس نظریے کے محرکین کا استدلال ہے کہ فوج ہمیشہ سیاست دانوں اور جمہوریت کو شبے کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ اپنے مفادات اور اس بڑے دفاعی بجٹ کی، جو اس کی بقا کا ذمے دار ہے، نہایت چوکنی رہ کر حفاظت کرتی ہے۔ آبادی کے اس بڑے حصے کے رائے ساز رہنما اس مسئلے کا ایک الجھا ہوا حل پیش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستانی فوج کو تباہ کرنا پڑے گا۔ یہ جان لینے کے بعد کہ سیاسی عمل کے ذریعے فوج کو تباہ کرنے کی کوشش بے سود ثابت ہو گی انھوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ فوج کو جنگ کے ذریعے کچل دیا جائے۔ اس بلائے عظیم کا مکمل صفایا اسی صورت میں ممکن ہے کہ بھارت کو کسی طرح فوج کے خلاف قدم اٹھانے پر راضی کیا جا سکے۔ یہ رہنما ایک لمحے کے لیے بھی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ان کی سرگرمی حب الوطنی کے منافی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بھارتی تو صرف مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہوں گے۔ ان کی کاروائی کا مطلب پاکستان کا خاتمہ نہ ہو گا۔ ایک دفعہ فوج کو شکست ہو جائے تو سیاست داں زیادہ آزادی سے ہمارے بے ڈھنگے نظام کو نئے سرے سے تعمیر کر سکیں گے۔ بھارتی جس طرح آئیں گے اسی طرح سرحد کے اس پار لوٹ جائیں گے۔ اور ہمیں اپنے ملک کی گاڑی آپ چلانے کے لیے آزاد چھوڑ دیں گے۔ یہ رہنما خود کو ان علیحدگی پسندوں سے مختلف گردانتے ہیں جو قومی آزادی کی جنگ کے ذریعے اپنے ملک کے حصے بخرے کرنے کی سازش کرتے ہیں۔ ان کا دشمن مملکت پاکستان نہیں، فوج ہے۔

بھٹو صاحب پہلے سیاست دان تھے جنھوں نے بڑی ترکیبیں لڑا کر، صحیح معنی میں، ایسی صورت حال دوبارہ پیدا کی۔ ایک دفعہ 1965ء میں اور دوسری بار 1971ء میں۔ 1965ء میں فوج کی تذلیل نہ ہوئی اور اس کے جرات مندانہ کارناموں نے عوام کے دل جیت لیے۔ بھٹو صاحب ٹھہرے زیرک سیاست دان وہ سمجھ گئے کہ انھیں عوامی جذبات کا ساتھ دینا ہو گا۔ تاشقند معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد بھٹو صاحب نے جنرلوں کے

خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا جنھوں نے مذاکرات کی میز پر پہنچ کر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ بھٹو صاحب نے بڑی وضاحت سے خطِ امتیاز کھینچتے ہوئے فوج کے نچلے عملے کو محب الوطن اور جنرلوں کو غدار قرار دیا۔

1971ء میں ڈھاکے میں پاکستانی فوج کی شکست کے بعد بھٹو صاحب کا خواب پورا ہو گیا۔ شکست سے جو خلا پیدا ہوا تھا اس کے اندر انھیں خاصی آسانی سے من مانی کاروائیاں کرنے کا موقع مل گیا۔ حد یہ کہ اس وقت بھی، جب فوج سنبھالا لے رہی تھی، ان کا اعتماد بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے فوج کی امیج بحال کرنے میں مدد دی۔ جب 1977ء میں ایک اور سیاسی تعطل کی نوبت آئی تو فوج میں اتنا اعتماد آ چکا تھا کہ اس نے 5 جولائی کو حکومت پر قبضہ کر لیا۔

مصطفےٰ کھر اور پی پی پی کے خاصے لوگ اس وائرس کا شکار ہو گئے جسے بھٹو صاحب نے پالا پوسا تھا اور پھر اس پارٹی میں، جس کے وہ قائد تھے، پھیلا دیا تھا۔ ان لوگوں کی نظر میں بھارتیوں سے رابطہ قائم کرنے کی جو بدترین تشریح کی جا سکتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ انسان ہر طرف سے مایوس ہو کر کچھ بھی کر گزرنے پر اتر آتا ہے۔ ان کے حماقت مآب نظریے کے مطابق اس رابطے کو غداری کا مترادف نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسے وہ بھٹوازم کہتے ہیں۔

سیاسی طیف کے دائیں طرف واقع پارٹیاں اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں رکھتیں۔ انھیں اتنا فہم ضرور ہے کہ فوج اہم ادارہ ہے اور اگر یہ موجود نہ ہو تو پاکستان بھارت کے رحم و کرم پر ہو گا جو اس پورے خطے پر حکم چلانے کا خواہاں ہے۔ بظاہر بے پایاں مارشل لا کے تاریک ترین دور میں بھی ان کے ذہن بھٹک کر کسی ایسے حل کی طرف مائل نہ ہوئے جس پر ملک دشمن ہونے کا خفیف سا گمان بھی ہو سکے۔ یہ میلان رکھنے والے بہت سے رہنما فوج کو کھیل میں شریک کرنے پر آمادہ ہیں اور اسے اقتدار میں بھی حصہ دینے کو تیار ہیں۔

مصطفےٰ کھر کی بیگم ہونے کے ناتے مجھے فوج سے نفرت کرنے اور گھن کھانے کا سبق رٹایا گیا تھا۔ میرا ذہن ایسے سانچے میں جکڑا جا چکا تھا کہ اس سے کوئی اور ردعمل متوقع ہی نہ تھا۔ بیشتر آزاد خیال حضرات، جن سے مجھے بعد میں ملنے کا اتفاق ہوا، مصطفےٰ کے نظریے سے بھی زیادہ انتہا پسندانہ نظریوں کے حامی دکھائی دیے۔ انھیں بھارت سے اتنا عناد نہیں تھا جتنی نفرت اس کردار سے تھی جو فوج کا ہماری ملکی سیاست کے حوالے سے رہا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا انتشار ہے جسے تاریخ نے جنم دیا ہے۔ مجھے پتہ ہونا ہی چاہیے۔ کبھی میں بھی اسی انتشار کا حصہ تھی۔ اب میں معاملات کو بہتر طور پر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سمجھتی ہوں۔

پاکستان پیپلزپارٹی پر اتنا دباؤ تھا کہ بنیادی غلطی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کی قیادت نے، جو آمر سے اقتدار چھیننے کے لیے مایوسانہ ہاتھ پیر مار رہی تھی، پاکستان کے روایتی دشمن، بھارت سے خفیہ مذاکرات شروع کر دیے۔ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں اور بھارتی رہنماؤں سے باقاعدہ رابطے رکھے جانے لگے۔ ان تمام باتوں کو خفیہ رکھا گیا کیوں کہ ان کی اگر ذرا سی خبر بھی باہر آ جاتی تو پنجاب، جہاں سے پیپلزپارٹی کو سب سے زیادہ ووٹ مل سکتے تھے، برگشتہ ہو جاتا۔

بھارتیوں نے میر اور شاہنواز کو سیاسی پناہ کی پیشکش کی تھی۔ وہ ان کے لیے بھارت میں تربیتی کیمپ قائم کرنے اور ضروری سازوسامان بہم پہنچانے پر بھی آمادہ تھے۔ میر اور شاہنواز نے اس پیشکش کو قبول نہ کر کے سمجھ داری کا ثبوت دیا۔ بھارت نہ جانے کا فیصلہ اس وجہ سے نہیں کیا گیا تھا کہ انہیں بھارت سے کوئی بغض تھا۔ سیاسی مصلحت پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ بھارت نہ جائیں۔ ہر اس تحریک کا جسے بھارت کی سرپرستی حاصل ہو پاکستان کے قلبستان (پنجاب) میں، جہاں حب الوطنی کا سب سے زیادہ شور تھا، ناکام ہونا یقینی تھا۔ کابل بہتر چناؤ تھا۔ اس کی انہیں کوئی پروا نہ تھی کہ کابل، ماسکو اور دہلی کا ایک محور موجود ہے۔ یہ تینوں طاقتیں ضیاءالحق کو نشانہ بنانا چاہتی تھیں۔ میر اور شاہنواز کی کابل میں گاڑھی چھنی۔ ضیاء نے افغانستان کے بارے میں جو موقف اپنایا تھا اور جس طرح سکھ علیحدگی پسندوں کی چوری چھپے مدد کر رہا تھا اس پر روسی اور بھارتی سخت برہم تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ضیا کو بھی ناکوں چنے چبوائے جائیں۔ الذوالفقار کچوکوں پر کچوکے دے کر آہستہ آہستہ اسے ختم کر سکتی تھی۔

مصطفےٰ کو معلوم تھا کہ کنفیڈریشن کا چکر بھارتیوں نے چلایا ہے۔ کنفیڈریشن کے حق میں پیپلزپارٹی کے دو سربرآوردہ رہنما سب سے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ بے نظیر نے شروع میں حفیظ اور ممتاز کو پارٹی سے نکالنے میں جو تامل ظاہر کیا تھا اس سے شبہ پیدا ہوتا تھا کہ کنفیڈریشن کی سکیم میں اس کا بھی کوئی کردار ہے۔ توقع یہ کی جا رہی تھی کہ چھوٹے صوبے اس سکیم کو قبول کر کے پنجاب کے خلاف متحد ہو جائیں گے۔ کنفیڈریشن پسندوں نے خود کو سندھ بلوچ پختون محاذ کا نام دے کر اپنی توپوں کا رخ کھلم کھلا پنجاب کی طرف موڑ دیا۔ یہ خیالی منظر کہ پاکستان آخرش ٹوٹ پھوٹ کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ جائے گا کوئی نیا نہ تھا۔ ایسی علیحدگی پسند تحریکوں نے، جو آزاد سندھودیش، عظیم تر بلوچستان یا پختونستان کی مانگ کرتی رہتی تھیں، پہلے دن سے ہماری سیاست میں فساد پھیلا رکھا تھا۔ پاکستان کی تین قومیتیں پہلی بار ایک

ایسے پلیٹ فارم پر یکجا ہوئی تھیں۔ جو فیڈریشن کے پرخچے اڑا دینے کے لیے بنایا گیا تھا۔ جو رہنما اس مقصد کے لیے اکٹھے ہوئے تھے ان میں وہ شخص بھی شامل تھا جس نے ہمارا 1973ء کا آئین قلم بند کیا تھا۔ پیپلزپارٹی کی قیادت کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ پنجابی فوج سے عناد رکھتی ہے۔ اس نے کنفیڈریشن کے تصور کو اس خیال سے خوش آمدید کہا ہو گا۔ اور کچھ نہ سہی تو اس بہانے پنجاب کی بالادستی ختم کرنے کی امید تو ہے۔

بھارتی پیپلزپارٹی کی ایک اور اہم گروہ بندی میں بھی پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں پنجاب سے ایک رہنما کی تلاش تھی کہ آخری پانی پت تو پنجاب ہی نے بننا تھا۔ یہ سب سے فریب آمیز پلان تھا۔ اس سے پاکستان کے دل پر ضرب پڑتی تھی۔ انہوں نے مصطفےٰ کھر کو اپنے آلہ کار کے طور پر چنا۔

مجھے مصطفےٰ کے بھارتی رابطے کا پہلی بار 1980ء میں پتہ چلا۔ ان دنوں میرے بیٹے علی کی پیدائش متوقع تھی۔ میری بہن زرمینہ کی شادی کے دوران مصطفےٰ بھارت چلا گیا۔ وہ میرے لیے ڈھیر سارے ملبوسات لے کر آیا۔ ساتھ ہی وہ ان کے "آدمی" بن کر لوٹا۔

اُس نے اندرگاندھی سے اپنی ملاقات کے بارے میں مجھے بتایا۔ وہ اندرا سے ملنے گیا جس کی رہائش گاہ نئی دہلی میں سفدر جنگ روڈ پر واقع تھی۔ دن کا وقت تھا۔ اُسے لے جا کر لونگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ میز پر "ٹائم" کا کوئی شمارہ پڑا تھا۔ مصطفےٰ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ گھر بہت سادہ ہے۔ اس میں ٹیم ٹام بالکل نہیں ایسا گھر نہیں تھا جسے اثر آفرینی کے لیے مزین کیا گیا ہو۔ اس میں مرورِ ایام کے ساتھ خود بخود نکھار آتا گیا تھا۔ اس گھر کا اپنا مزاج تھا۔

اندراگاندھی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے انداز میں سادگی تھی۔ وہ اپنا مافی الضمیر بے تکان بیان کر سکتی تھی لیکن یہ خیال کبھی نہ آتا تھا کہ وہ مرعوب یا دھونس جمانا چاہتی ہے۔ اس سے نباہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ انہوں نے گھنٹے بھر بات کی جس کے دوران جمہوریت کی بحالی اور بھٹو صاحب کے قتل پر تبادلۂ خیال ہوا۔ انہوں نے پاک بھارت تعلقات پر بھی غور کیا۔ دونوں ہمسایہ ملکوں میں پائی جانے والی مسلسل مخاصمت کی وجوہ کا تجزیہ کرنا چاہا اور اسلحہ کی دوڑ کا، جو سراسر گھاٹے کا سودا تھا، جائزہ لیا۔ اندرا کا خیال تھا اور مصطفےٰ نے اس سے اتفاق کیا کہ سرحدوں پر کشیدگی کو برقرار رکھنا فوج کے مفاد میں ہے۔ فوج پاکستان کے قلیل وسائل کو ہڑپ کیے جا رہی تھی۔ فوج کی وجہ سے پاکستان زیادہ تیز رفتاری سے ترقی نہ کر پا رہا تھا۔ فوج نے ہمارے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

عوام کو غریب رکھا ہوا تھا، جنہیں نہ کھانے کو ٹھیک طرح کچھ ملتا تھا نہ پہننے کو اور جن کے پاس رہنے کے لیے گھر تک نہ تھے۔ فوج جمہوری اداروں کی تعمیر میں روڑے اٹکاتی رہتی تھی اور سیاست دانوں کو شک کی نظر سے دیکھتی تھی وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فوج کی نفری میں کمی کرنی پڑے گی۔ پاکستان کی فوج تھوڑی کر دی جائے تو بھارت اپنے وسائل کو مسلح افواج پر صرف کرنے کے بجائے ان کا رخ صنعتی اور ترقیاتی منصوبوں کی طرف موڑ سکے گا۔ بھارت عظیم اقتصادی طاقت بننے کا خواہاں تھا اور اس کا یہ خواب صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا تھا کہ اسے پاکستانی فوج کے وبال سے نجات مل جائے۔

اندرا گاندھی خوب جانتی تھی کہ پاکستانی فوج کبھی اقتدار سے پرامن طور پر دست بردار نہ ہو گی۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستانی فوج کو جنگ میں شکست دے کر بے عزت کرنا پڑے گا۔ پچھلی بار بھٹو صاحب غلطی کر بیٹھے تھے۔ جس فوج نے بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے وہ اسی فوج کے مورال کو دوبارہ بلند کرنے میں لگے رہے۔ فوج نے شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں پھانسی چڑھا دیا۔ "ہمیں آپ کی فوج کو کچلنا اور ذلیل کرنا پڑے گا۔ صرف اسی کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان ہم آہنگی فروغ پا سکتی ہے۔ صرف اسی کے بعد آپ اپنے ملک میں سول قانون کی بحالی کی امید کر سکتے ہیں۔"

یہ ساری باتیں مصطفٰے نے بارہا سنی تھیں۔ بھٹو صاحب ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ فوج صرف محاذ جنگ پر شکست کھانے کے بعد اقتدار شہریوں کو منتقل کرنے پر تیار ہو سکتی ہے۔ ان کا کہا 1971ء میں درست ثابت ہوا۔ وہ اتنے مال اندیش نہ تھے کہ شکست خوردہ فوج کے دل میں اپنی تلوار اتار دیتے۔ وہ ہچکچائے اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لالچ میں ایسا موقع ضائع کر دیا جو زندگی میں ایک ہی بار ملتا ہے۔ بھٹو صاحب کا نظریہ ان کے مقلدین کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکا تھا۔ پیپلز پارٹی میں بہت سے لوگ اسی کو آخری حل سمجھتے تھے۔ اس خیال کے حامیوں میں مصطفٰے کھر کو بھی شامل سمجھئے۔

اس حیرت ناک انکشاف کے حوالے سے میرا ردعمل عجیب تھا۔ میں یہ تو سمجھ گئی کہ مصطفٰے نے جو کچھ کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے اس کے مضمرات کیا ہوں گے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اُس نے جو کچھ کیا حب الوطنی کے خیال سے کیا۔ اُس کے دلائل دل کو لگتے تھے۔ "جو کچھ میں کرنے والا ہوں اسے غلط سمجھا جائے گا۔ پاکستان کے لوگ ان پڑھ ہیں۔ ایک ہی خیال سے سختی سے چمٹے رہتے ہیں۔ پہلے سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آگے چل کر کیا ہو گا۔ ہمیں مال اندیش ضرور ہونا چاہیے۔ ان کی نظر میں بھارت دشمن نمبر ایک ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ان کی اصل دشمن فوج ہے جو انہیں بہتر مستقبل

سے محروم کر رہی ہے۔ میرا منصوبہ طویل المیعاد ہے۔ یہ منصوبہ ہمارے مستقبل کے لیے ہے۔ ہمارے بچوں کے لیے ہے۔ ملک کے خاص الخاص طبقے کی یہ سمجھ میں نہ آئے گا۔ وہ منصوبہ کو ضرورت سے زیادہ انتہا پسندانہ قرار دے کر اسکی مخالفت کریں گے۔ انہیں پتہ ہے کہ یہ معاملہ صرف فوج تک محدود نہیں رہنے دیں گے۔ انہیں بھی اپنی ناجائز ذرائع سے اکٹھی کی ہوئی دولت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ وسیع پیمانے پر اصلاحات کی جائیں گی۔ فوج کی تباہی تو محض پہلا قدم ہے۔ اسی لیے یہ راز خطرناک ہے"

میں حیران ہوں کہ مصطفٰے کو، جو پارٹی ڈسپلن کا اس قدر سختی سے قائل تھا، اپنی چیئرپرسن اور شریک چیئرپرسن کی اشیرباد حاصل تھی۔ پیپلزپارٹی کے ہاتھ میں اب ترپ کا بھارتی پتا آ گیا تھا۔ جب بھی یہ محسوس ہوا کہ اس کے اقتدار میں واپس آنے کی منزل رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی ہے پارٹی یہ پتا چل دے گی۔

بھارت یاترا کے بعد مصطفٰے زیادہ نڈر ہو گیا اُس میں اپنے خیالات کو چھپوانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ "اکانومسٹ" نے مصطفٰے کا مضمون چھاپا۔ اسے چھوٹا موٹا کارنامہ سمجھنا ہو گا۔ "اکانومسٹ" کی حد تک یہ غیر معمولی بات تھی کہ اس کے صفحات پر تیسری دنیا کے کسی ملک کی حزب اختلاف کے ایک غیر معروف رہنما کا مضمون اس کے نام سے چھپے۔ مضمون چار صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کے ساتھ بھارت کے تعلقات سے بحث کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ حالات کو معمول پر لانے کے عمل میں فوجی حکومت رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ مضمون کا یہ نزاع انگیز حصہ پڑھ کر وہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے جو مصطفٰے کو "شیر پنجاب" کے نام سے جانتے تھے۔ زیتون کی شاخ پنجابی سیاست داں کے ہاتھ میں بے تکی معلوم ہوتی تھی۔ یہ مضمون لکھنے پر اس کی پارٹی نے مصطفٰے کی سرزنش نہیں کی۔ پارٹی کے سکوت نے مصطفٰے کے موقف پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

ایک نامی گرامی اخبار میں مضمون کی اشاعت سے نئے نئے بنے ہوئے اتحادیوں کی نظر میں مصطفٰے کی اہمیت کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ خوش ہوئے کہ ان کے آدمی میں اپنے موقف کو اخبار میں چھپوا دینے کی ہمت ہے۔ انہوں نے مصطفٰے سے خصوصی مراسم استوار کرنے کا فیصلہ کیا۔ بھارت کے ساتھ ربط ضبط کو سرکاری شکل دے دی گئی۔ مصطفٰے کی ملاقات اعلیٰ مرتبے پر فائز ایک انٹیلی جنس افسر سے کرا دی گئی جو انگلینڈ میں انڈین ہائی کمیشن میں تعینات تھا۔ اس کا نام جوشی تھا۔ سازش اور جاسوسی کا جو ڈراما وہ رچا رہے تھے اس کی مناسبت سے انہوں نے ایک دوسرے کے خفیہ نام رکھے۔ مصطفٰے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بھارتی ہائی کمیشن کو فون کر کے کہتے کہ "آصف علی" سے بات کرنی ہے۔ اپنا نام وہ "دلیپ" بتاتے ایک دوسرے کے زیادہ قریب آنے کے شوق میں جوشی اور مصطفےٰ نے اپنے مذہبی تشخص تک کا ادلا بدلا کر لیا تھا۔ اس دوقومی نظریے کو، جس کی وجہ سے پاکستان وجود میں آیا تھا، طنز آمیز انداز میں تیاگ دیا گیا۔ جو منصوبے بنائے جا رہے تھے ان سے اس نظریے کی مکمل نفی کی نوبت آ سکتی تھی۔

ملاقات کا وقت ٹیلی فون پر طے کیا جاتا۔ دونوں ہمیشہ کسی وِمپی بار میں ملتے جو لندن میں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ وہ ساتھ بیٹھ کر پلاسٹک کے ان لال ڈبوں سے، جن کی شکل کسی عجیب وغریب بنا پر، حلوا کدو جیسی ہوتی ہے، بے مزہ اور مشینی انداز میں بنے برگروں پر ٹماٹو کیچ اپ نچوڑتے رہتے۔ تلے ہوئے آلو پاروں پر دونوں ملکوں کے مستقبل پر اور مخصوص نوعیت کی چالوں گھاتوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا جاتا۔ ملاقات ہر بار کسی مختلف وِمپی بار میں ہوتی۔ میں نادانستہ طور پر، پھندست بنی، متعدد بار مصطفےٰ کے ساتھ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ میں آس پاس کی کتابوں کی دکانوں میں وقت گزارتی اور موقع سے فائدہ اٹھا کر رسالوں وغیرہ کو دیکھتی رہتی جنہیں مجھے ہاتھ لگانے کی بھی ممانعت تھی۔ ان کی ملاقات کوئی گھنٹے بھر جاری رہتی۔ ان میں جو بات چیت ہوتی اس سے مجھے کوئی خاص دل چسپی نہ تھی۔ مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ میرا شوہر بھارتیوں سے مل کر پاکستان میں جمہوریت بحال کرنے کے کسی منصوبے کی تفصیلات پر کام کر رہا ہے۔

ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ بعض دفعہ مصطفےٰ جوشی سے ہفتے میں دو بار ملتا۔ ملاقات ہر بار جوشی سے ہوتی۔ مستقل رابطہ اسی سے تھا۔

ہم چھٹیاں منانے شارجہ جا رہے تھے۔ پرواز کے دوران مجھے بتایا گیا کہ ہم بھارت بھی جائیں گے۔ راجیو گاندھی سے ملاقات کا بندوبست ہو چکا ہے۔ سنجے گاندھی، جو اندرا کا سیاست داں بیٹا تھا، پائلٹ بننے کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ راجیو گاندھی، جو اندرا کا پائلٹ بیٹا تھا، اب سیاست داں بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ملاقات کا بندوبست ہماری ایک دوست، فریدہ میسنر، نے کیا تھا جو شارجہ میں رہتی تھی۔ اس کی گاندھی خاندان سے دوستی تھی۔

ملاقات کا وقت طے ہو جانے تک ہم شارجہ میں انتظار کرتے رہے۔ دہلی روانہ ہونے سے ذرا پہلے مصطفےٰ نے بڑی بیوقوفی کی حرکت کی۔ شام کے وقت ہم سلمان تاثیر اور اس کی دوست تولین سنگھ کے ساتھ تھے۔ جو ایک بھارتی صحافی ہے۔ مصطفےٰ نے ذکر کیا کہ وہ کل دہلی جا رہا ہے۔ سلمان نے بھی دہلی چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے پاس

ویزا نہیں تھا اور ایسی کوئی صورت بھی نہیں تھی کہ اتنے مختصر نوٹس پر ویزا مل سکے۔ مصطفےٰ نے شیخی میں آ کر کہا کہ وہ "انتظام کر لے گا۔" مجھے قدرے تعجب ہوا۔

ہم دہلی پہنچے۔ وہاں انٹیلی جنس کے افسر ہمارے منتظر تھے۔ وہ ہمیں آن کی آن میں امی گریشن کے سارے جھنجھٹ سے نکال کر لے گئے۔ سلمان کو روک لیا گیا۔ وہ ویزا کے بغیر باہر نہ جا سکتا تھا۔ تولین نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ امی گریشن حکام نے ہم دونوں کو کیسے جانے دیا جب کہ ویزا ہمارے پاس بھی نہ تھا۔ تولین معروف صحافی تھی۔ ہماری آمد راز نہ رہی۔

اگر یہ خبر اخباروں میں آ جاتی تو بڑا سنسنی پھیلانے والا سکوپ ثابت ہوتی۔ اس خبر کو دبانے کی غرض سے انٹیلی جنس افسروں نے مداخلت کی اور سلمان تاثیر کو ویزا کے بغیر بھارت میں داخل ہونے دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ مصطفےٰ نے بہت بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے۔ اُس نے ہمارے ساتھیوں کو یہ تو نہیں بتایا تھا کہ وہ راجیو گاندھی سے ملنے جا رہا ہے۔ بہر حال، اس بات پر کہ وہ بھارت جا رہا تھا اور اتنی حیثیت کا مالک تھا کہ ہوائی اڈے پر ایک معمولی پاکستانی سیاست داں کے لیے ویزا کا بندوبست کر سکتا تھا۔ لوگوں کو ضرور اچنبھا ہوا ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارا معاملہ ہمارے میزبان کو ذرا نہ بھایا۔ ہوائی اڈے پر ہونے والی چخ چخ سے راجیو کو مطلع کر دیا گیا اور اس نے مصطفےٰ سے مل کر کسی طرح کی بدنامی مول لینے سے انکار کر دیا۔ ہمیں راجیو کی طرف سے ایک مختصر اور روکھا پیغام ملا۔ اس نے ایک بھارتی صحافی کے ساتھ سفر کرنے اور اپنی خفیہ آمد کو توجہ کا مرکز بنا لینے پر مصطفےٰ کو جھاڑا، افسوس ظاہر کیا کہ اس بار وہ ان سے نہ مل سکے گا اور کہا کہ آئندہ زیادہ احتیاط کا ثبوت دیا جائے۔

ہم اوبیرائے کی مہربانی سے، جو فریدہ میسنر کا دوست تھا، اوبیرائے ہوٹل میں ٹھیرے۔ ہمیں دہلی سے باہر ان کے فارم پر بھی مدعو کیا گیا اور بعض پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ سیاست کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ راجیو نے مصطفےٰ سے بات کرنا بھی گوارا نہ کی۔

ڈیڑھ ماہ بعد مصطفےٰ نے راجیو گاندھی کے ساتھ ایک اور ملاقات کا بندوبست کیا۔ اس بار وہ اپنے رابطے یعنی جوشی کے حوالے سے بھارت پہنچا اور راجیو سے ملا۔ بعد میں مصطفےٰ نے مجھے بتایا کہ اُس نے دیکھا راجیو کے سیاسی قدوقامت میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ پُراعتماد تھا اور مصطفےٰ کا نقطۂ نظر سمجھ گیا۔ مصطفےٰ کو بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ بتدریج

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ابھر کر سامنے آنے والے سیاسی منظر کی باریکیوں پر اس کی کتنی گہری نظر ہے۔ راجیو نے اس منصوبے سے اتفاق کیا جس پر مصطفےٰ بھارتیوں کو اپنا ہمنوا بنانا چاہتا تھا۔ مصطفےٰ سنجے کا معترف تھا اور اس کی الم ناک موت کی خبر سن کر افسردہ ہوا تھا۔ راجیو سنجے جیسی ساحرانہ کشش کا مالک تو نہ تھا لیکن مصطفےٰ کو بہت ملنسار لگا۔ مصطفےٰ نے محسوس کیا کہ ملاقات اچھی رہی ہے۔

جوشی کے ساتھ ملاقاتیں باقاعدہ وقفوں سے جاری رہیں۔ کسی منصوبے کو شکل دی جا رہی تھی۔

مصطفےٰ پاکستان کی مسلح افواج میں چوری چھپے نفوذ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ غیر مطمئن فوجی افسروں کا ایک گروپ اس سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔ یہ جونیر افسر جنرل ضیا سے ناخوش تھے اور سمجھتے تھے کہ فوج کا کوئی کام نہیں کہ ملکی سیاست میں دخل دیتی پھرے۔ ان کی نظرِ انتخاب مصطفےٰ پر اس لیے پڑی کہ ان کے خیال میں مصطفےٰ دبنگ آدمی تھا۔ جن اصلاحات کی افسروں کے نزدیک ملک کو ضرورت تھی انہیں مصطفےٰ جیسا سیاست دان ہی نافذ کر سکتا تھا۔ ان کا پنجابی رہنما ہونا سونے پر سہاگا تھا۔ افسر جانتے تھے کہ پاکستان میں سول حکومت کی بحالی کے لیے چلائے جانے والی کوئی بھی تحریک اہلِ پنجاب کی تائید اور شرکت کے بغیر مؤثر نہیں ہو سکتی۔ انہیں یقین تھا کہ مصطفےٰ پنجاب کے عوام کو صف آرا کرنے اور تحریک میں حصہ لینے پر اکسانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

نوجوان فوجی باغیوں نے محسوس کیا کہ جنرل اور اس کے حواری جنرلوں کو ٹھکانے لگانا پڑے گا۔ جمہوریت کو بحال کرنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ عدالتیں بہت زیادہ اطاعت گزار ثابت ہوئی تھیں۔ اور عوام میں، جو جبرو تشدد کا نشانہ بنتے رہے تھے، اٹھ کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی۔

نوجوان افسروں سے ابتدائی رابطے تھوڑے تذبذب کے ساتھ قائم کیے گئے کہ دیکھیں تو سہی ان کی نیت کیا ہے۔ طرفین پینترے بدل بدل کر ایک دوسرے کو آزماتے رہے۔ انہوں نے لندن میں ایک مشترکہ دوست کے فلیٹ پر ملاقات کی۔ مصطفےٰ کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ وہ ہمیشہ سے یہ امید لگائے ہوئے تھا کہ ایک نہ ایک دن فوج کی زرہ بکتر میں کوئی رخنہ ڈھونڈ نکالے گا۔ اُس نے فوج کے نوجوان افسروں سے رومانی تصورات وابستہ کر رکھے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ ان افسروں کے درمیان سے کوئی انقلابی قیادت ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ جنرل بددیانت تھے۔ نچلے درجے کے افسر اور سپاہی وطن دوست پیشہ ور تھے۔ ان افسروں کی صورت میں انہیں اپنی امید

پوری ہوتی اور خواب شرمندہ تعبیر ہوتے دکھائی دیے۔ اب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ ضیا کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ فوج کی نچلی صفوں میں سر کشی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ضیا کے اپنے حلقۂ انتخاب نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

منصوبہ تیار کیا گیا۔ طے یہ پایا کہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ نوجوان افسر ایک بم نصب کر دیں گے۔ جب فوج کے اعلیٰ عہدے دار کسی اجلاس کے لیے اکٹھے ہوں گے تو بم پھٹ جائے گا۔ بات چیت کے ذریعے تاریخ اور جگہ کا تعین ہو گیا۔ بم پھٹتے ہی فوجیوں کے گروہ دھاوا بول کر پاکستان بھر میں ریڈیو اور ٹیلی وژن سٹیشنوں پر قبضہ کر لیں گے۔ جنرلوں کے خلاف ایک جوابی بغاوت برپا ہو گئی۔ پیپلز پارٹی کے قائد کو وزیر اعظم بنا دیا جائے گا۔ نئی حکومت میں مصطفےٰ کھر کو نمبر دو کا مقام حاصل ہو گا۔ ضیا اور اس کے ساتھیوں کی موت سے ملک بے یقینی اور افراتفری کا شکار ہو جائے گا۔ تمام جلاوطن پاکستان لوٹ آئیں گے۔ عوامی طاقت کو اس طرح مجتمع کیا جائے گا کہ کوئی اور جنرل کبھی اقتدار پر قبضہ نہ کر سکے۔ اب سب پر، جو 1977ء کی بغاوت میں ملوث تھے، غداری کے الزام میں مقدمہ چلے گا۔ "بجلی کے ہر کھمبے سے جنرل لٹکتے نظر آئیں گے۔" جو بھی مجرم پایا گیا اسے بخشا نہیں جائے گا۔ فوج کی تطہیر کی جائے گی۔ فوجی آمروں کا ساتھ دینے والوں کو بے نقاب کر کے ان پر مقدمے چلائے جائیں گے۔

چھ سال بعد، ٹھیک اس دن جو ناکام سازش کے لیے چنا گیا تھا، مصطفےٰ کا زاجی وژن حیقیقت بن کر سامنے آیا۔ جنرل ضیا اور اس کے قریب ترین ساتھیوں کو دھماکے سے اڑا دیا گیا۔ لیکن یہ دھماکا زمین پر نہیں فضا میں ہوا۔ جن لوگوں نے اقتدار سنبھالا وہ اتنے منتقم مزاج نہیں تھے۔ جتنا شاید مصطفےٰ ہوتا۔ انہوں نے عین اس وقت جب، فیصل مسجد کے احاطے میں ضیا کی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی پرانے جھگڑوں پر مٹی ڈال کر صلح صفائی کی راہ ہموار کر دی۔

منصوبے پر عمل در آمد کے لیے "لڑکوں" کو ہتھیار درکار تھے۔ انہوں نے ہتھیاروں کی فہرست تیار کی۔ وہ فہرست مصطفےٰ نے سنبھال کر رکھنے کے لیے مجھے دے دی۔ مجھے یاد ہے فہرست پر میں نے نظر ڈالی تھی۔ خطرناک معلوم ہوتی تھی۔ اسلحہ اور ایمونیشن کی خریداری کا بندوبست مصطفےٰ کے ذمے تھا۔ انہیں کوئی ایسا آدمی تلاش کرنا تھا جو اس اسلحہ اور گولا بارود کو پاکستان سمگل کر کے "لڑکوں" تک پہنچا دے۔ خریداری کا مسئلہ طے پا گیا۔ جوشی نے ایک اور ربڑ نما بر گر کھاتے ہوئے اسلحہ کی فراہمی کی ہامی بھر لی۔ اسلحہ کو پاکستان میں مقررہ جگہ تک پہنچانا زیادہ ٹیڑھا مسئلہ تھا۔

علی محمود کو اعتماد میں لیا گیا۔ وہ ابو ظبی میں تعمیراتی ٹھیکوں سے ڈھیر، پیسہ کما چکا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تھا اور اس آپریشن کے اخراجات برداشت کر سکتا تھا۔ مصطفیٰ نے اس معاملے پر اس کے ساتھ بات چیت کی۔ معاوضے کے طور پر یہ لالچ دیا گیا کہ نئی حکومت میں اسے وزیر خزانہ بنا دیا جائے گا۔ علی اور اس کی بیگم بلو اب مصطفیٰ کے سیاسی حلیف بن گئے۔

ہم علی کے گھر منتقل ہو گئے جو ویلون گارڈن سٹی میں واقع تھا۔ واقعات زیادہ تیزی سے پیش آنے لگے۔ جوشی نے پاکستانی سرحد کے پاس ایک بھارتی گاؤں میں اسلحہ ذخیرہ کرنے کا بندوبست کر دیا۔ اسلحہ لکڑی کے کریٹوں میں بند تھا اور کریٹوں پر ترتیب وار نمبر لگے ہوئے تھے۔ اب کسی ایسے آدمی کی تلاش شروع ہوئی جو اس ممنوعہ مال کو سمگل کر کے پاکستان لا سکے۔ جب یہ اسلحہ وہاں سے لیا جائے گا تو بھارتی بارڈر گارڈز اور کسٹم والے یہ ظاہر کریں گے جیسے انہیں پتہ ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ مصطفیٰ کو کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اس علاقے سے بخوبی واقف ہو اور پاکستانی کسٹم والوں اور فوجی چوکیوں سے بچ کر آ جا سکتا ہو۔

ایک روپے کے نوٹ کو دو حصوں میں پھاڑ گیا۔ آدھا حصہ بھارتی رابطے کے حصے میں آیا۔ باقی نصف سمگلر کو دیا جانا تھا۔ اسلحہ کی ڈلیوری لینے اور اس لین دین کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے دونوں ٹکڑوں کا یکجا ہونا ضروری تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی چالیں اسی کو سوجھ سکتی ہیں جو سستی قسم کی سنسنی سے بھرپور بھارتی فلمیں دیکھتا رہتا ہو۔ لیکن یہ فلم نہ تھی، عین حقیقت تھی۔

سمگلر کا کردار ادا کرنے کے لیے سیٹھ عابد کے چناؤ میں کسی پس وپیش کی گنجائش نہ تھی۔ وہ ہمارا دوست تھا۔ اس نے مالی طور پر ہماری مدد کی تھی اور اپنے برونڈز بیری پارک والے گھر میں ہمیں قیام کرنے دیا تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ محمود ہارون کے بہت قریب ہے جو ضیا کی کابینہ میں وزیر تھا۔ سیٹھ عابد کا بہنوئی/سالا مسعود، محمود اس مقدمے میں وعدہ معاف گواہ بنا تھا جس نے بھٹو صاحب کو تختۂ دار تک پہنچا دیا تھا۔ سیٹھ عابد کے بڑے پائے کا سمگلر ہونے میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہ تھی لیکن ضیا حکومت سے اس کی راہ ورسم شروع شروع میں ہماری آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ یہ الزام بھی تھا کہ سیٹھ عابد ایٹمی راز اور پرزے پاکستان سمگل کرتا رہا ہے۔

مصطفیٰ کے ایک پرانے ساتھی تصویر شاہ سے رابطہ قائم کیا گیا۔ وہ مصطفیٰ کے ساتھ شکار کھیلتا رہا تھا۔ مصطفیٰ محسوس کرتا تھا کہ اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ تصویر شاہ چونکہ اس علاقے میں شکار کھیلتا رہا تھا اس لیے وہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ علاوہ ازیں اس کے بہادر اور دبنگ ہونے کا شہرہ بھی تھا۔ اسے لندن طلب کیا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ بھارت سے چند کریٹ سمگل کر کے پاکستان لانے ہیں۔ لیکن یہ

پتہ نہیں دیا گیا کہ کریٹوں میں کیا ہے۔ تصویر شاہ مصطفیٰ کے لیے ہر کام کرنے کو تیار تھا۔ تصورشاہ کا بار بار انٹرویو لیا گیا اور آخر میں مصطفیٰ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اس کام کے لیے موزوں نہیں۔ اس میں جتنا جوش یا حوصلہ تھا تجربہ اتنا نہ تھا۔

طے پایا کہ سیٹھ عابد سے رابطہ قائم کیا جائے۔ یہ بہت بڑا جوا تھا۔ مصطفیٰ کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا تھا۔ جنرل ضیا سے نفرت نے اُسے اندھا کر دیا تھا۔ یہ خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ پلان کا دارومدار اس پر تھا کہ اسلحہ بغیر کسی دقت کے پاکستان پہنچ جائے۔ پاکستان میں صرف ایک ہی شخص اسلحہ کو صحیح جگہ پہنچانے کی ضمانت دے سکتا تھا۔ وہ شخص سیٹھ عابد تھا۔

مجھ سے کہا گیا کہ میں پاکستان سیٹھ عابد کو فون کروں ۔ اس سے نہ تو علی نے بات کی نہ مصطفیٰ نے۔ ذرا تصور کریں اس وقت میری کیا ذہنی کیفیت ہو گی۔ میں غداری کے جرم میں اعانت کر رہی تھی۔ میں وسیلہ بن کر اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر پہنچانے میں مصروف تھی۔ میرا شوہر میرے دامن کی آڑ میں چھپا بیٹھا تھا۔ انٹیلی جنس کی ہر بریفنگ میں ٹیپ پر ہمیشہ میری ہی آواز سنائی دیا کرے گی۔ میں نے فون کیا۔

چند بار گھنٹی بجنے کے بعد سیٹھ عابد نے فون اٹھایا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اس نے بھی مجھے سلام عرض کیا۔ میں نے اصل مدعا بیان کرنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگائی۔ "ہم آپ سے فوراً بات کرنا چاہتا ہے۔ مصطفیٰ چاہتے ہیں کہ آپ لندن آ جائیں۔ ہمیں آپ سے بہت اہم کام ہے۔ ہمیں ایک سلسلے میں آپ کا تعاون درکار ہے۔ جو بات ہے وہ میں اس طرح کھلے بندوں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتی۔..." سیٹھ عابد سہم گیا۔ وہ بہت نروس دکھائی دینے لگا۔ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے پہچاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ "میں ... میں ... میرا خیال نہیں کہ میں... ان سے... بات کر سکتا ہوں۔ میرے خیال میں... مجھے بات کرنی بھی نہیں چاہیے۔ میں پاکستان میں رہتا ہوں۔ خدا کے لیے میرے خاندان کا خیال کریں۔ پلیز بات کو سمجھیں۔" اس کے بعد ذرا دیر کے لیے موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ پھر "سنیں... ار... مجھے دوبارہ فون کریں۔ اسی نمبر پر۔ آدھے گھنٹے بعد"۔ اس نے فون بند کر دیا۔ میں پریشان ہو گئی۔

میں نے علی، بلو اور مصطفیٰ کو بتایا کہ سیٹھ عابد تو بہت نروس ہے۔ مجھے نظر نہیں آتا کہ وہ ہماری مدد کرے گا۔ وہ بہت خوف زدہ ہے۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اس کا فون ٹیپ کیا جاتا ہے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

آدھے گھنٹے بعد میں نے دوبارہ فون کیا۔ اس دفعہ بہت پُر سکون سیٹھ عابد سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے گفتگو کی۔ کرید کرید کر سوال کرتا رہا۔ بعض باتیں مجھ سے دو دو بار کہلوائیں۔ اس کے رویے کی مکمل کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ کہاں آدھے گھنٹے پہلے کا وہ آدمی جو تھر تھر کانپ رہا تھا، کہاں یہ آدمی جو مجسم اعتماد تھا۔ "مصطفٰے چاہتا ہے کہ آپ اُس سے آ کر ملیں۔" میں نے کہا۔ "اوہ، مصطفٰے صاحب چاہتے ہیں کہ میں ان سے آ کر ملوں؟" اس نے دریافت کیا۔ "کام بہت جلدی کا ہے۔" "بہت جلدی کا؟ کیا اس بات کا سیاست سے کوئی تعلق ہے؟ کیا وہ مجھ سے سیاست پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتے ہیں؟ میں حاضر ہو جاؤں گا۔" مجھے سچ مچ ایسا لگا جیسے ٹیپ چلنے کی آواز میرے کان میں آ رہی ہو۔

جب ٹیلی فون پر یہ عجیب و غریب مکالمہ آخر کار اختتام کو پہنچا تو میں نے اپنے خدشات علی، بلو اور مصطفٰے کے گوش گزار کر دیے۔ "یہ شخص گفتگو ٹیپ کرتا رہا ہے۔ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا سارا انداز صرف آدھ گھنٹے میں بدل گیا۔ وہ اتنا پُرسکون کیسے ہو گیا؟ مجھے اتنی دور سے بھی دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔ وہ اچانک ہم پر اتنا مہربان کس لیے ہو گیا ہے؟"۔

مصطفٰے مجھے گھورنے لگا۔ اُس نے کہا کہ میرے اندیشے اعصابی تناؤ کا دورہ پڑنے کا نتیجہ ہیں۔ میں اناڑی ہوں۔ ضرورت سے زیادہ ردعمل ظاہر کر رہی ہوں۔ بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہی ہوں۔ میں نے حیران ہو کر سوچا کہ کہیں وہ خود ہی ضرورت سے زیادہ سادہ لوح اور اعتبار کر بیٹھنے والا تو ثابت نہیں ہو رہا۔ میں نے علی اور بلو سے کہا کہ مصطفٰے کو سمجھائیں کہ سیٹھ عابد پر بھروسا نہ کرے۔ مصطفٰے ان کے اندیشوں کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ جب انہوں نے سنا کہ سیٹھ عابد لندن آ رہا ہے تو ان سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ سیٹھ عابد کی بڑی گرم جوشی سے آؤ بھگت کی گئی۔ سب سے اہم مہرہ بساط پر صحیح جگہ پہنچ گیا تھا۔

صرف پاکستان ہی ایسا ملک ہے جہاں سیٹھ عابد جیسے لوگ پنپ سکتے ہیں۔ اپنی داغ دار شہرت کے باوجود اتراتے پھرتے ہیں۔ انہیں سماجی طور پر قبول کر لیا جاتا ہے اور وہ اپنا کاروبار بغیر کسی دقت کے جاری رکھتے ہیں۔ ان کی دولت کی وجہ سے لوگ انہیں گوارا کر لیتے ہیں۔ یہی دولت انہیں محاسبے سے محفوظ رکھتی ہے۔ ان کے خیال میں سمگلنگ کوئی جرم نہیں بلکہ ایک طرح کی تجارت ہے جس میں جوکھم بہت زیادہ ہیں اور منافع اس قدر ہے کہ جوکھم اٹھانے میں مضائقہ نہیں۔ جس انتظامی ڈھانچے کو ان کے ناپاک منصوبوں کا تدارک کرنے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے وہ اس میں بدعنوانی کا زہر

گھول کر اپنے بچاؤ کا سامان کر لیتے ہیں۔ تحریری معاہدوں کے بغیر اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ دستاویزوں سے تو آدمی پر الزام آ سکتا ہے۔ الفاظ ٹھیرے ہوائی چیز، پکڑ میں نہیں آ سکتے۔ ان کے قول کو زرِقانونی کی حیثیت حاصل ہے۔

سیٹھ عابد سے قول قرار ہو گیا۔ اس نے کرنسی نوٹوں کو سرحد کے پار سے اس پار لانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس نے مصطفٰے کو یقین دلایا کہ ہتھیار مقرر تاریخ کو طے شدہ مقام پر یعنی لاہور کے ایک مکان تک پہنچا دیے جائیں گے۔ پھٹے ہوئے نوٹ کا نصف اور خفیہ نام میرے پاس تھے۔ وہ میں نے سیٹھ عابد کے حوالے کر دیے۔

اس سے پہلے، بائیں بازو کے ایک وکیل، رضا کاظم، کو لندن طلب کیا جا چکا تھا۔ اسے بتا دیا گیا کہ منصوبہ کیا ہے لیکن یہ بات چھپائی گئی کہ اس کا بھارت سے کوئی تعلق ہے۔ اسے مصطفٰے اور نوجوان فوجی افسروں کے درمیان رابطے دار کا فریضہ سونپا گیا۔ "لڑکوں" کا مورال بلند رکھنے کا کام بھی اسی کے ذمے لگا۔ پارٹی کے سرکاری نظریہ ساز کا کردار بھی رضا کاظم ہی کے حصے میں آیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ "لڑکوں" کو مارکسزم کا سبق دے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ وہ پارٹی کے سرکاری لائحۂ عمل سے ذرا بھی ادھر اُدھر نہ ہوں۔

شخصیتیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ "لڑکوں" نے مصطفٰے کو خبر دی کہ رضا کاظم ان کے بارے میں توہین آمیز باتیں کرتا رہا ہے۔ بظاہر کاظم کو یہ ناپسند تھا کہ پارٹی کے سربراہ اعلیٰ کا مقام مصطفٰے کو حاصل رہے۔ وہ خود کو لینن سمجھتا تھا۔ اس نے "لڑکوں" کو یہی بتایا۔ اس کی دانشورانہ اکڑفوں کا نتیجہ الٹا نکلا۔ نوجوان فوجی افسروں نے مصطفٰے کا ساتھ نہ چھوڑا۔

رضا کاظم انقلاب کو ہائی جیک کرنے کی جو کوشش کر رہا تھا۔ اسے مصطفٰے نے سرِدست نظر انداز کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ضیا کا خاتمہ کرنے کا عظیم منصوبہ کسی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے۔

رقوم کا تبادلہ ہوا۔ رضا کاظم کا کام ادھر سے رقم لے کر ادھر پہنچانا تھا۔ رقم جوشی نے فراہم کی تھی۔ وصول "لڑکوں" نے کی۔

جتوئی صاحب کو جزوی طور پر اعتماد میں لیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ کہ وہ تیار رہیں۔ کوئی بہت بڑی بات ہونے والی ہے۔ انہیں ہونے والی فوجی بغاوت کی خبر نہیں دی گئی۔ انہیں بھارتی رابطے کا نہیں بتایا گیا۔ انہیں یہ بھی خبر نہ تھی کہ جنرلوں کو بم سے دھماکے سے اڑانے کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ رقم کہاں سے آئی ہے۔ جوشی سے ملنے والی رقم مصطفٰے نے جتوئی صاحب کو بھجوا دی۔ جتوئی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

صاحب نے رقم رضا کاظم کے حوالے کی۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ جتوئی صاحب کا مزاج بہت زیادہ پارلیمانی ہے اور وہ تشدد کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کی ہر کاروائی کی مخالفت کرتے۔ لیکن ساتھ ہی وہ بہت ہی وفادار دوست بھی تھے۔ انہیں مصطفےٰ پر انتہا کا اعتماد تھا۔

یوم عمل قریب آ پہنچا۔ میں "لڑکوں" سے ٹیلی فون پر رابطہ رکھے ہوئے تھی۔ مجھے یہ احساس تک نہ ہوا کہ میں بھی شریک جرم ہوں۔ میں تمام پیغامات ان تک پہنچاتی رہتی اور کوڈ ایجاد کرنے اور معمائی زبان میں گفتگو کرنے میں خاصی طاق ہو گئی۔ جیسا کتوں، کینریوں اور کبوتروں کے سلسلے میں ہو چکی تھی۔ مصطفےٰ کی بہ نسبت "لڑکوں" کی بہبود اور سلامتی کی فکر مجھے زیادہ تھی۔ مجھے ان سے بہت لگاؤ ہو گیا تھا۔ میں راتوں کو کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہتی۔ مصطفےٰ مزے سے سوتا رہتا۔ وہ فتح کے خواب دیکھ رہا تھا۔

علی، بلو اور مصطفےٰ بیشتر وقت آپس میں صلاح مشورہ کر کے جزئیات کی وضاحت یا پلان کے نقائص دور کرتے رہتے۔ اس بارے میں انہیں کچھ گھبراہٹ تھی کہ وہ ابھی تک کسی سینئر فوجی افسر کو اپنا ہم نوا نہیں بنا سکے تھے۔ کسی ایسے آدمی کو ہاتھ میں لینا انتہائی ضروری تھا۔ فوج کے اعلیٰ ترین افسروں میں کئی کے بارے میں معلوم تھا۔ کہ وہ پیپلز پارٹی سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ طے پایا کہ ان سے رابطہ قائم کیا جائے اور ان کی تائید حاصل کی جائے۔ جنرل رفیع عالم سے رابطہ کیا گیا لیکن اس وقت وہ ہمیں اپنے مطلب کے لیے موزوں نظر نہ آیا۔ وہ انگلینڈ آیا بھی اور ہم سے ملا بھی لیکن اسے منصوبے کی خبر تک نہ دی گئی۔

اب لے دے کر ہمارے پاس جنرل کلو رہ گیا۔ بلو اس سے بات کرنے پاکستان گئی۔ علی اس کے ہمراہ نہ جا سکا کیونکہ اس کے خلاف پاکستان میں ٹیکسوں کے حوالے سے مقدمات درج تھے۔ بلو جنرل کلو سے مل کر خوش خوش واپس آئی۔ اس نے اپنی ملاقات کی ساری تفصیل مصطفےٰ اور علی کے سامنے بیان کی۔ اس رات مصطفےٰ نے مجھ سے کہا کہ جنرل کلو بھٹو صاحب کا پرستار ہے اور پی پی پی کے جنرل کے طور پر مشہور ہے۔ "میرا خیال ہے کہ اب سارے کام ٹھیک ہو جائیں گے۔ جنرل کلو ہماری حمایت کر رہا ہے۔ ہمیں اس جیسے کسی سینئر افسر کی ضرورت تھی۔ اب ہم اپنے منصوبے پر عمل درآمد کر سکتے ہیں۔"

سات سال بعد جنرل کلو کو ریٹائرمنٹ سے واپس بلا کر آئی ایس آئی کا چیف بنا دیا گیا۔ مصطفےٰ نے جوشی کو اس نئی پیش رفت سے مطلع کیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ پاکستانی

فوج میں نفوذ کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ اب یہ فوج ایسی تنظیم نہ رہی تھی جس میں اوپر سے نیچے تک کہیں جوڑ یا رخنہ نظر نہ آتا ہو اور جو اس حقیقت پر استوار ہو کہ ہر حال میں اپنے عہدے کا وفادار رہنا ہے۔ فوج کی آئیڈیالوجی کو کھوکھلا کر دیا گیا تھا۔ مصطفےٰ کھر نے جو کہا تھا کر دکھایا تھا۔ سازش میں کسی جنرل کی شرکت لاجواب کارنامہ تھا۔ جوشی خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے پاکستانی فوج کی اعلیٰ ترین صف میں اپنا ایک ایسا آدمی داخل کر دیا تھا جس سے وقت پڑنے پر کام لیا جا سکتا تھا۔ جوشی کو کلو سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ وہ بالمشافہ مل کر انداز لگانا چاہتا تھا کہ کلو کس قسم کا آدمی ہے۔ مصطفےٰ نے وعدہ کیا کہ جنرل کلو جب بھی لندن آیا وہ اسے جوشی سے ملوا دے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں کی ملاقات ہوئی یا نہیں۔ اگر ہوئی ہو گی تو یقیناً اسے ایک تاریخی لمحہ سمجھنا چاہیے۔ جوشی ایک دن "را" کا سربراہ بننے والا تھا۔

آخر کار سیٹھ عابد نے جو ہر بار کسی مختلف ٹیلی فون سے بات کرتا تھا، ہمیں مطلع کیا کہ "پارسل" صحیح جگہ پہنچ چکے ہیں۔ انہیں ایسے مکان میں رکھوا دیا گیا ہے جو ہر طرح سے محفوظ ہے۔ مصطفےٰ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سیٹھ عابد نے کام کر دکھایا تھا۔

"لڑکوں" سے کہا گیا کہ وہ لاہور میں مال روڈ پر چلتے ہوئے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے بالمقابل پہنچ جائیں جہاں ایک آدمی کاغذ کا پرزہ لیے ان کا منتظر ہو گا۔ پرزے پر سمن آباد، لاہور کے اس مکان کا پتہ درج تھا جہاں کریٹ رکھوائے گئے تھے۔ "لڑکوں" سے کہا گیا کہ وہ اپنی گاڑی بدل لیں اور انتظار کریں۔ شام کو ساڑھے سات بجے انہوں نے مکان پر جا کر ان ہتھیاروں کو اپنی تحویل میں لینا تھا جنہیں جمہوریت کی بحالی کے کام آنا تھا۔

پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق رات کے ساڑھے دس بج گئے۔ ہم "لڑکوں" کے فون کے منتظر تھے۔ انہوں نے فون کیوں نہیں کیا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق نو بجے فون کریں گے۔ مجھے نظر آیا کہ پسینے چھوٹنے والے ہیں۔ مسلسل چہل قدمی سے قیمتی قالین گھس پس گئے۔ کوئی ہولناک گڑبڑ ہو گئی تھی۔ لیکن کیا گڑبڑ ہوئی تھی۔ خاموشی۔ مقبروں جیسے سکوت سے ہمارے حواس گنگ ہو کر رہ گئے۔ میں ان گنت بار کافی بنا بنا کر پیالیوں میں انڈیلتی رہی اور چپ چاپ بیٹھی دعائیں مانگتی رہی۔ میں ان خیالی تصویروں سے لڑنے میں مصروف تھی جو میرے ذہن میں دراتی چلی آ رہی تھیں۔ ہم کیا کر بیٹھے تھے؟ "لڑکے" کہاں تھے؟ خدا کے لیے فون تو کرو۔ ادھر ایسا لگ رہا تھا جیسے فون نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہو۔ ہم مجنونانہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بوکھلاہٹ کے راستے یہاں تک پہنچے تھے اور اب اچانک سراسیمگی نے ہمیں دبوچ لیا تھا۔

سسپنس کا یہ عالم میری برداشت سے باہر تھا۔ مصطفےٰ نے فیصلہ کیا کہ میں "لڑکوں" میں سے کسی کے گھر فون کروں۔ مجھے ڈائل ٹون کے ساتھ اپنا دل بھی دھک دھک کرتا سنائی دے رہا تھا۔ میں نے میجر آفتاب کو فون کیا۔ اس کی بیوی نے فون اٹھایا۔ اس کا لہجہ غیر فطری اور سرد معلوم ہوا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ "وہ یہاں نہیں ہیں۔ براہ کرم ہمیں فون نہ کریں۔" میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی چھوٹی سی نوٹ بک کے ورق الٹے جس میں دوسرے سازشیوں کے فون نمبر درج تھے۔ جانے کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ یاالٰہی، تو ہی ان کا نگہبان ہو! میں نے نمبر ڈائل کرنے شروع کیے۔ بہت بار گھنٹی بجی۔ جواب ندارد۔ پھر ایک آواز آئی۔ نسوانی آواز۔ سکویڈرن لیڈر طاہر کی بیوی کی آواز۔ وہ رو رہی تھی۔ اس نے ماؤتھ پیس میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ سات سمندر پار میں اس کے کرب کو محسوس کر سکتی تھی۔ "گھر میں ہر طرف فوجی ہی فوجی ہیں۔ وہ میرے خسر اور طاہر کے بھائیوں کو لے جا رہے ہیں۔ وہ میرے بھائیوں کو لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے تلاشی لینے کے بہانے سارا گھر اتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ ان سب کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں" میری بھی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ میں نے خود کو بالکل بے بس محسوس کیا۔ میں کمرے میں موجود پژمردہ اور سنجیدہ چہروں کو تکنے لگی۔ انہوں نے آنکھیں جھکا لیں۔ ہمیں پتہ کرنا ہو گا کہ کیا ہوا ہے۔ مجھے تو لازمی طور پر پتہ کرنا ہو گا۔ میں نے میجر بخاری کے گھر فون کیا۔ اس بار بھی بیوی سے بات ہوئی۔ "میں اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میرے ارد گرد بہت زیادہ لوگ موجود ہیں۔" فون واپس رکھنے کی آواز۔ ہر جگہ ایک ہی وقت میں چھاپا پڑا تھا۔ ہر گھر میں فوجی پہنچے ہوئے تھے۔ بغاوت کچل دی گئی تھی۔ میرے پاس نمبروں کی جو فہرست تھی میں اس کے مطابق فون کرتی گئی۔ ہر جگہ یہی قصہ تھا۔

ہم ایج ویر روڈ سے پرے وائر گارڈنز میں بلو کے اپارٹ منٹ میں تھے۔ میں اپنا غم ضبط نہ کر سکی اور رونے لگی۔ بے گناہ خاندانوں کے دلوں میں جو دہشت چھائی ہوئی ہو گی میں اسے محسوس کر سکتی تھی۔ اپنی بے بسی پر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ مجھے بڑا تاؤ آیا کہ ہم نے انہیں ایسے جوکھم میں دھکیل دیا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ کام بگڑا کیسے۔ مجھے ایسے لوگوں کی تلاش نہ تھی جن کے سر سارا الزام مڑھ دیا جائے۔ میں اصل مجرم کا پتہ چلانا چاہتی تھی۔ ہم سب مجموعی طور پر قصوروار تھے۔ میر اور شاہنواز کا مہم جوئی کا شوق، جس کا مصطفےٰ ہمیشہ مذاق اڑایا کرتا تھا، بالکل بے حقیقت نظر

آنے لگا۔ ہم سے کہیں بڑی حماقت سرزد ہو چکی تھی۔ ہمارے "لڑکے" تو سراسر بے خبری کے عالم میں مار کھا گئے۔ میرے دل نے کہا کہ سیٹھ عابد نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ قصور مصطفےٰ کا تھا۔ میں نے اس شخص کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا اس پر انہوں نے کان نہ دھرے تھے۔ میں بلو سے بار بار کہتی رہی کہ مجھے سیٹھ عابد پر اعتبار نہیں۔ میں نے ضد کی کہ وہ مصطفےٰ کو قائل کرے۔ میں اپنی بات کسی اور کی زبانی کہنا چاہتی تھی۔ مصطفےٰ میری بات کاٹ چکا تھا۔ "بیچ میں مت بولو۔ تمہیں ڈراؤنے خیال آتے رہتے ہیں۔ اپنے ذہن کو لگام دو۔" اس طرح کی سرزنش سے عورت کا وجدان اکثر کند ہو کر رہ جاتا ہے۔ "دخل دینے سے باز رہو اور علی اور بلو کے ذہن میں شکوک ابھار کر میرا کام مت بگاڑو۔"

مصطفےٰ نے آسان راستہ چن لیا تھا سیٹھ عابد کی مدد سے کام جھٹ پٹ ہو جانے کی امید تھی۔ نقشے میں صاف صاف لکھا ہوا تھا کہ "یہاں چور بالو ہے۔" لیکن اس انتباہ پر توجہ نہ دی گئی تھی۔ چوٹی کے سیاست دان نے بری طرح ٹھوکر کھائی تھی۔ مصطفےٰ کی کوتاہ بینی کے باعث "لڑکوں" اور ان کے گھر والوں کو بے اندازہ تکالیف اٹھانی پڑیں۔ وہ برباد ہو گئے۔ عین جوانی میں ان کا بیڑا ہو گیا۔ زندگی بھر غداری کا داغ ان کے ماتھے پر لگا رہے گا۔ اگرچہ اب یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے مصطفےٰ کھر کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ داغ لگتے ہی مٹ جاتا ہے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ میں اچھل پڑی۔ سیٹھ عابد بول رہا تھا۔ جب اس نے میری آواز سنی تو کہنے لگا۔ "بھابھی..." اور رونا شروع کر دیا۔ وہ سچ مچ فون پر روتا رہا۔ "میں ابھی ابھی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ نو بجے کی خبروں میں انہوں نے اعلان کیا کہ، مخبری ہونے پر، سمن آباد کے ایک مکان پر چھاپا مارا گیا۔ سمگل شدہ سونے کے کریٹ پکڑے گئے ہیں۔ اب میں کیا کروں؟ مجھ پر بھی الزام آئے گا۔" "سونا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا "سونا کیسا؟ اسلحہ کہاں گیا؟" "وہ یہ خبر نہیں دینا چاہتے کہ ہتھیاروں کا ذخیرہ پکڑا گیا ہے۔ وہ پاکستانی عوام کو بتانا نہیں چاہتے کہ خود فوج کے اندر سے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ اسلحہ سمگل کرنے کی ناکام کوشش میں فوج ملوث ہے۔ سمجھنے کی کوشش کریں۔ سونے کی کہانی تو حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ اب میرے خاندان کا کیا بنے گا؟ کیا میں سرحد پار کر کے بھارت چلا جاؤں؟ مصطفےٰ صاحب میرے لیے سیاسی پناہ کا بندوبست کر سکتے ہیں کیا؟" میرا جی متلانے لگا۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ جی چاہتا تھا اسے مار ڈالوں کیونکہ وہ ہمارے سامنے قرآن پر قسم کھا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کر گیا تھا۔ میں اس لیے بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اتنے بہت سے لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دی تھیں۔

بعد میں ہمیں اپنی ناکام مہم جوئی کی تفصیلات کا علم ہوا۔ لڑکے دو جیپوں میں سمن آباد والے مکان پر پہنچے۔ وہاں دو کمرے کریٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک کریٹ کھول کر پڑتال کی۔ مطلوبہ اسلحہ اس میں موجود تھا۔ کریٹ لے جا کر انہوں نے جیپوں پر لادنے شروع کیے۔ کام بڑی سلاست سے انجام پا رہا تھا۔ منصوبے کے عین مطابق کسی رکاوٹ کے بغیر۔ دوسری جیپ لادی جا رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی کام نمٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ "ان سالے جنرلوں کے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہیے۔ ہم اس ملک کو دوبارہ راہ راست پر لے آئیں گے"۔ وہ جیپ میں بیٹھے۔ اگنی شن میں چابی گھومی۔ پہلا گیئر لگا۔ جیپ آگے لپکی۔ اچانک حشر برپا ہو گیا۔

وہاں گھات لگی ہوئی تھی۔ گھر کو فوج نے نرغے میں لے رکھا تھا۔ فوجیوں نے فائر کھول دیا۔ "لڑکوں" کے چھکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ دنادن فائر ہو رہے تھے۔ ابتری کا ایک لمحہ۔ بیرونی دباؤ کی تاب نہ لا کر ان کی زندگیاں اندر ہی اندر ڈھے گئیں۔ وہ کم تھے؛ ان کے حریف تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ وہ زخمی ہوئے مگر لڑتے رہے۔ بالآخر انہیں ہار ماننی پڑی۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اسلحہ کا ذخیرہ پکڑا گیا۔ ٹی وی پر اعلان ہوا کہ سمگلروں کے ساتھ زبردست فائرنگ کا تبادلہ ہوا ہے اور بہت بڑی مقدار میں سونا پکڑا گیا ہے۔

حب الوطنی کا مظاہرہ کرنے پر محمود ہارون نے سیٹھ عابد کو معاوضہ دینے کا بندوبست کیا۔ انیس سو ساٹھ اور انیس سو ستر کے درمیانی برسوں میں اس کے پاس سے بہت سارا سونا برآمد کیا گیا تھا۔ یہ سونا، جو کسٹمز کی تحویل میں تھا، کسی تکنیکی بنیاد پر اسے لوٹا دیا گیا۔ 1971ء سے اب تک سونے کی قیمت بڑھ چڑھ کر کہیں کی کہیں پہنچ چکی تھی۔ سیٹھ عابد کو موجودہ قیمت کے حساب سے معاوضہ ادا کیا گیا۔

سونے کی چمک دمک کے پیچھے شکستہ گھروں اور شکستوں سے چُور انسانوں کی داستان پنہاں تھی۔ "لڑکوں" کو انتہائی سیکورٹی والے قید خانوں میں رکھا گیا۔ ان کے پورے خاندان سے پوچھ گچھ کی گئی۔ ان کی بیویوں کو لے جا کر ایسی جگہ رکھا گیا جہاں ان سے کوئی مل نہ سکتا تھا۔ ان کے خاندان کے مردوں کو تعذیب کا نشانہ بننا پڑا۔ فوج نے اس راز کو خوب اچھی طرح چھپائے رکھا۔ "لڑکوں" کو یہ موقع نہ ملا کہ ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جاتا ہے۔

انہیں عذاب دیا گیا۔ ان کے دلوں میں شر سے ٹکرا جانے کا جو حوصلہ تھا کچل ڈالا

گیا۔ انہوں بغاوت کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا کورٹ مارشل ہو سکتا ہے۔ انہیں گولی ماری جا سکتی ہے۔ بعد میں رضا کاظم کو بھی پکڑ کر اٹک کے کسی تنگ و تاریک تہ خانے میں ڈال دیا گیا۔

ان کے قبضے سے بھارتی اسلحہ برآمد ہونے کی وجہ سے ان کے المیے کی الم ناکی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ کم ازکم اس معاملے میں "لڑکے" بے قصور تھے۔ انہیں ہمارے بھارتی رابطے کا سرے سے کوئی علم نہ تھا۔ ہم نے انہیں بتایا ہی کب تھا کہ اسلحہ کہاں سے آئے گا۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اسلحہ کسی غیر جانب دار ذریعے سے حاصل کیا گیا ہے۔ امکان یہی تھا کہ فوج کے اعلیٰ عہدے داروں کو اس بات پر یقین نہ آئے گا۔

مصطفےٰ کی کم بختی آ گئی۔ وہ ناکام ہو گیا تھا۔ یہی نہیں، اُس نے بھارتی حکومت کو بھی جرم میں الجھا دیا تھا۔ اُس کی وجہ سے ایسا وقوعہ ظہور پذیر ہوا تھا جو بین الاقوامی نوعیت کا حامل تھا۔ کسی نے، کسی قریبی ساتھی نے، اُس کے ساتھ دغا کی تھی۔ اُس کے پاس کوئی بہانہ نہ تھا۔ اُسے زیادہ سوجھ بوجھ کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اُس کا کام تمام نہ کر دیا جائے۔ اس لیے بھی زیادہ ڈر اُسے یہ تھا کہ کہیں وہ بے یارومددگار نہ رہ جائے۔ وہ ایسا رابطہ ثابت ہوا تھا جس سے تعلق رکھنا سخت خطرناک تھا۔ بھارتی شاید آئندہ اُس پر اعتبار نہ کریں۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو اُسے جمہوریت کے عظیم چیمپیئن کے نام سے یاد کیا جاتا۔ ناکامی نے ان کے سینے پر غداری کا تمغا چسپاں کر دیا تھا۔ مصطفےٰ کے ردعمل پر میں حیران رہ گئی۔ میں تو "لڑکوں" اور ان کے گھر والوں کے لیے غم زدہ تھی، اُدھر مصطفےٰ نے انہیں بالکل بھلا دیا تھا۔ اُسے فکر تھی تو یہ کہ بھارتی ردعمل جانے کیا ہو گا۔

اُس نے جوشی سے رابطہ قائم کیا۔ ان کی ملاقات ہوئی۔ مصطفےٰ بہت بڑبڑاتے اور سٹپٹائے ہوئے واپس آیا۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ ان دونوں کے درمیان بے لاگ قسم کی گفتگو ہوئی ہے۔ جوشی کی نکتہ چینی کا سارا بوجھ مصطفےٰ کو برداشت کرنا پڑا ہو گا۔ بھارتی واضح طور ناخوش تھے۔ انہوں نے کسی قسم کی لگی لپٹی نہ رکھی لیکن نہ جانے کیوں مصطفےٰ سے تعلق بالکل منقطع نہیں کیا۔

سنگ دلی ایک حد سے بڑھ جائے تو ظلم میں بدل جاتی ہے۔ مجھے ہر وقت "لڑکوں" اور لوگوں کا خیال ستاتا رہتا جنہیں مصطفےٰ نے کچھ عرصہ پہلے تحریک بحالی جمہوریت کے سلسلے میں گرفتاریاں پیش کرنے واپس پاکستان بھیجا تھا۔ وہ مصطفےٰ کے قریب ترین ساتھی تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ فوج تازہ دم ہو کر انہیں دبوچ لے گی اور معلومات اگلوانے کی کوشش کرے گی۔ مجھے پوچھ گچھ کرنے والے کی آنکھیں چمکتی نظر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

آنے لگیں۔

ضیا کا تختہ الٹنے کی جدوجہد 14 اگست 1983ء کو شروع ہوئی۔ 1981ء میں تحریک بحالیٔ جمہوریت کے نام پر آپس میں اتحاد کرنے والی سیاسی پارٹیوں نے فیصلہ کیا کہ ایجی ٹیشن کا آغاز کیا جائے۔ وہ سیاسی جلسوں جلوسوں پر عائد پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتاریاں پیش کریں گے۔ مصطفیٰ نے جتوئی صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کراچی میں قائداعظم کے مزار سے جلوس نکالیں۔ انہوں نے یہی کیا۔ انہیں فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ تحریک شروع ہو گئی۔ پاکستان کے عوام کو بھٹو صاحب کی گرفتاری کے وقت سے اٹھ کھڑے ہونے کے جس پیغام کا انتظار تھا وہ موصول ہو گیا تھا۔

پاکستان بھر سے ہزاروں کارکنوں اور رہنماؤں نے ضیا کے جیل بھر دیے۔ بھٹو صاحب کے اپنے صوبے، سندھ، میں تحریک ایک سنگین رخ اختیار کر گئی۔ سندھیوں کی جدوجہد ذاتی نوعیت کی تھی۔ انہیں اپنے قائد کی لاش موصول کرنی پڑی، تھی جسے پنجاب میں پھانسی دی گئی تھی۔ فوج پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اسے خود بخود برپا ہو جانے والی دیہی بغاوت کو کچلنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ کرفیو، گشتی دستے اور طاقت کے مظاہرے ملک کے اندرونی حصوں میں کام نہ دے سکتے تھے۔ نوجوان سندھی اقدام پسندوں نے سیاست میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ تھانوں میں ان کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ وہ بے چہرہ اور بے نام تھے۔ وہ اپنے لہو سے ظلم کے سامنے ڈٹ جانے اور بے جگری کا ثبوت دینے کا ایک نیا باب رقم کرتے رہے۔ سندھیوں کے بارے میں یہ گھڑم گھڑایا تصور کہ وہ اطاعت گزار اور ڈرپوک ہوتے ہیں اور جنگجو قوم کہلانے کے اہل نہیں نظر ثانی کا محتاج ہو گیا۔ نوشیرو فیروز، سکرنڈ، نیومورو اور خیرپور ناتھن شاہ کے نام مزاحمت کی فرہنگ میں درج ہوئے۔ کئی دن تک قومی شاہراہ، جو پاکستان کی شہ رگ ہے، سیاسی طور پر آتش بجاں ہجوموں کی موج در موج یلغار کی زد میں رہی۔ سندھ کے ساتھ خاصے عرصے تک زیادتیاں روا رکھی گئی تھیں۔

مرنے والوں کی تعداد میں جوں جوں اضافہ ہوا سندھ میں غیظ و غضب بڑھتا گیا۔ اندرا گاندھی نے اس سلسلے میں بیان دیا۔ اس نے سندھیوں کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے ان کے کاز کے لیے اپنی اخلاقی حمایت کا اعلان کیا۔ بہت سے لوگوں کی نظر میں یہ بیان فاش سیاسی غلطی تھی۔ پاکستان ہمیشہ بھارت کے خوف میں مبتلا رہا ہے۔ فوج نے ردعمل ظاہر کرتے ہوئے بھارت پر الزام لگایا کہ وہ علیحدگی پسندی کی آگ بھڑکا کر ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ ہمارے تمام قومی مسائل کے پس پشت جو خفیہ ہاتھ تھا وہ اس بیان کے بعد کھلم کھلا نظر آنے لگا۔ تحریک کے لیے پنجاب کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ سندھ کے شہری علاقوں نے، جن پر بھارت دشمن مہاجروں کا غلبہ ہے، ایم آر ڈی کو ترک دیا۔ سندھ کو تن تنہا تحریک کا بوجھ اٹھانا پڑا۔

درحقیقت اندرا گاندھی کا بیان بڑے کمال کی چال تھی۔ اس نے پنجاب اور سندھ میں پھوٹ ڈلوا دی جو اب تک باقی ہے۔ اس نے کامیابی سے سندھ کے شہری علاقوں کو دیہی علاقوں سے بیگانہ کر دیا۔ 1983ء کی ایم آر ڈی کی جدوجہد تاریخ کی کتابوں میں سندھی اور صرف سندھی تحریک کے طور پر رقم ہوئی۔ اس کی بدولت صوبے کو ماتم کے لیے مزید شہید مل گئے۔ یوں سندھ ان دوسرے چھوٹے صوبوں کی صف میں آ کھڑا ہوا جو فوج سے ٹکر لے چکے تھے۔ پاکستانی فوج کی حیثیت قابض فوج کی ہو کر رہ گئی۔

مصطفیٰ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ تحریک اس وقت تک کامیاب نہ ہو گی جب تک پنجاب اس میں دل و جاں سے حصہ نہ لے گا۔ لاہور کی سڑکوں پر چند اموات بالہ میں ہزار اموات کے برابر تھیں۔ فوج، جس پر پنجابیوں کا غلبہ ہے، آمادہ بہ پیکار پنجابی ہجوم پر فائرنگ نہیں کرے گی۔ اگر اسے مجبور کیا گیا تو فوج کے جوان اپنے بھائی بندوں پر گولی چلانے کے بجائے رائفلوں کی نالیوں کا رخ جنرلوں کی طرف پھیر دیں گے۔

مصطفیٰ نے اپنے سات قریب ترین ساتھیوں کو پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں چوہدری ارشاد، چوہدری حنیف، میاں ساجد، نورمائی اور دوسرے شامل تھے۔ یہ سب جلاوطن تھے اور ان پر ان کی غیر موجودگی میں فوجی عدالتوں میں مقدمہ بھی چل چکا تھا اور سزا بھی دی جا چکی تھی۔ یہ بہادر لوگ 5 ستمبر 1983ء کو لندن سے روانہ ہوئے۔ ان کی منزل مقصود: قید خانہ۔ مصطفیٰ نے اعلان کیا کہ حکومت کو للکارنے کے لیے پنجاب سے تعلق رکھنے والے پی پی پی کے نو دلیر کارکن گرفتاریاں پیش کرنے کی غرض سے وطن جا رہے ہیں۔ یہ حقیقت کہ روانہ ہونے والا ٹولا نو پر نہیں سات افراد پر مشتمل تھا جلد ہی ایک بھیانک، سیاہ طربیے کا روپ اختیار کرنے والی تھی۔

چوہدری حنیف کو یاد ہے کہ ان کے ساتھی سارے راستے جمہوریت اور مصطفیٰ کھر کی حمایت میں نعرے لگاتے آئے جو سیاسی طور پر ناوابستہ مسافروں پر بڑے گراں تھے۔ بقول چوہدری حنیف طیارہ کراچی اترا۔ اسے ٹرمینل سے کچھ فاصلے پر ٹھیرایا گیا۔ ہمارے کو فوراً کمانڈوز اور بکتر بند گاڑیوں نے گھیرے میں لے لیا۔ "ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ اختیار کیا گیا جیسے ہم خطرناک تخریب کار ہوں طیارے کی سیڑھیوں سے اترتے ہی پولیس کا سامنا ہوا۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ باقی دو رہنما کہاں ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلانا چاہا کہ ہم صرف سات ہیں۔ پولیس افسر کو ہمارے کہے پر یقین نہ آیا۔ اسے نو آدمیوں کو گرفتار کرنے کا حکم ملا تھا۔ انہوں نے طے کیا کہ گنتی پوری کرنے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے لیے میاں ساجد پرویز کے سیاسی طور پر ناوابستہ بھائی، طارق، اور گوجرانوالے سے تعلق رکھنے والے ایک اور بیچارے بے گناہ کو گرفتار کر لیا جائے۔ وہ بیچارہ نوجوان لندن اپنی آنٹی سے ملنے گیا تھا۔ اور ضیا الحق کا پر جوش حامی تھا۔ لیکن قانون تو عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتا ہے۔ اس نوجوان کو بھی دھر لیا گیا۔ پہلے پہل ہم اس نوجوان سے دور دور رہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اسے جاسوسی کرنے کے لیے ہمارے ساتھ رکھا گیا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سے نہ میل جول بڑھائیں نہ بات کریں۔ اس بے گناہ نوجوان کی حالت کسی چنڈال کی سی ہو گئی جسے کوئی پاس بٹھانے کا روادار بھی نہ ہو۔ ایک تو اس کی بے گناہی، دوسرے اس طرح باقی سب سے کٹ کر رہ جانے کا عالم۔ اس کے اعصاب اور ذہن دونوں جواب دے گئے۔ ہم نے اس کے بارے میں اپنے رویے پر نظر ثانی کی۔ ہم قائل ہو گئے کہ وہ صرف اسی لیے ہمارے ساتھ تھا کہ مصطفےٰ کھر نے پریس کو ہماری تعداد میں بڑھا کر بتائی تھی۔ اس نوجوان کو بائیس مہینے بعد نجات ملی۔ باقی تمام لوگ، جو حقیقی معنی میں سیاسی رہنما تھے، اس سے دو مہینے پہلے رہا ہو کر رخصت ہوئے۔ وہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

"پاکستان آنے کے چار ماہ بعد میں نے سہن آباد والی ناکامی کا حال سنا۔ میں سمجھ گیا کہ آگے چل کر کیا درگت بننے والی ہے۔ میجر آفتاب کو مصطفےٰ سے ملوانے والا میں ہی تھا۔ میں جانتا تھا کہ اوجھڑی میں آئی ایس آئی کیمپ میں دیے جانے والے عذاب کی ان لڑکوں میں سے کوئی بھی تاب نہ لا سکے گا۔ ان سے اسی کیمپ میں پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ وہ سب کچھ قبول چکے ہوں گے۔ کچھ ہی دیر کی بات ہے کہ وہ مجھے پکڑ کے کیمپ لے جائیں گے۔"

چوہدری حنیف نے اوجڑی کیمپ کی جس کوٹھری میں چار مہینے گزارے اس کے بارے میں بتایا، "ہمارے ذہن میں جہنم کا جو بھی تصور ہو گا وہ کوٹھری اس سے بدتر تھی۔" اس سے بار بار گھنٹوں تابڑ توڑ سوال پوچھے گئے اور اس مسلسل پوچھ گچھ کے دوران وہ مختلف انٹیلی جنس ایجنسیوں کو آپس میں الجھاتا رہا۔ چوہدری حنیف نے اندازہ لگا لیا تھا کہ معاملے سے بے شمار ایجنسیوں کا تعلق ہے۔ "مجھے نہ تو بھارتی رابطے کا کچھ علم تھا۔ نہ مجھے یہ پتہ تھا کہ "لڑکوں" نے کیا کہا ہے۔ ہر قیدی کو جس دبدھے کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ اس کی کلاسیکی مثال تھی۔ معلوم تو مجھے کچھ بھی نہ تھا لیکن ظاہر یہی کرتا رہا کہ بہت کچھ پتہ ہے اور اپنی کوشش میں بس کسی طرح کامیاب ہو ہی گیا۔ میں ایسی میلی کچیلی کوٹھری میں قید تھا جس میں ہوا کے آنے جانے کا کوئی رستہ نہ تھا۔ بغیر شیڈ کے ایک لیمپ لگا ہوا تھا جو چوبیس گھنٹے جلتا رہتا تھا۔ میرے حواس بالکل منتشر ہو چکے

تھے۔ گدے کے طور پر ایک بدبو دار کمبل عطا ہوا تھا جس کے نیچے کیڑے مکوڑے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرسراتے رہتے تھے۔ آری سے کٹا ہوا ایک ٹین، جو بھلے دنوں میں ڈالڈا سے پُر ہو گا، حاجت رفع کرنے کے لیے رکھا تھا۔ کئی کئی دن تک مجھے اس میں سے اٹھنے والے زہریلے بھبکے برداشت کرنے پڑتے۔ مجھے نہانے کی اجازت نہ تھی۔ جسم سے کسی مردار کی سی بُو آتی۔ سر کے بال بڑھ کر کندھوں سے نیچے تک لٹکنے لگے۔ داڑھی ناف تک جا پہنچی میں سو نہیں سکتا تھا۔ ہر بار جونہی آنکھیں بند کرتا اتنا ڈر لگتا تھا کہ اچھل کر اٹھ بیٹھتا۔ اوجھڑی کیمپ میں پوچھ گچھ کی کوٹھری بھارتی جاسوسوں کے لیے ہے۔ بھارت کی مدد سے حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں سب سے زیادہ مشکوک آدمی مجھے سمجھا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کا گزارا ہوا ایک دن لاہور کے شاہی قلعے کی کال کوٹھریوں یا اٹک میں سب سے خاص سیکورٹی والے قید خانے میں گزارے ہوئے ایک سال کے مساوی ہے۔ وہاں گزارا ہوا ایک سال عام جیل میں گزارے ہوئے بیس برسوں کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

"لڑکوں کو جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ انہیں پیٹ کے بل ننگا لٹا دیا جاتا۔ اس کے بعد ان کی رانوں پر فولادی رولر چلاتے جس کے دباؤ سے کھال پھٹ جاتی۔ انہیں الٹا لٹکا کر مارا پیٹا جاتا۔ وہ ان اذیتوں کی تاب نہ لا سکے۔ مجھے نفسیاتی نوعیت کی اذیت دی جاتی تھی۔ میرے حواس کو جس کمال طریقے سے پوری طرح کند کر دیا گیا تھا اس پر کسی فن کا گمان ہوتا تھا۔

"بعد میں، بہت عرصے بعد، میں نے ان لوگوں سے بات کی جو اس عذاب سے گزر چکے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس ہولناک زمانے میں وہ کیا دعائیں مانگتے رہے تھے وہ سب یہی دعا مانگا کرتے تھے کہ انہیں موت آ جائے۔ میں بھی گھٹنوں کے بل جھک کر یہی دعا مانگتا رہا تھا۔ ہم سب موت کے طلبگار تھے۔"

چوہدری حنیف کو یاد ہے کہ تمام قیدیوں میں ایک بات اور مشترک تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مصطفےٰ کھر نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ وہ مصطفےٰ کو، اُس کی اسی سنگ دلی دیکھ کر، گالیاں اور بددعائیں دیتے تھے۔ "ہم محسوس کرتے تھے کہ ہمیں، اپنا کام نکل جانے کے بعد، پرے پھینک دیا گیا ہے۔"

یہ احساس میرا جانا پہچانا تھا۔ مجھے وہ دن یاد آئے جب مصطفےٰ پر کنیریاں پالنے کا خبط سوار تھا۔ ایک روز وہ ان سے اکتا گیا اور اُس نے طے کیا کہ کنیریوں کو آزاد کر دیا جائے۔ مجھے اس میں شک تھا کہ یہ کنیریوں کے حق میں اچھا ہو گا یا نہیں۔ گھر میں پلی ہوئی چڑیاں، کھلی فضاؤں میں اڑنے کا جوکھم کیا جانیں۔ مصطفےٰ نے باغ میں لے جا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کر ان سب کو چھوڑ دیا۔ کنیریاں اڑ گئیں۔ انہیں یہ خبر نہ تھی کہ کھلی فضا ان کے حق میں خار زار سے کم نہیں۔ انہیں پر کھولنے کا موقع بھی نہ ملا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے بڑے بڑے شکاری پرندے انہیں دبوچ کر لے گئے۔ بھولی بھالی کنیریاں ہمارے لان میں منتظر بیٹھیں تھیں کہ موت کب ان پر جھپٹا مارے۔ یہ قتل عام تھا۔ میں جانتی ہوں کہ "لڑکے" اور مصطفٰے کے جیوٹ ساتھی کیا محسوس کرتے ہوں گے۔

اپنی اس کڑی آزمائش کے سات سال بعد، جب کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا، چوہدری حنیف نے ایک روز، جب وہ میرے گھر آیا ہوا تھا، مجھے بتایا کہ موت کے اس گھور گڑھے جیسے قیدخانے میں اسے میری آواز سنوائی گئی تھی۔ "آپ کی آواز ٹیپ پر موجود تھی۔ آپ کا ٹیلی فون ٹیپ کیا جاتا تھا۔ آپ نے "لڑکوں" سے، ان کی بیگمات سے، سیٹھ عابد سے جو بھی گفتگو کی تھی، سب ریکارڈ ہو چکی تھی۔ ان کے پاس ایک روپے کے پھٹے ہوئے نوٹ تک ہر اطلاع موجود تھی۔ وہ پہلے دن سے ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ ضیا معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہم کتنے اندر تک نفوذ کر چکے ہیں۔ وہ تمام سازشیوں کو بے نقاب کرنے کا خواہاں تھا۔ اس نے ساتھ میں ہمیں بھی رگڑ دیا۔

ضیا کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ بغاوت کو کچلنے کے تین ماہ بعد اسے اور اس کے جنرلوں کو راولپنڈی میں پبلک کے سامنے آنا تھا۔ اسے 23 مارچ کو، جو یوم جمہوریہ ہے، شاندار مارچ پاسٹ کی سلامی لینی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انور سادات کے قتل کی کہانی دہرائی جائے۔ آرمی سٹیڈیم کو قلعے میں تبدیل کر دیا گیا۔ ڈیس بلٹ پروف تھی۔ تماشائی زیادہ تر فوجی جوان تھے جنہوں نے شہری لباس پہن رکھا تھا۔ حد یہ کے خٹک ناچ ناچنے والوں تک کو تلواروں کی جگہ چوبی پھٹیاں تھما دی گئی تھیں۔ ایسے حالات میں، جب مصطفٰے کھر اور اُس کے بھارت سے رابطہ رکھنے والے لوگ کھلے پھر رہے ہوں، ضیا کسی قسم کا جوکھم اٹھانے پر آمادہ نہ تھا۔

مصطفٰے جیسے آدمی کو بھلا نچلا بیٹھنے پر مجبور کیا جا سکتا تھا! وہ دیکھتے ہی دیکھتے دوبارہ خم ٹھونک کر میدان میں آ دھمکا۔ جو ناکامی اُس کے حصے میں آئی تھی وہ قصۂ پارینہ قرار پائی اور اُسے زیادہ دیر پریشان نہ رکھ سکی۔ اُس کا علی اور بلو سے جھگڑا ہو چکا تھا اور اب اُسے اپنا سوجھتا آپ کرنا تھا۔

جلد ہی وہ دوبارہ بھارت گیا۔ اندرا گاندھی نے اُس کی میزبانی کی۔ وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ اب اُسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع مل جائے گا اور وہ دوبارہ اہمیت حاصل کر لے گا۔ اس سفر سے وہ خوش خوش لوٹا۔ بغاوت کے پلان کی بری طرح ناکامی میں اُس نے جو کردار ادا کیا تھا وہ اسے بھلا چکے تھے۔ اُس نے مجھے اس ملاقات کے بارے میں

بتایا۔ "اندرا بہت خوش خلقی سے پیش آئی۔ کہنے لگی کہ میں عظیم محب الوطن ہوں اور پاکستان کو میرے جیسے رہنماؤں کی ضرورت ہے۔ ہم جس بحران سے دوچار ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دوراندیش اور دیدہ ور رہنماؤں کو اقتدار سے دور رکھا جاتا ہے۔ اس نے اپنا یہ نظریہ دہرایا کہ پاکستانی فوج کو دو وجوہ سے تباہ کرنا ضروری ہے۔ وہ پاک بھارت امن اور پاکستان میں جمہوریت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنی ہوئی ہے۔ ہمارا دشمن ایک ہی ہے۔ عوام کے دشمن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کچل دینے کے واسطے جنگ ناگزیر ہے۔"

برصغیر کے افق پر اچانک جنگ کی گھٹائیں۔ چھا گئیں۔ ہر شخص کی زبان پر اس زبردست آگ کا ذکر تھا جو عنقریب بھڑکنے والی تھی۔ مصطفٰے کہنے لگا کہ بھارت کے ساتھ جنگ ہی وہ معجزہ ثابت ہو گی جس کے لیے ہم دعائیں مانگتے آئے تھے۔ اُس کی اس رائے کے بارے میں میرے تحت الشعور میں طرح طرح کے شکوک وشبہات موجود تھے۔ اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں بھیجیں تھیں۔ 1971ء میں پاکستانی فوج کی شکست کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ "ہزار سال کی غلامی کا خاتمہ ہو گیا۔" وہ اشارتاً کہنا یہ چاہتی تھی کہ مسلمانوں نے بھارت کے عوام کو۔۔۔ غیر منقسم ہندوستان کے عوام کو۔۔۔ غلام بنا رکھا تھا۔ اندرا کا تعلق اس مکتب فکر سے تھا جس کے نزدیک "بھارت ماتا کی چیر پھاڑ (تقسیم)" مذہبی بے حرمتی کے مترادف تھی۔ اندرا کا سیکولرازم مسلم قوم پرستی کے خلاف ردعمل تھا یہ کوئی دانشورانہ پہل قدمی نہ تھی۔ محض ایک موقع پرستانہ جوابی عمل تھا۔

بھٹو خاندان ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ جب اس کا نہرو خاندان سے موازانہ کیا جاتا تو خاندان کے افراد کے سر فخر سے بلند ہو جاتے۔ ان کا تعلق بھی اشرافیہ سے تھا۔ اور حکومت کرنا تو ان کے مقدر میں لکھا ہوا تھا۔ وہ بھی حکمران خاندان بننے جا رہے تھے۔ جب بے نظیر 1984ء میں انگلینڈ آئی تو علی محمود نے بے نظیر اور نٹور سنگھ کی ملاقات کا انتظام کیا۔ مسٹر سنگھ پاکستان میں بھارتی سفیر رہ چکے تھے۔ بعد ازاں انہیں بھارت کے وزیر خارجہ بننے کا موقع بھی ملا۔

یہ خفیہ ملاقات تھی۔ معلوم نہیں اس میں کیا بات چیت ہوئی۔ تاہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مضائقہ نہیں کہ بات چیت بھارتی پالیسی کے متعین کردہ خطوط کے مطابق ہوئی ہو گی۔ اندرا گاندھی حکمران خاندانوں کی ساحرانہ کشش سے باخبر تھی۔ وہ خود اس کشش سے فائدہ اٹھا چکی تھی۔ وہ اس شخص کی بیٹی کے لیے ہمدردانہ جذبات رکھتی تھی جس کے ساتھ اس نے شملہ دستخط کیے تھے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جنگ پسند سکھ ازم کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا۔ "آپریشن بلیو سٹار" کا حکم دے کر وہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ بیٹھی۔ امرتسر میں سکھوں کے گولڈن ٹیمپل پر حملہ کیا گیا۔ سکھوں کے مقدس ترین مقام کی بے حرمتی کی گئی۔ ان کا رہنما بھنڈراں والا اس لڑائی میں کام آیا۔ سکھوں نے قسم کھائی کہ وہ انتقام لے کر رہیں گے۔ یہ الزام لگا کہ سکھ علیحدگی پسندوں کو پاکستان میں کیمپوں میں تربیت دی جا رہی ہے۔ لاہور میں گردوارا انہیں مقامات میں سے ایک مقام ہے جہاں جا کر سکھ پنا لیتے ہیں اور جہاں سے وہ بھارتیوں پر حملہ کیا کریں گے۔ جنرل ضیا پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ علیحدگی پسندوں کی معاونت کر رہا ہے۔ سکھ پنجابی ہیں۔ سکھوں کے مرکزی علاقے کے ساتھ ہماری طویل سرحد ہے جس میں اتنے رخنے ہیں کہ لوگ آسانی سے اِدھر اُدھر آ جا سکتے ہیں۔ بھارت میں جو علیحدگی پسند رجحانات ابھر رہے تھے، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اندرا قوم کو متحد کرنا چاہتی تھی۔ روایتی دشمن کے خلاف جنگ ہمیشہ ملک کے مختلف حصوں کو جوڑے رکھنے کے لیے اچھا مسالہ ثابت ہوتی ہے۔ پاکستان پر فتح سے اسے وہی عظمت دوبارہ نصیب ہو جائے گی جو بنگلہ دیش بنانے پر اس کے حصے میں آئی تھی اور بعد ازاں اس سے چھن گئی تھی۔

اندرا کو یہ قدم اٹھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ اسے اپنے ہی گھر کے احاطے میں اپنے ہی پہرے داروں نے بےدردی سے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ یہ پہرے دار سکھ تھے۔

مصطفٰے جوگنگ کرنے نکلے ہوا تھا۔ میں ناشتے کے وقت دکھایا جانے والا ٹی وی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ میں نے اندرا کے قتل کی خبر سنی مصطفٰے گھر آیا۔ میں نے خبر اُسے سنا دی۔ وہ صوفے پر جا گرا، سر پکڑ لیا اور کرب میں ڈوبی آواز میں کہا، "خدایا"۔ وہ اس طرح بیٹھے رہ گیا جیسے اندر سے ہل گئے ہو اور کھوئی کھوئی نظروں سے آنے والے دنوں کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے اطمینان محسوس کیا۔ مصطفٰے کی غدارانہ سرگرمیوں میں شریک رہنے کے باوجود میں دل ہی دل میں بھارتیوں کے خلاف تھی۔ آپ کتنی ہی فرماں بردار اور دہشت زدہ بیوی کیوں نہ ہوں لیکن ان کیفیات کو جو سالہا سال تک آپ کے ذہن پر اثرانداز ہوتی رہی ہوں، بے اثر نہیں بنایا جا سکتا۔ اب مجھے اپنی ذہنی حالت پر حیرت ہوتی ہے۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ مصطفٰے اس قدر ناخوش کیوں ہے۔ "اندرا تو پاکستان کی جانی دشمن تھی۔" مجھے اس عورت کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کر کے خوشی ہوئی جس نے ہماری زندگیوں میں داخل ہو کر سب کچھ تہ و بالا کر ڈالا تھا۔ "ہمیں سارا کام ازسرنو اور بالکل ابتدا سے کرنا پڑے گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب اقتدار کون سنبھالے گا۔ اگر راجیو کامیاب ہوا

تو کانگریس کی پالیسی وہی رہے گی جو پہلے تھی۔ ہمیں دہلی میں نئے حکمران سے نئے سرے سے تعلقات قائم کرنے پڑیں گے۔ اس عمل کا سست رفتار ہونا یقینی ہے کیونکہ نیا وزیراعظم دوسرے معاملات میں بہت مشغول ہوگا۔ جنگ کو ملتوی کرنا پڑے گا۔"

تاریخ "اگرمگر" پر مبنی نہیں۔ تاہم بہت ڈر لگتا ہے یہ سوچتے ہوئے کہ ان گولیوں کی بدولت، جنہوں نے اندراگاندھی کا کام تمام کر ڈالا پاکستان کس مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچ گیا، ورنہ پاکستان پر جانے کیا گزرتی۔

انتقامی قتل وغارت کے نتیجے میں دہلی کی سکھ آبادی کے بہیمانہ کشت وخون کے بعد جب راجیو نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا تو پاکستانی فوج کو تباہ کرنے کا منصوبہ پھر منڈھے چڑھتا نظر آیا۔ مصطفٰے نے "دلیپ" بن کر "آصف علی" سے رابطہ قائم کیا اور تقاضا کرنے لگے کہ ان کو نئے وزیراعظم کے حضور میں باریاب ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔

وہ گرم ملک بھارت تھا جس کا مصطفٰے نے میرے بیٹے حمزہ کی پیدائش کے تین دن بعد دورہ کیا۔ لبرٹی کے تیار کردہ لباس پہن کر، جنہیں میں نے زچگی سے فارغ ہونے کے فوراً بعد اُس کے لیے خریدا تھا، مصطفٰے مسز گاندھی کے بیٹے اور وارث سے ملا۔ اُس نے بھارت میں چھ دن قیام کیا۔

واپس آ کر اُس نے بتایا کہ راجیو نے ان سے خفیہ طور پر ملاقات کی تھی۔ "مجھے ایک ریسٹ ہاؤس لے جایا گیا۔ راجیو وہاں آئے۔ ہم نے مسئلے کے ہر پہلو پر انتہائی تفصیل سے بات کی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ راجیو اب بھی اپنی والدہ کے منصوبے پر عمل درآمد کا خواہاں ہے۔ اندرا نے جو پلان تیار کیا تھا اسے بدلا نہیں ہے۔ صرف مؤخر کر دیا گیا ہے۔ ہم یہ نہ طے کر پائے کہ اس پلان کو کس وقت عملی جامہ پہنایا جائے لیکن سٹرٹیجی وہی ہے جو پہلے تھی۔"

مصطفٰے کا خیال تھا کہ بھارت پاکستان کو اپنے میں ضم نہیں کرے گا۔ فوجی شکست کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ پاکستان ختم ہو گیا۔ بھارتی ہمیں آزاد مملکت کے طور پر باقی رہنے دیں گے لیکن ہم آئندہ بھارت کے لیے کبھی خطرہ نہیں بنیں گے۔ ہتھیاروں کی دوڑ ختم ہو جائے گی۔ بھارت ہمیں ضروری تحفظ فراہم کرے گا۔ پھر ہمیں اتنی بڑی فوج رکھنے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ مجھے یہ ساری باتیں دورازکار معلوم ہوتی تھیں۔ یہ سیدھا سیدھا بھارتی بالادستی کا نسخہ تھا۔ یہ اندرا کے اس سیاسی عقیدے کا ایک اور روپ تھا جس میں فرض کر لیا گیا تھا کہ بھارت جنوبی ایشیا کا پولیس مین ہے اور آس پاس کے چھوٹے ملکوں کے داخلی معاملات میں مداخلت کر سکتا ہے اور کرے گا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

راجیو نے اپنے چھپ کر آنے والے مہمان کے لیے دو شکاری مہموں کا اہتمام بھی کیا۔ مصطفٰے کو پرندوں کے لیے بنی ہوئی ایک پناہ گاہ میں لے جایا گیا اور شکار کھیلنے کی اجازت دی گئی۔ وہ بڑے جانوروں کے شکار کی غرض سے ترتیب دی گئی سفاری پر بھی گئے۔ ان کے ساتھ نہایت عمدہ سلوک کیا گیا اور انہیں پروٹوکول کی وہ تمام سہولتیں حاصل رہیں جو کسی بھی آنے والے معزز مہمان کو فراہم کی جاتی ہیں۔ انہیں ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا تاکہ بھارت کے آزاد پریس کو ان کی آمدورفت کی کانوں کان خبر نہ ہو۔

حمزہ کی ولادت کے بعد مجھ پر اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کے مزار کی زیارت کی دھن سوار ہو گئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ میری زندگی میں ایک معجزہ رونما ہوا ہے۔۔۔ میں خوش ہوں۔ لوگ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں کہ میرے ساتھ یہ معجزہ کیسے پیش آیا۔ ایک آواز سنائی دی کہ معجزے کا سبب یہ ہے کہ میں نے اجمیر کے خواجہ کے دربار میں حاضری دی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ خواب کے ذریعے دراصل مجھے مزار پر طلب کیا جا رہا ہے۔ شاید اس معجزے کی بدولت میری زندگی میں، میری ازدواجی زندگی میں بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

مصطفٰے کے جوشی سے تعلقات اچانک میری نظر میں بہت اہمیت اختیار کر گئے۔ بھارت جانے کی جو بھی امید تھی اسی شخص سے وابستہ تھی۔ وہ مجھے اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے میں مدد دے سکتا تھا۔ یہ دنیوی طاقت کی مدد سے عرشی قوتوں تک رسائی کا معاملہ تھا میں نے مصطفٰے کو تنگ کرنا شروع کیا کہ وہ میرے سفر کا بندوبست کرا دے۔ مصطفٰے نے حامی بھرلی۔ میرا معجزہ شاید اتنا ہی ہو کہ میرے شوہر کی، جن میں درندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، کایا پلٹ جائے۔

ایک اور دہلی بار، ایک اور ملاقات۔ اس بار میں ساتھ ہو لی۔ الگ میز پر جا بیٹھی اور بڑی جانکاہی سے کوشش کرتی رہی کہ نمایاں بالکل نہ نظر آؤں۔ جوشی آ کر مصطفٰے کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کوشش کی کہ ان کی طرف نہ دیکھوں۔ بلاشبہ امورِ مملکت زیرِ غور ہوں گے۔ مجھے صرف اجمیر سے غرض تھی۔ مصطفٰے نے جوشی سے میرا تعارف نہیں کرایا۔

بالآخر وہ اٹھ کھڑے ہوئے بل ادا کیا اور میرے پاس سے گزرے۔ جوشی رک کر مسکرایا۔ اس نے مصطفٰے سے کہا کہ اپنی بیگم کو نہ بھول جایئے گا۔ مصطفٰے جھینپ کر مسکرایا۔ میں کھڑی ہو گئی اور میرا "را" کے مستقبل کے سربراہ سے رسمی تعارف کرایا گیا۔

ہم ایک ساتھ بار سے باہر آئے۔ اجمیر۔ اس سے اجمیر کے بارے میں بات کرو۔ مصطفٰے نے ایسا ہی کیا۔ جوشی کہنے لگا کہ دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے۔ میں جان گئی کہ مجھے جلد ہی بھارت جانے کا موقع مل جائے گا۔ میرے کانوں میں آواز آ رہی تھی۔ کہ میرے پیرومرشد مجھے اجمیر کی متبرک سرزمین کی طرف بلا رہے ہیں۔

دو دن بعد میرا خواب حقیقت بن گیا۔ میں نے پہلی بار اکیلے سفر کیا۔ ویزا کی ضرورت نہ پڑی۔ مصطفٰے نے مجھے ایرانڈیا کا ٹکٹ لا دیا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ اپنے ساتھ میک اپ کا کوئی سامان نہ لے جاؤں۔ لپ سٹک تک کی اجازت نہ ملی۔ ہوائی اڈے روانہ ہونے سے پہلے مجھے گھر پر ہی اپنے سامان کی تلاشی دینی پڑی۔ مصطفٰے نہیں چاہتا تھا کہ میں ان ممنوعہ چیزوں میں سے کوئی سمگل کر کے لے جاؤں۔ اُسے ہر وقت دوسرے مردوں سے خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ اُسے یہ پسند نہ تھا کہ میں کسی اور مرد کو دلکش نظر آؤں۔ بہر صورت، عورت اکیلی ہو تو مردوں کی نگاہوں کا نشانہ بن ہی جاتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مقناطیس کا کام بھی کرنے لگے۔

مصطفٰے کے عدم تحفظ کے احساس سے مجھے چڑچڑاہٹ ہوئی۔ میں نے سوچا کہ وہ محض احمقوں کی سی بات کر رہا ہے۔ اگر میک اپ کا سامان میں نے بھارت میں خرید لیا تو اُسے کیا پتہ چلے گا۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اُس کے جاسوس تو وہاں بھی موجود ہوں گے۔ آخر اُس کا جن لوگوں سے میل جول تھا ان کا کام ہی یہ تھا کہ کوئی بات اس سے چھپی نہ رہے۔ میں نے چوری چھپے دل کھول کر خریداری کرنے کے خیال کو ذہن بدر کر دیا۔

پرواز کے دوران کوئی قابل ذکر بات پیش نہ آئی۔ ہم نئی دہلی کے ہوائی اڈے پر اترے۔ ٹرمینل عمارت کے اندر دو آدمی میری پیشوائی کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے میرا سامان کلیر کرایا اور مجھے امی گریشن سے نکال کر لے گئے جہاں کم مراعات یافتہ لوگ قطاروں میں کھڑے تھے۔ ہم کار میں تاج ہوٹل پہنچے جہاں میرے لیے ایک خوبصورت سویٹ ریزرو کرایا جا چکا تھا۔

دس منٹ بعد ایک خاتون داخل ہوئی۔ اس نے خود کو مسز سنگھ کے نام سے متعارف کرایا۔ ادھیڑ عمر کی عورت جس کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ میں نے دل میں کہا، لو، میرے لیے رابطہ افسر آ گئی۔ میں سمجھ گئی کہ اس کے فرائض میں صرف میرا خیال رکھنا ہی نہیں بلکہ مجھ پر نظر رکھنا بھی شامل ہے۔ اس نے معلوم کرنا چاہا کہ میں دلی میں قیام کے دوران کیا کرنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت متانت آمیز اور مستعد معلوم ہوتی تھی۔ میرا پروگرام ترتیب پانے لگا: تاریخیں، وقت، مقامات۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میرے دونوں "سائے" دوبارہ نمودار ہوئے۔ انہوں نے غیر ضروری طور پر تکلف آمیز لہجے میں مطلع کیا کہ ایجنسی کے ڈائرکٹر جنرل آدھے گھنٹے میں مجھ سے ملنے آئیں گے۔ وہ میرے ساتھ چائے پئیں گے۔ میں نے خاتون سے پوچھا کہ ڈائرکٹر جنرل کون ہے؟ اس نے کوئی براہ راست جواب دینے کے بجائے صرف اتنا کہا کہ وہ اس کے باس ہیں اور بہت اہم شخص ہیں۔

میں مصطفٰے کی طرف سے ڈائرکٹر جنرل کے لیے ایک پیغام لے کر آئی تھی۔ مجھے یہ رپورٹ دینی تھی کہ سیاسی صورت حال ایک جگہ آکر ٹھہر گئی ہے۔ بطور صدر جنرل ضیا کی مسلسل موجودگی سے اچھے اثرات مرتب نہیں ہو رہے ہیں۔ پاکستان جس افغان پالیسی پر عمل کر رہا ہے اس کے نتائج پورے علاقے کے لیے تباہ کن ثابت ہوں گے۔ افغانستان سے روسی فوج کے انخلا سے انجام کار ہمارے مشترکہ مفادات کو گزند پہنچے گی۔ روسی پسپائی سے علاقے میں امریکی اثر زیادہ قوی ہو جائے گا۔ مصطفٰے نے جغرافیائی سیاسی منظر نامے کی جو تشخیص کی تھی یہ پیغام اس کا خلاصہ تھا۔ انہوں نے بھارتیوں پر زور دیا کہ قدم اٹھائیں اور جنرل ضیا کو ہٹا دیں جو بڑی بے ڈھب مصیبت ثابت ہو رہا تھا۔

ڈائرکٹر جنرل نے کہا کہ اسے مصطفٰے کی تشخیص سے اتفاق ہے اور وہ صورت حال کو سمجھ گیا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ پیغام ان حلقوں تک پہنچا دیا جائے گا جو اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں اور خود پندرہ دن کے اندر مصطفٰے سے رابطہ قائم کرے گا۔ اس نے اشارتاً کہا کہ وہ جلد ہی لندن آئے گا۔

مصطفٰے نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ راجیو گاندھی سے ایک اور ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ یہ استدعا میں نے ڈائریکٹر جنرل تک پہنچا دی۔ ڈائرکٹر جنرل نے کہا کہ وہ اس ملاقات کا بندوبست کر دے گا اور مصطفٰے کو معمول کے ذرائع سے مطلع کر دیا جائے گا۔ پھر اس نے تھوڑا سا مشورہ دیا۔ "بہت زیادہ گھومنے پھرنے سے احتراز کریں۔ شاید کوئی واقف کار آپ کو پہچان لے۔ یہ بات ہمارے لیے پریشانی اور خفت کا باعث ہو سکتی ہے۔" ڈائرکٹر جنرل اٹھ کھڑا ہوا، امید ظاہر کی کہ بھارت میں میرا قیام خوشگوار ثابت ہو گا اور چلا گیا۔

اس کے مشورے پر سختی سے کاربند رہنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ میں بھارت صرف اجمیر شریف جانے کے لیے آئی تھی۔ باقی سب معاملات دنیوی اور ہیچ پوچ تھے۔

اگلی صبح میں طیارے کے ذریعے اجمیر روانہ ہو گئی۔ دونوں "سائے" میرے ساتھ

تھے۔ جب میں مزار پر حاضر ہوئی تو وہ میرے ساتھ اندر گئے۔ اور جب میں نے دعا مانگی تو میرے پہلو میں کھڑے رہے۔ ان کی موجودگی سے میری یکسوئی میں خلل پڑا۔ میں بالکل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ میں دعا مانگنے آئی تھی۔ یہ دعا کہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے میری زندگی میں تھوڑا سا گزر عقل وخرد کا بھی ہو جائے۔ میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اور کہیں نہ سہی کم ازکم وہاں تو میری خلوت کو قابل احترام سمجھا جاتا۔ دونوں "سائے" میرے پاس سے ہٹنے سے انکاری تھے۔

بہت آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ میں ٹھوس حقیقت سے دور ہٹتی جا رہی ہوں۔ مجھے لگا کہ میں تسکین کی طرف بڑھنے لگی ہوں۔ زیارت گاہ کے سکون نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ اب مجھے صرف اپنے ارد گرد کے لوگوں کا مدھم شور سنائی دے رہا تھا یا فاختاؤں کے پھڑپھڑانے کی آواز آ رہی تھی اور یہ شور اور آواز بھی دور ہٹتے جا رہے تھے۔

میں اپنے میاں کے لیے دست بدعا تھی۔ میں نے اللہ سے التجا کی کہ میرا شوہر نارمل ہو جائے۔ اُسے تشدد اور دیوانگی کے جو دورے پڑتے رہتے ہیں ان پر روک لگ جائے۔ میں نے اللہ کی منت کی کہ میرے میاں کو ایسا بنا دے کہ وہ میرا اور میرے بچوں کا خیال رکھنے لگے۔ "مجھے ایک نارمل گھر چاہیے جہاں امن بھی ہو اور ہم آہنگی بھی۔" میں نے دعا کی کہ مصطفٰے کی توقیر میں اضافہ ہو اور ان کی جلاوطنی ختم ہو جائے۔ میں نے دعا کی کہ وہ مجھے معاف کر دے۔ میں نے اپنے والدین کی بھلائی کی دعا مانگی اور یہ کہ ان سے میری صلح صفائی ہو جائے۔ میں نے عظیم ولی اللہ کے مزار پر دعا مانگی کہ امی مصطفٰے کو معاف کر دیں۔ میری ارزو تھی کہ میرے میاں میرے والدین کی نظر میں مثالی داماد بن جائیں۔ میرے آنسو نکل آئے اور رخساروں پر بہنے لگے۔ ہر آنسو خود منت تھا۔ اور جہاں کوئی قطرہ تحلیل ہوا وہاں زیارت گاہ بن گئی۔ میرے ذہن میں سیاست کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ مجھے اپنے ذہن کو شفایاب کرنے کے لیے روحانی قوتوں کی ضرورت تھی۔

وقت اب ہتھکڑیوں کی طرح میری کلائیوں سے بندھا ہوا نہ تھا۔ میں ان باقی لوگوں میں گم ہو چکی تھی جو اپنے آپ کو تلاش کرنے کی خاطر زیارت پر آئے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ "سائے" بار بار پہلو بدل رہے ہیں۔ ان کی گراں بار موجودگی سے میں کبیدہ خاطر ہوئی۔ وہ بے چین نظر آ رہے تھے۔ ہندو ہونے کے باوجود انہیں ایک ایسی ہستی کے فانی آثار کے سامنے مجبوراً کھڑے ہونا پڑ رہا تھا جس نے بھارت میں اسلام کی ترویج کے لیے جتنا کام کیا تھا اتنا کسی خوں چکاں تلوار لہرانے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

والے سپہ سالار سے نہ بن پڑا تھا۔ انہیں ضرور خواجہ صاحب کی کشش محسوس ہوئی ہوگی۔ انہوں نے کشش کی مزاحمت کی۔ وہ وہاں سے چلے جانا چاہتے تھے۔ ایسا کرنے میں ناکامی کا ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا اور وہ یہ کہ وہ خود بھی خواجہ صاحب کی مقناطیسیت کے سامنے جھک جائیں۔ رات مزار پر گزارنے کے خیال کو دل سے نکالنا پڑا۔ "سائے" مجھے ساتھ لے گئے۔ میں سر جھکائے، زمین پر لیٹے لوگوں کو پھلانگتی مزار سے باہر آئی۔ مجھ میں نئی جان آ گئی تھی۔ میرے ساتھ خواجہ اجمیری کی رحمتیں تھیں۔ میں نے خود کو توانا محسوس کیا۔

ہم نے جے پور کے ایک محل میں، جسے ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا ہے، ڈنر کھایا۔ ہم دہلی واپس آ گئے۔

وقت کم اور معروفیات زیادہ۔ مسز سنگھ نامی خاتون آ پہنچی۔ ہم نے ہوٹل میں ساتھ ہی لنچ کھایا۔ شاپنگ کرنے گئے۔ میں نے ایک پینٹنگ اور کمبل خریدا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا مجھے خریداری کے لیے روپے درکار ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔

اب ہم بس دو عورتیں تھیں جنہیں ایک دوسر کا ساتھ میسر آ گیا ہو۔ ہم نے اپنی زندگیوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ اس کی زندگی نے میرے دل کو گدگدایا۔ میرا پرانا تجسس پھر بیدار ہو گیا۔ وہ اپنے گھر والوں کی باتیں کرتی رہی مگر اپنی ملازمت کے ذکر سے صاف دامن بچا گئی۔

میں نے دریافت کیا کہ اسے لندن سے کوئی چیز بھجوائی جا سکتی ہے۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ چمڑے کا بیگ مل جائے تو کیا ہی مزہ آئے۔ پھر مایوسی۔ پھر خوف۔ کہنے لگی کہ وہ مجھے اپنا پتہ نہیں دے سکے گی۔ "اگر انہیں پتہ چل گیا تو میری شامت آ جائے گی۔ آپ کے بھارت سے چلے جانے کے بعد مجھے آپ سے رابطہ رکھنے کی اجازت نہیں۔"

میں نے سوچا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے لندن کا کوئی پتہ دے دو۔ میں بیگ وہاں بھجوا دوں گی۔ وہ ہچکچائی۔ بیگ حاصل کرنا تو وہ چاہتی تھی لیکن...

"یہ بغل میں چھری، منہ پر نقاب کا ڈراما کس لیے؟ ہم دوست کیوں نہیں بن سکتے۔"؟

"یہ ناممکن ہے۔ براہ کرم، یہ ذکر دوبارہ نہ چھیڑیے۔ مجھے اپنے رابطوں سے دوستی کی اجازت نہیں۔ مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔" اس زمانے میں میری جو ذہنی سطح تھی اس کی واضح عکاسی اس امر سے ہو جاتی ہے کہ میں سچ مچ یہ سمجھنے سے بالکل قاصر تھی کہ یہ سارا بتنگڑ کس لیے ہے۔ میں واقعی خاصی بے عقل عورت ہوں گی۔

آخر کار، اس نے چوری چھپے مجھے انگلینڈ کا ایک پتہ فراہم کر دیا۔ جلدی سے نظر

دوڑائی۔ دائیں بائیں۔ پیچھے۔ بیگ کا لالچ بہت زیادہ ثابت ہوا۔ ایسی چابک دستی سے جو مشق کا نتیجہ ہی ہو سکتی تھی، اس نے پتہ میری طرف کھسکا دیا۔ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ نروس نظر آ رہی تھی اور کچھ کچھ مطمئن بھی۔

روانگی کا وقت آ پہنچا۔ دونوں "سائے" دبے پاؤں گویا ہوا میں تیرتے ہوئے اندر آئے۔ پُراسرار سمجھ میں نہ آنے والے۔ ہم ایک کار میں جا بیٹھے۔ کالے رنگ کی ایمبیسیڈر۔ اور ہوائی اڈے کی طرف چل دیے۔ مسز سنگھ کسمسائی۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ میرا بھول پن حماقت کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ وہ ضرور دل ہی دل میں دعا مانگ رہی ہو گی کہ اے بھگوان، کہیں یہ عورت کچھ بک نہ دے۔ "سایوں" کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے کوئی ماتحت سمجھتے ہیں۔ وہ میری طرف جھکی اور مجھ پر اعتماد کے ایک پیمان پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام مسز سنگھ نہیں ہے"۔ پھر خاموشی۔ انہوں نے اسے راستے میں سڑک کے کنارے اتار دیا۔ "تمہیں یہاں سے بس مل جائے گی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ خدا حافظ کہا۔ وہ کچھ کچھ اداس نظر آ رہی تھی۔ جب ہم شاپنگ کرنے نکلے تھے تو میں اس کا گھر دیکھ چکی تھی۔ اس نے اشارہ کر کے اپنا گھر مجھے دکھایا تھا۔ اب ہم نے اسے گھر کے سامنے اتار دیا۔ مسز سنگھ، یا اس کا جو بھی نام تھا، فٹ پاتھ پر کھڑی کار کے نکڑ سے مڑ کر نظر سے اوجھل ہو جانے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر جو آنکھ مچولی کھیلی جا رہی تھی اسے مکمل کرنے کے لیے چھ قدم چل کر اپنے گھر کے لکڑی کے بنے ہوئے دروازے تک گئی۔ اب اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔

نہ سرخ فیتے سے واسطہ پڑا۔ نہ قطار میں کھڑے ہونے کی نوبت آئی۔ نہ اکتائے اکتائے سرکاری عہدے داروں کے چہرے دیکھنے کو ملے۔ مجھے فرسٹ کلاس لاؤنج لے جایا گیا۔ میرے "سائے" میری سفری دستاویزات کو ٹھیک کرانے کے لیے دوڑ بھاگ کرتے رہے۔ جب تک میں طیارے پھر بحفاظت سوار نہ ہو گئی وہ میرے ساتھ ساتھ رہے اور بعد ازاں غالباً ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ ایک نیم تاریک ادارے سے تعلق رکھنے والی آسیبی صورتیں۔

واپس پہنچ کر ایک ایک بات بتائی۔ مصطفےٰ خوش ہوا جو دعائیں میں نے اجمیر شریف میں مانگی تھیں وہ پوری تو ہوئیں لیکن اس طرح نہیں جس طرح میری خواہش تھی۔ بیس دن بعد میں مصطفےٰ سے الگ ہو چکی تھی۔ مجھے دوبارہ اپنی بنانے کے لیے اُسے میرے بچے اغوا کرنے پڑے۔ مجھے بہت زیادہ رازہائے دروں معلوم تھے۔

میں اکثر حیران ہوتی ہوں کہ مجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے مصطفےٰ کو اس انتہا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تک جانے کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے جو چال بھی چلی اس سے یہی لگتا تھا جیسے اس کی جان پر بنی ہوئی ہے، جیسے اُس کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہ رہا ہو۔ اُس نے اپنے کیریر کو خطرے میں ڈالا، برطانوی حکومت کے حسنِ سلوک سے محروم ہونے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مجھے زبردستی واپس لے جانے کے لیے بچوں کو استعمال کیا۔ بعد میں جب ہم پاکستان جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ تو جو کچھ اُس نے بتایا اس سے میرے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ دو ہی باتیں ممکن تھیں۔ یا میں اُس کے پاس لوٹ آتی یا وہ مجھے ٹھکانے لگانے پر مجبور ہو جاتا۔ مجھے بہت زیادہ رازوں کا علم تھا۔

جب ہماری علیحدگی کی خبر اخباروں کی شہ سرخیوں کی زینت بن گئی تو جوشی نے مصطفےٰ سے بات کی۔ "جب آپ کی شادی کو استحکام حاصل نہیں تھا تو آپ نے اپنی بیوی پر بھروسا کیسے کر لیا؟" میں نے اپنی ازدواجی زندگی پر کس کامیابی سے پردہ ڈالے رکھا تھا۔ میں "را" کو غچا دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ مصطفےٰ نے وعدہ کیا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے واپس لا کر چھوڑیں گے۔ "اگر میں واپس نہ آتی تو کیا ہوتا؟" مصطفےٰ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور پوری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تمہیں ٹھکانے لگانے پر مجبور ہو جاتا"۔ "کیا صرف اس لیے تم نے یہ سب کچھ کیا؟" "نہیں۔ اس لیے کیا کہ مجھے تم سے محبت ہے"۔ "اگر میں تمہیں چھوڑ بھی جاتی تو بھی کبھی کسی کو کچھ نہ بتاتی" "ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یہ امکان ہمیشہ رہتا کہ تم ہمارے لیے خطرہ ثابت ہو گی۔ تم غیر ذمے دارانہ گفتگو کر سکتی تھیں۔ تم بے خیالی میں کوئی بات کہہ سکتی تھیں۔ اس انکشاف کی بھارتی حکومت متحمل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ فوجی سازش کے ذریعے کسی غیر ملکی حکومت کا تختہ الٹنے میں شریک ہے۔ اس طرح کا سکینڈل تباہ کن ثابت ہوتا۔ یہ بات ہرگز منظر عام پر نہ آنی چاہیے کہ بھارت کسی ملک کی حکومت کا تختہ الٹنے کی غرض سے وہاں کی حزب اختلاف کو مادی امداد فراہم کرتا رہا ہے۔ سازش کی سب سے کمزور کڑی تم تھیں۔ تمہیں تو اس بات کا ہوش تک نہیں کہ تم نے اپنے آپ کو کیسے بھاری خطرے میں ڈال رکھا تھا۔"

مصطفےٰ کے انکشافات سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں کس بری طرح سے خطرات میں گھری رہی تھی۔ میں نے خود کو اُس کی معیت میں محفوظ محسوس کیا۔

پاکستان لوٹنے سے پہلے مصطفےٰ نے بعض دوسری جگہوں کا نام لیا۔ ہم وہاں بھی جا سکتے تھے۔ کہنے لگا کہ وہ کابل کے حکمران طبقے سے انتہائی کارآمد رابطے قائم کر چکا ہے۔ دوستی کے اظہار کے طور پر افغانستان کے صدر نے اُسے دو خوبصورت قالین بھجوائے ہیں۔ صدر کی خواہش تھی کہ مصطفےٰ کابل چلا آیا۔ میر مرتضیٰ پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ کابل حکومت نے ایک پوری اقلیم میر کے سپرد کر دی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا علاقہ تھا جسے باقی ماندہ کابل سے الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ اس کے پاس خرچ کرنے کے لیے لامحدود فنڈ تھے۔ بیشتر رقم شام کے حافظ الاسد نے فراہم کی تھی۔ مصطفےٰ کے کابل پہنچنے سے پیپلز پارٹی کے کاز میں نئی جان پڑ جائے گی۔ میر مصطفےٰ سے صلح صفائی کی کوشش کر چکا تھا۔ اس نے کابل سے ایک پوسٹ کارڈ ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا کہ "مفاد پرست لوگوں نے ہمارے درمیان مسائل کھڑے کر دیے تھے۔" اس نے لکھا کہ وہ اب بھی مصطفےٰ کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔

علاوہ ازیں ہمارے لیے بھارت جانا بھی ممکن تھا۔ بچوں کے ساتھ دہلی جا سکتے تھے۔ وہاں ہمارا بہت خیال رکھا جاتا۔ مصطفےٰ کو ایک ریڈیو ٹرانسمٹر فراہم کر دیا جاتا جس کی مدد سے وہ پاکستانی عوام کے نام پیغامات نشر کر سکتا۔ "ہم بڑے آرام سے رہیں گے۔

کابل یا دہلی... میرا دل ان دونوں جگہوں کو قبول نہ کر سکا۔ میں پاکستان اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ "اگر ہم بھارت چلے گئے تو پھر ہماری زندگی میں پاکستان کا کوئی حصہ رہے گا یا نہیں؟ کیا ہمیں کبھی وطن لوٹنے کی اجازت مل سکے گی؟ کیا ہمارے پاس بھارتی پاسپورٹ ہوں گے۔؟" "وہ دن آئے گا جب ہم عزت واحترام کے ساتھ واپس لوٹیں گے۔"

ہم پاکستان چلے آئے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

باب - ۵

ماتا بھی ہے ستم ایجاد کیا

1953ء - 1971

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زر و زمرد و گوہر نہیں ہوں میں

ہال بیون پیٹ مین نے ۱۹۵۷ء میں ایک خاتون کی پینٹنگ تیار کی تھی جو لاہور میں میرے گھر کی دیوار پر آویزاں ہے۔ اس میں ایک ہوشربا حد تک حسین عورت کو زمردیں سبز ساڑھی میں لپٹا دکھایا گیا ہے۔ خدوخال کی رعنائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے فنکار نے پہلے وہم وخیال کی کسی دنیا کی سیر کی اور پھر ایک فرضی مگر مثالی صورت کی تصویر کھینچی۔ اس کے باوجود پینٹنگ اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کرتی۔ اس بات کا مجھے نہیں تو اور کسے پتہ ہو گا۔ یہ تصویر میری امی کی ہے۔

میری امی، ثمینہ، جیتی جاگتی داستان ہیں۔ جتنی حسین اتنی ہی سحر آفریں اور نستعلیق۔ ان خصوصیات سے ان کے ذہن کی براقی میں مزید نکھار آیا۔ خوش گفتاری کا عالم کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ بقول والد صاحب، ہمارا گھر ان کے سہارے کھڑا تھا۔ وہ سورج تھیں اور ہم سب ان کے گرد گھومنے والے سیارے۔ ہماری جو بھی شناخت تھی ان کے حوالے سے تھی۔ اور جب وہ ہمارے مدار سے دور ہو جاتیں تو ہمارا وجود قائم تو رہتا مگر گھٹنا جاتا۔ ان کی شخصیت میں تحکم بہت تھا۔ ابروؤں کی خفیف سی جنبش ایک دوسرے کو لرزہ براندام اور حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ گھر بار کے سب قاعدے قانون آپ وضع کرتیں اور پھر دیکھتی رہتیں کہ ان پر سختی سے عمل کیا جا رہا ہے

یا نہیں۔ حکم عدولی بغاوت کے مترادف تھی۔ وہ ہم پر چھائی رہتی تھیں اور انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے ہم میں کوئی کمی رہ گئی ہو۔ ہمارے دن دائمی مرعوبیت کے عالم میں گزرتے تھے۔ ہم بہت زور مارتے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ ان کی دھندلی سی نقل بن کر رہ جاتے۔

امی کا تعلق واہ میں آباد کھڑ قبیلے کے حیات خاندان سے تھا۔ "واہ" کلمۂ تحسین ہے۔ سنا ہے جب شہنشاہ جہانگیر کی نظر پہلی بار اس علاقے پر پڑی تو وہ بے اختیار "واہ" کہہ اٹھا۔ وہ یہاں اپنی بیگم نورجہاں کے ساتھ آیا اور آتے ہی اس علاقے کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ حیات خاندان کے افراد انگریزوں کے وفادار ثابت ہوئے اور انہوں نے تاجِ برطانیہ کے لیے جو خدمات انجام دیں ان کے صلے میں استعماری آقاؤں نے انہیں بڑی بڑی جاگیروں سے نوازا۔ حیات ہسپانیہ میں عربوں کے دوش بدوش لڑتے رہے تھے۔ اور یورپ میں قیام کے دوران انہوں نے ہسپانوی عورتوں سے شادیاں کی تھیں۔ ہسپانیہ کی قدیم بندرگاہوں میں سے ایک میں ایک دروازہ آج بھی باب لکھڑ کے نام سے مشہور ہے۔ حیات خاندان کا دعویٰ ہے کہ ان کا جاذب نظر حسن وجمال مختلف نسلوں کے آپس میں شادی بیاہ کا ثمرہ ہے۔

امی کا خاندان خوب تعلیم یافتہ تھا اور اس کے افراد راجوں اور نوابوں کی ریاستوں کی سیاست میں سرگرمی کا حصہ لیتے تھے۔ تقسیم سے پہلے یہ ریاستیں ہندوستان کے طول وعرض میں بکھری ہوئی تھیں۔ امی کے نانا، رائے بہادر، گیارہ برس تک پٹیالے کے وزیرا عظم رہے۔ امی کے والد کو، خسر کے انتقال کے بعد، اسی عہدے پر مامور کیا گیا اور وہ مہاراجہ پٹیالہ کے دربار سے اٹھارہ سال وابستہ رہے۔ میرے نانا کا نام نواب سر لیاقت حیات خاں تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی، سر سکندر حیات خان، تقسیم سے پہلے پنجاب کے گورنر رہ چکے تھے۔ دونوں بھائیوں کو برطانوی راج کی خدمات انجام دینے کے صلے میں سر کا خطاب ملا تھا۔ ایسے خاندان کا استعماری اقدار سے وابستہ رہنا فطری امر تھا۔ امی نے ایسے گھرانے میں پرورش پائی جہاں برطانوی طرز زندگی کی نقل غلامانہ انداز میں اتاری جاتی تھی اور سانولے صاحب ٹھیٹ "پکا" صاحب بننے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے تھے۔ برطانوی حکمرانوں نے اپنی الگ تھلگ دنیا میں بعض مقامی لوگوں کو تھوڑی سی رسائی کا موقع دے دیا تھا۔ جن خاندانوں پر انگریزوں کی سب سے زیادہ نظر عنایت تھی ان میں حیات خاندان بھی شامل تھا۔ انگریزوں کی طرف سے یہ اذن باریابی اہم تھا کیوں کہ مقامی لوگوں کی بھاری اکثریت کی نظریں رہنمائی کے لیے انہیں مراعات یافتہ خاندانوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ انگریزوں تک رسائی بجائے خود اقتدار تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

حیات خاندان کے مردوں کے وہی مشاغل تھے جو فارغ البال امیروں کے ہوا کرتے ہیں۔ اس کا خاص اہتمام کیا جاتا کہ کپڑے نہایت عمدہ سلے ہوں۔ وہ پولو کھیلتے، تازہ ترین ناچ سیکھتے، شکار کھیلنے جاتے اور پُرتکلف ضیافتیں دیتے۔ خواتین نے اپنی مشرقی دل فریبی برقرار رکھی۔ وہ عجیب عجیب وضع قطع کے لباس زیب تن کرتیں۔ لیکن ان کی گفتگو اور رویے میں انگریزی پن آ گیا۔ بیشتر ہندوستانی، جنہیں ملک کے چیدہ طبقے سے کسی قسم کے معاشرتی میل جول کا موقع نہ دیا جاتا تھا، ان عورتوں کو "نئے رنگ کی" یا "چھم ہانک" سمجھتے تھے۔ حیات خاندان کی عورتیں چوں کہ بہت خوبصورت تھیں اس لیے انہیں اور زیادہ مشکوک سمجھا جانے لگا۔ باہر والوں کا خیال تھا کہ جس عورت نے برقع اتار دیا اسے بدچلن ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

امی پندرہ سال کی ہوئیں تو انہیں نواب ٹانک کے بڑے بیٹے سے بیاہ دیا گیا۔ شادی خاندانوں کے بڑوں نے طے کی تھی۔ اس کے کچھ سیاسی پہلو بھی تھے۔ نواب کے ساتوں بیٹے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ گھوڑوں کی نسل افزائی کرتے، پولو، گولف اور کرو کے کھیلتے اور برطانوی زمینداروں کی طرح رہتے سہتے۔ انہیں ہوابازی سے بھی لگاؤ تھا اور ان کے پاس طیاروں کا اپنا بیڑا تھا۔ مغرب کی ہوا لگنے کے باوجود ٹانک کا نوابی خاندان انتہائی قدامت پسند تھا۔ عورتوں کا غیروں کے سامنے آنا تو کجا، انہیں یہ بھی منظور نہ تھا کہ ان کی آواز کسی نامحرم تک پہنچے۔ عورت کا صرف ایک ہی کام تھا۔ بیٹے پیدا کرنا۔ بچی کی پیدائش کو لعنت سمجھا جاتا تھا۔ امی جلد ہی حاملہ ہو گئیں۔ انہیں اس بارے میں بڑی تشویش تھی کہ پہلوٹھی اولاد کیا ہو گی۔ لڑکا یا لڑکی؟ ٹانک میں واقع کونونٹ کی راہباؤں نے انہیں بتایا کہ اگر بچی پیدا ہوئی تو نواب اسے جان سے مار دے گا۔ امی کو ہول اٹھنے لگے۔ انہیں اچانک سجھائی دیا کہ نواب کے کوئی بیٹی تو ہے ہی نہیں کیا انہیں پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا؟ محل میں جو اڑتی سی خبریں سننے میں آئی تھیں انہوں نے اور راہباؤں کے کہے نے ان کے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔

زچگی کے لیے لاہور آنے سے پیشتر وہ تہیہ کر چکی تھیں کہ اس وحشیانہ گھرانے میں ہرگز لوٹ کر نہ جائیں گی۔ ان کا فیصلہ درست تھا۔ جب میری بہن، روبینہ، پیدا ہوئی تو ٹانک بھر میں کالے جھنڈے لہرائے گئے۔ امی کے ساتھ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بہت عرصے بعد میرا ایک ایسے مرد سے تعلق ہوا جس کا خاندان بھی شیرخوار کشی کی اسی زمنۂ وسطیٰ کی رسم پر عمل پیرا تھا۔ بچیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا۔

امی نے شوہر سے تعلق ختم کر لیا اور لاہور میں ٹھیر گئیں۔ وہ ابھی بالکل نوجوان تھیں اور ان کے حسن پر روز بروز مزید نکھار آ رہا تھا۔ بے شمار مرد ان سے شادی کرنے

کے متمنی تھے۔ میرے والد صاحب بھی، جو فوج میں کپتان اور اس وقت کے پنجاب کے گورنر، سردار عبدالرب نشتر کے اے ڈی سی تھے۔ امیدواروں میں شامل تھے۔ میرے والد کا تعلق ابدالی خاندان سے ہے جو اپنا شجرۂ نسب افغانستان کی شاہی خاندان سے ملاتے ہیں۔ پوپل زئی درانی قبیلے کی ایک شاخ ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ افغانستان کے حکمرانوں کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ والد صاحب کے اب وجد صوبۂ سرحد میں چارسدہ کے مقام پر آباد ہو گئے تھے۔ وہ پشتو بولتے ہیں اور خود کو پختون کہتے ہیں۔

والد صاحب کا پس منظر نہایت قدامت پسندانہ تھا۔ ان کے آباواجداد سیدھے سادے لوگ تھے جو اپنی الگ تھلگ دنیا بسائے بیٹھے رہتے تھے۔ میرے دادا خان عبدالغفار خان کی سرخ پوش پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ یہ پارٹی ہندوستان کی کانگریس پارٹی کا ضمیمہ تھی۔

والد صاحب نے گورنمنٹ کالج، لاہور میں تعلیم حاصل کی جو بیوروکریٹ حضرات، ثقافتی اعتبار سے مایہ ناز افراد اور ٹیکنوکریٹ صاحبان کی نرسری ہے۔

امی اور ان کی ملاقات لاہور کے ایک ریستوراں میں ہوئی۔ وہ امی کے پیچھے پیچھے پھرنے لگے۔ انہیں شادی پر آمادہ کرنا چاہا۔ امی کو اس چھیلے بانکے نوجوان پٹھان کو اپنا بنانے کا کوئی خاص اشتیاق نہ تھا۔ ابھی ابھی وہ شادی کا مزہ چکھ چکی تھیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے۔ میری نانی کی مداخلت سے کام بن گیا۔ انہوں نے والد صاحب کو دیکھتے ہی پسند کر لیا۔ ان کے نزدیک اچھی شکل صورت کے سوا کسی چیز کی اہمیت نہ تھی۔ والد صاحب کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ان کا خاندان اس رشتے کے حق میں نہ تھا۔ لیکن انہوں نے ان کی مخالفت کی پروا نہ کی اور شادی کر لی۔ پٹھان نوجوان پنجابیوں میں شادی نہیں کرتے۔ ان کے بیٹے نے جو لڑکی پسند کی تھی وہ نہ صرف پنجابی تھی بلکہ مطلقہ بھی تھی اور ایک چھوٹی سی بچی کی ماں بھی۔

۱۹۵۲ء میں ان کی شادی ہو گئی۔ امی کو، جو متمول گھرانے میں پلی بڑھی تھیں۔ کپتان کی تنخواہ پر گزارا کرنا مشکل معلوم ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا معیارِ زندگی گرتا جا رہا ہے اور تہیہ کر لیا کہ اسے نمایاں طور پر بہتر بنا کر ہی دم لیں گی۔ میں ۱۹۵۳ء میں لاہور میں پیدا ہوئی۔ والد صاحب ابھی فوج میں تھے اور وہی کپتان کے کپتان۔ میرے پیدا ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ان کی زندگی کا چارج امی نے سنبھال لیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ والد صاحب کو ذہنی اور مالی طور آگے بڑھنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ والد صاحب کو اپنے بیچ کے ساتھیوں اور پینے پلانے کی محفلوں کے یاروں دوستوں کو خیرباد کہنا ہو گا۔ انہوں نے طے کیا کہ اب وہ اپنے سے بڑی عمر کے لیے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

لوگوں کی صحبت اختیار کریں جن کی زندگی کامیابی سے عبارت تھی، جو صنعت کے رہنما تھے، سیاست داں تھے یا نامی گرامی جاگیردار تھے۔ انہوں نے امی کی پسند اور ناپسند کے مطابق چلنا شروع کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی اور مستقبل کی بہتری اسی میں ہے۔ تاہم ان جیسے اکھڑ فوجی آدمی کو میاں ممتاز دولتانہ جیسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بہت اکھرتا ہوگا۔

امی کے تقاضے اور پہل قدمی پر والد صاحب لائیڈز بینک میں ملازم ہو گئے انہیں تربیت کے لیے انگلینڈ بھیجا گیا۔ میرا اکلوتا بھائی، عاصم اللہ درانی، لندن میں پیدا ہوا۔ والد صاحب لائیڈز بینک میں کام کرتے رہے لیکن جب بینک کے گرینڈلیز بینک میں ضم ہونے کی نوبت آئی تو انہوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ امی کی نظر میں بینکر ہونا کافی نہ تھا۔ انہوں نے والد صاحب کے لیے کچھ اور منصوبے تیار کر رکھے تھے۔ انہیں ابھی بہت سی سیڑھیاں چڑھنی تھیں۔ سیڑھیوں اور سانپوں کے اس کھیل میں امی نے سانپوں کو ان سے دور رکھا تاکہ وہ کسی قسم کے بکھیڑوں میں پڑے بغیر قدم آگے بڑھائے جائیں۔

وہ پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انویسٹ منٹ کارپوریشن لمیٹڈ (PICIC) میں چلے آئے۔ یہ مالیاتی ادارہ پاکستان کی شیرخوار صنعت کو قرضے فراہم کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں انہیں ایسے ہونہار صنعت کاروں سے ملنے ملانے کا موقع ملا جو جلد ہی ارب پتی کاروباری بن گئے۔ انہوں نے دلکش شخصیت کے مالک، ذہین وفطین شاکراللہ درانی سے اپنی کاروباری معاملت کو کبھی فراموش نہ کیا۔ میرے والد پکک کے ڈپٹی مینیجنگ ڈائرکٹر بن گئے۔ جب ایوب خاں کے دور میں انویسٹ منٹ کارپوریشن آف پاکستان (ICP) کا قیام عمل میں آیا تو مینجنگ ڈائرکٹر کے عہدے کے لیے انہیں کو سب سے موزوں خیال کیا گیا۔ انہوں نے انتہائی تیزی سے ترقی کی۔ ان کی کامیابی کا بیشتر سہرا امی کے سر تھا۔ انہوں نے والد صاحب کے اس جذبے کو کبھی سرد نہ پڑنے دیا کہ مزید کچھ کر کے دکھانا چاہیے۔ آئی سی پی والد صاحب کے لیے زبردست چیلنج تھی۔ انہوں نے اس اولین تجارتی بینک کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے ان تھک محنت کی اور انہیں کی نگرانی میں یہ کامیاب ہوا۔

والد صاحب کو دو اور عہدے تفویض کیے گئے۔ دونوں عہدے نہایت قدرومنزلت کے حامل تھے اور بہت لوگوں کو ان پر فائز ہونے کی حسرت تھی۔ انہوں نے پہلے پی آئی اے کے مینجنگ ڈائرکٹر کے طور پر کام کیا اور بعد ازاں یحییٰ خاں کے دورِ حکومت میں سٹیٹ بینک کے گورنر رہے۔

جب بھٹو صاحب نے اقتدار سنبھالا تو والد صاحب کو چن کر زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔

ان پر سنگین الزامات لگائے گئے۔ کہا گیا کہ پی آئی اے کے مینجنگ ڈائرکٹر کے طور پر ان کے سی آئی اے سے تعلقات تھے۔ پی آئی اے واحد بین الاقوامی ایرلائن تھی جسے عوامی جمہوریہ چین آنے جانے کے حقوق دیے گئے تھے۔ سی آئی اے کو چین سے دلچسپی تھی جو سمٹ سمٹا کر مکمل عزلت نشینی اختیار کرنے کے بعد باقی دنیا سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ مبینہ طور پر والد صاحب کے تعاون سے ایک سازش کی گئی۔ سازش یہ تھی کہ چین پر پرواز کرنے والے طیاروں کے پروں کے نیچے فوٹوگرافی کے انتہائی جدید آلات نصب کر دیے جائیں۔ ان کیمروں کی مدد سے چینی تنصیبات اور ہوائی اڈوں کی فضائی تصویریں اتاری جاتی تھیں۔ یہ نہایت پیچیدہ جاسوسی کاروائی تھی جس کے لیے کہتے ہیں، رقم سی آئی اے نے فراہم کی تھی۔ بظاہر یہ رقم ناتراشیدہ ہیروں کی صورت میں ادا کی گئی تھی۔ چینی حکومت کو جلد ہی اس خفیہ کاروائی کا پتہ چل گیا اور اس نے پاکستان سے احتجاج کیا۔

اس زبردست دغابازی کی کہانیاں ملک کے بالائی طبقے میں کھلم کھلا گردش کرتی رہیں۔ والد صاحب نے کہا کہ ان کا اس نامعقول معاملے سے بالکل کوئی تعلق نہیں۔ انہیں عدالت نے تمام الزامات سے بری تو کر دیا لیکن اس سے پہلے وہ چھ مہینے جیل میں پڑے رہے۔ رہائی کے بعد بھٹو صاحب نے انہیں منانے کی کوشش کی۔ والد صاحب نے انکار کر دیا۔ وہ پاکستان سے چلے جانا چاہتے تھے۔ ان کی طبیعت متنفر ہو چکی تھی۔ وہ محسوس کرتے تھے۔ کہ ان کی تذلیل کی گئی ہے۔ ان کا پاسپورٹ لوٹا دیا گیا اور وہ امریکہ جا کر اسٹ نیشنل سٹی بینک میں بطور وائس پریذیڈنٹ شامل ہو گئے۔ انہیں نیویارک میں بینک کے صدر دفتر میں تعینات کیا گیا۔

کچھ تو نمود خواہی کا تقاضا تھا اور کچھ مالیات کے شعبے میں اپنی مہارت پر اعتماد کا۔ والد صاحب نے بینک آف مونٹریال کے ساتھ مل کر انگلینڈ میں ایک بینک تشکیل دیا جس کا نام انٹرنیشنل ریسورس اینڈ فنانس بینک لمیٹڈ (IRFB) تھا۔ بینک اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ والد صاحب اپنی پہلی پیشہ ورانہ ناکامی سے دوچار ہوئے۔

فوجی بغاوت کے بعد، جس میں بھٹو صاحب کا تختہ الٹا گیا، وہ پاکستان لوٹ آئے انہوں نے صوبہ سرحد اور سندھ میں صنعتیں لگائیں اور کچھ وقت پاکستان میں گزارنا شروع کر دیا۔ انگلینڈ میں جو گھر تھا وہ بھی انہوں نے قائم رکھا۔

مجھے یاد ہے کہ میرا بچپن بڑے عیش وآرام سے گزرا تھا۔ ہمارے پاس کسی چیز کی کمی تھی۔ اگر کوئی مالی بحرانی درپیش بھی ہوتا تو بچوں تک اس کی خبر پہنچنے ہی نہ پاتی۔ ظاہری ٹیپ ٹاپ برقرار رکھنے کی بڑی اہمیت تھی۔ ہم ماڈل خاندان تھے؟ اس قسم کے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بچے جنہیں شیطان لڑکے لڑکیوں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ہم نے بڑی سیر وسیاحت کی اور بیرونِ ملک بھی آسودگی سے رہے۔ ملک سے باہر چھٹیاں منانے جاتے تو اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہوتا تھا کہ وہاں جا کر بڑی کفایت شعاری سے کام لیں گے۔

عدیلہ، زرینہ اور امینہ کی دیکھ بھال میری بڑی بہن روبینہ کے ذمے تھی۔ جب تک اس کی شادی نہ ہو گئی وہ یہ فرائض انجام دیتی رہی۔ گھر اس کے لیے تربیت گاہ تھا۔ بچیوں کو پال پوس کر بڑا اسی نے کیا۔ ہم سب کی آیائیں موجود تھیں لیکن امی بضد تھیں کہ روبینہ کو اپنے گھر کی ہونے اور اپنے بچے سنبھالنے سے پہلے بچوں کو پالنے پوسنے کے ہنر میں طاق ہو جانا چاہیے۔ اس عمر میں، جو کھیل کود اور خوش وقت ہونے میں گزرنی چاہیے تھی، روبینہ کمال مستعدی سے اپنے کام میں منہمک رہتی۔

امی کے خلوت خانے کی دیکھ بھال کی ذمے داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ مجھے خیال رکھنا پڑتا کہ ان کے ملبوسات صحیح حالت میں ہیں اور توشک خانے کا بندوبست ان کے اعلیٰ معیاروں کے مطابق کیا جا رہا ہے۔ جو کام مجھے سونپا گیا تھا اس سے مجھے سخت چڑ تھی۔ روبینہ کے ذمے کام ہی ایسا تھا کہ لوگوں کی نظر اس پر زیادہ پڑتی تھی۔ وہ ہر وقت ادھر اُدھر پھرتی۔ کبھی بچیوں کو کھلانے پلانے کا انتظام ہو رہا ہے تو کبھی انہیں نہلانے کے لیے پانی گرم کیا جا رہا ہے۔ کلوٹ بدلے جا رہے ہیں۔ کبھی "ٹھنکتے، ابکائیاں لیتے" بچے کو گود میں اٹھایا ہوا ہے۔ گھر میں اور آنے جانے والوں میں ہر وقت اس کے محنتی ہونے کا ذکر ہوتا رہتا۔

میرا کام نرا بلڈ پریشر بڑھانے اور قلبی بیماری کا نسخہ تھا۔ امی کا توشک خانہ اور ان کے زیورات میرے سر پر سوار رہنے لگے۔ میرے ذہن پر ہر وقت زبردست بوجھ رہتا۔ میں خاصی مخبوط الحواس واقع ہوئی ہوں۔ اکثر میں ان کے جواہرات کی صندوقچی کی یا توشک خانے کی چابیاں غلط جگہ رکھ کر بھول جاتی۔ یہ سوچ کر میری روح فنا ہونے لگتی کہ اگر امی کو توشک خانے سے کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی تو میں تعمیل ارشاد سے قاصر رہوں گی۔ میں نے انہیں کبھی برہم ہوتے دیکھا تو نہ تھا لیکن اس خیال ہی سے میری سٹی گم ہو جاتی کہ امی ناراض ہوں گی۔

امی کے توشک خانے کی نگران بی بی (یعنی مجھے) کچھ اور کرنے کے لیے مشکل ہی سے وقت ملتا تھا۔ ہر روز میں ان کا صبح کا لباس، میچ کرنے والے جوتے، دوسرے لوازمات کے ساتھ، نکال کر رکھنے کے بعد سکول جاتی تھی۔ مجھے یہ بھی ملحوظ رکھنا پڑتا کہ جو زیورات چنے گئے ہیں وہ ان کے لباس پر یا لباس کے رنگوں پر بدنما تو نہیں لگیں گے۔

سکول سے واپس آتے ہی ان کی ڈنر کا لباس نکالنا اور سنوارنا پڑتا۔ میں خاص خیال رکھتی کہ کپڑوں پر ٹھیک طرح استری کر دی گئی ہے۔ جو بل باقی رہ جاتے تھے وہ صرف میرے ماتھے پر پڑے ہوتے۔

امی کو کپڑے پہنانا نہایت لمبی چوڑی اور پُرپیچ رسم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے فرانسیسی طرز کا کھانا تیار کیا جا رہا ہو۔ ان کے ملبوسات کو ایک خاص ترتیب سے رکھنا پڑتا تھا۔ ہر چیز، جوتوں سے لے کر بٹنوں تک، بالکل ٹھیک جگہ پر رکھ دی جاتی۔ میں پہلے سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ چیزیں انہیں کس ترتیب سے تھمانی ہیں۔ وہ صرف ہاتھ پھیلاتیں اور میں ان کا حکم بجا لانے کے لیے دوڑ پڑتی۔ کوئی چیز وہ خود نہ اٹھاتی تھیں۔ یہ کام میرے ذمے تھا۔ وہ پوری توجہ اگر دیتی تھیں تو صرف میک اپ اور بالوں کی سجاوٹ پر۔ باقی باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ بعینہٖ جیسے روبینہ لائق فائق گورنس بننے کا کورس کر رہی تھی اسی طرح میں مستعد خواص کی تربیت حاصل کرنے میں مشغول تھی۔

شام کو جب وہ اپنے خلوت خانے سے باہر چلی جاتیں تو میں ان کا شب خوابی کا لباس بستر پر اور بیڈروم سلیپر ٹھیک جگہ پر رکھ دیتی تاکہ ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو۔

اگلی صبح میں ان کے کپڑے اٹھا کر سنگواتی اور تمام نگوں کو گننے کے بعد ان کی جیولری مقفل کرنے کا خاص خیال رکھتی۔ ان تمام مصروفیات کے دوران جو وقت ملتا اس میں اپنا ہوم ورک کرتی۔

اپنی بلوغ زندگی کے دوران بیشتر وقت میں امی کی خوش لباسی کی نقل اتارتی رہی۔ میں نے جو ملبوسات جمع کر رکھے تھے انہیں دیکھ کر بھی شک یہی ہوتا تھا کہ کہیں میں امی کا توشک خانہ تو نہیں اٹھا لائی۔ میں نے بالآخر رنگوں کو جو خیرباد کہا اور سفید رنگ کے سادہ سوتی کپڑے پہننے کا فیصلہ کیا تو اس کا جزوی سبب بھی یہی تھا کہ توشک خانہ سے وابستہ تمام علتوں میں ضرورت سے زیادہ مبتلا رہ چکی تھی۔ توشک خانے سے اس سابقے نے مجھے خوف زدہ بھی کیا اور حواس باختہ بھی۔ بارہ برس کی لڑکی کے لیے یہ عظیم الشان بوجھ اٹھانا کارے دارد تھا۔

تیرہ برس کی ہوئی تو بیمار پڑ گئی۔ ہر شام مجھے تیز بخار چڑھ جاتا۔ ڈاکٹر اسے ٹائیفائڈ سمجھ کر علاج کرتے رہے یہاں تک کہ میری بیماری نے بحرانی صورت اختیار کر لی۔ والد صاحب نے مجھے انگلینڈ لے جانے کے انتظامات کیے۔ بچوں کی خصوصی معالج، ڈاکٹر مبارکہ شاہ نے تشخیص کی کہ مجھے گردن توڑ بخار (MENINGITIS) ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر مبارکہ نے کہا کہ اب اتنی دیر ہو چکی ہے کہ سفر کرنا بیکار ہے۔ مجھے لمبر پنکچر ٹیسٹوں،

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے عذاب سے گزرنا پڑا جو نہ صرف بہت خوف ناک بلکہ بہت تکلیف دہ بھی تھے۔ خدشہ یہی تھا کہ میں جلد ہی اللہ کو پیاری ہو جاؤں گی۔ میں نے ڈاکٹر کو والد سے باتیں کرتے سنا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "غالباً یہ بچ نہیں سکے گی" والد صاحب میرے سرہانے بیٹھ کر رونے لگے۔ مری میں سکول میں ننوں نے خصوصی اسمبلی بلائی جس میں میری زندگی کی دعائیں مانگی گئیں۔

میں چھ مہینے تک بستر پر پڑی رہی۔ امی کے ہاں چھٹے بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ میری بیماری کی وجہ سے یہ حمل ضرور خاصا خوف ناک ثابت ہوا ہوگا۔ گھر پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ والد صاحب مجھے ہسپتال میں داخل کرانے پر رضامند نہ ہوئے۔ انہوں نے میرے لیے نرسوں کا بندوبست کیا جو دن رات میرے پاس موجود رہتیں۔ اور مہمانوں کے کمرے کو ہسپتال میں بدل دیا۔

میں صحت یاب ہو چلی تھی تو امی کے بچی پیدا ہوئی۔ میں نے اس کا نام عدیلہ رکھا۔

گردن توڑ بخار میں مغز کے گرد تنی ہوئی جھلی متورم ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس بیماری کا تعلق میرے دماغ سے تھا اس لیے اسے ہتھیار کے طور پر پہلے امی نے اور بعد میں مصطفٰے نے میرے خلاف استعمال کیا۔ ڈاکٹر مبارکہ شاہ کا کہنا تھا کہ میں ان کی معجزاتی طور پر تندرست ہو جانے والی مریضہ ہوں۔ اس بیماری سے میری سماعت، بینائی، دماغ متاثر ہو سکتا تھا۔ میں مفلوج ہو سکتی تھی۔ میں پوری طرح صحت یاب ہو گئی۔ دو برس تک دوائیاں کھاتی رہی اور امی کی کڑی نگہداشت میں کراچی جیسز اینڈ میری کونونٹ میں تعلیم حاصل کی۔

میری نانی موجود نہ ہوتیں تو میرے خیال میں مجھے کبھی پتہ ہی نہ چل سکتا کہ غیر مشروط محبت نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نانی کے بہت قریب تھی۔ والدین جب بھی کسی باہر کے ملک جاتے ہمیں نانی کے پاس بھجوا دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اور زرمینہ کو انہیں نے پالا پوسا۔ ان کے پاس جا کر رہتے تو یوں لگتا جیسے کسی ایسے بیگار کیمپ سے چھٹی مل گئی ہو جہاں مجھے ہر وقت اپنے ذہن سے بیگار لینے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ نانی کے ہاں میں اپنی سرشت کے ان پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لے سکتی تھی جنہیں گھر پر گھونٹ گھونٹ کر رکھنے پر مجبور تھی۔ نانی ہی وہ ماں تھیں جن کی مجھے ضرورت تھی، مجھے تمنا تھی۔ ان کی محبت میرے لیے سلامتی کا پیام تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی سی تھی تو ان کے بستر میں سونا چاہتی تھی۔ ان کے سائے تلے مجھے کسی چیز کا ڈر نہ تھا۔ وہ میری زندگی میں سب سے اہم شخصیت تھیں۔ میں ایسی محبت

کی چھاؤں میں چین کا سانس لے سکتی تھی جو مجھ سے کسی پہلے سے لکھے ہوئے رول کو ادا کرنے کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

میرا فنکارانہ رجحان نانی اماں کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ انہیں یقین تھا کہ تمام فنکار اگر پاگل نہیں تو خبطی ضرور ہوتے ہیں۔ انہیں یہ ناپسند تھا کہ میں دل بہلانے کے لیے رنگوں سے کھیلوں۔ ہر بار جب میں برش اٹھا کر کینوس کا رخ کرتی تو انہیں یوں لگتا کہ میں پاگلوں کی سرزمین میں قدم دھر رہی ہوں۔ کبھی کبھار وہ پاس بیٹھ کر مجھے پینٹ کرتے دیکھتی رہتیں۔ مجھے مشورے دیتیں۔ انہوں نے میری تصویروں میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور بار ہا اصرار کیا کہ میں کینوس پر لگے رنگوں کو بدل دوں۔ میری تصویریں بالعموم مریضانہ اور دل اچاٹ کرنے والی ہوتی تھیں۔ نانی اپنے طور پر مجھے خفقانی ہونے سے بچانے میں لگی رہتیں۔

ایسی ماں کے ساتھ رہنے کے بعد، جسے بظاہر بہت کم باتیں اچھی لگتی ہوں، کوئی آدمی بھی MANIC DEPREMINE (جو کبھی انتہائی پرجوش اور خوش نظر آئے اور کبھی بالکل پژمردہ اور مایوس) ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے رویے نے ہم گھر والوں کو ایسی زندگیاں گزارنے پر مجبور کر دیا تھا جو ہمارے مزاج کے بالکل منافی تھیں۔ ہم سب ان کے حضور میں کچھ نہ کچھ ثابت کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ وہ توقع رکھتی تھیں کہ ہم ان کے معیار اور توقعات پر پورا اتریں گے۔ یہ آسان نہ تھا۔ وہ کاملیت پسند تھیں۔ اور چاہتی تھیں کہ جو کام ہو وہ بالکل بے عیب ہو۔ میں نے زندگی بھر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کی۔ میں نے ان کے معیار کے مطابق زندگی گزارنی چاہی اور اس کوشش میں فریب اور اذیت سے بھری زندگی بسر کی۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی آدمی اپنے فطری انداز پر قائم رہ کر ان کی خوشنودی حاصل کر سکے۔ وہ حقیقی تپاک اور چاہت پر تصنع کو ترجیح دیتی رہیں۔ رفتہ رفتہ انہوں نے ان دونوں میں فرق کرنے کی اہلیت ہی کھو دی۔

ہمارے والدین بہت حسین وجمیل تھے۔ ہم سے بھی حسین وجمیل ہونے کی امید رکھی جاتی تھی۔ یہ ہمیشہ تو ممکن نہیں ہوتا ہمارے GENES ہمارے کنٹرول میں نہیں تھے۔ ہمارا ہر وقت والدین سے موازنہ کیا جاتا۔ ہمارے ماموں چچا، ممانیاں پھپھیاں وغیرہ ہم پر ایک نظر ڈال کر اس طرح آنکھیں جھپکنے لگتے جیسے انہیں اپنے دیکھے پر یقین نہ آ رہا ہو۔ "ثمینہ، تم تو اتنی خوبصورت ہو۔ تمہارے ہاں یہ مری مری چھپکلیاں کہاں سے پیدا ہو گئیں۔؟" ہم تینوں کے چھوٹے چھوٹے رخسار شرم سے جل اٹھتے۔

یاد آتا ہے کہ اس وقت مجھے بہنوں میں سب سے گئی گزری کہا جاتا تھا۔ میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس وقت بمشکل بارہ برس کی تھی اور اس اوکھی عمر میں ہر بات یا تو بہت بڑی لگتی ہے یا بہت چھوٹی۔ ان موازنوں سے مجھے نفرت تھی۔ کوئی ہمیں یہ سمجھ کر نہ دیکھتا کہ بھئی یہ جیسی ہیں ویسی ہی سہی۔ ہمیں گویا آئینے کے روبرو بٹھا دیا جاتا اور ہر کوئی یہ توقع رکھتا کہ آئینے میں ثمیمنہ کی صورت نظر آ جائے گی۔

جب میں سولہ برس کی ہوئی تو میرے بارے میں لوگوں کی رائے بدلنے لگی۔ اب میرا امی سے مثبت انداز میں موازنہ کیا جانے لگا۔ لوگ اب بھی بات امی کے حوالے ہی سے کرتے تھے۔ "تہمینہ تو اپنی ماں سے خاصی ملتی ہے۔"

مجھے یہ ذرا نہ بھایا۔ میں امی جیسی نظر نہ آنا چاہتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنی جیسی لگوں۔ اس موازنے کا امی نے برا مانا۔ انہوں نے میری کایا کلپ کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ ان کے خیال میں میں اب بھی خاندان بھر کی نظر بٹو تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کی معمولی شکل صورت کی بیٹی کا ان سے کیوں موازنہ کیا جا رہا ہے۔ جب بھی میرے بارے میں اس طرح کا کوی فقرہ کہا جاتا وہ خاموش رہتیں۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھیں کہ مجھ میں ان کی مشابہت آتی جا رہی ہے۔ انہیں مجھ سے جو خار تھا وہ کہیں اب جا کر میری سمجھ میں آیا ہے۔ میں نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ والد صاحب سے شادی کے بعد میں ان کی پہلی اولاد تھی اور پیدائش کے وقت کوئی عجیب الخلقت چیز معلوم ہوئی ہوں گی۔ امی لازمی طور پر دہشت زدہ ہو گئی ہوں گی۔ وہ اپنی بچی کو دنیا والوں کے سامنے فخر سے پیش نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے اس کا قصور وار مجھے ٹھہرایا اور یوں ہمارے تعلقات میں ہمیشہ کے لیے بدمزگی راہ پا گئی۔ ان کی زندگی میں سماجی سطح پر قبولیت اور حیثیت کی بڑی اہمیت تھی۔ یہی معاملہ حسن وجمال کا تھا۔ انہوں نے اپنی جو ستھری ستھری ترشی ترشائی امیج بنائی تھی اسے ان کی بے بی نے آ کر بگاڑ دیا تھا۔ اس امر کی طرف اشارہ کیے بغیر کہ میری آمد سے انہیں صدمہ پہنچا ہو گا میں امی سے اپنے کشیدہ تعلقات کو نہیں سمجھ سکتی۔ میری زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں وہ مجھ سے آزردہ ہو گئی ہوں گی۔

یاد نہیں آتا کہ امی نے مجھے کبھی گلے لگایا ہو یا اپنے ساتھ چمٹایا ہو یا مجھے کبھی امی کی جسمانی قربت حاصل رہی ہو۔ ایک بھی ایسا موقع یاد نہیں جب بچپن میں انہوں نے مجھے چوما ہو۔ مدتوں بعد جب میری زندگی میں ایسا وقت آیا کہ انہوں نے محبت ظاہر کرنی چاہی تو میں جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ ان کی اچانک شفقت کا بوجھ مجھ سے اٹھایا نہ گیا۔ مجھے شرمندگی اور پریشانی کا ملا جلا احساس ہوا۔

حیات خاندان کے بارے میں ایک دلچسپ بات میرے علم میں آئی۔ کھٹر قبیلہ

نسلی خطوط پر دو مخاصمت رکھنے والے گروہوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک "چٹے" کھٹر کہلاتے تھے، دوسرے، "کالے" کھٹر چٹوں کا تعلق واہ خاندان سے ہے اور کالوں کا دھریک خاندان سے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ چٹے کھٹر خالص مسلمان ہیں۔ یوں چٹے کھٹروں کی فوقیت کا تعلق نسلی اور دینی خالص پن سے جوڑ دیا گیا ہے۔ چٹے خاندان میں کالے کی پیدائش سیاپے سے کم نہیں۔

حد یہ کہ میری نانی کو بھی، جو اس قدر محبت کرنے والی روح تھیں، سانولے رنگ کی اولاد سے نباہ کرنے میں مشکل پیش آتی تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ امی اور ان کی بہن ثمر، ثمر خالہ بہت دلکش تھیں لیکن اسی تباہ کن نقص کی حامل۔ ان کی رنگت سانولی تھی۔ رنگ کے بارے میں اس کمپلیکس کا انگریزوں کے ساتھ ربط ضبط سے بھی تعلق تھا: بلکہ اس تعلق کی وجہ سے کمپلیکس اور چوکھا ہو گیا تھا۔ ہر اس شخص کو جس کی رنگت مطلوبہ معیار پر پوری نہ اترتی، پورے کا پورا حیات خاندان ٹھکرا دیتا۔ یہ ایک غیر معمولی طور پر خوش شکل خاندان تھا جس کے افراد کی خوبصورت انکھیں اور ترشے ترشائے خدوخال مشہور تھے۔ رشتے داروں سے مجھے پتہ چلا کہ رنگ کے حوالے سے یہ تعصب میرے قریبی خاندان تک محدود نہ تھا۔ حیات برادری کے تمام گروہ اس پر عمل پیرا تھے۔ ایسی باتوں پر بچوں کی زندگیاں بنائی اور بگاڑی جاتیں جو ان کے اختیار سے باہر تھیں۔ فطرت اپنے کھیل تماشے جاری رکھتی جن سے بچے کی پوری شخصیت متاثر ہوتی۔ یہ GENETICS اور ماحول کا نامراد سنگم تھا۔

میں کم سنی میں آج کل کی بہ نسبت زیادہ سانولی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری رنگت کیسے صاف ہوئی۔ شاید مجھ پر اتنا دباؤ ہو کہ میں قوت ارادی سے کام لینے پر مجبور ہو گئی ہوں اور صرف ارادے کی قوت سے اپنا رنگ بدل لیا ہو۔ رنگت کی وجہ سے میری دوسری بہنوں، زرمینہ اور روبینہ کی جان بھی عذاب میں تھی۔ عدیلہ اور امینہ اور میرا بھائی بہت گورے چٹے تھے۔ حیات خاندان نے نسلی امتیاز کی پالیسی اپنا رکھی تھی اس پر میرے پاس کہنے کے لیے ایک ہی بات ہے۔ "صاف" ناانصافی۔

جب ہم پندرہ سولہ برس کی ہو گئیں تو نہ جانے کیا ہوا ہم پر شگفتگی آ گئی۔ یوں لگا جیسے ہم کینچلی اتار کر گوری ہو گئی ہوں۔ یاد رہے کہ استعماری حکمرانوں کو "گورا" کہا جاتا تھا۔ زرمینہ اور میں اس کایا پلٹ پر اکثر حیران ہوتے۔ دو بدصورت بہنیں یکایک گویا جادو کے زور سے، "سنڈریلاؤں" میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہماری نانی اماں وہی دینی ماں ہیں جس کا پریوں کی کہانیوں میں ذکر آتا ہے۔ ان کی دعاؤں سے یہ معجزہ ممکن ہوا تھا۔ آج جب دوست مجھ سے کہتے ہیں کہ اپنا رنگ، جو ضرورت سے زیادہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

صاف ہے، تھوڑا سا سنولالو تو مجھے اچنبھا ہوتا ہے۔ میں انہیں بتاتی ہوں کہ انسان کس غضب کی قوت ارادی کا مالک ہے۔ اسے بروئے کار لایا جائے تو یہ نہ صرف جسم کے اندر اپنا کمال دکھائے گی بلکہ ظاہری سطح کو بھی بدل سکے گی۔

امی مکمل اطاعت گزاری پر یقین رکھتی تھیں۔ انہیں پلٹ کر جواب دینا یا ان سے بحث کرنا گناہ تھا۔ اگرچہ میں ان کا حکم ماننے پر مجبور تھی لیکن ہمیشہ تاثر یہی دیتی کہ بغاوت پر تلی ہوئی ہوں۔ میرا باغی پن چہرے اور حرکات وسکنات سے جھلکتا رہتا تھا۔ امی جانتی تھیں کہ میں ان کی من موج کے سامنے پوری طرح جھک جانے سے ہچکچاتی ہوں۔ میری شکل دیکھ کر پتہ چل جاتا تھا کہ میں ان کے احکام طوعاً وکرہاً بجا لا رہی ہوں۔ مجھے وہ احکام زہر لگتے۔ میرا پورا وجود والدین کی طرف سے مسلط کی ہوئی اس آمریت کے خلاف نبرد آزما تھا۔ امی کو میری ترش روئی سے نفرت تھی۔ نہ جانے کیوں میں کبھی خود کو ان سے اپنے مسائل پر بات چیت کرنے کے لیے آمادہ نہ کر سکی۔ میں انہیں بتا دینا چاہتی تھی کہ میرے خیال میں ان کے احکام غیر منصفانہ تھے لہذا میرے لیے چہرے پر ایسی کیفیت طاری کرنا ناممکن تھا جیسے میں نے انہیں کھلے دل سے قبول کیا ہو۔

ہم کسی چیز کے بارے میں بحث نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے ذہنوں کو کشادہ فضا میں پرواز چڑھنے سے روک دیا گیا۔ ہم خیالات کو چھپانے لگے۔ ذہن چھپنے کی جگہ، جائے اماں بن گیا۔ میں بہت سوچتی رہتی۔ میں جان گئی کہ ایک غیر منصفانہ ماحول میں زندگی گزار رہی ہوں لیکن اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں نے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

امی کے ساتھ باتیں تو ہم کبھی کر ہی نہ سکتے تھے۔ بس احکام کا ایک تانتا تھا۔ جو ان کی زبانی ہمارے کانوں تک پہنچتا رہتا تھا۔ جب ہم انہیں کا کام کر رہے ہوتے تب بھی خاموش ہی رہتے کہ ہمیں اسی کی تعلیم دی گئی تھی۔ کھانے کی میز پر وہ بولتی رہتیں۔ ہم سنتے رہتے۔ ان سے بحث کرنے کی ہم میں جرات نہ تھی۔ اسے گستاخی سمجھا جاتا۔ گھر میں ہر طرف پُرتصنع رکھ رکھاؤ کی فضا مسلط رہتی۔

ٹھٹھوں اور مذاق کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ انتہا یہ کہ بچوں جیسی شرارتوں یا بڑ دنگے پن کو دیکھ کر بھی ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ ہنسی تو بہت کم سنائی دیتی تھی۔ امی ہماری موجودگی میں ضرورت سے زیادہ درشت انداز اپنائے رہتیں۔ الکساہٹ کے مظاہرے منع، بستر میں پڑے انیڈتے رہنا منع، اوندھے لیٹ کر ٹانگیں ہوا میں جھلا جھلا کر کومک پڑھنا منع۔ ہم ننھی بیبیاں تھیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر ہمیشہ حیرت ہوتی کہ محفل میں پہنچ کر امی بالکل اور ہی بن جاتیں وہ ایسا چلبلاہٹ بھرا رویہ اختیار کرتیں جو ان

مزاج سے قطعاً کوئی لگا نہ کھاتا جسے وہ گھر میں اپنے پر طاری کیے رکھتیں۔

ان کی چہیتیاں بھی تھیں۔ روبینہ، زرمینہ اور خود مجھ میں تو کسی نہ کسی درجہ سے خرابیاں ہی خرابیاں تھیں۔ امینہ اور خاص طور پر عدیلہ پر انہیں ناز تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔ میری سمجھ میں یہ کبھی نہ آ سکا کہ انہیں زرمینہ سے کیوں چڑ ہے جو انتہائی خوش مزاج دوسروں کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والی اور بہت ہی پیاری بچی اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رنگ اتنا صاف نہیں تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔

ہمارے گھر میں کہیں تنکا بھی پڑا نظر نہ آتا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر اس طرح موجود ہوتی جیسے بس ابھی ابھی اس کا فوٹو اتارا جانے والا ہو۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ہمیں بڑی جان مارنی پڑتی۔ پھوہڑ پن کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ جرم کے مترادف تھا۔

امی مثالی میزبان تھیں۔ ان کے پاس ملازموں کی پوری فوج تھی اور ورثے میں ہم جیسے ننھے مددگار مل گئے تھے۔ ہمیں ذمے داریاں تفویض کی جاتیں۔ ہم مستعدی سے کام بھگتاتے۔ ہمیں سکھایا گیا کہ ڈنر کے لیے میز کیسے چنی جاتی ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ پانچ کورسوں پر مشتمل کھانا کس طرح پیش کیا جانا چاہیے اور اس کے لیے کس قسم کی کراکری اور چھری کانٹوں کی ضرورت پڑے گی۔ ہم گنگنے پانی میں گلاب کی پنکھڑیاں بکھیر کر فنگر بول تیار کرتے۔ بول کے کنارے پر لیموں کی قاش رکھنا کبھی نہ بھولتے۔ ہمیں پھول سجانے کی تربیت دی گئی تھی اور ہمیں پتہ تھا کہ ہر مہمان کے روبرو نمک دان، کالی مرچ دان، فنگر بول، مختلف قسم کے اچار چٹنیاں اور سلاد موجود ہونے چاہئیں۔ امی سالہا سال کی تگ ودو کے بعد روز نیتھال اور ویج وڈ کراکری کی ایک حیرت ناک رینج اکٹھی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں جس کی وہ فخریہ نمائش کرتی رہتیں۔

ان کی رات کی محفلوں میں بڑے لوگ آتے۔ اچھی شاعری ان پر جادو کا سا اثر کرتی۔ وہ غزلوں اور نظموں کی باریکیوں کو خوب سمجھتی تھیں۔ ہمیں بٹھا کر جمیل الدین عالی اور زہرہ نگاہ جیسے شعرا کا کلام سنوایا جاتا۔ یہ دونوں ترنم سے پڑھتے تھے۔ وہ ہمارے ہاں اکثر آیا کرتے۔ جب بھی بیچارے حبیب جالب کو جیل جانا پڑتا اور جیل جانا ان کا معمول بن ہی چکا تھا، امی ان کی کیسٹ لگا دیتیں جس میں وہ اپنی انقلابی نظمیں پڑھتے سنائی دیتے۔ دوسرے مہمانوں کو بھی پاکستان کی ممتاز شخصیتوں میں سے چنا جاتا۔ امی کی تیز فہمی کا یہ عالم تھا کہ وہ پہلے سے بھانپ لیتیں۔ کہ کون آگے چل کر کیا بنے گا۔ روبینہ اور میں مری کے جیزس اینڈ مری کونونٹ میں پڑھتے رہے۔ سکول ہمارے لیے گھر

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

مانند تھا، گھر سکول کے مانند۔ میں نے 1960ء میں، جب میں سات برس کی تھی، بورڈنگ سکول میں داخلہ لیا اور 1970ء میں تک جس سال میں نے اولیول کا امتحان دیا، وہیں رہی۔

سکول میں نو مہینے گزارنے کی وجہ سے ہم والدین کے پاس گرمیوں میں صرف پندرہ دن اور جاڑوں کی تعطیلات میں تین مہینے کے لیے رہ سکتے تھے۔ ان کی معروف زندگی کے پیش نظر ہمیں ان سے ملنے کا موقع کم ہی ملتا۔ میں نے سکول میں ننوں کے ساتھ قریبی تعلق پیدا کر لیا اور ازدواجی زندگی کے دوران مایوسی کے عالم میں اکثر رو رو کر انہیں یاد کرتی۔ مدر اینڈریو اور مدر برکمینز مجھے بہت یاد آتیں۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ مدر کیوں کہلاتی ہیں۔

بہت برسوں بعد، جب میں خود ماں بن چکی تھی، میں نے ایک بار پھر مری کونونٹ کا رخ کیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنی بیٹیوں کو مدر برکمینز کے حوالے کر آؤں گی۔ وہ ان کا خیال رکھیں گی۔ بدقسمتی سے واقعات کچھ ایسے پیش آئے کہ مری کونونٹ میں ان کا قیام ادھورا رہا۔

سکول میں میری زیادہ تر سہیلیاں پٹھان لڑکیاں تھیں۔ نفسیاتی طور پر میں نے اپنے پٹھان پس منظر کو زیادہ پُرکشش پایا۔ کسی وجہ سے میری ان کی بہتر نبھتی تھی اور میں محسوس کرتی تھی کہ میں بھی پٹھان اکثریت کا حصہ ہوں۔ پٹھانوں کو اپنی برتری کا کمپلیکس تھا۔ ان کے خاندان امیر تھے اور اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ صوبہ سرحد کے خان اور سردار ایک مدت سے اپنی لڑکیوں کو پڑھنے کے لیے اس قدامت پسند اور سخت گیر ادارے میں بھیجتے رہے تھے۔ فیلڈمارشل ایوب خان کی پوتیاں، نواسیاں، بے نظر بھٹو اور صنم بھٹو، پنجابی جاگیرداروں کی بیٹیاں، سب وہاں تھیں مگر غلبہ پٹھانیوں کا تھا۔ جس کا غلبہ، اسی کے ہاتھ میں قیادت۔ یہ تو جانا پہچانا اصول ہے۔

میں بہت ہی نٹ کھٹ تھی اور ہمیشہ ہنستی کھیلتی رہتی۔ میری تعلیمی زندگی کا حال یہ تھا کہ کبھی بلندیوں کو چھو لیتی، کبھی پستیوں میں پڑی نظر آتی۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے سینیئر کیمبرج کے نتائج کو آنکتے ہوئے مدر اینڈریو نے ایک فقرہ کہا جو بہت برمحل تھا۔ انہوں نے کہا "تہمینہ درانی کی صلاحیتوں کا اندازہ ماہانہ ٹیسٹوں کی بنیاد پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے ہاں اوسط نام کی کوئی شے نہیں۔ اس کی بہت گھٹیا تھرڈ ڈویژن بھی آ سکتی ہے اور بہت اچھی فرسٹ ڈویژن بھی۔ اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی"۔ 1970ء میں صرف دو لڑکیوں کی فرسٹ ڈویژن آئی۔ ان میں سے ایک میں تھی۔

ہم سب بہت دیندار تھے۔ امی کے کہنے پر ہم پانچوں وقت کی نماز پڑھتے۔ عاصم اور میں ابھی چودہ پندرہ برس ہی کے ہوئے تھے کہ حج کر چکے تھے۔ ہم تھے تو سنی لیکن محرم کے دوران سنجیدہ رویہ اپنانے کا بہت خیال رکھتے۔ اس مہینے میں ہم نہ تو موسیقی سنتے نہ کوئی ریکارڈ بجاتے۔ امی کو قوالیوں، مرثیوں اور نعتوں کا بڑا شوق تھا۔ ہمیں یہ سب اصناف سنوائی جاتیں اور رفتہ رفتہ اچھی بھی لگنے لگیں۔

مذہب نے مجھے فرار کا موقع فراہم کیا۔ اس کی بدولت مجھے کچھ دیر کے لیے ظلم و ستم سے نجات مل جاتی۔ میں زندگی کی ابتدا ہی میں مذہب کی طرف مائل ہو چکی تھی۔ جانماز کی صورت میں مجھے خدا کے حضور باریابی کا وسیلہ ہاتھ آ گیا۔ یہ بہت ہی نجی قسم کا رشتہ تھا۔ مقدس بھی اور لازوال بھی۔ میں نے دیکھا کہ میں نے اللہ کو اپنا رازدار بنا لیا ہے۔ میں اپنے تمام مسائل اللہ کے سامنے رکھ دیتی اور التجا کرتی کہ ان سے چھٹکارا پانے کا کوئی راستہ سجھا دیا جائے۔ میں امی کے استبدادی رویے کا گلہ کرتی، کہتی کہ اس ماحول میں میرا دم گھٹتا جا رہا ہے، زبان بات کرنے کو ترستی ہے، ذہن پر ابتری چھائی رہتی ہے۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ امی نے مجھے زندگی کے ایک ایسے رخ سے روشناس کرایا جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور یہ سب انہوں نے ایک جدید اور انگریزیت زدہ ماحول میں رہتے ہوئے کیا تھا۔ جب بھی میں برے حالات میں خدا سے رجوع کرتی ہوں تاکہ تقویت حاصل کر سکوں تو امی کے حق میں احساس تشکر سے بھری دعا ضرور مانگتی ہوں۔

میرے والدین کے باہمی تعلقات سطحی طور پر مکمل ہم آہنگی کے آئینہ دار تھے۔ والد صاحب دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر خوش خوش، پوری طرح چونچال لوٹتے۔ امی کی موجودگی میں وہ یکایک سنجیدہ ہو جاتے۔ ہر وقت اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا مظاہرہ کرتے نظر آتے۔ ایسا لگتا کہ وہ روز گھر آ کر امی کو سارے دن کی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ امی بڑے غور سے ان کی باتیں سنتیں اور اس دوران ان کا ذہن ایک ایک نکتہ نوٹ کرتا جاتا۔ کبھی کبھی والد صاحب جرأت سے کام لے کر کوئی لطیفہ سناتے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ امی کو ہنسی آ جائے۔ امی برف کی سل بنی رہتیں۔ والد صاحب کوشش کرنے سے کبھی باز نہ آئے۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ انہوں نے اپنی طرف سے کبھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ تو تو میں میں سے پہلو بچاتے، خواہ ایسا کرنے کے لیے انہیں اپنی انا کی قربانی کیوں نہ دینی پڑتی۔ امی کی غیر موجودگی میں بھی وہ ہمیشہ انہیں گھر کے سب سے اہم فرد کی حیثیت سے یاد کرتے۔ بتدریج انہوں نے بھی اپنی رائے رکھنی چھوڑ دی۔ انہوں نے امر سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ یوں ہم اس واحد حلیف سے محروم ہو گئے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جو ہمیں میسر آ سکتا تھا۔ ان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد امی کی خود سرانہ حکمرانی کو ختم کرنے کا آخری موقع بھی ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا۔

اتوار کو دہشت کا راج ہوتا۔ امی نے فیصلہ کیا تھا کہ اتوار بچوں کے ساتھ گزارا جائے گا۔ فلمیں دیکھی جائیں گی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمیں گلچھرے اڑانے کا موقع دیا جاتا تھا۔ یہ تو ایسا تھا کہ جیسے ہمیں خوش ہونے کی چابی دے دی گئی ہو کہ لو بھئی، تھوڑی دیر خوش ہو لو۔ کیا مجال جو کوئی غیر متوقع بات پیش آ سکے۔ ہر چیز کی پیش گوئی ممکن تھی، حتیٰ کہ یہ بھی بتایا جا سکتا تھا کہ جب پوپ کارن کے پیکٹ بانٹے جائیں گے تو پہلے کسے ملیں گے اور بعد میں کسے۔ ہم چپ چاپ گھومتے پھرتے، چپ چاپ کھاتے پیتے۔

ہم سکردو بھی گئے اور یہ ایک ایسا سفر یا سیر ہے جسے میں کبھی بھلا نہیں سکتی۔ امی نے فیصلہ کیا کہ جب پی آئی اے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے تو کیوں نہ ہم سب ایک دن کی سیر پر کے ٹو کی چوٹی دیکھنے چلیں۔ ہم ٹھنڈے کپڑے پہن کر کراچی سے براستہ لاہور، راولپنڈی پہنچے۔ لاہور کے وی آئی پی لاؤنج میں سارے ننھیال والے ہمارے منتظر تھے۔ اس کے بعد ہم اچانک بڑے بڑے کوٹ، مِٹن، سکارف اور سویٹر پہن کر سکردو روانہ ہوئے۔ ہم سکردو اترے، جلد جلد اردگرد نظر ڈالی اور پھر براستہ پنڈی واپس چل دیے۔ لاہور میں رہنے والے رشتے داروں سے ایک بار اور ملے اور کراچی پہنچ گئے۔ یہ تھا امی کے ذہن میں سیر و تفریح کا تصور، جیسے جیٹ طیارے میں سفر سے پیدا ہونے والی تھکاوٹ اور موسمی حالت میں اتنا بڑا فرق کوئی معنی ہی نہ رکھتا ہو۔

ہمارے گھر میں کسی کی پٹائی نہیں ہوتی تھی۔ امی نے اپنے خیالات ہمارے ذہنوں میں ٹھونس ٹھونس کر بھر دیے تھے۔ اس کے بعد انہیں راج کرنے سے کون روک سکتا تھا۔ وہ حکم دیتیں، ہم حکم بجا لاتے۔ کبھی کبھار کوئی غلط کام کر بیٹھنے پر ہمیں لیکچر پلایا جاتا۔ لیکچر کے نزول سے ہم اس طرح بدکتے جیسے لوگ طاعون سے بھاگتے ہیں۔ لیکچر سننے کے بعد ہمیں جواب میں کچھ کہنے یا کوئی ردعمل ظاہر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میں کوشش کرتی رہتی۔ جوں توں کر کے بیچ میں ایک آدھ جملہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے کہہ دیتی۔ اس جسارت سے صورتحال مزید بگڑ جاتی۔ دلائل پیش کرنے کا خسروانہ حق تو کلی طور پر امی کو حاصل تھا۔

کوئی بھی محفوظ نہ رہا۔ ہم سب امی کے ننھے ننھے جاسوس بن گئے۔ کسی کو رازدار بنانا مشکل ہو گیا۔ امی اتحادوں کو بنانے بگاڑنے میں ماہر تھیں۔ ہمیں اکثر طلب کر کے مطلع کیا جاتا کہ ہمارا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ "میں ہر چیز کا پتہ لگا سکتی ہوں۔ تم نے

میری دوسری بیٹی کے ساتھ جو راز کی باتیں کی تھیں وہ مجھ تک پہنچ چکی ہیں"۔

گھر مکمل طور پر پولیس ریاست بن کر رہ گیا جہاں ہر فرد مخبر تھا۔ امی کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کی وجہ سے ہم سب ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اب ہمیں سازش بھی خاموش رہ کر تیار کرنی پڑتی۔ امی ہرگز نہ چاہتی تھیں کہ ہمارے مابین اتحاد قائم ہو۔ اتحاد نراج اور بغاوت کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم ہوتا ہے۔ اگر لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھا جا سکے تو کوئی چیز کنٹرول سے باہر نہ ہو۔ یہ میکیاولی کے انداز کی سٹریٹجی تھی، اگرچہ امی نے میکیاولی کی تصنیف "شہریار" کبھی دیکھی بھی نہ تھی۔

روبینہ 1969ء میں اولیول کا امتحان دینے کے لیے پڑھ رہی تھی کہ اس کے والد مری آئے۔ اس سے پہلے وہ کبھی روبینہ سے ملنے نہ آئے تھے۔ مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ روبینہ کے والد اور ہیں، میرے اور۔ والد صاحب نے ہمارے درمیان کبھی کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھا تھا۔ روبینہ اپنے والد کے ساتھ چلی گئی اور گرمیوں کی چھٹیاں ان کے ساتھ گزاریں۔ اس اچانک صلح صفائی پر امی بڑی سٹپٹائیں اور روتی دھوتی رہیں۔ ٹانک کے ہیبت خاں نے اپنی بیٹی روبینہ کا بیاہ کر دیا۔ امی کو خبر تک نہ کی۔ اس کا شوہر، کیپٹن کمال الکریمی پی آئی اے میں پائلٹ تھا۔ روبینہ نے اس لیے شادی کر لی کہ وہ ہمارے گھر کی جابرانہ فضا سے تنگ آ چکی تھی۔ ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ اولیول کا امتحان دینے سے ڈرتی تھی۔ روبینہ اور کمال کی شادی کامیاب رہی۔

منو نے اپنی خوبروئی کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کیا۔ اسے اپنے خوبصورت چہرے کے حوالے سے پہچانے جانے سے چڑ ہو گئی۔ اسے ہمیشہ یہ فکر رہتی کہ زرینہ کو ذرا سی تکلیف بھی نہ پہنچے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈھنگی لڑکی بن کر رہے گی۔ اس نے ڈٹ کر کھانا شروع کر دیا جس سے اس کا وزن بڑھ گیا۔ ہر طرح کے میک اپ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے ملبوسات لے دے کر چند پھٹی پرانی، پیوند زدہ جینز اور کھدر کی شلوار قمیض کے دو جوڑوں پر مشتمل تھے۔ فوٹوگرافی کے فن پر اس کی گہری نظر تھی اور اس نے ٹھان رکھی تھی کہ یہی شوق بالآخر اس کا پیشہ بنے گا۔ والدین نے اسے آئل آف وائٹ میں واقع سکول میں داخلہ لینے کی اجازت نہ دی کیونکہ وہاں مخلوط تعلیم تھی۔ آخر ہوا یہ کہ اس نے فوٹوگرافی کے ایک بڑے زیرک طالب علم سے، جو نیم فرانسیسی اور نیم انگریز تھا، شادی کر لی۔ یوں وہ اپنے سکول ہی کو گھر اٹھا لائی۔ اس کے شوہر، فلپ ہولٹ، نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام علی حبیب رکھا۔

میرے بھائی عاصم نے کم عمری میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ والد کا دست نگر نہیں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

رہے گا۔ وہ جینیوا چلاگیا اور جلد ہی ان لوگوں کی صف میں شامل ہوگیا جو بڑے پیمانے پر کاروبار کرتے ہیں۔ اس نے بڑی خاموشی سے سعودی عرب کے شاہ سعود کی ایک پوتی سے شادی کرلی۔ عاصم نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اس بات کو بھلا کر ہی دم لے گا کہ اس کی رگوں میں پنجابی خون بھی ہے اور بات بے بات اپنی پٹھانیت جتانی شروع کر دی۔ کہنے لگا کہ وہ افغان گڈریا ہے اور بڑے فخر سے دوستوں کو اپنے اسلاف کے ادنیٰ پس منظر کی کہانیاں سناتا رہا۔ بھٹو صاحب نے والد صاحب کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس پر عاصم کو شدید رنج ہوا۔ 1972ء کے بعد اس نے کبھی پاکستان آنا پسند ہی نہیں کیا۔

زرمینہ نے روایتی انداز میں شادی کی۔ نواب صادق حسین قریشی کا بیٹا، ریاض، امی کا بھانجا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی دلہن سے پہلی بار ملنے آیا۔ زرمینہ نے تو عام لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے برعکس، عدیلہ، جو چودہ برس کی تھی، امی کی ساڑھی زیب تن کر کے پوری کوشش کرتی رہی کہ جو رشتہ زرمینہ کے لیے آیا ہے کسی طرح اسے خود اچک لے۔ ریاض کا دوست، جو اخلاقی سہارا دینے کے لیے ساتھ آیا تھا، پوری شام بیٹھا زرمینہ سے باتیں کرتا رہا تاکہ ریاض کو اپنی ہونے والی دلہن سے بات چیت کا موقع مل سکے۔ ریاض نے بعد میں اپنے دوست سے شکوہ کیا۔ وہ پریشان تھا کہ زرمینہ کا سارا وقت تو دوست نے لے لیا اور اسے بات کرنے کا موقع تک نہ مل سکا۔ بہرحال، عدیلہ کا یہ وار خالی گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد زرمینہ اور ریاض کی انگلینڈ میں شادی ہو گئی۔

عدیلہ امی کی لاڈلی تھی۔ وہ اسے ساتھ چمٹائے رکھتیں اور اس کی ہر بے تکی خواہش کو مان لیتیں۔ وہ جب بھی طیش میں آکر ادھم مچاتی تو اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے جاتے، اس کی ہر خوشی پوری کی جاتی۔ وہ جو جی چاہے کرتی پھرتی، کوئی اسے ٹوکنے والا نہ تھا۔ ایک ہم تھے کہ آہ کرنے پر بھی بدنام ہو جاتے تھے۔ عدیلہ کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کی صفائی پیش کرتے ہوئے امی کہتیں کہ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی کو ان سے بہت پیار ہے۔ وہ ہمیشہ امی سے چمٹی رہتی۔ ہماری تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم امی سے ہم آغوش ہوں تو کیسے۔ ان کی طرف سے ہمیں پرے پرے رہنے کے بیّن اشارے جو ملتے رہتے تھے۔

یاد آتا ہے کہ مجھ سے کہا گیا کہ عدیلہ کو ایک ماہر نفسیات کے پاس لے جاؤں۔ وہ بمشکل چھ برس کی تھی۔ امی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ بیٹھے بٹھائے اس پر جو خفگی کے دورے پڑتے رہتے ہیں ان کی وجہ کیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اسے صرف ایک عدد پینٹ بکس اور رنگ کرنے کی کتاب درکار ہے۔ اسے کسی نہ کسی شغل میں لگائے رکھنا ضروری تھا۔ وہ لاڈ پیار سے بگڑ گئی تھی اور چاہتی تھی کہ توجہ کا مرکز بنی رہے۔ وہ فیل مچا کر امی

کو بلیک میل کرتی۔ وہ صرف ملازموں کے بچوں کے ساتھ کھیلتی کیونکہ ان پر حکم چلا سکتی تھی۔

مجھ پر عدیلہ کے ایک اور پہلو کا انکشاف ہوا۔ اس نے چند چوزے پال رکھے تھے۔ چند روز تو وہ ان سے کھیلتی رہی اور پھر اس نتیجے پر پہنچی کہ اب وہ اپنی دل فریبی بالکل کھو چکے ہیں۔ اس نے ان ننھے چوزوں کو لے جا کر زندہ دفنا دیا۔ وہ ان کی اجتماعی قبر کے پاس کھڑی ہو کر خوفزدہ چوزوں پر کھرپے سے مٹی ڈالتی رہی۔ چوزے ادھر ادھر پھڑپھڑاتے پھرتے رہے یہاں تک کہ ان کے لیے ہلنا جلنا بھی مشکل ہوگیا۔ انھوں نے آہستہ آہستہ جھرجھری لی اور دم گھٹنے سے مر گئے۔ عدیلہ کھڑی مسکراتی رہی۔ سب نے اسے محض شرارت سمجھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس سے عجیب بھیانک حرکت سرزد ہوئی ہے۔ بدیہی طور پر یہی نظر آتا ہے جیسے اس میں اور مصطفےٰ میں بہت سی باتیں مشترک ہوں۔

امی کا خاندان ان سے اس طرح مودبانہ پیش آتا جیسے وہ کسی شاہی خاندان کی فرد ہوں۔ اگر وہ لاہور میں ہوائی اڈے پر تھوڑے دیر کے لیے بھی رکتیں تو پوری ننھیال اڈے پر حاضر ہو جاتی۔ ننھیال والوں کو وہاں ہونا ہی چاہیے تھا۔ امی توقع رکھتی تھیں کہ وہ بڑی تعداد میں حاضر ہوں گے۔ اس کے برعکس، اگر ہمارے رشتے داروں میں سے کوئی، اور ان میں ہماری نانی بھی شامل تھیں، کراچی آتا تو صرف بچے ہی اسے لینے ہوائی اڈے جاتے۔

ہماری جدید وضع کی طرزِ زندگی کے باوجود ہمیں مشرقی انداز اپنانے پر مجبور کیا گیا۔ امی کو بالکل اچھا نہ لگتا تھا کہ وہ خود یا ہم میں سے کوئی مغربی وضع قطع کا نظر آئے۔ وہ آپ بھی اپنے بال گوندھتیں، سوتی ساڑھیاں یا شلوار قمیض پہنتیں اور شفون کے بڑے سے دوپٹے سے سینے کو ڈھکے رکھتیں۔ اپنے انتہائی نفیس اور بیش قیمت جواہرات میں سے ایسے نگ چنتیں جنہیں دیکھ کر لوگ تعریف کے پل باندھے اور اپنی اپنی رائے ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکتے۔ جواہرات اور قیمتی پتھروں کے بارے میں انہیں خاصی معلومات حاصل تھیں۔ انھوں نے کسی جوہری کی نظر پائی تھی۔ پتھر میں خفیف ترین نقص کا پتا چلا لینا، پتھر کی آب و تاب کی گہرائی کا اندازہ لگانا اور یہ فیصلہ کرنا کہ ترشنے کے بعد پتھر شفاف اور آب دار نکلے گا یا غیر شفاف، ان کے لیے معمولی بات تھی۔ یہ ایسا علم تھا جس پر وہ مکمل عبور حاصل کر چکی تھیں۔ عبور حاصل کیوں نہ ہوتا کہ اپنی مہارتوں کو آزمانے کے لیے ان کے پاس جواہرات کا ایک شاندار ذخیرہ موجود تھا۔

کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا، اس طرح کے احکام کی کبھی ختم نہ ہونے والی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

فہرست ہمارے سامنے رہتی تھی۔ ہمیں لمبی آستینوں والے لباس پہننے اور بڑے دوپٹے اوڑھنے کی ہدایت کی جاتی اور یہ کہ اپنے لمبے بال گوندھنے ہیں، کوئی میک اپ استعمال نہیں کرنا، نیل پالش نہیں لگانی، نماز پڑھنی ہے، لڑکوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنا، ایسی لڑکیوں سے دوستی نہیں کرنی جو زیادہ ماڈرن ہوں، اپنی بوڑھی انا کے بغیر کسی سہیلی کے گھر نہیں جانا، ٹیلی فون کبھی خود نہیں اٹھانا، ایسی لڑکیوں کو سہیلیاں نہیں بنانا جن کے بھائی ہمارے ہم عمر ہوں یا عمر میں ہم سے بڑے ہوں۔ ہمیں تن تنہا ڈرائیور کے ساتھ کہیں جانے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔ باورچی خانے میں ملازموں کے اردگرد منڈلانے کی بھی ممانعت تھی۔

والد صاحب سے ہمارے جو بھی تعلقات استوار ہوئے ان کی بنیاد دوری اور کم آمیزی پر رکھی گئی۔ شفقت تو موجود تھی لیکن بیچ میں فاصلہ بہت تھا۔ امی ہمیں، خصوصاً مجھے، والد صاحب سے دُور رکھتیں۔ وہ خود بھی ہم سے، خصوصاً مجھ سے، دُور دُور رہتے کیونکہ امی کو ان کا مجھ سے قریب ہونا ناپسند تھا۔ شاید اس بنا پر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے مسائل لے کر میرے پاس آ جائیں اور میں اس لیے ان کی مدد کرنے لگوں کہ مجھے ان سے ہمدردی تھی اور امی کی پروا نہ تھی۔

ہم ہمیشہ سے یہ سوچتے آئے تھے کہ ایک نہ ایک دن والد صاحب کے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ ان جیسا زورآور پٹھان ہر وقت کے ان طعنوں تشنوں کو ہمیشہ تو برداشت نہیں کر سکے گا۔ بعض دفعہ رات کے وقت میں انہیں بند دروازے کے پیچھے بحث کرتے سن لیتی۔ امی کا لہجہ ہمیشہ جارحانہ اور والد صاحب کا معذرت خواہانہ ہوتا۔ ایک بار میں اپنے تمام حوصلے کو بروئے کار لا کر ان کی خواب گاہ میں جا دھمکی۔ میں امی کے عتاب کا نشانہ بننے کو تیار تھی۔ میں والد صاحب کو بچانا اور سہارا دینا چاہتی تھی۔ امی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میری دخل اندازی پر وہ آگ بگولا ہو گئیں۔ والد صاحب نے مجھ سے کہا کہ چلی جاؤ اور ہماری باتوں میں مخل نہ ہو۔ اس رات میں نے اللہ سے دعا کی کہ والد صاحب کو امی کی بدمزاجی سے محفوظ رکھنا۔

والد صاحب کے دفتر کے عملے سے امی اس طرح پیش آتیں جیسے وہ سب ان کے نوکر چاکر ہوں۔ وہ ہر وقت انہیں فون کرتی رہتیں۔ اگر فریج کام نہ کر رہا ہو یا ایئرکنڈیشنر ٹیں بول گیا ہو تو ان آلات کی مرمت اور درستی دفتر کے افسران کے ذمے داری تھی۔

گھر سے باہر تو کام کا دباؤ تھا ہی، گھر میں بھی دباؤ کچھ کم نہ تھا اور میں سمجھتی تھی کہ اتنا زیادہ دباؤ والد صاحب برداشت نہ کر پائیں گے لیکن وہ سب کچھ سہار گئے۔ امی انہیں کبھی رات کو ڈنر پر زیادہ دیر باہر نہ رہنے دیتیں۔ شراب کو ہاتھ لگانے کی اجازت

نہ تھی۔ گھر پر بھی نہ پی سکتے تھے۔ ان پر بھی اتنی ہی زیادہ قدغنیں تھیں جتنی ہم پر تھیں۔ زندگی ان کی تھی لیکن ہر بات کا تعین امی کرتی تھیں۔ ہمیں اپنے ددھیال والے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ سیدھے سادے لوگ تھے۔ والد صاحب کو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے رہنے سہنے میں مزہ آتا۔ امی نے یہاں بھی روڑے اٹکائے۔ والد صاحب سے کہا گیا کہ وہ اپنے بھائیوں بہنوں کے ساتھ اکیلے نہیں رہ سکتے۔ ان کے بھائیوں بہنوں کو ان سے خاصی دور رکھا جاتا۔ وہ ہمارے گھر آتے تو بس کھڑے کھڑے اور بالکل رسمی انداز میں۔ امی کا نہ جانے کیوں خیال تھا کہ ان سے میل جول کا والد صاحب پر اچھا اثر مرتب نہیں ہوتا۔ امی کو ددھیال والے اور ان کی زندگی کے معیار گنوار اور غیرشستہ معلوم ہوتے۔

تمام مالی وسائل و مسائل پر امی کا کنٹرول تھا۔ وہی طے کرتی تھیں کہ والد صاحب کو شام کو کس سے ملنا ہے اور کن لوگوں سے میل جول بڑھانا ہے۔ والد صاحب خوش شکل اور خوش پوش تھے۔ ان کے لباس میں کوئی ذرہ برابر نقص نہ نکال سکتا۔ وہ سویل رو کے سلے سوٹ اور ٹرن بل اور ایسر کی قمیضیں اور ہاتھ سے بنے ہوئے انگریزی جوتے پہنتے۔ ان کا طرزحیات قدامت پسندانہ تھا۔ ناخن قرینے سے ترشے، ہاتھ صاف ستھرے۔ اپنا مفہوم بیان کرنے پر پوری طرح قادر۔ انگریزی بولتے وقت لفظوں کو تھوڑا کتر کتر کر ادا کرتے۔ لب و لہجہ بہت صاف تھا۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے ان کا خاصا احترام کرتے تھے۔ درحقیقت ان کا رعب داب بڑی قوی جارحانہ شخصیت کی غمازی کرتا تھا۔ امی اکثر ان سے کہتیں کہ وہ اتنی جارحانہ روش اختیار نہ کریں۔ اس طرح ان کے بدخواہوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

والد صاحب کے کام کو امی اپنا کام سمجھتیں۔ ہر بات میں اس طرح دخل دیتیں جیسے ایسا کرنے کا انہیں حق حاصل ہو۔ ان کے کام کے حوالے سے ٹیلی فون پر تبادلۂ خیال کرتیں اور مصر ہوتیں کہ ان کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔ پی آئی اے میں جن دنوں ہڑتال ہوئی تو والد صاحب کی طرح امی بھی معاملات کو سلجھانے میں پوری طرح منہمک رہیں۔ بحرانی حالات میں امی کے جوہر کھلتے تھے۔ ان کی اپنی زندگی بحرانِ مسلسل ہو ٹھہری۔ جب کبھی والد صاحب کو پیشہ ورانہ سطح پر کسی بحران سے واسطہ پڑتا تو باگ ڈور امی سنبھال لیتیں۔ عام حالات میں بھی وہ والد صاحب پر کچھ زیادہ اعتماد نہ کرتی تھیں لیکن بظاہر بحران کے وقت اس اعتماد میں مزید کمی آ جاتی۔ پی آئی اے کی ہڑتال اور راولپنڈی میں طیارے کا کریش دو ایسی ہی مثالیں ہیں۔ میں دیکھتی کہ وہ تسبیح پھیرتے ہوئے یہ دعا مانگتی رہتیں کہ ذہنی سکون نصیب ہو۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

یحییٰ کی حکومت کے دور میں والد صاحب نے اپنے فوجی پس منظر کی وجہ سے، اپنے تمام پرانے دوستوں سے رابطہ قائم کر لیا۔ وہ خود سرکاری افسر تھے اور ان کے پرانے یار دوست، مارشل لا کی بدولت، حکومت چلا رہے تھے۔ والد صاحب زیادہ وقت اسلام آباد میں یا میٹنگوں میں گزارنے لگے۔ امی نے ان کے دوستوں کی ضیافتوں میں شاید ہی کبھی شرکت کی ہو۔ انہیں ان لوگوں کی بلانوشی اور عورت بازی کی شہرت سے گھن آتی تھی۔ انہوں نے والد صاحب کو ان دوستوں سے دور رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ یحییٰ خاں سے امی کی ملاقات صرف چند بار ہوئی اور وہ بھی یا تو سرکاری ضیافتوں پر یا یحییٰ خاں کے بیٹے کی شادی کے استقبالیے کے موقع پر، جو ہمارے ہی گھر پر، یعنی پی آئی اے ہاؤس میں دیا گیا تھا۔ اردگرد جو خواتین نظر آتی تھیں امی ان سے بدرجہا حسین تھیں؛ مگر ان لوگوں کا تعلق امی کی سماجی کلاس سے نہ تھا۔

ہمارے والدین کی جھک جھک ہمارے نوٹس میں زیادہ آنے لگی۔ پی آئی اے کے آخری سال کے دوران اور پھر اس مختصر عرصے میں، جب وہ سٹیٹ بینک کے گورنر رہے، ایسا لگا جیسے ان پر امی کے کنٹرول اور بالادستی میں کمی آ چلی ہو۔ وہ امی کے دلائل کا ڈٹ کر جواب دینے لگے۔ وہ اپنے خیالات اور آراء کا زیادہ شدومد سے اظہار کرتے، خصوصاً جب ان باتوں کا تعلق ان کے اپنے کام سے، حکومت سے یا جنرلوں سے ان کے یارانے سے ہوتا۔ امی پر جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔ ان کے اوسان خطا ہونے لگے۔ انہیں ہم سے پہلے سے بھی زیادہ نفرت ہو گئی اور جو غصہ والد صاحب پر آتا تھا وہ بھی ہم پر اتارا جانے لگا۔ انہیں والد صاحب کی چھوٹی سی آزادی بری لگی۔ امی کے خیال میں آیا کہ ان کے فوجی دوست انہیں تقویت دے کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا رہے ہیں۔ یہی دوست انہیں اپنی بیگم سے لڑا رہے ہیں۔ میرے خیال میں والد صاحب کے حق میں یہ بہت ہی اچھا ہوا تھا۔

اپنے گھر میں، گو وہ آمر بنی ہوئی تھیں، ہمارے روبرو والد صاحب کا نقشہ اس طرح کھینچا جاتا جیسے تمام اصول وہ بناتے ہیں اور ایسے پٹھان ہیں جنہیں کسی صورت میں غصہ نہیں دلانا چاہیے۔ ہم یہی سمجھتے تھے کہ والد صاحب ہم سے جو نارمل انداز میں پیش آتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ امی ہماری حفاظت کے خیال سے ہمیں ان سے دور رکھتی ہیں۔ چند ایک بار جب امی نے ہم میں سے کسی کی شکایت ان سے کی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ مجھے ایسا لگا کہ ان کی خفگی بناوٹی تھی۔ وہ محض امی کو خوش کرنا چاہتے تھے۔

باہر کی دنیا کے سامنے وہ ایک مستحکم شادی کی تصویر پیش کرتی رہیں۔ ہم ایسا

میری امی کی جوانی کے دنوں کی ایک تصویر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میرے والد شاکراللہ درّانی 1952ء میں

مری کے کونونٹ میں اپنی بہن روبینہ کے ساتھ 1968ء

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

خاندان تھے جس میں کوئی عیب نہ تھا، جو شائستگی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا۔

ایک بار میرے سامنے والد صاحب کے ذاتی ملازم، امیرخان، نے انہیں پیپسی لا کر دیا۔ انہوں نے بوتل خالی کر کے ایک اور طلب کی۔ مجھے پتہ چلا کہ بوتل میں الکحل تھا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا کہ پی آئی اے کے سربراہ کو خود اپنے گھر میں شراب چھپا کر رکھنی پڑتی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ وہ مجھ پر بھروسا کریں۔ میں "امی" کو نہیں بتاؤں گی۔ اس وقت وہ مجھ سے بہت شفقت سے پیش آئے۔ مجھے امی سے اور زیادہ نفرت ہو گئی۔

وہ قید سے چھٹ کر آئے تو امی نے پھر ان کی جان کھانی شروع کر دی۔ تاثر یہ ملتا تھا جیسے والد صاحب کی وجہ سے امی کی سبکی ہوئی ہے۔ اب اس میں والد صاحب کا کیا قصور اگر بھٹو صاحب کی شخصیت ان کی شخصیت سے ٹکرا گئی تھی۔ ان کی راتیں اس طرح بسر ہوتیں کہ امی والد صاحب کو لعنت ملامت کرتی رہتیں، قصوروار ٹھہراتیں--- اور یہ عقوبت جیل کی سزا سے بھی بدتر تھی۔ بات کوئی ہوتی، قصور ان کا نکل آتا۔ انہوں نے امی کی گلیمر بھری اور اقتدار سے عبارت زندگی میں کھنڈت ڈال دی تھی۔

یحییٰ خاں کی معزولی کے بعد، جب والد صاحب جیل میں تھے، اخباروں میں سابق صدر کی نجی زندگی کے بارے میں سنسنی خیز کہانیاں چھپنی شروع ہوئیں۔ بتایا گیا کہ وہ عورتوں کا رسیا تھا اور نشے میں دھت رہتا تھا۔ والد صاحب یحییٰ کے قریبی ساتھی تھے۔ چنانچہ انہیں بھی عیش و نشاط کی محفلوں میں حصہ لیتے دکھایا گیا۔ امی بھی لپیٹ میں آ گئیں۔ وہ چند بار اپنے شوہر کے ساتھ ضیافتوں میں یا رات کے کھانوں پر دیکھی گئی تھیں۔ ان کے بارے میں بھی سکینڈل گھڑ لیے گئے۔ صدر یحییٰ کا نواب جوناگڑھ کے پاس آنا جانا تھا جس کا مکان سٹیٹ بینک ہاؤس سے تھوڑا سا آگے تھا۔ اخباروں میں آیا کہ یحییٰ خاں کو سٹیٹ بینک ہاؤس کے قرب و جوار میں اکثر دیکھا جاتا ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ اشارتاً کیا سمجھایا جا رہا ہے۔ میرے والدین نے فیصلہ کیا کہ وہ ان الزامات کی تردید میں کچھ نہ کہیں گے۔ تردید جاری کرنے سے معاملہ بد سے بدتر ہو جاتا۔ چنانچہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے سے قاصر رہے۔ انہوں نے ان باتوں کا الزام بھٹو صاحب پر دھرا۔ امی نے اس سلسلے میں ہم سے یا کسی اور سے کبھی کوئی بات نہ کی۔ یہاں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ والدصاحب سے امی کی وفاداری اور لگاؤ کلی طور پر شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ حقیقت میں ان پر بس یہی دھن سوار رہتی تھی کہ وہ بیگم درانی کی حیثیت سے پہچانی جائیں اور اپنے شوہر کی امیج کو بنا سنوار کر دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہ امیج ہی امی کی آبرو کی ضامن تھی۔ والد صاحب کی توقیر، ان کے اصول، ان کی کامیابی-----

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سب امی کی نظر میں محترم تھے۔

مجھ سے کبیدہ رہنے کا انداز اپنانے کے باوجود امی ہر وقت میرے لیے بڑے بڑے منصوبے گھڑتی رہتی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ میری ذات میں انہیں اپنا عکس نظر آتا تھا۔ ہماری شخصیتیں آپس میں ٹکرا گئی تھیں۔ اتنا انہیں بھی پتہ تھا کہ اپنے تحکم کے باوجود وہ مجھے ذہنی طور پر اپنا حلقہ بگوش بنانے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ بہرحال یہ بات سمجھنے اور انکے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنے میں مجھے سینتیس سال لگے ہیں۔۔۔ یعنی ان کے تصرف کے اثرات کے رفع دفع ہونے کے لیے سینتیس سال درکار ہوئے۔ یہ ایسا تھا جیسے کوئی نحس ستارہ ایک جگہ آ کر رک گیا ہو اور ہر طرف نحوست کا سایہ ڈال رہا ہو۔ اب اس ستارے نے میرے برج سے کھسکنا شروع کر دیا تھا۔

دوسرا زبردست دباؤ جو ہم سب کو سہنا پڑا وہ یہ تھا کہ ہمیں کس قسم کی شادی کرنی ہو گی۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے لیے مثالی مرد وہ ہو گا جو بہت تعلیم یافتہ ہو۔ آکسفورڈ یا کیمبرج کا پڑھا ہو تو بہتر، اور اس کا تعلق کسی اچھے، عالی مرتبت خاندان سے ہو۔ یعنی ایسے خاندان سے جسے سماجی طور پر پذیرائی حاصل ہو۔ ہمارے والدین کو یہ اعلان کرتے ہوئے فخر محسوس ہونا چاہیے کہ فلاں خاندان کے فلاں لڑکے سے نسبت ٹھہرائی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو شادیاں ہم نے کرنی تھیں ان کا ہم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جن مردوں سے ہم بیاہی جائیں گی وہ ایسے ہونے چاہئیں کہ ان سے سماج میں ہمارے والدین کا رتبہ مزید بلند ہو سکے۔ اگر شادی کے بعد ہم خوش اور زندگی میں کامیاب رہے تو ہماری بدولت والدین کی سماجی حیثیت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ ہم محض موضوع گفتگو تھے۔ ان کی زندگی کی توسیع تھے۔

مرد کسی اور سیارے کی مخلوق تھے۔ ہمیں تربیت دی گئی تھی کہ ایک اصول یاد رکھیں۔ مردوں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے بھروسے کے لائق ایک ہی مرد ہو سکتا ہے۔ وہی جسے ہمارا شوہر بننا ہو۔ ہمیں سکھایا گیا کہ شادی ایک مقدس ادارہ ہے اور ہم ساتھ رہنے کا جو عہد باندھیں گے اسے کسی بھی صورت میں توڑنا نہیں ہے۔ اگر ہمارا مرد بعد میں بہائم صفت ثابت ہو تو بھی ہمارا فرض ہے کہ اس سے نباہے جائیں اور اس کے کردار کو بدلنے کی کوشش کریں۔ شادی کی ناکامی سے ہم عورتوں کی کمزوری آئینہ ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

میں سولہ سال کی ہو چکی تھی اور پہلی مرتبہ مجھے اس نظر سے دیکھا گیا کہ اگر اسے دلہن بنا کر اپنے گھر لے جائیں تو کیسا رہے۔ شادیاں اور سماجی تقریبات عموماً بڑی پرتکلف شادی منڈیوں سے مشابہ ہوتی ہیں جہاں عورتیں اپنی بیٹیوں کے مستقبل کا

کرنے آتی ہیں۔ اہل بن بیاہوں کو وہ لڑکیاں دکھائی جاتی ہیں جن سے ان کا رشتہ طے ہو سکتا ہے۔ کھلم کھلا ملنے جلنے کے مواقع کم تھے۔ ہر چیز پر اخفا کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ ہم آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔

میں ایک شادی میں شریک ہونے لاہور گئی تھی۔ وہاں میری انیس خاں سے ملاقات ہوئی۔ اس نے میرا بڑا لحاظ کیا۔ میں اس طرح کی خاطرداری کی عادی نہ تھی۔ شادی میں موجود بہت سے لوگ یہ بتانے کے لیے خاص طور پر میرے پاس آئے کہ میں امی سے مشابہ ہوں۔ انہوں نے میرا نام "چھوٹی ثمینہ" رکھ دیا کہ وہ اپنی دانست میں کسی نوجوان لڑکی کو اس سے بڑا خراج تحسین پیش نہ کر سکتے تھے۔ جوان بیٹوں والی بہت سی مائیں مجھ پر نظر ڈال رہی تھیں۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرا جائزہ لے رہی ہیں، انہیں مجھ سے دلچسپی ہے۔ انیس کی امی بھی وہاں موجود تھیں اور وہ مجھ پر لہلوٹ ہو گئیں۔ انیس میرے پاس آیا اور باتیں کرنے لگا۔ یہ بہت ہی مختصر اور مبہم سی ملاقات تھی۔ میرے لیے نہ یہ ملاقات کوئی خاص معنی رکھتی تھی نہ انیس۔ گفتگو کی ابتدا انیس کی طرف سے ہوئی۔ "ہیلو، آپ ابھی پڑھ رہی ہیں؟" "ہاں"۔ "کہاں پہ؟" "مری میں۔ کونونٹ میں"۔ "اوہ۔ آپ کس کلاس میں ہیں؟" "میں سینیئر کیمبرج کر رہی ہوں"۔ بالکل سیدھی سیدھی باتیں، بالکل رسمی باتیں۔

اس ملاقات کے بعد میں جلد ہی مری لوٹ گئی۔ ایک اتوار میری کلاس کی لڑکیوں کو مال پر سیر کرنے کی اجازت ملی۔ وہاں دیکھتی کیا ہوں کہ انیس موجود ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کدھر دیکھوں کدھر نہ دیکھوں۔ ہم ان نوجوانوں سے بالالتزام دور رہتے جو لڑکیوں اور عورتوں پر ڈورے ڈالنے کے لیے مال کے چکر لگایا کرتے تھے۔ مال پر گھومنے والے ان تمام دل پھینک پروانوں کو ہم پہچانتے تھے اور وہ، ہماری خاطر، جس طرح مرغِ زریں بنے اکڑتے تنتے پھرا کرتے تھے اس پر ہماری ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔ یہ شخص مختلف تھا۔ وہ میرے پاس آ کر بات کرنے لگا۔ میری تو شرمندگی اور گھبراہٹ کے مارے جان ہی نکل گئی۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ سہیلیوں میں سرگوشیاں جاری ہیں اور دبے دبے قہقہے لگ رہے ہیں۔

انیس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس کی امی نے میرا رشتہ مانگا تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ خبر نہ تھی۔ میری رائے معلوم ہی نہیں کی گئی تھی۔ امی نے اس بہانے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا کہ میں ابھی چھوٹی ہوں۔ مجھے پتہ تھا کہ کم عمری کی بات سے محض ٹلانا مقصود تھا۔ انیس امی کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اس کا کسی امیر گھرانے سے تعلق نہ تھا نہ اس نے آکسفورڈ یا کیمبرج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ایشیاٹک ایڈورٹائیزنگ کمپنی میں ایک ایگزیکٹیو تھا۔ اس ملازمت میں کوئی گلیمر تو تھا نہیں۔ کل ملا کر آٹھ سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔

انیس نے مجھے اور میری سہیلیوں کو دعوت دی کہ چل کر اس کے ساتھ مری کے مشہور ریستوراں "سامز" میں چائے پئیں۔ ہمارے لیے یہ بڑی بات تھی۔ بورڈنگ سکول میں دیکھے جانے والے خوابوں میں کیک پیسٹریوں کے سوا رکھا ہی کیا ہوتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ یہ نوجوان تو بہت بانکا اور سخی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے ووٹ اس کے حق میں پڑے کہ یہ فیصلہ ہم نے دماغ سے نہیں پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا۔ ہم سامز پہنچے۔ وہاں ہم رومان لڑانے نہیں گئے تھے۔ کیک پیسٹریاں اڑانی مقصود تھیں۔ لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میرے خیال میں مجھے انیس سے صرف اس لیے محبت ہو گئی کہ وہ مجھے کھلا پلا رہا تھا۔ میرے ناز اٹھائے جا رہے تھے۔ ہم نے اس کے پلے سے کھایا پیا اور پھر خوفزدہ ہو کر کلاک کی طرف دیکھتے ہی ناروا عجلت کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے۔ انیس نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہی۔ اسے اگلے دن کراچی جانا تھا۔ وہ نہیں گیا۔

اگلے روز میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ انیس ہمارے سکول کے دروازے کے باہر کھڑا ہے۔ وہ کسی مدعا کے تحت وہاں منڈلا رہا تھا۔ اس کا مدعا میں تھی۔ سکول کے ضابطے بہت سخت تھے۔ ہمیں اجنبیوں سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ انیس وہاں کھڑا ہوا ان باؤلے عاشقوں سے خاصا مشابہ نظر آیا جن کا ذکر ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ فرق تھا تو یہ کہ اس کی وضع قطع ماڈرن تھی۔

انیس کو بڑی ترکیبیں آتی تھیں۔ اس نے اپنی جاننے والی ایک ڈے سکالر کو مجھ تک اپنی چٹھی پہنچانے پر آمادہ کر لیا۔ یہ پہلا عاشقانہ خط تھا جو میرے نام آیا۔ اس میں شعرو شاعری) یا آرزومندی کی بھرمار نہ تھی۔ بالکل سیدھی سیدھی بات کی گئی تھی۔ "میں لاہور اپنی ملازمت پر واپس نہیں جا رہا کیونکہ میں تمہارے قریب رہنا چاہتا ہوں۔ میں مری میں ٹھہرا رہوں گا۔ یہاں کم از کم مجھے تمہاری جھلک تو نظر آ سکتی ہے"۔ اس نے میرے اور میری سہیلیوں کے لیے کیک اور پیسٹریاں بھجوائیں۔ میں اپنی اہمیت کے احساس سے مست ہو گئی۔ وہ میری طرف متوجہ ہونے والا پہلا مرد تھا۔ مجھے مزے مزے کی چیزیں کھانے کا شوق بھی تھا اور میں محبت کی بھوکی بھی تھی۔ انیس کی وجہ سے میری دونوں آرزوئیں بر آئیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔

امی ہم سب سے وعدہ لے چکی تھیں کہ انہیں بتا دیں گے کہ ہم کن سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی طرف سے انہوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں فوراً ہماری پسند

کے مرد سے بیاہ دیں گی۔ میں سمجھی کہ وہ سچ بول رہی ہیں۔ میں نے طے کیا کہ انہیں اس نوجوان کے بارے میں بتا دوں گی جس نے میرا دل موہ لیا ہے۔ میں جب گرمیوں کی تعطیلات گزارنے گھر روانہ ہوئی تو انیس سے شادی کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ انیس اور میں ایک ہی طیارے پر سفر کر رہے تھے۔ ہمارے لیے ساتھ بیٹھنا یا باتیں کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے اتنا بتا دیا کہ میں اس سلسلے میں امی سے بات کروں گی---- جلد۔ ہوائی اڈے پر اتر کر میں نے اپنا سامان اکٹھا کیا۔ کنویئر بیلٹ نے میرا سوٹ کیس مجھ تک پہنچا دیا۔ اس میں انیس کے لکھے ہوئے پندرہ خط تھے۔ وہ روز مجھے خط لکھتا تھا۔

کراچی پہنچ کر مجھے امی سے زبانی بات کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ ان کو خط لکھ دیتی ہوں۔ خط لکھ کر میں نے ان کے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور دعائیں مانگنے لگی۔ کوئی حس مجھے آگاہ کر رہی تھی کہ طوفان آنے والا ہے۔

امی بری طرح بپھری میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ غصے سے نیلی پیلی ہو رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ انہیں ہر بات بتائی جائے۔ وہ تمام بیہودہ تفصیلات جاننا چاہتی تھیں۔ لیکن کچھ ہوا ہوتا تو تفصیلات بتانے کی نوبت بھی آتی۔ میرے پاس صرف خطوط تھے۔ انہوں نے کہا کہ خط دکھائے جائیں۔ میں نے خط ان کے حوالے کر دیے۔ وہ بیٹھ کر خط پڑھنے لگیں۔ میں شرم سے لال، سر جھکائے بیٹھی رہی۔ "اس نوجوان نے سمجھداری کی صرف ایک ہی بات لکھی ہے اور وہ یہ کہ تمہیں کسی اور مرد سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے اور کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے زیادہ مردوں سے ملنا جلنا چاہیے"۔

امی کے خیال میں انیس لفنگا تھا۔ اسے ان کی بیٹی تک رسائی حاصل کرنے کی جرأت کیسے ہوئی، خصوصاً جب وہ رشتہ دینے سے انکار کر چکی تھیں۔ امی نے کہا کہ انیس سے میری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مجھے دھمکی بھرے لہجے میں سنایا کہ وہ انیس اور اس کی ماں سے بات کریں گی۔ مجھے بڑی شرمندگی اور گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ میرے خیال میں یہ ساری باتیں، بالکل غیر ضروری تھیں۔ میں نے ان کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اپنی پسند ان پر واضح کر دی تھی۔ ہمارے درمیان معاہدے کی رو سے جو ذمہ داری امی پر عائد ہوتی تھی انہوں نے اسے پورا نہیں کیا تھا۔

میں سکول واپس چلی گئی۔ گھر میں جو ایک مہینہ گزارا اس کے دوران میری حالت بعینہ کسی قیدی کی سی تھی۔ مجھے سختی سے منع کر دیا گیا تھا کہ ٹیلی فون کے قریب بھی نہ جاؤں اور کہیں باہر جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ مستزاد یہ کہ امی مجھ سے شاذو نادر ہی بات کرتیں۔ ان کے رویے سے مجھے یہ محسوس ہونے لگا جیسے میں ناپاک ہو چکی ہوں۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

چھٹیاں گزارنی دوبھر ہو گئیں۔

سکول لوٹ کر میں نے ساری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر دی۔ میرا اولیول کا امتحان سر پر آ پہنچا تھا۔ میرے لیے تو بس وہی رومان باقی رہ گیا تھا جس کا ذکر میری انگریزی ادب کی درسی کتابوں میں ملتا تھا۔ انیس نے ہار نہ مانی۔ وہ اپنے رابطے کے ذریعے مجھے باقاعدگی سے خط لکھتا رہا۔ یہ خط مجھ تک پہنچتے رہے۔ امی مجھے سکول چھوڑنے خود مری آئی تھیں اور انہوں نے ننوں سے بات کی تھی۔ میری تمام ڈاک سنسر ہونے لگی۔ میری ہر حرکت، ہر بات پر نظر رکھی جانے لگی۔ امی نے ننوں کو اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ مجھے قابو میں رکھنا ضروری ہے۔

انیس اپنی والدہ کو بار بار امی کے پاس بھیجتا رہا۔ انہیں ہر بار ایک سا جواب ملا۔ وہ پھر بھی باز نہ آئے۔

جاڑوں کی تعطیلات میں ہم ملک سے باہر گئے۔ ویانا اور روم کی سیر کی۔ مجھے اولیول کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اب امی نے مجھ سے اس طرح پیش آنا شروع کر دیا جیسے میں کوئی بالغ فرد ہوں۔ میرے ددھیال والوں کا خیال تھا کہ میں بن بیاہی عمر رسیدہ عورت بن چکی ہوں۔ آخر سترہ سال کی جو ہو چکی تھی۔ ادھر انیس تھا کہ ٹلنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ اس کی والدہ نے خوش خلقی کا ثبوت دیتے ہوئے امی کی بدتمیزی اور روکھے پن پر ناگواری ظاہر نہ کی۔ انیس ہمارے ہاں آنے لگا تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ اسے گھنٹوں انتظار کرایا جاتا۔ جب امی شاہانہ نوازش سے کام لے کر اس سے مل بھی لیتیں تو بھی انتہائی تکبر سے پیش آتیں۔

ان کی نظر میں انیس کوئی زیادہ اچھا رشتہ نہ تھا۔ وہ نہ تو دولت مند تھا نہ اس نے "صحیح" درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن میری رائے میں ان تمام باتوں کی مطلق اہمیت نہ تھی۔ انیس نے مجھ سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ اتنا ہی کافی تھا۔ اس کی مدد سے مجھے فرار ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ علاوہ ازیں، وہ مجھے ایک کاز بھی فراہم کر رہا تھا۔ میں جلد ہی بغاوت کا علم بلند کرنے والی تھی۔ میں آزاد ہونا چاہتی تھی۔

اگر میرے مستقبل کی خاطر کوئی منصوبہ بندی کی گئی ہوتی تو شاید میں شادی کا خیال چھوڑ دیتی۔ لیکن اس قسم کی منصوبہ بندی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس سلسلے میں نہ تو کبھی کسی طرح کا تبادلۂ خیال ہوا تھا، نہ کبھی کالج کا ذکر آیا تھا نہ یونیورسٹی کا۔ سرے سے کچھ بھی نہ تھا۔ صرف شادی کا نصاب میرے سامنے رکھا جا رہا تھا۔ یہاں بھی مجھے اپنی مرضی سے کچھ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ باقی خاندان سے میرا قافیہ نہ ملتا تھا۔ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے مجھے بیاہ دینا ہی بہتر تھا۔ میرے ذہن پر انتشار کا غلبہ تھا۔

یقیناً میری زندگی کے کوئی معنی تو ہوں گے۔ آزادی فریب نظر کے سوا کچھ نہ تھی۔ آزادی کا رشتہ شادی سے جوڑ دیا گیا تھا۔ گھر ہماری تربیت گاہ تھا جہاں ہمیں سکھایا جاتا تھا کہ شادی کے بعد اپنی آزادی سے کیا کام لینا ہے۔

انیس میرے لیے وہ دروازہ تھا جو آزادی کی طرف کھلتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے یونہی سے شناسا تھے۔ وہ اٹھائیس برس کا تھا۔ میں سترہ سال کی تھی۔ محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے لیے سراسر اجنبی تھے۔

میں نے امی سے کہہ دیا کہ میں انیس کے سوا کسی سے شادی نہ کروں گی۔ میں انہیں یہ نہ بتا سکی کہ میں انیس سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہوں۔ میری بات ان کی سمجھ میں کبھی نہ آتی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جتنے لوگ بھی مجھ سے شادی کرنے کے خواہاں ہیں ان سب میں انیس میرے لیے اچھے مستقبل کی بہترین ضمانت ہے۔ صرف وہی ایسا مرد ہے جس کے ساتھ میں زندگی گزار سکتی ہوں۔ میں نے کہا کہ رفتہ رفتہ مجھے اس سے محبت ہو جائے گی اور اس کی مستقبل مزاجی نے میرا دل جیت لیا ہے۔ میں نے واضح کر دیا کہ میں ہرگز کسی اور سے شادی نہ کروں گی اور وہ مجھے کہیں اور شادی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔ یہ محض خالی خولی دھمکی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ اگر کوشش کروں تو انیس کو بھلا سکتی ہوں لیکن میں اس تمام کشیدگی سے تنگ آ چکی تھی۔ امی کو تھوڑا سا ڈر لگا کہ کہیں کوئی سکینڈل نہ بن جائے۔ ان کے ذہن میں اچانک ناگفتہ بہ مناظر گردش کرنے لگے۔ آخرکار انہوں نے رضامندی ظاہر کر دی۔

امی کا رویہ یکایک بدل گیا۔ اب وہ ہونے والی دلہن کی ہنس مکھ ماں نظر آنے لگیں۔ وہ شادی کی رسومات میں مصروف ہو گئیں۔ دوستوں اور رشتے داروں کو مٹھائیوں کی ٹوکریاں بھجوائی گئیں۔ امی نے اپنے نئے کردار کو مکمل خلوص کے ساتھ ادا کیا۔ یہ بھلا دیا کہ وہ اس رشتے کی مخالفت کرتی رہی تھیں۔ ایس یو درانی کی صاحبزادی کی عروسی انتہائی دھوم دھام سے ہونی تھی۔ انہیں اس کی تیاری کرنی تھی۔ منگنی یادگار تقریب ثابت ہوئی۔ فریدہ خانم نے گانے سنائے اور آرائش کے ایک خصوصی ماہر کو لبنان سے بذریعہ طیارہ بلوایا گیا۔

ابھی چند سخت مقام آنے باقی تھے۔ امی کو پتہ چلا کہ جن دنوں وہ ملک سے باہر تھیں میں انیس کے ساتھ فلم دیکھنے گئی تھی۔ اس حقیقت کو کہ دو خالائیں اور دو کزن بھی ہمارے ساتھ تھے بڑی بے دردی سے نظرانداز کر دیا گیا۔ میں نے نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا۔ انیس نے ان کے احکام ٹھکرانے کی جرأت کی تھی۔ ان کے قہر کا نشانہ مجھ سے زیادہ انیس بنا۔ اسے درانی گھرانے کے قاعدے قانون سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہمارے گھر میں امی کا کہا تقدیس کا حامل تھا۔ ان کے کہے پر کان نہ دھرتے، ان کی مرضی کے خلاف چلنے کی ہر کوشش کو کچل دیا جائے گا۔

امی نے منگنی توڑ دی۔ ہماری یہ حالت ہوئی جیسے نسیان کے کسی عالم میں گم سم جیے جا رہے ہوں۔ امی نے جو ثابت کرنا تھا، کر دیا۔ انیس نے بہت سے ایلچی بھیجے۔ آخرکار امی کا مزاج، جو ساتویں آسمان پر جا پہنچا تھا، اعتدال پر آ گیا اور انہوں نے میری شادی کی راہ میں سے ہر رکاوٹ دور کر دی۔ یا ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ سب رکاوٹیں دور ہو چکیں۔ والد صاحب سٹیٹ بینک کے گورنر تھے۔ مشرقی پاکستان میں بحران سر اٹھا رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے والد صاحب سے ملاقات کی اور کہا کہ مشرقی پاکستان سے بینک کے اثاثے خفیہ طور پر نکال لیے جائیں۔ والد صاحب نے انکار کر دیا۔ اس بات کو بھٹو صاحب نے نہ تو کبھی بھلایا نہ معاف کیا۔

جنرلوں سے والد صاحب کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ ان سے مل کر جب وہ گھر آتے تو مشرقی پاکستان کے واقعات کو ہمارے سامنے امیدافزا رنگ میں پیش کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جنگ جیت لیں گے۔ ہمیں اس المیے کی کوئی خبر نہ تھی جو سروں پر منڈلا رہا تھا۔ ہماری بے خبری اتنی مکمل تھی کہ جس روز ہتھیار ڈالے گئے اسی دن سٹیٹ بینک ہاؤس کے لان میں امی نے سرکاری طور پر بنائی جانے والی سیمنٹ کی خندق کا افتتاح کیا۔ کیچڑ گارے سے لت پت خندق میں جا کر چھپنا ان کی برداشت سے باہر تھا۔

بھٹو نے بطور صدر اقتدار سنبھالنے کے بعد جو چند ابتدائی قدم اٹھائے ان میں سے ایک کا تعلق والد صاحب کی برطرفی سے تھا۔ انہیں گھر میں نظربند کر دیا گیا۔ ہم نے ٹی وی پر بھٹو کو بطور صدر پہلی بار تقریر کرتے سنا۔ یہ ایک عجیب لمحہ تھا۔ یہ تھا وہ آدمی جس کے لیے ہم دعائیں مانگتے رہے تھے۔ یہی وہ آدمی تھا جو صاحبِ عصر کہلانے کا مستحق تھا۔ یہی وہ آدمی تھا جو ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو اٹھا کر جوڑ سکتا تھا۔ اور وہ ہمارے خاندان کے خلاف تھا۔ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ردعمل ظاہر کریں۔ میرے خاندان کو شرمندگی اور اضطراب نے گھیر لیا۔

والد صاحب کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ہم نے بوریا بستر باندھ کر لاہور کی راہ لی۔ مجھے اپنے منگیتر سے ملنے کی اجازت نہ دی گئی۔ والد صاحب کو ایک گندی کوٹھری میں رکھا گیا جہاں تل چٹے اور دوسرے حشرات رینگتے رہتے تھے۔ امی چٹان بن کر ان کا ساتھ نباہتی رہیں۔ دونوں کو زندگی میں پہلی بار نیچا دیکھنا پڑا تھا۔ امی نے دیکھا کہ بھلے وقتوں میں دوست، جو مطلبی بندے تھے، ان کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ بعض دوسروں نے، مثلاً آغا حسن عابدی نے آزمائش کی اس گھڑی میں امی کا ساتھ دیا۔ بہت عرصے

بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ والد صاحب کی طرح کسی شہری کے جیل جانے کو شرمناک واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ اہل خاندان پر مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے۔ وہ لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ سیاستدان جیل یاترا کو اپنے لیے فخر سمجھتا ہے۔ ان دونوں ہستیوں کا، جو میری زندگی میں سب سے اہم ہیں جیل سے واسطہ پڑا۔ ایک خراب وخستہ ہو کر، کانوں کو ہاتھ لگاتا باہر آیا۔ دوسرا ہیرو بن کر جیل سے نکلا۔

چھ مہینے کی سخت ابتلا کے بعد میرے والدین کو دوبارہ یکجا ہونے کا موقع ملا۔ انہوں نے طے کیا کہ امریکہ چلے جائیں گے۔ اب انیس سے میری شادی کی سادہ اور خاموش تقریب ہونی باقی تھی۔ تاریخ طے پا گئی۔

والد صاحب صوبۂ سرحد جا کر اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ لاہور میں تھے۔ گورنر مصطفےٰ کھر نے انہیں پنجاب کی سرحد پار کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ بھٹو صاحب اس امر کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ والد صاحب کو اپنے پرانے دوست، ولی خاں، سے ملنے کا موقع نہ ملے۔ بھٹو صاحب ذرا سا خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہ تھے۔ اس موقع پر مصطفےٰ کھر نے جو کردار ادا کیا اسے والدصاحب کبھی نہ بھلا سکے۔ انہوں نے والد صاحب کو اپنے گھر والوں کو الوداع کہنے سے روک دیا تھا۔

شادی سے تین دن پہلے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ مجھے نہ تو انیس سے محبت ہے اور نہ میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھ پر اوس پڑ گئی۔ میں نے اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں غلطی کر رہی ہوں لیکن اب غالباً اتنی دیر ہو چکی تھی کہ بچنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ نانی نے میرے کمرے کے باہر منڈلی شادی کہ رات بھر جاگ کر چوکسی کریں اور میرا خیال رکھیں۔ نانی چاہتی تھیں کہ میں کچھ کھا پی لوں۔ مجھے نہ کھانے پینے کا ہوش تھا اور نہ اس بد کا کوئی خیال جس نے یہ ثابت کر دیا تھا۔ کہ عورت کا دل جیتنا ہے تو پہلے اس کے کام ودہن کو راضی کرو۔

میں نے انیس سے بات کی۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے غالباً اس سے محبت نہیں ہے؛ صرف محبت کے تصور سے محبت ہے۔ میں فرار ہونا چاہتی تھی۔ انیس پر جیسے بجلی گر گئی۔ اس کے سوا وہ کچھ نہ کہہ سکا کہ اب اتنی دیر ہو چکی ہے کہ میں اپنا ارادہ بدل نہیں سکتی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم صرف نروس ہو رہی ہو۔" اگلے دن ہماری مہندی تھی۔

والد صاحب میرے پاس آئے۔ میں ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ انہوں نے میری بات کا غلط مطلب لیا۔ بیٹیاں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرتی آئی ہیں۔ انہیں میکا چھوڑ کر اجنبی ماحول میں جانا پڑتا ہے۔ شادیاں شام کے جھٹپٹے کے مانند ہوتی ہیں۔ دکھ اور سکھ کا سنگم ہوتی ہیں۔ والد صاحب بار بار کہتے رہے کہ ان کا ساتھ چھوٹنے کا جو دکھ مجھے ہے وہ اسے سمجھ سکتے ہیں لیکن میرے سامنے میرا مستقبل ہے۔ جب میں کہتی کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی تو کسی کو میری بات پر یقین نہ آتا۔ سب نے کہا کہ میں آخری لمحات کے اضطراب کی وجہ سے ایسی باتیں کر رہی ہوں۔

میں ناشاد دلھن تھی۔ حیران پریشان بیٹھی رہی۔ انیس اب اپنے خسر کی مہربانی سے نیشنل شپنگ کارپوریشن میں کام کر رہا تھا۔ اب اس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ تھی۔ وہ میرا شوہر بن گیا۔

جب میں شوخ رنگوں سے سجی کار میں بیٹھ کر گھر سے رخصت ہونے لگی تو عدیلہ نے پھر تیسے میں آ کر آفت برپا کر دی۔ اس نے میرا غرارہ دبوچ لیا اور چیخنے اور رونے لگی۔ وہ آٹھ سال کی تھی۔ وہ میرا غرارہ چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ جو کچھ بن پڑا، ہم نے سب کر کے دیکھ لیا۔ آخر ہم اسے ساتھ لے جانے پر مجبور ہو گئے۔ عدیلہ اور میری شادیوں کو گتھم گتھا جو ہونا تھا۔

انیس میرا وہ دروازہ تھا جو آزادی کی طرف کھلتا تھا۔ میرے مقدر میں یہی لکھا تھا کہ میں انیس میں سے گزر کر پتہ چلاؤں کہ مجھے کس کی تلاش ہے۔

باب - ٦

مینڈا سائیں

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اس کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

انیس سے میری شادی جلد ہی یکسانیت کی نذر ہو گئی۔ نہ کوئی نشیب باقی رہا نہ فراز۔ سپاٹ سا رشتہ تھا ہمارا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ کسی چیز کی کمی ہے لیکن یہ بالکل پتہ نہ تھا کہ یہ کمی آخر ہے کیا۔ شاید اس کا تعلق میرے دل سے ہو جس نے زور زور سے دھڑکنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے کسی ایک کے پلے بندھ جانا ایسا ہی تھا جیسے آدمی یک رنگی کا پابند ہو کر رہ جائے۔ جس آزادی کے لیے میں کلپتی رہتی تھی وہ تو اب یہ افراط میسر تھی مگر مجھے یہ علم ہی نہ تھا کہ اس سے کیا کام لیا جانا چاہیے یا کیا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں بڑی تیزی سے سب کچھ سیکھنے والی تھی۔

اس ٹھہری ہوئی زندگی میں ہلچل پیدا کرنے کا فریضہ میرے ایک ماموں نے انجام دیا۔ ہسپانیہ کے قومی دن کا جشن منانے کے لیے پنجاب کلب میں ایک استقبالیے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ماموں نے مجھے اور انیس کو استقبالیے میں شرکت کی دعوت دی۔ ہم ایک بہت بڑے ہال میں پہنچے جہاں چیدہ چیدہ لوگ جمع تھے۔ وہ ان عام آدمیوں کے شانہ بہ شانہ کھڑے تھے جو بادہ و ساغر کو گردش میں رکھنے کے لیے کاک ٹیل کے جام اٹھائے دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ وہاں میرا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ خود مجھے بھی کوئی نہ پہچانتا تھا اور یہ امر میرے لیے اور زیادہ بدمزگی کا باعث تھا۔ میں نے ہلکے سبز شفن کی ساڑھی زیب تن کی ہوئی تھی۔ میں بہت دبلی پتلی تھی اور گھر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پر جب قدآدم آئنے نے میرے حسن کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر دکھایا تھا تو میں سچ مچ شرما گئی تھی۔ میرے لمبے لمبے بال آبشار کی صورت میری کمر پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس موقع کے لیے میں نے بالوں کو سمیٹ کر گوندھا تھا اور میری چٹیا گھٹنوں تک پہنچ رہی تھی۔ گلے میں ہیروں کی مالا تھی جو میرے الماسی بندوں سے لگا رکھی تھی۔ میں خوب بن سنور کر گھر سے چلی تھی۔ اپنی خواہشیں پوری کرنے کا شوق ابھی معصوم سا دل بہلاوا تھا۔ میرا شعور گہری نیند سو رہا تھا۔

میں نے اس طرح ادھر اُدھر نظر دوڑائی جیسے میری جان پر بنی ہوئی ہو۔ میں چاہتی تھی کہ کہیں ٹک جانا نصیب ہو جائے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اس کلب میں غلطی سے آنکلی ہوں۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہمیں یہاں آنے کا نااہل قرار دے دیا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجھے ایک خالی جگہ مل گئی۔ میں بساط بھر متانت بروئے کار لا کر وہاں جا بیٹھی۔ میں نے اس خاتون سے جو میرے ساتھ بیٹھی تھی جعلی سی مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔ وہ مجھے گھورنے لگی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھ سے بات چیت کرنے کی زحمت گوارا کی۔ جلد ہی اس نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

مجھے پتہ چلا کہ اس کا نام ڈاکٹر شاہدہ امجد ہے اور وہ اس کھیل میں خوب طاق ہے کہ کون کیا ہے اور کس کی کیا حیثیت ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ میں لاہور میں نووارد ہوں اور خود کو کھوئی کھوئی محسوس کر رہی ہوں۔

ڈاکٹر شاہدہ بہت شائستہ تھی۔ کسی کی طرف انگلی سے اشارہ نہ کرتی۔ جب کسی شخصیت کا تعارف کرانا مقصود ہوتا تو آنکھوں اور ابروؤں سے کام لیتی۔ اس کے بعد وہ مختصراً مختلف مہمانوں کا کچا چٹھا بیان کرتی۔ میں سنتی رہی۔ میری آنکھیں گردش کرتی رہیں۔

ہال میں ایک قدآور، سانولا اور چھریرا مرد، جس نے کالا سوٹ پہن رکھا تھا، بہت نمایاں تھا۔ میں نے اس کی کلف لگی اجلی قمیض پر نظر ڈالی جس کی سفیدی کو گہرے اُودے رنگ کی ٹائی اور اسی رنگ کے رومال سے ابھارا گیا تھا۔ بظاہر عیاش طبع آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس سے کچھ کچھ شیطنت ٹپکتی تھی لیکن اس طرح کی شیطنت جو ذرا بھلی لگتی ہے۔ میں نے اس کے اردگرد جمع لوگوں کے چہروں کی کیفیتوں پر نظر ڈالی۔ وہ سب خواتین تھیں۔ میں یہ نہ سن پائی کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ ان کی گفتگو نستعلیق سوسائٹی کے ہلکے ہلکے شور، برف کی چوکوریوں کی کھنک اور بہت شستہ قہقہوں میں دب کر رہ گئی تھی۔ میں نے اپنی مخبر سے پوچھا کہ یہ آدمی کون ہے۔ "وہ؟ تمہارا مطلب یہ تمہیں اتنا بھی نہیں پتہ کہ وہ کون ہے؟" خاموشی۔ مجھے واقعی پتہ نہ تھا۔ "یہ مصطفےٰ کھر ہے۔"

"اوہ۔"

اس کے سگار کے سرے پر جمع راکھ جھڑ کر قیمتی قالین پر گرنے ہی کو تھی۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگی کہ کیا سگار کی راکھ گرنے سے قالین کا کچھ بگڑتا نہیں۔ میں نے دوبارہ نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بول رہا تھا۔ باقی سب بدستور ہمہ تن گوش تھے۔ کھر بولتے بولتے رکا اور بہت آہستگی اور بڑے بانکپن سے سکاچ کے گلاس کو ہونٹوں تک لے گیا۔ میں نے سوچا کہ یہ اس قسم کا مجلسی مے خوار ہے جو کبھی اپنے لب تر نہیں ہونے دیتا۔ میری نظر اس کی آنکھوں پر گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ دمک رہی ہوں۔ وہ ایسے کوبرے سے مشابہ تھا جو ڈسنے ہی والا ہو۔ اسے اپنے اردگرد جمع تمیزدار ٹولی کو مسحور کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ عین اسی لمحے ایک بہت ہی دلکش نوجوان خاتون، نارنجی شفن کی ساڑھی میں لپٹی، خراماں خراماں ہمارے آگے سے گزری۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔ میں نے شاہدہ سے پوچھا یہ کون ہے۔ اس کا نازوانداز کہے دیتا تھا کہ اسے اپنی اہمیت کا احساس ہے۔ "یہ شہرزاد ہے۔ شیری۔ کھر کی بیوی۔" "اوہ۔"

مصطفےٰ کے بارے میں مجھے اور بہت سی باتیں پتہ چلیں۔ ہیروڈ جیسے ماحول میں سوقیانہ گپ شپ۔ وہ پنجاب کا گورنر اور وزیراعلیٰ رہ چکا تھا۔ اس نے حال میں استعفیٰ دے کر بھٹو صاحب سے، جو اب تک اس کے پیرومرشد تھے، ٹکر لی تھی۔ کوئی بہت جرأت مند آدمی ہی ایسی حرکت کر سکتا تھا۔ بھٹو صاحب فکرمند تھے۔ مصطفےٰ کھر "شیرِپنجاب" کہلاتا تھا۔ ادھر بھٹو صاحب کو ایسے شیر اچھے لگتے تھے جو پنجروں میں بند ہوں۔

ڈاکٹر شاہدہ نے جان لیا کہ میرے اعصاب کا تناؤ اب بڑی حد تک کم ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ میرا تجسس تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اب مجھے ان شخصیات سے براہ راست ملوانے کا وقت آ پہنچا تھا جن کی طرف اشارے کیے جا رہے تھے۔ "آئیں۔ میں آپ کو شیری سے ملواؤں۔ آپ کو وہ پسند آئے گی۔" ہم دھکا پیل کرتے ان لوگوں میں سے راستہ بناتے گزرے جو معاشرے کا "بالائی" حصہ کہلاتے ہیں۔ کیا ہی گاڑھی گاڑھی اور تیار بالائی ہے، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ مجھے شیری سے متعارف کرایا گیا۔ ہم کھر صاحب کی باتیں کرنے لگے۔ شیری نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کے شوہر سے ملنا پسند کروں گی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ مجھے کھر سے ملانے لے چلی۔ میں کچھ نیم دلانہ انداز میں ساتھ ہو لی۔ میری ہچکچاہٹ کی وجہ کھر کی شہرت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی بری شہرت ہمیشہ ہی اس سے دو قدم آگے رہتی ہے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہمارا رسماً تعارف ہوا۔ اب شیری نے ماہر شجریات کا روپ دھار کر میرے خاندانی شجرے کا ذکر چھیڑا۔ یہ سن کر کہ میں شاکردرانی کی بیٹی ہوں مصطفےٰ تھوڑا سا سٹپٹایا۔ یہ ویسا معاملہ تو نہیں تھا جیسے رومیو اور جولیٹ کے خاندانوں میں سخت دشمنی تھی لیکن پھر بھی اس پر تھوڑا سا گراں گزرا۔ بھٹو صاحب نے میرے والد کے ساتھ بہت سخت رویہ اختیار کیا تھا اور انہیں جیل تک بھجوا دیا تھا۔ اُن دنوں مصطفےٰ کھر بھٹو صاحب کا دستِ راست تھا۔ وہ قطعی طور پر ایسا شخص نہ تھا جس کے میرے والدین صورت دیکھنے کے بھی روادار ہوں۔ "مجھے امید ہے آپ کے والدین بخیر ہوں گے۔ سیاست میں ناانصافیاں بھی ہوتی ہیں۔ آپ کے والد کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس میں ذاتی رنجش کو کوئی دخل نہ تھا۔" میرے سننے میں کچھ اور ہی آیا تھا۔

اس کے گرد جمع عورتوں نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے پرکھا تولا۔ مصطفےٰ اور میں آپس میں ہنسی مذاق کرتے رہے۔ کوئی آنچ نہیں آئی۔ میں اس پر پھسلی تک نہیں۔ میرے دل کی دھڑکن ذرا بھی تیز نہ ہوئی۔ مصطفےٰ نے مجھ پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑا۔ غالباً اس بات کا احساس اسے خود بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھ پر ڈورے ڈالنے کا اسے فوری طور پر مزید موقع ملے۔

اس تمام عرصے میں انیس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب وہ نمودار ہوا۔ بڑا خوش تھا جیسے کوئی میدان مار کر آیا ہو۔ اس نے میزبان پر دیرپا اثر چھوڑا تھا۔ ہم دونوں سے خاص طور پر کہا گیا کہ کاک ٹیل پارٹی کے بعد ٹھہرے رہیں اور ڈنر کھا کر جائیں۔ انیس بہت ہی سادہ لوح تھا۔ میری کوئی حس مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ہمیں چلے جانا چاہیے۔ انیس ایسی نامعقول حرکت کرنے کا کبھی خواب میں بھی تصور نہ کر سکتا تھا۔ ہم اہم لوگوں کے درمیان تھے۔ رابطے بڑھ رہے تھے۔ مزید وزٹنگ کارڈ ہاتھ آنے کو تھے جنہیں جوڑ جوڑ کر کاغذی قلعے تعمیر کیے جا سکتے تھے۔ ہم ٹھہر گئے۔

اس رات رکھ رکھاؤ کی باریکیوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ڈنر کی میز پر مصطفےٰ میرے سامنے بیٹھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس جیسے آدمی اپنی جگہ آپ چنتے ہیں۔ یہی ہوا بھی۔ کھانے کے دوران ہم "یہ لیجیے نا، وہ دیجیے نا" قسم کی ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ اس نے مجھ سے میرے والدین کے بارے میں سوال کیے۔ پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے، وہ کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ میں اس کی طرف مائل ہوئی تو اس میں ہماری بات چیت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کی آنکھوں نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ وہ شفاف ہو کر دمک رہی تھیں اور وہ انہیں کچھ زیادہ ہی تواتر سے جھپک رہا تھا۔ پھر وہ کانچ کے بنٹوں سے مشابہ ہو گئیں۔ بعد میں اس کی آنکھوں کی یہ کیفیت دیکھنے کے مواقع مجھے بارہا ملے۔ آنکھوں

میں یہ شیشے کی سی چمک صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی عورت اُسے پرکشش نظر آتی۔

ڈنر ختم ہوا تو ہم اٹھ کر کونیاک اور شراب کے لیے سٹنگ روم میں منتقل ہو گئے۔ مردوں نے سگریٹ اور سگار سلگا لیے۔ بعض خواتین نے بھی تقلید کی۔ مصطفےٰ کو بالکل واضح طور پر سردار کا رتبہ حاصل تھا۔ باقی سب لوگ اچھوت تھے (اور وہ بھی زیادہ تر لال بیگی)۔ اس کا شاہانہ دبدبہ میرے تجسس کو گدگدائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کبھی کوئی چیز آپ طلب نہ کرتا تھا۔ وہ خود بخود اس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ ابروؤں کی ذرا سی جنبش، کلائی کی غیر محسوس حرکت دیکھتے ہی لوگ تعمیلِ ارشاد کے لیے اچھل کھڑے ہوتے۔ اس کا جام کبھی خالی نظر نہ آتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے میں موجود تمام مردوں کے درمیان اس کے جام کو پُر کیے رکھنے کا مقابلہ جاری ہے۔ بظاہر وہ اس کی پینے کی رفتار اور پسند ناپسند سے آگاہ تھے۔ کھر خاموش دُھن بجا رہا تھا اور لوگ اس کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ ایک بار مصطفےٰ نے جیسے ہی نپولین برانڈی سے بھرا اپنا جام خالی کیا تین آدمی اس کی طرف بڑھے۔ مصطفےٰ نے مشاق انگلیوں کی مدد سے اپنے سگار کو گولایا۔ بیسیوں آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر حرکت کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے ہی اس نے سگار کو ہونٹوں سے لگایا ایک سگار تراش نمودار ہوا۔ سگار کا سرا کترے جانے کی دیر تھی کہ بھک سے چھ لائٹر جل اٹھے۔ بادشاہ سلامت کے لیے یہ باتیں روزمرہ کا معمول تھیں۔ میں مزے لے لے کر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

ہم رخصت ہوئے۔ انیس پر سرور طاری تھا۔ اقتدار کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔

اگلی صبح ہمارے نام فون آیا۔ فون مسٹر آغا جمال اور ان کی بیگم پروین نے کیا تھا۔ وہ مصطفےٰ کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ دوپہر کا کھانا ہم ان کے ہاں کھائیں۔ انیس کہیں اور جانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اس کا بس چلتا تو جھنجھلاہٹ کے مارے اپنا سر دیوار میں دے مارتا۔ "کوئی مسئلہ نہیں" فون پر سنائی دینے والی مصر آواز نے کہا۔ "ہم رات کا کھانا ساتھ کھا لیں گے۔" میں حیران ہوئی کہ انہوں نے دوپہر کا کھانا کیا صرف اس لیے منسوخ کر دیا تھا کہ ہم اس میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔

اس رات ہم اس جادو بھرے حلقے کے رکن بن گئے۔ ہماری جس ٹولی سے ملاقات ہوئی اس نے ہمیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ان سب لوگوں میں ایک بات مشترک تھی۔ مصطفےٰ کھر۔

میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے کھینچے لیے جا رہا ہے۔ کچھ زیادہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ واقعی کوئی زیریں رو مجھے کھینچ رہی تھی یا یہ محض میرے تخیل کی کارفرمائی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تھی۔ میں نے ابتدا میں اسے بیزاری اور اکتاہٹ کا نتیجہ قرار دیا۔ میں چاہتی تھی کہ میرے ساتھ کوئی انہونی بات پیش آئے۔ میری آرزو تھی کہ زندگی میں کوئی رونق کا سامان ہو۔ تاہم مصطفےٰ شادی شدہ مرد تھا۔ اس کی بہت دلکش بیوی تھی جو بظاہر اس پر جان چھڑکتی تھی۔ میں صرف بائیس برس کی تھی۔ وہ بیالیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کے مزاج میں اتنی پختگی تھی۔ میں کسی بے طرح بگڑی ہوئی رومان زدہ لڑکی کی سی حرکتیں کر رہی تھی۔ آپس میں انس بڑھے تو تجسس کو بھی پر لگ جاتے ہیں۔

مصطفےٰ کھر ہماری زندگیوں میں داخل ہو چکا تھا۔ ہماری زندگیوں نے اس شخص کے گرد گھومنا شروع کر دیا۔ جلد ہی ہماری تقریباً روزانہ دوپہر اور رات کے کھانے پر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں سمجھتی تھی کہ زیادہ لوگوں کی موجودگی تحفظ کی ضامن ہوتی ہے۔ مجھ پر جلد ہی انکشاف ہوا کہ آدمی بھیڑ میں بھی تنہا ہو سکتا ہے۔ ان دعوتوں میں ہر کوئی اپنی اپنی بیگم کے ساتھ آتا۔ ان میں چھڑا چھانٹ کوئی نہ تھا۔ نہ ان میں سے کوئی کسی دوست لڑکی کو ساتھ لے کر آتا۔ گفتگو زیادہ تر شکار کے گرد گھومتی اور ہر کسی کے پاس سنانے کے لیے کوئی نہ کوئی من پسند کہانی ہوتی۔ مرد شکار کی اگلی مہم کا منصوبہ تیار کرنے یا پچھلی بار کی زبردست شکاری مہم کے دوران پیش آنے والے واقعات کا باریکی سے جائزہ لینے میں مگن رہتے۔ خواتین بڑے فخریہ انداز میں ان کی باتیں سنتیں اور ان کے میک اپ سے آراستہ چہروں پر بیزاری کے کوئی آثار تک نظر نہ آتے۔ وہ سب کی سب اپنے شوہروں کا ساتھ نبھانے والی بیویاں تھیں۔ شکاریوں کی بیویاں۔ ایک آدمی کے سوا۔ انیس واضح طور پہ اس گروہ میں کسی طرح فٹ نہ ہوتا تھا۔ یہی حال میرا تھا۔ گفتگو میں تو ہم حصہ نہ لے سکتے تھے۔ اس لیے بڑے شوق سے ان کی باتیں سنتے رہتے۔

کبھی کبھار گفتگو کی تان آ کر مجروں پر ٹوٹتی۔ مرد حضرات، اپنی بیگمات کے جذبات کو قطعی طور پر فراموش کر کے، کسی نہ کسی ناچنے گانے والی کے حوالے سے وجد میں آ جاتے۔ بیویاں بڑی احتیاط سے اپنے احساسات پر پردہ ڈالے رکھتیں اور اپنے مردوں کی ان خیالی عیاشیوں کو، جن سے وہ آنکھیں سینکتے رہتے تھے، بے ضرر سے مردانہ دل بہلاوے کے سوا کچھ نہ سمجھتیں۔ ہمارے سننے میں آتا کہ فلانی کے جسم میں یوں "لچک" ہے اور ڈھمکانی یوں "بھاؤ" بتاتی ہے اور فلاں جو ہے وہ رات بھر کی اتنی خرچی لیتی ہے۔ یہ سب باتیں میرے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ معاشرے کے یہ چیدہ افراد، نستعلیق ہونے کے ناتے، اسطرح کے قدرے خلافِ تہذیب موضوعات سے نمٹ سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ اس نوعیت کی بات چیت کی میرے والدین کے گھر میں بالکل اجازت نہ تھی۔ ہمارے ان

"دوستوں" کو درانی گھرانے کی طرف سے کوئی سنہرے حاشیوں سے سجا دعوت نامہ کبھی موصول نہ ہو سکتا تھا۔ ان کے اس انداز میں کہ اپنے جیسے منتخبِ روزگار افراد کے سوا کسی سے ملنے ملانے کی ضرورت نہیں کہیں زیادہ نک چڑھا پن پایا جاتا تھا۔

ایک اور موضوع، جو تواتر سے زیرِ بحث آتا، دسترخوان تھا۔ میں نے ان سب چیزوں کو ملاجلا کر دیکھنا چاہا۔ شکار اور دسترخوان کا تو ربط بنتا تھا۔ لیکن مجرے؟ اس وقت مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ جاگیردارانہ ذہن میں عورت بھی شکار ہے۔ اس کی جھانجریں بیڑیاں ہیں اور لہراتے ہوئے کرنسی نوٹ چارا۔

اس طرح مل جل کر رہنے سے ہمیں منفرد مقام حاصل ہو گیا۔ ہمارے گروہ کا بڑا چرچا رہنے لگا۔ مصطفےٰ کھر کے حوالے سے تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی بحث چھڑی رہتی تھی۔ اب ہم بھی اسی کے گروہ میں شامل تھے۔ چنانچہ ہم بھی متنازعہ قرار پائے۔ لوگ انیس کو اور مجھے مصطفےٰ کے بارے میں خبردار کرنے لگے۔ ہمارے سامنے اس کے وہ کارنامے دہرائے گئے جو وہ پنجاب کے عظیم ڈون جوان کے طور پر انجام دے چکا تھا۔ "وہ عورت باز ہے۔ اسے روز نئی عورت چاہیے۔ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ انیس یار اس سے بچ کر رہو۔ خبیث آدمی ہے۔ تمہیں نقصان پہنچا کر رہے گا۔"

انیس پر ان تنبیہوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ جاگیردار نہیں یا شکار نہیں کھیلتا۔ وہ مصطفےٰ کا دوست ہے۔ مصطفےٰ میں بڑی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ کبھی اس کے دن بھی پھریں گے۔ تب یہ یارانہ سودمند ثابت ہو گا۔ آج بوؤ کل کاٹو۔ وہ بڑی آسانی سے یہ بھول گیا کہ نلائی بھی کرنی ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کی جوان بیوی ہے۔ وہ اس اہمیت کے مزے لوٹنے میں محو تھا جو اسے تازہ تازہ نصیب ہوئی تھی۔ مصطفےٰ نے اس کا دل موہ لیا تھا۔

یہ چکنے چھبیلے شہری باؤ اور دیہاتی کے تضاد کی کلاسیکی مثال تھی۔ انیس کو کبھی دیہاتی ذہن سے سابقہ نہ پڑا تھا جو بیشتر وقت سازشوں اور چال بازیوں کا جال بچھانے میں مصروف رہتا ہے۔ شہر کا رہنے والا مادیت پرست ہوتا ہے۔ قانون کا لحاظ اس کی عادات اور اعمال کے تعین میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ چیزوں اور معاملوں کی ظاہری حالت ہی کو ان کا اصل سمجھتا ہے اور اسی حوالے سے قبول کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جاگیردارانہ ذہن پر وقت عیارانہ جال بچھانے کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ انیس سمجھتا تھا کہ مصطفےٰ معزز آدمی ہے۔ قدرتی طور پر اسے مصطفےٰ سے لگاؤ ہو گیا۔ وہ یہ دیکھ ہی نہ سکا کہ مصطفےٰ کی ذات میں ایک فریب کار سرگرم عمل ہے۔ اتنی باریک بینی انیس کے بس کی بات نہ تھی۔ اسے بہلا پھسلا کر صیدگاہ کی طرف لایا جا رہا تھا اور اسے مطلق خبر نہ تھی کہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

شکار کا آغاز ہو چکا ہے۔ شکار مجھے کیا جانا مقصود تھا، بھینٹ انیس نے چڑھنا تھا۔ ہمارے گروہ کے مراسم پورے آٹھ مہینے قائم رہے۔ یہ مدت مصطفےٰ کے لیے کافی تھی۔ اسے ہماری راہ میں کنویں کھودنے کے لیے خاصا وقت مل گیا۔

کسی براہ راست سلسلہ جنبانی کی نوبت نہ آئی۔ میں صرف قیاس دوڑاتی اور انتظار کرتی رہ گئی۔ مصطفےٰ نے مجھ سے کوئی ایسی بات کبھی نہ کی جس پر ذرا سا گمان بھی ہو سکتا کہ مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میرے ساتھ وہ رسمی انداز اختیار کیے رہا لیکن اس انداز میں کوئی روکھا پن نہ تھا۔ رویہ دوستانہ تھا مگر درمیان میں بڑی احتیاط اور توجہ سے فاصلہ رکھے ہوئے۔ اس نے کبھی کوئی چکر چلا کر مجھ سے تنہائی میں ملنے کی کوشش نہ کی۔ چاہے جانے کے اس اسلوب سے میرا تجسس دوچند ہو گیا۔ تقریباً ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مصطفےٰ اپنی شہرت پر لگے تمام داغ دھبے دھونے میں مصروف ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے بارے میں ازسرنو کوئی رائے قائم کروں۔ اس کا ہر فعل پکار پکار کر یہ کہتا معلوم ہوتا تھا کہ دیکھو میں عورت باز نہیں، میں اوباش نہیں۔ مجھے غلط سمجھا گیا ہے۔ وہ میرا احترام کرتا رہا۔ میں کوئی فاحشہ نہ تھی جس سے شہوانی خواہشات پوری کرنے کا کام لیا جانا مقصود ہو۔ وہ آرزومند تھا کہ میرا دل ہوس پرستی کے ذریعے نہیں بلکہ عشق جتا کر جیتے۔ بائیس برس کی اکیلی عورت ہوتے ہوئے بھی مجھ سے اکل کھرا پن ضرور پھوٹا پڑتا ہوگا۔ مصطفےٰ تھوڑا تھوڑا مجھ سے مرعوب ہوا۔ وہ میری مزاحمت کی سختی کو کم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے جیتنے کے لیے خوب سوچ سمجھ کر جو منصوبے تیار کیے تھے ان کی تکمیل کے لیے میری موجودگی اشد ضروری تھی۔

گفتگو کے دوران جب بھی سیاست کا موضوع چھڑتا تو مصطفےٰ کا جوش و خروش دیدنی ہوتا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ سوشلسٹ ہے۔ وہ تبدیلی لانا چاہتا تھا۔ وہ ازمنۂ وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے درپے تھا جو ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ وہ معاشرے کے غریب اور مراعات سے محروم طبقوں کا ذکر چھیڑتا۔ رکشا چلانے والوں اور کسانوں اور مزدوروں جیسے عام آدمیوں کے بارے میں خلوص سے بات کرتا۔ ان کے دکھ درد کو محسوس کرتا۔ ان کی ضرورتوں کو سمجھتا۔ وہ ان کا قائد تھا۔ اس نے انہیں پسینہ بہاتے دیکھا تھا۔ اس پسینے کی بو آج تک اس کے نتھنوں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اجلاف کا، رذالوں کا، نیچ لوگوں کا رہنما تھا۔ اس جیسے آدمی کو میرے والدین اور ان کے امیرانہ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ نفرت کا پرچار کرنے والے جھوٹی امیدوں کا بازار لگا کر امیروں اور غریبوں کے درمیان حائل خلیج کو عریض تر کر رہے تھے۔ انہوں نے روزافزوں توقعات کے جن

کو بوتل سے باہر نکال دیا تھا۔ اعلیٰ سماج والے ان کی صورت دیکھنے کے روادار بھی نہ تھے۔

میرے لیے یہ باتیں خون گرمانے والی تھیں۔ مصطفےٰ ان خیالات کو زبان عطا کر رہا تھا جو بچپن سے میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ میں کبھی ان کو کوئی واضح شکل نہ دے پائی تھی۔ میں ایسی باغی تھی جسے ناانصافیوں کے خلاف، کمزوروں پر ظلم و ستم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے کسی کاز کی تلاش تھی۔ مصطفےٰ میرے لیے اس کاز کے تمام پہلوؤں کا تعین کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میری دلچسپی اس سے چھپی نہ رہی ہو گی۔ وہ گفتگو کا رخ سیاست کی طرف پھیرنے کا اہتمام کرنے لگا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ میں کانٹا نگلنے ہی والی ہوں۔

میں نے اسے سراپا شرافت پایا۔ عورتیں اس کی نظر میں قابل تعظیم ہستیاں تھیں۔ وہ ہماری ٹولی میں تمام خواتین کے ساتھ احترام اور خوش خلقی سے پیش آتا۔ میں نے دیکھا کہ جب بھی کوئی خاتون کمرے میں قدم رکھتی وہ اٹھ کھڑا ہوتا اور کرسی کھینچ کر اسے بیٹھنے کی دعوت دیتا۔ وہ خلیق اور تمیزدار تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ یہ خوبیاں اس میں فطرتاً موجود ہیں۔ اس میں سطحی پن کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ مشہور تھا کہ وہ اکھڑ اور اوچھا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ آتش خو ہے اور رحم کھانا نہیں جانتا۔ مجھے تو اس کی روح میں رتی بھر سنگینی نظر نہ آئی۔ وہ مجھے اچھی تربیت کی اعلیٰ مثال معلوم ہوا۔ اس کے بارے میں مجھے تجسس رہنے لگا۔ وہ میرا موضوع خیال بن گیا۔ سیاست کے بارے میں مصطفےٰ کے جوشیلے رویے نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میری ازدواجی زندگی میں جو خالی پن تھا وہ مجھ پر اب بوجھ نہ رہا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اپنے لہو کو رگ و پے میں کسی ایسے مقصد کی خاطر دوڑتے محسوس کیا جو محض چاہے جانے کی خواہش سے بہت آگے کا معاملہ تھا۔

جب ازدواجی زندگی میں بدمزگی راہ پاتی ہے تو بڑی ہلچل مچتی ہے لیکن انیس کو اور مجھے اس کا کوئی تجربہ نہ ہوا۔ ہم پر معمولیت طاری رہی۔ لڑنے جھگڑنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئی۔ بے وفائی کے جھکڑوں نے آ کر ہمارے بیزار کن سکون کو کبھی تہ و بالا نہ کیا۔ انیس کو اس تبدیلی کی سرے سے کوئی خبر نہ تھی جو میری زندگی میں در آئی تھی۔ کوئی زیادہ حساس مرد ہوتا تو ان چھوٹے چھوٹے اشاروں کو دیکھے بغیر نہ رہ سکتا جن کے ذریعے زناکاری پر آمادہ عورت بڑی ڈھٹائی سے اپنا عندیہ ظاہر کرتی رہتی ہے۔ انیس ہمارے باہمی تعلقات کی ادھوری کیفیت سے آگاہ نہ تھا۔ اس نے شک کو کبھی اپنے ذہن میں گھات لگانے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس مکمل طمانیت اور آسودہ خاطری سے میں چڑ سی گئی۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں کہتی کہ، الہی، کاش اس کی آنکھیں کھل جائیں۔ کاش کہ وہ رعب ڈال کر مجھے، جو تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی، دوسری طرف جا گرنے سے روک لے۔ جو قعر مہیب میرے سامنے تھا وہ مجھے پھسلا کر اپنی طرف بلا رہا تھا۔ کبھا کر اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ میں اس میں جا گروں گی۔

جب انیس اور میں پہلی بار مصطفےٰ اور اس کی بیگم، شیری سے ملنے گئے تو ہمیں ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کی منصوبہ بندی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ وہ دونوں مری جانے والے تھے۔ جس طرح سامان پیک ہو رہا تھا اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ شاید کسی "سفاری" کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ شیری ایک جہازی پیٹی پر جھکی ہوئی اسے مصطفےٰ کے کپڑوں اور جوتوں سے بھرے چلی جا رہی تھی۔ یہ اسی قسم کی پیٹی تھی جس میں موسم گرما کی ابتدا ہوتے ہی لحاف رضائیاں سنگوا دی جاتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کپڑوں اور جوتوں کی شاید ہی کوئی قسم ہو جو موجود نہ ہو۔ ابھی ململ کا کرتا رکھا گیا تو اس کے فوراً بعد ایک نہایت جگادری کوٹ کی باری آئی جو جنگ عظیم کے دوران میں انتہائی شاندار لگتا۔ اس کے علاوہ ٹی شرٹیں، بشرٹیں، کلف لگی ہوئی قمیضیں، دھاری دار قمیضیں، چار خانوں والی قمیضیں اور جوتے جن میں ویلنگٹن شوز سے لے کر مگرمچھ کی کھال کے بنے ہوئے جوتوں تک ہر قسم کا نمونہ موجود تھا۔ جتنی بھی قسموں کی پتلونوں اور قمیضوں کا تصور کیا جا سکتا ہے ان سب کا پیٹی میں قرینے سے انبار لگا ہوا تھا۔ کیا پیٹی تھی کہ اس کا پیٹ بھرنے میں نہ آ رہا تھا۔ مجھے بڑا تجسس ہوا۔ "کیا آپ لوگ بہت دنوں کے لیے جا رہے ہیں؟" میں نے شیری کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا جس پر طاری کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ کام میں پوری طرح منہمک ہے۔ وہ اپنی فہرست میں چیزوں پر صاد کا نشان لگانے میں مشغول تھی۔ "نہیں" اس نے نظر اٹھا کر دیکھے بغیر جواب دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرے سوال کی وجہ سے اس کا حساب گڑبڑ ہو گیا ہے۔ اس نے آنکھیں سکیڑیں اور تمام توجہ سختی سے کام پر مرکوز کر دی۔ اپنی مساعی سے مطمئن ہو کر اس نے ایک بڑا سا لکڑی کا صندوق طلب کیا۔

اس صندوق میں دوائیاں بھری ہوئی تھیں۔ فارماٹون، ملٹی وٹامن گولیاں، کھانسی کے شربت، کوڈلیور کیپسول، لسٹرن، تھروٹ پینٹ، ایوڈین، جگر کے لیے لٹروسین، الکاسیلزر، بلڈ پریشر کی گولیاں، بھانت بھانت کی سپرنیں، پٹیاں، بینڈایڈ، قینچیاں، آنکھوں میں ڈالنے کی دوائیاں، ناک میں ڈالنے کی دوائیاں، تھرمامیٹر اور کسی بھی قسم بلکہ ہر قسم کی ہنگامی حالت سے نمٹنے کے لیے تریاق اثر ادویات اس میں جمع تھیں۔ یہ نہایت بڑھیا قسم کا محافظ جان کٹ تھا۔ ایک بار پھر میں نے شیری سے سوال کیا۔ اس

بار حواس باختہ ہو کر۔ "کیا مصطفےٰ اس قدر بیمار ہیں؟" اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اپنے شوہر کی صحت کے بارے میں میری فکرمندی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے یہ پُراسرار جملہ کہا۔ "نہیں۔ لیکن یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کس وقت وہ کیا مانگ بیٹھیں۔"

اس وقت تو یہ جملہ میرے بالکل ہی پلے نہ پڑا۔ مصطفےٰ سے بہتر طور پر واقف ہونے کے بعد میں اس جملے کے اسرار و رموز سمجھنے کے قابل ہو سکی۔ پرانے وقتوں کے سکاؤٹوں کی طرح ہم نے اس مقولے کو اپنا لیا تھا: "تیار رہو۔" ہمیں معلوم تھا کہ ناقص منصوبہ بندی کے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

میرا ذہن ایک پکچر گیلری تھا۔ مصطفےٰ کی زندگی کے مختلف ادوار کی آہستہ آہستہ نمائش جاری تھی۔ میں نے اس کی زندگی سے اکا دکا واقعات اور سانحات چن کر مسٹر کھر نامی سیاست دان، دوست، عاشق اور شوہر کے معاشقوں اور زندگیوں کا تجزیہ شروع کیا۔ میری توجہ اس کی شادیوں پر مرکوز ہو گئی۔ میں اضطرار کے عالم میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ میں جو قدم اٹھانے والی ہوں اسکے نتیجے میں آگے چل کر میرے ساتھ کیا پیش آ سکتا ہے۔

مصطفےٰ نے اپنے والد کے اصرار پر اپنی رشتے زاد وزیرہ سے شادی کی۔ یہ جاگیردارانہ رسموں اور روایتوں کے عین مطابق تھا۔ بیوی کی عمر مصطفےٰ سے کہیں زیادہ تھی۔ مصطفےٰ اُس وقت بمشکل سترہ برس کا تھا۔ زناشوئی کا رشتہ قائم ہو گیا اور وزیرہ کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ مصطفےٰ کا دم گھٹنے لگا۔ وہ گاؤں سے بھاگ گیا۔ اصل میں وہ ازدواج سے بچنے کے لیے فرار ہوا تھا۔ بیوی کو چھوڑ کر بھاگ جانے پر اس کے والد نے طیش میں آ کر اسے خوب برا بھلا کہا اور عاق کر دینے کی دھمکی دی۔ مصطفےٰ ان پڑھ بیوی کے پاس لوٹنے کو تیار نہ تھا۔ اس میں وزیرہ کا کوئی قصور نہ تھا۔ انہیں ایک بے لوچ نظام نے بیاہے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ خود مصطفےٰ بھی کوئی خاص پڑھا لکھا یا باخبر نہیں تھا۔ اس نے جو زندگی گزاری تھی اس میں دوسروں سے ملنے ملانے کے مواقع بہت کم تھے۔ وہ ابھی ایک جگہ ٹک کر گھر بار کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے جوانی کے مزوں کا نیا نیا پتہ چلا تھا اور وہ انہیں لوٹنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ وہ بھاگ کر پہلے ملتان آیا اور شہر کو چھان مارا۔ اس کے بعد اس نے لاہور کا رخ کیا۔ لاہور دیکھ کر گوٹ ادو سے آنے والے دیہاتی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جب وہ دیکھتا کہ عورتیں، فیشنی انداز میں بال سجائے، کاروں میں سٹیرنگ وہیل سنبھالے بھنت ڈٹی ہوئی ہیں تو بس ہونقوں کی طرح تکتا ہی رہ جاتا۔ ابھی اس میں اتنی مجلسی شائستگی نہیں آئی تھی کہ ان سے بات چیت کر کے اپنے طور پر یہ جان سکتا کہ عورتیں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

محض شوق پورا کرنے کی چیزیں نہیں۔ نہ ان کی حیثیت ایسے دم چھلوں کی ہے جن سے بس ایک خاص کام لینا منظور ہو۔ وہ ابھی صرف دور دور سے ان کے بارے میں ہوس ناک باتیں سوچ سکتا تھا یا یہ امید کر سکتا تھا کہ ایک روز وہ بھی ان برقاب دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں ہوگا۔

مصطفٰے کا مری سے گزر ہوا جو ہل سٹیشن بھی ہے اور سیاحوں کی تفریح گاہ بھی۔ وہاں پہنچ کر اسے نہ صرف میدانی علاقوں سے بلکہ یکسانیت کی شکار زندگی سے دامن چھڑانے کا موقع ملا۔ اس کا ایسی عورتوں سے رابطہ قائم ہوا جو رقم کے عوض، اپنی دلفریبیوں کا سودا کرتی تھیں۔ نوجوان کھر نے ان کے پاس پہنچ کر چین کا سانس لیا۔ اس میل جول کا وہ پہلو جس کا تعلق بھاؤ تاؤ کرنے سے تھا مصطفٰے کو راحت آمیز معلوم ہوا۔ وہ منڈیوں کو چھان مارتا، مال کا جائزہ لیتا اور خدمات کرائے پر حاصل کرتا۔ کسی کو غیر مشروط طور پر خرید لینے سے ابھی وہ ڈرتا تھا۔ اسے اپنی آزادی عزیز تھی۔ عورتوں کو یہ نوجوان جاگیردار بڑا پیارا لگتا جو اپنی نامراد شادی کی دکھ بھری کہانی سنانے پر تلا رہتا تھا۔

بیوی غریب چپ چاپ دکھ سہتی رہی۔ جب خاندان کے بڑوں نے اسے مصطفٰے سے طلاق دلوا کر کہیں زیادہ نوجوان دیور سے بیاہ دیا تو اس کی رسوائی دوچند ہو گئی۔ وہ مطلقہ کی حیثیت سے میکے واپس جانے کی اہانت سے بچ گئی۔ جسے جاگیردارانہ نظام میں موت سے بھی بدتر حشر سمجھا جاتا ہے۔

سیلانی بیٹا گھر سے دُور دُور ہی رہا۔ اسے اپنے کیے پر شرمندگی تو تھی لیکن سمجھتا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ اپنی زندگی کے عظیم ترین مفاد میں کیا ہے۔ جب وہ سماجی سیڑھی پر مستقل مزاجی سے قدم بہ قدم اوپر چڑھتا جائے گا تو گلے پڑی بیوی بوجھ ہی ثابت ہو گی۔

مری میں مصطفٰے کو فردو مل گئی جو اس کے ایک نئے نئے بنے دوست شفیع کی داشتہ تھی۔ فردوس حاملہ تھی۔ شفیع رفوچکر ہو چکا تھا۔ فردوس سے شادی کرنے کی پکی قسم کھانے کے بعد اب وہ اپنے قول قرار سے منکر ہو گیا تھا۔ صدمے کی وجہ سے لڑکی کی بری حالت تھی۔ اسے کسی کے کندھے کی ضرورت تھی جس پر وہ سر رکھ کر رو سکے۔ مصطفٰے نے اپنا کندھا پیش کیا۔ وہ فردوس اور اس کی ماں کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ غلط فہمی کی بنا پر ہمدردی کو محبت سمجھ لیا گیا۔ مصطفٰے نے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ اس طرح کی حرکت تھی جو آدمی جوش میں آ کر کر بیٹھتا ہے۔ لڑکی حاملہ تھی۔ اسے بے یارومددگار چھوڑ دیا گیا تھا۔ شکل کی اچھی تھی اور تھوڑی سی پڑھی لکھی بھی تھی۔ وہ

نسبتاً زیادہ مہذب تھی۔ مصطفٰے کے لیے معیاروں کا تعین ابھی دیہات کی انہیں عورتوں کے حوالے سے ہوتا تھا جن سے پیچھا چھڑا کر وہ بھاگ آیا تھا۔ مصطفٰے کو اس بنا پر کچھ پریشانی نہ تھی کہ فردوس شفیع کی داشتہ رہ چکی تھی۔ اسے یہ پروا بھی نہ تھی کہ فردوس کی ماں چھوٹا موٹا سا چکلا چلا رہی ہے۔ اس کی نظر میں فردوس ایسی عورت تھی جس کی آبرو تو لُٹ چکی تھی مگر جو تھی دل کی کھری۔ وہ معاشرے کی ستائی ہوئی تھی۔ فردوس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ مصطفٰے نے اس کا نام اپنے نام پر رکھا۔ فردوس جلد ہی دوبارہ حاملہ ہو گئی۔ بِلّو نے جنم لیا۔ مصطفٰے ان سب باتوں سے سٹپٹا سا گیا۔ کسی نہ کسی وجہ سے اسے زچگیوں سے چڑ تھی جیسے بچے جننے والی عورت اس کے ساتھ کوئی دشمنی نکال رہی ہو۔ ان مواقع پر اس کی سرشت کا بدترین پہلو سامنے آ جاتا تھا۔ جونہی کوئی عورت اس کے نطفے کو پیٹ میں پالنا شروع کرتی وہ اس سے متنفر ہو جاتا۔ ابھی فردوس ہسپتال میں زچگی کے بعد سنبھالا لے رہی تھی کہ مصطفٰے نے اسے طلاق کے کاغذات بھجوا دیے۔ اس نے ایک بار پھر غلط وجہ سے شادی کی تھی۔ رحم اور ترس پروان چڑھ کر محبت کا روپ نہ دھار سکے۔

گاؤں اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ مصطفٰے واپس چلا گیا اور بزرگوں نے اسے معاف کر دیا۔ اس نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور انتخابات میں طاقتور گرمانی خاندان کے ایک نوجوان چشم و چراغ کو ہرا دیا۔ اب وہ قومی اسمبلی کا رکن تھا۔ عورتیں آتی جاتی رہیں۔ اسے ابھی تک ایسی عورت کی تلاش تھی جو اس کی نظر میں مثالی ہو۔ اس کی ابھی یہ حیثیت نہ ہوئی تھی کہ کسی کو اپنے آپ چن سکتا۔ وہ ٹھکرائے جانے سے ڈرتا تھا او. ہمیشہ کسی ایسی عورت پر اکتفا کر لیتا جسے اور جو چاہے سمجھا جائے بہترین انتخاب ہرگز نہ کہا جا سکتا۔ نچلے طبقے تک رسائی آسان تھی۔ اپنے آدرش تک پہنچنے کے لیے وہ اپنے اعتماد میں بتدریج اضافہ کر رہا تھا۔ میں اس کی غلطیوں کو سمجھ اور پہلی دو شادیوں کو معاف کر سکتی تھی۔

اس کی نئی محبوبہ لاہور کے ایک کالج کی طالبہ تھی۔ بہت سال بعد مصطفٰے نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ اسے محبت ہوئی تھی تو بس اسی لڑکی سے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کی محبت کی تکمیل نہ ہو سکی۔ مجھے اس وقت تک پتہ چل چکا تھا کہ مصطفٰے اپنی عورتوں سے اکتا جاتا ہے۔ انہیں ہر وقت ہوا میں تنے ہوئے رسے پر چلنا پڑتا تھا۔ وہ لڑکی بہت سیدھی سادی تھی۔ اس نے مصطفٰے کے دکھ درد کو جان لیا اور وہ سہارا فراہم کر دیا جس کے لیے وہ بلک رہا تھا۔ علاوہ ازیں وہ اس سے والہانہ محبت بھی کرتی تھی۔ انھوں نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ملتان جاتے ہوئے اثنائے راہ میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پکڑے گئے۔

جاگیردارانہ روایت ان پریمیوں کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ وہ کسی اور کی منگیتر تھی۔ اپنے رشتے زاد کی۔ لڑکی کا باپ غصے کے مارے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے مصطفٰے کو سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ قومی اسمبلی کا نوجوان رکن اپنی پہلی سچی محبوبہ سے دست بردار ہو گیا اور کسی آج کے زمانے کے رانجھے کی طرح اپنے آنسو پی لیے۔ لڑکی اپنے قول قرار پر قائم رہی۔ اس نے اصرار کیا کہ پہلے مصطفٰے شادی کرے۔ ہتھیلیوں کو مہندی لگا کر اپنی قسمت کی لکیر وہ صرف تبھی مٹائے گی جب مصطفٰے کی شادی ہو چکے گی۔ وہ بحران کے دن تھے۔ لڑکی کے باپ نے مصطفٰے کی منت کی کہ شادی کر لے۔ اس نے اپنی پگ اتار کر نوجوان جاگیردار کے قدموں میں رکھ دی۔ جاگیردارانہ نظام میں پگ عزت آبرو کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ مصطفٰے کو جھکنا ہی پڑا اور اس نے بڑے میاں سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی التجا برلائے گا۔ ایک بار پھر مصطفٰے دردمند انسان کے روپ میں سامنے آیا۔ وہ بے رحمی کہاں گئی جس کی داستانیں مشہور تھیں؟ میں نے محسوس کیا کہ میری نظر میں مصطفٰے کی توقیر بڑھ گئی ہے۔ یہ شخص تو اصل میں ایسا ولی صفت انسان تھا جسے غلط سمجھا گیا تھا۔

قومی اسمبلی کے رکن کے طور پر مصطفٰے سفر میں رہتا۔ طیاروں کے ذریعے کبھی یہاں کبھی وہاں۔ جلد ہی اس کی صفیہ نامی ایک ایرہوسٹس سے ملاقات ہو گئی۔ مصطفٰے قومی اسمبلی کے سیشن میں شرکت کرنے ڈھاکے جا رہا تھا۔ طیارے پر کھانا پیش کیا جانے لگا۔ مصطفٰے نے دیکھا کہ دو پیارے پیارے ہاتھ بڑے چمچے سے اس کی پلیٹ میں کری ڈال رہے ہیں۔ نظر اٹھائی تو سبز رنگ میں ملبوس ایک صورت دکھائی دی جس پر چھلاوے کا گمان ہوا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مصطفٰے سماجی سیڑھی پر اوپر کی طرف گامزن تھا۔ تیس ہزار فٹ خاصی بلند ہوتی ہے۔ طیارے سے اترتے وقت وہ ترنگ میں آ کر مڑا اور صفیہ سے دریافت کیا کہ کیا دوبارہ ملاقات ہو سکتی ہے۔ صفیہ نے لجا کر اثبات میں سر ہلایا۔

ڈھاکے میں اگلے دو دن صفیہ کے ساتھ گزرے۔ مصطفٰے کو پتہ چلا کہ اس کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور وہ اپنے خاندان کو سہارا دینے کے لیے ملازمت کر رہی ہے۔ جاگیردارانہ پس منظر سے تعلق رکھنے والے مردوں کو ایسی عورتوں سے ملنے ملانے کا موقع شاذ ہی ملتا ہے جو آزادانہ زندگی گزار رہی ہوں۔ وہ تو ایک ایسی دنیا میں سانس لیتے ہیں جہاں مردوں کو سراسر بالادستی حاصل ہے۔ عورتوں سے پارٹیوں یا پکنکوں پر یا کلبوں میں ملاقات کرنے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ ایرہوسٹسیں انہیں پراسرار معلوم ہوتی

ہیں جیسے وہ انتہائی رومانی رنگ میں ڈوبی ہوئی سحرطراز پُتلیاں ہوں۔ اس پس منظر سے تعلق رکھنے والے مردوں کے لیے ایسی عورتوں کے عشق میں مبتلا ہونا اور ان سے شادی کر لینا بہت عام سی بات ہے۔ شادی کے بعد ان سے ملازمت چھڑوا دی جاتی ہے اور وہ کلی طور پر اپنے خاوندوں کی خدمت گزاری کے لیے وقف ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایرہوسٹسیں ان کے لیے سرخاب کا پر ثابت ہوتیں۔ دوسرے جاگیرداروں کو رشک آتا کہ خوب ہاتھ مارا ہے۔ ایرہوسٹیسوں کو کسی نہ کسی لحاظ سے ان معمولی اور سادہ گھر والیوں سے بالاتر سمجھا جاتا جو انہیں اپنے دیہات میں میسر تھیں۔ ان شادیوں میں مہم جوئی کا سا مزہ تھا۔ جب صفیہ اور مصطفٰے کراچی لوٹے تو انہوں نے شادی کر لی۔ شادی کی اطلاع اس نے سب سے پہلے اپنی کالج والی محبوبہ کو دی۔ اطلاع دینے کا مطلب یہ تھا کہ اب تم بھی شادی کرنے کے لیے آزاد ہو۔ صفیہ سے شادی کی بدولت کسی اور کو بھی ہنسی خوشی زندگی گزارنے کا پروانہ مل رہا تھا۔ شادی کرنے کی یہ وجہ بھی غلط تھی، میں نے سوچا۔ ایک اور غلطی۔

شادی ہونے کی دیر تھی کہ مصطفٰے پھر ویسا ہی ہو گیا جیسا کہ جاگیردار بالعموم ہوا کرتے ہیں۔ اس نے صفیہ کی ان تمام خوبیوں کو جن پر وہ مرمٹا تھا، کچل ڈالا۔ اسے برقع پہنا کر کوٹ ادو چلتا کر دیا گیا۔ جو بیچاری گنوارن نہ تھی اس سے توقع کی گئی کہ وہ گنوارنوں کے اطوار اپنا لے گی۔ کتابوں پر پابندی لگ گئی اور گوشہ نشینی کو معمول کی حیثیت حاصل ہوئی تاکہ شہر کے برے طور طریقوں کی ہوا تک نہ لگے۔ صفیہ نے کوٹ ادو میں سات برس گزارے۔ ان سات برسوں کو طاقِ نسیاں کی طرف ایک طویل اور اکتا دینے والی پرواز کہیے۔

اس کا شوہر اب نہایت سنجیدہ قسم کی سیاست میں مصروف تھا۔ ایوب خاں کی حکومت کا تختہ الٹنے کی جدوجہد میں وہ بھٹو صاحب کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس لڑکی کو یاد کرنے کا وقت اسے مشکل ہی سے ملتا تھا جسے اس نے آسمان سے جھپٹ کر مظفرگڑھ کے کوردہ کی نذر کر دیا تھا۔ انتہا یہ کہ اس کا نوزائیدہ بیٹا، بلال، بھی اسے بس کچھ دیر کے لیے اپنی طرف راغب کر سکا۔ صفیہ کے بطن سے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی جو کوٹ ادو میں طبی سہولتوں کے فقدان کے باعث اسہال کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئی۔

سیاست اب زوروں پر تھی۔ تیز فہم تجزیہ نگار بھانپ گئے کہ پی پی پی اقتدار سنبھالنے کے لیے پر تول رہی ہے۔ مصطفٰے بھٹو صاحب کا معتبر دست راست بن کر سامنے آیا۔ اب لوگ ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے۔ لوگوں نے یہ سوچ کر اس سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیے کہ اس میل جول سے آگے چل کر فائدہ اٹھائیں گے، مال بنائیں گے۔ مصطفٰے ڈنر پارٹیوں کے کے پیچ میں الجھ کر رہ گیا۔ کل کے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سوشلسٹ کو اب سوشل حلقوں میں قبول کیا جانے لگا۔ چکنے چپڑے بڑی ٹیم ٹام والے بھڑوے ادھر ادھر سے نمودار ہو گئے۔ ڈنر پارٹیاں سوقیانہ محفلیں تھیں۔ عورتوں کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا تاکہ جس شخص کی مدد سے مستقبل میں کام نکلوانا مقصود تھا وہ ان میں سے کسی کو چن لے مشہور ہو گیا کہ مصطفےٰ کو مجرا سننے کا شوق ہے۔ پھر کیا تھا ایسی محفلوں کا بندوبست کرنے والوں میں آپس میں ٹھن گئی۔ سب ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہتے۔ ان میں سے ایک کا تکا لگ گیا۔ اس نے مجرے پر نوبہار کو بلالیا۔

نوبہار کے سامنے آنے تک وہ ایک عام سی محفل تھی۔ نوبہار نے مشہور صوفی شاعر، خواجہ غلام فرید کی سرائیکی کافی گائی۔ مصطفےٰ چونک اٹھا۔ لڑکی کیا تھی سراپا ترغیبِ گناہ تھی۔ وہ آنکھوں، پلکوں، بھنوؤں، ہونٹوں بلکہ انگ انگ سے ڈورے ڈال رہی تھی۔ نوبہار کے ٹھیٹ طوائف ہونے میں کوئی شک نہ تھا۔ وہ ہیرامنڈی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا پیشہ ہی دل چرانا تھا۔ مصطفےٰ اس کی ہر ہر ادا پر مر مٹا۔ وہ جال میں پھنس چکا تھا۔ اس کے دوستوں نے اہتمام کیا کہ وہ نوبہار کو کبھی بھولنے نہ پائے۔ جو معاملہ رات گئی بات گئی سے آگے نہ بڑھتا وہ سرمستی بھرے رت جگوں میں تبدیل ہو گیا۔ ہر رات کوئی نہ کوئی واقف کار محفل کا اہتمام کرتا۔ نوبہار وہاں موجود ہوتی۔

نوبہار کا بھی دل آ گیا۔ پیشہ ور ناچنے گانے والی لڑکیاں عمر بھر کسی ایسے مرد کا خواب دیکھتی رہتی ہیں جو انہیں جسم فروشی کی ہولناکی سے نجات دلا دے۔ مصطفےٰ کی ذات میں اسے ایسا ہی مرد نظر آیا۔ مصطفےٰ میں عشق کی حرارت تھی۔ لیکن زیادہ اہم بات یہ کہ اس میں معاشرے سے ٹکر لینے کا حوصلہ بھی تھا۔ کوئی دلیر آدمی ہی طوائف سے شادی کر سکتا ہے۔ مصطفےٰ نے کہا کہ ناچنا گانا چھوڑ دو۔ نوبہار نے حامی بھر لی۔ مصطفےٰ نے گلبرگ میں ایک کوٹھی کرائے پر لی۔ نوبہار کو وہاں ٹھہرا دیا گیا۔ اب وہ بلاشرکت غیرے اس کی جاگیر تھی۔ اس کی داشتہ۔ انہوں نے چوری چھپے نکاح پڑھا لیا۔ لیکن نوبہار نے اس راز کو راز نہ رہنے دیا۔

جب پی پی پی کی حکومت نے کٹے پھٹے، گرتے ہوئے پاکستان میں اقتدار سنبھالا تو مصطفےٰ کھر پنجاب کا گورنر مقرر ہوا۔ وہ سرخ روئی کا دن تھا۔ سرخ بتی والے ایریا میں جشن برپا ہو گیا۔ مٹھائیاں بانٹی گئیں اور طوائفیں اپنے کوٹھوں سے اتر کر گلیوں میں ناچنے لگیں۔ ان کے جنوائی نے صوبے کا نظم و نسق سنبھالا تھا۔

حلف برداری کی تقریب کے بعد نوبہار سرکاری لیموزین میں اپنے جدی چشتی محلے گئی۔ لوگوں کے ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ جس بڑے سے بڑے شکار کا تصور کیا جا سکتا

تھا وہ لکھ لٹ بیٹی نے پھانس لیا تھا۔ نوبہار پر ان تمام چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو رشک آ رہا تھا جو ابھی اپنی جھانجھریں جھنکانا سیکھ رہی تھیں۔ یہ سارا بات بھٹو صاحب کے علم میں آ گئی۔ انہوں نے مصطفےٰ کو دارالحکومت طلب کر لیا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ نہ سمجھے کہ کھلے بندوں اس طرح کا رویہ اپنا کر وہ مکافات سے بچ سکتا ہے۔ پنجاب کا گورنر کسی عام ناچنے والی کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ نوبہار کو چلتا کرنا پڑے گا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مولویوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ مصطفےٰ سے کہا گیا کہ اسے گورنری یا نوبہار میں سے کسی ایک کو چننا پڑے گا۔ حقیقت میں مصطفےٰ کے پاس چناؤ کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

نوبہار کی طلبی ہوئی۔ مصطفےٰ گورنر کے خاص کمرے میں ڈیسک کے اوپر ٹانگ پر ٹانگ رکھے اپنی نشست پر براجمان تھا۔ نوبہار آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ مصطفےٰ نے ٹانگوں کے درمیان بن جانے والی V میں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے نوبہار پر واضح کر دیا کہ شادی کا قصہ ختم ہو چکا ہے۔

خاتون پر جیسے بجلی گر گئی۔ وہ پنجاب کے سب سے زیادہ طاقتور مرد پر چیخی چلائی، دہاڑی۔ وہ بت بنا رہا۔ پھر نوبہار جھنجھلا اٹھی اور ہوتے ہوتے بالآخر اس پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے منت سماجت کی، ہاتھ جوڑے، گڑگڑا کر کہا کہ مصطفےٰ اپنے فیصلے پر نظرثانی کرے۔ مصطفےٰ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ ذرا بوجھ تھی۔ اسے جانا ہی پڑے گا۔ نوبہار کے آنسو تھم گئے۔ اب وہ ایسی عورت تھی جسے نہایت حقارت سے ٹھکرایا جا چکا تھا۔ اس نے مصطفےٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کوسا۔ یہ ٹوٹے ہوئے دل کی پکار تھی: "مصطفےٰ کھر، جتنا دکھ تم نے مجھے پہنچایا ہے کاش اتنا ہی دکھ تمہیں بھی پہنچے۔ کاش تمہیں بھی پتہ چلے کہ حقارت سے ٹھکرا دیے جانے پر دل پر کیا گزرتی ہے۔ میں خدا سے دعا مانگتی ہوں کہ اس ملک کی گلی گلی میں تمہاری اولاد رُلتی پھرے۔ تم جس پتھر کو اٹھاؤ اس کے نیچے سے تمہارا بچہ نکل آئے۔ تمہیں کبھی چین نصیب نہ ہو گا۔ جس طرح تم نے مجھے برباد کیا ہے اسی طرح تمہیں بھی کوئی عورت برباد کر کے چھوڑے گی۔"

یہ ایک چھوٹا سا رومانی واقعہ تھا اور بس۔ جب امورِ مملکت اس کی توجہ کے طالب ہوتے تو ظاہر ہے وہ انہیں کو اولیت دیتا۔

اب صفیہ گورنر ہاؤس میں اٹھ آئی۔ اس شادی کی بھی بس راکھ ہی باقی رہ گئی تھی۔ سلگتے انگاروں کو وقت نے کبھی کا بجھا ڈالا تھا۔

مصطفےٰ کے بھائی گورنر ہاؤس اس سے ملنے آئے۔ اسے بتایا گیا کہ صفیہ نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ "اب آپ گورنر ہیں۔ یہ آپ کی عزت کا معاملہ ہے۔ صفیہ نے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

آپ کے چھوٹے بھائی، غلام مرتضیٰ، سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے تھے۔ ہم اس بات کو آپ سے مزید نہیں چھپا سکتے۔"

مصطفیٰ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ زندگی میں یہ پہلی عورت تھی جس نے اس کی عزت میں بٹا لگانے کی جرأت کی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ اس نے صفیہ کی زندگی برباد کر دی تھی یا نوبہار سے شادی کر لی تھی یا پچھلے چھ ماہ کے دوران صرف چند گھنٹے کے لیے اس کے پاس گیا تھا یا اسے صفیہ سے محبت کبھی تھی ہی نہیں۔ جاگیردارانہ قانون کی رو سے مرد کو یہ سب کچھ کرنے کی آزادی ہے۔ عورت اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتی۔ یہ عظیم ترین گناہ ہے۔ اس سے مرد کی مردانگی کو زک پہنچتی ہے۔ اگر مرد کو پتہ نہ ہو کہ اس کی بیوی کسی اور کے ساتھ دادِ عیش دے رہی ہے تو لوگ اس کی طرف انگلیاں اٹھا کر دبی دبی آواز میں ہنستے اور سرگوشیاں کرتے ہیں۔ مصطفیٰ نے شکستہ دل ہو کر اپنے کمرے کی خلوت میں پناہ لی۔

اس نے صفیہ کو بے دردی سے مارا پیٹا۔ سننے میں آیا ہے کہ اس نے صفیہ اور دائی عائشہ دونوں کے اندام میں پسی ہوئی لال مرچیں بھی ٹھونسیں۔ دونوں کو ہسپتال لے جانا پڑا۔ ان کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مصطفیٰ نے دائی عائشہ کو تو تقریباً جان سے مار ڈالا جسے اس معاملے کا شروع سے علم تھا۔ اس نے اپنی صفائی میں سیدھی سی بات کہی: "میں آپ کو بتانے کی جرأت کیسے کرتی۔ میری وجہ سے خاندان میں فساد پڑ جاتا۔ آپ کا بھائی مجھے مار ڈالتا۔ وہ میری بوٹیاں ابال کر اونٹوں کو کھلا دیتا۔" اس ہولناک بیان کی حقیقت کی تاریخ شاہد ہے۔ قتل کیے جانے والوں کا گوشت اکثر اونٹوں کو کھلا دیا جاتا تھا۔ جاگیردار دنیا کے سامنے اپنا یہ ایمج پیش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے نر مرد ہیں۔ اس ایمج کو بڑی احتیاط سے بناتے سنوارتے رہتے ہیں۔ لیکن بیوی برجائی نکل آنے تو یہ ایمج ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے۔ مصطفیٰ پر تو پہاڑ گر پڑا۔ وہ اسلام آباد پرواز کر گیا تاکہ اپنے پیرومرشد، بھٹو صاحب، سے ملے۔ وہی اسے ڈھارس دے سکتے تھے۔

پاکستان کا صدر اور پنجاب کا گورنر، ملک کے دو سب سے طاقتور آدمی، دونوں رات گئے تک بیٹھے شراب پیتے رہے۔ جب نشے نے اپنا اثر دکھایا تو گفتگو میں فلسفیانہ رنگ در آیا۔ مصطفیٰ نے جی بھر کر خود پر ترس کھایا اور آنسو بہائے۔ اس نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ اس عظیم بے وفائی کے بعد اس کے لیے امورِ مملکت پر توجہ مرکوز کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اسے اپنے پر اعتماد نہیں رہا۔ بھٹو صاحب نے، جو اب خود بھی خوب چہک گئے تھے، مصطفیٰ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا: "میرا خیال ہے ہم دونوں کو مستعفی ہو جانا چاہیے۔ ہمیں یہ حکومت چھوڑ دینی چاہیے۔ اس میں اذیت اور بے وفائی

کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اگر تم نے استعفیٰ دیا تو میں بھی تمہاری پیروی کروں گا۔ میں اکیلا کام نہیں چلا سکتا۔ تمہارے دکھ کو میں نے اپنے دکھ کی طرح محسوس کیا ہے۔ لعنت بھیجو، چلو کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ان سب باتوں سے بہت دور۔"

جوں جوں رات گزری پاکستان پر راج کرنے والے ان دونوں آدمیوں کی رقیق القلبی بڑھتی گئی۔ اگلی صبح جب شراب کے نشے سے چھا جانے والی دھند تتر بتر ہوئی تو بھٹو صاحب نے پٹڑی بدل لی۔ مصطفیٰ سے کہنے لگے کہ احمق نہ بنو، جذباتی باتیں مت کرو۔ ہم زبردست تقدیر کے مالک ہیں۔ ہمیں چن لیا گیا ہے۔ پاکستان میں تبدیلیاں ہم لے کر آئیں گے۔ اگر ہم نے کمزوری کا مظاہرہ کیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہ کرے گی۔ اور یہ سب کچھ محض ایک عورت کی وجہ سے۔ صفیہ کی وجہ سے۔ پھر بھٹو صاحب نے شیطنت آمیز انداز میں مصطفیٰ کی طرف دیکھا اور مکمل سنجیدگی سے فرمایا: "میں نے کہا، تم صفیہ کو ٹھکانے کیوں نہیں لگا دیتے؟"

بھٹو صاحب ایسی باتیں کچھ زیادہ ہی کرتے تھے۔ رواروی میں کہی گئی اسی طرح کی ایک بات نے انہیں تختۂ دار تک پہنچا دیا۔ جن لوگوں کے سامنے اس طرح کی باتیں کی جاتیں وہ انہیں کبھی نہ بھولتے۔ جب پی پی پی سے منحرف ہو جانے والے ایک رکن، احمد رضا قصوری، کے والد گولی لگنے سے ہلاک ہوئے تو ایسے مخبر سامنے آتے دیر نہ لگی جنہوں نے قسم کھا کھا کر کہا انہوں نے بگوشِ خود بھٹو صاحب کو اپنے گرگوں سے کہتے سنا تھا کہ اس شخص کو مزہ چکھا دیا جائے۔

جب مصطفیٰ نے یہ سارا واقعہ مجھے سنایا تو میں خاصی پریشان ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ صفیہ کا کام تمام کر دیا۔ وہ چپ ہو گیا۔ پھر کہنے لگا: "نہیں۔ اسلام میں یہ ہے کہ اگر تم اپنی بیوی کو کسی مرد کے ساتھ دیکھو اور غصے سے اندھے ہو کر بیوی کو مار ڈالو تو یہ جرم نہیں۔ خدا تمہیں بخش دیتا ہے۔ جب تم سے جرم سرزد ہوا تو تم غصے کے مارے اپنے آپ سے باہر تھے۔ لیکن اگر قتل کا منصوبہ تیار کیا گیا ہو، اس پر پہلے سے خوب غور کر لیا گیا ہو تو وہ ناقابل معافی ہے۔ میں اس طرح کی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بجائے میں نے صفیہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کیا۔" اس نے اپنے بھائی کو بھی انگلینڈ جلاوطن کر دیا۔ گاؤں میں اس کے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اسے اپنے بھائیوں اور والدہ تک سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اسے برادری سے دھتکار کر نکال دیا گیا۔

بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ مصطفیٰ ایک بار اور شادی کرے۔ ان کا بڑا دل چاہتا تھا کہ گورنر ہاؤس میں مصطفیٰ کے ساتھ کوئی خاتون ہونی چاہیے جو میزبانی کے فرائض انجام

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

دے سکے۔ ان کی خواہش تھی کہ مصطفیٰ کوئی ایسی عورت تلاش کرے جو آنے والی معزز شخصیتوں کی خاطر مدارات کر سکے اور مثالی گورنس (کوئی بہتر لفظ نہیں ملتا تو یہی سہی) ثابت ہو۔ لازمی طور پر کوئی جدید وضع قطع کی آزاد خیال خاتون درکار تھی۔

بطور صدر بھٹو صاحب پہلی بار ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دورے پر روانہ ہونے والے تھے۔ دورے سے قبل ایسی عورت کی تلاش جاری تھی۔ اتفاقاً کہیں سے شہرزاد نظر میں آ گئی۔

وہ بھٹو صاحب کے وزیر تعلیم، حفیظ پیرزادہ کی بیوی، عدیہ پیرزادہ کی بھتیجی تھی۔ اس کا تعلق متوسط طبقے کے ایسے خاندان سے تھا جس پر معاشرے میں بلند سے بلند تر مقام حاصل کرنے کی دُھن سوار تھی۔ خاندان بہت زیادہ مغربیت زدہ تھا۔ شہرزاد کی بہت اچھی تربیت ہوئی تھی اور وہ نہایت خوبصورت تھی۔ انگریزی اچھی بولتی تھی اور اس کی پور پور سے اعتماد جھلکتا تھا۔

مصطفیٰ نے اس پر نظر ڈالی۔ پھر اس نے شہرزاد کو گورنر ہاؤس میں ڈنر پر مدعو کیا اور چند جام شراب پینے اور دل ہی دل میں معاملے کے سب پہلوؤں کا حساب لگا نے کے بعد محسوس کیا کہ شیری (شہرزاد) سے کام چل جائے گا۔ وہ مثالی ساتھی ثابت ہو گی۔ مصطفیٰ کی تیزرفتار جمع تفریق اور جوش میں آ کر اچانک کوئی فیصلہ کر بیٹھنے کی عادت، دونوں کا اس موقع پر جوڑ مل گیا۔ وہ امریکہ کے درپیش دورے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا ہی غضب کا منظر ہو گا جب وہ اس جیسی شائستہ اور دلربا خاتون کا ہاتھ تھامے وہائٹ ہاؤس میں قدم رکھے گا۔ اس نے ایک مثالی ہمراہی کے تصور کو بیوی کے تصور سے گڈمڈ کر کے شادی کی تجویز پیش کر دی۔

شیری نے کہا کہ مصطفیٰ کو اس سلسلے میں اس کے والد سے بات کرنی چاہیے۔ مصطفیٰ جواب میں انکار سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ "نہیں۔ اپنے والد کو تم قائل کرو۔ میں ان سے صرف اس وقت بات کروں گا جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ وہ ہاں کر دیں گے۔ میرے مطالبے کے جواب میں وہ نہیں کہیں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

شیری مسکرائی۔ اس نے مصطفیٰ سے شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ نو دن بعد ان کی شادی ہو گئی۔ مصطفیٰ کو میزبان خاتون مل گئی۔

بھٹو صاحب شادی کے حق میں نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میاں بیوی کے تہذیبی پس منظر میں جو بُعد ہے اس کی وجہ سے آگے چل کر شادی میں بدمزگی پیدا ہو گی۔ وہ جانتے تھے کہ شیری اپنے میاں کو سمجھ ہی نہ پائے گی۔ مصطفیٰ کسی قسم کے سماجیاتی استدلال پر کان دھرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ بھٹو صاحب کے پاس اتنا اختیار نہ تھا کہ وہ

اس بات میں دخل دے سکتے کہ مصطفیٰ کس سے شادی کرے، کس سے نہ کرے۔ مصطفیٰ اپنی بات پر اڑا رہا اور یہی سمجھا کہ جو کچھ وہ چاہتا تھا اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جب میں مصطفیٰ سے زیادہ قریب ہوئی تو مجھے پتہ چلا کہ مستحکم ازدواجی زندگی گزارنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ شادی کرنے کی جو وجوہ اس کے ذہن میں تھیں سب کی سب غلط تھیں۔ مصطفیٰ کا تعلق ایسے پس منظر سے تھا جس میں باقی دنیا سے ربط ضبط کے مواقع انتہائی محدود تھے۔ وہ زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہ تھا۔ اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع اسے بہت زیادہ عمر گزر جانے کے بعد ملا تھا۔ اس نے نک چڑھے پن کا جو رویہ اپنایا وہ بھی الٹا پلٹا تھا۔ اپنے سے کمتر لوگوں سے جھک کر ملتا اور امیر کبیر آدمیوں سے اکڑ کر۔ پرانے زردار ان نودولتیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے جو روپے پیسے کے بل بوتے پر ان چیزوں کی کمی پوری کرنے کے لیے مرے جا رہے تھے جو انہیں اچھی تربیت اور عالی نسبی سے محروم رہ جانے کی وجہ سے نصیب نہ ہو سکی تھیں۔ اس نے جتنی بار بھی کسی کو چنا غلط ہی چنا۔ اگر اسے صحیح وقت پر صحیح عورت مل جاتی تو وہ اچھا شوہر بنکر قاعدے قرینے سے گھر بسا لیتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں سے چلتے پھرتے شادیاں کرتا رہا تھا۔ اس کی شخصیت تمام وقت پختہ سے پختہ تر ہو رہی تھی اور اس کی عورتیں ابھی گھر میں بس کر قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہوتی تھیں کہ وہ اور زیادہ پختہ ہو کر انہیں بہت پیچھے چھوڑ جاتا۔ ان کے قدم جمانے کی یہ کوششیں ہی مصطفیٰ کے اضطراب کا سبب تھیں۔

میں نے شیری سے مصطفیٰ کے تعلق کو فعال تجسس کی خوردبین کی مدد سے دیکھا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس تعلق میں توازن بالکل نہیں۔ مصطفیٰ سرتاج بھی تھا، دماغ بھی تھا، ذہن بھی تھا۔ شیری اس سے مرعوب تھی۔ وہ شاید ہی کوئی ایسی بات کہتی جس پر مصطفیٰ کی سوچ کا ٹھپا لگا نہ ہوتا۔ اس میں مصطفیٰ کے نقطہ ہائے نظر سے اختلاف کرنے کی جرأت ہی نہ تھی۔ وہ ہمیشہ چاپلوسی میں لگی رہتی۔ ایسی باتیں کرتی جنہیں سن کر خوش ہو اور ہر وقت داد حاصل کرنے کی فکر میں مبتلا نظر آتی۔ وہ اس کی ہمجولی بن کر رہ گئی تھی یا جی حضور کہنے والی عورت اور یہ صورتحال مصطفیٰ کے حق میں ٹھیک نہ تھی۔ مصطفیٰ کی انا کی ہر وقت مٹھی چاپی کی جاتی۔ اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس عمل کا نتیجہ بہتر نکلے گا یا بدتر۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ بہت غیرصحت مندانہ بات ہے۔ اس طرح مصطفیٰ میں صرف اس وجہ سے اچھے برے میں تمیز کرنے کا وقوف پیدا نہ ہو گا کہ اس کی بیوی چیزوں کو معروضی انداز میں دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی۔

یہ بالکل واضح تھا کہ مصطفیٰ کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ ہمارے سامنے احساس کی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

شدت سے بھرپور، بہت ہی ذہین آدمی ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور تھا جو ڈانگ کا کام دے کر اپنے شوہر کی شخصیت کا رنگ چوکھا کرنے کی اہل نہ تھی۔ وہ مصطفےٰ کے حق میں بہت ہی نحس تھی۔ کوئی چیلنج پیش نہ کر سکتی تھی۔

شیری لوگوں کے سامنے جو امیج پیش کرتی تھی وہ اس کی نجی زندگی کے بالکل الٹ تھا۔ وہ بڑی طنطنے والی اور مغرور عورت نظر آتی تھی۔ افواہ ساز فیکٹریوں نے ایسی کتنی ہی کہانیاں گھڑ کر پھیلا دی تھیں کہ مصطفےٰ گھر پر اسے مارتا پیٹتا اور رسوا کرتا رہتا تھا اور اس کے باوجود وہ یہی تاثر دینا چاہتی تھی کہ مصطفےٰ اس سے پیار کرتا ہے اور وہ مصطفےٰ کی زندگی میں سب سے اہم ہستی ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ پنجاب کی خاتونِ اوّل کے رتبے پر اچانک سرفراز ہو جانے سے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ اس نے اپنی تمام پرانی سہیلیوں اور دوستوں سے تعلقات بگاڑ لیے تھے جن کے لیے اس کی شخصیت کا نیا روپ خاصا ناقابل برداشت تھا۔

ہم سب کو معلوم تھا کہ بطور بیوی شیری کو خوب مار پڑتی ہے۔ یہ کھلا راز تھا۔ گھر کے پُرتشدد مناظر کا وہ مجھ سے اکثر ذکر کرتی۔ مصطفےٰ پر تشدد پر اتر آنے کے دورے پڑنے کی جو وجوہ اس نے بیان کیں وہ میرے دل کو نہ لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے سامنے پوری حقیقت بیان نہیں کر رہی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جو وجوہ شیریں پیش کرتی ہے وہ کسی مرد کو تشدد کرنے پر کیسے اکسا سکتی ہیں۔

بھلا اتنی سی بات پر کوئی مرد اپنی بیوی کو مار مار کر نیلو نیل کیسے کر سکتا ہے کہ وہ ملازم سے یہ کہنا بھول گئی تھی کہ گیزر چالو کر دیا جائے؟ بھلا وہ بیوی کی مرف اس وجہ سے دھنائی کیسے کر سکتا ہے کہ اسے کپڑوں پر استری کرنی یاد نہ رہی تھی؟ یہ کچھ زیادہ ہی انوکھی سی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شیری حقیقت کو جان بوجھ کر چھپا رہی ہے۔ مصطفےٰ مجھے غیر معقول آدمی نہ لگتا تھا۔

ایک بار شیری ہمارے ساتھ تھی۔ ہم فرنیچر کی کسی دکان سے کار میں واپس آ رہے تھے۔ ہم نے طے کیا کہ کھانے پینے کی ایک جگہ رک کر کھانے کے لیے کچھ لے چلتے ہیں۔ شیری نروس ہو گئی۔ "ہم یہاں نہیں رک سکتے"۔ وہ بولی۔ "ہمیں کیوں نہیں رک سکتے؟" میں نے پوچھا۔ "اس لیے کہ میں نے مصطفےٰ کو نہیں بتایا تھا کہ ہم کھانے کے لیے کچھ لینے یہاں رکیں گے۔" "پھر کیا ہوا؟" "میں نہیں رک سکتی۔ میں نے ان سے اجازت نہیں لی۔ وہ بہت ناراض ہوں گے۔" "تو ان سے بس یہ کہہ دینا کہ ہم نے یہاں رکنے کا فیصلہ اچانک کر لیا تھا" "نہیں۔ وہ بہت خفا ہوں گے۔ وہ مجھے ماریں گے۔ اگر میں ان کی اجازت کے بغیر کوئی کام کروں، تو وہ میری ٹھکائی کرتے ہیں"۔ اس

گفتگو کے بعد ہمارے کہیں رکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مجھے متنبہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن میں اتنی آگے نکل گئی تھی کہ اس طرح کے انتباہوں پر دھیان نہ دے سکتی تھی۔

شیری نے مصطفےٰ کے بعض دوسرے پہلوؤں سے پردہ اٹھایا۔ اسے اپنے والدین سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اسے میکے جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ شیری کی ماں، مشترکہ دوستوں کی مدد سے، اپنی نواسی، امینہ، کے لیے چوری چوری ملبوسات بھجواتی رہتی۔ مصطفےٰ کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ لباس کہاں سے آتے ہیں۔ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ آیا شیری کی باتیں مبالغے پر مبنی ہیں یا وہ کوئی درشت حقیقت بیان کر رہی ہے۔

میں نے پوچھا کہ والدین سے ملنے پر پابندی کس لیے لگائی گئی ہے۔ "وہ کہتے ہیں کہ میرے گھر والے ان سے رشتے داری کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو یہ بتا کر کہ پنجاب کا گورنر ان کا داماد ہے اپنے کام نکلواتے رہتے ہیں"۔

مجھے معلوم ہے کہ پاکستان میں یہ ایک عام روش ہے۔ کسی کے اقتدار پر فائز ہونے کی دیر ہے، موقع پرست رشتے داروں کے جھول کے جھول پیدا ہو جاتے ہیں۔

شیری نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اسے گورنر ہاؤس میں لا بٹھایا گیا تھا۔ اب وہ قیدی تھی۔ مصطفےٰ نے اسے اندر دھکیل کر باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں رہی۔ جو مصطفےٰ کی مرضی وہی اس کی۔ وہ بالکل بے رنگ اور لایعنی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ مصطفےٰ کا مدھم سا عکس بن کر رہ گئی۔ مصطفےٰ کے محور سے دور ہٹتے ہی وہ ماند پڑ جاتی۔

اس تمام معاملے میں مصطفےٰ تعقل پسند اور ہمدرد آدمی کے روپ میں سامنے آیا۔ میں اس سے کہہ سکتی تھی کہ میرے خیال میں درست کیا تھا اور غلط کیا۔ وہ میری رائے سننے کے لیے خاصا آمادہ نظر آتا اور اکثر میرے نقطۂ نظر کے مطابق عمل کرتا۔ وہ کسی طرح کے کمپلیکس کا مارا ہوا نہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی بے قراری کے عالم میں کسی ایسی ساتھی کی تلاش میں تھا جو خواہ مخواہ اس کے ناز اٹھانے کی بجائے اسے چیلنج کر سکے۔

میں نے سوچا کہ ایسی شادی جس میں محبت کے بجائے خوف کا غلبہ ہو زیادہ دیر نہیں چل سکتی۔ مصطفےٰ بظاہر شیری کی ذرا عزت نہ کرتا جس کی حیثیت پاانداز سے زیادہ نہ رہی تھی۔ وہ اس کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کرتا۔ وہ بھی لوگوں کے سامنے۔ وہ دوستوں میں بیٹھ کر شیری کے ساتھ قطعاً بدتمیزی سے پیش آتا۔ ایک موضوع جسے وہ بار بار دہراتا یہ تھا کہ شیری کو چننے میں اس سے غلطی ہوئی ہے اور اب وہ کسی مثالی بیوی کی تلاش میں بازار کے چکر لگا رہا ہے۔ شیری اس توہین پر ذرا بھی جز بز نہ ہوتی۔ وہ اپنی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بے عزتی کو ہنسی میں ٹال دیتی۔ شاید اسے یہ امید تھی کہ یہ سب باتیں سنجیدگی سے نہیں کہی جا رہیں۔ تاہم دل کی گہرائیوں میں اسے بھی پتہ تھا کہ مصطفے کی نظر بھٹکنے لگی ہے اور مصطفے کو اپنے ساتھ نتھی رکھنے کے لیے جس دلربائی یا چترتر کی ضرورت ہے وہ اس کے پاس نہیں۔ شیری دل ہی دل میں اپنی نااہلی کی قائل ہو چکی تھی۔ اس صورت حال میں جھوٹ موٹ کچھ اور سوچنے کی تک تھی بھی نہیں۔

میرا ذہن اب تجزیوں کے سیلاب کی زد میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ مجھے اس آدمی کا بہت خیال رہنے لگا ہے جس کی نیت کو کبھی ٹھیک طرح سمجھا نہ گیا تھا، جو محبت کا جویا تھا اور اس تلاش کے دوران میں ہر قسم کی غلط عورتوں میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ شاید یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے زیادہ ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لینا شروع کیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفے ہی اس طرح کا مرد ہے جس کے ساتھ میں تعلق پیدا کرنا پسند کروں گی۔ مجھے یقین سا آ گیا تھا کہ میں ہی وہ ابھی تک ہاتھ نہ آنے والی عورت ہو سکتی ہوں جسے وہ ڈھونڈتا رہا تھا۔

نہ کچھ کہنے سننے کی نوبت آئی نہ چوری چوری آنکھیں چار کی گئیں۔ تاہم ہمارے درمیان ایک ان کہی سی موافقت موجود تھی۔ اس وجہ سے میں گڑبڑا سی گئی۔ کبھی کبھار میں بالکل بوکھلا جاتی۔ میں چاہتی تھی کہ اس بات کی کسی طرح تصدیق ہو جائے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف راغب ہیں۔ مصطفے بغور میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس مرتبہ وہ انتخاب کے صحیح ہونے کے بارے میں اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے اچانک جوش میں آ کر کچھ کر گزرنے کی عادت پر قابو پا لیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں نروس ہوں اور کچھ بدی پر مائل بھی۔ یہ خیالات کیا تھے؟ میرے سر میں کیوں گردش کر رہے تھے؟ کیا کسی اور کو ان کی خبر ہو گئی ہے؟ انیس کو؟ دوسری بیگمات کو؟

ہمارے ٹولے کی بیگمات، منہ کے آگے ناک سوجھے کیا خاک کے مصداق، بظاہر زیادہ دور تک نظر دوڑانے کی زحمت نہ کرتی تھیں۔ وہ ہر وقت ملبوسات، زیورات اور اندرونی آرائش و زیبائش کی باتیں کرتی رہتیں۔ کبھی کبھار وہ اپنی اولاد، ان کی پڑھائی کا ذکر اور اس عزم کا اظہار کرتیں کہ انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر بھجوائیں گی۔ چھوٹے چھوٹے پُرلطف قصے یہ بتانے کی غرض سے مسلسل دہرائے جاتے کہ ان کے بچوں کی دلچسپیاں کیا ہیں یا وہ کتنے ذہین ہیں یا پاکستان میں سکول کتنے ہولناک ہیں۔ دن اس ادھیڑ بن میں گزرتے کہ شام یا رات کو کیا لباس پہنا جائے۔ میں ان سے مختلف نہ تھی۔ اب میں مصطفے کی نظروں میں جچنے کے لیے لباس زیب تن کرتی۔ جب وہ میرے لباس پر توجہ نہ دیتا تو میں رنجیدہ ہو جاتی اور جب وہ نظر بھر کر میری طرف دیکھ لیتا تو

آپ ہی آپ اترانے لگتی۔ میں نے ان سب ملبوسات کو آزمانا شروع کر دیا جن پر، وارڈروب میں پڑے پڑے، گرد کی تہہ جم چکی تھی۔ جہیز میں مجھے فرانسیسی شفن کی ڈھیر ساری ساڑھیاں ملی تھیں۔ اب ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میں اچھی لگتی ہوں۔ میں یہ بھی بتا سکتی تھی کہ مصطفے کو میرے اندازے سے اتفاق ہے۔ میرے لیے تحسین اس کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔

پکنک پارٹیاں اور شکار ہمارے زندگیوں کا حصہ بن گئے۔ پورے کا پورا ٹولا، جیپوں اور کاروں میں لد کر، ایک ساتھ سیر و شکار کو نکلتا۔ خیمے لگائے جاتے، الاؤ روشن ہوتے۔ عورتیں بیٹھ کر راہ دیکھتیں کہ مرد کب شکار مار کر لائیں۔ بہت ہی مزے کا زمانہ تھا۔ کس قدر رومان پرور دن تھے۔

مصطفے کو کھانا پکانے کا بڑا چاؤ تھا۔ ہم دن رات تیتر اور جنگلی مرغابیاں کھاتے رہتے جو وہ مار کر لاتا۔ جنگل میں سوؤروں کا شکار بھی کھیلا جاتا۔ یہ خطرناک درندے جنگل میں اچانک سامنے آ جاتے اور جیپوں کو ٹکر مارنے دوڑتے۔ بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے ان سے کچھ بن نہ پڑتا اور وہ گولیوں سے بچنے کے لیے نہ تو پلٹ سکتے نہ دائیں بائیں مڑ پاتے۔ مارنے کے بعد انہیں وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ سؤر حرام جو ٹھہرے۔ انہیں کون کھاتا۔

میں نے محسوس کیا کہ مصطفے چاہتا ہے کہ میں بھی ان سرگرمیوں میں حصہ لوں۔ یہ بات اس کی نظر میں بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ ہمیشہ مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش کرتا رہتا۔ لیکن رعب جمانے کی کوشش کے لیے بڑا لطیف پیرایہ اختیار کیا جاتا۔ مجھے اپنی طرف راغب کرنے کا جو انداز اس نے اپنایا تھا اس میں کوئی بات کھلی ڈلی نہ تھی۔ میں اس شخص کی طرف اور مہم جوئی کی اس فضا کی طرف کھنچی چلی گئی۔ جب وہ شکار سے لوٹتا تو اس کے چہرے پر ایک خاص کیفیت ہوتی۔ کوئی کارنمایاں کرنے کا احساس۔ وہ مجھے ڈھونڈ نکالتا اور چاہتا کہ میں اسے سراہوں۔ شکار کے لباس میں شکار کے لوازمات سے لدا پھندا وہ بہت بھلا لگتا۔

ایک بار میں نے اسے اس حلیے میں دیکھا: سر پر ماؤ کیپ، ایک ہاتھ میں رائفل، خاکی پتلون کے پائنچے ویلنگٹن بوٹوں میں اڑسے ہوئے۔ وہ جھک کر پانی میں سے ایک جنگلی مرغابی اٹھا رہا تھا جو اس نے ابھی ماری تھی۔ دھوپ کی پہلی کرنوں نے اسے نیم رخ چھوا۔ اس نے نظر اٹھا کر عین میری طرف دیکھا۔ آخرکار میرا دل دھک سے رہ گیا۔

کھانا وہ کھلی جگہ میں جلتی ہوئی آگ پر پکاتا۔ اس کا خاص خیال رکھتا کہ کس قسم کا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گوشت پکنا چاہیے۔ گوشت لازمی طور پر پٹھوروں کا ہوتا۔ وہ اس بارے میں انتہائی احتیاط برتتا کہ گوشت کو بہت دیر تک نہ پکایا جائے۔ وہ غذائیت کے بارے میں لیکچر دیتا اور بتاتا تھا بہت دیر تک پکاتے رہنے سے ہم گوشت کے اصل ذائقے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں سوال کرتی اور مجھے پتہ چلتا کہ کھانا پکانے کے فن میں وہ طاق ہے۔ اسے اپنے فن پر ناز تھا۔ وہ کمال پسند تھا۔ بیوقوفوں کو بالکل برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اگر کوئی یہ چکر چلانا چاہتا کہ کھانا صحیح وقت کے بجائے کسی طرح کم وقت میں تیار ہو جائے تو ایسی ہر کوشش کو فوراً کچل دیا جاتا۔ طباخی اس کے لیے مہم جوئی کا، جو کھم کا درجہ رکھتی تھی۔ میرے لیے طباخی دریافت کے مترادف تھی۔

کسی لحاظ سے اس پچ میل بھیڑ بھاڑ میں مصطفےٰ اور میں دو ایسی روحیں تھیں جن کے تار آپس میں ملے ہوئے ہی نہیں گتھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں اکیلڑے تھے۔ دونوں کو دنیا والوں نے غلط سمجھا تھا۔ دونوں فنکار تھے۔ دونوں کسی ایسے کاز کو تلاش کرنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہے تھے جس کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر سکیں۔ دونوں کو کسی ایسے فرد کی جستجو تھی جو ہمارے دلوں میں برپا ڈراؤنے ہیجان کو سمجھ سکے۔ اب تک کوئی ہمارے ذہنوں کے اندر نہ اتر سکا تھا۔

اس آدمی کے ساتھ میرا تعلق پروان چڑھ رہا تھا۔ میں اسے بہتر طور پر جاننے کی آرزومند تھی اور محسوس کرتی تھی کہ بیشتر لوگوں سے کہیں بہتر انداز میں اس کی ناقابل یقین توانائی کو سمجھ سکتی ہوں، اُس کی اس خواہش کا احترام کر سکتی ہوں کہ وہ جیسا ہے اسے بجنسہٖ اسی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ میں بے رحمی اور شقاوت کی اس رکاوٹ کو، جو غلط فہمیوں کی بنا پر اس کے سامنے کھڑی کر دی گئی تھی، ڈھانے میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔ اس کی ذات سے مجھے اتنی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی کہ میری تمنا تھی کہ کسی طرح اسے کھل کر باتیں کرنے پر راضی کر لوں۔ کوئی چیز مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ یہ نوشتۂ تقدیر ہے۔ مجھے اعتماد تھا کہ صرف میں ہی مثبت انداز میں اس کا تجزیہ کر سکتی ہوں اور جس سہارے یا ہمدردی کے لیے وہ اتنے کھلم کھلا انداز میں ترس رہا ہے وہ اکیلی میں ہی اسے فراہم کر سکوں گی۔

جو آدمی میرے سامنے بیٹھا بڑی خُردہ کاری سے تیتر کو سیخ پر چڑھانے کی تیاری میں منہمک تھا اس کی ایک بات پر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ وہ یہ کہ وہ رائے عامہ کو قطعاً خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اگر وہ خود کو حق بجانب سمجھتا تو اس میں بالکل بیہودہ اور نامعقول رویہ اپنانے کا حوصلہ بھی تھا۔ یہ ایک ایسی خصلت ہے جو صرف غیر معمولی انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ رسم و رواج پر مصطفےٰ تھوکتا بھی نہ تھا۔ وہ دل کی دل میں رکھنے کا قائل

کبھی نہ ہوا۔ قیادت اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ روایت کی انگلی تھام کر نہ چلتا تھا۔ اپنے لیے نئی راہیں نکالتا رہتا تھا۔ یہ فیصلہ خود کرتا تھا کہ کس سمت میں اور کس راستے پر چلنا ہے۔ لوگوں کا اس کی حرکتوں کے بارے میں کیا خیال ہے، اس بات کو اس نے اپنے لیے کبھی بوجھ نہ بننے دیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ انہیں مجبور کر دے گا کہ وہ جیسا ہے اسے ویسے کا ویسا قبول کیا جائے۔ اس کی کارگزاریوں کی تہہ میں اعتماد کارفرما ہوتا تھا اور اس اعتماد کی بدولت اس نے بہت سے مخالفین سے بھی یہ منوا لیا تھا کہ وہ جو کچھ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ اس پر جو بھی کیچڑ اچھالا جاتا وہ پھسل کر نیچے جا گرتا۔

قاعدہ ہے کہ سیاست دان، کم از کم اپنی نجی زندگی کی حد تک، محتاط ہوتے ہیں۔ مصطفےٰ اس قاعدے سے مستثنیٰ تھا۔ اس کی شادیوں اور طلاقوں کا چرچا ڈرائینگ روم میں ہونے والی گپ شپ تک محدود نہ تھا۔ ان کی گونج ملک کی گلی گلی اور بازار بازار میں سنائی دیتی تھی۔ اس کا بہت شادیاں کرنے والے مرد کا جو امیج بن چکا تھا اسے جھٹلانے کی اس نے کبھی کوشش نہ کی۔ اس ضمن میں اسے ایسے معاشرے کی وجہ سے سہارا ملا جس میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کو برا نہیں سمجھا جاتا اور جو طلاق کو ناکام ہو جانے والی شادی کا منطقی انجام سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ لوگ اس کے جوشِ عشق کو معاف کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے بڑی فراست سے اس کی سیاسی سوجھ بوجھ اور رومانی خوش وقتیوں کو ترازو میں تول کر دیکھا اور فیصلہ کیا کہ اول الذکر میں کہیں زیادہ وزن ہے۔ وہ عوام کا آدمی تھا۔

بھٹو صاحب کے ساتھ سیاسی ناچاقی بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ مصطفےٰ ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی عزت آبرو کو عزیز رکھتے ہیں۔ جب آزمائش کی گھڑی آئی تو اس نے مصالحت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اعلیٰ عہدے کے حوالے سے میسر آنے والی تمام مراعات کو اپنے آدرشوں پر قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اقتدار سے اقتدار کی خاطر چمٹے رہنا اس کے مسلک میں نہ تھا۔ وہ جی حضور کہنے والوں کی صف میں شامل ہونے کے بجائے سیاسی بن باس لینے پر راضی تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ان لوگوں کے کام آنے میں دلچسپی رکھتا تھا جنھوں نے ووٹ دے کر اسے مسندِ اقتدار تک پہنچایا تھا۔ وہ ان کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگنے دے گا چاہے اس کا مطلب اپنے پیرو مرشد اور دوست، بھٹو صاحب کے قہر و غضب کو دعوت دینا کیوں نہ ہو۔

بھٹو صاحب نے لوگوں سے جو قول قرار کیے تھے ان پر قائم نہ رہے تھے۔ انہوں نے خود کو اپنی طاقت کے سرچشمے یعنی عام آدمی سے الگ تھلگ کر لیا تھا۔ وہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

خوشامدیوں کے فن کا شکار ہو گئے تھے اور اب انہیں ایسے دوستوں اور آستین کے سانپوں نے گھیر رکھا تھا جو ان کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے لیے پٹی تیار کر رہے تھے۔ یہ پٹی بھٹو صاحب کی آنکھوں پر تختہ الٹ جانے تک بندھی رہی۔ مصطفےٰ کو خوب علم تھا کہ کرپشن کا زور ہے اور پارٹی کو گھن لگ چکا ہے۔ وہ پارٹی کے منشور سے غداری کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ سیاست دان کا کام حکم چلانا نہیں، خدمت بجا لانا ہے۔ مجھے اس کی آراء عالی ظرفانہ اور موقف راستبازانہ معلوم ہوا۔

ہم لکھوکھا ستاروں کی چھاؤں تلے محبت میں گرفتار ہوا چاہتے تھے۔ دونوں کو اس بات کا احساس تھا۔ مصطفےٰ نے اس لمحے کو، جس میں محبت کا اظہار کیا جانا تھا، اور اس اظہار سے پیدا ہونے والے تناؤ کو التوا میں ڈالے رکھا۔ وہ کب پہل کرے گا؟ وہ پہل کرے گا بھی؟ مجھے یقین تھا کہ میرا ذہن شعبدے بازی پر اتر آیا ہے۔ میں پھولوں کی پنکھڑیاں توڑ توڑ کر کہتی رہی۔ اسے مجھ سے محبت ہے۔ اسے مجھ سے محبت نہیں۔ خنک شام تھی۔ الاؤ دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔ چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ لیکن اس شخص نے، جس کے بارے میں شہرہ تھا کہ ناقابل اصلاح عورت باز ہے، جھپٹا نہیں مارا۔ کیا شائستگی کا ثبوت دیا جا رہا تھا؟ یا یہ سب کچھ میرے تخیل کا کھیل تماشا تھا؟

مصطفےٰ کی رہائش گاہ پر گھر کا گمان نہ ہوتا تھا۔ وہ کوئی پھٹیچر سی جگہ لگتی تھی۔ جیسے میلی چکٹ ہو۔ جیسے گندی ہو۔ پراگندگی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ شیری ان عورتوں میں سے نہ تھی جنہیں اپنے گھر پر ناز ہوتا ہے۔ وہ اسی پراگندگی میں، بے فکری سے، گھومتی پھرتی رہتی۔ میں نے اس بے ترتیبی پر نظر ڈالی اور پھر ذہن میں اپنے ذوق کے مطابق گھر کو نئے سرے سے آراستہ کیا۔ میں اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھ رہی تھی۔ میں تو ہرگز یہ گوارا نہ کرتی کہ کھانا اس طرح پڑا رہے اور مکھیاں اس پر بھنبھنائیں۔ میں اس طرح بے نیازی سے ہاتھ ہلا کر کیڑے مکوڑوں کو کبھی نہ بھگاتی۔ میں پتہ چلا کر رہتی کہ کیڑے مکوڑے اور مکھیاں آتی کہاں سے ہیں۔ میں اس کا اہتمام کرتی کہ گھر میں ایک بھی مکھی نظر نہ آئے۔ یہ سب تو حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے ٹھیک نہیں، میں نے سوچا شیری ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھی رہتی ہے؟ پھول کہاں ہیں؟ گل دان کیوں خالی پڑے ہیں؟ کیا اس نے کبھی گھر کے اندر لگائے جانے والے پودوں کا نام نہیں سنا؟ یقیناً کسی گھر کے حسن کو قائم رکھنا اتنا مشکل کام بھی نہیں۔ شیری میں کیا خرابی ہے؟ گھر کوئی ہوٹل یا ایسا لاؤنج تو نہیں ہوتا جہاں آدمی آتے جاتے تھوڑی دیر کے لیے ستا لے۔ اس گھر میں عورت کے سلیقے کی جھلک نظر کیوں نہیں آتی؟

میں نے اس کے گھر کا چکر لگایا۔ میری ناقدانہ صلاحیتیں پوری طرح بیدار ہو چکی

تھیں۔ برآمدوں کی حالت خستہ تھی۔ کرسیاں آدھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ان کا پینٹ جھڑ رہا تھا۔ کرسیوں اور صوفوں کے گدے اور غلاف خاصے ہی بوسیدہ دکھائی دیتے تھے۔

مجھ پر اچانک یہ عقدہ کھلا کہ شیری کو تو اپنی شادی برقرار رکھنے کے سوا کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ اس نے شادی کے سیاق و سباق کو نظرانداز کر دیا تھا۔ شیری کی توجہ صرف ان جذبات پر مرکوز تھی جو بالآخر مصطفےٰ کے موڈ پر اثرانداز ہو کر اس کی بدمزاجی کو ہوا دیتے تھے۔ مصطفےٰ کو اس کی پروا نہ تھی کہ وہ ایسے گھر میں رہتا ہے جو گندگی میں ڈنگر خانے سے مشابہ ہے۔ اس سے بہتر گھر میں رہنے کا اسے اتفاق ہی کب ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ شیری آ کر گھر کو چار چاند لگا دے گی۔ وہ ناکام ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بیاہی زندگی میں اتنی غیر محفوظ تھی کہ اس کے لیے اپنے گرد و پیش پر توجہ دینا ممکن ہی نہ تھا۔ بغیر جانے بوجھے اس نے خود کو ایسی چیز بنا لیا تھا جسے برتنے برتانے کے بعد ایک طرف پھینک دیا جائے۔ وہ مصطفےٰ کی توقعات پر پوری نہ اتر سکی۔ خود مصطفےٰ کو بھی ٹھیک طرح علم نہ تھا کہ وہ شیری سے کس قسم کی توقعات رکھتا تھا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ جو کچھ دیکھنے میں آیا ہے وہ اس کے آدرش کا پاسنگ بھی نہیں۔ اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے ان نگاہوں کو پا لیا۔ وہ گلہ مند تھیں۔ میری طرف سے انہیں مثبت جواب ملا۔ میں اس کی تلاش کو کامیابی سے اختتام تک پہنچا سکتی تھی۔ میں اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تیار تھی۔ اس شخص کو دریافت کرنے کے عمل کے دوران یکایک میں نے خود اپنی ذات کا سراغ پا لیا تھا۔

مصطفےٰ کی طرف سے آخرکار ایک عید ڈنر کے موقع پر، جو تاج الملک کے گھر پہ دیا جا رہا تھا، سلسلہ جنبانی کا آغاز ہوا۔ ناچ کا انتظام تھا۔ میزبانی کے فرائض مصطفےٰ انجام دے رہا تھا۔ اس طرح کی پارٹیوں میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔ جب وہ حسیناؤں کے جھرمٹ میں ہوتا تو اس کے چہرے پر رونق آ جاتی۔ وہ سرتاپا راجا اندر بنا نظر آتا۔

وہ گھر خود بھی رومان آفرینی کے لیے سازگار تھا۔ پرانا گھر تھا، انگریزی راج کے دنوں کا بنا ہوا، اور اس میں چکیلے فرش والی ایک عجوبہ رقص گاہ تھی۔ پرانی وضع کے ترشے ترشائے شیشوں والے جھاڑ فانوس چھت سے آویزاں تھے جن سے گئے گزرے وقتوں کی سی دلربائی پیدا ہو گئی تھی۔ آغاز عشق کے لیے اس سے موزوں ماحول خیال میں نہیں آ سکتا۔ اس طرح کے گرد و پیش کو تو کسی عام سی تجویز پر بھی عرضِ تمنا کا گمان ہو سکتا ہے۔

مصطفےٰ نپے تلے قدم رکھتا ہوا میری طرف آیا۔ مصمم ارادے کے ساتھ۔ مجھ سے کہنے لگا کہ آیئے، ناچیں۔ میں کہاں ناچ سکتی تھی۔ علاوہ ازیں، انہیں۔۔۔ مصطفےٰ اس

کے لیے تیار تھا۔ اس نے نادر شاہی انداز میں شیری کو حکم دیا کہ وہ میرے میاں کے ساتھ رقص کرے۔ یہ بڑی فیاضانہ ادا تھی۔ انتہائی زبردست خراج تحسین تھا۔ ایک جاگیردار اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ رقص کی اجازت دے رہا تھا۔ اس عزت افزائی پر انیس پھولا نہ سمایا۔ وہ فرش پر جا ڈٹا۔ کہنا چاہیے کہ فرش بلکہ چت ہو گیا۔ اس نے اشارتاً مجھ سے کہا کہ مصطفیٰ نے اپنے ساتھ رقص کرنے کی جو پیشکش کی ہے اسے رد نہ کروں۔ میں نے اپنے میاں کو شیری کے ساتھ ناچتے دیکھا۔ وہ اتنا خوش نظر آ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ اتنی فطری سی بات معلوم ہوتی تھی۔ آٹھ مہینے خود کو اسی لمحے سے دوچار ہونے کے لیے تیار کرنے میں گزرے تھے۔ اس وقت کی سرمستی آنے والے مزوں کے خیال میں چپکے چپکے گھل مل گئی۔

مصطفیٰ نے ایک آہستہ خرام دُھن کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں جان لوں کہ وہ مجھ پر تصرف حاصل کر چکا ہے۔ تصرف اور ملکیت ہم معنی لفظ تھے۔ وہ بڑے اعتماد سے ایسے کوچے میں قدم رکھ رہا تھا جہاں آنے جانے کی اسے اجازت نہ تھی۔ میں نے مزاحمت نہ کی۔

ہم نے ابھی رقص کے چند ہی پینترے بدلے تھے کہ مصطفیٰ نے یونہی سا پرے ہٹ کر کہا: "مجھ سے شادی کرو گی؟" نہ کوئی تمہید باندھی، نہ کوئی تشبیب نہ گریز، سیدھے سبھاؤ شادی کی تجویز سامنے رکھ دی۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مجھے اس طرح کے سوال کی توقع ہی نہ تھی۔ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ "لیکن۔۔۔ مگر۔۔۔ میں تو پہلے ہی۔۔۔ شادی شدہ ہوں۔" "یہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔"

یکایک ہمیں احساس ہوا کہ رقص گاہ میں دوسرے جوڑے بھی موجود ہیں۔ مجھے لگا کہ مصطفیٰ کی تجویز ہر کسی نے سن لی ہے۔ مجھ پر اضطراب اور احساسِ جرم طاری ہو گیا۔ ہم جو رقص کی غرض سے ہم آغوش تھے الگ ہو کر لمحے بھر کے لیے، جو ختم ہونے میں نہ آ رہا تھا، فرش پر کھڑے رہے۔ وہ مجھے سہارا دے کر میری کرسی تک چھوڑنے آیا۔ نروس تو مصطفیٰ بھی نظر آ رہا تھا لیکن خاصا مطمئن بھی کہ جو بوجھ آٹھ طویل مہینوں سے وہ سینے پر اٹھائے پھر رہا تھا اتر گیا ہے۔ اس نے یہ پانچ لفظ بول کر کہ "مجھ سے شادی کرو گی" اپنی محبت اور نیت کا اظہار کر دیا تھا۔

میری زندگی میں اب تک اس سے زیادہ فیصلہ کن لمحہ کوئی نہ آیا تھا۔ ان پانچ لفظوں نے میری کایا کلپ کر کے مجھے اکتائی ہوئی، معمولی سی گھر والی کے بجائے ایسی عورت بنا دیا جس نے پندرہ سال تک مصطفیٰ کھر کو برداشت کیا اور آخر کار سیاسی حریف بن کر اس کے سامنے آ ڈٹی۔

بینڈ "رات میں اجنبی" کی دھن بجا رہا تھا۔ یہ گیت بھٹو صاحب کو بہت پسند تھا اور مصطفیٰ کا پسندیدہ گیت بن چکا تھا۔ میں اب "رات" کو سوچ رہی تھی کہ بھلا کیا ہو گا۔ مل کے کیا پیار کریں گے دونوں۔ اس سے پہلے کہ گزر جائے یہ رات۔" فرینک سناٹرا کے بول مصطفیٰ کے دل میں اتر گئے تھے۔ ان پر عمل اس نے "اپنے انداز" میں کیا۔

ہمارے درمیان کس قیامت کا جذب باہم تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ان سب لوگوں نے، جو وہاں رنگ رلیاں منانے جمع ہوئے تھے، اہتزاز کی اس رو کو محسوس کر لیا ہو گا جو ہمارے مابین جاری و ساری تھی۔ اگر انہوں نے محسوس کر لیا تھا تو اپنے محسوسات کو بڑی عمدگی سے چھپا گئے۔ ہمارے خفیہ معاہدے پر مہر تصدیق ثبت ہو چکی تھی۔ میں تو بس اتنا چاہتی تھی کہ اس کے گہرے خاکستری سوٹ، ہلکی نیلی قمیص اور گھڑیال کی کھال کے بنے کالے جوتوں کی یاد ذہن میں محفوظ کر لوں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے بھی ہمیشہ میرا اس وقت کا حلیہ یاد رہے گا۔ میرے ماتھے پر الماسی بندیا دمک رہی تھی۔ ایک ایسی کہانی شروع ہو چکی تھی جس میں پریوں کی کہانیوں کا سا انوکھا پن تھا۔

جھجک دُور ہونے کی دیر تھی کہ مصطفیٰ زیادہ بے دھڑک ہو کر مجھ سے پینگ بڑھانے لگا۔ ہم ٹیلی فون پر گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ اس نے مجھ سے منوا لیا کہ انیس کے ساتھ میری شادی ختم ہو چکی ہے اور میرا مستقبل اس کی ذات سے وابستہ ہے۔ وہ فون پر بہت اچھی گفتگو کرتا تھا۔ ہم اکثر ملتے اور اپنے جذبات کے وفور کو ہوش و حواس پر حاوی آ جانے دیتے۔ ہم دیوانہ وار محبت میں مبتلا تھے۔ احتیاط، اخلاقیات اور تمیزداری کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔

مصطفیٰ کو ہر وقت مجھ سے کوئی نہ کوئی تقاضا رہتا۔ وہ احتیاط کا قائل نہ تھا۔ میں سہمی رہتی تھی کہ کہیں اوروں کو خبر نہ ہو جائے۔ احساس جرم مجھے ڈستا رہتا۔ مصطفیٰ مکمل طور پر پُرسکون نظر آتا۔ کبھی کبھی تو میں باور کر لیتی کہ وہ چاہتا ہے کہ ہماری خفیہ آشنائی کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوٹ جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس معاملے سے متعلق باقی دو لوگوں یعنی شیری اور انیس کو بھی ہمارے تعلقات کا پتہ لگنا چاہیے۔ وہ چاہتا تھا کہ ہماری شادیوں کا ٹنٹنا ختم ہو تاکہ ہم آزاد ہو کر ساتھ رہ سکیں۔

جو دل میں آ جائے اسے فوراً کر ڈالنے کی عادت۔ مصطفیٰ فون کر کے کہتا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ ابھی ابھی۔ انیس گھر پر ہے۔ ملنے میں بہت خطرہ ہے۔ مصطفیٰ کو کوئی پروا نہ تھی۔ وہ مجھ سے ملنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لیتا۔ ہماری ان ملاقاتوں کا ایک مزاحیہ پہلو بھی تھا لیکن اب ان گزری باتوں پر غور سے نظر ڈالتی ہوں تو یہی پہلو بے دردی اور بے حسی سے عبارت معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے لیے اب ایک دوسرے سے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

الگ رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔ فیصلہ کرنے کی گھڑی آ پہنچی تھی۔

مصطفیٰ نے فون کیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ فی الفور۔ کہنے لگا کہ میں تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ "لیکن کیسے؟ انیس گھر پہ ہے۔ تم نہیں آ سکتے۔" "فکر مت کرو۔ میں اسے گھر سے دفان کیے دیتا ہوں۔ چٹکی بجاتے میں۔"

دو منٹ بعد فون بجا۔ گورنر ہاؤس سے فون تھا۔ انیس کے لیے۔ میں نے ریسیور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ سنتا اور سر ہلاتا اور ہوں ہاں کرتا رہا۔ اس نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ "مجھے گورنر ہاؤس جانا ہے۔ مصطفیٰ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ گورنر کو مجھ سے کوئی بات کرنی ہے"۔ وہ چلا گیا۔ اس قدر عجلت کے ساتھ جو زیب نہیں دیتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مصطفیٰ آ موجود ہوا۔ "انیس کہاں ہے؟" میں نے سانس روک کر پوچھا۔ "تیر رہا ہے۔" مصطفیٰ نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

انیس گورنر ہاؤس پہنچا۔ مصطفیٰ نے اس سے ملاقات کی۔ پھر اس نے انیس سے کہا کہ وہ ذرا نہانے کے تالاب میں ڈبکی لگائے کیونکہ اسے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ وہ جلد ہی لوٹ آئے گا۔ انیس کو مصطفیٰ کے دوست، رؤف خاں، نے نہانے کا جانگیا دیا اور ٹھیل دھکیل کر تالاب میں اتار دیا۔ اس کا دل بڑھاتے رہے تاکہ وہ تیرتا ہی رہے۔ جب وہ باہر آتا تو رؤف اسے کھینچ کھانچ کر دوبارہ تالاب میں لے جاتا۔ وہاں وہ زبردستی ادھر سے ادھر تیرنے میں مشغول تھا یہاں مصطفیٰ اور میں ساتھ تھے۔ فون بجا۔ فون گورنر ہاؤس سے آیا تھا۔ "جناب، ہم اب اسے زیادہ دیر پانی میں ٹھہرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ گھٹن کے مارے بیہوش ہو جائے گا۔ اس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا ہے اور وہ تنگ آ چکا ہے۔" "پانچ منٹ بعد باہر نکال دینا۔ کہنا کہ میرا ابھی ابھی فون آیا تھا۔ میں پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔" ہم بے رحمانہ انداز میں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

مصطفیٰ کو اپنے کیریر میں دوسری مرتبہ پنجاب کے گورنر کے طور پر پوری مضبوطی سے قدم جمانے کا موقع ملا تھا۔ میں نے اس کی حلف برداری کی تقریب میں شرکت کی۔ تقریب کے دوران پورے وقت میری آنکھیں ڈبڈبائی رہیں۔ ہر کوئی شیری کو مبارک باد دے رہا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ میں پریشان اور بدحواس تھی۔ اس وقت بھی، جب مصطفیٰ نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھا، ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے دیکھ لیا کہ میں خود کو تنہا محسوس کر رہی ہوں۔ اُسی دن بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ کوئی سرکاری عہدہ اس محبت پر فوقیت نہیں رکھ سکتا جو اسے مجھ سے ہے۔ اسے والہانہ عشق

اگر کسی سے ہے تو صرف مجھ سے۔

امور مملکت کا تقاضا بڑھا۔ مصطفیٰ کو بھٹو صاحب کے ساتھ پنجاب کے دورے پر نکلنا پڑا۔ اچانک لاہور میں کوئی آب و تاب نہ رہی۔ میں فرار ہو جانا چاہتی تھی۔ دوبارہ سوچنا چاہتی تھی۔ صورتحال کو پرکھنا چاہتی تھی۔ نکل بھاگنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

پنجاب کے اندرون میں واقع کسووال میں میری ایک عزیزہ رہتی تھیں۔ میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ میں آ کر کچھ دیر ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے ایسی جگہ درکار تھی جس تک مصطفیٰ کی رسائی نہ ہو سکے۔ میں اس کے بغیر زندگی گزارنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔ کسووال مثالی مقام تھا۔ نہ سڑکیں۔ نہ بجلی۔ نہ ٹیلی فون۔ میں اپنی شیرخوار بچی، تانیا، کو ساتھ لے کر کسووال چلی گئی۔

مصطفیٰ لاہور لوٹا۔ یہ پتہ چلنے پر کہ میں شہر چھوڑ کر چلی گئی ہوں وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے وہی کیا جو فوری طور پہ دل نے سجھایا۔ اس نے گورنر کے طیارے کو حکم دیا کہ اسے اوکاڑہ پہنچایا جائے۔ اپنی سرکاری مرسیڈیز، پانچ سو ایس ای ایل، اس نے سڑک کے راستے اوکاڑہ بھجوا دی۔ جب وہ اوکاڑہ اترا تو کار اس کی منتظر تھی۔ وہ تاج الملک اور پائلٹ کو ساتھ لے کر کسووال میں وارد ہوا۔

عجیب منظر تھا۔ پنجاب کا گورنر، کسی پیشگی اعلان کے بغیر، پروٹوکول کے بغیر، کسووال پہنچا ہوا ہے۔ اس دنیا جہان سے الگ تھلگ، اجڑی پجڑی جگہ کے رہنے والے غریب غرباء حیران بھی ہوئے اور مرعوب بھی۔ مصطفیٰ کسووال کے تنگ گلی کوچوں میں اکٹھے ہونے والے حیرت زدہ ہجوم کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا رہا۔ پی پی پی کے لیے مزید ووٹ یقینی ہو گئے۔ گورنر کو صوبے کے اندرون کا خیال ہے۔ یہ خبر قومی پریس میں آ گئی۔ یہ کسی کو پتہ نہ تھا کہ اس نے صرف ایک عورت کی خاطر اس ویرانے تک جانے کا جوکھم اٹھایا تھا۔

شوروغوغا سن کر میں تو حواس باختہ ہو گئی۔ میں نے کار کے آنے کی آواز سنی۔ چق اٹھا کر دیکھا تو وہ سامنے کھڑا تھا۔ "تمہیں لاہور واپس چلنا ہو گا۔ ابھی۔ میں تمہارے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔"

رشتے داروں کے سامنے بہانے بنانے کے سوا چارہ کیا تھا۔ میں نے کہا کہ پنجاب کا گورنر میرے میاں کا دوست ہے۔ مجھے جانا ہی پڑے گا۔ وہ میرے خوابوں خیالوں پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے عزیز و اقارب کو خدا حافظ کہا جو بہت مرعوب ہو چکے تھے اور ابھی سے اس مشہوری کے خیال سے ہونٹ چاٹ رہے تھے جو گھر پر گورنر کی آمد سے ان کے حصے میں آنے والی تھی۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہم، میری بچی، مصطفےٰ اور بس، ایک ساتھ رخصت ہوئے۔ ہم اوکاڑہ پہنچے۔ میرے لیے اس طرح سفر کرنا ضروری تھا کہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔ میں نے بستر کی سفید چادر سے کام چلاؤ سا پردہ تیار کیا، ایسی چادر جس میں سے صرف میری آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ہم گورنر کے طیارے پر سوار ہوئے اور لاہور روانہ ہو گئے۔

مصطفےٰ طیارے سے اترا، سرکاری کار میں بیٹھا اور سائرنوں کے شور میں، موٹر سائیکل سوار جلوداروں کے ساتھ، گھر کا رستہ لیا۔ میں بھیس بدل کر باہر آئی۔ ایک اور کار میں سوار ہوئی جس میں رنگین شیشے لگے تھے اور پیچھے پیچھے چل پڑی۔

میرے شوہر کو مصطفےٰ نے ایک انتہائی خفیہ مشن پر پشاور چلتا کر دیا تھا۔ اسے وہاں ایک اہم "صرف آپ کے پڑھنے کے لیے" خط کسی کو پہنچانا تھا لیکن اسے مکتوب الیہ سے ملانے میں ٹال مٹول سے کام لیا گیا تاکہ وہ پشاور میں مجبوراً رکا رہے۔ مصطفےٰ کا دوست، رؤف خاں، اسے ہوائی اڈے پر چھوڑ کر آیا تھا تاکہ اس کی روانگی کے بارے میں کوئی شبہ نہ رہے۔ وہ اپنا مشن مکمل کیے بغیر واپس نہ آ سکتا تھا۔ ادھر مصطفےٰ بد نصیب انیس کو واپس بلانے سے پہلے خود اپنے مشن کو یقینی طور پر تکمیل تک پہنچانے کے لیے تلا بیٹھا تھا۔

ہم گورنر ہاؤس پہنچے۔ میری بچی اور اس کی انا میرے ساتھ تھی۔ ہمیں صدارتی سُوئٹ میں ٹھہرایا گیا۔ مصطفےٰ نے ڈنر میرے ساتھ تناول کیا۔ اس کے چہرے پر کمال کی مسکراہٹ تھی۔ شرارت بھری۔ میں گھبرائی ہوئی تھی۔ اگر شیری کو پتہ چل گیا تو؟

مصطفےٰ نے مجھے بتایا کہ شیری ہمیں پریشان نہیں کرے گی۔ وہ شیری سے کہہ آیا ہے کہ وہ نیچے کی منزل میں علمائے کرام کی خاطر تواضع میں مصروف ہے۔ علمائے کرام کا مطلب ہے خالص مردانہ محفل۔ مذہبی عالموں کی محفل میں کوئی عورت میزبانی کے فرائض انجام دے، یہ بالکل محال ہے۔ شیری کو اپنے کمرے میں ٹھہرنا ہوگا۔ شیری نے اس من گھڑت پر یقین کر لیا۔

شمعوں کی روشنی میں آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے ہم اپنے باہمی مستقبل کی باتیں کرتے رہے۔

خاصی رات گزر جانے کے بعد مصطفےٰ رخصت ہوا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔ میں اکیلی پڑی کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہی۔ احساس جرم کا شکار لیکن ساتھ ہی مطمئن کہ کوئی میرا چاہنے والا بھی ہے۔ میری آنکھ صبح سویرے کھل گئی۔ میں نے اپنے خیالات مجتمع کیے، بچی اور انا کو ساتھ لیا اور گورنر ہاؤس سے چلی آئی۔ اس کے بعد قیامت برپا ہو گئی۔

شیری کو پتہ چل گیا۔ وہ گورنر ہاؤس میں کھانے پینے کی چیزوں پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ اسے بڑا غصہ آیا کہ ایک دن میں اتنا دودھ کیسے خرچ ہو گیا۔ مجرم تو تانیا تھی۔ شیری نے ملازموں پر الزام لگایا کہ دودھ انہوں نے چرا لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بے قصور ہیں اور شیری کو بتایا کہ دودھ ایک چھوٹی بے بی پیتی رہی ہے۔ "چھوٹی بے بی؟ کس کی چھوٹی بے بی؟" "میم صاحب کی بے بی۔ مہمان میم صاحب۔" "کیسا مہمان؟ کون سی میم صاحب؟" "ہمیں نام نہیں معلوم۔ لمبے لمبے سرخ بالوں والی میم صاحبہ۔" تہمینہ۔

اب شیری جان گئی۔ علمائے کرام کا ذکر تو اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے تھا۔ مصطفےٰ سچ مچ اس کے پلنگ کے نیچے (نچلی منزل میں) چھپ کر عشق لڑا رہا تھا۔ میاں بیوی میں ٹھن گئی۔ مصطفےٰ نے بڑے اطمینان سے مان لیا کہ وہ میری محبت میں گرفتار ہے۔ اس نے شیری کو بتایا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ نہ کوئی حیلے حوالے۔ نہ کوئی جھوٹ کپٹ۔

مصطفےٰ نے یہ ساری بات مجھ سے چھپائے رکھی۔ شیری مقابلے میں ڈٹ گئی۔ وہ ہمارے ٹولے کی تمام خواتین کے آگے یہ ذکر کر بیٹھی۔ مجھے اچانک یہ محسوس ہوا جیسے ہر طرف ٹھر پھیل گئی ہو۔ خواتین نے مجھ سے بات کرنا تو ایک طرف رہا میری طرف دیکھنا تک چھوڑ دیا۔ میں گھر بگاڑنے والی قرار پائی۔ اس رویے سے نمٹنا میرے لیے بہت مشکل ہو گیا۔ مصطفےٰ کے عاشقانہ تیور اور اندازِ گفتگو زیادہ نڈر اور واضح ہوتا گیا۔ مجھ سے خواتین کی مخاصمت کچھ اور بڑھ گئی۔

گورنمنٹ ہاؤس میں ممتاز بھٹو کے اعزاز میں دیے جانے والے ایک ڈنر کے موقع پر میرے ٹولے کی عورتیں جان بوجھ کر مجھ سے دُور رہیں اور بات کرنے سے اجتناب کیا۔ شیری کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ میں غلیظ در انداز تھی۔ لچی۔ لفنگن۔ میں دیدہ دلیری سے مصطفےٰ کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ میں بڑی بہادری سے میدان میں ڈٹی رہی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے، پیلی پڑ جانے والی مٹھی میں کوک سے بھرے گلاس کو بڑی سختی سے پکڑے ہوئے تھی۔ جذبات سے بے قابو ہو کر آنسو بہانے اور اپنی جگ ہنسائی کا سامان آپ کرنے میں سراسر میرا نقصان تھا۔ میں خود کو اس طرح بے نقاب نہ کر سکتی تھی۔ میں تو بس یہی چاہتی تھی کہ کہیں غائب ہو جاؤں۔ کہیں جا چھپوں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ سب کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی ہیں اور سب ہونٹ کینہ آمیز گپ شپ کا طوفان اگلنے میں مشغول ہیں۔ میں داغ دار ہو چکی تھی)۔

خواتین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان کے خاموش رہنے سے مجھے اتنی تکلیف نہیں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پہنچ رہی جتنی پہنچنی چاہیے۔ انہوں نے مجھے چڑانا شروع کر دیا۔ وہ آپس میں زور زور سے باتیں کرنے لگیں۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی گفتگو مجھے سنائی دے رہی ہے۔ وہ ایک فرضی بیاہی عورت کا ذکر کرنے لگیں جو شادی شدہ مردوں سے یارانے گانٹھتی پھر رہی تھی۔ انہوں نے اس طرح کے کرتوت کی مذمت کی اور کہا کہ ایسی عورتوں کا سماجی سطح پر بائیکاٹ کر دینا چاہیے۔ زانیہ کو سنگسار کرنے کا عمل انہوں نے نگاہوں نگاہوں میں اور زیر میں بجھی زبانوں کی مدد سے کر دکھایا۔ میں نے طے کر لیا کہ ان ستانے والیوں سے میں آپ قطع تعلق کر لوں گی۔ ہم نے ضیافتوں میں شریک ہونا چھوڑ دیا۔ ایسی دعوتوں سے بہت زیادہ ناخوشگوار یادیں وابستہ ہو چکی تھیں۔

سوشل منظر سے ہمارے غائب ہو جانے پر لوگ چونکے۔ مصطفٰے کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ ہم اس ڈنر میں شریک نہ ہوئے تھے جو گورنر ہاؤس میں بیگم نصرف بھٹو کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ وہ ہماری غیرحاضری کی وجہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ بضد تھا کہ وجہ بتائی جائے۔ میں نے ساری بات اسے بتا دی۔ وہ ہنستا رہا۔ اور پھر اس نے کہا کہ وہ اس کا تدارک کر کے رہے گا۔ "سب کچھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

اگلے دن میں شیری کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے برسرِ مطلب آنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ کہنے لگی کہ اسے مصطفٰے نے بھیجا ہے۔ "مجھے تمہارے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔ میں صورتحال کو قبول کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے میاں اور تم ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو۔۔۔۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ہاں دعوتوں میں شریک ہوا کرو۔ میں تمہاری موجودگی کا برا نہیں مانوں گی۔ نہ دوسری خواتین کو کوئی رنج ہو گا۔"

میں بہت جھینپی، بہت گھبرائی۔ شیری واضح طور پر پریشان معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی سہیلی، گکو کو ساتھ لے کر آئی تھی۔ غیراخلاقی سہارے کے طور پر۔ "سنو میں یہاں آئی ہوں تو اس لیے کہ مصطفٰے نے مجھ سے کہا تھا کہ یہاں آؤں اور یہ پیغام پہنچا دوں۔ میں طوعاً و کرہاً یہاں آئی ہوں۔ میں اپنا سہاگ بچانا چاہتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم آئندہ اس سے نہ ملو۔ اگر تم نے اس سے ملاقات کی تو میں۔۔۔ تو میں خودکشی کر لوں گی۔ میری زندگی سے نکل جاؤ۔ مصطفٰے کی زندگی سے نکل جاؤ۔ وہ بہت ٹیڑھا آدمی ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہو چکی ہوں۔ تمہیں اس کے بارے میں خاک علم نہیں۔ وہ تمہارے لیے ٹھیک نہ رہے گا۔ تمہاری زندگی برباد کر دے گا۔"

اس کے بعد اس نے میرے سامنے اس سلوک کا مین نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جو مصطفٰے نے اس کے ساتھ روا رکھا تھا۔ "یہ تمام ہولناک حرکتیں وہ میرے ساتھ کر چکا

ہے۔ لیکن میں نے ٹھان لی ہے کہ اس شادی پر آنچ نہ آنے دوں گی۔ میں حالات سے نپٹنا جانتی ہوں۔ مجھے بھی کسی نہ کسی طرح گزارا کرنا ہے۔ تم پر لازم ہے کہ میری زندگی سے لاتعلق ہو کر میرا ہاتھ بٹاؤ۔ مہربانی ہو گی۔"

میں نے عہد کیا کہ شیری کے شوہر سے کوئی تعلق نہ رکھوں گی۔

یہ عہد چند روزہ ثابت ہوا۔ مصطفٰے میرا پیچھا چھوڑتا ہی نہ تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ شیری میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ شیری نے کہا کیا تھا۔ لیکن میں نے مصطفٰے پر واضح کر دیا کہ ہمارا یارانہ ختم ہو چکا ہے۔ اسے جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ ہماری وجہ سے بہت زیادہ لوگوں کو دکھ پہنچے گا۔

چار دن بعد مصطفٰے مجھ سے ملنے آموجود ہوا۔ پیچھے پیچھے شیری، جیسے کھینچ کر لائی گئی ہو۔ جو مکالمہ اسے رٹوایا گیا تھا وہ اس نے یوں ادا کیا جیسے اپنے دل کی بات کہہ رہی ہو۔ شیری نے اپنے کرب اور تلخی پر پردہ ڈالے رکھا۔ وہ درماندہ اور شکست خوردہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے میری منت کی کہ میں ان کے حلقے میں لوٹ آؤں۔ میں پھندے میں آ گئی۔ یہ شخص اپنی محبوبہ کو منانے کے لیے خود اپنی بیوی کو استعمال کر رہا تھا۔ یہ کج روی تھی لیکن جہاں مصطفٰے ہو وہاں عجیب و غریب معاملات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔

ہم ایک بار پھر سوشل حلقوں کا حصہ بن گئے۔ مخاصمت دب گئی مگر ابھی موجود تھی۔ بیشتر ڈنر جب ختم ہوتے تو مرد ایک طرف جا کر بیٹھ جاتے اور عورتیں دوسری طرف۔ میں ان عورتوں سے ملنے جلنے پر مجبور ہو جاتی جنہیں مصطفٰے سے میری اٹکھیلیاں ناگوار گزری تھیں۔ یہ میرے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ میں چاہتی تھی کہ تعلقات منقطع کر کے غائب ہو جاؤں۔ مصطفٰے نے کچھ اور ٹھان رکھی تھی۔

شیری میرے استفادے کے لیے مصطفٰے کے ساتھ اپنے مثالی "تعلقات" کا خاص طور پر چرچا کرتی رہتی۔ "مصطفٰے کہتے ہیں کہ شادی شدہ مردوں سے عشق لڑانے والی عورتیں چھنال ہوتی ہیں۔ ان کی خوب اچھی طرح مذمت کی جانی چاہیے اور انہیں سزا ملنی چاہیے"۔ "مصطفٰے کہتے ہیں۔۔۔" گفتگو کا یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا۔ اس دوران میں صاف پتہ چلتا رہتا کہ دبی دبی ہنسی کی آوازیں آ رہی ہیں، کہنیاں ماری جا رہی ہیں اور واضح طور پر کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ جرم کا احساس آدمی کی حساسیت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ آپ کے حواس اتنے تیز ہو جاتے ہیں جتنے پہلے کبھی نہ تھے۔

ایک ڈنر پر ہمارے سربرآوردہ صنعت کاروں کی بیویوں نے طے کیا کہ مجھے مزہ چکھایا جائے۔ انہوں نے میرے بارے میں ایسے توہین آمیز جملے کہے کہ بے بسی کے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مارے میرے آنسو نکل آئے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شیری کی سہیلیاں ہیں اور انہیں اکسایا گیا ہے۔ یہ واقعہ مصطفٰے کے علم میں آگیا۔ میری زبانی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ فکر مت کرو۔ میں ان عورتوں کو سبق سکھا کر چھوڑوں گا۔

اگلے روز دونوں عورتوں کے شوہروں کو گورنر ہاؤس طلب کر لیا گیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ کی بیگمات جا کر تہمینہ سے معافی مانگیں۔ آج ہی۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو مجھ سے خیر کی امید نہ رکھیں۔ تہمینہ کی بے عزتی کی قیمت آپ لوگ ادا کریں گے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

مصطفٰے جانتا تھا کہ ان کی بیویاں میرے پاس پہنچیں گی۔ صوبے کے حاکم اعلیٰ کی ناراضگی مول لینا ان کے لیے سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ وہ سیدھے گھر گئے اور ان کی بیگمیں سیدھی میری خدمت میں حاضر ہو گئیں۔ انہوں نے معافی مانگی۔ مصطفٰے کو پتہ تھا کہ اس نے مجھے مشکل صورتحال سے دوچار کر دیا ہے۔ اس نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ اس نے مجھے تحفظ فراہم کیا۔ میں نے اس سے شادی کا جو عزم کیا تھا اسے پختہ تر کرنے کے لیے اس طرح کے تحفظ کی فراہمی ضروری تھی۔ وہ ہر کسی سے ٹکر لینے کو تیار تھا۔ اسے پروا نہ تھی کہ ان باتوں کے اتفاقی مگر منفی نتائج کیا ہوں گے۔ اس پر تو مجھے اپنے تصرف میں لانے کی دھن سوار تھی۔

شیری اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے تھوڑی دیر ستانے کی ضرورت ہے۔ اسے روحانی مدد درکار تھی۔ اس نے عمرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مصطفٰے اور میں اور زیادہ وقت ساتھ گزارنے لگے۔ میں دن میں اکیلی اس سے ملتی اور رات کو وہ انیس کو اور مجھے ڈنر پر مدعو کر لیتا۔ انہیں چند دنوں کے دوران ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم اذیت کو مزید طول دینے یا اپنے اپنے زوج کے ساتھ یہ مہمل سی چیستان جاری رکھنے کے حق میں نہ تھے۔

شیری عمرہ کر کے لوٹی۔ ہم اسے لینے ہوائی اڈے گئے۔ میں بتا سکتی تھی کہ اس نے کیا دعا مانگی ہو گی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں ناپاک ہوں، جیسے میرے بارے میں کچھ بھی چھپا نہ رہا ہو۔ شیری سے تقدس اور طمانیت چھلکی پڑ رہی تھی۔ مجھے تشویش لاحق ہو گئی۔ اللہ اس کی دعائیں قبول کر لے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس نے مصطفٰے ہی کو مانگا ہو گا۔ مصطفٰے اس کے پاس لوٹ جائے گا۔ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چل دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول نہ کی۔ ویسے اللہ اپنی پُراسرار مصلحتوں کے تحت، میری التجا سن رہا تھا۔ شاید میری التجا سنی ہی اس لیے گئی کہ اس طرح مجھے سزا دینی مقصود تھی۔ اللہ نے شیری کی درد بھری فریاد سن لی اور اسے چھٹکارا دلانے کے لیے

ایک منصوبہ ترتیب دے ڈالا۔

میں ابھی ابھی بائیس برس کی ہوئی تھی۔ ہم نے سالگرہ کا جشن منانے کے لیے ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ مصطفٰے کا رویہ کسی حاسد عاشق کا سا تھا۔ اسے انیس کی موجودگی خار کی طرح کھٹک رہی تھی۔ وہ چاہتا ہی نہ تھا کہ انیس میرے پہلو میں نظر آئے اور جب میں اپنے میاں سے بات کرتی تو تیوری چڑھا کر مجھے گھورنے لگتا۔ اس نے مجھ پر واضح کر دیا کہ مجھے کسی اور مرد کے ساتھ دیکھنا، خواہ وہ میرا شوہر ہی کیوں نہ ہو، اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اس مرحلے پر اس کی تصرف پسندی سے میری انا کو بڑی تسکین پہنچی۔

عید سے ایک دن پہلے مصطفٰے نے فون کیا اور کھڑے کھڑے عید لنچ کی تجویز سامنے رکھی اور اپنے آپ کو لنچ پر خود ہی مدعو کر لیا۔ لنچ مجھے ہاتھ کے ہاتھ تیار کرنا پڑا۔ اس قدر عجلت کے باوجود میں سپین اور وہب کے تیار کردہ روپہلے چھری کانٹے چمچے اور شیشے کے منقش، بوہیمین گلاس نکالنے نہ بھولی۔ کھانا نفیس روزنتھال کراکری میں پیش کیا گیا۔ کھانا یونہی سا تھا اور مصطفٰے کو، جو خاصا خوش خوراک واقع ہوا تھا، اس کے غیر معیاری پن کا فوراً اندازہ ہو گیا۔ لمحے بھر کے لیے موقع ملتے ہی اس نے میرے کان میں کہا: "تمہاری سروس کمال کی ہے۔ میرا پکایا ہوا کمال ہوتا ہے۔ میری سروس کا معیار پست ہے۔ تمہارا کھانا واہیات ہے۔ ہم اپنی خوبیوں کو یکجا کیوں نہ کر لیں۔ ہمارے لیے ایک مثالی صورتحال وجود میں آ جائے گی۔" میں سمجھ سکتی تھی کہ مصطفٰے کی مراد اصل میں کیا ہے۔ اس غیر معمولی تجویز پر ہر کسی نے مجھے جھینپ کر سرخ ہوتے دیکھا ہو گا۔ دیکھنے والوں کے لیے دعوتِ فکر۔

جلد ہی ہم دونوں کی وجہ سے افواہ بازوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ "جیٹ سیٹ" سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے وقت گزاری کا پسندیدہ مشغلہ گپ بازی ہے اور وہ بھی ایسی جس میں دوسروں کی بدنامی کا پہلو نکلتا ہو۔ اس زبردست معاشقے کا چرچا چار سو ہونے لگا۔ لندن میں امی تک بھی خبر پہنچ گئی۔ وہ ہوائی جہاز سے کراچی آئیں اور انیس سے خوب کھل کر بات چیت کی۔ انہوں نے اسے مصطفٰے سے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ "گورنر کی نئی فتح" کا ذکر ساری دنیا کی زبان پر ہے۔ "میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں۔ اس شخص سے ملنا جلنا چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اپنی بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

انیس نے اس تنبیہ کو اس کان سُن کے اُس کان اڑا دیا۔ اسے بہت زیادہ بھروسا اس بات کا تھا کہ وہ مجھ سے عشق کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ خوددار آدمی تھا۔ اس ...

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

افواہوں کو کینہ توز گپ بازی قرار دے کر نظرانداز کر دیا اور امی کو بتایا کہ وہ جس سے جی چاہے گا ملے گا۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔

ہمارے بارے میں جو افواہیں گرم تھیں وہ ٹھنڈی نہ پڑیں۔ رسالے باتیں چھانٹ کر ہمیں دق کرنے لگے۔ ہمارے معاشقے کی سب کو خبر ہو گئی۔ میری سسرال والوں کو بھی پتہ چل گیا۔ انیس کا بھلا چاہنے والے اسے ہر قت خبردار کرتے رہتے۔ بیشتر صورتوں میں شوہر کو سب سے آخر میں پتہ چلتا ہے کہ بیوی نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ انیس کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اصل میں وہ کچھ جاننا چاہتا ہی نہ تھا۔

ہماری ملاقاتیں زیادہ تواتر سے ہونے لگیں اور اب غور کرتی ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ ہم ملنے بھی زیادہ ڈھٹائی سے لگے تھے۔ محبت میں مبتلا ہو کر آدمی آگم اندیشہ بالکل نہیں سوچتا۔ مصطفٰے دن میں تین تین چار چار بار فون کرتا اور اگر کسی روز مجھ سے نہ مل سکتا تو بجھ کر رہ جاتا۔ محبت کرنے والا پچ کی لینے میں بھی بہت ماہر ہو جاتا ہے۔ گھر سے باہر جانے کی وجوہ تلاش کرنا یا بہانہ گھڑنا میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا تھا۔ مجھے بار بار جھوٹ بولتے ہوئے ذرا لحاظ نہ آتا۔ انیس کو شبہ تک نہ ہوتا۔ مجھ میں بہت کٹھورپن آ گیا تھا اور میں محبت میں اس قدر مبتلا ہو چکی تھی کہ مجھے کچھ پروا نہ رہی تھی۔ مصطفٰے شدید جذبات رکھنے والا آدمی تھا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم نہ کر سکتا تھا کہ جس عورت سے اسے عشق ہے وہ اس کی نہیں کسی اور کی ہے۔ قانون میں اصل اہمیت ملکیت کی ہے۔ جاگیردار ہونے کے ناطے وہ اس نکتے سے باخبر تھا۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ میں آدھے وقت اس کی کہلاؤں اور آدھے وقت کسی اور کی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں پوری طرح اس کی ہو جاؤں۔

ہمارے تعلقات میں ایک طرح کی تلخی آہستہ آہستہ سرایت کر رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھ پر بیاہی عورت کا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ انیس کا نام سنتے ہی مصطفٰے بھڑک جاتا اور مجھ سے تمام وقت جھگڑتا رہتا۔ وہ محسوس کرتا کہ اس کے حصے میں محرومی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ خود کو یہ کہنے پر آمادہ نہ کر سکا کہ میں انیس کو چھوڑ دوں۔ یہ تذبذب اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ اس نے کبھی رسماً بھی طلاق کا نام نہیں لیا۔ اس کے باوجود وہ مجھے طلاق کی طرف دھکیل رہا تھا۔ یہ اس کی فراخ دلی تھی کہ اس نے کبھی مجھے بلیک میل نہیں کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اپنے فیصلے میں آپ کروں۔ یہ اس کا ثبوت ہو گا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ کچھ تو معاشرتی فشاروں کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ میں انیس کو دکھ نہ پہنچانا چاہتی تھی میں ابھی تک ڈانواں ڈول تھی۔

ایک بار ترنگ میں آ کر وہ گورنر کے طیارے میں مجھے اپنے گاؤں لے گیا۔ شیری ہمارے ساتھ تھی۔ وہاں پہنچ کر شیری نے چارج سنبھال لیا اور مجھے اس کی زمینیں دکھاتی پھری۔ اپنے سائیں کا گھر دیکھ کر مجھے کچھ دھکا لگا۔ وہ نہ تو حویلی تھی نہ کسی زمیندار کی ڈیوڑھی۔ جاگیردارانہ معیاروں سے وہ چھوٹا سا گھر تھا اور وہ بھی خستہ و شکستہ۔ اپنے گردوپیش سے پوری طرح ہم آہنگ۔ غربت نے، کسی اوکٹوپس کی طرح، اپنے رسوں جیسے لمبے لمبے ہاتھ ہر طرف پھیلا رکھے تھے۔ اس کے خاندان کا ڈھانچہ قبائلی زیادہ اور جاگیردارانہ کم تھا۔ وہ جاگیردار ہونے کی بہ نسبت قبائلی سردار زیادہ تھا۔ درحقیقت اپنے قبیلے کا غالباً وہ پہلا فرد تھا جس نے جاگیردارانہ طرزِ زندگی اپنانے کی آرزوؤں کو دل میں پالا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے قبیلے کے افراد ابھی تک ذہنی طور پر ہندومت کے غلام تھے۔ ان کی روایات مختلف ادیان کا ملغوبہ تھیں۔ راسخ العقیدگی کو اسلام کی ایک بہت ہی ہند زدہ شکل میں پیوند کر دیا گیا تھا۔ اس طرح عقیدے کی پختگی ہلکے پن کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ کون مسلمان تھا اور کس حد تک مسلمان تھا، اس کا کوئی تعین نہ ہو سکتا تھا۔

اور اس کے باوجود مجھے اپنی زمینیں اور پرانے گھر دکھاتے وقت وہ بڑا فخر محسوس کر رہا تھا۔ وہ بظاہر یہ کہتا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہے وہ جگہ جہاں سے ابھر کر میں منظرِعام پر آیا۔ دیکھو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں۔ وہ اپنے حسب نسب پر شرمسار نہ تھا۔ ان کی وجہ سے اس کی عظمت کی شان دوبالا ہو جاتی تھی۔ مصطفٰے نے اپنی ادنیٰ شروعات کو بیساکھیاں بنا کر ہمدردی حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنایا۔ یہ شروعات اس کے لیے حقیقی معنی میں باعث افتخار تھی۔ اس نے اپنے علاقے کو کبھی بھلایا نہیں اور اس پر ان لوگوں کے حالات سدھارنے کا جنون سوار رہتا تھا جن کی وجہ سے اسے اتنا زبردست امتیاز نصیب ہوا تھا۔ وہ لکھ لٹ فرزند تھا۔ اکثر اپنے علاقے کا رخ کرتا۔ مجھ پر اس کی راستبازی نے گہرا اثر چھوڑا۔ میں اس بات سے بہت متاثر ہوئی کہ اس نے اپنی شروعات پر کوئی ملمع چڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس روز میری وہاں موجودگی اس کے نقطۂ نظر سے اہم تھی۔ یہی وہ سیاق و سباق تھا جو مصطفٰے کو معنویت عطا کرتا تھا۔

ہمارا رومان پروان چڑھتا رہا۔ مصطفٰے ناقابل علاج رومان پسند تھا۔ وہ مجھے رات کے تین بجے فون کرتا۔ "ٹینا، میں تم سے ملنے کے لیے مرا جا رہا ہوں۔" "لیکن تم نہیں مل سکتے۔ میں اس وقت تم سے نہیں مل سکوں گی۔" "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ دوں اور تمہارے پاس آ جاؤں۔" "مصطفٰے، بہت رات جا چکی۔ میں تم سے باتیں نہیں کر سکتی۔ انیس۔۔۔۔" "فون بند مت کرو۔ میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

دس منٹ بعد کار میں تمہارے گھر کے آگے سے گزروں گا۔ جا کے کھڑکی میں کھڑی ہو جاؤ۔ صرف ایک منٹ کے لیے۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔ پنجاب کا گورنر کار میں بیٹھا میرے سامنے سے گزرتا۔ وہ نظر اٹھا کر دیکھتا۔ میں مسکراتی اور پردہ کھینچ لیتی۔

انیس کاروبار کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے سنگاپور چلا گیا۔ میں کراچی میں تھی۔ مصطفےٰ بھی کراچی آ گیا۔ اس نے مجھے سندھ کے وزیرِاعلیٰ کے گھر پر ایک ڈنر میں مدعو کیا۔ میں نے دعوت میں شرکت کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ میری ایک سہیلی مجھ سے ملنے گئی۔ ہمارے درمیان اس دیوانگی کی حد کو چھونے والے عشق کا ذکر چھڑ گیا جو مجھے مصطفےٰ سے تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ مصطفےٰ میرے سطحی روپ کی محبت میں گرفتار ہے۔ "وہ تم سے محبت کرتا ہے کیونکہ تم شکل کی اچھی ہو۔ تم خوش پوش ہو۔ تم سے اس کا ایج سنورتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں جیت لے اور اپنی کامیابی پر اتراتا پھرے۔ ایک دفعہ وہ تمہیں اس حال میں دیکھ لے کہ بالوں میں کرلز لگے ہوئے ہیں یا چہرے پر نائٹ کریم تھپی ہوئی ہے تو تم سے محبت کرنی چھوڑ دے گا۔ وہ تمہاری ظاہری زیب و زینت پر فدا ہے۔ تم اصل میں جیسی ہو اس پر نہیں۔"

مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ کیا یہ بات سچ ہو سکتی ہے؟ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفےٰ کو آزما کے دیکھتی ہوں۔ میں ثابت کرنا چاہتی تھی کہ چاہے میں پھٹیچر سا لباس پہنوں اور بھیانک نظر آؤں وہ پھر بھی مجھ سے محبت کرتا رہے گا۔

اس رات میں چارخانوں والے ہلکے نیلے گنگھم کا ایک ہولناک سا لباس پہن کر ڈنر پر گئی۔ اس لباس میں جھالروں کی تین پرتیں تھیں جو میرے ٹخنوں تک پہنچ رہی تھیں۔ سامنے کی طرف ایک YOKE تھا جس سے مزید جھالریں آویزاں تھیں۔ بظاہر نرسری میں پڑھائی جانے والی کسی تک بندی کو سامنے رکھ کر یہ لباس وضع کیا گیا تھا۔ لباس کی ہئیت کو مزید بگاڑنے کے لیے اس پر ایک پلاسٹک سٹکر چسپاں تھا جس میں کاٹیج اور موٹی سی دم والی پلی ہوئی گائے کی مدد سے ایک مکمل دیہی منظر کی عکاسی کی گئی تھی۔ لباس کی پھولی پھولی آستینوں سے مہملیت کی طرف میرے اس سفر کی تکمیل ہوئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں پرلے درجے کی احمق ہوں۔ اس حماقت میں کوشش اور بناوٹ کا بہت دخل تھا۔ لیکن میں اپنی بات ثابت جو کرنا چاہتی تھی۔

میں نے سندھ کے وزیرِاعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ میں قدم رکھا تو یوں لگ رہی تھی جیسے "تا، جا" کھیلتے کھیلتے بھاگ کر پناہ لینے آ گئی ہوں۔ مصطفےٰ بیڈ روم میں تھا۔ کالے رنگ کا سوٹ ڈاٹے وہ بڑا بانکا لگ رہا تھا۔ مجھ پر نظر ڈالتے ہی اس کا منہ اتر گیا۔

اسے عافیت اسی میں نظر آئی کہ مجھ سے دُور دُور رہے۔ اسے خاصی کراہت محسوس ہوئی۔ دیر اتنی ہو چکی تھی کہ گھر جا کر لباس تبدیل کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ڈنر پر پہنچا۔ ہر کوئی مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ چولیوں بلاؤزوں، چمکتی نافوں اور نیچے تک کٹے گریبانوں سے جھانکتی وادیوں اور شفون کی سرسراہٹوں والی حسین و جمیل عورتیں اس اول جلول لباس پر نظر ڈال کر میری طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔ ان کے اور میرے درمیان موجود تضاد ٹھکرا دینے والا تھا۔ میرے چہرے کی طرف کسی نے نظر نہ کی۔ انہوں نے رائے دی تو یہی کہ مجھ میں سلیقے کی کمی ہے۔ میں نے ایک فضول چیلنج قبول کر لیا تھا اور وہی چیلنج الٹا میرے گلے پڑ گیا تھا۔ مصطفےٰ تو نباہ کر رہا تھا۔ میں اپنی بچگانہ حرکت پر زیادہ شرمسار تھی۔

میرے دلبر کے نباہ کا انداز یہ تھا کہ وہ نہایت احتیاط سے مجھ سے دُور دُور رہا۔ اس نے مجھ سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ وہ گھومتا پھرتا رہا۔ اس کے اردگرد عورتیں جمع رہیں۔ اس نے ان تمام دلکش عورتوں سے لگاوٹ کی باتیں کیں جن کی ہوشربا دلربائی اپنے اوج پر تھی۔ وہ مجھے سبق سکھا رہا تھا۔

میں وہاں ایک طرف ایسے کھڑی رہی جیسے دیوار پر لگانے والا کاغذ ہوں اور وہ بھی ایسا جو اکھڑ کر گرنے کے قریب ہو۔ چند ایک مرد میرے پاس آئے۔ انہوں نے مجھے شستہ گفتگو میں معروف کرنا چاہا اور پھر آگے بڑھ گئے۔ وہ اس رات کے لیے اپنے مجلسی آداب کا کوٹا پورا کر چکے تھے۔

گھبراہٹ کے عالم میں میں نے اپنے لباس پر کوک گرا لیا۔ ہمایوں بیگ محمد میری مدد کو پہنچے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کوکا کولا کو بوتلوں میں بھرنے کا ٹھیکا انہیں کے پاس تھا۔ وہ مجھے جتوئی صاحب کے غسل خانے تک چھوڑ آئے جہاں میں نے دھبے کو دھویا۔ پھر میں ایک ایئرکنڈیشنر سے چمٹ کر دعا مانگتی رہی کہ میرا لباس صرف سوکھے ہی نہیں بلکہ ہوا میں تحلیل بھی ہو جائے۔ اگر کسی سنڈریلا کو منہ بولی پری ماں کی ضرورت تھی تو اسی لمحے تھی۔ پری ماں کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ میں ٹہلتی ٹہلتی واپس لوٹی۔ ابھی تک تربتر اور بہت خفت زدہ۔

میں گلاس کو سینے سے لگائے کھڑی رہی۔ مجھے سخت بے چینی یہ تھی کہ کسی طرح گلاس کی مدد سے سٹکر پر بنی ہوئی گائے کو چھپائے رکھوں۔ لیکن میں چاہے کسی بھی زاویے سے گلاس کو جھکاتی گائے کی دم مجھ سے بازی لے جاتی اور میری ناکام کوشش پر مکھیاں اڑانے کے انداز میں ہلتی رہتی۔ مصطفےٰ نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ مجھے گھر چھوڑ آئے۔

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint

اس رات میں نے رو رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔ میری بڑی بری حالت تھی۔ سارا قصور میرے لباس کا تھا۔ میری سہیلی ٹھیک کہتی تھی۔ مصطفےٰ مجھ سے صرف اس لیے محبت کرتا تھا کہ میں اچھے ذوق کی مالک تھی۔

اس نے اگلی صبح فون کیا۔ مجھے بتایا کہ لباس پہننے کا سلیقہ معنی رکھتا ہے۔ جو کچھ میں نے کیا تھا وہ سراسر میرے مزاج کے الٹ تھا۔ "تم یہ حرکتیں کیوں کرتی رہتی ہو؟ مجھے بھی خفت اٹھانی پڑتی ہے اور تم بھی شرمسار ہوتی ہو۔ تم اپنے طور پر مجھے پیاری لگتی ہو۔ تم بہت باوقار عورت ہو۔ وقار سے گری ہوئی کوئی حرکت کرنے کی کوشش میں تم خود کو مضحکہ خیز بنا لیتی ہو۔ تم اس طرح کے فضول چیلنج قبول کرتی مت پھرو۔ مجھے تم سے محبت ہے، تم جیسی بھی ہو۔ تمہیں خود کو بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر تم کوئی بالکل مختلف فرد بن گئیں تو شاید میں بھی اپنا ذہن بدل لوں۔ سمجھیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟" میں نے بسورتے ہوئے کہا "ہاں"۔ "دیکھو، اگر میں کسی مسخرے یا بھانڈ کا لباس پہن کر تمہیں لینے آؤں تو کیا میرا حلیہ تمہارے لیے قابل قبول ہوگا؟ کبھی نہیں۔ مجھے دیکھ کر تم سٹپٹا جاؤ گی۔ اس لیے بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ جیسی ہو ویسی رہو۔"

میرے بیہودہ لباس سے قطع نظر، جتوئی صاحب کے ہاں یہ ڈنر پارٹی ایک اور وجہ سے بھی معنی خیز ثابت ہوئی۔ میری موجودگی کا نوٹس لیا گیا۔ کراچی افواہوں سے بھنبھنانے لگا۔ یہ تہمینہ مصطفےٰ کھر کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ ابھی بائیس برس کی تو ہے۔ میاں سنگاپور گیا ہوا ہے۔ یہ دونوں کھلم کھلا عشق لڑا رہے ہیں۔

انیس لوٹا تو یہ سب کچھ اس کے سننے میں آیا۔ اس نے مجھ سے دوبدو بات کی۔ اس کے ساتھ مزید جھوٹ بولتے رہنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اپنے آپ کو ابتلا سے چھٹکارا دلانے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ انیس کو ابتلا میں ڈال دیا جائے۔ میں نے اسے ہر بات بتا دی۔ میں نے کہا کہ مجھے طلاق دی جائے۔ میں اس سے بے وفائی کرتی رہی ہوں۔ میں نے انیس کو بتایا کہ ہماری شادی کو ختم سمجھو۔ اس بات کی اب کوئی اہمیت نہ تھی کہ مصطفےٰ سے شادی کروں گی یا نہیں کروں گی۔ میں طلاق لینا چاہتی تھی۔ میں ایسے مرد کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی جسے میں نے دھوکا دیا تھا۔

انیس کا ردعمل انیس جیسا تھا۔ بحران کے اس لمحے میں بھی نہایت مہذب۔ اس نے بڑی سمجھ بوجھ اور رواداری کا ثبوت دیا۔ کہنے لگا کہ وہ مجھے طلاق دے دے گا۔ وہ مجھ سے صرف یہ چاہتا تھا کہ ہماری بیٹی تانیا کو اس کی تحویل میں دے دیا جائے۔ "مجھے تانیا کی ضرورت ہے۔ اس کے سوا میرا ہے کون۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ عورت یاد آتی رہے گی جس سے مجھے محبت ہے۔ تم عدالتوں سے رجوع کر کے تانیا کو واپس لے سکتی

ہو۔ لیکن مہربانی کر کے اس وقت تک اسے میرے پاس رہنے دو جب تک میں اس صدمے سے سنبھل نہ جاؤں۔ تم دونوں میرے پاس نہ ہو گی تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ تم سے میرا بس اتنا ہی تقاضا ہے۔"

اس شخص کی باتوں نے میرے دل پر اثر کیا۔ انیس اچھا آدمی تھا۔ بہت مہربان آدمی تھا۔ محبت کرنے والا باپ تھا۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ اپنی بیٹی اس سے چھین لوں۔ میں نے اس کی درخواست مان لی۔ اس نے مجھے طلاق دے دی۔ میں بائیس برس کی عمر میں مطلقہ ہو گئی۔

کراچی میں میری بہن کا گھر میری اولین پناہ گاہ بنا۔ میرے اہل خاندان کو میری ناہنجاری سے سخت صدمہ پہنچا۔ امی پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ والد صاحب کے طیش کی انتہا نہ رہی۔ اس واقعے سے جانے پہچانے سماجی حلقوں میں جو ہلچل مچی اس کا سامنا کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ امی لندن سے فوراً کراچی پہنچیں۔ انہیں یقین تھا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنے پر تلی بیٹھی تھیں کہ مصطفےٰ پر میرا دیوانہ وار فریفتہ ہونا کسی طرح کے ذہنی اختلال کا نتیجہ ہے۔ مجھے ڈاکٹر ہارون احمد کے پاس لے جایا گیا جو کراچی میں نفسیاتی علاج کے ایک سربرآوردہ ماہر تھے۔ ان سے کہا گیا کہ پتہ چلائیں کہ میں ایک ٹھگ کے عشق میں کیوں مبتلا ہوئی اور جو وجوہ سامنے آئیں ان کا تجزیہ کریں۔

ڈاکٹر ہارون مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ خوش قسمتی سے مجھے کاؤچ پر لیٹنے کے لیے نہیں کہا گیا۔ کہنے لگے کہ انہیں سب کچھ بتایا جائے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے مجھ سے چند سوال کیے۔ سیشن کے اختتام تک ہم نے سارے تعلق کا تجزیہ کر کے ہنڈی کی چندی کر ڈالی۔ وہ بعض باتیں لکھتے رہے۔ انہوں نے امی کو بتایا کہ میں نارمل ہوں۔ امی مایوس نظر آئیں۔ ان کا خیال تھا کہ میری بے راہ روی بچپن میں MENINEITIS میں مبتلا ہونے کے اثرات مابعد کا شاخسانہ ہے۔ یہ خیال بالکل غلط نکلا۔

ڈاکٹر ہارون نے میرے بگڑنے کا الزام مصطفےٰ پر دھرا۔ انہوں نے فیصلہ سنایا۔ "مصطفےٰ کھر عورتوں کو پھنسانے میں پیشہ ورانہ مہارت رکھتا ہے۔ آپ کی بیٹی اس کے جال میں آ گئی۔"

امی کو نفسیاتی معالجوں پر بڑا اعتقاد تھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مجھ پر مصطفےٰ جیسے "بازاری زندگی" گزارنے والے کا جادو کیسے چل گیا۔ وہ تو "اخلاق باختہ عورتوں" کا، بگڑی ہوئی عورتوں کا شکار کھیلتا تھا۔ اگر اسے مجھ پر ناشائستہ ہونے کا گمان نہ گزرتا تو وہ کبھی مجھے پھانسنے کی کوشش نہ کرتا۔ امی کا کہنا تھا کہ میں نے کسی طرح مصطفےٰ کو یہ باور

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کرا دیا تھا کہ میں دستیاب ہوں۔ جس بدنصیبی نے میری شہرت کو داغ دار کیا تھا اس کے لیے قصوروار میں خود تھی۔ یہ سب کچھ اس لیے پیش آیا کہ میں نے کسی خاص اور معنی خیز انداز سے مصطفیٰ کی طرف دیکھا ہو گا۔ "تمہارا انگ انگ کہہ رہا تھا کہ آؤ میں تمہاری دسترس میں ہوں۔ میری کوئی دوسری بیٹی اسے اپنے پاس پھٹکنے تک نہ دیتی۔" ان کا یہ خیال کتنا غلط نکلا۔

نفسیاتی معالج نے مجھے بے قصور قرار دیا تھا۔ میری برت سے امی کی اتنی تشفی تو ہوئی کہ چلو آبرو بحال ہو گئی۔ میں کوئی گئی گزری فاحشہ نہ نکلی۔ مجھے پھسلا کر خراب کیا گیا تھا۔ اب میری باگ ڈور امی نے سنبھال لی۔ وہ میرے جذبات کو قابو میں رکھ کر اس امر کو یقینی بنائیں گی کہ میں راہِ راست سے باردگر نہ بھٹکوں۔ جو نقصان ہونا تھا ہو گیا، مزید نہ ہو۔

مجھے لاہور نانی کے پاس بھیج دیا گیا۔ میری نگرانی کی جا رہی تھی۔ میں اپنی مرضی سے کہیں آ جا نہ سکتی تھی۔ مجھے کسی کو فون کرنے یا کسی کا فون سننے کی اجازت نہ تھی۔ اپنی سہیلیوں سے ملنے پر بھی پابندی عائد تھی۔ چنانچہ کسی کو چوری چھپے پیغام بھجوانا بھی خارج از امکان ٹھہرا۔ مجھے بالکل الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ ایسے حالات میں ذہن کچھ زیادہ ہی فعال ہو کر نت نئی ترکیبیں گھڑنے لگتا ہے۔ مصطفیٰ اور میں کبھی کبھار اس نرغے کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتے۔

میری اگلی منزلِ مقصود پشاور تھا۔ صوبۂ پنجاب سے باہر۔ وہاں میں نے اپنے چچا کے پاس قیام کیا۔ پشاور میں بھی حفاظتی انتظامات غیر تسلی بخش پائے گئے۔ چنانچہ مجھے اپنے آبائی گاؤں چارسدہ بھجوا دیا گیا۔ یہاں میں سچ مچ قیدی بن کر رہی۔ باہر کی دنیا کا دروازہ، اپنی تمام ترغیبات کے ساتھ، مجھ پر مکمل طور سے بند کر دیا گیا۔ میں دن بھر بیٹھی انتظار کرتی رہتی۔ میرے والدین انگلینڈ میں تھے۔

غور کرتی ہوں تو ان سب پابندیوں کو چپ چاپ مان لینے کی صرف یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ میں والدین کے اختیار سے خائف تھی۔ انیس کی بیوی ہوتے ہوئے میں راہ راست سے بھٹک کر عشق لڑاتی رہی تھی۔ شادی کے وقت اپنے میاں کی وفادار رہنے کے جو قسمیہ وعدے میں نے کیے تھے میرا شوہر، اپنے رعب اور اختیار کے باوجود، مجھ سے ان کی پابندی نہ کرا سکا تھا لیکن اپنے والدین کے دوبارہ نمودار ہوتے ہی میں پھر سے ایک چھوٹی لڑکی میں تبدیل ہو گئی۔

انیس مجھ سے ملنے پشاور آیا۔ میں نے خود کو مجرم محسوس کیا۔ میں نے اسے اور خاص طور پر اس کے گھر والوں کو تکلیف پہنچائی تھی جو میرے ساتھ بہت شفقت اور

محبت سے پیش آتے رہے تھے۔ گھر والے انیس کی بے حسی پر پریشان تھے۔ اسے الزام دیا جا رہا تھا کہ اس نے مجھے ایک "برے آدمی" کے سامنے کھلا کیوں چھوڑ دیا۔ "وہ تمہارے گھر سکول کی یونیفارم میں آئی تھی۔ وہ بھولی بھالی تھی۔ تم نے اسے ایک ایسی صورتحال میں جھونک دیا جو نہ تم سے سنبھالی گئی نہ اس سے۔" یہ الفاظ اس کی والدہ کے تھے۔

میں تو بری الذمہ ٹھہری۔ سارا ملبہ انیس پر ڈال دیا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ انصاف نہیں۔ ہر بار جب مصطفیٰ یہ کہتا تھا کہ انیس اتنا مرد آدمی نہیں کہ اپنی بیوی کو قابو میں رکھ سکے تو میں اس طرح دبک جاتی جیسے مار کھانے سے خود کو بچا رہی ہوں۔ اس بات سے "بطور بیوی" میری کچھ اچھی تصویر سامنے نہ آتی تھی۔

انیس پشاور مجھ سے ملنے آیا تو ملاقات کے دوران مجھے اس کی شخصیت کا دوسرا رخ دیکھنے کو ملا۔ میں کوئی چیز ساتھ لیے بغیر گھر سے نکل آئی تھی۔ میرا سارا جہیز، زیورات، جواہرات، کراکری اور کٹلری گھر رہ گئی تھی۔ میں نے مادی اشیاء کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ مجھے اداسی تھی تو یہ کہ وہاں سے اٹھا کر ساتھ لانے کے لیے اتنی کم یادیں میرے پاس تھیں۔ انیس کو مادی چیزوں کا زیادہ خیال تھا۔ "تمہارے گھر والے مجھ سے تمہارے سارے سازوسامان کا تقاضا کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ بہت گری ہوئی بات لگتی ہے۔ اگر میں سب کچھ لوٹا دوں تو میرے گھر میں جھاڑو پھر جائے گی۔ میری رائے میں یہ غیر منصفانہ بات ہے۔" میں اس کا کرب محسوس کر سکتی تھی۔ میں نے اسے تقریباً ہر چیز سے محروم کر دیا تھا۔ میرے لیے کم از کم اتنا تو ممکن تھا کہ اپنی چیزیں اس کے نام کر دوں۔ میں بیٹھ گئی اور اس نے میرے تمام مال و متاع کی فہرست قلم بند کر ڈالی۔ کہنے لگا کہ میں یہ لکھ کر دستخط کر دوں کہ میں نے اپنی تمام چیزیں اس کے ہاتھ فروخت کر دی ہیں۔ اس نے ہر چیز کے سامنے قیمت درج کر دی تھی۔ میں نے دستخط کر دیے۔ اس نے کبھی ایک دھیلا بھی ادا نہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح اس کے نقصان کی تلافی ہو گئی ہے۔ مجھے یوں لگا کہ میری خطا کا کچھ حصہ دھل کر صاف ہو گیا۔ کتنی ذرا سی بات سے آدمی خوش ہو جاتا ہے۔ کتنی ذرا سی بات سے آدمی کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔

میری نظر میں انیس کی توقیر کم ہو گئی۔ اس کے احترام میں مزید کمی اس وقت آئی جب وہ چاندی کی کٹلری کی قیمت پر بھاؤ تاؤ کرنے لگا۔ اس پر بحث شروع کر دی کہ کٹلری کی اصل قیمت کیا ہے۔ میں نے اس کی من مانی قیمت پر صاد کر دیا۔ میں حیران تھی کہ جب اس نے ادائیگی مجھے بہرحال نہیں کرنی تو قیمت کی کمی بیشی سے کیا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

فرق پڑتا ہے۔ میں تھوڑی سی اداس ہو گئی۔ وہ کاغذ کے ایک پرزے سے لیس ہو کر رخصت ہوا جیسے وہ دخل در معقولات کا شوقین دنیا کی ناک کے آگے نچا سکتا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ تانیا کو میرے پاس بھیج دے گا۔

کراچی میں، میں نے ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ کرائے پر لیا۔ آزمائش کی اس گھڑی میں فاروق حسن اور ان کی بیگم نے مجھے سہارا دیا۔ ان کی مہربانی کے بارے میں جو کہوں تھوڑا ہے۔ میں فاروق حسن کے پاس، ان کی کنسٹرکشن کمپنی میں، ملازم ہو گئی۔ لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ ہمارے معاشرے میں مطلقہ عورت خباثت آمیز بے پر کیوں کا خاص الخاص نشانہ بنتی ہے۔ میں کام کرتی رہی اور گوشہ نشین ہو گئی۔

تانیا میرے پاس تھی۔ اس نے سکول جانا شروع کر دیا تھا۔ کراچی میں رہتے ہوئے پانچ مہینے ہو گئے تھے کہ میرے سننے میں آیا کہ شیری حاملہ ہو چکی ہے! میں نے بڑی سبکی محسوس کی۔ مصطفےٰ سے بات کی تو وہ اپنی بے گناہی کے حق میں دلیلیں پیش کرنے لگا۔ اس کا کیس بہت کمزور تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے رابطہ مکمل طور پر منقطع کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ قصہ ختم ہوا۔

میرے سننے میں یہ بھی آیا کہ مصطفےٰ نے کسی گانے والی سے تعلقات قائم کر لیے ہیں۔ مصطفےٰ نے اس بات سے بھی انکار کیا۔ میرا جی خاصا برا ہوا۔ ہم نے مزید پانچ ماہ کے لیے تعلقات توڑ لیے۔ رابطے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

مجھے کو پاک صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی طلبگار تھی۔ میں نے عمرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں مکہ معظمہ چلی گئی۔

وہاں خانہ کعبہ کے روبرو کھڑے ہو کر میں نے دعا مانگی۔ آنسو بہائے۔ الٰہی، میں نہیں چاہتی کہ "حرافہ" کہلاؤں۔ میں راہ راست سے بھٹک گئی تھی۔ میں تیری مغفرت کی جویا ہوں۔ مجھے اتنا حوصلہ بخش کہ اپنی آبرو بحال کر سکوں۔ اس آدمی کے ساتھ میرا تعلق "گھٹیا" قسم کا تھا۔ مہربانی فرما کر مجھے سیدھی راہ دکھا۔ ان چار ہاتھ کی زبانوں کو لگام دے جو میرے خلاف زہر اگلتی رہتی ہیں۔ ان انگلیوں کو روک جو میری طرف اٹھتی رہتی ہیں۔

وہاں خدا کے حضور میں کھڑے کھڑے مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ میری بری طرح پامال شدہ نیک نامی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ میں اس آدمی سے شادی کر لوں۔ میرے لیے ایک یہی شریفانہ طریقہ بچا تھا۔ مصطفےٰ کھر نے میرے منہ پر کالک مل دی تھی۔ مجھ پر اس کی چھاپ لگ چکی تھی۔ میں ان بہت سی عورتوں میں سے ایک تھی جن

سے وہ متمتع ہو چکا تھا۔ اس داغ کو صرف شادی کے ذریعے ہی دھویا جا سکتا تھا۔ معاشرہ مجھے صرف اس کی بیوی کے روپ میں قبول کرے گا۔ میں نے اللہ سے دعا کی کہ میرے لیے کوئی معجزہ کر دکھائے۔ میں اس شخص سے شادی کرنے کے لیے تڑپ رہی تھی جس نے میرے نام کو بٹا لگایا تھا۔

جیسے ہی میں کراچی پہنچی معجزہ ظہور میں آ گیا۔ مصطفےٰ کا فون آیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ کراچی آنے والا تھا۔ اسے کوئی اہم بات کرنی تھی۔

مصطفےٰ اب گورنر نہ تھا۔ وہ بھٹو صاحب کے امیدوار کے خلاف ضمنی انتخاب لڑ چکا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کا دشمن نمبر ایک تھا۔ اس کا ہر وقت پیچھا کیا جاتا تھا۔ انٹیلی جنس کی ایجنسیاں اس پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھیں۔ وہ گرفتاری اور قید و بند سے بچتا پھر رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر سیاست میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے وزیراعظم سے ٹکر لی تھی۔ اس کے پاس دل لگانے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ بات میری سمجھ میں آ گئی۔

وہ اپنی کار کی ڈگی میں چھپ کر میرے گھر پہنچا۔ یہ عیاری سی آئی ڈی والوں کو چکما دینے کے لیے ضروری تھی۔ کہنے لگا کہ مجھ سے شادی کرو۔ فوراً۔ میں ہچکچائی۔ اس نے کہا کہ وہ جواب میں انکار نہیں سننا چاہتا۔ "میں لاہور واپس جا رہا ہوں۔ تم وہاں پہنچو۔ میں انتظار کر رہا ہوں گا۔ ہم فوراً شادی کر لیں گے۔"

میرے پاس کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے دو دن تھے۔ میں ان دو دنوں میں مصطفےٰ کی اچھائیوں برائیوں کو جمع تفریق کر کے فرد حساب مرتب کرتی رہی۔ بالآخر میں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ میں چاہتی تھی کہ جس طوفان نے میری زندگی کو گھیرے میں لے رکھا تھا وہ فرو ہو جائے۔ شادی ہی واحد راستہ تھا۔ اس وقت مجھے کیا خبر تھی کہ طوفان میری زندگی کے اگلے پندرہ برس تک اسی شدت سے برپا رہے گا۔

میں بذریعہ طیارہ لاہور پہنچی۔ تانیا کو انہیں کے پاس چھوڑ آئی۔ میں نے وعدہ کیا کہ تین دن میں لوٹ آؤں گی۔ یہ ایسا وعدہ تھا جو میں وفا نہ کر سکتی تھی۔

ہم مصطفےٰ کے گاؤں، کوٹ ادو، چلے گئے اور وہاں مکمل رازداری میں، 25 جولائی 1976ء کو، ایک قابل اعتماد قاضی نے ہمارا نکاح پڑھا دیا۔

مصطفےٰ نہایت خوشگوار موڈ میں تھا جیسے اسے میری دلجوئی منظور ہو۔ میں اب اس کی ملکیت تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور نہایت خلوص سے ہمارے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ "تہمینہ، تمہیں مجھ سے ڈرنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ تم پر لازم ہے کہ ہر معاملے کے بارے میں میرے ساتھ تبادلہ خیال کرو۔ جب تمہارا دل چاہے۔ میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا اور تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آؤں گا۔"

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں بہت خوفزدہ تھی۔ میں نے نامعلوم کی طرف ایک بہت بڑا قدم اٹھایا تھا۔ میں اپنی بیٹی کی وجہ سے سہمی ہوئی تھی۔ مصطفےٰ نے کہا کہ تانیا آ کے ہمارے ساتھ رہ سکتی ہے۔ میرے دل سے بوجھ اتر گیا۔ مصطفےٰ کا رویہ ہمدردانہ تھا اور وہ یہ ثابت کر رہا تھا کہ اسے میری ضرورتوں کا شدت سے احساس ہے۔ ہم بذریعہ کار لاہور چلے آئے۔

میں کراچی میں اپنے نکاح نامے کو ڈھال کی طرح اٹھائے اٹھائے پھری۔ میں نے خود کو محفوظ محسوس کیا۔ سامان پیک کیا۔ تانیا کو لیا۔ مجھے ایک فیصلہ اور کرنا تھا۔ میں ابھی تک اس بارے میں غیریقینی کا شکار تھی کہ لاہور میں رہنے سہنے کا کیا بندوبست ہو گا۔ مجھے یقین نہ تھا کہ آیا ہماری شادی راز رہے گی یا نہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ شادی کا اعلان ہونے تک تانیا کو انیس کے پاس چھوڑے جاتی ہوں۔ مصطفےٰ نے فون کیا۔ ہمارا الگ الگ رہنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ مجھے اپنے منصوبوں میں قطع برید کر کے واپس لاہور جانا پڑا۔ جو اس کا حکم وہی میری اِچھا۔

انیس کو شادی کا سب سے پہلے پتہ چلا۔ وہ پریشان تو ہوا مگر راضی ہو گیا کہ جب میں گھر بسالوں گی تو اس وقت تانیا کو ساتھ لے جاؤں گی۔ تانیا دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ جب میں طیارے میں لاہور جا رہی تھی تو اس کی سسکیوں کی گونج ابھی میرے ذہن میں باقی تھی۔

ہوائی اڈے پر میاں ساجد پرویز مجھے لینے آئے۔ میں ان کے گھر میں چھپی رہی۔ اگلے دن مصطفےٰ اور میں کار سے ملتان روانہ ہوئے۔ چند ماہ کے لیے میرا پڑاؤ ملتان میں رہا۔ میں بالکل گوشہ نشین رہی۔ نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ گھر کا حلیہ درست کرنے کی کوشش میں وقت گزارتی رہی۔ میں نے کراچی سے اپنا فرنیچر ٹرک کے ذریعے منگا لیا۔ میں کچھ مدت کے لیے ہماری شادی کو خفیہ رکھنے پر آمادہ ہو گئی۔ بھٹو صاحب کے یار دوستوں کو اگر مصطفےٰ کی اس تازہ ترین لگاوٹ کی خبر ہو گئی تو کتنے خوش ہوں گے۔ اس طرح کی خبر ہاتھ آ جائے تو اور کیا چاہیے۔ گھٹیا قسم کی صحافت کو کھلی چھٹی مل جائے گی کہ جو چاہے چھاپے۔ شیری ابھی اس کی بیوی تھی۔ وہ سکینڈل کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔

مصطفےٰ موجی بندہ تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے میری زندگی میں معمول کا پیدا ہونا یا ٹھہراؤ آنا کب ممکن تھا۔ وہ یہ کہہ کر لاہور کے لیے روانہ ہوتا کہ ہفتے بھر باہر رہے گا اور اسی رات لوٹ آتا۔ مسلسل سفر کرنے سے اس کی صحت پر اثر پڑ رہا تھا۔ وہ ہماری شادی کو بے نقاب کرنے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ مجھ سے دُور رہنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ میری باتیں سنتا رہتا۔ لاہور روانہ ہوتا اور پھر اسی رات ملتان لوٹ آتا۔ کہتا تھا کہ چھ گھنٹے کا یہ سفر سراسر فائدے کا سودا ہے کہ

پھر تمہارے پاس آ جانے کا موقع ملتا ہے۔

ہم ماہ عسل کی بہار لوٹ رہے تھے کہ رمضان آ گیا۔ دونوں روزے سے تھے۔ مصطفےٰ پلاؤ تیار کر رہا تھا۔ مجھے کھانا پکانے کی تربیت بھی دی جا رہی تھی۔ وہ اپنی طباخی میں پوری طرح منہمک تھا اور تڑاق پڑاق ہدایات جاری کر رہا تھا۔ "لونگیں لا کے دو اور دارچینی بھی۔" میرے چھکے چھوٹ گئے۔ مجال ہے جو کچھ پلے پڑا ہو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا چاہیے۔ وہ میری جہالت پر واضح طور پر جھنجھلایا۔ مجھے اس کی جھنجھلاہٹ سے دوچار ہونے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ اسے توقع تھی کہ مجھے ان باتوں کا پتہ ہو گا۔

ہم لاہور چلے آئے۔ یہ فیصلہ مصطفےٰ کا تھا اور جب فیصلہ اس کا ہو تو کچھ کہنے سننے کی گنجائش کہاں رہتی تھی۔ کنال کے کنارے پر اس کا لمبا چوڑا گھر تھا۔ گھر کے احاطے میں ایک پری فیبری کیٹڈ کیبن تھا۔ اس کیبن میں مجھے رہنا تھا۔ یہ جگہ میری جانی پہچانی تھی۔ یہیں پر مصطفےٰ اور میں اپنے ناجائز میل ملاپ کو جاری رکھنے کے لیے ملا کرتے تھے۔ اب ہم یہاں میاں بیوی کے طور پر ملیں گے۔ ہمارا میل ملاپ اب بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

اس کیبن سے بہت سے یادیں وابستہ تھیں۔ میں نے یہاں بطور سامع کتنے ہی مجروں میں شرکت کی تھی۔ مصطفےٰ اس سے خلوت گاہ کا کام لیتا تھا۔ میں نے تھوڑی سی بے آرامی محسوس کی۔ میں معاشرے میں اس کی منکوحہ کے طور سے پہچانی جانے کے لیے ترس رہی تھی۔

میرا شوہر دن کے وقت میرے پاس رہتا۔ اس کی دوسری بیوی بالکل مگن بیٹھی تھی۔ اسے قطعاً علم نہ تھا کہ گھر میں کوئی مہمان بلکہ سوتن موجود ہے۔

ایک رات مصطفےٰ کے جانے کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ مصطفےٰ نے آ کر مجھے جگایا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ شیری اس کے ساتھ تھی۔ مصطفےٰ نے مجھ سے شادی کی خبر اپنی حاملہ بیوی کو سنا دی تھی۔ شیری کو اس کے کہے پر اعتبار نہ آیا تو وہ اپنے اعتراف کو ثابت کرنے کے لیے اسے ساتھ لے آیا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا وقت پھر آ گیا۔ میں بڑے گھر میں منتقل ہو گئی۔ مصطفےٰ اور اس کی دو بیویاں۔

یہ خندہ آور صورتحال تھی۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میں دوسری بیوی ہوں اور یہ کہ میں نے اپنی اس حیثیت کو قبول کر لیا ہے۔ مجھے اس بارے میں بڑی فکر رہتی کہ وہ میرے ساتھ کتنا وقت گزارتا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ شیری کو نظرانداز کرے۔ یہاں کسی کا منظورِ نظر بن کر رہنے کی گنجائش نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام وقت مجھ پر جرم کا احساس، بے آرامی کا احساس غالب رہتا۔ جب وہ شیری کی موجودگی میں میرا ہاتھ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تھام لیتا یا کسی اور طرح سے لگاوٹ کا اظہار کرتا تو میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتی کہ شیری یہ سب دیکھ رہی ہے۔ میں شیری کو دکھ پہنچانا نہ چاہتی تھی۔ میں اس کی تکلیف کو محسوس کر سکتی تھی۔ میں کبھی بھلا نہ سکتی کہ وہ حاملہ ہے اور اس وجہ سے مجھے لگتا کہ میری بے عزتی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

رات کے وقت مجھے مصطفیٰ کو کمرے سے دھکیل کر باہر نکالنا پڑتا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ شیری کے پاس چلا جائے۔ وہ مجھ پر ہنستا۔ مجرم ضمیر کے ہوتے ہوئے اپنے شوہر کے ساتھ سونا میرے لیے ناممکن تھا۔ مصطفیٰ مکمل بے یقینی کے عالم میں سر جھٹکتا ہوا میرے بستر سے اٹھ کر چلا جاتا۔ کسی اور عورت کی تلخ کامی کا بوجھ اٹھائے پھرنے پر میں اکیلی رہنے کو ترجیح دیتی۔

شیری مجھ سے کھل کر باتیں کرنے لگی۔ وہ مجھے مصطفیٰ کے بارے میں کہانیاں سناتی۔ وہ ڈراؤنی کہانیاں معلوم ہوتیں۔ ان میں مصطفیٰ سادیت پسند کے روپ میں سامنے آتا۔ ایک کج مج شخص جو انہیں کی تذلیل کر کے لذت حاصل کرتا جن سے محبت کرنے کا اسے دعویٰ تھا۔ شیری کہنے لگی کہ وہ کمتری کے کمپلیکس کا مارا ہوا ہے۔ ہمارے سماجی پس منظر سے تعلق رکھنے والی عورتیں اسے زہر لگتی ہیں۔ وہ ان سے چڑتا ہے اور اس کا مشن یہی ہے کہ ایسی عورتوں کو محکوم بنا کر رکھا جائے۔ جاگیردارانہ انداز اپنا کر اپنے طبقاتی حسد کو چھپائے رکھتا ہے۔ بھونڈا آدمی ہے۔ ہمارے طبقے سے اس لیے ناراض ہے کہ ہم اسے اپنے برابر جگہ دینے کے روادار نہیں۔ ہم نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔ جن سیاسی آدرشوں کا وہ قائل ہے وہ اس کے جذبۂ انتقام کے آئینہ دار ہیں۔ غریبوں اور پامال طبقوں کے لیے اس کی فکرمندی محض دکھاوا ہے۔ اس فکرمندی پر فوقیت اس نفرت کو حاصل ہے جو اسے سوسائٹی کے چیدہ طبقے سے ہے۔ وہ اس سماجی ڈھانچے کو تہس نہس کر ڈالنا چاہتا ہے جو اس کے حسب نسب کا تحقیر سے ذکر کرتا ہے اور یہ دیکھ کر ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں تربیت اور شائستگی کی کمی ہے۔ وہ سب سے واضح طور پر عورتوں کو نشانہ بناتا ہے۔ وہ ہمیں اور ہمارے اعتماد کو خاک میں ملانے پر تلا ہوا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ سنا اور ذہن میں محفوظ کر لیا۔ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات مجھے یہ سمجھنے کے قابل بنا دیں گے کہ کون سی بات سچ تھی اور کون سی محض ایک ٹھکرائی ہوئی عورت کی ہرزہ سرائی۔

مصطفیٰ شکار کھیلنے چلا گیا۔ میں تو بالکل ویران ہو کر رہ گئی۔ شیری بڑی خوش تھی کہ وہ گھر سے دفع تو ہوا۔ جوں جوں اس کی واپسی کا وقت قریب آتا گیا میں شگفتہ ہوتی گئی کہ دوبارہ ملاقات ہونے والی ہے۔ شیری واضح طور پر ناخوش دکھائی دی۔ دو بیویاں

اپنے شوہر کے حوالے سے ایسے جذباتی ردِعمل ظاہر کر رہی تھیں جنھیں ایک ہی طیف کی دو انتہاؤں کو چھو کر بھی چین نہ تھا۔

میرے مشاہدے میں آیا کہ وہ شیری سے اس طرح پیش آتا جیسے اس کا صبر جواب دینے کو ہے۔ وہ اس سے انتہائی اہانت آمیز سلوک کرتا اور نہایت گندی گندی گالیاں دیتا۔ ایسے بیہودہ الفاظ میں نے کبھی نہ سنے تھے۔ میرے کان جلنے لگتے۔ میں نے محسوس کیا کہ مصطفیٰ کا رویہ غیر معقول ہے۔ شیری کے پیٹ میں مصطفیٰ کا بچہ تھا۔ اسے سہارا دینے والا کوئی نہ تھا۔ مصطفیٰ شیری کو یہ یاد دلاتا رہتا کہ اسے بچانے کے لیے کوئی آگے نہ آئے گا۔

ایک صبح مصطفیٰ نے شیری سے اپنی ملٹی وٹامن گولیاں مانگیں۔ گولیوں کی یہ خاص برانڈ اس نے لندن سے منگائی تھی۔ شیری نے جو شیشی لا کر دی وہ آدھی خالی تھی۔ مصطفیٰ آگ بگولا ہو گیا۔ "باقی کہاں گئیں؟" "میں... میں نے... کھا لیں۔ مجھے ضرورت تھی... حاملہ ہونے کی وجہ سے..." مصطفیٰ نے بدلا لے کر چھوڑا۔ پہلے شیری کو ٹھوکر ماری اور پھر جوتے اتار کر اس کی ٹھکائی کی۔ اس کے بعد دھکے دے کر کمرے سے نکال دیا۔ میں دم بخود رہ گئی۔ صدمے کے مارے لرزتی رہی۔ مجھے اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ اپنے تنفر کا اظہار ہی کر سکوں۔

مجھے عجیب لگتا تھا کہ شیری نے میری موجودگی کو کسی چون و چرا کے بغیر قبول کر لیا ہے۔ میرے ساتھ اس کے رویے میں کوئی تکدر نہ پایا جاتا تھا۔ میں اکثر حیران ہوتی کہ میری وجہ سے اس کی زندگی میں جو خلل پڑا ہے وہ اس سے کیسے نمٹ سکے گی۔ مجھے بعد میں شیری کی زبانی پتہ چلا کہ میری موجودگی اس پر گراں کیوں نہیں گزرتی تھی۔ اسے پختہ یقین تھا کہ میرا قیام چند روزہ ہے۔ مصطفیٰ نے اسے بتایا تھا کہ میں صرف چند مہینے کے لیے آئی ہوں۔ اس نے مجھ سے شادی اس لیے کی تھی کہ مجھے اس واہیات طعنہ زنی سے تحفظ دے سکے جس کا میں ہر طرف سے نشانہ بن رہی تھی۔ میں جس مخمصے میں گرفتار تھی اس کا ذمے دار وہ خود کو سمجھتا تھا اور مجھ سے شادی کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مجھ پر گندگی اچھالنے کا سلسلہ ختم ہو۔ مصطفیٰ نے شیری کو بتایا تھا کہ میں چند مہینے بعد ملک سے باہر چلی جاؤں گی اور یہ کہ ہم میں چپ چاپ طلاق ہو جائے گی۔ شیری نے مصطفیٰ کے کہے پر یقین کر لیا کیونکہ وہ یہی کچھ سننا چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے کہنے لگی کہ اپنے غیر ملکی لباس یہیں میرے پاس چھوڑ جانا کیونکہ یہ پاکستان میں دستیاب نہیں۔ میں مصطفیٰ کے ان نرالے ہتھکنڈوں پر عش عش ہی کر سکتی ہوں۔

ہمیں یعنی ہم تینوں کو جب کبھی ڈنر پر جانا ہوتا تو مجھے جھجک آتی۔ ہم تینوں کے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کسی گھر میں ایک ساتھ قدم رکھنے کا میں تصور نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بات مجھے نادرست معلوم ہوتی۔ شیری کو کچھ پروا نہ تھی۔ وہ مصر تھی کہ ہمیں ایک خوش و خرم گھرانہ نظر آنا چاہیے۔ مصطفےٰ کے لیے تو ان باتوں میں جیسے کچھ رکھا ہی نہ تھا۔ مجھے لگتا جیسے یہ طور طریق جدید زمانے سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے اور ماضی کی یادگار ہیں۔ ہم باہر جاتے اور اسی ٹولے میں اٹھتے بیٹھتے جس سے ہمارا پہلے ملنا جلنا رہتا تھا۔ میں شیری کو زبردستی کار میں آگے مصطفےٰ کے ساتھ بٹھاتی۔ یہ سب خاصی اول جلول باتیں تھیں۔ میں خود کو بہت بیگانی محسوس کرتی اور شرم سے کٹ کٹ جاتی۔

ایک بار مجھے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ مصطفےٰ نے شیری سے کہا کہ مجھے ساتھ لے جائے۔ میں نے مصطفےٰ سے پوچھا کہ اپنا کیا نام بتاؤں کیونکہ ہماری شادی ابھی پردہ راز میں تھی۔ کہنے لگا کہ تم اپنا نام مسز مصطفےٰ کھر لکھواؤ۔ میں گڑبڑا گئی۔ شیری میرے ہمراہ تھی۔ میں اس کی بے عزتی نہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنا نام مصطفےٰ کی بیوی کے طور پر درج نہ کرایا۔

میں نے تو لحاظ کیا تھا۔ اس کا انعام یہ ملا کہ میرا راز فاش کر دیا گیا۔ شیری نے مصطفےٰ کو بتا دیا کہ میں بیوی ہونا چھپا گئی ہوں۔ میں نے حکم عدولی کی تھی۔ مصطفےٰ کو فوراً طیش آ گیا۔ وہ چیخ چیخ کر بولنے لگا اور مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا "کبھی میری نافرمانی مت کرنا۔ تمہیں وہی کرنا ہو گا جس کا میں تمہیں حکم دوں گا۔" اس کا لہجہ تند تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں آئندہ کبھی حکم عدولی کروں۔

تنبیہوں کا تانتا بندھا رہا۔ مصطفےٰ مجھ پر واضح کرتا جا رہا تھا کہ میں کیا کیا نہیں کر سکتی۔ اس کے ضابطۂ حیات میں ایسی باتیں بہت کم تھیں جنہیں کرنے کی اجازت ہو۔ ایک دفعہ اس نے مجھے طلب کیا۔ میں بیڈروم میں کپڑے بدل رہی تھی۔ مجھے کچھ وقت لگا۔ وہ برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایک بار اور طلبی کا پیغام بھجوایا۔ میں بے پروائی سے ٹہلتی ہوئی چلی آئی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ چہرے پر دیوانگی کے آثار ہیں۔ غصہ چڑھا ہوا ہے۔ آنکھیں، جن میں خون اتر آیا ہے، باہر ابلی پڑ رہی ہیں۔ کسی کو اتنا واضح غصہ آتے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ "تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ مجھے انتظار کرواؤ۔ تم نے آنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟ تمہاری یہ مجال۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ فوراً آؤ۔ میرے پیغام بھیجنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سارے کام چھوڑ کر دوڑتی چلی آؤ۔"

میں نے تاخیر کی وضاحت کرنی چاہی۔ میری وضاحت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اپنا منہ بند رکھو۔ میں نے اسے خلاف طبع حرکت سمجھ کر دل میں نہ رکھا۔ جو وقت ہم ساتھ گزارتے تھے وہ بالعموم کشیدگی اور غصے سے پاک ہوتا تھا۔ وہ بہت

پیار کرنے والا اور رومانی آدمی تھا۔

میں نے مصطفےٰ کو پہلی بار اندھا دھند تشدد پر اترتے اس وقت دیکھا جب شیری نے اس کے بیٹے کو سگریٹ پیتے پکڑ لیا۔ وہ غسل خانے میں گئی تو وہاں ابھی تک نکوٹین کی بو رچی ہوئی تھی۔ شیری نے مصطفےٰ کو بتا دیا۔ عبدالرحمن اس وقت انیس برس کا تھا۔

ہم اپنے بیڈروم میں بیٹھے تھے۔ بدنصیب سگریٹ نوش کو ملازموں سمیت طلب کیا گیا۔ مصطفےٰ نے بیٹے سے پوچھا کہ وہ سگریٹ پیتا رہا ہے۔ لڑکے نے جھوٹ بولا۔ مصطفےٰ اٹھ کھڑا ہوا اور ملازموں کو حکم دیا کہ لڑکے کو پکڑ کر زبردستی فرش پر لٹا دیا جائے۔ اسے فرش پر اس طرح لٹا دیا گیا کہ ٹانگیں اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ہاتھ پیر مار رہا تھا لیکن ملازموں نے اس کی ٹانگیں اور ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ مصطفےٰ نے اسے چھڑی سے مارنا شروع کیا۔

چھڑی پڑنے سے کھال چرنے کا ڈراؤنا چراہا سن کر میں پیچھے دبک گئی۔ چھڑی کمر پر لگ لگ کر ٹوٹی تو مصطفےٰ کو ایک اور چھڑی لا کر دی گئی۔ وہ بھی ٹوٹ گئی۔ ایک اور چھڑی آئی۔ لڑکا چلا چلا کر رحم کی التجا کرتا رہا۔ مصطفےٰ نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ لڑکے کو مارتا رہا۔ میں نے مداخلت کی کوشش کی۔ مجھے دھکا دے کر سامنے سے ہٹا دیا گیا۔

دس سال بعد اڈیالا جیل کے احاطے میں، ہم نے ایک ملتا جلتا منظر دیکھا۔ ایک قیدی کو ہاتھ پیر پھیلا کر زمین پر لٹایا ہوا تھا۔ وہی اذیت ناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اسی بے رحمانہ انداز میں قیدی کو مارا جا رہا تھا۔ مصطفےٰ نے نمودار ہو کر قیدی کو چھڑا لیا تھا۔

میں دم بخود رہ گئی۔ میں مضطرب ہونے میں حق بجانب تھی۔ عبدالرحمن اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اس کی سگریٹ نوشی پر کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہیے تھا۔ اتنا اس نے جرم نہیں کیا تھا جتنی زیادہ اسے مار پڑی تھی۔ اور جرم بھی کیا، محض الزام ہی تو تھا۔ اس تشدد سے میں لرز کر رہ گئی۔ مصطفےٰ نے اپنی صفائی میں وہی مقولہ دہرایا کہ بچے کو مارا پیٹا نہ جائے تو وہ بگڑ جاتا ہے۔ میں قائل نہ ہو سکی۔

مصطفےٰ اب اپنا ملمع اتار رہا تھا۔ میرے ساتھ تعلقات میں اب اسے تکلف سے کام لینے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس کی شخصیت کا تاریک تر پہلو ظاہر ہو چلا تھا۔

ہم تاج الملک کے گھر گئے ہوئے تھے۔ مصطفےٰ نے مجھ سے کہا تھا کہ کچھ رقم ساتھ لے چلنا۔ مجھے بیگ اٹھائے پھرنے کی عادت نہ تھی۔ میں بھول گئی۔ تاج الملک

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے ہاں پہنچے تو ٹولے نے فیصلہ کیا کہ کہیں باہر جا کر کھانا کھایا جائے۔ مصطفیٰ نے مجھ سے رقم طلب کی۔ میں نے کہا کہ وہ تو میں گھر بھول آئی۔ اس نے سب کے سامنے نہایت آمرانہ لہجے میں مجھ سے کہا "گاڑی میں بیٹھو، گھر جاؤ، رقم لو اور واپس آؤ۔" مجھے لگا جیسے میں اس کی زرخرید باندی ہوں۔ میں نے وہی کیا جو کرنے کا مجھے حکم دیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے ذلیل کیا گیا ہے۔

ایک بار مصطفیٰ شکار کھیلنے نکلا تو مجھے ساتھ لے گیا۔ وہاں ہمارے سننے میں آیا کہ شیری کے بچہ ہوا ہے۔ واپس آ کر مصطفیٰ اور میں ہسپتال اسے دیکھنے گئے۔ مصطفیٰ بیٹے کو گھر لے آیا۔ وہ خوشی سے جھوم رہا تھا کہ بیٹا ہوا ہے۔ وہ بچے کو اس کی دادی کے پاس لے گیا۔ دادی نے اسے ذرا سا شہد چٹایا اور کان میں اذان دی۔ وہ بچے کو واپس لے آیا۔ اسی رات بچے کی طبیعت بگڑ گئی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ اسے نمونیا ہو گیا ہے۔ وہ ایک کھلی کھڑکی کے پاس سویا رہا تھا۔ بچہ فوت ہو گیا۔

افواہیں گردش کرنے لگیں۔ مصطفیٰ پر بچہ کشی کا الزام لگا۔ شیری کے خاندان کا خیال تھا کہ الزام درست ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ الزام میں کوئی صداقت نہیں۔ مصطفیٰ نوزائیدہ بیٹے کو دیکھ کر سچ مچ خوش ہوا تھا اور اس کے فوت ہو جانے سے اسے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ ایک بار پھر مصطفیٰ کو اپنی شہرت کی وجہ سے خجالت اٹھانی پڑی۔ اس کے بارے میں جو کہا جاتا، لوگ ماننے کو تیار ہو جاتے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے ہی بچے کو ہلاک کرنے کے سفاکانہ اور بے رحمانہ فعل کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ میرا خیال اس کے برعکس تھا۔ لیکن میری رائے کی وقعت ہی کہاں تھی۔ جانبدارانہ رائے جو ہوئی۔ میں اس کی بیوی تھی اور عنقریب اس کی اکلوتی بیوی بننے والی تھی۔

شیری سے کہا گیا کہ گھر آنے کی زحمت نہ کرے۔ وہ اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ شادی ختم ہوئی۔ بگاڑ تو پہلے ہی آ چکا تھا، رہی سہی کسر بچے کی وفات سے پوری ہو گئی۔ مصطفیٰ اس سے ملنے گیا اور طلاق کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے۔

شیری اپنی چیزیں سمیٹنے کے لیے آئی۔ ہم اس سے الگ رہے۔ ہم چاہتے تھے کہ سارا گھر اس کی دسترس میں ہو، اکیلی جو چاہے کرے، جو چاہے اٹھا کر لے جائے۔ مصطفیٰ نے اسے بالکل نہ ٹوکا۔ جو شیری کا دل چاہا اسے لے جانے دیا۔ اس نے اپنے تمام زیورات اکٹھے کر لیے۔ پورے اسی کے اسی سیٹ۔ یہ زیورات اسے اس لیے پیش کیے گئے تھے کہ وہ پنجاب کے گورنر سے شادی کر رہی تھی۔ اس نے وہ تمام تحائف بھی ہتھیا لیے جو مصطفیٰ کو آنے والے مقتدر مہمانوں نے پیش کیے تھے۔ مجھے یاد ہے مصطفیٰ نے مجھ سے کہا تھا کہ چند ایک زیورات لے لو لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔

شیری کے تمام زیور میں نے ایک ٹرنک میں رکھوا دیے تھے۔ مجھے گوارا ہی نہ تھا کہ اس کی کوئی چیز پہنوں۔ میں مصطفیٰ کی زندگی میں بہت بعد میں آئی تھی، اس کے دورِ زوال کی ساتھی تھی۔

میرے ذہن پر تانیا سوار تھی۔ شیری رخصت ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ تانیا کو اپنے نئے گھر لانے کا وقت، آ گیا ہے۔ میں نے انیس کو فون کیا۔ یہ 18۔اکتوبر 1976ء کی بات ہے۔ انیس نے تانیا کو میرے پاس بھجوانے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا کہ میں اپنی بیٹی کو مصطفیٰ کھر جیسے موذی آدمی کے پاس رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس کے ہاتھوں بچے کی موت کی کہانی ہر طرف مشہور ہو چکی تھی۔ انیس نے بتایا کہ آئندہ مجھے تانیا کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

اگلی صبح آنکھ کھلی تو میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ تانیا کا سکول اسی دن کھلنا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری بچی کو کپڑے کون پہنائے گا؟ اس کا لنچ کون تیار کرے گا؟ مصطفیٰ غصے میں آ کر جاگا۔ "اگر تمہیں اپنی بیٹی سے اتنا ہی پیار ہے تو مجھ سے شادی کس لیے کی؟ تمہیں پتہ ہونا چاہیے تھا کہ جو قدم تم اٹھا رہی ہو اس کے نتائج کیا نکلیں گے۔ اب تانیا کے لیے آنسو بہا کر تم میری زندگی برباد نہیں کر سکتیں۔ اس کی خاطر رونے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں یہ بالکل نہیں دیکھنا چاہتا کہ آئندہ تم اسے یاد کر کے آنسو بہاؤ۔ کبھی نہیں۔ بالکل نہیں۔ سن لیا تم نے؟"

وہ بہت درشت ثابت ہو رہا تھا۔ مجھے اس آدمی سے خوف آنے لگا۔ اس کے لہجے میں ہمیشہ دھمکی کا رنگ ہوتا۔ اس بات کی تمہید کہ تشدد کا پورا پورا امکان موجود ہے۔ اس کے تیور سب کچھ بتا دیتے تھے۔ چہرے کی کیفیت میں طیش، تلخی اور دھمکی سب یکجان نظر آتے تھے۔

شادی کے دو ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ میں حاملہ ہو چکی ہوں۔ مصطفیٰ پیپلز پارٹی میں دوبارہ شمولیت کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ ہمارا بذریعہ کار اسلام آباد آنا جانا رہتا۔ ہم اندازہ لگاتے کہ مصطفیٰ کے سامنے عمل کی ایسی کون سی راہیں ہیں جن میں سے وہ کوچن سکتا ہے اور بھٹو صاحب کے دامن میں واپسی کی شرائط پر تبادلۂ خیال کرتے۔ اسے میرے حاملہ ہونے کا پتہ چلا تو خوش ہوا۔

ہم رات کے کھانے کے لیے میز پر پہنچے۔ مصطفیٰ پر بظاہر بے صبری کا غلبہ تھا۔ کھانا آنے میں پانچ منٹ کی تاخیر ہو گئی۔ جونہی ملازم سالنوں کے ڈونگے وغیرہ لے کر نمودار ہوا مصطفیٰ کو اپنے ہوش و حواس پر قابو نہ رہا۔ وہ بچ مچ پھٹ پڑا۔ اس نے بیچارے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ملازم کو اتنا مارا، اتنا مارا کہ وہ تقریباً غش کھا گیا۔ میری بھوک اڑ گئی۔ اس کے بعد اس نے کھانے کی میز پر اپنی نشست دوبارہ سنبھالی اور مجھ سے کہا کہ کھاؤ۔ میں کھا نہ سکی۔ مصطفٰے مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس نے وہی گندی اور بازاری زبان استعمال کی جس کا وہ شیری کو نشانہ بنایا کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے کھانا نہ کھایا تو وہ سالن کی پلیٹیں اٹھا اٹھا کر مجھ پر پھینکنے لگے گا۔ اس شام گویا گلا دبا کر مجھے کھانا کھلایا گیا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا اتفاق ہوا، گو یہ آخری بار نہ تھا۔

اس رات جب ہم سونے کے لیے کمرے میں پہنچے تو مجھے خوف نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ فضا تشدد سے بوجھل معلوم ہو رہی تھی، اتنی بوجھل کہ اس پر کسی ٹھوس چیز کا گمان ہوتا تھا اور ایسی ٹھوس کہ چاقو سے کٹ سکتی تھی۔ مصطفٰے بہت ہی الٹے پلٹے موڈ میں تھا۔ بستر میں لیٹے لیٹے اس نے انیس سے میری شادی کی تفصیلات کے بارے میں تفتیش شروع کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر بات اسے ازسرِ نو بتائی جائے۔ میری انیس سے کیسے ملاقات ہوئی تھی؟ کہاں ہوئی تھی؟ میں نے بتانا شروع کیا۔ زیادہ چبھتے ہوئے سوال کیے جانے لگے۔ ان سے دکھتی رگیں چھلی جا رہی تھیں۔ وہ ہماری پہلی رات کی ساری تفصیلات جاننا چاہتا تھا۔

جوں جوں وہ سوال کرتا گیا اس کا غصہ بڑھتا گیا۔ اس کی آواز بدل گئی۔ سانس چڑھ گئی۔ آنکھیں ابل آئیں اور لال ہو گئیں۔ چہرہ غصے سے تن گیا۔ میں ٹال مٹول پر اتر آئی۔ زیادہ محتاط ہو گئی۔ سچ سن کر اس کا پارہ اور چڑھ جاتا لیکن بضد تھا کہ سنوں گا تو سچ ہی سنوں گا۔ "بھول جاؤ مصطفٰے۔ یہ قصہ ختم ہو گیا۔ یہ ساری باتیں تم دوبارہ کیوں سننا چاہتے ہو؟" "میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ مجھے جواب دو۔" میں بہت دہل گئی۔ خود کو جواب دینے پر آمادہ نہ کر سکی۔ میری زبان لڑکھڑانے لگی۔ اسے اور غصہ چڑھ گیا۔ "تم مجھ سے باتیں چھپا رہی ہو۔ بتانے کے لیے ابھی اور بہت کچھ ہے۔" "ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے خیال میں ہمیں اس موضوع پر اس وقت گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ یہ باتیں سن سن کر تمہاری الجھن بڑھ رہی ہے۔" "تم کون ہوتی ہو جی سوچنے والی؟ میں نے تم سے سوال کیا ہے۔ جواب دو۔"

میں خوف کے مارے جواب دینے سے احتراز کر رہی تھی۔ آخر کار مجھے اس کے سامنے جھکنا ہی پڑا۔ میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ جاننا چاہتا تھا۔ وہ سنتا رہا۔ میں جب بھی ذرا رکتی وہ مجھے دھمکانے لگتا۔ وہ مجھے دام میں لا رہا تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اسی معلومات کو وہ مستقبل میں مجھ پر فردِ جرم عائد کرنے کی غرض سے کام میں لائے گا۔ میں اپنی نظر میں آپ مجرم بنتی جا رہی تھی۔

میں جانتی تھی کہ میری شادی کی تفصیلات سن کر مصطفٰے کو نہ صرف بہت طیش آ رہا ہے بلکہ اس کا توازن بھی بگڑتا جا رہا ہے۔ وہ اذیت کے مارے تڑپ رہا تھا اور اس کے باوجود مزید جاننے کے لیے بے قرار تھا۔ جن جزئیات کو میں پوست کندہ بیان کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی ان سے ایک اذیت خواہانہ لذت حاصل کی جا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ لذت اور اذیت کا یہ توازن عارضی ہے۔ پلڑا بالآخر اذیت کی طرف جھک جائے گا۔ توازن بگڑنے کی صورت میں جو دھماکا ہونا تھا میں اس کے خیال سے دہشت زدہ تھی۔ آخر یہی ہوا۔ جس تشدد کا مجھے نشانہ بنایا گیا میں اس کا کبھی تصور تک نہ کر سکتی تھی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تشدد کوئی بیس منٹ سے زیادہ دیر تک جاری رہا۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے اٹھا اٹھا کر پھینکا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میرا جسم جا کر دیواروں سے ٹکراتا رہا۔ مجھے یاد ہے کہ میری آنکھ میں کوئی چیز پھٹ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ کوئی چیز دو نیم ہو گئی۔ میری آنکھ میں اٹھنے والی ٹیس برداشت سے باہر تھی۔ مجھے یاد ہے کوئی چیز سوجتی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ہونٹوں پر ورم آ گیا ہے۔ مجھے لگا جیسے میرے چہرے کا تناسب اچانک بگڑ گیا ہے۔

بعد میں ایک ایسی آواز، جو مشکل سے پہچانی جا سکتی تھی، میں نے گڑگڑا کر کہا۔ "پلیز۔ بس کرو۔ خدا کے لیے۔ میں۔ میں..... باتھ روم جانا چاہتی ہوں"۔ میں ڈگمگاتی ہوئی باتھ روم میں داخل ہوئی۔ اتفاقاً سنک کے اوپر لگے ہوئے آئینے پر نظر گئی۔ مجھے ایک چہرہ دکھائی دے رہا تھا جسے ہولناک انداز میں کچلا مسلا گیا تھا۔ یہ میں نہ تھی میرا توڑا مروڑا ہوا سایہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں ابھی ابھی کسی جانے حادثہ سے اٹھ کر آ رہی ہوں۔ کسی نے دیدہ و دانستہ میرا یہ حشر کیا تھا۔ دورِ حاضر کی جنگ کی ہولناکی کی تاب نہ لا کر بعض فوجی ایسے ہو جاتے ہیں کہ زندہ لگتے ہیں نہ مردہ۔ یہی کیفیت میری تھی۔ چہرہ ٹیڑھا میڑھا ہو گیا تھا۔ ناک پچک کر چہرے سے جا ملی تھی جو ڈراؤنے انداز میں ابھرا ہوا تھا۔ رخسار سوج گئے تھے۔ آنکھیں بڑے بڑے نیلے دھبوں کی گہرائیوں میں چھپ گئی تھیں۔ ایک آنکھ میں مُوزگ پھٹ گئی تھی۔ کان میں ٹیس اٹھ رہی تھی۔

میں وہاں کھڑی اپنی طرف تکتی رہی۔ یقین نہ آتا تھا کہ میرے ساتھ یہ کچھ ہوا ہے۔ میں نے الجھے ہوئے بالوں کو سنوارنے کے لیے ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ سر پر ایک جگہ بالوں میں خون جما ہوا ہے۔ ہاتھ لگانے سے بالوں کے گچھے اتر کر ہاتھ میں آ گئے۔ غرارہ کیا تو منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ ہونٹ بہت ہی مبالغہ آمیز اور کج مج انداز میں کپا ہو کر پھیل گئے تھے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

یہ سب کچھ دیکھ چکنے کے بعد میں نے آئینے سے نظر ہٹائی۔ لگتا تھا جیسے میرے جسم کا ست نکل گیا ہے اور کسی بھی لمحے دھڑام سے گر جاؤں گی۔ میں خوفزدہ اور بوکھلائی ہوئی واپس کمرے میں پہنچی۔ مصطفیٰ وہاں کھڑا تھا۔ سر جھکائے۔ مٹھیاں بھینچے۔ اس نے میرے اندر آنے کی آہٹ سنی۔ میری طرف دیکھا۔ وہ اچانک چُور چُور ہو گیا۔ جیسے کوئی مرگی زدہ دورہ فرو ہونے کے بعد ہوش میں آ رہا ہو۔ فرق یہ تھا کہ مرگی زدہ بتدریج ہوش میں آتا ہے۔ مصطفیٰ یکایک ہوش میں آ گیا۔ اس نے خود کو ایک وحشی، منتقم مزاج درندے سے ننھے بچے میں تبدیل کر لیا۔ مسکین اور سہما ہوا۔ اس کی آنکھوں میں حقیقی شرمندگی تھی۔ میرے قدموں میں گر پڑا اور رونے اور سسکنے لگا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس میں ضرور کوئی بدروح حلول کر گئی ہو گی۔ تبھی اس نے مجھے اتنی زیادہ جسمانی گزند پہنچائی ہے۔ میں نے نظر جھکا کر اس آدمی کی طرف دیکھا جو آقا کا روپ چھوڑ کر غلام کی جون میں آ گیا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے اس آدمی پر ترس آیا جو میرے قدموں پر ماتھا ٹیکے ہوئے تھا اور جس نے میرے پیر اپنی مٹھیوں میں داب رکھے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔

تکلیف کہاں بھولنے دیتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ میں رات بھر درد کے مارے تڑپتی رہی۔ میں کسی طرح بھی نہیں سو سکتی تھی۔ میرے جسم کا ہر حصہ دکھ رہا تھا۔ مصطفیٰ میری تکلیف کو کم کرنے کی کوشش میں ساری رات بیٹھا جاگتا رہا۔ میں جانتی تھی کہ مجھے سخت چوٹیں آئی ہیں۔ مجھے خود کو کسی ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔

کانوں کے کسی خصوصی ماہر، آنکھوں کے کسی معالج، کسی فزیوتھیراپسٹ کے پاس ہمارا جانا ضروری تھا۔ میرا کان کا پردہ، آنکھ کی مُورگ، چوٹوں کے نیل، موچیں---- ان سب کا معائنہ ہونا چاہیے تھا لیکن میں اس حال میں باہر کس منہ سے جاتی۔ میری طرف دیکھتے ہی صاف پتہ چل جاتا کہ مجھے مارا پیٹا گیا ہے۔ اپنا بھرم بنائے رکھنے کے لیے میں تکلیف برداشت کیے جانے پر مجبور تھی۔

مصطفیٰ گھبرایا ہوا تھا۔ اسے بھٹو صاحب سے ملنے اسلام آباد جانا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو ہماری تشدد بھری رات کا پتہ چلے۔ اسے ملازموں اور اپنی ماں جی کی طرف سے زیادہ فکر لاحق تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ان کے ذریعے سے یہ کہانی باہر نکل جائے گی۔ میں نے اس سے کہا کہ اسلام آباد چلے جاؤ۔ "جب تک تم واپس نہ آؤ گے میں کمرے ہی میں رہوں گی۔ سب کو یہی بتانا کہ میں تمہارے ساتھ گئی ہوں۔" اس نے میری بات مان لی۔ میں نے خود کو اپنی جاں فرسا تکلیف کے ساتھ کمرے میں مقفل کر

لیا۔ چار دن اسی اذیت میں مصطفیٰ کا انتظار کرتے گزرے۔ دائی عائشہ کو بتائے بنا چارہ نہ تھا۔ وہ چوری چھپے میرے لیے کھانا لے آتی اور چہرے پر پلٹسیں لگاتی تاکہ ورم اتر جائے۔

میرے چہرے کو ایسی شکل اختیار کرتے کرتے، جو میری اصل صورت سے کسی حد تک مشابہ تھی، پندرہ دن لگے۔ صرف اس کے بعد ہی میں گھر سے نکلنے کی جرأت کر سکی اور ڈاکٹروں کے پاس گئی۔ انہوں نے محض میرے خدشات کی تصدیق کی۔ میری آنکھ میں اندرونی زخم آ گیا تھا، ایک پھٹی ہوئی مُورگ جو زندگی بھر مجھے دق کرتی رہے گی۔ مجھے آپریشن کرانا پڑا۔ آج بھی جب تناؤ کی حالت ہو تو میری داہنی آنکھ میری ذات پر اس پہلی تاخت کی گواہی دینے لگتی ہے۔

نفسیاتی طور پر جو گزند پہنچی وہ بدتر تھی۔

مصطفیٰ نے مجھ پر جو حملہ کیا تھا اس سے میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔ جونہی وہ گھر میں قدم رکھتا میں خوف سے کانپنے لگتی۔ پہلے سے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کیا کرے گا، کیا نہیں۔ میں اس بارے میں یقین سے کبھی کچھ نہ کہہ سکتی کہ اس کی دنیا میں میرا مقام کیا ہے۔ اس شخص کی جو محبت میرے دل میں تھی وہ خوف میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا کہا ہمارے لیے قانون تھا۔ اس کا حکم کتنا ہی غیر معقول کیوں نہ ہوتا مجھے یہ دریافت کرنے کی اجازت نہ تھی کہ وہ کیوں دیا گیا ہے۔ ایک روز کہنے لگا کہ تم اخبارات پڑھا کرو۔ میں نے چوں بھی نہ کی، حکم مان لیا۔ میں نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ مجھے ایک طرف کونے میں دھکیل دیا جائے جہاں میں دن بھر بیٹھی لرزتی اور یہ سوچ کر حیران پریشان ہوتی رہوں کہ جتنی جگہ میرے لیے مختص کی گئی تھی کہیں میں نے اس سے زیادہ جگہ تو نہیں گھیر لی۔ یہ ڈراؤنی باتیں تھیں۔ کبھی کبھی وہ ایسے کمرے میں چلا آتا جہاں ہر طرف اخبار ہی اخبار ہوتے۔ میرے ردعمل سے ظاہر ہو جاتا کہ میں کس بری طرح احساس جرم میں مبتلا ہوں۔ میں دعائیں کرتی رہتی کہ اسے یہ خیال نہ آنے کہ میں نے کسی طرح اس کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے۔ کبھی کبھار وہ اندر آتا، رکتا، پہلے اخباروں پر اور پھر الزام لگانے کے انداز میں مجھ پر نظر ڈالتا۔ "تم نے کوئی اخبار پڑھا؟" "نہیں۔" "مجھ سے جھوٹ مت بولو۔"

مزید کچھ نہ کہا جاتا۔ باقی بات گھونسوں کی زبانی ہوتی۔ ہماری ازدواجی زندگی میں کوئی دن ایسا نہیں آیا جب مصطفیٰ نے کسی وجہ سے مجھے مارا نہ ہو۔ کھانا دیر میں ملا، گرم پانی کے گیزر میں نقص پیدا ہو گیا، کپڑوں پر سلوٹیں پڑ گئیں، غرض کوئی بھی وجہ ہو سکتی تھی اور ہر وجہ سزا دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ عذر تلاش کرتا رہتا۔ بہانے ڈھونڈتا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کرتا۔ شیری کی کہانیاں حقیقت بن گئیں۔ میں شیری جیسی بن گئی۔ میں تھی ہی اس لیے کہ وہ جب چاہے مجھ پر مشق ستم کرے۔ المیہ یہ تھا کہ جب اس پر تشدد کرنے کا بھوت چڑھتا تو میں کچھ نہ بولتی۔ میں نے یہ پوچھنا چھوڑ دیا تھا کہ مجھ پر ہاتھ کیوں اٹھایا جارہا ہے۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں نے ہمت کر کے اس سے یہ پوچھ لیا تو وہ مجھے اور مارے پیٹے گا۔

وہ گھر پر کسی آمر کی طرح راج کرتا۔ جونہی وہ گھر میں قدم رکھتا گھر کے ہر مکین پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ دوسرے زرخرید غلاموں کی طرح میں بھی ایک باندی تھی۔ وہ ہمارا آقا تھا۔ بائیس کنال میں بنی کوٹھی کا مالک، جہاں ہرن اٹھلاتے پھرتے تھے، جہاں چوزے بسیرا کرتے تھے، جہاں مور اترا اترا کر چلتے تھے اور ملازم، گھر والے، ماں اور بیوی، سب کانپتے رہتے تھے۔ بہت ہی اوٹ پٹانگ صورتحال تھی۔ وہ ظالم تھا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں پنجرے کی چڑیا ہوں۔ لیکن پنجرہ بھی کوئی گوشۂ عافیت نہ تھا۔

میرا سوچنے کا عمل یکایک ساقط ہو گیا۔ میں سوچنے سے ڈرتی تھی۔ تجزیہ کرنے سے ڈرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے ذہن میں سرایت کر سکتا ہے، مجھے سزا دے سکتا ہے۔ میں نے اس آدمی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا جس نے اتنے ارمانوں کے ساتھ مجھ سے شادی کی تھی اور پھر مجھ پر اچانک اس قدر وحشیانہ اور بہیمانہ انداز میں ٹوٹ پڑا تھا۔

میں جان بچا لائی تو صرف مصطفے کے شیزوفرینک رویے کی وجہ سے۔ جب اس کے مزاج پر شگفتگی کا غلبہ ہوتا تو بہت پیار کرنے والا اور لحاظ رکھنے والا آدمی بن جاتا۔ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا، ایسے کھانے چن چن کر میرے سامنے رکھتا جو میرے لیے مفید تھے۔ میرا سر اور ٹانگیں دباتا۔ میرے لمبے لمبے بالوں میں تیل لگاتا اور ان میں کنگھی کرتا۔ میرے ساتھ مل کر خواب دیکھتا اور وعدہ کرتا کہ میرے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔

مصطفے کے اس اچھوتے موڈ کو برقرار رکھنے کے لیے میں بہتیرے ہاتھ پیر مارتی۔ اس کی خونخواری سے میری جان فنا ہونے لگتی۔ اس وقت بھی، جب میں سطریں لکھ رہی ہوں، میں محسوس کر سکتی ہوں کہ وہ کس طرح کلائیاں پکڑ کر میری بانہیں مروڑتا تھا۔ درد کے مارے میں چیخیں مارنے لگتی تھی۔ میں دیکھ سکتی ہوں کہ اس کی آنکھیں کس طرح ابل کر غصے سے مجھے گھورتی تھیں۔

مجھے پتہ تھا کہ میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں نے یہ شادی ایک عالم کی ناراضگی مول لے کر کی تھی اور اب اسے قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہنا مجھ پر فرض تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ ہماری شادی اب اعتماد یا محبت یا احترام پر قائم نہ تھی۔ اس کی بنیادیں کبھی ختم نہ ہونے والے اندھے خوف پر کھڑی تھیں۔

مجھے اپنے پر اتنا اعتماد نہ تھا کہ گھر چھوڑ کر نکل جاتی۔ میں ایسا کرنے سے ڈرتی تھی۔ اس کی دلیل میرے پاس یہ تھی کہ خواہ میں کتنی دور ہی کیوں نہ بھاگ جاؤں مصطفے مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ بہت زیادہ طاقتور تھا۔ وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ میں دیکھ چکی تھی کہ وہ قتل کرنے کا پوری طرح اہل ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دینے کے تمام خیالات کو ذہن بدر کر دیا۔ "مجھے پتہ چل جائے گا کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔ تہمینہ، مجھ پر یقین کرو۔ کسی ایسی بات کے بارے میں سوچنے کی تمہیں جرأت نہیں ہو سکتی جس کے بارے میں سوچنے سے میں تمہیں منع کر چکا ہوں۔"

میرے دماغ کو دھو دھلا کر، رنگ اتار کر، سکھانے کے لیے الگنی پر ڈال دیا گیا تھا۔ میں خود اپنے ذہن کے قریب جانے سے ڈرتی تھی۔ مجھے سونے سے خوف آتا تھا۔ میں ایسے امیجوں کے خواب نہیں دیکھنا چاہتی تھی جن سے وہ ناراض ہونے لگے۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں سوتے میں باتیں نہ کرنے لگوں۔ مجھے لگتا کہ لوگ خواہ مخواہ میری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ تہمینہ کھر کی کایا کلپ کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ وہ آدمی کا روپ چھوڑ کر چھینڈا بنتی جا رہی تھی۔ نہ منہ میں زبان، نہ ہاتھ پیر میں جان۔ نری ترکاری۔

1977ء میں پاکستان میں انتخابات کرائے گئے۔ بھٹو صاحب، جنہیں ایسا معلوم ہوتا ہے انٹیلی جنس والوں کی جھوٹی رپورٹیں پڑھائی جاتی رہی تھیں، وقت سے پہلے انتخابات کرانے کا اعلان کر بیٹھے۔ مخالف سیاسی جماعتوں نے، بھان متی کے کنبے کی طرح اکٹھے ہو کر، پاکستان قومی اتحاد تشکیل دیا۔ یہ نو سیاسی جماعتوں کی کھچڑی تھی۔ ان میں صرف ایک قدر مشترک تھی۔ بھٹو صاحب سے نفرت۔ انتخابات سے پہلے مخالفین سمجھ گئے کہ بھٹو صاحب جیت جائیں گے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ نتائج کو قبول نہیں کریں گے، بھٹو صاحب پر دھاندلی کا الزام لگائیں گے اور تحریک شروع کر دیں گے جس میں سڑکوں پر نکل آنے والے عوام کی طاقت ریاست کی طاقت پر غلبہ پا لے گی۔ جو جال انہوں نے بڑی صفائی سے بچھایا تھا بھٹو صاحب آ کے اس میں پھنس گئے۔ پیپلز پارٹی کو اچھی بھلی، اگرچہ پہلے سے کچھ کم، اکثریت حاصل ہو جاتی لیکن بھٹو صاحب کے چہیتے چاپلوسوں نے اس پر اکتفا کرنے کی بجائے بڑے پیمانے پر دھاندلی کی اور بیلٹ بکسوں کو زبردستی جعلی ووٹوں سے بھر دیا۔ جب نتائج آنے شروع ہوئے اور پتہ چلا کہ پی پی پی نے مخالف جماعتوں کا صفایا کر دیا ہے تو حزب اختلاف نے "ہم تو پہلے ہی کہتے تھے" کا موقف اپنا کر ردعمل ظاہر کیا۔ وہ بڑے بڑے ہجوم سڑکوں پر لے آئے اور

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

انہیں حواس باختہ بھٹو صاحب کی طرف ہشکار دیا۔

ملک تباہی کے دہانے پر لڑکھڑانے لگا۔ ملک بھر میں تشدد اور ہڑتالوں کی وبا پھوٹ پڑنے سے معیشت کے چیتھڑے اڑ گئے۔ حزبِ اختلاف کو فتح کی خوشبو آنے لگی۔ اب وہ خون کے پیاسے ہو گئے۔ ان میں سے بہت سوں کو پتہ تھا کہ فوج پس پردہ انتظار کر رہی ہے اور بگڑتی حالت کو سنبھالنے اور بھٹو صاحب کو برطرف کرنے کے لیے آدھمکے گی۔ سازش کے نظریوں کا چرچا ہونے لگا۔ بھٹو صاحب کی آزادانہ خارجہ پالیسی اور ان کے نزاع انگیز ایٹمی پروگرام سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کو تشویش تھی۔ اس سے فوج بھی گھبرائی ہوئی تھی۔ ایٹمی اسلحہ بنانے کی صلاحیت حاصل ہو گئی تو پھر ہمہ وقتی روایتی فوج کی ضرورت کم ہو جائے گی اور اس اکثر دہرائے جانے والے مطالبے کو پورا کیا جا سکے گا کہ دفاع پر اخراجات میں کمی کی جانی چاہیے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ڈر تھا کہ کہیں نام نہاد اسلامی بم آخر کار لیبیا اور شام جیسے ملکوں اور پی ایل او جیسی تنظیم کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ بھٹو صاحب نے کسی زمانے میں "آزادی کا ڈھکوسلا" کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ انہوں نے کچھ سبق اپنی ہی مقالہ نما تصنیف سے سیکھ لیے ہوتے۔

اس مقصد کے لیے حزب اختلاف کو استعمال کیا گیا۔ ایجی ٹیشن کو "بازار" نے یا، جیسا کہ بعض افواہوں میں خیال ظاہر کیا گیا تھا، امریکی ڈالروں نے ہوا دی۔ کامیاب پہیہ جام ہڑتالوں نے صنعت کے پہیے کو روک دیا اور بھٹو صاحب کو ملک کے تین بڑے شہروں میں فوج طلب کرنی پڑی۔ فوج کو مکمل کنٹرول حاصل تھا اور یوں جزوی مارشل لاء کا آغاز ہوا۔

مصطفےٰ نے انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو دیکھتا کیا ہے کہ وہ جو کل تک اس کے پیرومرشد کہلاتے تھے اپنی سیاسی بقا کے لیے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ بھٹو صاحب جانتے تھے کہ ان کی نجات کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پنجاب کے صوبے کو جو اُن سے روٹھ چکا تھا، دوبارہ منا لیا جائے۔ یہ معجزہ، جس کی وہ امید لگائے بیٹھے تھے، صرف ایک ہی شخص کر کے دکھا سکتا تھا۔۔۔ مصطفےٰ کھر۔ ہر طرف سے نرغے میں آئے ہوئے بھٹو صاحب نے، ہار کے اور مونچھ نیچی کر کے، مصطفےٰ کو اسلام آباد آنے کی دعوت دی۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ، نواب صادق حسین قریشی، دھاڑتے ہجوموں کا زور کچلنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ وہ اپنے تمام قانونی اختیارات سے نوکرشاہی کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔

یہ بحران وہ چیلنج ثابت ہوا جس کی مصطفےٰ کو تلاش تھی۔ اس نے پیپلز پارٹی میں دوبارہ شمولیت کا فیصلہ کیا۔ اسے امید تھی کہ وہ پنجاب میں اصل طاقت بن کر ابھرے

گا۔ اسے بھٹو صاحب کا خصوصی معاون اور اعلیٰ ترین سیاسی مشیر مقرر کیا گیا۔ اس کا عہدہ مرکزی کابینہ کے وزیر کے برابر تھا۔ اسے فوراً پنجاب بھیجا گیا جہاں اس نے اعلیٰ سطح کے اجلاس میں وزیراعلیٰ، چیف سیکرٹری، آئی جی اور کمشنر سے ملاقات کی۔ اس نے عوام سے بھی رابطہ کیا اور پاکستان قومی اتحاد کو کھلم کھلا مقابلے کی دعوت دی۔ وہ پارٹی کے عام اراکین کا، جن پر بے دلی طاری تھی، حوصلہ بلند کرنے میں کامیاب رہا۔ راولپنڈی میں اس نے ایک بہت بڑے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے پُرجوش ہجوم کو بتایا کہ پاکستان قومی اتحاد کو پتہ ہونا چاہیے کہ پیپلز پارٹی ضبط و تحمل سے کام لیتی رہی ہے۔ "اگر ہمیں مزید پیچھے دھکیلا گیا تو ہم بدلا لیں گے۔ ہم گولی کا جواب گولی سے دیں گے۔ اگر وہ ہمارے خون کے پیاسے ہیں تو ہم بھی ان کا ٹینٹوا دبوچنے کو تیار ہیں۔"

ہم اسلام آباد میں سٹیٹ بینک ہاؤس منتقل ہو گئے۔ بھٹو صاحب محسوس کرتے تھے کہ اپنی آخری جدوجہد کے لیے کمربستہ ہوتے وقت مصطفےٰ کا ان کے پہلو میں ہونا ضروری ہے۔ میرا آٹھواں مہینہ تھا۔ ایک ماہ بعد میرے بطن سے مصطفےٰ کے پہلے بچے کی ولادت متوقع تھی۔ مجھے پہلی بار پتہ چل رہا تھا کہ کسی اہم سرکاری عہدے دار کی بیگم ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

مصطفےٰ کا حال یہ تھا کہ آج یہاں تو کل وہاں۔ بحران سنگین ہونے کے بعد وہ شاید ہی کبھی گھر پر نظر آیا ہو۔ وہ کابینہ کے اجلاس میں شریک ہوتا اور بھٹو صاحب کے مشیروں کی حماقتوں کے خلاف تقریریں کرتا۔ بارہ دن کی سخت دوڑ دھوپ کے بعد پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ مصالحت کے آثار صاف نظر آنے لگے۔ دونوں متحارب فریق اب گفت و شنید کر رہے تھے اور بھٹو صاحب زیادہ صلح جو موڈ میں تھے۔ ان کے مزاج میں خاصی لچک آ گئی تھی۔ جتوئی صاحب کے ساتھ مصطفےٰ کی جو بات چیت ہوتی رہتی اس سے میں اتنا اخذ کر سکی کہ حزب اختلاف کے مولانا نورانی کے ساتھ الھام کی کوئی صورت نکل آئی ہے اور کسی طرح کا معاہدہ طے پانے والا ہے۔

جنرل ضیاءالحق چیف آف آرمی سٹاف تھا۔ وہ اجلاسوں میں شریک ہوتا اور اپنی خاموشی اور ظاہری چاپلوسی کے لیے مشہور تھا۔ بہت ہی اطاعت گزار واقع ہوا تھا اور بھٹو صاحب کے ساتھ ضرورت سے زیادہ مروت سے پیش آتا تھا۔ بظاہر بھٹو صاحب سے مرعوب تھا۔ مصطفےٰ کابینہ کے ایک اجلاس میں شرکت کرنے گیا ہوا تھا۔ میں نانی اماں کے ساتھ ایک ریستوراں میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ رات کو گھر سے باہر کھانا کھائیں گے۔ جولائی کی چار تاریخ تھی۔ اس دن امریکی اپنا یوم آزادی مناتے ہیں۔ مصطفےٰ ریستوراں میں داخل ہوا۔ ایک تو آیا بڑی دیر میں تھا، دوسرے بہت

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مضطرب تھا۔ گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ وہ پریشان بھی تھا اور تناؤ میں مبتلا بھی۔ بتانے لگا کہ اس نے جنرل ضیاء کے رویے میں زمین آسمان کا فرق آتے دیکھا ہے۔ "یکایک ایسا لگا جیسے جنرل ضیاء بھی بعض معاملات میں اپنی کوئی سوچ رکھتا ہے۔ ہم جو منصوبے پیش کر رہے تھے ان میں سے چند ایک سے اس شخص نے عدم اتفاق ظاہر کیا۔ اس کے رویے میں تبدیلی کا مطلب ہے کہ اس کی ڈور بڑی طاقتیں ہلا رہی ہیں۔ میں نے بھٹو صاحب کو بتا دیا ہے انہیں خبردار کر آیا ہوں۔ میں سی آئی اے پر مزید بھروسا نہیں کر سکتا۔"

بھوک کے رہ گئی تھی۔ ہم کھانے سے یونہی چھیڑ چھاڑ کرتے رہے اور بھوک اڑ جانے کا بل ادا کر کے گھر کا رستہ لیا۔ ہم ایک بجے سوئے۔ کوئی تین بجے دروازہ کھلا۔ جو بھی تھا اس نے دستک دینے کی زحمت نہ کی تھی۔ متین، ایک قدآور پٹھان، جو ہمارا گن مین تھا، سایوں میں کھڑا نظر آیا۔ مصطفیٰ اچھل کر اٹھا۔ اس کا ہاتھ بڑی تیزی سے اپنے آتشی ہتھیار کی طرف بڑھا۔ اسے ہمیشہ قاتلانہ حملے کا ڈر رہتا تھا۔ وہ سوتے میں قتل ہونا ہرگز نہ چاہتا تھا۔ لڑتے لڑتے جان دینا اس کے نزدیک قابل ترجیح تھا۔

متین نے کوئی بات نہیں کی۔ ہاتھ ہلا کر مصطفیٰ کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں آدمی چلے گئے۔ نیند کے غلبے سے میرے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ میں پڑ کر دوبارہ سو گئی۔

دس منٹ بعد دروازے کو زور زور سے دھڑ دھڑانے کا شور میرے خواب میں در آیا۔ میں چونک کر تو نہیں، قدرے کبیدہ خاطر ہو کر جاگی۔ میں تھکی ہوئی تھی اور مجھے نیند بہت آ رہی تھی۔ میں سمجھی کہ دروازہ اندر سے بند ہو جانے کی وجہ سے مصطفیٰ باہر رہ گیا ہے۔ میں نے اٹھ کر بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ متین نے لونگ روم کے دروازے سے، جو میرے بالکل سامنے تھا، باہر آ کر سہمے سہمے لہجے میں مجھ سے اندر لوٹ جانے کے لیے کہا۔ میں پیچھے ہٹ گئی مگر دروازہ ذرا سا کھلا رہنے دیا۔ میرا تجسس بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے درز میں سے جھانکا۔ دو وردی پوش بریگیڈیئر اینٹھی چال چلتے سامنے گزرتے نظر آئے۔ دوسرے افسر بھی ان سے آ ملے۔ وہ چاق و چوبند معلوم ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید بھٹو صاحب نے ان فوجی افسروں کو کسی سیاسی معاملے کے سلسلے میں مصطفیٰ سے ملنے بھیجا ہے۔ یہ خیال محض لمحاتی ثابت ہوا۔ اس کے بعد پانچ فوجی جوان آئے۔ ان کے ہاتھ میں اسلحہ استعمال کے لیے بالکل تیار تھا۔ وہ کچھ کر گزرنے پر تلے ہوئے تھے اور خاصے غضب ناک دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا انداز بین طور پر معاندانہ تھا۔ انہوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ ان میں سے ایک فوجی کا سایہ میرے

حاملہ وجود پر پڑا۔ سائے نے مڑ کر دیکھا۔ اسے نظر آیا کہ دروازہ ذرا سا کھلا ہے اور روشنی جل رہی ہے۔ اس نے جوش میں آ کر اور یہ جوش مسلسل مشق کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا، دروازے پر بوٹ سے ٹھوکر ماری۔ دروازہ کھل کر میرے پیٹ میں لگا۔ میں تکلیف کے مارے بلک گئی۔ میرے پیٹ میں بچے نے لات چلائی۔ میں نے طیش میں آ کر جوابی کارروائی کی۔ دروازہ دھڑ سے بند کر دیا اور بستر پر آ بیٹھی۔ مجھے تشویش نے گھیر لیا۔ کیا یہ فوجی بغاوت ہو سکتی ہے؟ وہی جس کے بارے میں روایتی طور پر مشہور ہے کہ آدھی رات کو دروازے پر دستک ہوتی ہے اور---- یہ 5 جولائی 1977ء کی بات ہے۔

مجھے سب سے پہلے مصطفیٰ کی سلامتی کی فکر ہوئی۔ کیا فوج صرف اسی کو گرفتار کرنے آئی ہے؟ کیا مصطفیٰ نے بھٹو صاحب سے بگاڑ لی ہے؟ دوبارہ؟ یا یہ مارشل لاء ہے؟ دوسرے رہنماؤں کا کیا بنا؟ کیا یہ ڈرامہ ملک کے طول و عرض میں دوسرے گھروں میں کھیلا جا رہا ہے؟ خاموشی۔ لب بستر میز پر گھڑی زور زور سے ٹک ٹک کرتی رہی۔ اس کی طرف میرا پہلے کبھی دھیان ہی نہ گیا تھا۔ میں بیٹھی دعائیں مانگتی رہی۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ گھڑی مجھے بولنے نہ دیتی تھی کہ وقت گزر رہا ہے۔

مصطفیٰ اندر آیا۔ وہ بہت پُرسکون تھا۔ سوچ رہا تھا۔ میں تقریباً دیکھ سکتی تھی کہ اس کا ذہن یہ اندازہ لگانے میں مصروف ہے کہ جو امکانات سامنے ہیں ان کی ترتیب کتنی بار ادلی بدلی جا سکتی ہے، صورتحال کا تجزیہ کر رہا ہے اور سوچنے کی کوشش کہ اب کیا چال چلنی ہو گی۔ اس نے مجھے بالکل پُرسکون انداز میں بتایا کہ مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔ فوج بھٹو صاحب کے خلاف حرکت میں آ گئی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کا سوٹ کیس پیک کر دوں۔ "میرے وٹامن رکھنا مت بھولنا...... اور میرے سگار۔" "کیا معاملہ خطرناک رخ اختیار کر سکتا ہے؟" "پتہ نہیں۔ شاید یہ خون ریز بغاوت ثابت ہو۔ وہ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ بہتر ہو گا تم آج عربی اور صائمہ کے ہاں چلی جاؤ۔ پریشان مت ہو۔" وہ چلا گیا۔

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اندھیرے میں مجھے ایک جیپ نظر آئی جس میں فوجی افسر تھے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جیپ میں ممتاز بھٹو اور میرے ایک ماموں عزیز خاں دکھائی دیے۔ مصطفیٰ بیٹھ گیا۔ جیپ زناٹے بھرتی روانہ ہوئی۔ میرا شوہر سیاسی قیدی بن چکا تھا۔ جو بریگیڈیئر مصطفیٰ کو جیپ کی طرف لے جا رہا تھا اس کے الفاظ مجھے آج تک یاد ہیں اس نے اپنی واکی ٹاکی پر کہا تھا۔ "مشن ممو مکمل ہو گیا۔"

اگلی صبح میں عربی اور صائمہ کے گھر منتقل ہو گئی۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ مصطفیٰ کہاں ہے۔ میں بہت پریشان تھی۔ ہم نے ٹیلی وژن پر جنرل ضیاء کی پہلی تقریر نہایت

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

غور سے سنی۔ اس نے وعدہ کیا کہ نوے دن بعد انتخابات کرا دیے جائیں گے۔ ہمیں اس کے وعدے پر یقین آ گیا۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ سیاستدانوں کی جان بخشی ہو گئی ہے۔ پندرہ دن گزر گئے۔ پھر ایک فوجی جوان کی مہربانی سے مصطفےٰ کا لکھا ہوا ایک رقعہ دستی مجھے ملا۔ کم از کم ہمیں اتنا پتہ چل گیا کہ وہ خیریت سے ہے اور اسے ایبٹ آباد میں رکھا گیا ہے۔

فوجی بغاوت بذات خود بچے تلے انداز میں کارروائی کرنے کا کوئی اچھا نمونہ نہ تھی۔ یہ تو "وار کرو اور دوڑ پڑو" قسم کا آپریشن تھا۔ جھٹکے کھا کھا کر تکمیل کی طرف بڑھا تھا اور اس خامی کی طرف سے میں اس نتیجے پر پہنچی کہ بغاوت کا پلان دوڑتے بھاگتے تیار کیا گیا تھا۔ لگتا نہیں تھا کہ اس کی پہلے سے کوئی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ سیاستدانوں کے خلاف قدم اٹھانے کا اشارہ بظاہر خود جنرلوں کے لیے بھی حیرانی کا باعث ہوا ہو گا۔

کسی کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ مصطفےٰ ہے کہاں۔ مصطفےٰ کی کھوج میں نکلا ہوا فوجی دستہ اس کے بھائی، عربی، کے گھر میں جا گھسا۔ فوجیوں نے ٹیلی فون کے تار کاٹ دیے اور عربی کی بیوی سے اپنے شکار کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے رہے۔ صائمہ کو پتہ تھا کہ مصطفےٰ کہاں ہے لیکن اس نے کچھ بتا کر نہ دیا۔ اس کے بعد بغاوت کرنے والے فوجی رحمانی کھر کے گھر پہنچے۔ انہوں نے ٹیلی فون لائن کاٹ کر باقی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع کر دیا۔ رحمانی نے افسروں کو بتا دیا کہ مصطفےٰ کہاں ہے۔ تیسری بار قسمت نے ڈھونڈنے والوں کا ساتھ دیا۔ انہوں نے سٹیٹ بینک ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا جہاں مصطفےٰ مرے پہلو میں محو خواب تھا۔

ہمارے گن مین متین نے فوجیوں کو نقل و حرکت کرتے دیکھا تو گڑ بڑا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا کہ اس ساری سرگرمی کا مقصد کیا ہے۔ جب اس نے گھر کے چاروں طرف فوجیوں کو اس طرح پوزیشن سنبھالتے دیکھا جیسے وہ آمادہ جنگ ہوں تو فکر مند ہوا۔ تب کہیں اس نے اس آدمی کو جگانے کا فیصلہ کیا جس کی حفاظت پر وہ مامور تھا۔

جونہی مصطفےٰ میرے پہلو سے اٹھ کر متین کے پیچھے پیچھے بیڈروم سے باہر گیا تو فون بجا۔ بھٹو صاحب بول رہے تھے۔ "مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے" گھبرائی ہوئی آواز نے کہا۔ "مجھے گھر پر نظر بند کر دیا گیا ہے۔ تم سے بات کرنی ضروری ہو گئی ہے۔" "کیا....." آواز یک لخت غائب ہو گئی۔ ایک منٹ بعد فون پھر بجا۔ بھٹو صاحب اپنے "سبز فون" سے کال کر رہے تھے۔ "ضرورت ہے کہ ہم بات..... ایک بار پھر گفتگو ادھوری رہ

گئی۔ مصطفےٰ کان لگائے رہا۔ ڈائل ٹون بھی باقی نہ رہی۔ ہماری ٹیلی فون لائن کاٹ دی گئی تھی۔

بغاوت کے حوالے سے ہر کسی کے پاس کوئی نہ کوئی کہانی تھی۔ حفیظ پیرزادہ کسی کو فون کر رہا تھا۔ یکایک اسے مسلح فوجیوں نے گھیر لیا۔ اسے بڑا تاؤ آیا۔ "تم غلط گھر میں آ گئے ہو۔ تمہیں پتہ نہیں میں حفیظ پیرزادہ ہوں۔ میں حکومت میں ہوں۔ حزب اختلاف کا رکن نہیں۔ لعنت ہو تم پر۔" جب افسر نے اسے بتایا کہ کیا ہو گیا ہے تو وہ سنتا تو رہا لیکن چہرے کی کیفیت کہے دیتی تھی کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ "جناب، آپ زیرِ حراست ہیں۔" اسے گھر سے باہر لے جایا گیا۔ حفیظ کو فون بند کرنا بھی یاد نہ رہا۔

سیاستدان اپنی جبری بے شغلی سے نمٹنا سیکھتے جا رہے تھے۔ مقامی پریس کے ایک کارٹون میں ممتاز، حفیظ اور مصطفےٰ کو ایبٹ آباد کے ایک گھر میں ساتھ دکھا گیا۔ ممتاز سگار پی رہا تھا، حفیظ سویا پڑا تھا اور مصطفےٰ یوگا کے جانے پہچانے، آسن میں سر کے بل کھڑا تھا۔ میرے دل کو قرار آ گیا۔ سُونی دیواروں اور گولی سے اڑا دینے والے دستوں کے جو منظر میری آنکھوں میں گھومتے رہتے تھے اُڑن چھو ہو گئے۔

جنرل ضیاء نے سیاست دانوں سے کہا تھا کہ انہیں تحفظ دینے کی خاطر حراست میں رکھا جا رہا ہے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ انتخابات سے پہلے تھوڑا سا وقفہ نہایت لازمی ہے تاکہ جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں۔ اس نے انہیں مری چلتا کر دیا۔ بھٹو صاحب کو بھی اسی ہل سٹیشن میں رکھا گیا۔ ممتاز، حفیظ، مصطفےٰ، جنرل ٹکا خاں اور شیخ رشید ایک ساتھ محبوس تھے۔ زچہ خانے میں میرے محبوس ہونے میں دو ہفتے رہ گئے تھے۔

مصطفےٰ اور باقی لوگ جن حالات میں دن بسر کر رہے تھے، عام آدمی ان پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ مینو کا تعین وہ آپ کرتے۔ باوردی بیرے انہیں کھانا کھلاتے۔ ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ بس ان کی رہائش گاہ کے باہر مارچ کرتے بوٹوں کی کھٹاکھٹ، مداخلت بے جا بن کر، اس ظاہری امن و سکون اور گھر جیسے آرام کی فضا میں کھنڈت ڈالتی رہتی تھی۔

جو سیاست دان کل تک ہماری قوم کی تقدیر پھینٹنے میں معروف تھے اب بیٹھے تاش کھیلتے نظر آتے۔ انہیں پوائنٹس بنانے یا رقم جیتنے سے غرض نہ تھی بلکہ ہارنے والے کو سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ جو ہار جاتا اسے ڈنڈ پیلنے پڑتے۔ یہ پہلے سے طے کر لیا جاتا تھا کہ جو ہارے گا اسے کتنے ڈنڈ نکالنے پڑیں گے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی جب میں نے حفیظ پیرزادہ کو جس نے ہمارا آئین مرتب کیا تھا، ڈنڈ پیلتے ہوئے ہانپتے پھنکارتے دیکھا--- کہاں اصلاحِ متن، کہاں تعزیرِ تن۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں مری منتقل ہو گئی۔ تاج الملک اور ان کی بیوی نے میری میزبانی کی۔ سعدیہ پیرزادہ بھی ملنے آ جاتی۔ میں سارا دن مصطفیٰ کے ساتھ گزار کر شام کو چھ بجے گھر لوٹتی۔

اخباروں کو پی پی پی کے بارے میں کہانیاں فراہم کی جارہی تھیں۔ بھٹو صاحب کے منہ پر کالک ملنے کی مہم شروع ہو چکی تھی۔ ضیاءالحق قوم کو تیار کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب اپنے سب سے بڑے دشمن کو بالاخر ٹھکانے لگائے تو کسی کی آنکھ آنسوؤں سے تر نظر نہ آئے۔ میں نے ایک خبر پڑھی جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ حفیظ پیرزادہ نے مصطفیٰ کھر کو قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی۔ میں دہل کر رہ گئی۔ مصطفیٰ سے ملنے گئی تو وہ ممتاز بھٹو کے بستر پر بیٹھا ہوا ملا۔ وہ اکیلا نہ تھا۔ حفیظ اس کے ساتھ تھا۔ وہی اخبار دونوں کے پاس پڑا تھا۔ مجھے کسی کل چین نہ تھا۔ جونہی مصطفیٰ سے علیحدگی میں بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے اسے بتایا کہ میں کیا پڑھ کر آئی ہوں۔ "کیا یہ خبر تمہاری نظر سے نہیں گزری؟" "تو پھر؟" "یہ بے معنی ہے۔" میں نے کوریڈور میں فوجی بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنی۔ میری سمجھ میں آگیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

حفیظ ان لوگوں میں سے تھا جو خیالی رنگ رلیوں ہی سے دل خوش کر لیتے ہیں۔ اب وہ بھی پر پرزے نکالنے لگا۔ اسے ثمینہ نامی ایک نوجوان فزیکل انسٹرکٹر سے محبت ہو گئی۔ وہ ثمینہ کے لیے ترس رہا تھا اور کہتا تھا کہ قید سے چھوٹتے ہی اس سے شادی کر لے گا۔ مصطفیٰ حفیظ کو چھیڑتا رہتا۔ کہتا کہ حفیظ میں اتنا حوصلہ ہی نہیں کہ سعدیہ اور بچوں سے رشتہ توڑ سکے۔ حفیظ کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے مصطفیٰ سے کہا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے کہے کو پورا کر دکھائے گا۔

جو شوہر بیک وقت دو دو جگہ آنکھ لڑاتے ہیں ان کی بیویاں اکثران کے ہرجائی پن کا پتہ چلا لیتی ہیں۔ حفیظ کے معاملے میں بھی کوئی استثنا نہ ہوا۔ بد قسمتی سے وہ معشوقہ کو بھی چکر دے رہا تھا۔ اس نے بھی حفیظ کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

حفیظ نے ثمینہ کے نام ایک طویل خط لکھا جس میں کہا کہ وہ اس کی خاطر ساری خدائی کو تج دے گا۔ اس نے لکھا کہ تمہارے لیے میرا عشق امر ہے

اس کے بعد احساسِ جرم نے ستایا۔ اس نے سوچا کہ اس احساس کا کسی حد تک ازالہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک خط بیوی کو بھی لکھ ڈالا۔

دونوں خط بند کر کے ان پر پتے لکھے اور انہیں ایک فوجی جوان کے حوالے کر دیا جس نے انہیں پہنچانے کا وعدہ کیا۔ اس نے خط پہنچا دیے لیکن غلط پتوں پر۔ قیامت برپا ہو گئی۔ حفیظ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ فوج نے ایک بار پھر اس کی زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔

ہر روز ساڑھے چھ بجے محبوس سیاستدانوں کو سوزوکی وین میں بٹھا کر بھٹو صاحب سے ملانے لے جایا جاتا۔ وہاں یہ رہنما بیٹھ کر اپنی چھوٹی موٹی پرانی علتوں، موجودہ معاملات اور مستقبل کی پالیسیوں پر تبادلۂ خیال کرتے۔ ضیاء نے جو کچھ کیا تھا بھٹو صاحب اس پر بہت برہم تھے۔ ان کے تکبر میں فرق نہ آیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ جنرل بڑی ٹیڑھی وکٹ پر کھیلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بھٹو صاحب کے خیال میں جنرل ان کے ساتھ جو "بہت اہم شخصیت" والا سلوک کر رہے تھے اس کی کوئی اور وجہ نہ ہو سکتی تھی۔ انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ جنرل ان کی رسی خاصی دراز کرتے جا رہے ہیں تاکہ پایانِ کار یہی رسی سچ مچ ان کے گلے کا پھندا بن جائے۔

بھٹو صاحب اپنا دربار لگاتے۔ انہوں نے ابھی وزیراعظم والی آن بان کو چھوڑا نہ تھا۔ احتیاط سے ذرا کام نہ لیتے تھے۔ جنرلوں کو برملا گالیاں دیتے اور ان پر غداری کا الزام لگاتے۔ انہوں نے قسم کھائی کہ انتقام لے کر رہیں گے اور اقتدار پر دوبارہ فائز ہونے کے بعد جنرلوں کی اچھی طرح خبر لیں گے۔ ان کے ساتھیوں نے محسوس کیا کہ بھٹو صاحب کوتاہ اندیشی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ بظاہر گھر میں جاسوسی کے آلات نصب تھے۔ جنرل اندازہ لگا رہے تھے کہ بھٹو صاحب کے ارادے کیا ہیں۔ جب انہوں نے ٹیپ کی ہوئی بات چیت دوبارہ سنی ہو گی تو یقیناً ان پر خوف غالب آگیا ہو گا۔ ٹیپ کی چرخیوں کے گھومنے کے ساتھ ساتھ ان کا یہ یقین واثق ہوتا گیا ہو گا کہ بھٹو صاحب کو جسمانی طور پر ختم کرنا پڑے گا۔

مصطفیٰ نے بھٹو صاحب کو خبردار کیا۔ انہوں نے انتباہ پر کان نہ دھرا۔ جنرلوں نے آئین میں تحریف کی ہے۔ آرٹیکل چھ میں فوجی طالع آزماؤں کے بارے میں کوئی ابہام نہ تھا۔ اس آرٹیکل کی رُو سے مارشل لاء خلافِ قانون قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کی خلاف ورزی کرنا اپنی شامت کو آپ دعوت دینے کے مترادف تھا۔ بھٹو صاحب ٹھہرے وکیل، قانونی نکتوں سے چمٹے رہے۔ وہ بھول گئے کہ سیاست میں طاقت کیا معنی رکھتی ہے۔ انہوں نے یہ غلطی اس وقت بھی دہرائی جب وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر قانونی تنکوں کا سہارا ڈھونڈ رہے تھے۔ توپیں بندوقیں جنرلوں کے پاس تھیں۔ قانون تو ایک اڑیل ٹٹو ہے جسے جی چاہے تو گاجر دکھا کر پھسلا لو جی چاہے تو ڈنڈا دکھا کر دھمکا لو۔

بھٹو صاحب کے لعن طعن کا واحد نشانہ فوج نہ تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی سخت سست کہتے رہتے تھے۔ ان پر بدعنوانی اور اقربا پروری کا الزام لگاتے۔ انہوں نے ہر ایک کی چن چن کر خبر لی اور جس مخمصے میں وہ اس وقت پھنسے ہوئے تھے اس کے لیے فرداً

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

فرداً انہیں قصور وار ٹھہرایا۔ ممتاز پر بدعنوانی اور ہر طرح سے اپنا الو سیدھا کرنے کا الزام لگایا شیخ رشید پر "جیزک دواؤں" کے حوالے سے نزلہ گرا۔ حفیظ کو رنگیلے شاہ بنے پھرنے پر لتاڑا گیا۔ سیاستدان دو ایک دن تو اس زبانی چابک زنی کو سہتے رہے۔ اس کے بعد ممتاز نے فیصلہ کیا کہ بس بہت ہو گیا۔

اگلے دن اس نے بھٹو صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے ساتھی قیدیوں سے کہا کہ بھٹو صاحب سے کہہ دیں کہ وہ علیل ہے۔ گو بھٹو صاحب اقتدار سے الگ ہو چکے تھے۔ لیکن اصل وجہ کو ان سے پھر بھی چھپانا پڑتا تھا۔

بعض اوقات بھٹو صاحب زیادہ خوشگوار موڈ میں ہوتے اور مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے۔ وہ انہیں بتاتے کہ اگلے سال ان کے لیے کتنے اہم ہیں۔ کس طرح انہوں نے یہ امید کی تھی کہ وہ ان اصلاحات کو مستحکم اور نافذ کریں گے جن کی بدولت تاریخ میں ان کا ایک اعلیٰ مقام یقینی ہو جائے گا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ جنرلوں نے ان کے ساتھ ہاتھ کیا ہے۔ ابھی وہ پوری طرح اڑنے نہ پائے تھے کہ پر قینچ کر دیے گئے۔ ایک تقدیر ساز شخصیت جس پر خود اس کے مستقبل کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔

میں محسوس کر سکتی تھی کہ وضع حمل کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ میں مری میں ڈاکٹر کے پاس گئی جس نے مجھے بتایا کہ شہر میں سول اینڈ ملٹری ہسپتالوں میں زچگی کے لیے کوئی سہولتیں موجود نہیں۔ میں ششدر رہ گئی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں حیران ہوتی رہی کہ مری میں عورتیں بچہ جننے کے لیے کہاں جاتی ہیں۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میدانی علاقے کو لوٹ کر دردیں شروع ہونے کا انتظار کروں۔

تین دن بعد گھر پر ایک بہت بڑی کالی لیموزین آکر رکی جس پر فوجی لائسنس پلیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ مصطفیٰ مسکراتا ہوا کار سے باہر آیا۔ ہم سب بالکل ہک دک رہ گئے۔ میں اس سے مل کر خوش ہوئی۔ اس نے اپنی بیوی کے پاس آنے کے لیے جنرلوں سے خصوصی اجازت حاصل کی تھی۔ وہ جنرل ضیاء سے ملا تھا اور اس سے بات چیت کر چکا تھا۔ اس نے رات میرے پاس گزاری اور علی الصبح آمر کی کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔

میرے پاس مصطفیٰ کی آمد سے بھٹو صاحب سمیت اس کے ساتھ قیدیوں کے ذہنوں میں سخت شبہات پیدا ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ مصطفیٰ کو جنرل ساتھ لے گئے ہیں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے پیٹھ پیچھے کوئی سودے بازی ہو رہی ہے۔ جنرلوں نے اس شبہے کو ہوا دینے کے لیے مصطفیٰ کو اگلے چند دن تک راولپنڈی میں روکے رکھا۔

انہوں نے اسے باقیوں سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ مصطفیٰ ان کا آلہ کار معلوم ہونے لگا۔ اس نے مجھ سے ملنے کی درخواست بالکل بھولپن میں کی تھی۔ اسے یہ خیال تک نہ آیا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ جنرلوں کو معلوم تھا کہ اگر وہ مصطفیٰ سے اکیلے میں ملیں گے تو اس کی شہرت داغدار ہو جائے گی۔ جنرلوں کو اچھی طرح علم تھا کہ سیاستدان انہیں کتنی حقارت سے دیکھتے ہیں۔

دو دن بعد جنرل ضیاء نے بھٹو صاحب اور دوسرے سیاستدانوں کو رہا کر دیا۔ بھٹو صاحب بذریعہ ہیلی کوپٹر اسلام آباد چلے گئے۔ مصطفیٰ گھر آ گیا۔ مجھے دردِزہ شروع ہوا اور نصیبہ، اپنے والد کی رہائی کے چند روز بعد 29 جولائی 1977ء کو پیدا ہوئی۔

ہم لاہور چلے آئے۔

نصیبہ، جو چند دن کی تھی، ہمارے بستر پر سوتی تھی۔ مصطفیٰ نے اسے سر پر پکی مٹی کا بنا ہوا نیم مدور گھیرا پہنا دیا۔ کہنے لگا کہ اس طرح نصیبہ کا سر چپٹا رہے گا۔ اس پرانے، ازمنۂ وسطیٰ کے طریقے کی طبی نقطۂ نظر سے کوئی تک نہ تھی۔ مصطفیٰ اسے پہنائے رکھنے پر مصر تھا۔ نصیبہ کو اس عجیب و غریب اور بندشی گورکھ دھندے کی وجہ سے، بڑی بے آرامی محسوس ہوتی۔ وہ کروٹ تک نہ لے سکتی۔ ساری رات روتی رہتی۔ اس کے سر کے گرد یہ گھیرا بہت تنگ تھا۔ بچی کے سر کو چپٹا رکھنے کے لیے اس اول جلول اور پسماندہ طریقے پر مجھے کوئی اعتماد نہ تھا۔

میں چاہتی تھی کہ میرے بچی پیٹ کے بل لیٹے تاکہ اسے دودھ پیتے وقت اُچھو نہ لگے۔ مصطفیٰ مشہور ماہرِ اطفال، ڈاکٹر سپوک، بننے پر بضد تھا۔ مجھے یہ بھی اجازت نہ تھی کہ نصیبہ کو گود میں اٹھالوں۔ بچی کا چہرہ اضطراب کے مارے اودا پڑ گیا تھا۔ نصیبہ کی ہاؤہُو سے مصطفیٰ کے آرام میں خلل پڑتا۔ وہ اسے زبردستی چپ کرانے کے درپے ہو جاتا۔

میں بہت خوف زدہ ہوئی۔ میں ملازموں کی زبانی سن چکی تھی کہ وہ شیری کی بیٹی، آمنہ، کے ساتھ کس طرح پیش آیا کرتا تھا۔ اگر بیچاری بچی اس وقت رونے لگتی جب اس کے والدین سوئے ہوتے تو مصطفیٰ اُسے اٹھا کر پلنگ کے نیچے دھکیل دیتا۔ اسے صرف اپنے ذہنی سکون سے غرض تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بچی کے واویلے کو روکنے کے لیے اس نے بچی کے منہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھ دیا۔ اس بات کے خیال ہی سے دل میں ہول اٹھنے لگتا۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص تو بڑی آسانی سے میرے بچی کا گلا گھونٹ سکتا ہے۔ اب ایک اور جان کی حفاظت بھی میرے گلے پڑ گئی۔ خود اپنا بچاؤ کرنا ہی خاصا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ بچی کی حفاظت کی خاطر میں پہلے سے بھی زیادہ مصلحت آمیز رویہ اختیار

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کرنے پر مجبور ہو گئی۔ نصیبہ کی وجہ سے میرے تناؤ میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس میں بچی کا اپنا کوئی قصور نہ تھا۔

میری شادی میں بہیمیت کا جو عنصر راہ پا گیا تھا اسے مجھے اپنے خاندان سے چھپائے رکھنا پڑا۔ امی ہمارے پاس مقیم تھیں۔ وہ لندن سے خاص طور پر اس لیے آئی تھیں کہ نصیبہ کی ولادت کے وقت میرے پاس موجود رہیں۔ معاشرے کے جس طبقے سے امی کا تعلق تھا اس کے افراد ان کے داماد سے رسم و راہ بڑھانے کے حق میں نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مصطفیٰ، جسے عورت بازی کی لت تھی، اس قابل نہیں تھا کہ معزز لوگ اسے منہ لگائیں۔ مجھے یاد ہے کہ امی کی ایک سہیلی ان سے ملنے کے لیے مصطفیٰ کے گھر آنے کو تیار نہ ہوئی۔ امی بھی اڑ گئیں۔ انہوں نے سہیلی کے گھر جانے سے انکار کر دیا۔ مصطفیٰ کو معاشرے میں باعزت مقام دلانے کی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ گورنر یا وزیراعلیٰ کے عہدے اور ان سے وابستہ اقتدار اسے ہمارے طبقے کی نظر میں محترم نہ بنا سکے تھے۔ اب چونکہ مصطفیٰ ان کا داماد بن چکا تھا اس لیے امی اصلاحِ احوال کی خواہاں تھیں۔

ہمارے تعلقات کو تشدد کسی اٹل مرض کی طرح چمٹ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ امی کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ میرا گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

میری بچی کی پیدائش کے تین دن بعد مصطفیٰ کے اندر چھپے حیوان کو پھر جنون چڑھا۔ اسے میری صحت کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ تھی۔ وہ کسی غضب آلود حیوان سے مشابہ تھا۔ میرے احساسات غیراہم تھے۔ میرا احتجاج اسے مزید تشدد کرنے پر اکساتا تھا۔ اسے روکنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس نے لحاظ اور رحم کو بالائے طاق رکھا اور میرے جذبات کو پرکاہ بھی نہ جانا۔ اس غصے بھرے وحشی ابال سے اسے لذت ملی، میرے حصے میں اذیت آئی۔ میں غسل خانے کا دروازہ مقفل کر کے چپ چاپ روتی رہی مبادہ وہ میری آواز سن لے۔

امی کو نواب صادق حسین قریشی کے گھر ایک ڈنر پر مدعو کیا گیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی ساتھ چلوں۔ میں نے مصطفیٰ سے پوچھا کہ چلی جاؤں۔ ڈنر خواتین کے لیے تھا۔ اس لیے وہ شریک نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے جھنجلا کر اجازت تو دے دی لیکن کہا کہ یہ آخری بار ہے۔ آئندہ اجازت نہیں ملے گی۔ میں نے کپڑے بدلے۔ شادی کے بعد میں پہلی بار اس کے بغیر کہیں جا رہی تھی۔ مصطفیٰ نے کہا کہ رات کو ہر حالت میں ٹھیک ساڑھے دس بجے واپس آنا ہو گا۔ وقت کی پابندی تھوڑی سی نرم کرانے کے لیے میں نے کچھ بحث کرنی چاہی۔ اس نے میری ایک نہ سنی۔

میری ساری شام تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلاک کی طرف دیکھنے میں گزری جو ڈراؤنے انداز میں وقت کو کتر کتر کر کم کیے جا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ امی کو میری اضطراب کا پتہ چلے۔ ڈنر ساڑھے دس بجے پیش کیا گیا۔ امی کو کوئی جلدی نہ تھی۔ وہ یہ دیکھ ہی نہ سکیں کہ بدحواسی کے مارے میرے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ ساڑھے دس بجے مصطفیٰ کا فون آیا۔ "اگر تم پانچ منٹ کے اندر اندر گھر نہ پہنچیں تو میں تمہیں ٹھیک کر دوں گا۔" میں سہم گئی۔ میں امی سے کہتی رہی کہ مجھے گھر پہنچنا ہے۔ یہ بہانہ بنانا تو ممکن نہ تھا کہ نصیبہ کو دودھ پلانا ہے۔ نصیبہ میرے ساتھ تھی۔ امی کسی گفتگو میں منہمک تھیں۔ وہ میری "چلیے، چلیے" کی رٹ کو خاطر میں نہ لائیں۔

ہم گھر پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔ امی اپنے بیڈروم میں چلی گئیں۔ میں "جل تو جلال تو....." کا ورد کرتی گھسٹتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ مصطفیٰ میرا منتظر تھا۔ اس نے نصیبہ کو میری بانہوں سے چھین کر بستر پر پھینک دیا اور مجھے مارنے لگا۔ ساتھ کے کمرے میں امی تھیں۔ میں اپنی چیخوں کو ضبط کرتی رہی۔ جب مجھ پر مکوں تھپڑوں کی بارش ہو رہی تھی تو میں نے خود کو صرف دبی دبی سسکیاں لینے پر مجبور پایا۔ "امی سن لیں گی۔" "اوپر چلو" اس نے دھمکاتے ہوئے کہا۔

میں نے نصیبہ کو اٹھایا جو گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتا ہوا مجھے اوپر اذیت خانے کی طرف لے چلا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ دو ہفتے کی بچی نے خطرے کی بُو سونگھ لی۔ اس نے بچی کو میری بانہوں سے چھین لیا اور ایک حواس باختہ بچی کی مسلسل چیخ پکار کی دھن پر مجھے دُھننا شروع کر دیا۔ میری ساڑھی لیرلیر ہو گئی۔ مجھے چیخنے چلانے کی ضرورت نہ تھی۔ میری بچی کی چیخوں نے میری چیخ پکار کی کمی پوری کر دی۔

اگلی صبح میں امی کے سامنے اس طرح آئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں دنیا سے اپنے احساسات اور اپنی چوٹوں کے نشان چھپانا سیکھتی جا رہی تھی۔

بھٹو صاحب نے اپنا مقدمہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہی عوام جنہیں بھٹو صاحب خطابت کے جوہر دکھا کر، گویا جادو کے زور سے، منظرِعام پر لے آئے تھے اور جو ان کے دیے ہوئے ایک نعرے کی وجہ سے روٹی، کپڑے اور مکان کے خواب دیکھنے لگے تھے، وہ خاک بسر جو دھول جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے، جنہوں نے بھٹو صاحب کی دعوت پر لبیک کہا تھا۔ بھٹو صاحب لاہور پہنچے، کار پر سوار جسے مصطفیٰ چلا رہا تھا۔ پرانے دنوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ جو ہجوم ان کے جلسوں سے دُور دُور رہنے لگا تھا، جو کبیدہ خاطر اور بیگانہ ہو گیا تھا، اب اچانک سامنے آ گیا۔ ہجوم میں جوش و خروش کی لہر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

دوڑ رہی تھی۔ ظلم رسیدہ کو سینے سے لگانے والا لیکن وزیراعظم سے، بے اعتنائی برتنے والا ہجوم۔ اس ہجوم میں ایسے چہرے بھی تھے جو بھٹو صاحب کو چھوڑ کر چلے گئے تھے، جنھوں نے ان کے دشمنوں سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اب وہ سب بھٹو صاحب کی واپسی پر انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے جمع تھے۔ تقریباً ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے بھٹو صاحب کی ساری غلطیاں معاف کر دی ہیں۔ وہ اپنی بے اعتنائی سے بھٹو صاحب کو کافی سزا دے چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بھٹو صاحب واپس آ کر ان کی سپاٹ اور بے کیف زندگیوں میں تھوڑا سا رنگ گھول دیں۔ اگر بھٹو صاحب کو دیکھ کر ہجوم مسحور ہو گیا تھا تو ہجوم پر نظر ڈال کر خود بھٹو صاحب کے رگ و پے میں بجلی دوڑ گئی تھی۔ وہ خوشی اور فخر سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ ان کے عوام لوٹ آئے تھے۔ وہ متحد ہو کر غاصب کو نکال باہر کر دیں گے۔ وہ متحد ہو کر ضیاء پر مقدمہ چلائیں گے اور اسے سزا دیں گے۔ فضا میں گویا جلی حروف میں تحریر تھا۔ "ہم نے تمہاری کمی صرف اس وقت محسوس کی جب تم ہمیں چھوڑ گئے۔"

بھٹو صاحب کا کار جلوس جوں کی چال چلتا نواب صادق حسین قریشی کے گھر کی طرف رینگتا رہا۔ ٹھاٹھیں مارتا ہجوم آمر کے حق میں بدترین ڈراؤنا خواب بن گیا۔ لوگ اپنے قائد کے قریب ہونا چاہتے تھے۔ انہوں نے گھر کے پھاٹک توڑ دیے، کھڑکیاں چور چور کر دیں، دیواروں پر چڑھ گئے، لانوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ چھوڑی، درختوں کی پھننگوں پر ڈیرے ڈال دیے، خطرناک انداز میں بجلی کے کھمبوں سے چمٹے رہے۔ انہوں نے اپنے قائد کی جھلک دیکھ لی۔ وہ اس آواز کو دوبارہ سننے کے خواہاں تھے جسے خاموش کر دیا گیا تھا۔ اپنے جوش و خروش میں انہیں نتائج کی پروا نہ رہی۔ انہیں یہ پتہ نہ چلا کہ اس دن انہوں نے بھٹو صاحب کے موت کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں۔

بھٹو صاحب بالکنی میں نمودار ہوئے۔ وہ خود کو محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ "ان کا قد ہمالیہ کو چھو رہا تھا۔" جنرل بالشتیے تھے۔ انہوں نے ولولہ خیز تقریر کی۔ "جنرل ضیاء غداری کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے آئین میں تحریف کی ہے۔ پاکستان کے عوام غدار کو نہیں بخشیں گے۔ فوج کو کوئی حق نہیں کہ عوامی نمائندوں کو برطرف اور منتخب وزیراعظم کو معزول کر کے غاصبانہ انداز میں اقتدار پر قبضہ جما لے۔" یہ سرمستی جلد ہی ہوا میں تحلیل ہونے کو تھی۔ ٹینک اور توپیں منشائے عوام سے زیادہ حقیقی ثابت ہوئیں۔

بھٹو صاحب، اسلام آباد پہنچے اور پیر آف مکھڈ کے ہاں رہنے لگے۔ مصطفٰے اور میں جتوئی صاحب کے گھر اٹھ آئے۔ مصطفٰے بھٹو صاحب سے ملنے گیا تو انہیں کھچا کھچا اور

سرد مہر پایا۔ مصطفٰے نے انہیں بتایا کہ جنرلوں کے ساتھ ملاقات میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس نے کہا کہ جنرل بھٹو صاحب کو جسمانی طور پر ختم کرنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ وہ بھٹو صاحب کو بخشیں گے نہیں۔ اس نے سمجھا بجھا کر بھٹو صاحب کو اپنا سخت گیر موقف بدلنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ اقتدار جنرلوں کے پاس تھا۔

بھٹو صاحب، قائل نہ ہوئے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ انہوں نے دوبدو مقابلہ کرنے کا جو انداز اپنایا ہے اس سے جنرلوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ اگر اس مرحلے پر کوئی کمزوری دکھائی گئی تو صرف فوج کی طاقت میں اضافہ ہو گا۔ حفیظ کو یقین تھا کہ عوام اپنے قائد کو بچانے کے لیے سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ انہیں آراء کا غلبہ رہا۔ مصطفٰے جانتا تھا کہ جس کے پاس توپ و تفنگ ہے وہی اقتدار کی جنگ جیتے گا۔ یہ سوچنا کہ لوگ اچانک اور خود بخود بغاوت کر دیں گے غیر حقیقی خیالوں میں گم رہنے کے مترادف تھا۔ حفیظ پرچھائیوں کے پیچھے بھاگا پھر رہا تھا۔ اس نے غلطی سے عوامی تجسس کو عوامی حمایت سمجھ لیا تھا۔ مصطفٰے نے اپنے موقف کی وکالت آپ کی اور بھٹو صاحب سے کہا کہ وہ اسے جنرل ضیاء سے دوبارہ ملنے کی اجازت دیں تاکہ وہ ازسرنو اندازہ لگا سکے کہ جنرل کیا سوچ رہے ہیں۔ بھٹو صاحب نے یہ درخواست منظور کر لی۔

ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ جنرل ضیاء، جنرل عارف اور جنرل چشتی مصطفٰے سے ملے۔ انہوں نے مصطفٰے کو سراہا اور کہا کہ انہیں پنجاب میں اسی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ وہ بھٹو صاحب سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ بھٹو صاحب کے تکبر کو تھوڑا سا زائل کرنے کی اگر ضرورت پیش آئی تو زبردستی سے کام لینا ہو گا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ بھٹو صاحب کی بقا کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے موقف کی تصحیح کر لیں۔ بھٹو صاحب سمجھتے تھے کہ اپنے موقف سے ذرا بھی ہٹنا سیاسی خودکشی کے برابر ہو گا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خودکشی کر لیں گے لیکن اپنے سیاسی ورثے کو داؤ پر نہیں لگائیں گے۔

اس ملاقات کے دوران مصطفٰے کو بتایا گیا کہ بھٹو صاحب کو اگر جلاوطن ہونے کا خیال آئے تو جنرل اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ وہ صرف ایک ہی ضمانت چاہتے تھے۔ وہ یہ کہ بھٹو صاحب سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی آدمی سے کہا جائے کہ زندہ رہو لیکن آکسیجن کے بغیر زندہ رہنا ہو گا۔

مصطفٰے نے بھٹو صاحب سے مل کر جنرلوں سے ملاقات کی روداد بیان کی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ جنرل اسے سرکاری گواہ کے طور پر استعمال کریں گے۔ وہ بھٹو صاحب سے بے وفائی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بھٹو صاحب سے کہا کہ وہ اسے ملک سے باہر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جانے کی اجازت دے دیں۔ اس نے اپنے قائد کی بھی منت کی کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ملک سے فرار ہو جائیں۔ بھٹو صاحب صورتحال کی سنگینی کو سمجھ تو گئے لیکن جانتے تھے کہ وہ اپنی کشتیاں جلا چکے ہیں۔ وہ فرار نہ ہو سکتے تھے۔ انہیں یہیں رہ کر اپنی جنگ لڑنی ہوگی۔ ان کے سامنے عمل کی بہت کم راہیں باقی رہ گئی تھیں۔ انہوں نے متحدہ عرب امارات کے سفیر کو طلب کر کے اس کا مصطفیٰ سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد انہوں نے شیخ زید کے نام ایک رقعہ لکھا جس میں مصطفیٰ کو "میرا بھائی" کہہ کر متعارف کرایا گیا۔ انہوں نے ابوظہبی کے حکمراں سے کہا کہ مصطفیٰ کو ہر ممکن مدد فراہم کی جائے۔ اس ملاقات کے وقت بھٹو صاحب کا معتبر خدمتگار، نورا، بھی موجود تھا۔

اس کے بعد جلد ہی بھٹو صاحب کو ایک قتل کے الزام میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ جنرلوں پر ہراس طاری ہوگیا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کے عدالتی قتل کا منصوبہ گانٹھ رہے تھے۔

ہم لاہور میں تھے۔ مصطفیٰ جنرلوں سے ایک اور ملاقات کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنرل چشتی اور جنرل راؤ فرمان علی سے اس کا مسلسل رابطہ تھا۔

ہم ایک شادی پر گئے ہوئے تھے۔ ایک آدمی نے مصطفیٰ کے پاس آ کر اسے جنرلوں کا خفیہ پیغام پہنچایا۔ مصطفیٰ اور میں گھر چلے آئے اور مصطفیٰ نے جنرل چشتی سے بات کی۔ پھر اس نے کہا کہ ہمیں نصیبہ کو چھوڑ کر فوراً اسلام آباد جانا پڑے گا۔ وہاں سے ہمیں لندن روانہ ہونا تھا۔

ہم کار کے ذریعے اسلام آباد پہنچے۔ دارالحکومت میں بے مقصد ادھر ادھر گھوم کر وقت گزارا۔ ہم کسی کو نہ بتا سکتے تھے کہ ہم پرواز کرنے والے ہیں اور ہماری منزل جلاوطنی ہے۔ یہ اکتوبر 1977ء کی بات ہے۔ عید کا دن تھا۔ لندن جاتے ہوئے ہم عمرہ کرنے مکہ معظمہ رکے۔ مصطفیٰ نے خانہ کعبہ کو ہاتھ لگا کر قسم کھائی کہ وہ باقی زندگی کسی اور عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔

باب - ۷

دیکھا جو تیر کھا کے ....

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جو ذہن شہری ماحول کا پروردہ ہو اس کا کسی جاگیردار سے واسطہ صرف رومانی ناولوں میں پڑ سکتا ہے۔ ان کو، جنہوں نے نوجوانی میں تازہ تازہ قدم رکھا ہو، ملز اینڈ بُون کے جعلی، نرے گتے کے بنے کرداروں کے قصے اور جیارجیٹ ہیئر کے سرور انگیز عشقیہ رومان پڑھ کر بڑا لطف آتا ہے۔ جاگیردار سائیں کسی اور دنیا کی ہستی معلوم ہوتا ہے۔ بالعموم اسے قد آور، سانولا اور خوبرُو دکھایا جاتا ہے جس کی آنکھیں چمکتی رہتی ہیں اور رگوں میں جپسی لہو کی خفیف سی آمیزش شامل ہوتی ہے۔ اس کا غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے اور وہ بڑے جوشیلے انداز میں پیار کرتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ان مردوں کی مثالی تصویر بن کر سامنے آتا ہے جو عورتوں کو کوئی گھٹیا مخلوق سمجھتے ہیں۔ وہ عورتوں سے ناروا سلوک کرتا ہے اور اس کے باوجود عورتیں اسے دل دیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ جاگیردار کی بیپروانہ اکڑفوں سے متاثر ہو کر ہیروئن اس کے دام میں پھنس جاتی ہے۔ نوخیز قارئین کے دل یہ دیکھ کر دھک دھک کرتے رہتے ہیں، کہ خونخوار ترین شمشیرزنوں کی اس کے سامنے ایک نہیں چلتی، وہ ان کے وار خالی دینے میں ماہر ہے اور ہر بار اپنے مشکی رہوار پر سوار شفقِ شام میں یوں اتر جاتا ہے جیسے دنیا میں اس کا یہی ایک مشغلہ ہو۔ حقیقت کہیں زیادہ معمولی اور بے رنگ ہے۔

مصطفیٰ کھر کا تعلق پنجاب کے کھرل قبیلے سے ہے۔ یہ اصل میں راجپوت تھے۔ اب

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

خود کو جاٹ کہتے ہیں۔ راجپوت کھرل مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ پنجاب کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان کی بڑی بڑی آبادیاں جالندھر، ساہیوال، بہاولپور اور ملتان کے اردگرد ہیں۔ وہ راوی کے دوآبے میں یعنی جہاں راوی اور چناب کا سنگم واقع ہے وہاں سے ساہیوال اور لاہور کی درمیانی حد تک بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ کھرل دو بڑے گروہوں، وڈے راوی قبائل اور نکے راوی قبائل میں منقسم ہیں۔ اول الذکر کا صدر مقام کوٹ کمالیا ہے۔ تاریخی طور پر دونوں قبیلوں میں ہمیشہ سے چلتی آئی ہے۔ ان میں صرف ایک قدر مشترک ہے۔ دونوں کو جھنگ کے سیالوں سے نفرت ہے۔

کھرل قبیلے کی شہرت ہمیشہ شورش پسندی کے حوالے سے رہی ہے۔ وہ اپنا شجرہ نسب بھوپا سے ملاتے ہیں، جو خود راجہ کرن کے اخلاف میں سے تھا۔ وہ اچ شریف میں آباد ہوا اور وہاں مخدوم شاہ جہانیاں کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا۔

ایلفنسٹن نے آبادکاری کے بارے میں اپنی رپورٹ میں کھرلوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ان کے بارے میں ہمیشہ سے یہ مشہور ہے کہ مصائب سہنے اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرنے میں، کھاتیوں کے سوا، ان کا کوئی ثانی نہیں۔ لیکن جس علاقے میں وہ آباد ہیں وہ زیرکاشت رقبے میں تیزرفتار توسیع کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس چیز سے خالی ہوتا جا رہا ہے جو ان کے لیے سب سے زیادہ تقویت کا باعث تھی۔ میری مراد گھنے جنگل سے ہے۔ لہذا ماضیٔ قریب تر میں، شورش برپا ہونے کے بعد، بڑی تعداد میں فوج آتے ہی، وہ اپنا علاقہ خالی کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور یوں اپنے قریوں کی تاراجی سے انہیں خاصا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ ان کے سب سے نامور رہنما، احمد خاں کھرل، نے، ستمبر ۱۸۵۷ء میں کیپٹن بلیک کے ماتحت فوجی دستے سے لڑتے ہوئے مارے جانے سے پہلے، کم از کم پانچ بغاوتوں میں، جو سب کی سب ایک حد تک کامیاب رہیں، کھرل قبائل کے مشترکہ لشکر کی قیادت کی۔ ان بغاوتوں کا اصل مقصد ہندوؤں اور کھتریوں کو لوٹنا تھا۔ اپنی کوشش میں کامیاب ہونے کی انہیں بالعموم اتنی قیمت ادا کرنی پڑتی کہ امن بحال ہونے کے بعد ان پر نذرانے کے نام پر واجبی سا جرمانہ عائد کر دیا جاتا۔ ان کامیابیوں کی وجہ سے احمد خاں کھرل کا شہرہ دُور دُور تک پھیل گیا اور اسے "بڑے راوی" کے تمام علاقے میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا۔ اس کا ثبوت ۱۸۵۷ء کی سرکشی ہے جس کا منصوبہ بظاہر اسی نے تیار کیا تھا اور شورش کو منظم کرنے میں بھی اسی کا ہاتھ تھا۔ قد کے اعتبار سے کھرل اوسط قامت سے اونچے ہوتے ہیں۔ ان کے نقش بہت تیکھے ہیں اور ان میں غیر معمولی توانائی اور قوتِ برداشت پائی جاتی ہے۔ باقی سب جاٹوں کی طرح انہیں بھی راجپوت نسل ہونے کا ادعا ہے اور اسی طبقے کی طرح وہ کھیتی باڑی کرنے والے تمام لوگوں کو قدرے تحقیر کی نظر

سے دیکھتی ہیں۔ چنانچہ ان کے دیہات میں کاشتکاری کو کلی طور پر بسی وانوں اور نیچ ذات والوں پر چھوڑ دیا گیا ہے اور کھرل مالک پیداوار میں سے اپنا حصہ وصول کرنے پر قناعت کرتے ہیں۔ ان کے پاس صرف سیلابی زمینیں ہیں۔ ان کے متوسلین تک کو کھیتی باڑی جیسا کام بھی نہایت مشقت طلب معلوم ہوتا ہے۔"

ایک اور مستشرق، منتظم اور عالم، پرسر کا کہنا ہے کہ کھرل "شادی بیاہ کے موقع پر بہت فضول خرچی کرتے ہیں۔ مسافر نواز ہیں۔ چوری چکاری کی عادت بھی ہے۔ زراعت سے بہت کم لگاؤ ہے۔ آج بھی، خصوصاً شادی کے موقع پر، بہت سی ہندوانی رسموں پر عمل کرتے ہیں۔" ایک فارسی کہاوت ہے کہ "ڈوگر، بھٹی، وٹو اور کھرل سب شورہ پشت ہیں اور کشتنی۔" لیپل گریفن لکھتا ہے۔ "تاریخ کے تمام ادوار میں کھرل شورش پسند، وحشی اور سارق قبیلہ رہے ہیں۔ اس بات کی کبھی تاب نہیں لا سکتے کہ انہیں جکڑ کر رکھا جائے۔ ماردھاڑ اور لوٹ مار کر کے خوش رہتے ہیں۔ باقی مسلمان قبیلوں کی بہ نسبت زیادہ کٹر ہیں اور انہوں نے ہندو راج کے سامنے انتہائی ناخوشی سے سر جھکایا۔ دیوان ساون مل اور سکھ انہیں باز رکھنے کے لیے اس سے زیادہ کرتے بھی کیا۔ بات یہ تھی کہ ان کے خلاف جب بھی کوئی منظم فوج بھیجی جاتی وہ پسپا ہو کر دلدلی علاقوں اور گھنے جنگلوں میں ڈیرے ڈال لیتے جہاں ان کا تعاقب کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ احدی اور فتنہ پرداز ہیں، برے کاشتکار اور بدنام چور ہیں۔ اپنی ذات کی حد تک قد آور اور خوبرو ہیں اور عادتوں کے لحاظ سے خانہ بدوش اور لٹیرے۔"

کھرل قبیلے کی کھر شاخ کو اپنا نام زیادہ پُرلطف انداز میں ملا۔ خطۂ لاہور سے تعلق رکھنے والے کھروں کے ایک ٹولے نے ملتان میں گنے کے ایک کھیت کے پاس پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے گنے کاٹ کر کچھ اپنے مویشیوں کو کھلا دیے اور کچھ کو جوڑ جاڑ کر جھونپڑیاں بنا لیں۔ جب کھیت کے مالک نے گلہ کیا تو انہوں نے بھولپن سے کہا کہ وہ سمجھتے تھے کہ گنا کسی قسم کا بیج ہے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا وہ کون ہیں تو انہوں نے فخر سے کہا کہ وہ کھرل ہیں۔ بذلہ سنج مالک نے رعایت لفظی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ "تم کھرل نہیں، خر ہو جس کے معنی فارسی میں گدھا ہیں۔" یہ شاخ ملتان سے ملحق مظفر گڑھ میں دریائے سندھ کے کنارے آباد ہو گئی۔

بہر کیف، کھر اپنے نام کی ابتدا کی وجہ کچھ اور بیان کرتے ہیں۔ کھرلوں کے پیر قبیلے کے عام افراد سے برتر سمجھے جاتے تھے۔ علماء اور ان کے مریدوں میں فرق کرنے کے لیے ثانی الذکر خود کو کھر کہنے لگے۔

کھر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوک سیان کے رومانی ہیرو مرزا جٹ کی اولاد ہیں جو

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

صاحباں کو لے اڑا تھا اور جس کا نام پنجاب کے قلب و نظر پر نقش ہو چکا ہے۔ کھر رومانی مزاج کے مالک ہیں۔ ان کی رومان پسندی کی اصلاح ناممکن ہے۔

کھر خاندان کی تاریخ کچھ افسانہ ہے، کچھ تذکرۂ اولیا ہے۔ یہ تاریخ نسل در نسل زبانی منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ مصطفےٰ کے اب وجد نے کوٹ ادو کا رخ اس لیے کیا کہ انگریز اپنی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرتے رہو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انہیں دوسرے قبائل سے جنگ کرنے پر اکسانے کی کوشش کر رہے تھے۔ خاندان کے بزرگ افراد برطانوی راج کے خلاف تھے اور سفید آقاؤں کے خلاف احمد خاں کھرل کے کارہائے نمایاں کی یاد ابھی تازہ تھی۔ انہوں نے نقلِ مکانی شروع کر دی۔ قبیلہ شیر خوار بچیوں کو ہلاک کرنے کا عادی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس عظیم نقلِ مکانی کا آغاز ہوا تو تمام عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ کھرل چاہتے تھے کہ دوران سفر ان پر کسی قسم کا بوجھ نہ ہو۔ انہیں پتہ تھا ان کی عورتیں دوسرے غارت گر قبائل کا ہدف بن جائیں گی۔ اس لیے انہیں مار ڈالنا مسئلے کا زیادہ آبرومندانہ حل تھا۔ وہ نقلِ مکانی کر کے دریائے سندھ کے کنارے کنارے آباد ہو گئے۔

مصطفےٰ کے دادا نے چار شادیاں کیں۔ ہر بار اس کی بیوی پورے پورے گاؤں اپنے جہیز میں لائی۔ ان دیہات کے علاوہ بابا نے اپنی مقتول عورتوں کے سونے اور زیورات کی مدد سے، جو وہ ساتھ لانا نہ بھولا تھا۔ زرخیز زمین کے بڑے بڑے رقبے خرید لیے۔ مربع بھر زمین صرف چار آنے میں مل جاتی تھی۔

اس کی ایک بیوی کا نام سناواں تھا۔ وہ اپنے جہیز میں ایک گاؤں لائی تھی جو آج بھی اس کے نام سے منسوب ہے۔ خریداری اور ازدواجی رشتوں سے دادا کی جاگیر میں کوٹ ادو اور ڈوگر کا بھی اضافہ ہوا۔ ان بزرگوار کے تین بیٹے ہوئے۔ ان میں سے ایک طفولیت میں فوت ہو گیا۔ یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ پرانے خانہ بدوش طور طریق چھوڑ کر کسی جگہ ٹک کر رہا جائے۔ جو زمین پہلے پورے قبیلے کی شاملات تھی اسے اب صرف ایک خاندان کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ قبائلی معاشرے سے جاگیردارانہ معاشرے کی طرف سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔

دونوں بیٹوں، محمد یار کھر اور احمد یار کھر کے سماجی قدوقامت میں اضافہ ہوتا گیا۔ محمد یار کھر بہت بچہ خیز واقع ہوئے تھے۔ ان کے پچیس سے زیادہ اولادیں ہوئیں۔ انہوں نے بہت ہی کم عمر میں شادی کی تھی۔ جب ان کی بیوی فوت ہوئی تو انہوں نے دوبارہ شادی کر لی۔ نئی بیوی ملتان کی کوئی رقاصہ تھی۔ اس رقاصہ کی بہن کی شادی ڈیرہ غازی خاں کے سردار مزاری سے ہوئی۔ رقاصہ بیوی کی وفات کے بعد محمد یار کھر نے مصطفےٰ کی والدہ

سے شادی کی۔ وہ ساٹھ برس کے اور مصطفےٰ کی والدہ سولہ برس کی تھیں۔ مصطفےٰ کی والدہ کے سولہ بچے ہوئے۔ ان میں سے سات بیٹے اور ایک بیٹی زندہ ہے۔

مصطفےٰ کی والدہ کا تعلق ملتان شہر سے تھا۔ انہوں نے جاگیردارانہ طرز زندگی اس طرح اپنا لی جیسے وہ ان کی فطرت ثانیہ ہو۔ وہ قبیلے کی تمام رسوم اور روایات کی نہایت احتیاط سے پابندی کرتیں۔ انہوں نے خود کو سرتاپا قبیلے کے رنگ میں رنگ لیا۔ انہیں بیٹیاں جننے سے نفور ہو گیا۔ اگرچہ قبیلے نے نوزائیدہ بیٹیوں کو ہلاک کرنے کا سلسلہ ترک کر دیا تھا، اس کے باوجود مصطفےٰ کی والدہ، جب بھی ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی، اپنی کوفت کا اظہار ضرور کرتیں۔ بیٹی جننا عورت کی کمزوری کی دلیل تھی۔ یہ ایک ان لکھا فرمان تھا جسے قبیلے کی تائید حاصل تھی۔

جانے کیسے، ایک کے سوا ان کی تمام بیٹیاں فوت ہو گئیں۔ سرگوشیوں میں کہا جاتا تھا کہ بیٹیوں کی موت کی ذمے دار وہ آپ ہیں۔ ان کی اموات کے گرد زبردست اسرار کا حصار تھا۔ چھوٹی بچیوں کو پہلے عام زکام یا معمولی کھانسی ہو جاتی۔ ماں ان پر توجہ نہ دیتی تاکہ ان کی بیماری بڑھتی رہے۔ بچیوں کو پتہ چلتا کہ ان کی قوتِ مدافعت کمزور پڑتی جا رہی ہے اور بالاخر وہ مرض کی پیچیدگیوں کی تاب نہ لا کر چل بستیں۔ ان کی کبھی دوا دارو نہ کی جاتی۔

زندہ بچ جانے والی اکلوتی بیٹی، رشیدہ، کے ساتھ ماں بہیمانہ سلوک کرتی رہی۔ چھ برس کی عمر میں اسے آج کل کی کسی سنڈریلا کی طرح کھانا پکانے اور برتن مانجھنے پر لگا دیا گیا۔ بات بے بات کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے اسے بے دردی سے مارا پیٹا جاتا۔ ماں جھونٹے پکڑ کر اسے اِدھر سے اُدھر گھسیٹتی پھرتی۔ ماں کے سارے بغض کا نشانہ وہی بنتی۔ اس کی یہ غلطی کبھی معاف نہ ہو سکی کہ وہ زندہ بچ گئی تھی۔ رشیدہ کی زندگی موت سے بدتر تھی۔ ہر روز اسے چاروں طرف سے دھوئیں کے مرغولوں میں گھر کر کھلے چولہے کے سامنے بیٹھنا پڑتا۔ اس کے میلے کچیلے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں پڑی ہوتیں اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے چپاتیاں بنانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ آخر ایک روز رشیدہ کو اتنی بری طرح پیٹا گیا کہ وہ مرتے مرتے بچی۔ مصطفےٰ نے اپنی بہن کی جان بچائی اور اسے اپنے ایک مزارع کی بیوی کے حوالے کر دیا جو دائی کا پیشہ کرتی تھی۔ رشیدہ کو اسی عورت نے پالا پوسا۔

ساتوں بیٹے نظم و ضبط سے آشنا ہوئے بغیر بڑے ہوتے گئے۔ ان کے والد بہت معمر ہو چکے تھے اور والدہ کو خود کو ٹھیٹ جاگیردارنی ثابت کرنے اور بیٹی کی جان سولی پر لٹکائے رکھنے سے فرصت نہ تھی۔ مصطفےٰ اور اس کے بھائی ہوش لکے اور چھوٹے چھوٹے وحشیوں میں تبدیل ہو گئے۔

کوٹ ادو سے ملحقہ قبائلی سرزمین غیر علاقہ کہلاتی ہے۔ وہاں قبائلی سرداروں کے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

فرمان کو قانون کا درجہ حاصل ہے۔ وہاں عورتوں کا ادلا بدلا ہوتا، انہیں بیچا جاتا۔ جب عورت فروخت ہو کر کسی کی بیوی بن جاتی تو اسے میاں کی من مانیوں کے سامنے سر جھکانا پڑتا۔ میاں اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرتا جو زرخرید لونڈی باندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑی جاتی تو اس کی کونچیں کاٹ دی جاتیں تاکہ اسے وسیع و عریض صحرا رینگ کر عبور کرنا پڑے۔ مرد شکاری تھے، عورتیں ان کا شکار۔

وٹے سٹے پر عملدرآمد عام تھا۔ اس کی ابتدا یرغمال بنانے کے قدیم دستور سے ہوئی ہو گی۔ جب ایک قبیلے کی عورت کسی دوسرے قبیلے میں بیاہی جاتی تو عورت کا بھائی اپنے بہنوئی کی بہن کو بیوی بنا کر لے آتا۔ اس کارروائی سے اپنی عورت کے حقوق کا تحفظ منظور تھا۔ اپنی بیوی سے بدسلوکی کرنے والے شوہر کو بخوبی علم ہوتا کہ اس کی بہن کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ چنانچہ شادیاں ایک قسم کا دباؤ ہوتیں جن کی وجہ سے فریقین بدخلقی سے باز رہتے۔

جب بدلے میں بیوی لانے کے لیے دلہن کا کوئی بھائی نہ ہوتا تو چھوٹی لڑکیوں کو دلہن کے باپ سے بیاہ دیا جاتا۔

عورتوں کو بکاؤ مال سمجھا جاتا۔ ان کا فرضِ منصبی یہ تھا کہ کام کریں، گھر کو صاف ستھرا رکھیں، کھانا پکائیں، بچے جنیں، مرد کو لذت بہم پہنچائیں اور مار کھائیں۔ حقوق صفر، فرائض ہزاروں۔

مردوں میں شکار کے لیے جو میلانِ خاطر پایا جاتا تھا اس میں پرانے وقتوں سے اب تک کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس خمار کا تعلق ان کے ماضی سے تھا۔ انہیں خونریزی کا شوق تھا اور چھپ کر شکار کا پیچھا کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ جانور کو تکلیف سے تڑپتا دیکھ کر ان کو حال آنے لگتا۔

مصطفےٰ اور اس کے بھائیوں کے لیے زندگی شکار سے عبارت تھی۔ وہ زبردست کھوجی تھے اور اپنے صید کی تلاش میں کئی کئی دن گھر سے غائب رہتے۔ شکار زیادہ تر گھوڑے پر چڑھ کر لیکن کبھی کبھار پاپیادہ بھی کیا جاتا۔ وہ تیتر سے لے کر سانپ تک ہر چیز مارنے پر تلے رہتے۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ جس چیز کا شکار کیا جا رہا ہے وہ حرام ہے یا حلال۔ شکار کرنے کا عمل زیادہ اہم تھا۔ آسکر وائلڈ کا قول کہ "جو ناگفتنی ہیں وہ ناخوردنی کو کھدیڑنے چلے ہیں" مکمل طرح سے ان پر منطبق ہوتا تھا۔

جب شکار کا موسم نہ ہوتا تو یہ لڑکے لاٹھیوں سے لیس ہو کر اس انتظار میں کھڑے رہتے کہ سانپ جھاڑیوں سے کب باہر آتا ہے۔ اگر سانپ رینگتا ہوا چال چلتا پٹی پٹائی لیک

پر آنکلنے کی غلطی کرتا تو لڑکے حملہ کر کے اسے فوراً مار ڈالتے۔ سانپ کی تاک میں وہ گھنٹوں کڑی دھوپ میں کھڑے رہتے۔ شکار بجائے خود نشہ تھا۔ شکار کھیلنے سے مصطفےٰ کے ریفلیکس تیز ہوئے۔ ہمت اور قوتِ برداشت بڑھی۔ چالوں گھاتوں کی سمجھ حاصل ہوئی۔ اس نے سیکھا کہ بہلا پھسلا کر، دم دے کر، کسی کو جال میں کس طرح پھنسایا جاتا ہے۔ کسی سیاستدان کے لیے، خصوصاً اس ملک میں، اس سے بہتر مکتب کوئی نہیں۔

خون کی پیاس بجھنے میں نہ آتی۔ جب کرنے کے لیے کچھ اور نہ ہوتا تو لڑکے رینگ کر چوزوں کے ڈربے میں جا گھستے اور چوزوں کی گردنوں کو اتنا مروڑتے کہ وہ چٹ سے الگ ہو جاتیں۔ بے سر کے چوزے کو اذیت کے مارے تڑپتا اور اپنے کپڑوں کو اس کے لہو کی پھوار سے رنگین ہوتا دیکھ کر انہیں بڑا مزہ آتا، یہاں تک کہ چوزہ پھڑپھڑا کر ان کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتا، آخری بار جھرجھری لیتا اور دم توڑ دیتا۔ بہت سال بعد میں نے ہیرل میر میں مصطفےٰ کو اس خونی دل بہلاوے سے دوبارہ مزے لیتے دیکھا۔ فوارے کی طرح ابلتے خون کی سنسناہٹ کی یاد آج بھی مجھے ستاتی ہے۔

شکار ان کے ہاتھ آ جاتا تو وہ ضیافت کا اہتمام کرتے۔ وہ سب کے سب کھانا پکانے میں ماہر تھے اور اس مہارت پر انہیں خاص فخر تھا۔ وہ گوشت خور تھے۔ انہیں گوشت کھانے میں مزہ آتا تھا۔ سبزی سے انہیں مطلق ذوق نہ تھا اور وہ سبزی خوروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ گوشت کو دیر تک شاذونادر ہی پکایا جاتا۔ وہ ایسا گوشت کھانے کو ترجیح دیتے جسے تھوڑی دیر پکایا گیا ہو اور جس میں خون کی ذرا ذرا سی پھٹکیاں ابھی نظر آ رہی ہوں۔ تہذیب ان کی وحشیانہ جبلتوں کو رام نہیں کر سکی تھی۔

جس علاقے میں یہ قبیلہ آباد ہے وہ بہت بنجر اور خشک ہے۔ گرمیوں میں غضب کی گرمی پڑتی ہے۔ سیم اور تھور کے دہرے مسئلے کی وجہ سے بیشتر زمین کسی کام کی نہیں۔ ماحول درشت ہے، لوگ غریب ہیں۔ زندگی جہدِ مسلسل ہے۔ صعوبت کے حقیقی ہونے میں کلام نہیں۔ آب و ہوا بے رحم اور کٹھور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آب و ہوا کے انہیں خصائص کو علاقے کے باشندوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔

مصطفےٰ کے خاندان کا سیاست کی طرف جھکاؤ نہ تھا۔ اس کے والد کا اختیار بہت بڑے علاقے پر تھا لیکن ان کی نظر میونسپل سطح سے آگے نہیں جاتی تھی۔ انہیں قومی سیاست کی منجدھار میں قدم رکھنے کا کوئی ارمان نہ تھا۔ وہ انتظامیہ سے دُور رہنے اور سماجی کام پر توجہ مرکوز رکھنے کے قائل تھے۔ جب مشتاق احمد گورمانی پنجاب کا گورنر بنا تو گورمانی قبیلے کی طاقت بڑھ گئی۔ گورمانی ساتھ کے علاقے میں آباد تھے اور وہ مقامی سیاست میں ٹانگ اڑانے لگے۔ گورمانیوں کا اپنی حدود سے تجاوز مصطفےٰ کے خاندان پر گراں گزرا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نوکرشاہی، جو کھر خاندان کا احترام کرتی آئی تھی، اب جانبدار نظر آنے لگی۔ پولیس نے گورمانی قبیلے کی غیرقانونی حرکتوں کا نوٹس لینا چھوڑ دیا۔ کھروں کو پتہ چلا کہ اگر انہوں نے قومی سطح پر اپنا لوہانہ منوایا تو وہ ماتحت بن کر رہ جائیں گے۔ انہیں بڑا کھلا کہ ان پر دھونس جمائی جارہی ہے اور ان کی طاقت کی جو روایتی اساس تھی وہ رفتہ رفتہ کھوکھلی ہو چلی ہے۔ کھروں پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان کے اپنے لوگوں میں بے چینی پھیل گئی ہے اور وہ ان کی بہ نسبت گورمانیوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کرنے لگے ہیں۔ کھروں کو پہلی بار انصاف میں تاخیر سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے دیکھا کہ گورمانیوں سے روایتی رقابت کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے پانی کے وسائل کا رخ یا تو موڑ دیا گیا ہے یا ان کے بالکل بند ہو جانے کی نوبت آگئی ہے۔

فیصلہ کیا گیا کہ اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر اور گورمانیوں کی یلغار کا توڑ کرنے کے لیے کھر خاندان قومی سیاست میں حصہ لے گا۔ مصطفےٰ کھر چوبیس سال کا تھا۔ یہ ۱۹۶۲ء کا ذکر ہے اور محدود حقِ رائے دہی کے تحت قومی اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے۔ مصطفےٰ نے قومی اسمبلی کی ایک نشست کے لیے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بالکل ہی نورکھ تھا۔ علاقے کے روایتی خاندان اور اقتدار کا سودا کرانے والے اسے جانتے تک نہ تھے۔ مصطفےٰ ان حقائق سے بددل نہ ہوا۔ کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کے سربراہ کی خدمت میں وہ حاضر نہ ہوا ہو۔ اس نے ہر ایک کے سامنے وضاحت سے اپنی سیاست اور معتقدات پر روشنی ڈالی۔ لغاریوں کے روپ میں اسے اتحادی مل گئے۔ لغاری گورمانیوں کے رقیب تھے۔ مصطفےٰ نے بڑی مستقل مزاجی سے بالکل نچلی سطح پر مہم چلائی تو اسے خاصی حمایت حاصل ہوگئی۔ جس آسانی سے وہ انتخاب جیتا اس پر سارے سیاسی پنڈت حیرت زدہ رہ گئے۔

یہ .ن دنوں کا ذکر ہے جب اسے یہ سوچ کر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی کہ سب لوگوں کی نظریں اسی پر جمی ہوئی ہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب اسے پہلی بار بنیادی جمہوریت کے اراکین سے بھرے ہوئے کمرے میں تقریر کرنی پڑی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ یہ بات مصطفےٰ نے چوبیس سال بعد اس :مت بتائی جب میں جلسۂ عام میں اپنی پہلی تقریر کی تیاری میں مشغول تھی۔

گورمانی جیسے گرم و سرد چشیدہ سیاستدان کے خلاف مصطفےٰ کی جیت پر مصطفےٰ کے والد خوش ہوئے۔ انعام کے طور پر انہوں نے اسے سات لاکھ روپے دیے۔ تازہ تازہ ہاتھ آنے والی اس دولت سے مصطفےٰ نے بہت سی کاریں خرید لیں۔ وہ کیڈلک یا اولڈز موبیل میں بڑے دھوم دھڑکے سے پارلیمنٹ جایا کرتا۔ اسے بھڑکیلی امریکی کاروں سے عشق تھا۔

بعض اوقات وہ ایک کار کو تو خود چلاتا اور باقی کاروں کے ڈرائیوروں کو حکم دیتا کہ کار جلوس کی صورت میں اس کے پیچھے پیچھے آئیں۔ اس کو یہ سجھائی نہ دیا کہ امارت کی اس نمائش کو معاشرے کا چیدہ ترین طبقہ نیا نیا پیسہ ہاتھ آجانے کا اظہار سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

پارلیمنٹ میں مصطفےٰ کو اپنی نشست پر بیٹھے رہنے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ وہ ابھی تک پینڈو نوجوان تھا اور اسے اپنے پینڈو ہونے کا احساس بھی بہت تھا۔ وہ بعض مقطع ارکان کے بے تکان طمطراق کو تحسین بھری نظر سے دیکھتا۔ ان کی تقریریں سنتے سنتے اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ سرعام موثر انداز میں تقریر کرنے کی صلاحیت کتنی طاقت کی حامل ہے۔ اس نے منظورقادر، بھٹو صاحب، صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان اور نواب کالا باغ کی تقریریں سنیں اور ان کی مدد سے تقریر کرنے کے فن کو سمجھا۔ اس نے خود اسمبلی میں ایک بار بھی تقریر نہیں کی۔ اسے پارلیمنٹ کے سب سے غیراہم رکن ہونے کی شہرت حاصل ہوتی جارہی تھی۔

مصطفےٰ نے مجھے بتایا کہ پارلیمنٹ کا رکن بننے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جان لیا تھا کہ اب سیاسی اثر و رسوخ کے بغیر جاگیردارانہ دنیا اپنا کام نہیں چلا سکتی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ کسی بااختیار مقام پر فائز ہوئے بغیر وہ اپنے متوسلین اور اپنی املاک کے لیے انصاف حاصل نہیں کر سکتا۔ پارلیمنٹ نے اسے قانونی جواز، اقتدار اور تحفظ فراہم کر دیا۔

قومی اسمبلی میں مصطفےٰ نے دیکھا کہ اسے سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک ساتھی جاگیردار، غلام مصطفےٰ جتوئی، کے پہلو میں نشست ملی ہے۔ ان کے نام کے پہلے دو جُز تو مشترک تھے ہی، ان کے درمیان اور بھی بہت سے پہلو اشتراک کے نکل آئے۔ ان میں دوستی ہوگئی جس کے نتیجے میں ہنگامہ خیز برسوں کا فرق نہ آسکا۔ جتوئی صاحب سندھ کے سب سے بڑے جاگیردار خاندانوں میں سے ایک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ وڈیروں کی ایک بڑی منڈلی کے قائد تھے اور انہیں اسمبلی میں اچھا بھلا رسوخ حاصل تھا۔ جتوئی صاحب کو کیا خبر تھی کہ ایک دن خود اپنے انتخابی حلقے کی طرف سے مسترد ہو جانے کے بعد کوٹ ادو سے آنے والا یہ کچا نوجوان انہیں قومی اسمبلی کی نشست کی پیشکش کرے گا۔

بھٹو صاحب جتوئی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہی حال صدرِ مملکت کا تھا۔ ایوب خان شکار کھیلنے کی غرض سے اکثر جتوئی صاحب کے پاس نواب شاہ جاتے رہتے تھے۔

اس زمانے کے بیشتر نوجوانوں کی طرح مصطفےٰ بھی بھٹو صاحب کی مقناطیسی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو گیا جنہیں یکے بعد دیگرے ایندھن اور قدرتی وسائل، کامرس اور امورخارجہ جیسی اہم وزارتیں سنبھالنے کا موقع ملا تھا۔ مصطفیٰ نے جتوئی صاحب سے کہا کہ اسے اس آتش بجاں پارلیمنٹیرین سے متعارف کرایا جائے۔ تعارف کرا دیا گیا۔ یہ ایک ایسے پیچ در پیچ تعلق کی ابتدا تھی جو سدا محبت اور نفرت کی انتہاؤں کے درمیان جھولتا رہا۔

1966ء میں بھارت کے ساتھ تاشقند معاہدے کے بعد بھٹو صاحب وزیرخارجہ کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ پاکستان کی مسلح افواج نے جو کچھ میدان جنگ میں جیتا تھا وہ سب ایوب خان نے گفت و شنید کے دوران گنوا دیا۔ تاشقند کو ایوب خان کا واٹرلو ثابت ہونا تھا۔ بھٹو صاحب نے اسے بچ کر جانے کا موقع نہ دیا۔

کابینہ سے مستعفی ہونے کے بعد بھٹو صاحب نے راولپنڈی سے کراچی جانے کی ٹھانی۔ وہ راولپنڈی سے ایک ٹرین پر سوار ہوئے۔ کوٹ ادو کے نوجوان ایم این اے کے سوا کوئی آدمی انہیں الوداع کہنے سٹیشن پر نہ پہنچا۔ بھٹو صاحب مصطفیٰ سے سٹیشن پر مل کر بہت خوش ہوئے۔ مصطفیٰ کی اس ادا نے ان کے دل پر اثر کیا۔ انہوں نے مصطفیٰ کی جرأت مندی پر اظہار خیال کیا۔ بھٹو صاحب اب سیاسی اچھوت تھے اور لوگ اس ڈر سے ان کے پاس نہ پھٹکتے تھے کہ کہیں ان پر ایوب خان اور کالاباغ کا قہر نازل نہ ہو جائے۔ مصطفیٰ نے اپنا پسندیدہ قول دہرایا۔ "وقت بتائے گا۔"

بھٹو صاحب کراچی چلے آئے اور جلد ہی مصطفیٰ ان کے پاس آ گیا۔ دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ برے وقتوں کے ساتھی۔ اس شراکت سے دونوں کو فائدہ پہنچا۔ بھٹو صاحب نے مصطفیٰ کی دلیری، خلقی مکاری اور نئی باتوں کو بہت جلد جزوذہن بنا لینے کی اہلیت کو تحسین کی نظر سے دیکھا۔ وہ کھر پر بلاتامل اعتماد کر سکتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ مصطفیٰ کا مشاہدہ تیز ہے، وہ ذہین ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس کی نظر میں وہ کسی دیوتا سے کم نہیں۔ بھٹو صاحب نے مصطفیٰ کے فیصلوں پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا۔ مصطفیٰ نے بھی کان لگا کر عوام کے دلوں کی دھڑکن سنی اور بھٹو صاحب اس کے اندازوں پر تکیہ کرنے لگے۔

مصطفیٰ ستر کلفٹن میں بھٹو صاحب کے پاس مقیم تھا۔ بھٹو صاحب نے اس کی ذات میں گہری دلچسپی لینی شروع کی۔ انہوں نے نوجوان سے کہا کہ بعض مصنفوں کو پڑھو اور اسے سیاسی تھیوری کی اونچ نیچ خود سمجھانے لگے۔ وہ روزانہ بڑی تفصیل سے سوال پوچھتے تاکہ پتہ چلے کہ مصطفیٰ نے جو پڑھا ہے اسے کس حد تک سمجھ سکا ہے۔

انہوں نے مصطفیٰ کو لباس پہننے کی تمیز بھی سکھائی۔ نوجوان زمیندار جلد ہی اپنی کرمپلین پتلونوں، ٹیری لین قمیضوں اور سینڈلوں سے بے نیاز ہو گیا۔ بھٹو صاحب کسی چھیل چھبیلے جیسا لباس پہنا کرتے تھے اور مصطفیٰ پوشاک کی حد تک ان کے اسلوب کی تقلید کرنے لگا۔ بھٹو صاحب اپنی ٹرن بل اور ایسر کی قمیضیں مصطفیٰ کو دیتے رہتے جو اب خوش قطع سوٹ پہننے لگا تھا۔

مصطفیٰ کو ایک نئی دنیا سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ وہ اب ایسے لوگوں کے درمیان تھا جن کا رہن سہن نفاست کا آئینہ دار تھا۔ وہ ستر کلفٹن میں گھوم پھر کر وہاں کی زیبائش اور سازوسامان کو ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ یہ اور ہی دنیا تھی جس کا اس کے اپنے گئے گزرے گھر سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

نوجوان سیاستدان کے دیکھنے میں آیا کہ بھٹو صاحب اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ پیشکش کے انداز سے سلیقہ جھلکنا چاہیے۔ ڈنر پارٹیوں سے پہلے کراکری اور کٹلری کا انتخاب خود کرتے۔ انہیں طباخی کے مختلف اسالیب اور انگوری شرابوں کے بارے میں بڑی معلومات تھی۔ حد یہ کہ پھولوں کو قرینے سے ترتیب دینے کی نگرانی تک آپ کرتے تھے۔ یہ بھی وہی طے کرتے تھے کہ مینو کن کن چیزوں پر مشتمل ہونا چاہیے اور اس کو یقینی بناتے کہ سروس بہت عمدہ ہو اور ملازموں کا لباس بالکل بے داغ۔ وہ ہر بارے میں خود ہدایت دیتے۔ نصرت بھٹو صرف ان کے احکامات کی تعمیل کرتی۔

بھٹو صاحب کو ایرانی اور چینی قالینوں سے عشق تھا۔ وہ بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے انہیں خریدتے تھے۔ اگر کوئی قالین ان کی نظر میں بچ جاتا تو اسے خریدنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کسی دوست کے گھر میں وہ جس قالین پر کھڑے ہوتے اس کی قیمت لگا دیتے اور اس وقت تک وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتے جب تک سودا پٹ نہ جاتا۔

بھٹو صاحب کو بھی نہرو کی طرح، جس کے وہ بڑے مداح تھے، گلابوں سے بہت پیار تھا۔ کراچی اور لاڑکانے میں ان کے باغات کا مایۂ فخر گلاب کی بعض نادر اقسام تھیں جن کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کاشت کیا تھا۔

ان کے کتب خانے کی زیبائی دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ اس کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ یہ ایشیا کے بہترین کتب خانوں میں سے ایک تھا اور نپولین بوناپارٹ سے متعلق کتابوں کا ان کے پاس جو ذخیرہ تھا اس کی ملکیت پر انہیں بے حد ناز تھا۔ بھٹو صاحب جزیرہ کورسیکا سے تعلق رکھنے والے اس پست قد انسان کے بڑے گرویدہ تھے جس نے آپ ہی فرانس کا تاج شہنشہی اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ وہ کتب خانے میں، خصوصاً رات

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے وقت، خاصا وقت گزارتے۔ اس کتب خانے کے دروازے انہوں نے مصطفیٰ پر کھول دیے تاکہ وہ مطالعے کی طرف راغب ہو جائے اور اپنے ذہن کو جلا دے سکے۔

مصطفیٰ مکمل طور پر مغلوب نہ ہوا۔ وہ اپنی شناخت اور دھڑیلے پن کو بچائے رکھنے کا جتن کرتا رہا۔ وہ نرالا جوڑا تھا۔ سانولا صاحب بہادر ناشتے میں تلے ہوئے انڈے اور بیک کیے ہوئے سیم کے دانے کھا رہا ہے اور دیسی سائیں کے سامنے لسی سے بھرا جگ اور پراٹھا اور آملیٹ رکھا ہے۔ مصطفیٰ کو اپنے رکاب دارانہ ورثے پر فخر تھا اور اس نے اپنی زبان کے چسکے سے بے وفائی نہیں کی۔

بھٹو صاحب حسنیٰ شیخ نامی ایک حسین و جمیل مطلقہ سے عشق لڑا رہے تھے۔ وہ ہاتھ آئی لینڈ پر ریل کی پٹریوں کے اُس پار رہتی تھی۔ بھٹو صاحب اس کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کا بندوبست کرتے۔ مصطفیٰ کار ڈرائیو کر کے انہیں اس جگہ پہنچا دیتا جہاں ملاقات ہونی ہوتی اور چند گھنٹے اور جا کر لے آتا۔ بھٹو صاحب عشق میں دیوانہ وار مبتلا تھے۔ حسنیٰ ابھی یہی اداکاری کر رہی تھی کہ اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے اور اس مرحلے پر عشق کا جواب برابر کی شدت سے دینے پر آمادہ نہ تھی۔

حسنیٰ شیخ کے ساتھ بھٹو صاحب کا الجھاوا ان کے زوال کے بعد شہ سرخیوں کی زینت بنا۔ یہ راز کتنے ہی برس عیاں راچہ بیاں کی مثال بنا رہا۔ حسین اور زندہ دل حسنیٰ پر ان کی فریفتگی کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب وہ ایوب حکومت میں وزیر تھے۔ حسنیٰ ایک بنگالی وکیل، عبدالاحد سے بیاہی ہوئی تھی۔ عبدالاحد شدید قوم پرستانہ رجحانات کا حامل تھا۔ ان کی شادی استحکام سے محروم تھی۔ احد کو 1971ء میں پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا۔ یا تو اسے فوج نے مار دیا یا البدر کے کسی دہشت گرد سکواڈ نے ٹھکانے لگایا۔ ستم ظریفی یہ کہ اس کے دوسرے عاشق یعنی بھٹو صاحب کا بھی یہی انجام مقدر تھا۔

حسنیٰ پٹھان بنگالی والدین کی اولاد تھی۔ وہ حسین بھی تھی اور گفتگو کے فن میں بھی ایسی طاق کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے۔ بھٹو صاحب اپنے سیاسی بن باس کے دنوں میں اس کے پیچھے پڑے رہے۔ وہ متذبذب تھی۔ بھٹو صاحب کا امیج ایسے آدمی کا تھا جو عیش و عشرت کا دلدادہ ہو۔ اس لیے جب وہ کہتے کہ ان کی محبت لازوال ہے تو حسنیٰ ان کے دعوے کو شک کی نظر سے دیکھتی۔

مصطفیٰ بھٹو صاحب کو حسنیٰ کے اپارٹ منٹ پر چھوڑ کر آجاتا۔ اس خفیہ اور پُرخطر آشنائی کے سلسلے میں بھٹو صاحب مصطفیٰ کے سوا کسی پر اعتماد نہ کرسکتے تھے۔ ایک بار مصطفیٰ نے بھٹو صاحب کو اپارٹ منٹ کے باہر اتارا اور چلا آیا۔ حسنیٰ اور بھٹو میں کچھ پچ پچ ہوگئی۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ سابق وزیر خارجہ اور آئندہ کے وزیراعظم کو باہر دھکیل

کر دروازہ اندر سے بند کرلیا گیا۔ بھٹو صاحب کو روٹھوں کو منانے کے جو جو دل پذیر گر آتے تھے انہوں نے سارے آزما ڈالے۔ حسنیٰ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دروازہ جو بند کیا جاچکا تھا کُھل نہ سکا۔ بھٹو صاحب پیدل ستر کلفٹن کی طرف چل دئے۔ رات بہت جاچکی تھی۔ ایک دن اسی سڑک سے انہیں چنگھاڑتے سائرنوں کے شور میں موٹر سائیکل سواروں کے جلوس کے ساتھ شان سے گزرنا تھا۔ لیکن اس وقت تو گھر پہنچنے کیلئے ایک لمبا اور تھکا دینے والا راستہ طے کرنا باقی تھا۔ انہوں نے بعد میں مصطفیٰ کو بتایا کہ انہیں ڈر یہ تھا کہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔ اگر اس رات کسی کی نظر ان پر پڑی بھی ہوگی تو وہ اپنا سر جھٹک کر دوبارہ سوگیا ہوگا۔ جو کچھ دیکھا ہوگا اسے خواب سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی ہوگی۔

جب بھٹو صاحب بالآخر صدر بن گئے تو انہوں نے فوراً حسنیٰ کو بلا بھیجا۔ مصطفیٰ بتاتا ہے کہ وہ فرش پر بیٹھی رہتی۔ بھٹو صاحب کو نیاک کی چسکیاں لیتے اور سگار پیتے رہتے۔ ان کا ایک ہاتھ حسنیٰ کے بالوں سے کھیلتا رہتا۔ وہ نہایت تیز طبع تھی۔ بھٹو صاحب اسکے ساتھ سیاست پر تبادلہ خیال کرتے۔ وہ بھٹو صاحب کے بہت سے فیصلوں پر اثر انداز ہونے میں کامیاب ہوئی۔ وہ ان کی سب سے کڑی نقاد تھی۔ ان کے تعلق میں زندگی پوری حرارت کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ آپس کے بحث مباحثے، چون و چرا اور اختلاف رائے سے آشنائی کا رنگ چوکھا ہوگیا تھا۔

جب اسکی بیٹی کی شادی سر پر آپہنچی تو حسنیٰ نے بھٹو صاحب پر زور دیا کہ ان کے تعلق کو قانونی حیثیت دینے کا وقت آگیا ہے۔ اس کی بیٹی کے مستقبل کا سوال تھا۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ کچھ میری بات مان لو کچھ میں تمہاری مان لیتا ہوں۔ حسنیٰ کو دوسری بیوی بنا کر گھر لانے سے ایک عالم میں فضیحت ہوتی۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کیلئے تیار نہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ قرآن پر لکھے دیتے ہیں کہ انہوں نے خدا کی نگاہ میں حسنیٰ کو اپنی بیوی کے طور پر قبول کرلیا ہے۔ حسنیٰ راضی ہوگئی۔ بھٹو صاحب نے اپنا کہا پورا کیا۔ حسنیٰ نے قرآن کو اپنے پاس محفوظ کرلیا۔

گھر لوٹ کر بھٹو صاحب کو نظر آیا کہ بطور قائد ان کا چراغ اب کسی وقت بھی گل ہوسکتا ہے۔ وہ بہت گھبرائے۔ مصطفیٰ کو طلب کیا گیا۔ منصوبہ تیار ہوا کہ جب حسنیٰ گھر پر نہ ہو تو قرآن چرالیا جائے۔ خانہ دزدی کی واردات کا انتظام کیا گیا۔ خانہ دزد نرے نکھٹو نکلے۔ وہ صرف قرآن چرا کر لے آئے۔ واٹرگیٹ سکینڈل میں ملوث اپنے جیسے اناڑیوں کی طرح انہوں نے بھی کام چوپٹ کردیا۔ حسنیٰ کو پتہ چل گیا کہ اس کا مقدس نکاح نامہ کس نے چرایا ہے۔ بھٹو صاحب نے قدرتی طور پر چوری کی ذمہ داری قبول

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کرنے سے انکار کردیا۔

نصرت بھٹو کو بھٹو صاحب کے اس بالا بالا معاشقے کا علم تھا۔ اس نے بے کل ہوکر نوٹ کیا کہ حسنیٰ کا اثر بڑھتا جارہا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ بھٹو صاحب کے بیشتر وزیروں نے بھانپ لیا ہے کہ اصل طاقت کس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر وقت حسنیٰ کے دربار میں حاضر رہتے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ نصرت نے بھٹو صاحب کو چھوڑ کر اپنے وطن ایران چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ بھٹو صاحب کے ہوش اڑگئے۔ نصرت سیاسی طور پر ناگزیر بن چکی تھی۔ انہوں نے مصطفیٰ کا سہارا لیا۔ کہا کہ وہ نصرت کے پاس جاکر ان کے کیس کی پیروی کرے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی راہ راست سے نہیں ہٹیں گے۔ مصطفیٰ بذریعہ طیارہ اسلام آباد پہنچا اور مبتلائے اضطراب خاتون اول کو قائل کرنا چاہا کہ اپنے شوہر سے تعلق قطع نہ کریں۔ نصرت گھر بار چھوڑ چھاڑ کر چل دینے پر تلی بیٹھی تھی۔ مصطفیٰ کھر کی زبانی ملنے والے زیادہ ہوش مندانہ مشوروں کی وجہ سے یہ معاملہ، جو بگڑ کر سکینڈل بن سکتا تھا، سلجھ گیا، خطرہ ٹل گیا۔ نصرت واپس تو آگئی لیکن اپنے شوہر کے ساتھ اس کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔

کلفٹن میں حسنیٰ کا گھر نظر عنایت کے طلبگاروں، چاپلوسوں، مشکل میں پھنسے وزیروں اور سرکاری افسروں کا پسندیدہ اڈا بن گیا۔ کسی بھی شام کو وہاں جانے پر کوثر نیازی، جام صادق علی، مصطفیٰ جتوئی، مصطفیٰ کھر، حفیظ پیرزادہ، طالب المولیٰ، رسول بخش ٹالپر، ممتاز بھٹو وغیرہ جیسے افراد سے اتفاقاً آمنا سامنا ہوسکتا تھا۔ یہ سب حسنیٰ کے بہی خواہ مشہور ہوگئے۔ انہیں لوگوں نے آگے چل کر وہ (انکل) بننا تھا جن پر بینظیر کبھی تکیہ نہ کرسکتی تھی۔ یہی تھے وہ جنہوں نے بینظیر کی ماں سے بے وفائی کی تھی اور اس دوسری عورت سے تعلق بڑھایا تھا۔ 6 اگست 1990ء کو یہ انکل دوبارہ اقتدار میں آگئے۔

جب بھٹو صاحب پشت بدیوار ہوکر پاکستان قومی اتحاد کے خلاف جدوجہد میں معروف تھے تو اخباروں میں حسنیٰ کے ساتھ ان کے ناجائز تعلق کا ذکر آنے لگا۔ بھٹو صاحب نے ایک ریلی میں سرعام اعلان کیا کہ ان کا حسنیٰ سے کوئی تعلق نہیں اور مکر گئے کہ انہوں نے حسنیٰ سے شادی کررکھی ہے۔ یہ اعلان کرنے سے پہلے انہوں نے حسنیٰ کی منت کی تھی کہ وہ خاموش رہے اور اس سرعام تردید کی رسوائی کو برداشت کرلے۔ حسنیٰ پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آفرین ہے کہ اس نے زبان نہ کھولی۔

بھٹو صاحب انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو کو تیسری دنیا کے قائد کی بہترین مثال سمجھتے تھے۔ غریب ملکوں کے لوگ جذباتی اور ان پڑھ ہوتے ہیں۔ عوام کو ہاتی لحاظ سے

غیر دلچسپ زندگی میں رنگ بھرنے کیلئے سوئیکارنو کی آتش بیانی اور لوگوں کے حالات سدھارنے کے نعرے ضروری تھے۔ اس کی نجی زندگی بھی اسی رنگ آمیزی کا حصہ تھی۔ عوام اس کی عشق بازیوں کو معاف کردیتے تھے۔ بھٹو صاحب سوئیکارنو کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کررہے تھے۔ بھلا مصطفیٰ اپنے قائد سے پیچھے کیسے رہ سکتا تھا۔ وہ اکثر سوئیکارنو جیسے انسانوں کا ذکر کرتا اور کہتا کہ غیر معمولی مردوں کو بیویاں بھی غیر معمولی درکار ہوتی ہیں جن میں سوجھ بوجھ بھی ہو اور جو اپنے شوہروں کے مزاج کی ٹیڑھ سے نمٹنے کی اہلیت بھی رکھتی ہوں۔ اس ضمن میں ہٹلر اور ایوا براﺅن سے اس کی آشنائی تک کو بطور مثال پیش کیا جاتا۔

کراچی میں مصطفیٰ ہر طرح کے عشقیہ الجھیڑوں سے دور دور ہی رہا۔ وہ ہر وقت بھٹو صاحب کے ساتھ رہتا اور تمام سوشل سرگرمیوں اور محفلوں سے لطف اندوز ہوتا لیکن عشقیہ چھیڑ چھاڑ یا عورت بازی سے اجتناب برتتا رہا۔ وہ اعلیٰ سوسائٹی کی لطافتوں سے آشنا ہونے اور نستعلیق انداز میں کسی کو پٹانے کا فن سیکھنے کیلئے زیادہ بے چین تھا۔ غالباً ابھی اس میں زیادہ اعتماد پیدا نہ ہوا تھا اور اونچی سوسائٹی کی خواتین کی چہلیں اور کھلا ڈلا پن اسے خوفزدہ کردیتا تھا۔ وہ ذرا نچلے طبقے کی عورتوں کے درمیان زیادہ چین سے سانس لیتا جہاں جنسی تعلقات قائم کرنے کیلئے طرح طرح کے جتن کرنے ضروری نہ تھے، صرف روپیہ خرچنا کافی تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی تشکیل لاہور میں ڈاکٹر مبشر کے گھر میں عمل میں آئی۔ مصطفیٰ اس کے بانی ارکان میں شامل تھا۔ نوزائیدہ سیاسی جماعت نے اپنا پہلا جلسہ عام لاہور کے گول باغ میں کیا جو زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوسکا۔ وجہ یہ تھی کہ ایوب حکومت کے کارندے ہجوم میں شامل ہوگئے تھے۔ مقررین کو شوروغل مچا کر آوازے کس کر مسلسل تنگ کیا جاتا رہا اور ان میں سے کوئی بھی اپنی تقریر مکمل نہ کرسکا۔

کالاباغ نے مصطفےٰ کے پیچ کسنے شروع کر دیے۔ اسے دق کیا جانے لگا اور یونیورسٹیکس کے ڈھیر سارے مقدمات اس پر لاد دیے گئے۔ اس کا خاصا وقت کچہری اور عدالت میں گزرنے لگا۔ اسے گرفتار کرلیا گیا اور پھر ہفتے بعد چھوڑ دیا گیا۔ مصطفےٰ نے اپنی شامت کو آپ ہی دعوت دی تھی۔ کالاباغ بہت طاقتور گورنر تھا اور اس نے پنجاب کو بری طرح شکنجے میں کس رکھا تھا۔ مصطفےٰ نے چوبیس سال کی کم عمر میں کالا باغ سے ٹکر لے کر اور اسے للکارنے کے عواقب برداشت کرکے حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔

بھٹو صاحب بڑے سخت کوش سیاست دان تھے۔ ان کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا۔ انہوں نے پاکستان کے طول و عرض کا چکر لگایا اور عوام کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ان

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے مزاج کی صحیح تشخیص کی۔ 1967ء میں انہوں نے ملتان میں فیصلہ کیا کہ پارٹی کو سیاسی اکھاڑے میں اتارنے کا وقت آپہنچا ہے۔ مصطفٰے نے ملتان کے نوجوان اقدام پسندوں سے ملاقات کی۔ ان میں سے ایک میں اُنہیں سیاست دان بننے کے تمام امکانات نظر آئے۔ یہ میاں ساجد پرویز تھا، جو اس وقت صرف سولہ برس کا تھا۔ وہ اس نوجوان لڑکے کو بھٹو صاحب سے ملانے کھر ہاؤس لے گیا۔ ملتان میں ریلی نہایت کامیاب رہی۔ یہ دیکھ کر کہ طالب علموں، کسانوں اور مزدوروں نے ان کی آواز پر لبیک کہا ہے اور اپنے نئے ابھرتے قائد کی باتیں سننے کے لیے ہر طرف سے امڈ آئے ہیں بھٹو صاحب جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "پاکستان کی تاریخ میں اپنا کردار ادا کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس امر کے ممکن ہونے کا احساس مجھے آپ نے دلایا ہے۔ اس وجہ سے میں ملتان کے لوگوں کو کبھی فراموش نہ کروں گا"۔ پھر ادائے دلبرانہ کے طور پر، جو جلد ہی ان کی مخصوص پہچان بن گئی، انہوں نے قمیض کے بٹن کھولے اور بٹنوں کو نوچ کر وجد میں آئے ہوئے ہجوم کی طرف اچھال دیا۔ "ایک روز، یہ اب کوئی دن کی بات ہے، جب میں اقتدار میں ہوں گا، یہ بٹن لے کر میرے پاس آنا۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ یہ بٹن اس بات کا ثبوت ہوں گے کہ جس تاریخی دن ہماری تقدیر کا فیصلہ ہوا تو تم یہاں موجود تھے۔"

سیاسی مشینری اب ٹاپ گیئر میں چل رہی تھی۔ پی پی پی نے فیصلہ کیا کہ صادق آباد، بہاولپور، میں ریلی منعقد کی جائے۔ حکومت نے دفعہ 144 لگادی جس کے تحت کسی عام جگہ پر چار سے زیادہ آدمی اکٹھے نہیں ہوسکتے پی پی پی نے اپنا پروگرام جاری رکھا اور اس پابندی کو خاطر میں نہ لائی۔ اس جلسے کو اسٹیبلشمنٹ کے حربوں اور جماعت اسلامی کی سینہ زوری نے تتر بتر کر دیا۔ بھٹو صاحب کو شتم پشتم کار میں ڈالا گیا۔ کار مصطفٰے چلا رہا تھا۔ کار پر ایک غصیلے ہجوم نے بلا بول دیا۔ مصطفٰے کسی جنونی کی طرح ڈرائیو کرتا ہوا کار کو ہجوم میں سے نکال لے گیا۔ وہ نکل تو گئے لیکن آگے جاکر راستے میں ایک ریلوے کراسنگ آگئی جو بند تھی۔ مصطفٰے نے کار کو الٹا چلا کر ایک متبادل راستے کا رخ کیا (جماعت والوں کا ایک ہجوم اینٹیں پتھر لیے ان کا منتظر کھڑا تھا)۔ اس گھات لگائے کھڑے ہجوم سے بچنے کے لیے مصطفٰے کار کو کچے میں سے نکال کر لے گیا اور عین ممکن ہے اپنی کارکردگی سے اس نے پی پی پی کو مرگ ناگہاں سے بچا لیا ہو۔

ایوب خان نے گول میز کانفرنس طلب کی۔ بھٹو صاحب نے اس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا انکار جنرل کے تابوت میں آخری میخ ثابت ہوا۔ جس وقت کانفرنس ہو رہی تھی بھٹو صاحب لاہور میں موچی دروازے کے باہر انسانوں کے

ایک ٹھاٹھیں مارتے سمندر سے خطاب کر رہے تھے۔ "میری گول میز کانفرنس یہ ہے۔ ملک کے مستقبل کا فیصلہ یہاں ہوگا اور فیصلہ آپ لوگ کریں گے"۔

ایوب خان کو ہٹانے کے لیے جو ایجی ٹیشن جاری تھی وہ کامیاب رہی۔ ایوب خان نے دست بردار ہو کر عنانِ حکومت جنرل یحییٰ کو تھمادی۔ مارشل لا لگا دیا گیا۔ جنرل یحییٰ نے وعدہ کیا کہ وہ انتخابات کرائے گا اور ان میں ہر بالغ فرد کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔

یحییٰ خان نے عام انتخابات کرانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس پر کام جاری رہا۔ انتخابات کے ذریعے آئین ساز اسمبلی منتخب کرنا منظور تھا۔ اسمبلی کے ذمے یہ کام لگایا جانا تھا کہ وہ ملک کا آئین تیار کرے۔ یہ بذات خود ایک غلطی تھی۔ ملک سیاسی طور پر دو شدید قسم کی انتہاؤں میں بٹا ہوا تھا اور سیاسی جماعت نے اپنے پروگرام اور منشور کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لیا۔ یحییٰ خان کو یقین تھا کہ کوئی سیاسی جماعت مکمل اکثریت حاصل نہ کرسکے گی اور جو پارلیمنٹ وجود میں آئے گی اس میں کسی جماعت کو اتنی اکثریت بھی حاصل نہ ہوسکے گی کہ وہ اس کا سہارا لے کر کام چلا سکے۔ اس صورت میں مسلح افواج کو کسی (غیر) ایمان دار ثالث کی طرح مستقل طور پر بندر بانٹ کرتے رہنے کی ضمانت مل جائے گی۔

جنرل یحییٰ محسوس کرتا تھا کہ اگرچہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ سب سے بڑی واحد جماعت بن کر ابھرے گی لیکن باقی جماعتوں کو ایک عظیم اتحاد کی شکل میں اکٹھا گانٹھ کر عوامی لیگ کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔ اس اتحاد کا قائد مسلم لیگ کے خان عبدالقیوم خان کو بننا تھا۔ یحییٰ خان کو یہ خیال نہ آیا کہ ووٹ دینے والے اپنی فراست سے اس کی بازی الٹ سکتے ہیں۔ اسے یہ بھی تسلیم نہ تھا کہ پیپلز پارٹی کو زبردست مقبولیت حاصل ہے۔ قوم پرستی کی جو لہر مشرقی پاکستان پر چھائی ہوئی تھی۔ یحییٰ نے اس کے بارے میں بھی غلط اندازے لگائے۔ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ انتخابات میں کامیاب ہونے والی جماعت اپنے منشور کی بنا پر جیتا کرتی ہے اور بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد ہی اپنے پروگرام سے دست بردار ہو سکتی ہے۔ 1970ء میں ہونے والے انتخابات منصفانہ اور آزادانہ تھے۔ بہر حال، اگر یحییٰ خان کی نیت کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ کہنا قرین انصاف ہوگا کہ ان انتخابات میں یحییٰ خان نے دھاندلی کی تھی۔ اس کے غلط اندازوں نے ملک کو اپنے عمیق ترین بحران میں دھکیل دیا۔

مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے دو کے سوا مشرقی پاکستان میں تمام نشستیں جیت لیں۔ صرف نورالامین اور چکما قبیلے کا راجہ تری دیو رائے عوامی لیگ کی ضرب کاری کی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

تاب لا سکے۔ عوامی لیگ اپنے چھ نکاتی پروگرام کی بنیاد پر کامیاب ہوئی تھی۔ بظاہر تو اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ فیڈریشن میں شامل اکائیوں کے لیے زیادہ صوبائی خود مختاری حاصل کی جائے لیکن اس میں علیحدگی کے بیج موجود تھے۔ چھ نکات کو مان لینے کے بعد پاکستان زیادہ سے زیادہ ایک ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کی صورت میں باقی رہ سکتا تھا۔

روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کرنے والی پاکستان پیپلز پارٹی نے دیکھا کہ مغربی پاکستان میں اپنی طاقت کے باوجود اس کے حصے میں ہمیشہ اقلیتی جماعت کے کردار کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ بھٹو صاحب جانتے تھے کہ عوام لیگ دوسری چھوٹی جماعتوں کی مدد سے اپنی مرضی کا آئین اسمبلی سے منوا لے گی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئے کہ چھ نکات مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں میں علیحدگی پسند میلانات کو ہوا دیں گے۔ پنجاب کے قائد کے طور پر بھٹو صاحب پر لازم تھا کہ سخت رویہ اختیار کریں اور بگڑتی ہوئی صورت حال پر روک لگائیں۔ جو قدم انہوں نے اٹھائے ان میں کچھ عنصر نرگسیت کا بھی شامل تھا۔ وہ خود کو مجیب اور باقی لوگوں سے کہیں بہتر سیاست دان سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ وہ پاکستان کی قیادت کرنے کے زیادہ اہل ہیں۔ سارے کے سارے مشرقی پاکستان کے ایک طرف جھک جانے سے ان کا وزیر اعظم بننے کا خواب ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ چند عشرے پہلے جناح صاحب نے جو کیا تھا بعینہ اسی طرح بھٹو صاحب نے اچھے برے پہلوؤں کا خوب حساب لگانے کے بعد خطرہ مول لیا۔ انہوں نے سرے سے اقتدار نہ ملنے پر کٹے پھٹے اور کرگھائے پاکستان میں اقتدار حاصل کرنے کو ترجیح دی۔

یحییٰ اپنا کھیل پورا کرنے کے لیے ڈھاکے جاکر مجیب سے ملا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ تین مہینے کے اندر اندر آئین تیار کر لیا جائے۔ ایسا نہ ہوا تو وہ اسمبلیاں توڑ دے گا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اسمبلیوں کا اجلاس 23 مارچ کو طلب کیا جائے گا اور مجیب کو سرِ عام مستقبل کا وزیر اعظم پاکستان کہہ کر متعارف کرایا۔ بدلے میں مجیب نے یحییٰ خان سے وعدہ کیا کہ اسے دعوت دی جائے گی کہ ملک کے صدر کے طور پر کام کرتا رہے۔

یحییٰ مغربی پاکستان لوٹا تو بھٹو صاحب سے ملاقات ہوئی جن پر اضطراب طاری تھا۔ پیپلز پارٹی کا قائد ایک بے رحم اکثریت کا نادری حکم قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ بھٹو صاحب نے یہ دلیل پیش کی کہ ملک کا آئین بنیادی دستاویز ہوتا ہے جسے سب کی رضا مندی سے مرتب کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے یحییٰ خان کو خبردار کیا کہ مجیب اپنے تمام وعدے وفا نہیں کرے گا اور یہ کہ چھ نکاتی پروگرام کا مطلب پاکستان کا خاتمہ ہے۔ لاڑکانے میں ایک ملاقات کے دوران انہوں نے جنرل یحییٰ کو بتایا کہ مجیب وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوتے ہی آپ کو ہٹانے کے لیے قدم اٹھائے گا۔

یحییٰ بھٹو صاحب کی دل کو لگنے والی منطق کے دام میں آگیا۔ تمام اقتدار بنگالیوں کے ہاتھ آگیا تو پھر ان کا کیا اعتبار۔ ہو سکتا ہے وہ مسلح افواج کی قطع و برید شروع کر دیں اور بھارت کے ساتھ یارانہ گانٹھنے لگیں۔ یحییٰ حواس باختہ ہو گیا۔ منصوبہ تیار کیا گیا کہ سیاست دان چھ نکات کے خلاف بڑھ بڑھ کر بولیں گے اور قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا کا مطالبہ کریں گے۔ مشرقی پاکستان پھٹ پڑا۔ فسادات برپا ہو گئے۔ پرانے شکوک مت نمایاں ہو کر ابھر آئے۔

بھٹو صاحب اور مصطفےٰ ڈھاکہ پہنچے۔ مصطفےٰ کے ذریعے مجیب کو پیغام بھجوایا گیا۔ پیغام میں بھٹو صاحب نے کہا کہ وہ مجیب کو پاکستان کے وزیر اعظم کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہیں۔ انہوں نے مجیب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور التماس کیا کہ اس مسئلے کو دور کرنے کے لیے کسی قابل عمل فارمولے تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ مجیب چھ نکات کے سلسلے میں کچھ لچک کا مظاہرہ کرے کیونکہ اپنی موجودہ شکل میں وہ مغربی پاکستان کے عوام کو قبول نہ تھے۔

یحییٰ دوبارہ ڈھاکے آیا۔ آمادہ بہ جنگ مجیب نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جیسے وہ کسی غیر ملک کا سربراہ ہو۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں کو، جن میں بھٹو صاحب بھی شامل تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دہرے یرغمال ہوں۔ حقیقت میں مجیب نے یک طرفہ آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ مزید بات چیت کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اقتدار فوری طور پر منتقل کیا جائے۔ یحییٰ نے زور دیا کہ گفت و شنید ہونی چاہیے۔ وہ طے کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ ڈھاکے میں اپنے قیام کو وہ ایک چال کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ وہ کچھ مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بنگالیوں کی آزادی کی جدوجہد کو کچلنے کے لیے پاکستانی فوج طیاروں کے ذریعے مشرقی پاکستان پہنچائی جا رہی تھی۔ ڈھاکے میں بھٹو صاحب کی موجودگی سے فائدہ مستزاد تھا۔ یحییٰ خان ایک ہی وار میں دو شکار کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

فوج نے ہلہ بول دیا۔ بہیمانہ انداز میں۔ مجیب کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان پہنچا دیا گیا۔ بھٹو صاحب نے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے ڈھاکہ جلتے دیکھا۔ یحییٰ واپس چلا گیا۔ ہوٹل کے گرد و نواح میں یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے۔ یحییٰ خان نے بھٹو صاحب کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایک شیطانی منصوبہ تیار کیا تھا۔ قتل کا الزام وہ مکتی باہنی پر لگا دیتا، جو عوامی لیگ کا مسلح بازو تھا، اور جرم کی سزا میں مجیب کو مغربی پاکستان میں پھانسی دے دی جاتی۔ خوش قسمتی سے بھٹو صاحب کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ انٹرکانٹی نینٹل میں بموں کا دھماکہ ہو ہی نہ سکا۔ ڈھاکہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

خون میں نہایا ہوا تھا۔ خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ بھٹو صاحب بد حواسی کے عالم میں مغربی پاکستان واپس پہنچے۔ ہوائی اڈے پر انہوں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے، پاکستان کو بچا لیا گیا ہے۔ نرگسیت کے مارے انہوں نے اپنی ذات کو پاکستان کے مساوی قرار دے ڈالا۔

خانہ جنگی زور شور سے جاری رہی۔ بنگلہ دیش کی آزادی کی لڑائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس فساد کو بھڑکانے میں پُر عناد غیر ملکی پریس کا بڑا ہاتھ تھا۔ یحییٰ خان نے نورالامین کو پاکستان کا وزیر اعظم بنا دیا۔ بھٹو صاحب نے نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کے طور پر حلف اٹھایا۔ پناہ گزینوں کا بہانہ بنا کر بھارتی فوجیں مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئیں اور دسمبر 1971ء میں پلٹن میدان میں اقبال کا خواب ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ جنرل نیازی نے اپنی تلوار جنرل اروڑا کو تھمادی۔ اقوام متحدہ میں بھٹو صاحب کی غلو آمیز اداکاری پر کسی نے کان تک نہ دھرا۔ ان کے پاکستان لوٹنے کا وقت آنے والا تھا تاکہ وہ "کرتا ہوں جمع پھر وطنِ لخت لخت کو" کہہ کر نئے پاکستان کی تعمیر کے لیے کوشاں ہو سکیں۔

اچانک اتنا شدید صدمہ پہنچنے کی وجہ سے مغربی پاکستان میں مکمل ابتری کا عالم تھا۔ یحییٰ خان حقیقی دنیا سے منہ موڑ کر خوابوں کے جہان میں گم ہو گیا۔ وہ اقتدار سے چمٹا رہنا چاہتا تھا اور مدہوشی کے عالم میں بھی آئین مرتب کرنے میں لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہ تو اس المیے کا کچھ ہوش ہے جس سے قوم دوچار ہو چکی تھی اور نہ ان ہجوموں کا شور و غوغا اس کے کانوں تک پہنچ رہا ہے جو اس کے خون کے پیاسے تھے۔ فوج نے اقتدار پر اپنی گرفت قائم رکھنے کے لیے چالیں چلنی شروع کیں۔ جنرل حمید کو یقین تھا کہ اس کے سربراہ مملکت بننے کا وقت آپہنچا ہے اور موصوف نے صدر کی طرح اینڈنا اکڑنا شروع کر دیا۔ جنرل پیرزادہ نے زیادہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ اسے پتہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں ہزیمت کے بعد فوج اپنی ساکھ گنوا چکی ہے اور اسے اقتدار چھوڑنا ہی پڑے گا۔ بہرکیف، اسے یہ منظور نہ تھا اقتدار ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ سیاست دانوں کی صفوں میں کسی ایسے کٹھ پتلے کو ڈھونڈنے لگا جس کی ڈور فوج ہلاتی رہے۔ اس کی نظر انتخاب اصغر خاں پر پڑی۔

ان دونوں نے منصوبہ گھڑا کہ لیاقت باغ میں ایک سیاسی ریلی ہو جس میں اصغر خان یحییٰ خان کا معاملہ عوام کی عدالت کے سامنے پیش کرے۔ اس کے بعد جذبات سے بھرا ہوا ہجوم صدر کی رہائش گاہ جائے اور اسے گھیرے میں لے کر یہ مطالبہ کرے کہ یحییٰ خاں اقتدار چھوڑ دے اور اس کا عہدہ اصغر خاں سنبھال لے۔

ایر مارشل رحیم خاں اور جنرل گل حسن اقتدار بھٹو صاحب کو منتقل کرنے کے حق میں تھے۔ انہوں نے مصطفےٰ سے بہت قریبی رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ رحیم خاں نے مصطفےٰ کو پیرزادہ کے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ لیاقت باغ کا جلسہ افراتفری کا شکار ہو گیا۔ (خورشید حسن میر اور مصطفےٰ کھر نے پکا انتظام کیا تھا کہ ایسا ہو کر رہے۔ لیاقت باغ فائرنگ کیس ابھی تک زیر سماعت ہے۔ ملزمان میں سے ایک مصطفےٰ ہے)

جنرل گل حسن اور رحیم خان صدر کے پاس گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی فوجی بغاوت تھی۔ انہوں نے یحییٰ کو بتادیا کہ اسے سبکدوش ہونا پڑے گا۔ اور یہ کہ بھٹو صاحب کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی جائے۔ یحییٰ کو سرکاری طور پر گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ انہوں نے یحییٰ سے کہا کہ بس بہت ہو گئی۔ وہ یحییٰ کو مزید کوئی چکر چلانے کا موقع نہیں دیں گے۔

مصطفےٰ کو مطلع کر دیا گیا۔ گل حسن نے بھٹو صاحب سے بات کی جو اس وقت روم میں تھے بھٹو صاحب پاکستان کی صورت حال کے بارے میں ابھی تذبذب کا شکار تھے۔ ان کے لیے جنرلوں پر بھروسہ کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں اس بارے میں ٹھوس ضمانتیں فراہم کی جائیں کہ عنانِ اقتدار ان کے حوالے کر دی جائے گی۔ ان ضمانتوں کے بغیر وہ واپس آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہ یقین دہانی انہیں مصطفےٰ نے کرائی۔ "ذمے داری میری ہے۔ اقتدار آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ از راہ کرم فوراً واپس آجائیے"۔

خصوصی طیارہ روم بھجوایا گیا۔ بھٹو صاحب واپس آ گئے۔ انہیں صدرِ پاکستان اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔ مصطفےٰ کھر کو پنجاب کا گورنر اور زون "اے" کا مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ دونوں ساتھی اپنا اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ڈھاکہ میں ابھی مرنے والوں کو دفنانے کا کام جاری تھا۔ پاکستان کا نقشہ نئے سرے سے کھینچا جارہا تھا۔

بھٹو صاحب نے مجیب الرحمن کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا۔ سیاست دان کے طور پر وہ خوب سمجھتے تھے کہ سیاست میں مستقل دشمن کوئی نہیں ہوتے۔ مجیب کو پھانسی کی کوٹھری سے نکال کر صدر کی رہائش گاہ لایا گیا۔ مصطفےٰ اور بھٹو صاحب نے اسے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ مجیب ان واقعات سے بالکل بے خبر تھا جن کے نتیجے میں بنگلہ دیش وجود میں آچکا تھا۔ مجیب نے ادھر ادھر نظر ڈالی اور بھٹو صاحب سے پوچھا کہ کیا صدر کا عہدہ انہوں نے سنبھال لیا ہے۔ بھٹو صاحب مسکرائے اور بولے۔ "ہاں۔ اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی میں ہوں۔" سب ہنس پڑے۔ مجیب کو ڈالروں کی صورت

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں ایک خاصی بڑی رقم اور انگلستان کے راستے بنگلہ دیش پہنچانے کے لیے ایک خصوصی طیارہ فراہم کیا گیا۔ مجیب نے ان ترانوے ہزار جنگی قیدیوں کو رہا کرانے میں مدد دینے کا وعدہ کیا جو بھارت میں قید تھے۔ اس نے بھٹو صاحب کو یقین بھی دلایا کہ وہ کوئی ایسی صورت نکالنے کی کوشش بھی کرے گا جس کے ذریعے پاکستان کے ساتھ کسی قسم کی ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن قائم ہو جائے۔ بھٹو صاحب اور مصطفیٰ مکمل رازداری کے ساتھ مجیب کو رخصت کرنے گئے۔ جب مجیب کا طیارہ فضا میں بلند ہوا تو ان دونوں نے سمجھ لیا کہ پاکستان اب وہ نہیں رہا جو کبھی تھا۔

مصطفیٰ ڈھائی سال تک پنجاب کا گورنر رہا۔ اس کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ وہ مؤثر منتظم ہے۔ اس کا اکثر اپنے نامی گرامی پیش رو، کالاباغ، سے موازنہ کیا جانے لگا۔ مصطفیٰ کالا باغ سے زیادہ طاقتور تھا۔ وہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی تھا اور عوام کا منتخب نمائندہ بھی۔ صدر کے بہت قریب تھا۔ اسے صدر کا مکمل اعتماد حاصل تھا۔ اس کے پاس ہر طرح کی اپوزیشن کو لگام دینے اور کچل ڈالنے کا اختیار تھا۔ وہ ہڑتالوں کی اس وبا پر قابو پانے میں کامیاب رہا جو روز افزوں توقعات کی وجہ سے پھوٹ پڑی تھی۔ جمعیت طلبہ اسلام کی کمر توڑنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ قانون اور امن عامہ کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پا لیا گیا اور صوبے بھر میں ڈاکہ زنی کی جو لہر آئی ہوئی تھی وہ مکمل طور پر ٹھنڈی پڑ گئی۔

بطور گورنر ایک لحاظ سے مصطفیٰ کا کام آسان ہو گیا تھا۔ یہ سرخوشی ابھی فضا میں تھی کہ حکومت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ مصطفیٰ کو عوام کی طاقت کی سمجھ بھی تھی اور وہ اس طاقت سے مؤثر انداز میں کام بھی لیتا تھا۔ جب صوبائی پولیس فورس نے ہڑتال کی تو مصطفیٰ نے اپنا ردعمل ظاہر کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ اس نے اعلان کیا کہ ہڑتال بغاوت ہے اور عوام سے درخواست کی کہ قانون اور امن عامہ کی ذمے داری سنبھال لیں۔ اس نے کہا کہ عوام پولیس چوکیوں پر ڈیوٹی دیں اور ٹریفک کی نگرانی کریں۔ اس نے پولیس کو الٹی میٹم دیا۔ "چوبیس گھنٹے کے اندر کام پر واپس آجاؤ ورنہ تمہیں نوکری سے نکال دیا جائے گا۔" پولیس والے ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ مصطفیٰ کی دھمکیاں پھوکی نہیں ہوتیں انہیں نظر آنے لگا تھا کہ گورنر کسی پس و پیش کے بغیر ساری پولیس فورس کو برطرف کر کے بے روزگار لوگوں کے جم غفیر سے نئے رنگروٹ بھرتی کر لے گا۔ مصطفیٰ ان میں سے نہیں تھا جو بلیک میل کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

نوکر شاہی سیاست دانوں کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتی آئی تھی۔ اس کے ارکان

اوپر ہی طبقے کے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کی نظر میں پی پی پی ایک ست نما غول تھی، چھچھوروں کی جماعت تھی۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ بطور جماعت یہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گی کیونکہ اس سے وابستہ لوگ ہنگامہ آرائی پر مبنی سیاست چلانے کے عادی تھے اور انتظامی امور کی روکھی پھیکی دنیا سے مانوس نہ تھے۔ مصطفیٰ کو معلوم تھا کہ پارٹی مشینری اس کی پشت پر ہے۔ اس نے انتظامیہ پر ثابت کر دیا کہ جہاں تک نئی نئی باتیں سوچنے اور پالیسی پر عمل درآمد کرانے کا تعلق ہے وہ کسی طرح اس سے ہٹا نہیں۔ اس نے واضح کر دیا کہ نوکر شاہی کا کام عوامی حکومت کی خدمت کرنا ہے۔ اس کا کام پارٹی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ جس افسر میں ولولے کی کمی پائی جاتی یا جو جان بوجھ کر سست رفتاری کا مظاہرہ کرتا سے موقوف کر دیا جاتا۔ مصطفیٰ پہلے خود مثال قائم کرتا تا کہ دوسرے اس کی خوشی خوشی تقلید کریں۔ وہ سچے دل سے اس نعرے پر یقین رکھتا تھا کہ "طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں" اور دوسرے سیاست دانوں کی بہ نسبت عوام کی طاقت کو زیادہ ذہانت سے کام میں لاتا تھا۔

فوج کو ابھی پوری طرح بے اثر نہیں بنایا جا سکا تھا۔ بھٹو صاحب کو علم تھا کہ انہیں بالآخر اقتدار کی رفعتوں تک پہنچانے میں مسلح افواج کے دو سینئر افسروں۔ گل حسن اور رحیم خاں کا ہاتھ ہے۔ فوج سے معاہدہ یہ طے پایا تھا کہ اقتدار میں ان کا بھی ساجھا ہو گا۔ اس شراکت سے نہ سول حکومت مطمئن تھی نہ فوج۔ جب معاہدے کے فریقین نے اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کی حدود کا تعین کرنا چاہا تو خاصا کھچاؤ پیدا ہو گیا۔ بھٹو صاحب کو مسلح افواج کا کردار گراں گزرتا تھا۔ وہ یورپی سیاست کے بڑے زیرک طالب علم تھے اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ بونا پارٹزم سے انہوں نے کوئی سبق نہ سیکھا ہو۔ انہیں پتہ تھا کہ فوج کے اندر سے ایسے طالع آزما ابھر کر سامنے آتے رہیں گے جو اس انقلاب کو، جس کی وہ رہنمائی کر رہے تھے، ملیامیٹ کر سکتے ہیں۔ بادشاہ گروں کو اکثر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ بادشاہ تو وہ خود ہیں۔

چھوٹی موٹی بدمزگیاں ہوتی رہیں۔ اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد بھٹو صاحب نے اطلاعات کی نہایت حساس وزارت حفیظ پیرزادہ کے سپرد کر دی۔ ٹی وی کا نیٹ ورک حفیظ کے احکام کا تابع تھا۔ حفیظ نے فوج کی حساسیت کو پرکھنے کا فیصلہ کیا۔ ٹی وی کے نیوز سیکشن کو حکم دیا گیا کہ ڈھاکہ میں بھارتی افواج کے سامنے پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کی تصویریں نشر کی جائیں۔ حفیظ محسوس کرتا تھا کہ فوج اور عوام کے شتر مرغ جیسے انداز نظر میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ وہ فوجی بوٹوں کو روندنے چلا تھا۔

گل حسن، جواب فوج کا سی، ان سی تھا، پروگرام دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھٹو کو فون

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مصطفیٰ کھر اور حنیف رامے، ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف محاذ

کیا۔ وہ اس "لغزش" پر سخت برہم تھا۔ "اس شخص کو فوراً ہٹایا جائے۔" بھٹو صاحب کے پاس جنرل کے کہے پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ حفیظ کو ہٹا کر یہ اہم وزارت زیادہ قابل قبول کوثر نیازی کے حوالے کر دی گئی۔ گل حسن کا لہجہ خار بن کر کھٹکتا رہا۔ بھٹو صاحب کی سمجھ میں آگیا کہ فوج اور سول حکومت کے مابین اختیارات اور مراتب کی اس تقسیم کی ناکامی مقدر ہو چکی ہے۔ انہوں نے جان لیا کہ گل حسن اور رحیم خان کو نکالنا پڑے گا۔ ان کی جگہ ایسے افسروں کو دینی ہو گی جو بھٹو صاحب کے وفادار ہوں۔ ایسے افسروں کی کوئی گنجائش نہ تھی جو یہ کہیں کہ ہمیں اتنا تاوان دیتے رہو تو ہم تمہاری قانونی حیثیت کو کچھ نہ کہیں گے۔ بھٹو صاحب نے اس سلسلے میں پہل کرنے کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے دونوں بادشاہ گروں کو ڈنر پر مدعو کیا۔ وہ مصطفیٰ، حفیظ، ممتاز بھٹو اور جتوئی صاحب کو اعتماد میں لے چکے تھے۔ انہیں بھی ڈنر میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ بھٹو صاحب فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ دونوں افسروں سے مستعفی ہونے کے لیے کہیں گے۔ اگر افسروں نے استعفٰے دینے میں ہچر مچر کی تو اس غیر متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے بھی منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب ان استعفوں کا مضمون تیار کرنے کے لیے سٹڈی روم میں چلے گئے اور اپنے چار قریب ترین ساتھیوں سے کہا کہ اتنی دیر وہ صورت حال کو سنبھالیں۔ دونوں افسر آپہنچے۔ ان کے اے ڈی سی بھی ساتھ تھے اے ڈی سی حضرات سے کہا گیا کہ وہ بغلی کمرے میں انتظار کریں۔

گل حسن نے دیکھ لیا کہ چاروں میزبانوں کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ہیں۔ وہ پوکر کے بڑے کھلاڑی تھے۔ پوکر کا اچھا کھلاڑی تو اپنے چہرے مہرے کی کیفیت سے پتا ہی نہیں چلنے دیتا کہ اس کے پاس کیسے پتے ہیں۔ گل حسن نے بھانپ لیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے وزیروں سے پوچھا کہ بھٹو صاحب کہاں ہیں۔ کہنے لگا کہ ابھی کی اور بھی مصروفیات ہیں جو فوری توجہ چاہتی ہیں اور وہ اسی صورت میں رکے گا کہ صدر صاحب موجود ہوں۔ کھڑے کھڑے بہانہ گھڑا گیا۔ بھٹو صاحب کسی سفیر سے بات چیت کرنے میں معروف ہیں اور تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔

حفیظ نے سٹڈی میں جا کر بھٹو صاحب سے کہا کہ وہ باہر آجائیں کیونکہ بلیوں کی موجودگی میں کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ کہیں اڑ ہی نہ جائیں۔ بھٹو صاحب سٹڈی سے برآمد ہو کر اس تناؤ بھری محفل میں شامل ہو گئے۔

بھٹو صاحب نے تقریر کی اور بتایا کہ اس موقع پر ان کا مستعفی ہونا کیا اہمیت اور معنی رکھتا ہے۔ انہوں نے دونوں افسروں کو سنہرے مصافحے کی پیشکش کی۔ گل حسن نے کھٹ سے انکار کر دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بھٹو صاحب ڈرا دھمکا کر کام نکالنا چاہتے ہیں اور

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اگر وہ ڈٹا رہا تو ان کی ترکی تمام ہو جائے گی۔

اس نامبارک سکوت میں ان کاغذوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا، جن پر استعفے تحریر تھے، کوئی آواز نہ آرہی تھی۔ بھٹو صاحب نے کاغذات افسروں کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں کے ہاتھ میں قلم تھما دیے گئے۔ رحیم نے صورت حال کی گھمبیرتا کو سمجھ لیا۔ ان کا انکار ملک کو ایک گہرے بحران میں جھونک دے گا۔ سول حکومت اور فوج کے درمیان کھلم کھلا ٹکراؤ تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ فوج میدان جنگ میں اپنی شکست کے شرم ناک داغ کو ابھی دھو نہ سکتی تھی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ واحد موقع تھا جب فوج کو ایک بہت ہی بے ڈھب وکٹ پر کھیلنا پڑ رہا تھا۔ اس نے دستخط کر دیے۔

گل حسن کا دل چاہ رہا تھا کہ بحران کی نوبت آجائے تو خوب ہو۔ اس کے ذہن میں صرف ایسے منصوبے تھے جو مختصر مدت کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔ فوج صورتِ حال پر قابو پا سکتی ہے۔ اس مرحلے پر کمزوری کا ثبوت دیا گیا تو فوج کے وقار کو مزید دھچکا لگے گا۔ اس نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

جس بات کا وہم گمان بھی نہ تھا وہی پیش آگئی۔ بھٹو صاحب اور ان کے ساتھیوں کے پاس پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہ تھی۔ جنرل گل حسن صدر کی رہائش گاہ سے نکل کر اپنے کور کمانڈروں کو کاروائی کے لیے مجتمع کر سکتا تھا۔ ادھر اس کے سامنے فوجی بغاوت کے سوا کوئی راہ عمل نہ تھی۔ ادھر اس سے زبردستی دستخط کرانے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ اس واقعے کے بعد اگر وہ اپنے عہدے پر فائز رہا تو پی پی پی اور فوج کے تعلقات کی نوعیت عنادِ مسلسل کی شکل اختیار کر لے گی۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ کسی کو پلک جھپکنے کا بھی یارا نہ تھا۔ دونوں طرف سے بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔

مصطفےٰ اٹھا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا گل حسن کے پاس پہنچا، جو بیٹھا ہوا تھا، چھا جانے والے انداز میں اس کے سر پر کھڑے ہو کر مصطفےٰ نے اس پر قہر بھری نظر ڈالی۔ "میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ آپ دستخط کر دیں۔" مصطفےٰ کے آمادہ بہ فساد لہجے سے کام بن گیا۔ رہی سہی کسر رحیم خان کے قائل معقول کرنے والے انداز سے پوری ہو گئی۔ گل حسن نہایت طوعاً وکرہاً اپنے عہدے سے دست بردار ہوا۔ دستخط کرنے کے فوراً بعد اس نے اپنے اے ڈی سی سے ملنا چاہا۔ اسے اجازت نہ دی گئی۔ "ابھی نہیں" بھٹو صاحب نے کہا۔

وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر کو فون کیا گیا۔ یہ نحیف و نزار انجینیئر جلد ہی ہیلی کوپٹر میں

منتخب قومی اسمبلی میں ... اراکین اسمبلی کے ساتھ پہلی ...

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

سفر کرتا نظر آیا۔ اس کا مشن -- جنرل ٹکا خان کو اوکاڑہ سے اسلام آباد لانا۔ بنگال کے بوچڑ کو بحال کرنے کا وقت آگیا تھا۔ اسے فوج کا سی ان سی مقرر کیا جارہا تھا۔ بھٹو صاحب نے اس پر جو احسان کیا اسے ٹکا خان نے کبھی بھلایا نہیں۔ وہ آگے چل کر پیپلز پارٹی کا گرم جوش وفادار ثابت ہوا۔

صدر کی رہائش گاہ کے پچھلے دروازے پر ایک کار انتظار میں کھڑی تھی۔ جنرل ٹکا خان کے عہدہ سنبھالنے تک ان دونوں افسروں کو دنیا بھر سے الگ تھلگ رکھنا ضروری تھا۔ ان کا استعفیٰ دینے سے مکر جانا یا یہ کہنا کہ استعفیٰ جبراً لیا گیا تھا بھٹو صاحب کو مہنگا پڑتا۔ ان دونوں حضرات کو چوری چھپے صدر کی رہائش گاہ سے باہر پہنچا کر کار میں دھانس دیا گیا۔ سٹیئرنگ وھیل مصطفےٰ نے سنبھالا۔ وہ بہت اچھا ڈرائیور تھا اور اسے کار تیز چلانے میں مزہ آتا تھا۔ ممتاز بھٹو محافظ بن کر مصطفےٰ کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا۔ جتوئی صاحب کو بونا پارٹسٹ بننے کے خواب دیکھنے والے دونوں بدنصیبوں کے درمیان بیٹھنے کا ناقابل رشک فریضہ انجام دینا تھا۔ پی پی پی کے تینوں جیالے مسلح تھے۔ اگر افسران کا کہا ماننے سے انکار کرتے تو وہ اپنے اسلحہ کو کام میں لائے بغیر نہ رہتے۔

مصطفےٰ نے لاہور کا رستہ لیا۔ وہ زناٹے بھرتے ایک شہر کے بعد دوسرے شہر سے گزرتے گئے۔ وہ ابھی تک خاصے نروس تھے۔ اگر افسروں کی غیر موجودگی کسی کے نوٹس میں آگئی تو کیا ہوگا؟ کیا گل حسن خطرے کو پہلے سے بھانپ کر آئی ایس آئی کو مطلع کر چکا تھا؟ جو اے ڈی سی انتظار کر رہے تھے اگر انہیں کسی طرح پتہ چل گیا کہ ان کے افسرانِ بالا کو اغوا کرنے کی سازش کی گئی ہے؟ مصطفےٰ نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔

ہیڈ لائٹوں کی تیز روشنی میں مصطفےٰ کو ایک چیک پوائنٹ دکھائی دیا۔ روڈ بلاک پر سرتاپا مسلح فوجی ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ یہ ایسا لمحہ تھا جسے پی پی پی کے تینوں آدمی کبھی فراموش نہ کر سکے۔ پل بھر کے لیے انہیں لگا کہ کھیل ختم ہوگیا۔ مصطفےٰ جس رفتار سے کار چلا رہا تھا اسی رفتار سے سوچ بھی رہا تھا۔ اس نے روڈ بلاک سے رکے بغیر گزر جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ معمول کی کسی پڑتال کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ کیا پتہ کوئی فوجی اپنے کمانڈران چیف کو پہچان کر سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دے۔ وہ روڈ بلاک سے گزر گئے اور انہیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ بہت وقت گزر جانے کہ بعد مصطفےٰ نے پچھلا منظر دکھانے والے آئینے پر نظر ڈالی۔ اسے جتوئی صاحب کی جھلک دکھائی دی جو اپنے دونوں قیدیوں کے درمیان پڑے سو رہے تھے۔

وہ لاہور پہنچے، داتا صاحب کے پاس سے گزرے، جلدی سے کچھ دعائیں مانگیں اور گورنر ہاؤس کے گوشۂ عافیت کا رخ کیا۔ دونوں اعلیٰ افسروں کو کمرا نمبر دس میں ٹھہرایا گیا۔ انہیں غیر سرکاری طور پر نظر بند رکھا جارہا تھا۔ پنجاب کے گورنر نے انہیں اغوا کیا تھا۔ وہ مصطفےٰ کے برے میزبان ہونے کا گلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے انہیں شلواریں قمیضیں فراہم کیں اور ان کے کمرے میں بہترین سکاچ پہنچا دی گئی۔ گورنر ہاؤس میں کسی کمرے کو پہلی مرتبہ نا رضامند مہمانوں کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ اگلے دن انہیں گورنر کے طیارے میں اسلام آباد لے جایا گیا۔ ان کے مستعفی ہونے کی خبر تمام اخباروں کے پہلے صفحے پر چھپ چکی تھی۔ بھٹو صاحب ان سے ملے اور کوشش کی کہ جو بدمزگی پیدا ہو چکی تھی اسے بھلا دیا جائے۔ دونوں کو بیرون ملک سفیر مقرر کر کے بعد شان جلا وطن کر دیا گیا۔

بھٹو صاحب اور مصطفےٰ کے تعلقات میں جلد ہی کشیدگی در آئی۔ مصطفےٰ اپنے قائد کے سحر سے آزاد ہو چلا تھا۔ اب وہ بذات خود ایک سیاست دان بن چکا تھا، واضح شناخت کا مالک تھا۔ یہ امر بھٹو صاحب کو شاق گزرتا تھا کہ مصطفےٰ اور پنجاب کو لازم و ملزوم سمجھا جانے لگا ہے۔ بھٹو صاحب عمر میں بڑے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ پنجاب کتنا اہم ہے۔ وہ پاکستان کا ووٹ بینک اور پیپلز پارٹی کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا۔ پنجاب کا ان کے ہاتھ سے نکل کر خود ان کے بنائے ہوئے فرینکن شٹائن نما عفریت کے قبضے میں چلا جانا بھٹو صاحب کو بہت مہنگا پڑتا۔ مصطفےٰ جہاں بھی جاتا اس کے خیر مقدم میں "شیر پنجاب" کے نعرے بلند ہوتے۔ وہ محسوس کرتے کہ مصطفےٰ شاید کسی وقت اپنی ابھری ہوئی انا کے بھرے میں آکر خود ہی ملک کا قائد بننے کی کوشش کرنے لگے۔ اس موقع پر مصطفےٰ کی حرکات سے بھٹو صاحب کے شکوک اور پختہ ہو گئے۔

گورنر نے جتانا شروع کر دیا کہ وہ فیصلے اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ وہ صدر کی منظوری حاصل کیے بغیر بعض کام اپنی صوابدید سے شروع کرا دیتا۔ اسے اپنی خود مختاری عزیز تھی اور جب اسے چیلنج کیا جاتا تو بگڑ بیٹھتا۔ دونوں نے پالیسی کے معاملات حتیٰ کہ افراد کی تقرریوں تک کے حوالے سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ اگر بھٹو صاحب مصطفےٰ کے نام زد افراد کو مسترد کر دیتے تو وہ منہ پھلا کر بیٹھ جاتا اور بھٹو صاحب کے تجویز کردہ متبادل ناموں پر قلم پھیر دیتا۔ وہ بہت اڑیل پن پر اتر آیا تھا اور اس کی حرکتوں سے یہی تاثر ملتا تھا کہ پاکستان میں بھٹو صاحب کے بعد اگر کوئی ہے تو وہی ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے بعد اس کے لیے صرف ایک ہی جگہ رہ گئی تھی یعنی ملک کے سب سے اونچے عہدے پر فائز ہونا باقی تھا۔ اسے اپنی طاقت پر بڑا اعتماد تھا اور وہ جانتا تھا کہ بھٹو صاحب کو چار و ناچار اس کی بیشتر تجاویز پر صاد کرنا پڑے گا۔ اس نے بڑی استادی سے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

خود کو ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا کہ اس کے کہے کو آسانی سے ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ پنجاب کو سیاسی طاقت کی مضبوط ترین اساس کی حیثیت حاصل تھی۔ مصطفیٰ نے پنجاب کی سرزمین پر بڑی مضبوطی سے قدم جما رکھے تھے۔

رفتہ رفتہ مصطفیٰ اپنے قائد کے احکامات ماننے سے انکار کرنے لگا۔ اس نے صدر پر برملا تنقید شروع کر دی۔ اس کے قابل اعتماد دوستوں میں سے بہت سے ایسے تھے جو ساری باتیں جاکر بھٹو صاحب کو بتا دیتے تھے۔ اقبال لکا نامی تحصیلدار، جسے مصطفیٰ تک رسائی حاصل ہو گئی تھی، ایسا ہی ایک مخبر تھا۔ اسے مصطفیٰ کے دلی خیالات تک کا پتہ تھا اور ان دلی خیالات تک رسائی، جناب لکا کی مہربانی سے، بھٹو صاحب کو بھی حاصل ہو چکی تھی۔ بھٹو صاحب کے ارد گرد رہنے والے لوگ بھی پنجاب کے گورنر کی روز افزوں طاقت پر کڑھتے رہتے تھے۔ وہ شکوک کے شعلوں کو ہوا دینے لگے۔ انہوں نے بھٹو سے کہا کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ بھٹو صاحب مصطفیٰ پر دو ٹوک انداز میں بھروسہ کرتے تھے۔ انہیں اس سے محبت تھی۔ وہ مصطفیٰ کی اس طرح سرزنش کرتے جیسے کوئی باپ اپنی بگڑی ہوئی اولاد کو ڈانٹتا ہے۔

اسلام آباد میں ہر طرف مصطفیٰ کی "ہم سا ہو تو سامنے آئے" جیسی خوش فہمی کا چرچا ہونے لگا۔ بھٹو صاحب کو اس کی ڈینگوں سے مطلع کیا گیا۔ بظاہر مصطفیٰ نے کہا تھا کہ ملک کا اگلا صدر وہ بنے گا۔ پنجاب کے عوام اس کی پشت پر ہیں۔ وہ اسے اچانک اٹھا کر اقتدار اعلیٰ تک پہنچا دیں گے۔ بھٹو صاحب کے سیاسی شعور نے انہیں اپنے نائب کی طرف سے خبر دار کیا۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں گورنروں نے بادشاہِ وقت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ یہ بھٹو صاحب کی برداشت سے باہر تھا کہ کوئی شخص، جو پس پردہ منتظر ہو، اپنے وقت سے پہلے سٹیج پر آدھمکے۔ مصطفیٰ میں صبر کا مادہ نہ تھا۔ جو مکالمے اسے ادا کرنے تھے انہیں وہ بھٹو صاحب کی طرف سے اشارہ ملنے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیتا۔ مصطفیٰ نے اپنے موقف کو حق بجانب ٹھہرانے کی کوشش میں دلیل یہ پیش کی کہ اگر وہ انفرادی طور پر ایک قائد کی طرح ابھر کر سامنے آئے گا تو اس میں بھٹو صاحب کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ پیپلز پارٹی کو مزید رہنما درکار تھے۔ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ بھٹو صاحب بنفس نفیس ہر بات اور کام پر خود نظر رکھیں۔ اس نے بھٹو صاحب کی خدمت میں کئی بار عرض کی کہ وہ ہمیشہ وفادار رہے گا اور جو بھی حمایت اسے حاصل ہو گی وہ ساری کی ساری پارٹی کے سپرد کر دی جائے گی۔ مصطفیٰ کی یہ دلیل بھٹو صاحب نے قبول نہ کی۔ انہیں پتہ تھا کہ مصطفیٰ کو جو بھی حمایت حاصل ہے وہ پارٹی کے اندر سے ہے۔ وہ دوسری جماعتوں کے چھوٹے چھوٹے دھڑوں کو

توڑ کر ساتھ ملانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ وہ صرف بھٹو صاحب کی طاقت کی اساس کو کتر رہا تھا۔ وہ اس کیک کو بانٹ کر کھانا چاہتا تھا جسے بھٹو صاحب نے تیار کیا تھا۔

اقتدار ہاتھ آجانے سے مصطفیٰ کی خود پسندی حد سے بڑھ گئی۔ بھٹو صاحب کو ہر ایرے غیرے اور خود ان کے وزیروں مشیروں کے ٹولے نے مصطفیٰ کی خیرہ سری کی خبر دی۔ ہر کسی کو آرزو تھی کہ بھٹو صاحب مصطفیٰ کے پر کتریں تو سہی۔

معاملات جلد ہی قابو سے باہر ہو گئے اور دونوں کھلم کھلا خم ٹھونک کر آمنے سامنے آ ڈٹے۔ آئین کی منظوری کے بعد مصطفیٰ کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا تھا۔ کراچی میں کابینہ کے ایک اجلاس کے دوران بھٹو صاحب اور مصطفیٰ کا اختلاف، جو آہستہ آہستہ پک رہا تھا، اچانک ابال کھا کر سامنے آگیا۔

مسٹر امتیازی نامی ایک بیورو کریٹ نے اجلاس میں ایک مقالہ پڑھا جس میں واضح طور پر پنجاب سے رعایت برتی گئی تھی۔ بھٹو صاحب نے امتیازی کو بیچ میں ٹوک دیا اور اس پر برس پڑے۔ "کسی کو یہ حق نہیں کہ مجھے بتائے کہ ملک کے صوبوں میں فنڈز کو کیسے تقسیم کرنا ہے۔ اگر میں چاہوں تو تمام فنڈز لاڑکانہ منتقل کر سکتا ہوں۔ مجھے عوام اختیار دے چکے ہیں۔" مصطفیٰ نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ "جناب، یہ درست نہیں آپ کو پورے ملک کے عوام کی خدمت کرنے کا اختیار ملا ہے۔ بات لاڑکانہ تک محدود نہیں۔ جب تک میں پنجاب کا وزیر اعلیٰ ہوں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں پنجاب کے حقوق کا تحفظ کروں گا۔" اس مصطفیٰ کھر میں اور 1962ء کے خاموش طبع مصطفیٰ کھر میں، جو بھٹو صاحب کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے ہر لفظ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتا تھا، زمین آسمان کا فرق تھا۔

بھٹو صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے کاغذات اٹھا کر میز پر پھینک دیے اور چراندے انداز میں بولے۔ "یا میں پاکستان کا وزیر اعظم رہوں گا یا تم وزیر اعظم بن جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ بکتے جھکتے اجلاس چھوڑ کر چلے گئے۔

مصطفیٰ کو اس کے ساتھیوں نے گھیر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ مصطفیٰ نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اندر جا کر وزیر اعظم سے معافی چاہے۔ مصطفیٰ اندر گیا۔ بھٹو صاحب نے اسے خبردار کیا اور آئندہ تمیز داری کا ثبوت دینے کے لیے کہا۔ "تم قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہو۔ میں سرِ عام اس طرح کی گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگلی بار مجھ سے علیحدگی میں بات کرنا۔"

بھٹو صاحب نے لاہور میں ایک اسلامی کانفرنس کا اہتمام کیا۔ مقصد یہ تھا کہ بنگلہ دیش میں منہ کی کھانے سے پاکستان کا امیج جو بگڑا تھا اسے سنوارا جائے۔ کانفرنس کی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

حیثیت ایسے جشن کی تھی جسے دیکھ کر لوگ واہ واہ کر اٹھیں۔ مختلف ملکوں کے مقتدر سربراہوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ تیل کی قیمتوں میں زبردست اضافے کی وجہ سے بہت سے مسلم ممالک راتوں رات بے انتہا امیر ہو گئے تھے اور بھٹو صاحب ان کا دل جیتنا چاہتے تھے۔ وہ پاکستان کے لوگوں کو یہ منظر دکھانے کے خواہاں بھی تھے کہ مسلم امہ کے تمام رہنما مل کر بادشاہی مسجد میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ اس طرح ان راسخ العقیدہ حضرات کے اس الزام کی بھی پر زور تردید ہو جائے گی کہ بھٹو صاحب دہریے اور اوباش ہیں۔ اس کانفرنس کو کامیابی سے تکمیل تک پہنچانا مصطفےٰ کی ذمے داری تھی۔ اس کی انتظامی صلاحیتوں پر انتہا کا دباؤ پڑا لیکن جو کام اس کے ذمے لگایا گیا تھا وہ اس نے کر دکھایا بلکہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ کانفرنس کی تمام کارروائی بالکل صحیح طریقے سے بالکل صحیح وقت پر ہوئی۔ ذرا سا مبالغہ ہی سہی۔

ایک تقریب کے موقع پر ڈائس پر تین کرسیاں رکھی گئیں۔ لیبیا کے قذافی کے دائیں بائیں بھٹو صاحب اور مصطفےٰ کو بیٹھانا تھا۔ جب تینوں رہنما نشستیں سنبھالنے لگے تو قذافی نے اپنے نائب عبدالسلام جالود کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑانی شروع کی۔ کہنے لگا کہ جالود کو آکر ڈائس پر اس کے ساتھ بیٹھنا چاہیے۔ جالود کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر قذافی کے پاس لایا گیا۔ بھٹو نے مصطفےٰ کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی کرسی جالود کے لیے چھوڑ دے۔ مصطفےٰ اٹھ گیا اور دوسری کرسی لائی جانے کا انتظار کرنے لگا۔ قذافی بیٹھ گیا۔ منچلا رہنما ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلانے میں کامیاب رہا تھا۔ مصطفےٰ کے دل پر اس بات کا بہت اثر ہوا۔ اس نے بھٹو سے شکایت کی۔ "قذافی کتنا عظیم انسان ہے۔ جس عزت اور اہمیت کا نائب مستحق ہے وہ قذافی سے اسے ملتی ہے۔ آپ میں اور قذافی میں یہی فرق ہے۔ جب تک جالود کو اس کے پاس نہیں لایا گیا وہ بیٹھا تک نہیں۔"

اسلامی کانفرنس کے انعقاد سے ملاپ کرانے کا کام بھی لیا گیا۔ مجیب الرحمن کو پاکستان بلایا گیا اور بھٹو صاحب نے کانفرنس سے پیدا ہونے والے انبساط کی آڑ میں بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ شالامار باغ میں آناً فاناً استصواب رائے کی مدد سے مدعا حاصل ہو گیا۔

اقتدار میں آنے سے فائدہ اٹھا کر مصطفےٰ نے ان تمام زمینوں پر دوبارہ قبضہ جمالیا جنہیں وہ اپنی سیاسی مہم کے دوران اور اپوزیشن کا ساتھ دینے کے زمانے میں بیچ چکا تھا۔ جب وہ گورنر بنا تو اس کے پاس صرف تیس ایکڑ زمین رہ گئی تھی۔ پولیس ان تمام بدنصیبوں کو پکڑ لائی جنھوں نے مصطفےٰ سے زمین خریدی تھی اور انہیں ڈرا دھمکا کر ساری املاک سابق مالک کو لوٹانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اپنی گورنری کے زمانے میں وہ تقریباً

اپنی ان تمام زمینوں کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔

بھٹو صاحب کے بہت سے دشمن تھے۔ ملک میں جن لوگوں کو صرف اپنے مفادات سے غرض تھی وہ بھٹو صاحب کی پالیسیوں سے خوف زدہ تھے اور ان کا اسلامی سوشلزم تو انہیں زہر لگتا تھا۔ وہ ہمہ وقت انہیں کمزور کرنے اور ملک پر ان کی گرفت کا قلع قمع کرنے کی چالیں گھاتیں تیار کرتے رہتے۔ دشمنوں کو یقین تھا کہ اگر کسی طرح پنجاب کو بھٹو صاحب کے قبضے سے چھڑا لیا جائے تو ان پر زوال آتے دیر نہیں لگے گی۔ انہوں نے اپنی تمام توجہ اس مردِ واحد۔ یعنی مصطفےٰ کھر۔ پر مرکوز کر دی جو بھٹو صاحب کو پنجاب میں للکار سکتا تھا۔ انہوں نے رسم وراہ بڑھانی شروع کی۔ بھٹو صاحب کو کمزور کرنے کے ایک خوب اچھی طرح سوچے سمجھے منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز ہوا۔ اس منصوبے میں مصطفےٰ کو کلیدی عنصر کا مقام حاصل تھا۔

اسلامی کانفرنس کے فوراً بعد مصطفےٰ نے استعفےٰ پیش کر دیا۔ بھٹو صاحب نے اسے منظور تو کر لیا لیکن مصطفےٰ سے استدعا کی کہ استعفےٰ دینے کی بات کو اپنے تک ہی رکھے وہ اسے ابھی عام نہیں کریں گے۔ بھٹو صاحب نے مصطفےٰ سے کہا کہ رات کو وہ اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کر لے اور اگلی صبح ان سے ملے۔ "ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ مستقبل میں ہمارے روابط کی نوعیت کیا ہو گی۔ یہ طے پا جانے کے بعد ہی ہم تمہارے مستعفی ہونے کا اعلان کریں گے"۔

اس رات مصطفےٰ کو بتایا گیا کہ وہ بھٹو صاحب کے دام میں آ گیا ہے۔ وہ اعلان کر دیں گے کہ مصطفےٰ کو ہٹا دیا گیا ہے اور پھر اس کی برطرفی کی وجوہ گنا ڈالیں گے۔ مصطفےٰ کو اس برطرفی کا دھچکا سہار جانے یا یہ وضاحت کرنے میں کہ اسے کیوں ہٹایا گیا ہے سخت دشواری پیش آئے گی۔ مصطفےٰ نے اپنے مخبر کے کہے کو صحیفۂ آسمانی سمجھا۔ اس نے پریس کانفرنس طلب کی اور استعفے کا اعلان کر دیا۔ اس نے جلد بازی سے کام لیا۔

بھٹو سخت برہم ہوئے۔ وہ مصطفےٰ سے ملنے اس کے گھر آئے۔ لاہور میں وہ ہمیشہ مصطفےٰ کے پاس ٹھہرتے تھے۔ وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ کی مرمت اور آرائش ہو رہی تھی۔ مصطفےٰ کرائے کی ایک کوٹھی میں مقیم تھا جس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ نہایت فرسودہ تھی۔ مصطفےٰ نے بھٹو صاحب کا خیر مقدم کیا اور انہیں ایک ایسے کمرے میں ٹھہرایا جس کا ساز و سامان بالکل پھٹیچر تھا۔ اس کے ساتھ جو غسل خانہ تھا اس کی حالت بھی دگرگوں تھی۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بھٹو صاحب نوجوان میاں ساجد پرویز کو لے کر ٹیرس پر جا بیٹھے۔ انہوں نے اپنے لیے جام انڈیلا اور نظر افق پر جمادی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے ساتھ بے وفائی کی گئی ہے۔ انہیں لگتا تھا کہ دوستیوں میں کچھ نہیں رکھا۔ سب فریب نظر ہے۔ میاں ساجد کا کہنا ہے کہ اس نے بھٹو صاحب کو اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بھٹو صاحب کے دل پر واقعی چوٹ لگی تھی اور وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے بڑی تلخی سے میاں ساجد سے مصطفیٰ کا گلہ کیا۔ "مجھے مصطفیٰ سے محبت ہے۔ ہم مل کر اس ملک کے لیے اتنا کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اس نے میرے ساتھ یہ کیا کیا؟ آج رات میں خود کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے لوگوں پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔ آج کے بعد میں کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ اگر مصطفیٰ کھر میرے ساتھ یہ کچھ کر سکتا ہے۔ خدایا ..." انہوں نے اپنا سر اس طرح جھٹکا جیسے انہیں یقین نہ آرہا ہو۔ "مصطفیٰ کی نمود خواہی ہماری دوستی سے زیادہ اہم بن گئی ہے۔ آج بطور قائد میری ناکامی پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی ہے۔ اگر میں مصطفیٰ کی وفاداری حاصل نہیں کر سکتا تو ملک کو اپنا وفادار کیسے رکھ سکتا ہوں۔ اگر میں اپنی حکومت کے موثر ہونے کا اسے قائل نہیں کر سکا تو دوسروں کو قائل کرنے کی امید کیسے رکھ سکتا ہوں۔" بھٹو صاحب وہاں بیٹھے شراب پیتے اور اپنے حال پر افسوس کرتے رہے۔

میاں ساجد نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ انہیں ایسی صورت حال کا سامنا ہے جس کے بحران میں تبدیل ہونے کے تمام امکانات موجود ہیں"۔ جناب، آپ ایک سنگین مسئلے سے دوچار ہیں۔ اس مسئلے سے مصطفیٰ کی بہ نسبت آپ زیادہ متاثر ہوں گے۔" بھٹو صاحب نے جام سے نظر اٹھائی۔ "تمہیں پتہ ہے ایوب کے ہاتھ سے کالاباغ بھی اسی طرح نکل گیا تھا۔ سازش۔ گھٹیا قسم کی سازش جس میں چوری چھپے وار کیا جاتا ہے۔"

ساجد اقبال ٹکا کے ساتھ مصطفیٰ کی کوٹھی سے رخصت ہوا۔ وہ دونوں حالیہ تبدیلیوں پر بات کرتے رہے۔ ساجد نے کہا۔ "بھٹو صاحب کی چھٹی ہو گئی۔ وہ برباد ہو چکے ہیں۔ ان کا سیاسی کیریر ختم ہو گیا۔"

اسی رات اقبال ٹکا نے قادر حسیٰ نامی ایک شخص کو فون کر کے کہا کہ بھٹو صاحب کی زندگی خطرے میں ہے۔ کھر نے ان کا کام تمام کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔ قادر حسیٰ فوراً حرکت میں آگیا۔ بھٹو صاحب کو مصطفیٰ کے گھر سے لانے کے لیے رات کے ڈھائی بجے کاریں بھیجی گئیں۔ بھٹو صاحب مصطفیٰ کو مطلع کیے بغیر کھسک آئے۔ انہوں نے صبح کے وقت مصطفیٰ کو فون کیا۔ مصطفیٰ ورزش کر رہا تھا۔ بھٹو صاحب کی آواز سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب بالائی منزل پر محو خواب ہیں۔ بھٹو صاحب

نے اپنے چلے آنے کی وجہ مصطفیٰ کو نہیں بتائی۔ کوئی بہانہ بنا دیا۔ انہوں نے مصطفیٰ سے کہا کہ ان کا اسباب گورنر ہاؤس پہنچا دیا جائے۔

بھٹو صاحب نے مصطفیٰ سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ لاڑکانہ چلے۔ ہوائی اڈے پر جب مصطفیٰ اپنے قائد کے آگے آگے طیارے پر سوار ہوا تو سنتا کیا ہے۔ کہ بھٹو صاحب حنیف رامے کو بلا کر وزیر اعلیٰ کے طور پر چارج سنبھالنے کا کہہ رہے ہیں۔ حنیف رامے سیاہ رنگ کی اسی سرکاری مرسیڈیز میں گھر لوٹا جس میں مصطفیٰ کھر بیٹھ کر ہوائی اڈے آیا تھا۔

بھٹو صاحب اور مصطفیٰ نے بظاہر تاثر تو یہی دیا کہ بات کچھ بھی نہیں لیکن زیرک مبصروں نے بھانپ لیا کہ دونوں کے درمیان ایسی خلیج پیدا ہو چکی ہے جسے پاٹنا ممکن نہیں۔ پارٹی کے ارکان کو جو نظر آیا وہ اسی پر یقین لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب انہیں بنا رہے ہیں اور بھٹو صاحب اور مصطفیٰ کی ظاہری ان بن محض ڈرامہ بازی ہے۔ ان کے تعلقات کی خرابی کو نورا کشتی کا نام دیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حنیف رامے کو اپنے لیے حمایت حاصل کرنے میں سخت دشواری پیش آئی۔ اسمبلی میں کھر کے وفادار وزیر اعلیٰ سے بگڑے بگڑے رہے اور پارٹی میں پھوٹ پڑنے کی نوبت آگئی۔ بھٹو صاحب اور مصطفیٰ اب بھی ملتے رہتے لیکن ان کا یارانہ شدید کھچاؤ کی زد میں آچکا تھا۔ چونکہ دونوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہ رہا تھا اس لیے ان کے تعلقات میں ایک طرح کا رسمی پن آگیا تھا۔ حنیف رامے نے جارحانہ رویے کا آغاز کیا۔ اس نے طے کر لیا کہ مصطفیٰ کی شہ رگ پر وار کیا جائے پریس میں بڑی زور شور سے کردار کشی کی مہم کا آغاز ہوا اور رامے اور اس کے حواری قلم تیز کر کے مصطفیٰ کی بے راہ روی کی بہت سی مثالوں کے بارے میں صحافیوں کو بڑی بڑی رنگیلی کہانیاں فراہم کرنے لگے۔

سمن آباد والے واقعے کو بڑھا چڑھا کر کچھ کا کچھ بنا دیا گیا۔ ہوا یہ تھا کہ خٹک قبیلے کے بعض نوجوان دو لڑکیوں کو اغوا کر کے لے اڑے تھے۔ پریس نے اس واقعے سے مصطفیٰ کو زک پہنچانے کا کام لیا۔ حقائق بالکل الٹ تھے۔

ان میں سے ایک لڑکی کے کسی خٹک لڑکے سے تعلقات تھے۔ لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہونے کو تیار تھی۔ لڑکے نے سوچا کہ فرار کو اغواء کا رنگ دینے کے لیے لڑکی کی بہن کو بھی اٹھا لیا جائے۔ لڑکیوں کو اٹھا کر چوری چھپے صوبۂ سرحد کے قبائلی علاقے میں پہنچا دیا گیا اور قید میں رکھا گیا۔ لڑکیوں کی ماں کو سارے معاملے کا پتہ تھا۔ اس نے پولیس کے پاس شکایت درج کرائی اور ملزموں کے نام بھی بتائے۔ اس وقت ریاض خٹک گورنر ہاؤس میں تعینات تھا۔ فرض کیا گیا کہ اغوا میں اس کا ہاتھ ہے۔ پورا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

صوبہ دہل کر رہ گیا اور گورنر ہاؤس کے باہر مظاہرے ہونے لگے۔ مصطفیٰ نے اس سلسلے میں ریاض خٹک سے بات کی۔ اسے بتایا گیا کہ اغوا کرنے والے کون ہیں۔ مصطفیٰ نے مفتی محمود کو فون کیا جو اس وقت صوبہ سرحد کے گورنر تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کر کے پنجابی لڑکیوں کی رہائی کا بندوبست کریں۔ مصطفیٰ نے خٹک خاندان کو الٹی میٹم دیتے ہوئے کہا کہ اگر لڑکیوں کو چوبیس گھنٹے کے اندر واپس نہ لایا گیا تو خٹک قبیلے کی عورتوں کی خیر نہیں۔ پولیس نے جاکر لاہور میں خٹک ہاؤس کا محاصرہ کر لیا۔ بزرگوں نے مداخلت کی لڑکوں سے کہا کہ دونوں مقید بہنوں کو واپس بھیج دیا جائے۔ خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ لڑکیاں ایک خصوصی طیارے کے ذریعے، جسے مفتی محمود نے ازراہ کرم فراہم کیا تھا، واپس گھر آگئیں۔

اس کہانی کو توڑ مروڑ کر اخباروں نے مصطفیٰ کو یوں پیش کیا جیسے وہ کوئی بلائے بد ہے جسے جنسی بد فعلیوں کے سوا دنیا میں کوئی کام نہیں۔ کارلیس پریس کی نظر میں مصطفیٰ اب "شیرِ پنجاب" نہ رہا تھا۔ وہ ایسا غنڈا اور بدمعاش تھا جو اپنی ہوس کی تسکین کی خاطر لڑکیاں اٹھوا کر نہ جانے کتنے گھر برباد کر چکا تھا۔ پنجاب کی بیویوں اور بیٹیوں سے کہا گیا کہ "اس وقت سے ڈرو جب مصطفیٰ واپس آجائے گا"۔ رامے اس کا پکا بندوبست کر رہا تھا کہ مصطفیٰ کی واپسی کی راہ میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہوں۔

کچھ مدت سیاسی بن باس میں گزارنے کے بعد جہاں اسے محسوس ہوتا تھا کہ کسی سے کوئی تعلق نہیں رہا، مصطفیٰ کو ایک بار پھر گورنر کے عہدے کی پیشکش کی گئی۔ بھٹو صاحب نے اسے آزمائشی طور پر تین مہینے کے لیے مقرر کیا۔ انھوں نے مصطفیٰ کو بتادیا کہ وہ اس کے رویے پر کڑی نظر رکھیں گے۔ اگر اس نے بھٹو صاحب کی مرضی کے مطابق کام کیا تو اسے وزیر اعلیٰ کا من بھاتا عہدہ واپس مل جائے گا۔

مصطفیٰ راضی ہوگیا۔ اسے احساس تھا کہ وہ صرف کسی با اقتدار عہدے پر پہنچ کر ہی اپنا امیج بحال کر سکتا ہے۔ بعد ازاں اس کا استدلال یہ ہوگا کہ اگر وہ بدمعاش ہوتا تو بھٹو صاحب ہرگز ہرگز اسے گورنر مقرر نہ کرتے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ ہم پلہ طاقت بن کر وہ حنیف رامے کو بہتر طور پر اڑنگا لگا سکے گا۔ پالامارنے کی کشمکش کے لیے سٹیج تیار ہو چکا تھا۔ پلڑا بااختیار وزیر اعلیٰ کے حق میں جھکا ہوا تھا۔ مصطفیٰ کو بے اختیار بادشاہ بن کر رہنے کی عادت نہ تھی۔

اس کے گورنر بننے کی دیر تھی کہ ایک ایسا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس سے دونوں عہدہ داروں کے اختیار کی آزمائش ہوگئی۔ مصطفیٰ کے ایک قریبی ساتھی، پیر اسرار شاہ، کی خواہش تھی کہ شبیر شاہ نامی کسی مجسٹریٹ کے تبادلے کا حکم منسوخ کر دیا جائے۔ مصطفیٰ

نے بڑے اعتماد سے چیف سکریٹری کو فون کیا اور ہدایت دی کہ تبادلے کا حکم منسوخ کر دے۔ چیف سکریٹری کے انداز سے ظاہر نہ ہوا کہ وہ مؤدب یا مرعوب ہو کر بات سن رہا ہے۔ اس نے مصطفیٰ سے کہا کہ وہ بعد میں فون کرے گا۔ چیف سکریٹری نے بعد میں فون پر کہا۔ "افسوس ہے، جناب لیکن اس کیس کے سلسلے میں آپ کو وزیر اعلیٰ سے بات کرنی پڑے گی۔ تبادلے کا یہ حکم خود انھوں نے جاری کیا تھا۔"

یہ جواب سن کر مصطفیٰ جھنجلا گیا۔ اس نے رامے کو فون کیا۔ وزیر اعلیٰ نے بڑی شائستگی سے لیکن استقلال کے ساتھ جواب دیا۔ "کھر صاحب، بھلا ایک ادنیٰ مجسٹریٹ سے آپ کی کیا دوستی ہو سکتی ہے۔ براہ کرم اس طرح کی باتیں نہ کریں۔ آخر میں بھی تو دیکھیے کہ صوبے کا نظم و نسق مجھے ہی چلانا ہے۔ آئیے، ہم ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ یہی بہتر ہے۔"

مصطفیٰ تلملا اٹھا۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ بالکل بے بس ہے اور اسے اپنے احکام پر عملدر آمد کرانے کا کبھی موقع نہیں دیا جائے گا۔ اس نے بھٹو صاحب کو فون کیا اور تلخ ہو کر شکایت کی کہ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ بھٹو صاحب نے اس کا غصہ ٹھنڈا کر کے وعدہ کیا کہ وہ رامے سے بات کریں گے۔

مصالحت ہو جانے کے بعد بھی سیاسی سازش نے مصطفیٰ اور بھٹو صاحب میں تفرقہ ڈالے رکھا۔ جب بھی وہ دونوں ساتھ سفر کرتے کہیں سے لوگ نمودار ہو کر "مصطفیٰ کھر زندہ باد" اور "شیرِ پنجاب" کے نعرے بلند کرنے لگتے۔ کسی کے علم میں تھا کہ بھٹو صاحب مصطفیٰ کی آزادانہ شہرت سے متنفر ہیں۔ جب بھی یہ نعرے لگتے بھٹو صاحب واضح طور پر دبک سے جاتے۔ مصطفیٰ کا خیال تھا کہ اس چال کے پیچھے رامے کا ہاتھ ہے۔ لیکن مصطفیٰ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ رامے کو روک سکتا۔ ایک بار جب داتا دربار میں بڑے بڑے ہجوم قائد عوام کے پاس سے گزر کر شیرِ پنجاب کے گرد جمع ہونے لگے تو مصطفیٰ نے دیکھا کہ بھٹو صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آرہا ہے، ایک رنگ جارہا ہے۔ شرارت کی جارہی تھی۔ اب اسے روکا نہ جاسکتا تھا۔ شرارت کے پیچھے جو مقصد تھا وہ پورا ہو کر رہے گا۔ ڈاکٹر مبشر نے، جو وہاں موجود تھا، مصطفیٰ کو بتادیا کہ قصہ ختم سمجھو۔ اس کے بعد بھٹو صاحب سے نہیں نبھ سکتی۔

آخر ش بڑھتی ہوئی کشیدگی کے دباؤ میں آکر مصطفیٰ نے گورنری سے استعفیٰ دے دیا۔ لاہور کے حلقہ نمبر چھ میں ضمنی انتخاب ہونے والا تھا۔ مصطفیٰ نے بھٹو صاحب سے کہا کہ انتخاب لڑنے کے لیے اسے پارٹی کا ٹکٹ دیا جائے۔ وہ صوبائی اسمبلی کا رکن بن کر حنیف رامے سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا۔ بھٹو صاحب کو علم تھا کہ مصطفیٰ اسمبلی میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پہنچ کر کیا فساد برپا کر سکتا ہے۔ انہوں نے اسے ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔ پی پی پی کے اندرونی حلقے سے تعلق رکھنے والے تمام ارکان نے بھٹو صاحب کو مصطفےٰ کے عزائم اور ناپاک ارادوں سے خبردار کیا۔ وہ دشمن نمبر ایک بن چکا تھا۔ کوشش کی گئی کہ بہلا پھسلا کر کسی طرح اسے مرکز میں لے جائیں تاکہ اس کا ڈنک نکل جائے۔ مصطفےٰ اپنی طاقت کی اساس سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ تھا۔ ان دونوں میں آخر کار ہمیشہ کے لیے بھوگ پڑنا ہی تھا۔ فرینکن شٹائن نما عفریت جاگ اٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ اپنے خالق پر پیچھے سے وار کرنے کی تاک میں تھا۔

اس نے پی پی پی کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے چالیس ارکان کے ساتھ خیر باد کہا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ اس کے ساتھ چالیس ارکان ہیں۔ لیکن اسمبلیوں کے یہ رکن مصطفےٰ کی پیروی کرنے کے پیمان سے پھر گئے اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے صرف سات ارکان کا چھوٹا سا ٹولا اس کے ساتھ رہ گیا۔ کھر کے وفاداروں میں میاں ساجد، چوہدری حنیف، چوہدری ارشاد، میاں تاری اور طالب حسین شامل تھے۔ ان سب پر ظلم ڈھائے گئے اور آخر دہشت ناک دلائی کیمپ ان کا ٹھکانا بنا جو انتہائی سکیورٹی والا عقوبتی قید خانہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف فوجی بغاوت ہونے تک وہ اسی قید خانے میں پڑے رہے۔

مصطفےٰ نے لاہور کے حلقہ چھ سے انتخاب، لڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ آخر کار خم ٹھوک کر اپنے پیرو مرشد کے مقابلے میں اتر آیا تھا اور صوبے کے مستقبل پر اپنا دعویٰ جمانا چاہتا تھا۔ بھٹو دشمن احساس کی جس لہر نے رفتہ رفتہ زور باندھا تھا مصطفےٰ نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے ہر طرف پھیلی ہوئی بد دلی سے، جو خوش فہمیوں کے خاک میں مل جانے کا نتیجہ تھی، خوب کام نکالا اور کچلے اور روندے ہوئے لوگوں کے دلی جذبات کو گویائی بخشی جو محسوس کر رہے تھے کہ جس حکومت کو وہ اقتدار میں لائے تھے اس نے انہیں مایوسی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اس نے درمیانی مدت کے اس بحران کا بالکل صحیح اندازہ لگایا جس نے حکومت کو اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا۔ لوگ ہجوم در ہجوم اس کے زور خطابت کی وجہ سے اس کی طرف کھچے چلے آئے۔ یہ اس کی بہترین گھڑی تھی۔ وہ سیاہ و سفید کے مالک بھٹو نیم دیوتا بھٹو سے ٹکرا گیا تھا۔ جو باتیں بازاروں میں سرگوشیوں میں سننے میں آتی تھیں وہ انہیں برملا کہہ رہا تھا۔ اس کو نکتہ چینی سچائی پر مبنی معلوم ہوتی تھی۔ آخر وہ وزیر اعظم کا قریب ترین ساتھی رہ چکا تھا۔ اگر وہ بھٹو کی غلط کاریاں گنوا رہا تھا تو ضرور سچ بول رہا ہوگا۔

بھٹو صاحب کے اوسان خطا ہو گئے۔ پی پی پی کے تمام اعلیٰ عہدے دار، چھوٹے

بڑے، لاہور آدھمکے۔ بغاوت کی اس رو پر بند باندھنے کے لیے آزاد کشمیر کے صدر اور وزیر اعظم، بلوچستان اور صوبۂ سرحد کے گورنروں اور وزرائے اعلیٰ اور وزیروں کی پوری فوج کی فوج نے لاہور آکر ایک بار اپنی صورت دکھائی۔ یہ مصطفےٰ کی طاقت کا اور اس بات کا ثبوت تھا کہ بھٹو صاحب اس طاقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس دنگا فساد سے جو شخص ڈپلومیٹک انداز میں دور رہا وہ مصطفےٰ جتوئی تھے۔ انہوں نے پرانے وقتوں کے اس دوست سے وفا کی جب وہ دونوں قومی اسمبلی کی پچھلی نشستوں پر بیٹھتے تھے اور ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ پاکستان کی اتار چڑھاؤ بھری تاریخ میں یہی دو "غلام مصطفےٰ" تھے جنہوں نے بار بار اپنے اتحاد کا ثبوت دیا۔ بھٹو صاحب نے صوبائی دارالحکومت میں ایک اجلاس کا بندوبست کر کے، جس کی تجویز صوبۂ سرحد کے وزیر اعلیٰ نے ان کے سامنے رکھی تھی، جتوئی صاحب کو اسی بہانے لاہور بلانے کی کوشش کی۔ جتوئی صاحب نے یہ کہہ کر آنے سے انکار کر دیا کہ انہیں کراچی میں کچھ کام ہے۔

اگرچہ جتوئی صاحب کا تعلق سندھ کے ممتاز ترین جاگیردار خاندانوں میں سے ایک سے ہے ان کے اقدار کے نظام میں مصطفےٰ کے نظامِ اقدار سے کہیں زیادہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جتوئی صاحب کی شخصیت پرانے وقتوں کے جاگیرداروں کا نمونہ ہے۔ افسوس ہے کہ پرانے جاگیردار ایسی نژاد ہیں جس کا نشان مٹتا جا رہا ہے۔ غیرت مندی، راست بازی، وفاداری، سچائی اور اپنی رعیت کے ساتھ پدرانہ شفقت پرانے جاگیردار کے وہ خصائص ہیں جو فوراً نظر میں آجاتے ہیں۔ میں اکثر اس تضاد کے بارے میں حیران ہوتی رہی ہوں۔ میں نے جتوئی ہاؤس اور کھر ہاؤس دونوں کی فضا دیکھی ہے اور ان میں پائے جانے والے، فرق نے ہمیشہ میرے ذہن پر اثر چھوڑا ہے۔ میں صرف اس نتیجے پر پہنچ سکی ہوں کہ اس فرق کے پیچھے بعض تاریخی اسباب کار فرما ہیں۔ کھر، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ جاگیردارانہ امنگیں رکھنے والے قبائلی لوگ ہیں۔ وہ ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ لیکن یہ زمانہ، جس میں انہوں نے قبائلی رہن سہن چھوڑ کر جاگیردارانہ زندگی کی طرف قدم اٹھایا ہے، ایسا ہے جو جاگیردارانہ طرزِ بودوباش میں شگاف ڈالتا جارہا ہے۔ زمانے کی اس چیرہ دستی کے جواب میں کھر خاندان کا عمل کسی نو دولتیے جاگیردار کا سا ہے۔ انہیں اس تہذیب اور شرافت کو اپنے میں رچانے کا موقع ہی نہیں ملا جو پشتینی جاگیرداروں کی رگ و پے میں شامل تھی۔ اس ضمن میں کھر خاندان کا بھونڈا ادعا لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کے سوا کچھ نہیں۔

پاکستان میں اور بھی ایسے جاگیردار گھرانے ہیں جو شرافت کے انہیں بلند معیاروں پر پورے اترتے ہیں جن کے جتوئی خاندان کے افراد علم بردار ہیں۔ نواب صادق حسین

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

قریشی اور ہالہ کے مخدوم خاندان کے نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ ان کا رویہ دیکھ کر آدمی حیران ہو کر سوچتا ہے کہ کہیں وہ زوال آمادگی اور عیاشی، جنہیں مخصوص جاگیردارانہ عادتیں سمجھا جاتا ہے، محض خلاف از معمول باتیں نہ ہوں۔ بد قسمتی سے اس خیال میں کوئی سچائی نہیں۔ عام جاگیردار، جسے اپنے طبقے کا صحیح نمائندہ کہا جاسکتا ہے، شاید سطحی طور پر شائستہ اور نستعلیق معلوم ہو لیکن بہت کم لوگوں کو اس سطح کو کریدنے کا حوصلہ ہوا ہے۔

مصطفےٰ کی بغاوت نے بھٹو صاحب کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس صدمے سے وہ کبھی پوری طرح سنبھل نہ سکے۔ ایک بار میاں امان اللہ نے حفیظ پیرزادہ کی بیگم، سعدیہ، کے پاس کسی پیر کو بھیجا۔ سعدیہ نے پیر صاحب سے دریافت کیا کہ اس کا شوہر وزیراعظم کب بنے گا۔ یہ کہانی بھٹو صاحب تک بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے حفیظ کو بتایا۔ "اگلا وزیراعظم پنجاب سے ہوگا۔ اگر میرے بعد پی پی اقتدار میں آئی تو اس کی قیادت مصطفےٰ کے ہاتھ میں ہوگی۔"

انتخاب میں دھاندلی ہوئی اور مصطفےٰ ہار گیا۔ آخری جلسے میں، جو تاج پورے کے مقام پر ہو رہا تھا، بھٹو صاحب کے گرگوں نے مجمع میں زہریلے سانپ چھوڑ دیے جس سے بھگدڑ مچ گئی۔ گولیاں بھی چلیں۔ کوئی ایک لاکھ سے زیادہ آدمی اندھا دھند اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور بہت سے پیروں تلے کچلے گئے۔

یہ واقعہ مصطفےٰ کے سیاسی کیریر میں فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔ وہ جلسے سے لوٹا تو بہت گھبرایا اور سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ہوش و حواس ٹھکانے نہ تھے۔ میاں ساجد ایک نوجوان کی لاش لے مصطفےٰ کے گھر پہنچا۔ اس نے لاش کو بانہوں میں اٹھا رکھا تھا۔ مصطفےٰ کا ردعمل غیر متوقع تھا۔ اس نے اس لمحے سے، جو سیاسی طور پر آن کی آن میں تہلکہ پیدا کر سکتا تھا، فائدہ نہ اٹھایا۔ وہ ساجد پر برس پڑا۔ "تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟ تم لاش لے کر یہاں کس لیے آ گئے؟ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کیا جاسکتا ہے؟ لاش فوراً یہاں سے لے جاؤ۔ تم اتنے احمق کب سے ہو گئے؟" ساجد حیران پریشان وہاں سے واپس چلا آیا۔ جسے وہ شیر نیستان سمجھتا رہا تھا وہ شیرِ قالین نکلا۔ ساجد کو یقین تھا کہ اگر لڑکے کے جنازے کی قیادت مصطفےٰ خود کرتا تو بھٹو صاحب کے خلاف ہاری ہوئی بازی جیتی جا سکتی تھی۔ پورا پنجاب سڑکوں پر نکل آتا۔ مصطفےٰ میں بھٹو صاحب کے خلاف تحریک چلانے کی اہلیت تو تھی مگر بظاہر قوتِ ارادی اتنی نہ تھی۔ وہ پولیس اور انتظامیہ سے بہت ڈرتا تھا۔ یہ خوف اس کے جاگیردارانہ دنوں کی باقیات تھا۔ صرف اقتدار ہی تحفظ کی ضمانت بن سکتا تھا۔

اگلے دن ایک مزدور رہنما کو مار دیا گیا۔ جب مصطفےٰ اس کی تعزیت کرنے گیا تو جماعت اسلامی کے آمادہ بہ جنگ کارکن اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ ٹھکائی الگ ہوئی۔ پولیس نے اس کی جان بچائی۔ مصطفےٰ اعلان کر چکا تھا کہ وہ مقتول رہنما کے جنازے کی قیادت خود کرے گا۔ آخری وقت پر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وعدے سے پھر جانا بڑا مشکل تھا۔ مصطفےٰ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ ایک منصوبہ گھڑ گیا۔

اگلی صبح اخباروں میں مصطفےٰ کھر کے سنسنی خیز اغوا کی کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اس گم شدگی کا بندوبست مصطفےٰ اور اس کے قریبی ساتھیوں نے کیا تھا۔ چوہدری حنیف نے مصطفےٰ کو سیالکوٹ پہنچایا۔ شیرِ پنجاب کار کی ڈکی میں دبکا ہوا تھا۔ اسے سیالکوٹ اتار دیا گیا۔ ملکہ پکھراج کا بیٹا، تصویر شاہ، اس کے ساتھ تھا۔ انہوں نے لاہور کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ ایک سرِ راہ کیفے پر رکے اور کیفے کے مالک کو ایک من گھڑت کہانی سنائی۔ مصطفےٰ نے کہا کہ نامعلوم اشخاص نے اسے اغوا کر کے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اسے کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ کیفے کے مالک نے مصطفےٰ کو پہچان لیا۔ اور گوجرانوالے کے ایس پی کو مطلع کر دیا۔ وہ فوراً آموجود ہوا اور مصطفےٰ کو ایک جیپ میں بٹھا کر لاہور چھوڑ آیا۔

اس اثنا میں مصطفےٰ کی بیوی شیری کی پریشانی کے مارے حالت غیر ہو گئی۔ اس نے ہر اہم نمبر پر ٹیلی فون کیا اور حد یہ کہ بھٹو صاحب تک سے بات کرنے میں کامیاب رہی۔ وہ چیخی چلائی، روئی پیٹی۔ اس پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے بے قصور بھٹو پر اپنے شوہر کو اغوا کرنے کا الزام لگایا۔ "میرے شوہر کہاں ہیں؟ آپ نے انہیں ہلاک کر دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے۔ وہ کہاں ہیں؟"

مصطفےٰ کا حوصلہ تو نو دو گیارہ ہو چکا تھا مگر اس کی مکاری نے ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ بھٹو صاحب اب بھی ایک دیو قامت رہنما تھے۔ مصطفےٰ اپنی ہی چلائی ہوئی تحریک سے رفتہ رفتہ کنارہ کشی اختیار کر رہا تھا۔ وہ گھٹیا قسم کی اداکاری پر اتر آیا۔ واپسی کے بعد اپنی پریس کانفرنس میں کہنے لگا۔

"میں شکاری ہوں۔ ستارے دیکھ کر پتہ چلا لیا کہ گھر کس طرف ہے۔"

اس کے ستارے نہ صرف اسے راہ دکھاتے تھے بلکہ بظاہر اس کے مقدر کا تعین بھی کرتے تھے۔

رامے کو نااہلیت کی بنا پر وزیر اعلیٰ کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ وہ مصطفےٰ کھر سے مل گیا۔ دو سیاسی رقیب متحد ہو گئے، محض اس لیے کہ دونوں، بھٹو صاحب سے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نفرت کرنے لگے تھے۔ انہیں تحفظ کے لیے کسی سیاسی جماعت کی ضرورت تھی۔ انھوں نے قدرے احمقانہ انداز میں مسلم لیگ کے حق میں فیصلہ کیا۔ یہ ان سے سیاسی چوک ہوئی۔ مسلم لیگی قیادت نے دونوں کو خوشی خوشی قبول تو کر لیا لیکن ان سے سلوک وہی کیا جو کسی سیاسی جماعت میں نئے شامل ہونے والوں سے کیا جاتا ہے۔ پارٹی کے عام ارکان نے ان کے بارے میں کسی گرم جوشی کا ثبوت نہ دیا اور قیادت انہیں شک کی نظر سے دیکھتی رہی۔ ان پر بھروسہ نہ کیا جاسکتا تھا۔

مصطفےٰ ہم رنگِ زمین نظر آنے کے لیے، گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہا۔ کہتے ہیں کہ زندگی میں موقع صرف ایک بار دستک دیتا ہے۔ آدمی موقع پرست ہو تو دستکوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ جس پارٹی کو تشکیل دینے میں مصطفےٰ نے ہاتھ بٹایا تھا اسے چھوڑ دینا اس کے لیے کون سی بڑی بات تھی۔ جس تھالی میں کھانا، اسی میں چھید کرنا، یہ بھی مصطفےٰ سے کب بعید تھا۔ بھٹو صاحب کو ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آنے لگے۔ ہر طرف سازشوں کے جال بچھے دکھائی دینے لگے۔ مصطفےٰ کھر کے تجربے سے گزرنے کے بعد انھوں نے شاذو نادر ہی کسی کو گہرا دوست بنایا۔ انھوں نے اپنے گرد جی حضور کہنے والے اور ایسے لوگ جمع کر لیے جو بے ضمیر تھے اور جن پر وہ دھونس جما سکتے تھے۔ ان کی زبانی اکثر یہ سننے میں آیا کہ مصطفےٰ نے ان کے ساتھ وہی کیا جو بروٹس نے جولیس سیزر کے ساتھ کیا تھا۔ میرے ہم وطنو یہ گراوٹ بھی کیا گراوٹ تھی۔ گندی غداری پھولتی پھلتی رہی اور کوئی اسے روکنے والا نہ تھا۔ تیرہ سال بعد 1990 کے اواخر میں، یہی مصطفےٰ کھر صدر کے سامنے کھڑا اپنے عہدے کا حلف اٹھا رہا تھا۔ "ایک منتخب پارلیمنٹ کا آئینی طور پر تختہ الٹنے والوں کے ساتھ مل گیا تھا۔ اس نے خود اپنی ہی پارٹی کے خلاف کارروائی کی حمایت کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر بھٹو خاندان کے کسی فرد کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔

وہ پُر سکون دکھائی دے رہا تھا۔ غداریاں کرتے رہنا اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا۔

باب - ۸

اندھیرے دور ہوتے ہیں

(1986ء - 1988ء)

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

ایشیا نے بالعموم اور برصغیر نے بالخصوص ایسی بہادر عورتوں کو جنم دیا ہے جنھوں نے اس جدوجہد کو جاری رکھا جسے ان کے گھر کے مرد نامکمل چھوڑ گئے تھے۔ بیشتر صورتوں میں جب انھوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو وہ مصائب کا شکار تھیں۔ تشدد ہمارے معاشرے میں گھر چکا ہے۔ اندرا گاندھی ہو یا مسز بندرا نائیکے، کوری اکینو ہو یا بے نظیر بھٹو، مسز حسینہ واجد ہو یا مسز ضیاءالرحمٰن، یہ سب جریدۂ عالم پر اپنے نام ثبت کر چکی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے متوفی باپ یا شوہر کی جگہ سنبھالنی پڑی۔ عملی سیاست میں قدم رکھنے سے پہلے ان کی زندگی چین سے گزرتی تھی اور عموماً انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ میں ان سے مختلف تھی۔ میں نے ایک ایسے مرد سے شادی کی جو رو بہ زوال تھا، ایسا مرد جو اپنے خوابوں کے سہارے زندہ تھا، جو گرفتار ہونے سے بچنے کے لیے سرگرداں رہتا تھا، جس نے اپنی امیدوں کو بندھتے اور ٹوٹتے دیکھا تھا۔ دہشت زدگی کے اس پورے دور کو جھیل کر اور اپنی جان کی خیر منا کر میں اس کی زندگی کی بہترین ساعت میں شریک تھی۔ جب وہ میرے پہلو میں کھڑا اپنے عوام کی محبت اور اخلاص کے مزے لوٹ رہا تھا تو میرے حصے میں آنے والی شان محض اس کی عظمت کا عکس نہ تھی۔ اگر میری مساعی اور تقدیر کی ساز باز شاملِ حال

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہوتی تو مصطفےٰ کھر شاید آج آزاد نظر نہ آتا۔ زندگی میں ایک بار تو اس کی تقدیر میری مٹھی میں تھی۔ میں اس سے انتقام لے سکتی تھی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں عظیم تر ہستی بن کر دکھاؤں گی۔ میں نے طے کیا کہ میں اس کے کرب کو طول نہ دوں گی اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کام عوام کی عدالت پر چھوڑ دوں گی۔ عوام ہی دادگر تھے۔ بہترین منصف بھی وہی ہیں۔ آمروں تک کو ایک بار موقع دیا جاتا ہے۔

میں نے جن بہادر خواتین کا ذکر کیا انہیں اب اپنے طور پر اولو العزم ہستیوں کا مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ظلم و ستم اور استبداد کے خلاف ان کی جدوجہد جاری ہے۔ ان کی زندگیاں میڈیا کی چکاچوند میں گزرتی ہیں۔ میں اندھیرے میں دن بسر کرتی رہی۔ بس جب مصطفےٰ کو قید کر دیا گیا تو میں منظرِ عام پر آئی۔ مجھے کٹر اور بے لحاظ سیاست سے پہلی بار حقیقی معنی میں واسطہ پڑا۔ اور واسطہ پڑنے کے ساتھ ہی میری کایا پلٹ ہو گئی۔ یہ امید رکھنی عبث ہے کہ نظریہ کبھی عمل کی جگہ لے سکتا ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اس ہولناکی کو دیکھا، محسوس کیا اور چھوا جسے ہم یکسر بدلنے کے خواہاں تھے۔ یہ کام اتنا بڑا تھا کہ اس کے خیال سے حوصلہ پست ہونے لگتا تھا۔ لیکن کام ایسا تھا کہ اس کی لت پڑ جائے تو چھوٹتی نہیں۔

میری سمجھ میں آ گیا کہ اقتدار کے حصول کی خاطر انسان اپنی جان کیوں ہلکان کرتے رہتے ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ میں گھریلو خاتون کو ایک بے نام و نشاں قبر میں دفنا چکی ہوں۔ میری زندگی اب ایک مشن تھی۔ میں اس مشن کی حدود متعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب کوئی ایسا نہ تھا، حتیٰ کہ مصطفےٰ بھی نہیں، جو مجھے آسودہ خاطری کے ریشمی خول میں دوبارہ زبردستی دھانس سکتا۔ مارکس کا قول کتنا درست تھا۔ عمل پیرائی یا کسی انقلابی صورت حال میں جسمانی طور پر ماخوذ ہونے کا فعل کسی مکمل مرد یا عورت کی تشکیل میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اندھیروں سے باہر قدم رکھ چکی تھی۔ میری کہانی میں کوئی غیر معمولی پن نہیں۔ ایسی بہت سی عورتوں کو یہ بالکل عام لگے گی جو جاگیر دارانہ نظام کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے انہیں ابھی لبِ گویا کی تلاش ہے۔ ان کے الفاظ یوں تحلیل ہو جاتے ہیں جیسے برف کی چوکوریاں گرم زبانوں پر رکھتے ہی پگھل جاتی ہیں۔ میں نے ان کی اس آہ وزاری کو نیا جنم دینے کی کوشش کی ہے جو ان کے لبوں تک آ کے دم توڑ گئی۔ میں صرف یہی امید رکھ سکتی ہوں کہ میری کہانی پڑھ کر ان میں سے بعض کی ہمت بڑھے گی اور وہ نکل کھڑی ہوں گی۔ ان کے اندھیرے پیچھے پیچھے چلتے آئیں گے۔

کوئی پرواز مصطفےٰ کو جلاوطنی سے لے کر گھر آئی اور وہ جیل پہنچ گیا۔ اس کا حال

اس سیلانی پرندے جیسا ہوا جو موسم گرما کی تلاش میں برفانی چوٹیوں کے اوپر سے اڑتا آیا ہوا اور جسے پتہ چلے کہ آسمان تو خارزار میں تبدیل ہو چکا ہے۔

میں مصطفےٰ کے ساتھیوں کے ہمراہ لاہور پہنچی۔ وہ لندن سے ہمارے ساتھ آئے تھے۔ مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے جتوئی صاحب ہوائی اڈے پر موجود تھے۔ وہ نیشنل پیپلز پارٹی تشکیل دے چکے تھے۔ اس پارٹی کا مقصد یہ تھا کہ پیپلز پارٹی کے پرانے اور آزردہ خاطر ارکان کی حمایت حاصل کر کے پی پی پی کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں۔ نیشنل پیپلز پارٹی بے نظیر بھٹو کے "انکلوں" نے خار کھا کر بنائی تھی۔ ایک تو اس کے ذریعے سے وہ بے نظیر کے تکبر کا علاج کرنا چاہتے تھے، دوسرے یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ بے نظیر اپنے والد کے معاصرین کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اہلیت سے محروم ہے۔

نیشنل پیپلز پارٹی کے چیئرمین جتوئی صاحب تھے۔ ان کا شفقت آمیز اور مانوس چہرہ نظر آیا تو جی خوش ہو گیا۔ ہوائی اڈے پر غلام عربی کھر بھی موجود تھا۔ وہ بھی این پی پی کا رکن بن چکا تھا۔ میاں ساجد بھی دکھائی دیا۔ وہ ابھی ابھی قید سے چھوٹا تھا۔ میں نے ارد گرد نظر ڈالی۔ جو لوگ میرا استقبال کرنے آئے تھے ان میں چوہدری ارشاد اور چوہدری حنیف بھی شامل تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ لیکن یہ خوشی ابہام آمیز تھی۔ ان کا قائد میرے ساتھ نہ تھا۔ میں اس کی نمائندہ بن کر آئی تھی لیکن ہم دونوں کی تازہ جھڑپ میں کسی ہیجان پرور ڈرامے کے تمام اجزائے ترکیبی موجود تھے اور انہیں کچھ زیادہ یقین نہ تھا کہ بطور نمائندہ میں کتنے دن نکال سکوں گی۔ یہ تو انہیں معلوم تھا کہ میری قوتِ برداشت کا جتنی بار امتحان لیا گیا تھا میں ہر دفعہ کامیاب رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آرہا تھا کہ میرا میاں تو قید ہے، ایسی صورت میں مَیں کام کیسے چلا سکوں گی۔

میرا پریس سے پہلی بار آمنا سامنا ہوا۔ مصطفےٰ نے بڑے سنسنی بھرے انداز میں میرے بچوں کو اغوا کیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کاش اغوا کی تفصیلات کے بارے میں مجھ سے پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ اخبار والوں نے میری پریشانی کو بھانپ لیا۔ انہوں نے مجھے کانٹوں پر نہیں گھسیٹا۔ وہ یہ معلوم کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے کہ کیا میں اپنے شوہر کی رہائی کے لیے جدوجہد کروں گی۔ میں یہ جان کر خوش ہوئی کہ انہوں نے مجھے ایسی بیوی کے روپ میں دیکھا ہے جو کسی مقصد کے لیے لڑنے بھڑنے کو تیار ہے۔ ان کا خیال تھا کہ تہمینہ کے حوالے سے اچھی خبریں تیار کی جا سکتی ہیں۔ میڈیا کے لیے موزوں شخصیت کے طور پر اس کے پنپنے کے بہت امکانات ہیں۔ انہیں امید تھی کہ میں اثبات میں جواب دوں گی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے اخباروں کے کالموں میں مجھے جگہ دے کر اپنی پسندیدگی ظاہر کی۔ میں ایک طویل اور

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

حوصلہ شکن سفر پر روانہ ہونے والی تھی۔ میں مصطفےٰ سے کیا ہوا وعدہ نباہ رہی تھی۔

پارٹی کے کارکنوں میں میرا دل زیادہ لگا۔ مصطفےٰ کو جب بھی پارٹی کے سرگرم کارکنوں سے ملنا ہوتا وہ مجھے التزاماً ساتھ لے جایا کرتا۔ میں نے اس کے ساتھ فرانس، بیلجیئم، جرمنی اور انگلستان کے متعدد شہروں کا دورہ کیا۔ اکثر اوقات میٹنگ میں میرے سوا کوئی عورت نہ ہوتی۔ جب وہ مردوں سے بات کرتا تو میں اس کے ساتھ بیٹھی خاموشی سے کافی پیتی رہتی۔ میں غور سے سب کچھ سنتی اور سنے ہوئے کو اپنے میں رچاتی بچاتی رہی۔ مصطفےٰ کے انداز سیاست کے خاص خاص نکتوں کو یاد میں محفوظ کرتی جاتی۔ اس وقت مجھے احساس نہ تھا کہ مصطفےٰ کا رنگ کس حد تک مجھ میں رچ چکا ہے۔ میٹنگ سے لوٹ کے ہم جو کچھ کہا سنا گیا تھا اس پر بحث اور سامعین کے موڈ کا تجزیہ کرتے۔ میں وقتاً فوقتاً اپنی رائے ظاہر کرتی یا کوئی مشورہ دیتی مصطفےٰ کو میری سیاسی بصیرت پر بھروسہ تھا۔

پارٹی کے کارکنوں نے مجھے گرم جوشی سے اپنایا۔ میں ایک علامت بلکہ ایسی ہستی بن چکی تھی جس کے گرد اکٹھا ہوا جا سکتا تھا۔ میں ان سے مانوس تھی۔ ہمیں آپس میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے کسی تکلیف دہ مدت سے گزرنا نہ پڑا۔ میں ویسی اناڑی نہ تھی جیسا کہ ان میں سے بعض مجھے سمجھ بیٹھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میں انہیں حیران کرنے میں کامیاب رہی اور اس حیرانی میں خوشگواری کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ سازشوں اور اہم عہدوں کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کھینچا تانی سے میں گڑبڑاتی نہیں۔ مجھے مخلص کارکنوں اور خوشامد پرستوں میں تمیز کرنے میں دیر نہ لگتی۔ میں ہر وقت چوکس رہتی۔ کبھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر لطف آتا کہ ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے والے تمام گروہ بیک وقت اپنی اپنی راز کی باتیں میرے گوش گزار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سب سے یکساں سلوک کیا اور آپس کے دنگا فساد کو لگام دینے کی حتی الامکان کوشش کی۔ سیاست کسی طرح کی ہو، اس میں اندرونی مناقشے ناگزیر ہوتے ہیں۔ میرا کام یہ تھا کہ ان امور کا پتہ چلاؤں جو بدمزگی کا سبب بن رہے تھے اور ان کا تدارک کرنے کے لیے کوشاں رہوں۔

میں نانی اماں سے ملی جنہیں میرے باقی اہل خاندان کی طرح اغوا کے ڈرامے کے روح فرسا تجربے سے گزرنا پڑا۔ میرے بچے ان کے گھر پر میرے منتظر تھے۔ ہم پھر سے ملے تو جذبات پر قابو نہ رہا۔ یہی وہ لمحہ تھا جو مجھے واپس وطن کھینچ لایا تھا۔ میں نے آنسوؤں کی دھند کی اُس پار بچوں کو کھڑے دیکھا۔ وہ صحت مند نظر آ رہے تھے۔ حقیقت میں مجھے پروانہ تھی کہ وہ کیسے لگ رہے ہیں۔ اہمیت صرف اس بات کی تھی کہ وہ میرے پاس تھے۔ میں نے تھوڑی سی قربانی دے کر ان کی خاطر سمجھوتہ کیا تھا۔ "کیا

تم سمجھ رہے تھے کہ امی کبھی لوٹ کر نہ آئے گی؟" "نہیں ہمیں پتہ تھا کہ آپ ہمارے پاس لوٹ آئیں گی۔ ہمیں پتہ تھا بس۔" نصیبہ ان کی ترجمانی کر رہی تھی۔ میں نے فخر محسوس کیا کہ وہ اپنی امی کے دلی جذبات کو اتنی اچھی طرح سمجھتے تھے۔

ہم سب عربی اور صائمہ کے ہاں رہنے لگے۔ لاہور میں ہمارا کوئی گھر نہ تھا۔ ہماری کوٹھی سرکار ضبط کر چکی تھی۔

این پی پی کا کنونشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس میں لوگ بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اخبار والے بھی بڑے بھرپور انداز میں موجود تھے اور اگلے دن اخباروں میں پارٹی کو خاصی جگہ دی گئی۔ جتوئی صاحب نے ڈائس پر مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔ یہ میری اولین تقریر تھی۔ میں مصطفےٰ کھر کی نمائندگی کر رہی تھی۔ "مصطفےٰ کھر واپس آ چکے ہیں۔ بد قسمتی سے انہیں براہ راست آپ سے ملنے کا موقع نہیں دیا جا رہا۔ ان کے قید رہنے سے آپ کی طاقت میں اضافہ ہو گا۔ اس ملک کے کچلے اور پسے ہوئے لوگوں کی حالت سدھارنے کا کام ان کا مقدر بن چکا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جنرل انہیں اپنا یہ کردار ادا نہیں کرنے دیں گے۔ اس کے باوجود وہ بہادری سے پاکستان لوٹ آئے۔

"یہ ان کی سرشت ہی میں نہیں کہ سمجھوتہ کرلیں یا حوصلہ ہار جائیں۔ وہ یہاں جدوجہد جاری رکھنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ مارشل لا اور اس کی ناانصافیوں کے خلاف جنگ لڑیں گے۔ ہم سرسری سماعت کرنے والی فوجی عدالتوں اور ٹربیونلوں کے سنائے ہوئے فیصلوں کو جھوٹا قرار دے کر مسترد کرتے ہیں۔ جنرل نہ تو ہمارے عزم کو شکست دے سکتے ہیں نہ ہماری آوازوں کو دبا سکتے ہیں۔ مصطفےٰ کھر ان بدنصیبوں کے ساتھ رہنے کے لیے واپس آئے ہیں جنہیں مارشل لانے اپنا نشانہ بنایا ہے۔ ان بدنصیبوں کے درمیان ان کی موجودگی نے انہیں ستم رسیدہ کارکنوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ انہیں فخر ہے کہ وہ عام آدمی کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہیں۔ جنرلوں کو یہ احساس دلانا ضروری ہو گیا ہے کہ پاکستانی عوام کو ان کی غیر قانونی حکومت قبول نہیں۔

"مصطفےٰ کھر اپنے تمام ساتھیوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ جتوئی صاحب کی قیادت میں متحد ہو جائیں۔ آپ کی یہاں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کو مصطفےٰ کی قیادت پر یقین تھا، ہے اور رہے گا۔ آپ نے ہمارا ساتھ دیا تو مصطفےٰ جلد ہی رہا ہو کر ہم سے آملیں گے۔"

مصطفےٰ کے سوا کوئی قابل ذکر رہنما جیل میں نہ تھا۔ اپنے اثاثوں کا اعلان نہ کرنے کے جرم میں اس پر اس کی غیر موجودگی میں فوجی عدالت میں مقدمہ چلا تھا اور سولہ سال

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

قید بامشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔ مزید برآں عدالت نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ اس کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ املاک، اور اثاثوں کو ضبط کر لیا جائے۔

میرے پاس ٹک کر بیٹھنے اور خود کو پاکستان کے حالات کے مطابق ڈھالنے کے لیے پندرہ دن تھے۔ کسی قسم کے ثقافتی صدمے سے گزرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ سیاسی دوڑ دھوپ کی وجہ سے مجھے یہ موقع بھی نہ ملا کہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنی جذباتی شکستوں کا حساب کتاب کرتی۔ آخر کار ہمیں پتہ چل گیا کہ مصطفےٰ کو کہاں رکھا گیا ہے۔

اسے کراچی سے فیصل آباد کے مرکزی جیل پہنچا دیا گیا تھا۔ میں کار سے فیصل آباد روانہ ہوئی۔ بذریعہ کار لاہور سے فیصل آباد پہنچنے میں تین گھنٹے لگتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں میری اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ پُر اعتماد انداز میں کمرے میں داخل ہوا جیسے اقتدار میں ہو۔ اس کے چہرے پر ایسی کوئی کیفیت نہ تھی جسے دیکھ کر ترس آنے لگے۔ یہ اکھاڑا اس کا جانا پہچانا تھا۔ یہاں قیادت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اسے پتہ تھا کہ قوانین کو اپنے حق میں کیسے توڑا مروڑا جاسکتا ہے۔ وہ جیل کے عہدے داروں اور پولیس کو ڈرا دھمکا سکتا تھا۔ مصطفےٰ جو چاہتا، اسے مل جاتا۔ میں نے جلاوطنی کے برسوں میں اس کو کبھی ایسے عالم میں نہ دیکھا تھا۔ اب وہ ایسی فضا میں سانس لے رہا تھا جو اسے سراسر اپنی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنے پالے میں کھڑا تھا۔

این پی پی کو منظم کرنے کا کام جاری تھا۔ پارٹی کے وفادار اور سرگرم کارکن عہدے حاصل کرنے کے لیے اپنے حق میں فضا ہموار کرنے میں معروف تھے۔ بعض اناؤں کو چرکا لگائے بغیر چارہ نہ تھا، بعض پھول کر کپا ہو چکی تھیں۔ میں درمیان میں رہ کر افہام و تفہیم کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ پارٹی کے کارکن مجھے اپنی اپنی اہلیت کا قائل کرنے کی کوشش کرتے تاکہ میں ان کے حق میں بات کر سکوں۔ میں ان کا جوش و خروش دیکھ کر خوش تو ہوئی لیکن سیاسی عہدوں کے لیے ان کی ہوس نے مجھے پریشان کر دیا۔ زیادہ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پنجاب کا صدر اور سیکرٹری جنرل کسے بنایا جائے اور مرکزی کمیٹی میں کون کون شامل ہو۔ یہ بڑا مشکل وقت تھا کیونکہ پارٹی کے کرتا دھرتا تمام جوشیلے کارکنوں کو کہیں نہ کہیں کھپانے کا جتن کر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے فیصلوں کی وجہ سے ناراض کارکنوں کا ایک ریزرو جیش وجود میں آرہا ہے۔

مجھے یہ تمام معاملات مصطفےٰ کے سامنے رکھنے پڑتے۔ وہ باخبر رہنا چاہتا تھا۔ ابتدا میں تو اسے صرف اتنی فکر تھی کہ کہیں اس قضیے کی وجہ سے، جس میں وہ گرفتار تھا، سب سے الگ تھلگ ہو کر نہ رہ جائے۔ اس کے نقطۂ نظر سے ضرورت اس بات کی تھی کہ کلیدی عہدوں پر اس کے اپنے آدمی فائز ہوں۔ اس کے اپنے لوگ پیش پیش ہوں

گے تو وہ اپنی باتیں منوا سکے گا۔ وہ آنے والے زمانے کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ پارٹی میں بعض عناصر اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ناجائز حربوں سے اس کا حق مار لیں گے۔ مرکزی کمیٹی لازمی طور پر ایسے لوگوں پر مشتمل ہونی چاہیے جو اس کے فیصلوں پر صاد کریں۔ وہ پارٹی کے اہم ترین ارکان میں سے ایک تھا اور اپنی اس پوزیشن سے کسی حالت میں دست بردار ہونا نہ چاہتا تھا۔

میں میدان جنگ سے ملنے والی تمام اطلاعات مصطفےٰ تک پہنچا دیتی۔ مجھے احساس تھا کہ جتوئی صاحب حکم ماننے کو تیار نہیں۔ کلیدی عہدے جتوئی صاحب کے وفاداروں میں بانٹے جارہے تھے۔ مصطفےٰ کے ہمنواؤں کو لطیف انداز میں پس منظر کی طرف دھکیلا جارہا تھا۔ میں پارٹی کے جذبات کا بالکل صحیح صحیح اندازہ لگانے میں کامیاب رہی۔ ضرورت تھی کہ مصطفےٰ اپنے آپ کو، خصوصاً پنجاب میں، منوائے۔ اس موقع پر اگر وہ اپنے آپ کو منوانے میں ناکام رہا تو اس کی چھٹی ہو جائے گی۔ یہ میں نے اس پر واضح کر دیا۔

پارٹی کے ایک حصے کی خواہش تھی کہ مصطفےٰ کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا جائے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اگر یہ کلیدی عہدہ اسے نہ ملا تو وہ عملاً تماشائی بن کر رہ جائے گا۔ ان کی رائے میں مصطفےٰ قومی سطح کا قائد تھا اور اپنے صوبائی پس منظر کو کوسوں پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ پنجاب کی سطح پر عہدہ قبول کر کے وہ اپنے قومی قد و قامت کا ناس مار دے گا۔ میں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ میں پیغامات لے کر لاہور سے فیصل آباد اور وہاں سے واپس لاہور آنے جانے میں معروف تھی۔ بیوی کی وساطت سے قائد تک رسائی ممکن ہو گئی تھی۔ مصطفےٰ اور پارٹی کی قیادت دونوں کو پتہ تھا کہ مجھ پر تکیہ کیا جاسکتا ہے۔ میں پیغامات کو ایمانداری سے اور من و عن پہنچا دوں گی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میری اپنی بھی آراء ہیں جن کا اظہار کرنے سے مجھے اب کوئی باک نہیں اور میری ان آراء کا مصطفےٰ احترام کرتا ہے۔

پورا ہفتہ لاہور میں پارٹی کے کارکنوں کے دلائل اور دلائل کا رد سننے میں گزر جاتا۔ میں فیصل آباد تک تین گھنٹے کی ڈرائیو کے دوران اپنے خیالات کو ترتیب دیتی رہتی تاکہ مصطفےٰ کے روبرو انہیں قرینے سے بیان کر سکوں۔

مصطفےٰ میری باتیں سنتا، فراہم کردہ معلومات کا تجزیہ کرتا اور پھر اپنے پیغامات کو لفظوں کی شکل دیتا۔ میں ڈرائیو کرتی ہوئی واپس لاہور کا رخ کرتی جہاں گھر پر پریس والے اپنے روزانہ کے راتب کے انتظار میں ہوتے۔ پہلے میں ان سے نمٹتی۔ پھر تشویش میں مبتلا پارٹی کے کارکنوں سے ملتی جن کے مستقبل کا دار و مدار قائد کے پیغام پر تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جتوئی صاحب سے ٹیلی فون پر بات کرتی اور پھر کچھ وقت اپنے بچوں کے ساتھ گزارتی اور ان کے تقاضے بجالاتی۔ مجھے شاید ہی کبھی نیند آئی ہو۔ عموماً تو بستر پر لیٹتے ہی مجھے غش آجاتا تھا۔

مصطفےٰ کی اسیری واقعتاً ہماری راہ میں رکاوٹ بنتی جارہی تھی۔ حنیف رامے کو، جو این پی پی میں شامل ہو چکا تھا، پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔ حنیف رامے کی حیثیت سیاست میں اسی لڑھکنے پتھر کی سی تھی جس کے بارے میں کہاوت ہے کہ اس پر کائی نہیں جمتی لیکن میں نے اسے مہربان، شفیق اور حساس پایا۔ راؤ فرمان علی کو بھی یاد رکھا گیا۔ یہ وہی جنرل تھا جس نے ہمیں پاکستان چھوڑنے میں مدد دی تھی۔ اسے ایک اہم عہدہ دیا گیا۔ مصطفےٰ کو پنجاب میں این پی پی کا صدر مقرر کیا گیا چونکہ ان دنوں اس تک رسائی محال تھی اس لیے اس انتہائی اہم عہدے کا چارج چوہدری ارشاد کو دیا گیا۔ چوہدری حنیف پنجاب کا سیکرٹری جنرل مقرر ہوا۔ میاں ساجد پرویز مرکزی کمیٹی کا رکن بنا غلام عربی کھر کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔ بعضوں کا خیال تھا کہ صدر اسے بنانا چاہیے تھا۔ مصطفےٰ کے پاس اپنے ساتھیوں کو یہ عہدے دلانے کا ایک ذرا ہیر پھیر والا استدلال تھا۔

اس کا خیال تھا کہ پارٹی کے عہدے داروں کو عام ارکان میں سے چنا جانا چاہیے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ پارٹی کی مشینری سے ان رہنماؤں کو الگ کرنا ضروری تھا جو مستقبل میں پارلیمانی گروپ تشکیل دینے والے ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ پارٹی کے عہدے ان لوگوں کو دیے جائیں جنھوں نے ہر برے بھلے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی تھا کہ انہیں وفاداری کا صلہ دیا جائے۔ بظاہر معلوم یہ ہوتا تھا کہ مصطفےٰ حقیقی نمائندگی میں یقین رکھتا ہے اور پارٹی کے بعض رہنماؤں کو بتوں کی طرح پوجنے کی رجحان کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔

مصطفےٰ نے جو تانا بانا بُنا تھا وہ اتنا بے غرضانہ نہیں تھا۔ وہ اپنے اتحادیوں کو اگلی صف میں اس لیے رکھنا چاہتا تھا کہ جو مصیبت آئے ان پر آئے، جو الزام لگے ان پر لگے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جوہر قابل ہونے کا ثبوت فراہم کریں۔ اسے یقین تھا کہ جب انہیں کچھ عرصے بڑے بڑے عہدوں پر کام کرنا پڑے گا تو ان کی کمزوریاں بالکل بے نقاب ہو جائیں گی۔ اسے پتہ تھا کہ کسی سیاسی پارٹی کی تنظیم میں وہی لوگ کسوٹی پر پورے اترتے ہیں جو ہر لحاظ سے بہترین ہوں۔ ہنگامہ پسندی پر مبنی سیاست کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ان میں سے کوئی آدمی بھی امتحان میں پورا نہ اتر سکے گا۔ جب مصطفےٰ قید خانے سے باہر آئے گا تو یہ لگے گا کہ پارٹی کو منظم کرنا اس کے سوا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ آزمودہ اور تیر بہدف چال اس نے بھٹو صاحب

سے سیکھی تھی۔ ہمیشہ دھماکا کرو۔ اٹھنے والے دھویں میں قدم رکھو۔ پچے کچھے ٹکڑے اٹھا لاؤ۔ ثابت کردو کہ تمہارے سب ساتھی خواہ مخواہ کا بوجھ ہیں۔ خود سر بلند رہو۔

مصطفےٰ محسوس کرتا تھا کہ اپنے قریبی ساتھیوں کو اہم عہدے دلا کر وہ انہیں ان تمام قربانیوں کا، جو وہ پیش کر چکے تھے، اجر دے رہا ہے۔ وہ ایک ہی وار میں کئی شکار کرنے چلا تھا۔

مصطفےٰ اور جتوئی صاحب کے درمیان طویل رفاقت کی وجہ سے میرا شوہر قائل ہو چکا تھا کہ سندھ کا یہ وڈیرا بہت ہی شریف النفس سیاست داں ہے جو اپنے ہاتھ آلودہ کرنے پر تیار نہ ہو گا۔ مصطفےٰ کا اندازہ درست تھا۔ جتوئی صاحب بنی بنائی تنظیموں کے اندر کام کرنے کے عادی تھے۔ اس کے برعکس مصطفےٰ کو اور ہی سطح پر سیاست کرنے میں مزہ آتا تھا۔ وہ جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ یہ توقع اسے پُر جوش بنانے کے لیے کافی تھی کہ ان دنوں کی یاد تازہ کرنے کا پھر موقع ملنے والا ہے جب پی پی پی کے ابتدائی دنوں میں وہ ملک کا دورہ کر کے پارٹی کو منظم کر رہا تھا۔ اپنے ذہن میں مصطفےٰ اس ابتری کا تصور کر سکتا تھا جو جتوئی صاحب کے سب کا بھلا چاہنے والے مزاج کی وجہ سے پیدا ہو کر رہے گی۔ وہ قید خانے کی کوٹھری میں بیٹھا، جسے تقریباً گوشۂ عافیت سمجھنا چاہیے، اس وقت کا منتظر تھا جب ڈانواں ڈول ناؤ سے اسے مدد کے لیے پکارا جائے گا۔ وہ ایسا فرد بننا چاہتا تھا جس کے بغیر کام نہ چل سکتا ہو۔ مصطفےٰ جانتا تھا کہ این پی پی عوام میں دور تک نفوذ نہ کر سکنے کے باعث بری طرح ناکام ہو جائے گی۔ اس کا منشور اور پمفلٹ آخر کار انہیں سجاوٹی کتابوں کا حصہ بن جائیں گے جن کے جتوئی ہاؤس میں بڑے قرینے سے ڈھیر لگے رہتے تھے اور جنہیں کوئی کبھی کھول کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

مصطفےٰ کی سٹر-ٹجی یہ تھی کہ اس طرح غیر جانب دار بنے رہو جیسے کسی بات میں دلچسپی نہ رہی ہو۔ وہ شاذو نادر ہی مداخلت کرتا۔ بڑی آسانی سے ہر بات مان لیتا۔ اس نے استغنا اور الگ تھلگ رہنے کا انداز اپنانا شروع کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ معاملات بگڑ جائیں۔ جب وقت آئے گا تو الزام دھرنے کے لیے وہ موقع پر موجود ہو گا۔ یہ سب اداکاری تھی۔ بہت سے لوگ یہ سمجھے کہ شیر اب کٹ کھنا نہیں رہا۔ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر وہ اس کے کچھار میں جاگھسے۔ اس کا شکار بننے والوں میں خود جتوئی صاحب بھی شامل تھے۔

نجی محاذ پر مصطفےٰ نے، اور کچھ ہو نہ ہو، استغنا کو پاس بھی نہ پھٹکنے دیا۔ میں ابتدا میں پندرہ دن میں صرف ایک بار فیصل آباد جا کر اس سے مل سکتی تھی۔ یہ قطعی طور پر ناکافی تھا۔ ہم میں ایک روح فگار اور ڈرامائی ماجرے کے بعد پھر سے ملاپ ہوا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہمارے تعلقات ابھی سرسری تھے۔ جو زخم اس نے مجھے لگائے تھے ان میں اب تک جلن محسوس ہوتی تھی۔ واقعات بہت تیزی سے پیش آئے تھے۔ وہ میرا دل ابھی پوری طرح جیت نہ سکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملے تاکہ دماغ شوئی کے عمل کا ازسر نو آغاز کیا جاسکے۔ اسے میری آزادی سے چڑ تھی اور کڑھتا رہتا تھا کہ میں اتنا وقت اس سے دور رہ کر کیوں گزارتی ہوں۔ صاف عیاں تھا کہ وہ خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں میں اس سے انتقام نہ لوں اور جانتا تھا کہ وہ مجھ سے بدلا لینے کی پوزیشن میں نہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کا ذہن ہر وقت ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے مجھ سے زیادہ بار ملنا ضروری تھا۔ وہ تن تنہا اسیری کی صعوبت اٹھانے کو تیار نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ میں بھی قید ہو کر رہ جاؤں۔

میں نے کہہ سن کر مصطفےٰ سے یہ منوالیا کہ میں لاہور میں کوئی مکان کرائے پر لے لوں تاکہ بچوں کے ساتھ کہیں ٹک کر رہنا تو شروع کیا جائے۔ میں مکان حاصل کرنے کے لیے مری جارہی تھی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ میرے ہاتھ میں ہر وقت سوٹ کیس رہے۔ زندگی اس طرح نہیں گزاری جاسکتی۔ بچوں کو اچھے انگریزی سکولوں میں داخلہ مل گیا۔ اغوا کے واقعے سے انہیں بہت زیادہ نفسیاتی صدمہ نہیں پہنچا تھا۔ اس بات کا ان کے پاس ایک ہی ثبوت تھا کہ وہ پاکستان کی اجاڑ جگہوں میں گھومتے پھرتے رہے ہیں۔ ان کے سروں میں جوئیں ہی جوئیں تھیں۔ میں دہشت زدہ ہو گئی۔ مجھے بیچ بچ انہیں دھونی دینی پڑی۔ یہ ایک طویل اور سخت جنگ تھی۔ آخر کار اس وبال سر پر جراثیم کش دواؤں کو فتح حاصل ہوئی۔ میں نے سوچا، خدا کا شکر ہے، میں لوٹ آئی ورنہ جوئیں میرے بچوں کو کچا کھا جاتیں۔

ہمیں ابھی چین سے بیٹھنا نصیب ہی ہوا تھا کہ مصطفےٰ نے کھنڈت ڈال دی۔ اس نے مجھے مہلت دی تھی۔ وہ مجھے فوراً بہت سختی سے رگیدنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے بڑے صبر سے کام لیا لیکن اس کی ذات میں چھپا ہوا تخریب پسند ایک بار پھر جیت گیا۔ ایک صبح ناشتے پر اخبار اٹھا کر جو دیکھا تو اس میں خبر تھی کہ مصطفےٰ کو جیل میں دل کا دورہ پڑا ہے۔ میں حواس باختہ ہو گئی۔ ہوم سیکرٹری سے اپنے بیمار شوہر سے ملنے کی خصوصی اجازت حاصل کر کے جھٹ پٹ فیصل آباد کی راہ لی۔ غلام عربی اور غلام ربانی کھر میرے ہمراہ تھے۔

مصطفےٰ کو فیصل آباد ہسپتال منتقل کیا جاچکا تھا۔ ہسپتال کے ایک حصے کو ضمنی جیل کی شکل دے دی گئی تھی۔ ہسپتال کی اس طرح حفاظت کی جارہی تھی جیسے وہ کوئی

قلعہ ہو۔ اہل اختیار کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ ہسپتال میں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں کو رات بھر جاگتے رہنے پر مامور کیا گیا تھا۔ بہت سے مرد عورتیں ادھر ادھر بیٹھے کلام پاک کی تلاوت کرنے یا تسبیح میں مشغول تھے۔ وہ اپنے قائد کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔

میں نے مصطفےٰ کے کمرے میں قدم رکھا۔ مجھ پر خوف طاری تھا۔ مصطفےٰ بستر پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ "یہ پاکستان ہے۔ یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ میں نے یہ چکر جیل کے ڈاکٹر سے مل کر چلایا ہے۔ جیل مینول میں لکھا ہے کہ اگر قیدی کی زندگی خطرے میں ہو تو اسے ہسپتال منتقل کر دیا جائے۔ یہ مینول انگریزوں نے مرتب کیا تھا۔ آؤ ان کا شکریہ ادا کریں۔ ہمارا کام قانون میں رخنے تلاش کرنا تھا، سو ہم نے تلاش کر لیے۔"

دوسری حسب مطلب شق جو مصطفےٰ نے ڈھونڈ نکالی تھی یہ تھی کہ قیدی ہسپتال میں ہو تو اس کے لواحقین روز ملنے آسکتے ہیں۔

جیل مینول میں یہ شقیں صرف انسانی ہمدردی کی خاطر شامل کی گئی تھیں لیکن مصطفےٰ نے انہیں ایک ظالمانہ چال میں بدل ڈالا جس سے الو سیدھا کرنا مقصود تھا۔ اصرار کرنے لگا کہ میں روز اس سے ملنے آیا کروں۔ اگر میں ان قواعد کی پابندی نہ کرتی جو ہمارے استعماری آقا مرتب کر کے ہمارے لیے چھوڑ گئے تھے تو مجھے احساس دلایا جاتا کہ میں خطاوار ہوں۔

اب میرے وقت کو یرغمال بنا لیا گیا۔ میں ڈرائیو کر کے فیصل آباد جاتی۔ وہاں دو گھنٹے کے قریب گزارتی۔ مصطفےٰ کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتی۔ ڈرائیو کر کے لاہور واپس آتی۔ اخبار والوں سے ملتی۔ کچھ وقت اپنے بچوں کے لیے نکالتی اور تھکن سے چور ہو کر بستر پر جاگرتی۔

درحقیقت مصطفےٰ کو معدے میں جلن کی شکایت تھی۔ دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ وہ مکمل طور پر صحت مند تھا۔ اس کی صحت یابی کی دعا مانگنے کے لیے روزانہ جمع ہونے والے لوگ حیران ہوتے کہ اس کے کمرے سے دھم دھم کی آواز کیسی آرہی ہے۔ ان کا قائد ورزش کر رہا تھا۔ وہ سر کے بل کھڑا، ٹانگ پر ٹانگ رکھے، دنیا کو ایک ٹیڑھے بیڑھے تناظر میں دیکھنے میں محو تھا۔ میری زندگی کا پھر کوئی سر پیر نہ رہا تھا۔ اگر میری نانی اور صائمہ اور میری خالائیں، ثمر اور نسرین مجھے سہارا نہ دیتیں تو میرے اعصاب بھی جواب دے جاتے اور صحت بھی۔ میری کوئی سہیلیاں تو تھیں نہیں۔ انھوں نے سہیلیوں کی کمی پوری کر دی۔ بیس دن تک مجھے بلاناغہ فیصل آباد جانا پڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ بس بے ہوش ہو کر گری کہ گری۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میرا کوئی عذر قبول نہ کیا جاتا، کوئی شکایت نہ سنی جاتی۔ میرا اس کی خدمت میں حاضر ہونا لازمی تھا چاہے مجھے تیز بخار کیوں نہ چڑھا ہو۔ وہ کبھی یہ نہ کہتا کہ تمہاری طبیعت اتنی خراب تھی تو تم نہ آتیں۔ اس کے خیال میں مجھے تو آنا ہی تھا۔ بیوی ہونے کے ناتے یہ میرے فرائض میں شامل تھا۔ وہ قیدی ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی ہمدردی کا مستحق تھا۔ محض اس لیے کہ وہ مصیبت میں گرفتار تھا میں نے خود کو اس کی ہر من مانی کے آگے سر جھکاتے دیکھا۔ گو وہ نامعقولیت اور بے حسی کا ثبوت دے رہا تھا میں اس سے جھگڑ نہ سکتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں اس وقت برابری کی سطح پر بات نہ کر سکتے تھے میں صورت حال کو مزید بگاڑنا نہ چاہتی تھی۔ وہ مستقل غیر یقینی کے عالم میں جی رہا تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔ اس کے مستقبل کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ کتنی مدت جیل میں رہنا پڑے گا۔ اس کی بے چارگی بالکل عیاں تھی۔

اچانک اس کی ماں جی بیمار ہو گئیں۔ انہیں ملتان کے نشتر ہسپتال لے جایا گیا۔ مصطفیٰ کو بھی وہیں منتقل کر دیا گیا۔ قدرتی طور پر مجھ سے بھی یہی توقع کی گئی کہ آزمائش کی گھڑی میں اس کے ساتھ رہوں گی۔ ملتان میں میں نے میاں مشتاق اور اس کی بیوی شاہدہ کے پاس قیام کیا۔ دونوں میاں بیوی بڑے کمال کے میزبان ثابت ہوئے۔ مصطفیٰ کی ماں جی پر مہینے بھر غشی کا عالم طاری رہا۔ میں ایک دن بھی ان کے پاس سے نہ ہلی۔ میرے بچے سکول کی وجہ سے لاہور میں تھے اور صرف جمعرات اور جمعے کو ہمارے پاس آسکتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال دائی عائشہ کے ذمے تھی اور میں نے محسوس کیا کہ انہیں اتنی توجہ نہیں مل رہی جتنی ملنی چاہیے۔ میں مصطفیٰ سے کہتی رہتی کہ مجھے لاہور جانے دو۔ وہ ہمیشہ انکار کر دیتا۔ مجھے اس بارے میں لیکچر پلایا جاتا کہ بطور بیوی اور بہو مجھے کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ میں نے محسوس کیا کہ جو کردار مجھے دیا جارہا تھا اس کے لیے میں سراسر ناموزوں تھی۔ ماں کا کردار ادا کرنے کی آرزو مند تھی۔

آخر کار مصطفیٰ کی ماں جی وفات پا گئیں۔ مجھے لگا کہ میری جبری قید ختم ہونے کا وقت آ پہنچا۔ مصطفیٰ کے ذہن میں کچھ اور منصوبے تھے۔

دل کے ایسے عارضے کے علاج کے لیے جس کی تشخیص نہ ہو سکی تھی، جو اتنا نادر تھا کہ اسے معدوم سمجھنا چاہیے، مصطفیٰ ملتان ہی میں ٹھہرے رہنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں بچوں سمیت ملتان چلی آؤں۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ میں ابھی ابھی لاہور میں ایک مکان میں منتقل ہوئی تھی جس کا ظاہری روپ تازہ تازہ سنوارا گیا تھا۔ بچوں کا اپنے اپنے سکولوں میں دل لگ گیا تھا۔ مصطفیٰ کی بات کی کوئی تک نہ تھی۔

میرے بچے جس معیار کے سکولوں میں پڑھنے کے عادی ہو چکے تھے ویسا ایک بھی سکول ملتان میں نہ تھا۔ "تم جیل میں ہو۔ تمہیں چاہیے کہ جیل میں زندگی گزارنا سیکھو۔ بطور سیاست دان۔ وقار کے ساتھ۔ تم آخر مجھ سے کیوں چمٹے رہنا چاہتے ہو؟ ہمیں بچوں کی زندگی کوئی ترتیب پیدا کرنی ہے۔ اگر تمہیں چودہ برس جیل میں رہنا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ بھی بے آرامی کی زندگی گزاریں؟" مصطفیٰ کا ردعمل یہ تھا۔ "مجھے پتہ تھا۔ مجھے پتہ تھا تم یہی کرو گی۔ تم نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تم نے وعدہ کیا تھا۔ اور اب تم اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔"

ہمارے وکیل اور دوست، ایس ایم ظفر نے ملتان میں مجھ سے کہا کہ بری بھلی جس طرح زندگی گزرتی ہے گزار دو۔ مجھے مصطفیٰ کی من مانیوں کے سامنے جھکنا یا اس کا دم چھلا بنے بنے پھرنا نہ چاہیے۔ کاش یہ بات وہ مصطفیٰ سے کہتے۔ لیکن پھر یہ بھی تو ہے کہ اچھے وکیل اپنے مؤکلوں سے ہدایات لیتے ہیں، مؤکلوں کو ہدایات دیتے نہیں۔

حسب معمول مصطفیٰ نے مجھ زچ کر دیا۔ ہمارے گھر کے سارے ساز و سامان کو اٹھا کر ملتان پہنچانا پڑا۔ بچوں کو ایسے سکولوں میں داخلہ ملا جہاں کے استاد انگریزی لفظوں کے تلفظ اور معنی کے لیے میرے ننھے منوں سے رائے طلب کرتے تھے۔ بچے حیران بھی ہوئے اور تھوڑے سے پریشان بھی۔ ہم سب میاں مشتاق اور شاہدہ کے پاس مقیم تھے۔ وہ بہت مہمان نواز تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہماری وجہ سے وہ خاصے بے آرام رہتے ہوں گے۔ ان کے تین اپنے بیٹے تھے اور مکان بھی حویلی نما نہ تھا۔ اپنے چار بچوں اور ملازمہ کے ساتھ ان کے ہاں رہتے ہوئے مجھے لگتا تھا جیسے میرا کسی نامعقول قسم کے قبضہ گروپ سے تعلق ہے اور میں زبردستی وہاں ٹکی ہوئی ہوں۔ بہرحال، خرابیٔ صحت کے ہاتھوں مجھے وہاں سے بے دخلی کا نوٹس مل گیا۔

میں بیمار ہو گئی۔ میرے سینے پر ایک CYST نمودار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ بایوپسی کرانی پڑے گی۔ مجھے سخت فکر لاحق ہوئی۔ نانی اماں بھی بہت پریشان ہوئیں۔ انہوں نے تقاضا کیا کہ کم از کم کچھ دیر کے لیے تو میں مصطفیٰ کو بھلا کر اپنی صحت کا خیال رکھوں۔

مصطفیٰ کو مطلع کیا گیا کہ مجھے آپریشن کرانا پڑے گا۔ "کرا لو۔ یہیں پہ۔ اسی ہسپتال میں۔" میں نے بلا تامل انکار کر دیا۔ وہاں آپریشن کرانے کے خیال ہی سے مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ہسپتال کیا تھا، ڈراؤنا خواب تھا۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ حفظان صحت کا کوئی خیال نہ رکھا جاتا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں ہولناک کہانیاں صرف سنی ہی نہ تھیں بلکہ اپنی ساس کی بیماری کے دوران وہاں کے حالات کو بچشم خود بہت

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

قریب سے دیکھا تھا۔ آپریشن تھیٹر کی روشنیاں نازک مزاج واقع ہوئی تھیں اور جنریٹر اپنی مرضی کا مالک تھا۔ لوڈشیڈنگ کسی طرح سے عین اسی وقت ہوتی تھی جب ہنگامی آپریشن کیے جارہے ہوں۔ آپریشن کے بعد مریض کی دیکھ بھال کے تصور سے ہسپتال کا عملہ بالکل ناآشنا تھا۔ ٹانکوں میں پیپ پڑ جانے کے کیس نشتر میڈیکل ہسپتال میں روز ہوتے تھے۔

میں مصطفیٰ کی ماں جی کے کیس کا ذکر کیا۔ "دیکھو، ان لوگوں نے ماں جی کے ساتھ کیا کیا۔ میں یہاں آپریشن نہیں کرا سکتی۔ میں کراچی جارہی ہوں۔ شاید مجھے سرطان ہو۔ میں یہاں آپریشن کرانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ فرض کرو یہ افزائش خبیث نکلے۔ یہاں والے تو بتا بھی نہ سکیں گے کہ یہ خبیث ہے یا نہیں۔ میرے ساتھ اس طرح پیش نہ آؤ۔ کیا میری زندگی کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں؟ کیا تم چاہتے ہو میں مر جاؤں؟"

مصطفیٰ مریضانہ قسم کے گھٹیا فلمی مکالمے بولنے پر اتر آیا۔ "کم از کم میں تمہارے پاس تو ہوں گا۔ میں تمہارا ہاتھ تھامے رہوں گا۔" زندگی کے اس مرحلے میں اگر کوئی چیز میرے نزدیک سب سے کم اہم تھی تو وہ اس کے ہاتھ تھے۔

میں نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ میں کراچی میں آغا خان ہسپتال جانا چاہتی تھی۔ اس کی خواہشات کو ٹھکرا کر اور ان شکایات کی پروا کیے بغیر، جو اس نے میرے اڑیل پن، خودغرضی اور نافرمانی کے بارے میں اپنے بھائیوں سے کی تھیں، میں کراچی جتوئی ہاؤس کے لیے روانہ ہو گئی۔ جتوئی صاحب کی بیگم، کیکس، نے مجھے اتنا سہارا دیا کہ سارے خاندان کی کمی پوری کر دی۔ جب میرا آپریشن ہوا تو وہ آپریشن تھیٹر کے باہر انتظار کرتی رہیں۔ جب میں صحت یاب ہونے اور اپنی بایوپسی رپورٹ ملنے کا انتظار کر رہی تھی اور میرے ٹانکے ابھی تازہ تھے تو ملتان سے فون آیا۔ پارٹی کا کوئی کارکن بول رہا تھا۔ "مجھے کھر صاحب نے یہ پیغام دینے کے لیے کہا ہے کہ براہ کرم فوراً واپس آجائیں۔" "کھر صاحب کو بتا دو کہ ابھی میرے ٹانکے نہیں کھلے۔ میں نہیں آسکتی۔" مصطفیٰ کو اندازہ تھا کہ میری طرف سے یہ جواب ملے گا۔ کارکن نے بہت مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "کھر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ان کا حکم ہے۔ ٹانکے ملتان میں کھولے جاسکتے ہیں۔"

جتوئی صاحب میرے پاس تھے۔ انہیں مصطفیٰ پر بڑا تاؤ آیا۔ "کھر صاحب کو بتا دو کہ میں ان کے نامعقول احکام ماننے کو تیار نہیں۔ وہ مجھے ایسے حکم نہ دیں جن کے بارے میں وہ خود بھی جانتے ہیں کہ میں انہیں ہرگز نہ مانوں گی۔" میں نے فون کو

واپس رکھ دیا۔

جتنا وقت درکار تھا میں اتنی دیر وہاں رہی۔ CYST بے ضرر نکلا۔ موذی تو خود مصطفیٰ تھا۔

میں طیارے کے ذریعے ملتان پہنچی۔ جو کارکن جمع تھے ان کے چہروں پر تشویش کے آثار تھے۔ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کی مہربانی سے ہماری تازہ ترین جھڑپ کی خبر عام ہو چکی تھی۔ میں پارٹی کے عہدے دار کا کردار اتنی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی کہ کارکن غالباً یہ بھول چکے تھے کہ میں ان کے قائد کی بیوی بھی ہوں۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں مصطفیٰ کے ردعمل کے بارے میں خوف زدہ کیوں نہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس کا رویہ غیر معقول تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس سے خوف کھاؤں۔

میں مصطفیٰ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ غصے سے کھول رہا تھا۔ وہ اول فول بکنے لگا اور جب اس نے محسوس کیا کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو مجھے کندھوں سے دبوچ کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "اب بہت دیر ہو گئی۔ بس چلی جاؤ۔" میں نے ایک یا دو سیکنڈ کے لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور چلی آئی۔

میں دو دن اس سے ملنے نہ گئی تو مصطفیٰ پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے پیغاموں کا تانتا باندھ دیا۔ معافی مانگ لی۔ میں اس کے سامنے جھک گئی۔ مجھے اس کی سنگ دلی سے بڑا دکھ پہنچا تھا۔ اسے میری صحت کا کوئی خیال نہ تھا۔ صرف اپنے تنہا رہ جانے کی فکر ستا رہی تھی۔

بچے روز اپنے باپ سے ملنے جاتے اور دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھاتے۔ پھر وہ پرائیویٹ ٹیوشنیں پڑھنے چلے جاتے۔ میں شام کے چھ بجے مصطفیٰ سے رخصت ہوتی اور اپنے ذہن میں میڈیکل بلیٹن مرتب کرتی۔ جو کچھ سوچتی اسے پریس کے آگے اگل دیتی اور اگلی صبح اپنا کہا بے جان عبارت کی صورت میں چھپا ہوا پڑھ لیتی۔ یہ سلسلہ چھ ماہ جاری رہا۔

میں بہت بیمار ہو گئی۔ میرے رحم میں سنگین نوعیت کی اندرونی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہ عارضہ ایک تو زیادہ بچے جننے سے اور دوسرے نشتر میڈیکل کالج ہسپتال کی سیڑھیاں اترتے چڑھتے رہنے سے لاحق ہوا تھا۔ مجھے سرجری کی ضرورت تھی۔ یہ کہنا آسان تھا اور کرنا مشکل۔ مصطفیٰ کا اولین ردعمل بالکل ویسا ہی تھا جیسا اس نے ایک بار پہلے بھی ظاہر کیا تھا۔ "خوب۔ یہیں آپریشن کرالو۔" میرا ردعمل بھی میرے پچھلے ردعمل سے مختلف نہ تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بحث کا آغاز ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ اگر کراچی بہت دور ہے تو میں لاہور میں شیخ زید ہسپتال میں داخل ہو جاتی ہوں۔ مصطفےٰ کہنے لگا کہ وہ مجھے امراض نسواں کے کسی مرد معالج کے پاس ہرگز نہ جانے دے گا۔ میں نے کہا کہ میرا کسی مرد معالج کے پاس جانے کا پہلے ہی کوئی ارادہ نہیں۔ یہ پیچ در پیچ احتسابی بحث جاری رہی یہاں تک کہ مصطفےٰ نے ہار مان لی۔ لیکن اپنی طرف سے بعض شرطیں جڑدیں۔

بچوں کو چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ انہیں اپنے ساتھ لاہور لے جاؤں گی۔ ٹکٹ خریدے جا چکے تھے۔ ہم ہسپتال پہنچے تاکہ بچے اپنے والد کو الوداع کہہ لیں۔ مصطفےٰ نروس نظر آرہا تھا۔ "بے فکر رہو، مصطفےٰ میں پندرہ دن تک واپس آجاؤں گی۔ میرا وعدہ ہے۔"

اس نے مجھ سے قرآن مجید پر لکھوا لیا کہ میں ٹھیک پندرہ دن میں واپس آجاؤں گی۔ میں نے لکھ تو دیا لیکن ایک شرط اپنی طرف سے بڑھا دی۔ میں نے لکھا کہ اگر میرے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا تو پندرہ دن میں واپس آجاؤں گی۔ "یہ کیا لکھ دیا؟" "مصطفےٰ، میں کلام پاک پر کوئی ایسا حلف نہیں اٹھا سکتی جسے شاید پورا نہ کیا جاسکے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اتنی قطعیت سے بات کرنا مناسب نہیں۔" "کیا ہو سکتا ہے بھلا؟" "بھئی--- مثلاً میں مر سکتی ہوں۔" "پھر کیا؟ اگر تم مر بھی جاؤ تو بھی تمہاری میت آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد میرے پاس پہنچ جانی چاہیے۔ اگر تم بیمار پڑ جاؤ تو سٹریچر پر لیٹ کر یہاں آجانا۔ مجھے پروا نہیں۔" میں اس کی طرف تکتی رہ گئی۔ اس آدمی کی اصلاح ناممکن تھی۔ اس نے فی الفور نئی چال چلی۔ "ٹھیک ہے۔ تم جا سکتی ہو۔ نشا اور علی کو میں اپنے پاس رکھ لیتا ہوں۔" بلیک میل۔ "مصطفےٰ ہوش سے کام لو۔ بچے لاہور جانا چاہتے ہیں۔ وہ کب سے آس لگائے بیٹھے ہیں کہ لاہور جائیں گے۔ انہیں اس طرح جدا کر دینا بے انصافی ہے۔" "نہیں۔ وہ یہیں رہیں گے۔ میرے پاس۔" "یہاں کمرے میں اس طرح بند رہ کر وہ کیا کریں گے؟ اس سے ان کی نفسیات پر برا اثر پڑے گا۔ یہ مت کرو۔ یہ ظالمانہ حرکت ہے۔ نشا اور علی کا دل ٹوٹ جائے گا۔ انہیں لگے گا کہ وہ بالکل بے اختیار ہیں۔ انہیں پتہ ہو گا کہ نصیبہ اور حمزہ لاہور میں خوب مزے اڑا رہے ہیں۔" "میں نے کہہ دیا نہیں۔ میرے انکار کو انکار سمجھو۔ یہ میرے ساتھ ہسپتال میں رہیں گے۔ تمہیں وقت پر واپس آنا ہو گا۔"

اس کا ساتھ چھوڑ جانے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اسے تو خود ہی عدم تحفظ کا احساس کھائے جارہا تھا۔ وہ ایک بار پھر میرے بچوں کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں لاہور جانے سے باز آجاؤں گی۔ میں بچوں کی

خاطر ملتان میں رک جاؤں گی۔ اب میں بھی مزاج کی بڑی سخت ہو چکی تھی۔ میں نصیبہ اور حمزہ کو لے کر چلی گئی۔

جب مجھے وھیل چیئر پر بٹھا کر آپریشن تھیٹر میں لے جایا جارہا تھا تو مجھ پر اداسی طاری ہو گئی۔ مجھے اس آدمی پر ترس آیا جو مجھے ہنسی خوشی زندگی گزارنے کا موقع دینے کو تیار نہ تھا۔ جو مجھے اپنے سے دور دھکیلنے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ میں تو اپنی تذلیل گوارا کر کے اس کی ہر الٹی سیدھی من مانی پوری کرتی رہی اور وہ تھا کہ اسے میرے احساسات کا شمہ بھر لحاظ نہ تھا۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتے وقت مجھے اپنے ان بچوں کی یاد آئے گی جو جیل میں اس کے ساتھ بند تھے۔ اسے معلوم تھا کہ میں بالکل اکیلی ہوں۔ میرے والدین اور بہنیں میرے پاس نہ تھیں۔ میں نے اس کی خاطر ان سب سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ ان کے بجائے مجھے دوستوں کا سہارا حاصل تھا۔ میرے خاندان کی جگہ جتوئی صاحب اور ان کے اہل خانہ لے چکے تھے۔ میرے شوہر کو میری علالت اس لیے ناگوار گزرتی تھی کہ خود غرضی کے مارے وہ چاہتا تھا کہ میں ہر وقت اس کے پاس رہوں۔ مجھے امی کا خیال آیا۔ میرے پچھلے آپریشن کے وقت وہ کراچی میں تھیں۔ انہوں نے میرا حال معلوم کرنے کی زحمت تک نہ کی تھی۔ صرف زرمینہ باقاعدگی سے مجھے فون کرتی رہی۔ روبینہ، عدیلہ اور منو میرے پاس بھی نہ پھٹکیں۔ میں یہ بھلا نہ سکی کہ وہ ایک ایسی بہن کے پاس آنے سے پہلو بچا رہی تھیں جو شاید سرطان میں مبتلا تھی۔

خوش قسمتی سے لاہور میں میرے رشتے دار میرے گرد جمع ہو گئے۔ میرے خالو اور خالائیں اور نانی اماں۔ زرمینہ نے بھی میرا ساتھ دیا حالانکہ امی اسے سختی سے منع کر چکی تھیں کہ مجھ سے نہ ملے۔ امی نے میرے رشتے داروں کا بائیکاٹ کر دیا۔ زرمینہ کے خلاف بھی سرد جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ میرا جرم یہ تھا کہ میں مصطفےٰ کے پاس لوٹ گئی تھی۔ میں نے امی کی حکم عدولی کی تھی۔

آپریشن کے بعد نانی اماں نے میری صحت کا خیال رکھا۔ اس اثنا میں مصطفےٰ نے اپنے سب بھائیوں کو بلا کر شکایت کی کہ مجھے اس کی بیمارگی کی کوئی پروا نہیں اور میں ہمیشہ اپنی ہی خیر مناتی رہتی ہوں۔ مجھے بڑا طیش آیا۔

میں کراچی جاکر والد صاحب سے ملنا چاہتی تھی۔ مصطفےٰ نے سختی سے منع کیا کہ میں نہ جاؤں۔ میں نے اس کی مناہی کو نظر انداز کر دیا۔ میں والد صاحب سے ملی اور ان کے ساتھ اپنے نئے مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ میں لاہور لوٹ آئی۔

میں صبح سویرے ملتان روانہ ہونے والی تھی۔ اس رات زیاں اور ملال کے ایک

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

احساس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مجھے لگا جیسے مجھ پر کوئی بھاری بوجھ آ پڑا ہے۔ میرے وجدان نے خبر دی کہ کوئی بہت بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ جب ابھی تو یہ خبر ملی کہ مصطفیٰ کو رات کے اندھیرے میں ملتان سے اٹھا کر بذریعہ کار راولپنڈی کے اڈیالا جیل پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ کارروائی ایک طرح کی بدشگونی تھی۔ اڈیالا جیل کو راولپنڈی جیل بند کر دینے کے بعد تعمیر کیا گیا تھا۔ یہیں پر بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی تھی۔ چار و ناچار مجھے برے برے خیال آنے لگے۔ اوپر والوں نے آخر کیا کرنے کی ٹھانی ہے؟ اگر وہ جیل سے کبھی زندہ واپس نہ آ سکا تو کیا ہو گا؟ مجھے محسوس ہوا جیسے پھندا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ایک کو پھانسی دے چکے ہیں۔ اب کسی اور کو پھانسی نہیں دے سکتے۔

نشا اور علی اسی روز، استغاثیہ کی مہربانی سے، میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے اخباری کانفرنس بلائی اور مصطفیٰ کو اڈیالا منتقل کرنے کی مذمت کی۔ میں نے کہا کہ میرا شوہر دل کا مریض ہے اور کار کے ذریعے ملتان سے پنڈی تک کا طویل سفر اس کے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

دو اگست کو، جو اس کا یوم پیدائش ہے، میں اس سے ملنے راولپنڈی پہنچی۔ غلام مرتضیٰ کھر اور اس کی بیوی، فرح، غلام، عربی، بلال، عبدالرحمن اور بچے، سب میرے ساتھ تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں ہماری مصطفیٰ سے ملاقات ہوئی۔ مصطفیٰ مجھ سے بہت خفا تھا۔ میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ میں اتنی تھک چکی تھی کہ اس سے جھگڑنے کا دم بھی نہ رہا تھا۔ دو مہینوں میں دو بار آپریشن کرا چکی تھی۔ میں اپنے بچوں کی ماں ہی نہ تھی، باپ کا رول بھی مجھے ہی ادا کرنا پڑتا تھا۔ میں ایک دفعہ پھر بے گھر ہو گئی تھی۔ سب کچھ غتربود ہو چکا تھا۔

مصطفیٰ سپرنٹنڈنٹ سے خصوصی اجازت حاصل کر کے ہمیں اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے کا دروازہ کواڑوں سے بے نیاز تھا۔ ایک چک لٹکی ہوئی جھول رہی تھی۔ تخلیہ فراہم کرنے کا ایک ڈھیلا ڈھالا معذرت خواہانہ انداز۔ میں اپنا ایک فوٹو اس کے لیے لے گئی تھی۔ وہ ابھی تک روٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا کہ اسے فوٹو نہیں چاہیے۔ میں نے فوٹو واپس بیگ میں رکھ لیا۔ اس نے گھر والوں سے کہا کہ وہ باہر جا کر انتظار کریں۔ وہ سب باہر جا کر چک کے ارد گرد پہرے داروں کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

مصطفیٰ مجھ سے ہم بستری کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے نہ تو وہ جگہ موزوں تھی نہ وقت۔ تخلیے نام کی کسی چیز کا وہاں وجود نہ تھا۔ باہر کھڑے گھر والوں کی باتیں مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے علاوہ میری صحت بھی ٹھیک نہ تھی۔ مجھے میرے ڈاکٹر

نے مشورہ دیا تھا کہ ٹانکوں کے ٹھیک ہونے کا انتظار کروں۔ میں بہت خوف زدہ ہو گئی۔ میں نے اسے بتانے کی کوشش کی میری صحت ٹھیک نہیں اور مجھے صحت مند ہونے میں کم از کم چھ ہفتے لگیں گے۔ اس نے ذرہ برابر پروا نہ کی۔ میں نے اسے بتایا کہ گھر کے لوگ باہر کھڑے ہیں، پولیس والے باہر کھڑے ہیں۔ یہ وقار سے بہت ہی گری ہوئی بات ہو گی۔ "ہماری جتنی عمر کو پہنچنے کے بعد لوگ اس طرح کی حرکتیں نہیں کرتے۔ مجھے بعد میں باہر جا کر ان سے آنکھیں چار کرنی ہیں۔ میرا سر شرم سے نیچا ہو جائے گا۔" مصطفیٰ کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ "مصطفیٰ، میں خدا کی قسم کھا کہ کہتی ہوں، میں رسولؐ کی قسم کھا کے کہتی ہوں کہ اگر تم نے، یہ جانتے بوجھتے کے باوجود کہ میری صحت خراب ہے، مجھے چھونے کی جرأت کی تو میں آئندہ کبھی تم سے ملنے نہ آؤں گی۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ میں طلاق لے لوں گی۔"

اس نے کوئی پروا نہ کی۔ ابتدا میں جو خوف مجھ پر طاری ہوا تھا اصلیت اس سے کہیں زیادہ خوف ناک ثابت ہو رہی تھی۔ آخر کار میں متنفر ہو کر اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ "تم بیمار ہو... اس قدر بیمار۔" میں اس کی زندگی سے گرتی پڑتی نکل آئی۔ اس نے صلح کرنے کی کوشش کی۔ "مجھے معاف کر دو..." "تمہاری بیوی بن کر رہنا ناممکن ہے۔" "مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ خدا کے لیے۔ میرا کیا بنے گا۔ تم چلی جاؤ گی اور مجھے یہاں، بند کر دیا جائے گا۔ مجھے اتنی پریشانیاں گھیر لیں گی۔ تمہارے سوا مجھے کسی سے پیار نہیں۔ تمہارے سوا کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ تمہارے سوا مجھے امید کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر تم چلی جاؤ گی تو میرے پاس کچھ بھی نہ رہے گا۔ امید کا سہارا بھی چھن جائے گا۔"

اس نے مجھ سے میرا فوٹو مانگا۔ میں نے بیگ سے فوٹو نکالا اور پھر بالکل دیدہ و دانستہ اسے پرزے پرزے کر کے کمرے میں بکھیر دیا۔ اس کی منت سماجت جاری رہی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اسے معاف کر چکی ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا۔ میں اس پاگل، بیمار جانور کو معاف نہیں کر سکتی تھی۔ دکھ کے بجائے رسوائی محسوس ہو رہی تھی۔ میں شرمندہ ہو کر مگر اس یقین کے ساتھ باہر آئی کہ یہ میری مصطفیٰ سے آخری ملاقات تھی۔

ڈی ایچ ایل کی وساطت سے ایک خط اڈیالا بھیجا گیا۔ اس میں طلاق کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ مفتی ڈاک سنسر کرتا تھا۔ اس نے خط پڑھ لیا۔ خبر باہر نکل گئی۔ اسے اخباروں کے صفحۂ اول پر جگہ ملی۔ خبر سے کسی کو دھچکا لگا۔ ابھی چند دن پہلے تک میں ایسی بیوی کے طور پر پہچانی جاتی تھی جو کسی بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کر رہی تھی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں اپنی شرمندگی کی وجوہ منظرِ عام پر نہ لاسکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسی عورت بن کر رہنے سے کیا فائدہ جس کے ساتھ خود اس کا شوہر زنا بالجبر کر چکا ہو۔ اس کے بجائے ایسی عورت بن کر جینا بدر جہا بہتر ہے جو اپنی تلون مزاجی کے لیے بدنام ہو چکی ہو۔

مجھے سنگدل قرار دے کر برا بھلا کہا گیا۔ میرا شوہر بیچارہ قید بند کی اذیتیں سہہ رہا تھا اور میں بظاہر اس کا ہاتھ جھٹک کر چل دی تھی۔ جو زیادہ بد زبان تھے انہوں نے کہا کہ میں رنگ رلیاں منانے اور عشق لڑانے کے لیے رسی تڑانا چاہتی تھی۔ آخر مصطفٰے نے جیل میں رہتے ہوئے ایسی کون سی زیادتی کی ہو گی، وہ پوچھتے؟ مصطفٰے بیچارے کی حالت پہلے ہی غیر تھی، اوپر سے میں نے دھکا دے دیا۔ میں ایسی عورت بن گئی جسے برا کہنا ہر کسی کو اچھا لگتا تھا۔

میری وکیل، عاصمہ جہانگیر، جس کے لیے میرے دل میں بڑا احترام پیدا ہو گیا، مصطفٰے سے ملنے گئی۔ اس نے ٹھکرائے ہوئے عاشق کا بہروپ بھرنے کا حق ادا کر دیا اور اقرار کیا کہ میرے لیے اس کی محبت امر ہے۔ اس نے عاصمہ سے کہا کہ مجھے کسی طرح منا کر واپس لے آئے اور غضب یہ کہ طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے خلع کے لیے درخواست پیش کر دی۔

ایک بار پھر اپنا سامان پیک کرنے کی نوبت آگئی۔ میں نے کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ مصطفٰے اتنی زیادہ بار ایسی حرکتیں کر چکا تھا جن سے میری تذلیل کا پہلو نکلتا تھا اور میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ ہمارے تعلقات کی اصلاح ممکن نہیں۔ مصطفٰے کی وجہ سے سیاست کے لیے میرا جوش بالکل ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ میں بہت تنہا تھی۔ میرا کوئی ذاتی دوست نہ تھا۔ پارٹی کے کارکن، جو خلا پر کرنے کے کام آتے رہے تھے، جا چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے قصہ ختم ہو گیا ہو۔ میں ان تمام لوگوں کے بارے میں سوچتی رہتی جن سے مجھے ان پچھلے برسوں کے دوران ملنے ملانے کا اتفاق ہوا تھا۔

میرے بے قرار ذہن میں چہرے اور نام بجلی کی سی تیزی سے گزرتے رہے۔ انہیں یاد کرتے کرتے مجھ پر ایک ناگوار حقیقت کا انکشاف ہوا۔ وہ سب مصطفٰے کے ساتھی تھے۔ مصطفٰے کے اتحادی تھے۔ مصطفٰے کے پچھ لگو تھے۔ مجھے یقین نہیں کہ ان میں کوئی مصطفٰے کا دوست بھی تھا۔ ہم دونوں نے جو زندگی ایک ساتھ گزاری تھی اس کے دوران جو لوگ بھی ہمیں ملے تھے ان کی اور ہماری زندگیاں سیاست کے پھیلے ہوئے جال کے ایک حصے کے طور پر آپس میں بیلوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ ہمیں ایک دفعہ بھی ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا جو سیاست کے جال سے یکسر آزاد ہوں۔ ہمارے

جو بھی تعلقات تھے وہ لین دین پر مبنی تھے۔ ان میں جذبات کو دخل نہ تھا۔ صیمہ، اینڈریو اور کیکس کو البتہ اس کلیے سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ المیہ یہ تھا کہ میرے پرانے یار دوست اب کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ ان کی زندگیوں نے میری زندگی کو چھونے کے بعد ایک بالکل ہی مختلف رخ اختیار کر لیا تھا۔ جو وقت میں نے ایک جلاوطن سیاسی رہنما کی بیوی کے طور پر گزارا تھا اس نے کسی نہ کسی طرح مجھے نارمل، پیش پا افتادہ زندگی بسر کرنے کے قابل نہ رہنے دیا تھا۔

یہی وہ دن تھے جب نصرت جمیل یا نصی، جیسا کہ اسے ولاد سے کہا جاتا ہے، میری زندگی میں داخل ہوئی۔ وہ صحافی تھی اور انگریزی اخبار "دی نیشن" کے لیے کام کر رہی تھی۔ میں اس سے پہلے کبھی نہ ملی تھی۔ اس نے مجھے فون کیا۔ کہنے لگی کہ میرا انٹرویو لینا چاہتی ہے۔ میں نے سوچا کہ ایک سیاست دان کی روٹھی ہوئی بیوی کے مصائب پر مبنی دل خراش کہانی میں لوگوں کی دلچسپی کا سامان ضرور ہو گا۔ میں اس سے ملنے پر راضی ہو گئی۔ وہ آئی۔ ہم نے گفتگو کی۔ نصی نے میری زندگی بدل ڈالی۔

نصی نے اپنے گھر مجھے ڈنر پر مدعو کیا۔ پاکستان میں جن گھروں میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا یہ گھر ان سے مختلف نظر آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس گھر کے بانکپن میں ٹھہراؤ بھی ہے اور اطمینان بھی۔ کتنی چابک دستی سے کام لیا گیا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ گھر میں رہنے والوں کا اسلوب زندگی بھی مختلف ہے۔ نصی کا شوہر بھی موجود تھا، جسے میں جے جے کہنے لگی، اور یوسف صلاح الدین بھی، جو علامہ اقبال کا نواسا ہے۔ بڑے لطف کی شام گزری۔ ڈنر کے بعد ہم قلفیاں کھانے انار کلی گئے۔ آزاد ہو جانے کا احساس تو تھا لیکن میں ابھی اپنے بہت سے حجابات سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکی تھی۔ تینوں ساتھی میری موجودگی کو بڑے اطمینان سے قبول کر چکے تھے۔ انہیں مجھ سے نہ تو ڈر لگ رہا تھا نہ پروا تھی کہ میں کون ہوں۔ انار کلی پہنچ کر مجھے محسوس ہوا جیسے میں سکول سے چوری چھپے بھاگ آئی ہوں۔ فکر لاحق تھی تو یہ کہ کہیں مجھے اس طرح گلچھرے اڑاتے نہ دیکھ لیا جائے۔ میں گھر جانا چاہتی تھی۔ خاصی دیر ہو چکی تھی۔ لطف تو بہت آرہا تھا لیکن میں اس احساس سے دامن نہ چھڑا پا رہی تھی کہ کوئی جرم کر رہی ہوں۔ انہیں کوئی جلدی نہ تھی۔ میں ابھی ان سے اتنی بے تکلف نہ ہوئی تھی کہ ان پر حکم چلا سکتی۔ آدھی رات ہونے کو آئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنی رات گئے میں اکیلی باہر گھوموں پھروں۔ بیک وقت مجھے ڈر بھی لگا اور دل میں گدگدی بھی ہوئی۔ مجھے لگا کہ میں بڑی نٹ کھٹ ہو گئی ہوں۔ میں اپنے پر عائد کرفیو کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔ لیکن مجھے سوچنے اور محسوس کرنے کے جس سانچے کا عادی بنا دیا گیا تھا وہ اپنی طاقت منوا کر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

رہا۔ میں نے جی کڑا کر کے ان سے کہا کہ بہت دیر ہو چکی ہے اور میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ ان کے لیے وقت کوئی ایسی چیز نہ تھا جو ان کی کلائیوں پر ہتھکڑیوں کی طرح بندھا ہو۔ وہ تو وقت کے پیچھے لٹھ لے کر پھرتے تھے۔ وقت خود منتظر رہتا تھا کہ وہ آئیں اور اسے برباد کریں۔ وہ مجھے گھر اتار گئے۔ مجھے پتہ تھا کہ ان سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔

مصطفےٰ سے قطع تعلق کے دو دن بعد غلام رحمانی کھر لندن میں فوت ہو گیا۔ اس کی موت سے میرے دل پر چوٹ لگی۔ رحمانی لندن میں ہمارے ساتھ رہ چکا تھا۔ وہ صرف تیس برس کا تھا۔ میں نے اُسے محبت سے یاد کیا۔ وہ ہمیشہ نہایت احترام سے پیش آتا تھا اور میرا بڑا لحاظ کرتا تھا۔ اس کی موت کے بارے میں کوئی سرسری رویہ اختیار کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں ہوائی اڈے گئی۔ وی آئی پی لاؤنج میں داخل ہوئی جہاں غازی کھر اور عبدالرحمٰن کھر رحمانی کی میت کا انتظار کر رہے تھے۔ طیارہ آپہنچا۔ میں دونوں غم زدہ مردوں کے ساتھ طیارے تک گئی، طیارے کے ہولڈ میں جا کر میت کے لیے دعائے مغفرت کی اور چلی آئی۔ غلام غازی کھر کو پتہ تھا کہ میں مصطفےٰ کو چھوڑ چکی ہوں۔ اس موقع پر میرے حاضر ہونے سے اس کے دل پر اثر ہوا۔ مصطفےٰ کو پیرول پر چھوٹے بھائی کے جنازے میں شرکت کی اجازت دی گئی۔ کہتے ہیں کہ جنازے پر وہ کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ بہت سوں نے کہا کہ اسے دو بڑے نقصان اٹھانے پڑے تھے، ایک تو رحمانی کی موت کا غم، دوسرے تہمینہ سے بچھڑ جانے کا غم، اور اس کے جتنے آنسو رحمانی کے لیے بہے تھے اتنے ہی تہمینہ کی خاطر بھی بہتے رہے تھے۔ وہ سن چکا تھا کہ جس وقت رحمانی کی میت ہوائی اڈے پر پہنچی تو میں وہاں موجود تھی۔ مصطفےٰ سے شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں آزمائش کی کسی گھڑی میں اس کے ساتھ نہ تھی۔

اگلے دن میں بچوں اور اپنی ملازمہ، شگفتہ، کو ساتھ لے کر کراچی روانہ ہو گئی اور اپنے اپارٹمنٹ میں جا اتری۔ کیکس میری قریب ترین دوست تھی۔ میں ترستی رہتی تھی کہ کوئی تو ہو جو یہ احساس دلائے کہ میرا بھی کوئی خاندان ہے۔ کیکس کی موجودگی نے خاندان کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اسے دیکھ کر مجھے صبیحہ یاد آجاتی تھی۔ وہ منکسر مزاج تھی اور فطرتاً بہت شفیق۔ بچوں کو اس سے پیار تھا۔ وہ ان کے لیے وقت نکالتی اور ہر طرح کے موڈوں کو مکس اور ویڈیو فلمیں لے کر آتی۔ اس نے خاص اہتمام کیا کہ ہمیں ایک لمحے کے لیے عدم تحفظ کا احساس نہ ہو۔ کبھی یہ خیال نہ آئے کہ ہمیں چاہنے والا کوئی نہیں۔

نصی اور جے جے کا کراچی آنا ہوا۔ ملنے آئے تو انہوں نے بھٹ شاہ چلنے کی دعوت دی۔ عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کا عرس منایا جا رہا تھا۔ بھٹ شاہ سندھ

کے عوام کے لیے جائے اجتماع بن گیا تھا۔ یہاں تصوف کے زیر سایہ، چڑھتے چاند کی چھاؤں تلے، آمادہ بہ جنگ سندھی جمع ہو کر موسیقی اور رقص کے ذریعے اپنے احتجاج کو آہنگ عطا کرتے تھے۔ ولی کامل کی آرام گاہ ان کے لیے جائے امان تھی۔ بھٹو صاحب کے زیاں اور پھر 1983ء میں فوجی کارروائی سے سندھی قوم پرستی میں نئی جان پڑ گئی تھی۔ وفاقی حکومت سے اختلاف غالب آچکا تھا اور ہر سال بھٹ شاہ واضح ہو کر سامنے آجاتا تھا۔ شاہ لطیف کی شاعری دلوں میں ولولہ پیدا کرتی تھی اور بہت ہی برمحل اور بامعنی معلوم ہونے لگی تھی۔ سچل سرمست کی انقلابی شاعری کے برعکس شاہ لطیف سنجیدہ اور لطافت آمیز پیرائے میں بات کرنے کے ماہر تھے۔ جس ثقافتی احیا کی زد میں پورا سندھ آچکا تھا اسے بچشم خود دیکھ کر میرے جوش و خروش کی انتہا نہ رہی۔

اس سے پہلے میں نے کسی عرس میں شرکت نہ کی تھی۔ مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ دیکھنے کو کیا کیا ملے گا۔

میرے لیے بھٹ شاہ بہت عجیب تھا۔ مشرقی وضع کے جشن کا سماں تھا۔ ہماری کار میں جھانکنے والے چہروں سے آزردگی اور غیرت جھلکتی تھی۔ بھٹ شاہ کی سرزمین تقدیس کی حامل ہے۔ وہ انہیں ایک دم گھونٹنے والے نظام سے تحفظ اور چھٹکارا فراہم کر رہی تھی۔

بھٹ شاہ میں میری بعض ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جن سے میرا لگاؤ مرورِ ایام کے ساتھ بڑھتا گیا۔ میں عمران اسلم سے ملی جو "سٹار" کا مدیر تھا۔ ہم دونوں میں بڑا زبردست ذہنی ارتباط قائم ہو گیا۔ جن بہترین ذہنوں کو جاننے کا مجھے شرف حاصل رہا ہے ان میں عمران اسلم کا ذہن بھی شامل ہے۔ اس کے خیالات مجھے بہت انقلابی معلوم ہوئے۔ یہ بات مجھے بہت بھائی۔

جے جے یا جیلو تجزیہ پسند ذہن کا مالک ہے۔ اس کی مدد سے میں بعض ایسے اسرار کی گتھیاں سلجھانے میں کامیاب ہو گئی جو میرے ذہن کو مدتوں سے پریشان کر رہے تھے۔ ہم سب کو تجزیہ کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ جے جے فرائیڈی طریق کار کا قائل تھا اور گفتگو کے ذریعے علاج کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ میں نے اسے آزاد طبع مرد پایا اور آج تک مجھے جن سب سے بردبار اور ہمدرد شوہروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اسے بھی انہیں کی صف میں رکھنا پڑے گا۔

نصی خوبصورت تھی۔ وہ بہت ذہین اور اپنے مفہوم کو صحت سے بیان کرنے پر قادر تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس قسم کی طرزِ زندگی سے مجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہے۔ اس نے ذہن میں طے کر لیا کہ میرے معاملے میں عجلت سے کام نہیں لے گا۔ جو ہونا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بے آپ ہوتا رہے گا۔ اس نئی طرز زندگی کے اسرار سے واقف ہوتے ہوتے مجھے دیر تو لگے گی لیکن میری واقفیت ہو گی مکمل۔ میں نے جو زندگی گزاری تھی اس میں مجھے ہر طرح کا تحفظ حاصل تھا اور میرے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز ایک خاص طرح کے سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ نعمی ان باتوں کو سمجھ گئی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ مجھے ایسے مرد کے ساتھ رہنا پڑا ہے جو عمر میں مجھ سے بڑا تھا اور جاگیر دارانہ ذہنیت رکھتا تھا۔ اپنی اقدار کی حد تک میں لکیر کی فقیر تھی لیکن میرے اندر کوئی چیز مجھے ہمیشہ بغاوت کرنے پر ورغلاتی رہتی تھی۔ میری سرشت میں شامل تجسس مجھے کوئی نہ کوئی نئی چیز دریافت کرنے کے لیے کچو کے دیتا رہتا تھا۔ اب تک تو میں اپنے ذہن کی اُجاڑ پہنائیوں میں بھٹکتی رہی تھی۔ نعمی چاہتی تھی کہ میں اپنے ذہن کو کشادہ کروں اور متبادل حقیقت پر بھی نظر ڈالوں۔ طلاق کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی بس ختم ہو گئی۔ ایسی شادی کو جسے گھن لگ چکا ہو محض اس لیے قائم رکھنا کہ اس کی بدولت معاشرے میں پذیرائی حاصل رہے گی کوئی زیادہ معقول بات نہیں۔ نعمی نے میرے اندر کا توازن بحال کر دیا۔ اس کی رفاقت میں مجھے محسوس ہوتا کہ جو کچھ کر رہی ہوں اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔ کسی کی نقل نہیں اتار رہی۔ میں نے "بیگمات" والا بناؤ سنگھار ترک کر دیا اور اس چادر کو اتار پھینکا جس نے شخصیت کو مسخ اور مقید کر دیا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے میری خاطر ملتے تھے، میری کوئی حالیہ یا سابقہ حیثیت ان کے پیش نظر نہ ہوتی تھی۔

میں مبہم سا تاثر تھی۔ سوشل پوزیشن واضح کرنے والا بیان تھی۔ ایسی گفتگو تھی جس سے تمیزداری ظاہر ہوتی ہو۔ نعمی سے مل کر میں اندھیروں کو مار بھگانے میں کامیاب ہو گئی۔ اگرچہ ماضی سے میرا رشتہ ابھی مکمل طور پر منقطع نہ ہوا تھا تاہم مجھے احساس تھا کہ اس رشتے کو توڑنے کے لیے میں زور لگا رہی ہوں۔ نعمی نے مجھے حوصلہ دیا۔

ریسٹ ہاؤس میں سونے کے انتظامات سے میرے احساسات کو ٹھیس لگی۔ مجھے سرسری انداز میں بتایا گیا کہ ہم سب ایک ہی کمرے میں رات بسر کریں گے۔ ہم چھ یا سات آدمی تھے۔ مرد بھی، خواتین بھی۔ میرا چہرہ ضرور شرم سے لال ہو گیا ہو گا۔ یہ بہت ہی نرالی بات تھی۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ جس کمرے میں نعمی کا میاں سوئے گا اسی کمرے میں مجھے سونا ہو گا۔ ان کو ذرہ برابر پروا نہ تھی۔ ان کے لیے یہ بالکل فطری بات تھی۔ ان کی بے پروائی دیکھ کر میری ہمت بڑھی۔ میں نے ایسی عام حجابی کا مظاہرہ کرنے پر دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا ڈپٹا۔ جو لوگ بیچ بیچ ساتھ سوتے ہیں درحقیقت وہ سوتے کب ہیں۔

ہم ان لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں سے گزرے جو عارضی طور پر بنے ہوئے بازار میں قدم مارتے چلے جا رہے تھے۔ ہم نے گھٹیا ریستورانوں میں جھانکا جہاں ہیجڑے فحش انداز میں ناچتے ہوئے ناپاک صحبتوں کے لیے وقت اور جگہ طے کر رہے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس معاشرے کی ریاکاری، جس میں مردوں کو غلبہ حاصل ہے، اس سے زیادہ واضح انداز میں کبھی سامنے نہ آئی تھی۔ مردوں نے بیچ بیچ عورتوں کا کردار اپنا لیا تھا۔ یہ سارا منظر جسے ہم نے آگے کو جھک جھک کر دیکھنے والوں کی گردنوں کے بیچ بیچ میں سے ملاحظہ کیا جتنا بھونڈا اتنا ہی گستاخانہ بھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایسا وحشت ناک خواب شاید مشہور ہدایت کار، فیلینی، ہی دیکھ سکتا ہے۔ ہم نے ایک بڑے شامیانے والے سرکس کا جائزہ بھی لیا جس میں پسوؤں کے ستائے ہوئے چند بیزار ہاتھی اور شیر کھڑے تھے۔ مجھے رہ رہ کر دہی بدنوں سے چپکے ہوئے لباس یاد آ رہے تھے جو ہیجڑوں نے اپنے جھالر دار گھٹنوں کے نیچے پہن رکھے تھے۔ ہم قسمت کا حال بتانے والوں، دانتوں کے معالجوں، بھنگ فروشوں اور ان بڑے بڑے خیموں کے پاس سے گزرے جن میں شاہ لطیف کے عرس پر آنے والے زائرین قیام کرتے ہیں۔ یہ جگہ مشرق کی خوبصورت ترین زیارت گاہوں میں سے ایک ہے۔ لوگ احاطے میں پڑے سو رہے تھے۔ تھکے ہارے لوگ جو اپنی اپنی التجائیں لے کر زیارت گاہ آئے تھے۔ شفاعت کے طلبگار بن کر حاضر ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں نہ تھیں ہزاروں کشکولِ گدائی تھیں۔ ہم ان زمین پر دراز صورتوں کے درمیان سے گزرے۔ ایک پُرہیبت لے ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ زیارت گاہ کے سامنے فقیر ہم آہنگ ہو کر گا رہے تھے۔ ان کے لبوں پر دعا تھی کہ صبح ہو اور زیارت گاہ کا دروازہ کھلے۔ صبح گویا رہائی کی ساعت تھی۔ بعینہ جیسے موت صوفیائے کرام کے لیے رہائی کی گھڑی ہوتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں دوبارہ اپنے پیر و مرشد کے مزار کے دیدار سے مشرف ہونے کا موقع دیا جائے۔ ایک قتیلہ موقعیر پر حال طاری ہو گیا۔ وہ عشق کے نشے میں ڈوب کر ناچنے لگا۔

میرے دل کو چین آ گیا۔ میرا نقاب خاموش دعائیں مانگنے والے ہونٹوں پر پڑ گیا۔ دور دور سے چل کر اس جائے امن تک پہنچنے والے باقی تمام لوگوں سے ہم مختلف نظر آ رہے تھے۔ مجھے اپنے گردو پیش کا ہوش نہ رہا۔ میں نے عظیم صوفی کے مزار پر مصطفےٰ کی رہائی کی دعا کی۔ میں خود کو مجرم محسوس کر رہی تھی کہ اپنے لیے تو دعا مانگ لی اور مصطفےٰ کا خیال تک نہ کیا جو جیل میں پڑا ہے۔

ہم جی بھر کر موسیقی سے لطف اندوز ہوئے۔ ہم نے الن فقیر، عابدہ پروین، وحید اور اقبال جانڈیو کو سنا۔ زعفرانی چرغوں میں ملبوس سونگ ناچنے والوں کو ایک تارہ،

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کھرمتال اور مستی کی دھن پر گاتے اور چکر کھاتے دیکھا۔ حواس آسمان کی خبر لانے لگے۔ دو دن وجد کے عالم میں گزرے۔ وہاں جتنے بھی لوگ موجود تھے سب نے ہماری مدد کی اور دوستوں کی طرح پیش آئے۔ مجھے اشعار کا مطلب بتایا گیا اور میں موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے ان کی اسرار آمیز معنویت کو سمجھ گئی۔ دو دن کے بعد ہم بھٹ شاہ سے رخصت ہوئے۔ صفر کا چاند گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ کراچی واپس جاتے ہوئے کار یوسف صلاح الدین نے چلائی اور میں جے جے اور ایک مرد دوست کے ساتھ پیچھے بیٹھی اس بات کی شعوری کوشش کرتی رہی کہ جب کار کوئی موڑ مڑے تو میرا بدن ان دونوں میں سے کسی کے بدن سے نہ لگے۔ میری یہ کوشش ان کے لیے تفریح کا سامان بن گئی۔

نصی اور جے جے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے مجھے راضی کر لیا کہ میں بھی ان کے ساتھ لاہور چلوں۔ ایک اور ہی وضع کی زندگی کی جو جھلکیاں میں دیکھ چکی تھی وہ میرے تجسس کو بھڑکانے کے لیے کافی تھیں۔ یہ میری ہی عمر کے لوگ تھے۔ میری طرح ہی سوچتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں کوئی بالکل انوکھی عورت نہیں۔ عجیب عورت بھی نہیں۔ دنیا میں میری جیسی اور بھی عورتیں ہیں جنہیں دکھ اٹھانے پڑتے ہیں۔ وہ خاموشی سے دکھ نہیں سہتیں۔ اپنا ردعمل ظاہر کر کے رہتی ہیں۔ اپنی شادی کی وجہ سے میں بہت سی چیزوں سے بے خبر رہ گئی تھی۔ مصطفےٰ مجھے اپنی دنیا میں لے گیا تھا اور وہاں لے جا کر اس نے تمام کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔

یہ گروپ میرے خاندان کا نعم البدل ثابت ہوا۔ میں ایسے لوگوں سے ملی جنہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا تھا۔ ضروری نہیں کہ ایسی زندگی کو جس میں بہت جوکھم ہو یا جو قومی معاملات یا سیاست سے متعلق رہی ہو۔ مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ سیاست زندگی کا ایسا تجربہ نہیں جس کے بعد کسی اور تجربے کی گنجائش نہ رہتی ہو اگرچہ سیاست میں دوسرے طبقات اور واقعات سے دوچار ہونے کے ایسے مواقع ملتے ہیں جن کو زندگی کے کسی اور دائرۂ عمل میں رہ کر حاصل کرنے کی امیدِ عبث ہے۔ اس گروپ میں جتنے بھی لوگ تھے وہ سب اپنے اپنے طور پر زندگی کے عملی تجربات حاصل کر چکے تھے۔ ان سب کو ادبار اور کشمکش کے مختلف مراحل سے گزرنا پڑا تھا اور وہ ان آزمائشوں سے زیادہ مضبوط ہو کر ابھرے تھے۔ وہ ذہن رکھتے تھے۔ یہ ذہن ان کی زندگیوں کا تجزیہ کر کے اصلاح کا راستہ سجھا سکتے تھے۔ وہ سوچنے سمجھنے والے لوگ تھے۔ ان کے نقطۂ نظر سطحی نہ تھے۔ کھیل تماشے اور سیر و تفریح ان کے لیے جذبات کے نکاس کے ذرائع تھے۔ اس کھلنڈرے پن کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک کی زیادہ گہری اور کسی بڑے مقصد سے وابستہ ذات پر پردہ پڑا رہتا تھا۔ انہیں سیکھنے سے نفور نہ تھا۔ وہ آسانی

سے مطمئن ہو جانے والوں میں سے نہ تھے۔ میں بڑی آسانی اور بہت خوشی سے ان میں گھل مل گئی۔ انہوں نے مجھے اپنے گروپ میں شامل کر لیا۔ میں ہی وہ چوب پارہ تھی جو ان کے کج مج چوبی ٹکڑوں سے بنے معمے میں سے غائب تھا۔ میں خالی جگہ میں بالکل ٹھیک آ گئی۔ یا تقریباً ٹھیک آ گئی۔

لاہور کی رونقیں اپنے شباب پر تھیں۔ عالمی کپ کی دعوتوں کا زور شور تھا۔ سمجھا جا رہا تھا کہ پاکستان کپ جیت لے گا۔ ہم نے ویسٹ انڈیز کی زبردست ٹیم کو ابھی ابھی شکست دی تھی۔ میں نے نصی اور جے جے کا دامن تھام کر ان دعوتوں میں شرکت کی جو ہمارے فاتح کھلاڑیوں کے اعزاز میں دی جا رہی تھیں۔ ان کے بغیر اپنے طور پر کہیں جانے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دونوں میری خفیہ بیساکھیاں تھے۔ میں نے نوجوانوں اور جوانوں کی زندگی کا دوسرا رخ بھی دیکھا۔ میں نوجوان لڑکیوں سے ملی جو بہت ماڈرن اور بہت پر اعتماد تھیں اور اس بات پر شرماتی نہیں تھیں کہ دوسرے انہیں غور سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے بالکل خبر نہ تھی کہ نئی پاکستانی لڑکی نفسیاتی اور معاشرتی حجابات سے آزاد ہو چکی ہے اور چست جینز اور منی سکرٹ پہننے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی۔ مجھے یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ لڑکیاں اپنی ٹانگیں کھلی رکھتی ہیں۔ کسی اور کو ان باتوں سے وحشت نہیں ہو رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ایسی چیزیں دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہ وہ نسل تھی جو ضیاء کے دور میں بڑی ہوئی تھی۔ یہ نسل چے اور ماؤ اور سوئیکارنو پر جان نہیں دیتی تھی۔ یہ میڈونا، ایاکوکا اور ڈونلڈ ٹرمپ کی پرستار تھی۔ جدلیاتی مادیت کی جگہ مادہ پرستی لے چکی تھی۔ جو محروم تھے وہ سوزوکیوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور مفلسی سے مراد یہ تھی کہ آدمی کے پاس رہنے کا فلیٹ تو ہو مگر فلیٹ میں ایئرکنڈیشنر نہ لگا ہو۔ یہ شہر کا بالائی طبقہ تھا۔ افغانستان کی جنگ اور منشیات کے کاروبار میں اچانک بے پناہ اضافے کے اثرات چھن چھن کر نیچے تک پہنچ گئے تھے۔ نسلی خصوصیات اور امتیازات کے بارے میں کہا جانے لگا تھا کہ یہ تو لسانیات دانوں کے مطلب کی باتیں ہیں۔ میں نے ان لڑکیوں کو رقص گاہ میں ناچتے اور پھرکیوں کی طرح گھومتے دیکھا۔ ناچنے کے یہ انداز تازہ ترین پوپ ویڈیوز سے چنے گئے تھے۔ ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی میڈونائیں۔ "ہمیں بھی دیکھو ہمیں بھی چاہو" کہنے والی نسل۔

اتنی دیدہ دلیر بننے کا تو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی لیکن ان کے بارے میں کسی پاکستانی نقطۂ نظر سے فیصلہ دینا نہ چاہتی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ جو کچھ وہ کر رہی تھیں وہ مجھ سے خواب و خیال میں بھی نہ ہو سکتا تھا۔ میں کسی ایسے مرد کے ساتھ ناچ ہی نہ سکتی تھی جو میرا شوہر نہ ہو۔ ایک بار میں مصطفےٰ کے ساتھ ناچ کر سخت مشکل میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پھنس گئی تھی۔ تعلقات میرے لیے تقدیس کے حامل تھے۔ یہ لڑکیاں چاہتی تھیں کہ جو ہونا ہے آج ہی ہو جائے۔ کون فردا کا انتظار کرے۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ میں کسی اور زمانے میں سانس لے رہی تھی اور نئی نسل کسی اور زمانے میں۔ میں وقت کے کسی پیچاک میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

جو تضاد نظر آیا درحقیقت میں سب سے زیادہ اسی سے خوف زدہ ہوئی۔ میں جاگیر دارانہ نظام کے سائے میں جینے والی عورتوں کی زندگی کو اندر سے دیکھ چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم بیک وقت کئی صدیوں میں جی رہے ہوں۔ جدید جیٹ باش ٹولے سے تعلق رکھنے والیاں اس قدر آگے نکل چکی تھیں کہ ان کے سامنے دور دراز دیہی علاقوں میں رہنے والی عورتیں قصے کہانیوں میں ملنے والے کردار بن کر رہ گئی تھیں۔ اس نئے طبقے کو کیا خلوت اور کیا جلوت دونوں میں بدچلنی کی کھلی چھٹی تھی۔ پھر تعجب ہی کیا جو ان کی نظر میں حدود آرڈی نینس اور شریعت بل کوئی چیز نہ تھے۔

میں نے کوشش کی کہ عورتوں میں ہی اٹھا بیٹھا کروں۔ میں الگ تھلگ رہنے والی تماشائی تھی۔ مجھے اپنا کردار سجانے میں لطف آرہا تھا۔ کسی سرگرمی میں حصہ لینے کی کوئی خواہش مجھ میں نہ تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر مزہ آتا تھا کہ لوگ لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن جانتی تھی کہ میری زندگی نہیں میری زندگی اس سے کہیں زیادہ بھر پور تھی۔ میں اپنی نوجوانی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ایک بار پھر بائیس برس کی ہو جاؤں۔ لیکن میں نے آئینے میں اپنی طرف دیکھا تو وہاں مجھے پھرکیوں کی طرح گھومتی شکلیں نظر نہ آئیں۔ چونتیس برس کی ہو کر میں حقیقت میں اس تصور تک کو بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔ ایسی دعوتیں جن میں سو سو مہمان بلائے گئے ہوں محض جشن آرائیاں معلوم ہوتی تھیں۔ کسی سے جان پہچان کا موقع تک نہیں ملتا تھا۔ جیسے جاتے ویسے ہی لوٹ آتے۔ موسیقی بہت اونچے سُروں میں جاری رہتی اور اس کان پھاڑ شور میں گفتگو کرنا نہ کرنا برابر تھا۔ میں شور کا بہانہ بنا کر راز بھری سرگوشیوں والے کھیلوں کا مزہ لوٹنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتی تھی۔ میری نظر میں دعوت کا تصور یہ ہے کہ کھانا بیٹھ کر کھایا جائے اور سب کو ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے۔ تاہم میں ان پارٹیوں کے گلیمر سے محظوظ ہوتی رہی۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے ان میں شرکت کی۔

یاد آتا ہے کہ جن دنوں عالمی کپ کی وجہ سے ہر طرف کرکٹ کا تیز بخار پھیلا ہوا تھا مجھے یوسف کی حویلی جانے کا موقع ملا۔ وہاں کرکٹ کے عظیم کھلاڑی، عمران خاں سے ملاقات ہوئی جس کا ایک عالم پرستار ہے۔ میں کرکٹ کی شوقین نہ تھی۔ مجھے محسوس ہوتا

تھا کہ کرکٹ ضرور کوئی دانشورانہ کھیل ہو گا۔ آخر یہ صرف دانشوروں کے لیے ممکن ہے کہ پانچ دن تک اکٹھے رہیں اور پھر کسی فیصلے پر پہنچے بغیر اٹھ کھڑے ہوں۔ عمران خاں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ ہمارا تعارف کرایا گیا۔ اس پہلی ملاقات نے مجھ پر کوئی تاثر نہ چھوڑا لیکن جب اس سے واقفیت بڑھی تو میں اسے بہتر طور پر سمجھنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اصولوں کا بڑا پکا، بہت کھرا اور بہت راست باز ہے۔ میں نے دیکھا کہ پٹھان کی سچی اقدار اس کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ اس کی غیرت مندی اور جان لڑا کر مقابلہ کرنے کی عادت سے ملک کو بہت فیض پہنچا ہے۔

جب میں نے اندر قدم رکھا تو سارے نوجوان فرش پر دراز تھے۔ میرے داخل ہونے پر کسی نے اٹھنے کی زحمت نہ کی۔ یہ مجھے بہت عجیب لگا۔ میں ایک ایسی دنیا سے آئی تھی جہاں شرفاء ہمیشہ مجھ سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے میں کوئی بہت معزز خاتون ہوں۔ میری کبھی ایسے مردوں سے ملاقات نہ ہوئی تھی جو میرا خیر مقدم کرنے کے لیے اٹھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کریں۔ یہ نوجوان مرد اور عورتیں آدابِ محفل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

یوسف کو تو براہ راست کسی مغل منی ایچر تصویر سے نکال کر پیش کر دیا گیا تھا۔ بظاہر وہ وقت کے کسی اور دھارے سے بچھڑ کر ہمارے زمانے میں آنکلا تھا۔ اپنا ماضی وہ ساتھ لایا تھا۔ مستقبل کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ اس کا قائل تھا کہ کھانے ہوں تو اچھے سے اچھے، مشروبات ہوں تو اعلیٰ سے اعلیٰ۔ ماضی ہر طرف حال پر چھایا نظر آتا تھا جس سے عجیب سا ان مل بے جوڑ پن وجود میں آگیا تھا۔ وہ مرمریں تخت پر نیم دراز ہو کر منظر کا شاہانہ تحقیر سے جائزہ لیتا۔ خراماں خراماں پھرنے والی کنیزوں نے ایسی پیشوازیں اور چوڑی دار پاجامے زیب تن نہیں کر رکھے تھے جن سے بدن صاف دکھائی دے۔ انہوں نے منی سکرٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کے بال بنانے کے انداز مغل اور PUNK طرزوں کا آمیختہ تھے۔ یوسف پورم پور نواب دکھائی دیتا۔ ادھر وہ شاہی دربار کو ازسر نو تخلیق کر رہا تھا، اُدھر جمہوریت کی بحالی کے پوسٹر اس کی حویلی کے باہر دیواروں کو داغ دار کر رہے تھے۔

میری مبشر سے ملاقات ہوئی جو موبی کہلاتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو جتنے قوی تن ہوتے ہیں اتنے ہی خاموش رہتے ہیں۔ میں بتا سکتی تھی کہ وہ بڑا گہرا آدمی ہے، جیسا کہ کہاوت میں ہے کہ "ساکت پانی، گمبھیرتا کی نشانی"۔ ہم دونوں میں بڑی دوستی ہوگئی۔ ہماری خاموشیاں ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئیں۔

میں پہلی بار کرکٹ میچ دیکھنے گئی۔ نصی اور جے جے کو بڑا جوش چڑھا ہوا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں ان کے جوش کے حوالے سے میچ دیکھ رہی تھی۔ جب وہ اچھل کھڑے ہوتے اور داد دیتے تو میں بھی ویسا ہی کرتی اور جب وہ مغموم ہو کر بیٹھے رہتے تو میں بھی اپنے چہرے پر کوئی ملتی جلتی کیفیت طاری کر لیتی۔ مجھے یاد ہے کہ جب عمران سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ "میں نے دیکھا آپ نے کس طرح ویسٹ انڈیز کو اپنی بیٹنگ سے آؤٹ کر دیا۔" عمران نے چڑچڑے انداز میں اپنی مشہور آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس دن سے مجھ سے صرف ایک یہی حماقت نہیں ہوئی۔ میں نے موبی سے پوچھا کہ کیا وہ بھی کرکٹر ہے۔ جس ٹیم کے بارے میں ہر کوئی رطب اللسان تھا میں اس کے ارکان کو پہچانتی تک نہ تھی۔ میری زندگی، حالات میں تبدیلی لانے کی کوشش میں، کہیں اور ہی گزری تھی اور ادھر کرکٹ کے کھلاڑیوں کی یہ نسل سپر سٹاروں کا مرتبہ حاصل کر چکی تھی۔

میں نے اپنے نئے دوستوں کے درمیان خود کو محفوظ محسوس کیا۔ یہ لوگ مجھ سے میری خاطر ملتے تھے۔ مجھے کسی سیاست دان کی توسیع سمجھ کر ملنے نہ آتے تھے۔ میں نے اپنے دوست آپ چنے تھے۔ وہ مجھ پر مسلط نہیں کیے گئے تھے۔ یہ دوست میں نے اس وقت بنائے تھے جب مصطفیٰ میرے پاس نہ تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

عاصمہ جہانگیر کا خیال تھا کہ اگر میں نے بچوں کو ساتھ لے کر ملک چھوڑنے کی کوشش کی تو مصطفیٰ شاید حکم امتناعی حاصل کر لے اور انہیں باہر نہ جانے دے۔ میں نے طے کیا کہ بچوں کو لندن بھجوائے دیتی ہوں۔ اکیلے چلے جائیں۔ سوچا یہ تھا کہ ان کے جانے کے دو دن بعد میں بھی روانہ ہو جاؤں گی۔ میں نے لندن اپنی بہن منو کو فون کیا۔ مصطفیٰ کے پاس واپس آجانے کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ہوائی اڈے جا کر بچوں کو لے آئے اور دو دن انہیں اپنے پاس رکھے۔ اتنی دیر میں میں آپ لندن پہنچ جاؤں گی۔ منو نے حامی بھری اور بچوں سے دوبارہ ملنے کا موقع ہاتھ آنے پر بہت خوش ہوئی۔

فون کی گھنٹی بجی۔ منو بول رہی تھی۔ اس نے امی سے بات کی تھی اور امی نے کہا تھا کہ مجھ سے بالکل کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ بچوں کو لینے ہوائی اڈے نہ جائے۔ اگر اس نے امی کی حکم عدولی کی تو بچوں کو اگلے طیارے پر بٹھا کر پاکستان واپس بھیج دیا جائے گا۔ منو کہنے لگی کہ اس کے پاس امی کے حکم کی تعمیل کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ امی نے کہا کہ اس دفعہ بچوں کو اغوا میں نے کیا ہے! امی مجھے مصطفیٰ کی پاس لوٹ جانے کی سزا دینا چاہتی تھیں۔ ہمارے اس بیکار کے کھیل میں

بیچارے بچے ایک بار پھر مہرے بنے ہوئے تھے۔

میرے بچے طیارے پر تھے۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کس سے رابطہ قائم کروں۔ پریشانی کی مارے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لندن میں بہتیرے دوست موجود تھے لیکن میں ان میں سے کسی کو اس معاملے میں الجھانا نہ چاہتی تھی۔

میں نے منو کو فون کیا۔ اس سے کہا کہ وہ بچوں کو لینے ہوائی اڈے نہ جائے۔ "وہ خود ہی تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔ تم امی کو فون کر کے بتا دینا کہ بچے آپ ہی آگئے ہیں اور اب تم انہیں گھر سے نکالنے سے تو رہیں۔"

اس کے لیے وہ آمادہ ہو گئی۔ میں نے پی آئی اے کے منیجر کو فون کیا اور کہا کہ بچوں کو ٹیکسی دلا کر منو کے پتے پر بھجوا دیا جائے۔

لندن میں جن جن لوگوں کو میں جانتی تھی انہیں فون کرنا چاہا۔ کسی سے بات نہ ہو سکی۔ بیچارے بچے ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر اترے۔ وہ سہمے ہوئے تھے۔ رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ وہ اپنی خالہ کو ڈھونڈتے رہے جس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پی آئی اے کا منیجر ان کے پاس آیا اور انہیں لے جا کر، ٹیکسی میں بٹھا کر، چلتا کر دیا۔ وہ اس کاغذ کو جس پر منو کے گھر کا پتہ درج تھا اس طرح مضبوطی سے پکڑے بیٹھے تھے جیسے ان کی زندگی کا دارومدار اسی چٹ پر ہو۔ جیمز ایونیو میں انہیں منو کا مکان نہ مل سکا۔ ٹیکسی ڈرائیور جھنجھلا اٹھا۔ اس نے بیچارے ننھے ننھے بچوں کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ نصیبہ نے بعد میں مجھے بتایا کہ ان سب کی جان نکلی جارہی تھی۔ وہ ڈر رہے تھے کہ ٹیکسی ڈرائیور انہیں کچا چبا جائے گا یا اس سے بھی بدتر یہ کہ انہیں کسی بالکل انجانی جگہ اتار کر چلتا بنے گا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہر شے نامانوس معلوم ہو رہی تھی۔ بچوں کا کہنا ہے کہ ہیتھرو سے منو کے گھر تک کا سفر ان کے پاکستان آنے کے سفر سے کہیں زیادہ ڈراؤنا تھا۔ اس وقت کم از کم عربی تو ان کے ساتھ تھا۔ اس بار وہ بالکل اکیلے تھے۔

آخر کار مکان انہیں مل ہی گیا۔ منو انہیں اندر لے گئی۔ ان سب کو منو بہت اچھی لگتی تھی۔ منو نے ان کی آمد کی اطلاع دینے کے لیے امی کو فون کیا۔ یہ خبر سنتے ہی امی کا تو فیوز اڑ گیا۔ انہوں نے منو سے کہا کہ بچوں کو اگلی پرواز پر بٹھا کر کراچی روانہ کر دیا جائے۔ منو کے شوہر علی نے کہا کہ وہ ایسی بیہودہ اور سنگدلانہ حرکت میں ماں بیٹی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں نے اپنے خاندان کو ایک بار پھر بحران میں مبتلا کر دیا تھا۔ بچوں نے رات بھر منو کے ہاں قیام کیا۔ اگلی صبح امی نے منو کو فون کیا۔ وہ میرے بھائی، عاصم، سے بات کر چکی تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ بچوں کو فوراً گھر واپس بھجوا دیا جائے۔ منو پر بجلی گر پڑی۔ اس نے حواس باختہ ہو کر مجھے بار بار فون کیا۔ اس

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کو دی گئی ڈیڈلائن کا وقت ختم ہونے کو تھا۔ میں ذہنی طور پر بری طرح تھک چکی تھی۔
نصی نے اپنی بہن، چنی، سے کہا کہ بچوں کو اپنے گھر لے آئے۔ بیچاری چنی۔ وہ بوکھلا گئی۔ میرے خاندان کے نامعقول رویے کی لم کو پہنچنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ حیران تھی کہ امی کو میری بہن پر اتنا غلبہ حاصل ہے۔ منو اتنی زیادہ خوف زدہ تھی کہ ایک اصولی موقف پر بھی قائم نہ رہ سکی۔ اس کا شوہر بھی اتنا ہی حیرت زدہ اور پریشان تھا لیکن منو کا یہ خوف کہ امی کہیں اسے عاق نہ کر دیں ہر چیز پر غالب آگیا۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ امی نے اپنے نواسوں نواسیوں کو ایسی اذیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کے اس فعل کو کسی دلیل کی رو سے حق بجانب قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔
چنی کے اپنے بھی بچے تھے۔ اسے کالج جانا ہوتا تھا اور وہ انہیں اکیلے چھوڑ کر نہ جا سکتی تھی۔ میں نے پاکستانی سفارت خانے سے ایک بہت باکمال خاتون، منصورہ، کا بندوبست کر دیا۔ منصورہ نے ازراہ کرم دن کے وقت بچوں کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لی۔ نصی کی امی بھی میرے بچوں کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آئیں۔ میں کبھی بھول نہیں سکتی کہ میں انہیں جانتی تک نہ تھی اور میں نے ان پر اتنا بوجھ ڈال دیا۔
میں ننھے حمزہ کو ساتھ لے کر لندن پہنچی۔ اب بچے پھر میرے پاس تھے۔ میں اپنے اپارٹ منٹ میں منتقل ہو گئی۔ طے کیا کہ انہیں انگلینڈ میں کسی بورڈنگ سکول میں داخل کرا دینا چاہیے۔ میں نے کینٹ میں ایک خوبصورت سکول تلاش کر لیا جسے اسلامی خطوط پر چلایا جارہا تھا۔ ایک لبنانی اس کا مالک بھی تھا اور ناظم بھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ مصطفٰے اپنے پرانے دلائل استعمال کرے اور بچوں کو اس بہانے واپس بلا لے کہ انہیں مغرب کے اخلاق باختہ طرز زندگی سے دوچار ہونے سے بچانا مقصود ہے۔
مجھے فرصت ہی فرصت تھی۔ یہ اپنے حالات اور معاملات کا جائزہ لینے کا زمانہ تھا۔ میں نے تصویریں بنانی شروع کر دیں۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں مغموم تھی اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ مجھے یہ احساس جرم ستا رہا تھا کہ ایک قیدی کو اپنے حال پر چھوڑ کر چلی آئی ہوں۔ جب تصور کرتی کہ وہ اکیلا قید خانے میں بند پڑا ہے تو راتوں کی نیند اڑ جاتی۔ اسے چھوڑ کر چلے آنے کا کوئی معقول جواز میرے پاس نہ تھا۔ مجھے یہ بہت ناگوار گزرتا تھا کہ وہ تو پہلے ہی پچھڑ چکا تھا اور اوپر سے میں اسے ٹھوکریں ماروں۔ یہ میرے مزاج کے خلاف تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ بے سہارا ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ میری جگہ کسی اور عورت کو لے آئے۔ کوئی بیوی جو اس سے ملنے آسکتی ہو۔ یہ سوچ کر میری طبیعت خراب ہونے لگتی کہ میں ایک زبوں حال مرد سے لڑتی رہی ہوں۔ مجھے دکھ یہ تھا کہ مصطفٰے کو چھوڑ کر بھاگ آنے

بچی کے ساتھ جس نے میری زندگی بدل دی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نیشنل پیپلز پارٹی کی کنونشن 1984ء میں غلام مصطفےٰ جتوئی صاحب کے ساتھ

میری کامیاب بھوک ہڑتال کے بعد جیل میں ایک ملاقات

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے لیے جو وقت میں نے چنا تھا وہ غلط تھا۔ فرار ہونے کی وجوہ غلط نہ تھیں۔

میری شخصیت میں تبدیلی آچکی تھی۔ مجھے ہر طرف آنکھیں نظر آنے لگیں۔ کھوکھلی بے جان آنکھیں۔ غصیلی آنکھیں۔ للکارنے والی آنکھیں۔ سہمی سہمی آنکھیں۔ آنکھیں جو خوابوں کا ذائقہ تک بھول چکی تھیں۔ کہتے ہیں کہ آدمی کی آنکھیں اس کے تمام اجتماعی تجربات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ وہ ایک طرح کا ریکارڈ ہیں۔ ایک مسلسل آئینہ جس پر یکے بعد دیگرے تصویر پر تصویر چھپتی رہتی ہے۔ یہ آنکھیں لندن میں میرے فلیٹ میں میرا پیچھا کرتی رہیں۔ وہ مجھے استقامت کی کمی کے طعنے دیتیں۔ مجھے چڑاتیں کہ میں نے ان سے منہ موڑ لیا ہے۔ میں ایک کام ادھورا چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ ان کی امیدیں جونکوں کی طرح مجھے چمٹی ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے بے وفائی کی تھی۔ میں ان کی جدوجہد کا حصہ بن چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ان کے حالات بہتر بنائے جاسکتے ہیں۔ ان کے افلاس، ان کی خستہ حالی اور غربت کے ہاتھوں تذلیل کو میری خطابت پردازی کے لیے محض خام مواد کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ مصطفیٰ کھر میرا شوہر نہ رہا تھا لیکن وہ اب بھی میرا قائد تھا۔ اس کے وژن کو میں اپنے میں جذب کر چکی تھی۔ یہ اس کا خواب تھا جسے میں حقیقت میں بدلنے کی خواہاں تھی۔ اسے میری ضرورت تھی۔ میں تصور کرتی کہ وہ اکیلا پڑا ہے، ٹوٹ پھوٹ چکا ہے اور نومیدی کا شکار ہے۔ موجودہ بے بسی کی حالت تک وہ اپنے مزاج کی وجہ سے پہنچا تھا۔ اس نے اس وقت مجھے دھکیل کر پرے کر دیا۔ جب اسے اپنا مشن پورا کرنے کے لیے میری ضرورت تھی۔ میں تاریخ میں اپنا نام ایسی عورت کے طور پر درج نہ کرانا چاہتی تھی جس کی وجہ سے ایک خواب ادھورا رہ گیا۔

میری پینٹنگز نے مجھے راہ دکھائی۔ میں تقریباً بے خودی کے عالم میں کینوس پر اپنے ان تجربات کو ازسر نو تخلیق کرتی رہی جو دنیا کے پسے اور کچلے ہوئے انسانوں کے درمیان رہ کر مجھے حاصل ہوئے تھے۔ جب میں تذبذب کے متلاطم پانیوں میں سفر کر رہی تھی تو فیض احمد فیض کی انسان دوست شاعری نے میری لیے چپوؤں کا کام کیا۔ ان کے لفظوں نے انسانی شکلیں اختیار کر لیں۔ برش سے کھینچی ہوئی ہر لکیر مجھے اس فیصلے سے قریب تر لاتی گئی کہ مجھے لوٹ جانا چاہیے۔

فیض نے اپنا شاہکار لکھا تھا "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ۔" یہ نظم خالص جدلیات ہے۔ نصف اول عشقیہ نظم ہے۔ اس میں عشق کی اس قوت کا ذکر ہے جس کی زد میں آکر سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ عاشق دنیا سے منہ موڑ چکا ہے اور اسے اپنے محبوب کے سوا کسی چیز کا ہوش نہیں۔ نظم کا نصف

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

آخر سیاق و سباق کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں حسن کا سودا ہوتا ہے اور فریب نظر کے کھیتوں میں بھوک اگتی ہے، محبت کیا معنی رکھ سکتی ہے۔ "لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے/اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے/اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔"

یہ مصرعے مجھے اپنی روداد معلوم ہوئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ اپنے ذہنی سکون کی خاطر میں نے عوام کی خوشیوں کو بیچ کھایا ہے۔ زندگی کی طرف کھلنے والے دروازے بند کیے جاسکتے تھے۔ میں اپنے ریشمی خول میں محفوظ و مامون تھی لیکن -- وہی "اور بھی دکھ ہیں"۔ میں نے گلی کوچوں میں پلنے والے میلے کچیلے اور خراب و خستہ لڑکوں کی تصویریں بنائیں جن کا ماضی، حال اور مستقبل گندگی کے ایسے ڈھیروں سے وابستہ تھا جہاں کوڑا کرکٹ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی پسلیاں سوکھ کر کانٹا جسم پر منڈھی ہوئی کھال کی بندشوں سے باہر آنا چاہتی تھیں۔ میں نے ان ماؤں کے چہروں پر طاری کیفیتوں کی تصویر کھینچی جن کی چھاتیاں سوکھ گئی تھیں۔ میں نے اپنی تصویروں کو ایسے بوڑھے مردوں اور عورتوں سے بھر دیا جو ایک گلی میں، تھکن سے چور ہو کر، سر جھکائے بیٹھے تھے۔ امید کسی متلون سورج کی طرح ان کے قریب سے گزر گئی تھی۔ رنگ کالے، شتری اور کتھئی تھے۔ شکلیں میری طرف تک رہی تھیں۔ وہ تقاضا کرتی معلوم ہوتیں۔ "لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے/اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا/اور بھی دکھ ہیں۔"

فیض کی ایک اور نظم دبے پاؤں میرے کینوس تک چلی آئی۔ "نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں/چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔"

میں نے ایسی عورتوں کی تصویریں بنائیں جن کے سر جھکے ہوئے تھے۔ جن کے بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے وہ ماتم کر رہی ہوں۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے لیے فیض نے شعر کہے تھے، جن کے لیے آنسو بہائے تھے۔ عام لوگ جن کی محدود سی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ وہ میرے ذہن میں سرایت کر گئے اور پھر کینوس پر ایک واضح پیغام لے کر نمودار ہوئے۔ تمہاری سرزمین، اس کی سڑکیں، اس کے گلی کوچے، تمہیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ تمہیں اپنی جان اس سرزمین پر، ان لوگوں پر، وارنی پڑے گی۔ خاموشی کو ہرگز پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔ خوف کے مقابلے میں ڈٹ جانا ضروری ہے۔

جیل کی تصویریں سیل رواں بن کر میرے ذہن میں اُمڈ آئیں۔ میں نے جیل میں ایسی عورتیں دیکھی تھیں جن کے ساتھ جیل کے عملے نے زنا بالجبر کیا تھا۔ خوف

زدہ جیلر انہیں اسقاط حمل کے لیے لے جاتے تھے کیونکہ وہ اپنے مجرمانہ افعال کے تمام شواہد مٹا دینا چاہتے تھے۔ ان عورتوں کو معصوم جنینوں کے قتل کی کوششوں کو برداشت کرنا پڑا تھا۔ بعض کے بچے پیدا ہو گئے تھے۔ کھوٹ ملے انصاف کی ناجائز اولادیں۔ میں نے ان کو پینٹ کیا۔ ماں بچہ دونوں سلاخوں کے پیچھے۔ رہائی سے خائف کیونکہ ان کے بارے میں باہر کی دنیا کا رویہ مخالفانہ بھی تھا اور غیر یقینی بھی۔

تصویریں بنائیں تو مجھے پتہ چلا کہ میں پاکستان سے اپنے رشتے منقطع کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہوں۔ اپنے ماضیٔ قریب سے میرا تعلق بدستور قائم تھا۔ عوام کے روبرو اپنی غیر حاضری کا جواز پیش کرنا مجھ پر لازم تھا۔ میری طرف سے اس بارے میں کوئی بیان آنا چاہیے تھا۔ اس کے لیے مجھے کسی پلیٹ فارم کی ضرورت تھی۔ مصطفٰے کھر مجھے ایسا پلیٹ فارم فراہم کر چکا تھا۔ میں بذات خود ابھی اس طرح کا کام انجام دینے کے لیے لیس نہ تھی۔ عوام کے درمیان میری جو بھی حیثیت تھی صرف مصطفٰے سے میرے رشتے کی بنا پر تھی۔ مجھ میں ابھی اتنا حوصلہ نہ تھا کہ اپنے لیے کوئی مقام پیدا کرنے کی کوشش کر سکتی۔ میں مصطفٰے کی سیاست پر یقین رکھتی تھی۔ اس کے آج پر یقین رکھتی تھی۔ اس کا سیاسی حال قابلِ احترام تھا۔ جو سیاست مجھے آتی تھی میں نے اسی سے سیکھی تھی۔ مجھے اپنے محرکات سے موقع پرستی کی بُو آئی۔ لیکن کاز کے لیے میرے خلوص نے مجھے یقین دلایا کہ میں صحیح راستے پر ہوں۔ مصطفٰے ہی وہ شخص تھا جس کا سہارا لے کر میں بلندیوں کو چھو سکتی تھی۔ جب وہ جیل سے باہر آئے گا تو میں اسے اپنی اہلیت ثابت کرنے کا موقع دوں گی۔ میں قید و بند سے اسے چھڑانے کی کوشش میں ہاتھ بٹاؤں گی۔ مجھے واپس جانا ہی پڑے گا۔ سیاست کا دل فریب گیت مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ میں نے خود کو ایک کمزور مستول سے، یعنی اپنے بارے میں خوش گمانیوں کے مستول سے، باندھ رکھا تھا۔ مجھے یاد آگیا میں نے اس کا ساتھ نباہنے کا وعدہ کیا تھا۔

ایک بار پھر میں سامان پیک کرنے میں جت گئی۔ پرچھتی سے کیبن ٹرنک اتارے گئے۔ میں نے بچوں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا۔ سکول میں ان کا دل نہ لگا تھا۔ ان کو پاکستان کی یاد ستا رہی تھی۔ انہیں اپنے والد کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ بورڈنگ سکول سے انہیں نفرت تھی۔ ہم پاکستان روانہ ہو گئے۔

مصطفٰے کی حالت خستہ تھی۔ وہ روتا رہتا۔ کوئی اسے ڈھارس دینے والا نہ تھا۔ اس کا وزن خاصا کم ہو گیا تھا۔ اسے عدالت میں پیش ہونا پڑتا۔ لیاقت باغ فائرنگ کے مقدمے کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ میں نے بچوں کو اس سے ملنے بھیجا۔ پریس کے مزے ہو

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گئے۔ اخباروں میں "شیر" اور اس کے بچوں کے آنسوؤں بھرے ملاپ کی تصویریں چھپیں۔

اگلے دن میں مصطفیٰ سے ملی۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ ہم نے دوبارہ تعلق استوار کرنے کے موضوع سے احتراز کیا۔ دونوں بہت محتاط تھے۔ میں نانی اماں کے ساتھ لاہور واپس آگئی۔ نانی اماں میری زندگی کے بارے میں بہت فکر مند تھیں جس میں کسی قسم کا استحکام پیدا ہی نہ ہو رہا تھا۔ اس بارے میں بھی کچھ زیادہ پُر اعتماد نہ تھیں کہ میں جو قدم اٹھانے والی ہوں وہ صحیح ہے۔ میرے بچوں کو یقین تھا کہ میں صحیح قدم اٹھا رہی ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے والدین میں صلح صفائی ہو جائے۔

نصی اور جے جے یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ میں مصطفیٰ کے پاس واپس جارہی ہوں۔ وہ سمجھ گئے کہ میں ایسا قدم کیوں اٹھانے والی ہوں۔ میں مصطفیٰ سے ملنے گئی۔ وہ کھانا پکا رہا تھا۔ اس نے مجھے پلاؤ اور تیتر کھلائے۔ ہم بات کرتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ مصطفیٰ نے پہل کی۔ "آؤ اپنی شادی کو ایک موقع اور دیتے ہیں۔ میں تمہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم پر بھی لازم ہے کہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو ہوا سو ہوا۔ آؤ اسے بھول جائیں۔"

مجھے بتانے لگا کہ جتنے عرصے میں اس سے الگ رہی وہ اپنی جان سے بیزار رہا۔ وہ جانماز پر بیٹھا روتا رہتا۔ وہ سسکیاں لیتا اور زور زور سے گریہ وزاری کرتا۔ یہ دیکھ کر کہ اس جیسا دلیر آدمی بھی رونے دھونے پر مجبور ہو گیا ہے باہر تعینات پہرے دار اور خدمت گزار غم زدہ ہو جاتے باہر کھڑے کھڑے وہ اس کے حال پر آنسو بہاتے۔ مصطفیٰ نے کہا کہ اس نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے ہولناک برتاؤ کرتا رہا ہے۔ اپنے پُرتشدد رویے کی یاد اس کے حق میں عذاب بن گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرا چہرہ اکثر اسے خواب میں دکھائی دیتا۔ اس کے تشدد کی وجہ سے سہمی سہمی اور بت بنی نظر آتی۔ خواب میں نظر آنے والے چہرے اسے عذاب دے رہے تھے۔ اس نے عدیلہ والے واقعے کا ذکر کیا۔ اسے یقین تھا کہ اس میں شیطان حلول کر گیا تھا۔ اللہ نے اسے سزا دی تھی۔ اب وہ جیل میں تھا اور میں آزاد۔ اس نے یاد کیا کہ میں کس طرح اپنے کمرے میں بند، جانماز پر بیٹھی، آنسوؤں سے نمکین اور تربتر قرآن مجید کو سینے سے لگائے، اللہ کے حضور میں آنسو بہاتی رہتی تھی۔ اب اس کے پاس اس کوٹھری اور کلام الہٰی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ میں اس سے جدا ہو چکی ہوں۔ وہ پریشان تھا۔ میں جوان اور دلکش تھی۔ مجھے بڑی آسانی سے کوئی اور مرد مل سکتا تھا اور میں نئے سرے سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ ایسی زندگی جس میں مصطفیٰ کھر کی طرف سے دی گئی اذیتوں کا

کہیں پتہ نہ ہو۔ اس نے میری آزادی کے دنوں کے قصے سنے تھے۔ اس کا حسد دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ عدیلہ والے معاملے میں اس نے میرے جذبات کو کس طرح ٹھیس پہنچائی تھی، مجھے کتنا دکھ دیا تھا۔ اس پر انکشاف ہوا تھا کہ ہمارا گھر دراصل میرے لیے جیل تھا۔ میری تنہائی اس کی قید تنہائی سے مشابہ تھی۔ یہ ایک راست بازانہ انداز تھا۔ وہ اپنا احتساب آپ کرنے میں مشغول تھا۔ ہمارے درمیان کشیدگی کی وجوہ اس پر واضح ہو چکی تھیں۔ اور وہ اپنے رویے کی تلافی کے لیے تیار تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ پہلے جیسی حرکتیں نہیں کرے گا۔ ہم نے صلح کر لی۔

میں پُر اعتماد تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں دنیا اور پریس کو بدل سکتی ہوں۔ میں ایسا بے لچک رویہ اپنانے کے حق میں نہ تھی جس کا مقصد صرف اپنے امیج کو تحفظ دینا ہو اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ان باتوں کو جو میرے خیال میں صحیح ہوں، قربان کر دیا جائے۔ مجھ میں اپنی غلطیاں تسلیم کرنے کی جرأت تھی۔ جو تکلیف تھی سو میرے حصے میں آئی تھی۔ میں نے اپنے شوہر کو چھوڑتے وقت یہ تک نہ سوچا تھا کہ اس بارے میں عوام کس قسم کی رائے ظاہر کریں گے میں دوسروں کی آراء کے خوف کو اپنے فیصلوں پر اثر انداز نہ ہونے دوں گی۔ لوگ جو کچھ سوچ رہے تھے وہ موقع محل سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا۔ میں ان کے سامنے وضاحتیں پیش کرنے کو تیار نہ تھی جب اخبار والوں نے کہا کہ میں اپنے متلون طرز عمل کا جواز سامنے لاؤں تو مجھ میں اتنا اعتماد آ چکا تھا کہ میرے جواب میں شبہے کی رمق تک نہ تھی۔ میں نے کہا۔ "چھوڑنے کا فیصلہ بھی میرا تھا اور لوٹ آنے کا فیصلہ بھی میرا ہے۔ میں اسی جوش و خروش سے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے مہم جاری رکھوں گی۔" میرا کہا مان لیا گیا۔ میں نے بات جو انتہائی اعتماد سے کہی تھی۔ یہ نکتہ میں نے مصطفیٰ سے سیکھا تھا۔ احمقانہ انداز میں ہر وقت ایک ہی بات پر اڑے رہنے سے متضاد باتیں کرنا بہتر ہے۔ غلطیاں تسلیم کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ میں تہیہ کر چکی تھی کہ مصطفیٰ کو رہا کرانے کی کوشش پورے خلوص سے جاری رکھوں گی۔ اگر وہ رہنمائی کرنے کے قابل ثابت نہ ہوا تو میں اس کا قبلہ درست کرنے میں مدد دے سکتی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مصطفیٰ کو ہمیشہ میری موجودگی کا احساس رہے گا اور وہ اس خیال سے کہ کہیں میں سیاست کی طرف سے بد دل نہ ہو جاؤں، جوش میں آ کر شاید وہ کچھ کر دکھائے جس کا اسے دعویٰ ہے۔ میں اپنے احساسِ جرم کو دھو چکی تھی۔

میں نے اپنی دوستیاں قائم رکھیں۔ مصطفیٰ چاہتا تھا کہ میں اس کے بغیر اپنے دوستوں سے نہ ملوں۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت ماڈرن اور روایتی اقدار سے محروم

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہیں۔ بنیادی طور پر وہ خود عدم تحفظ کے احساس کا مارا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے جو دوست بنائے ہیں وہ ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تمہارے دوستوں کی کوئی جڑیں نہیں اور معاملات کو وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو ان جیسوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

اڈیالا جیل میں میری سیاسی تعلیم کا پوری سنجیدگی سے آغاز ہوا۔ لگتا تھا وہ کوئی یونیورسٹی ہے جہاں میں ہر ہفتے اپنے ٹیوٹوریل کے لیے جاتی ہوں۔ پریکٹیکل عوام کی معمل گاہ میں کرنے پڑتے تھے۔ میڈیا میری ہر چال کا جائزہ لے کر مجھے کامیاب یا ناکام قرار دیتا۔ مصطفیٰ نے مجھے ہر بات کا سبق دیا۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ میں اس پر یقین لے آؤں۔ اس نے میری حوصلہ افزائی کی کہ میں سوال پوچھوں اور میں نے محسوس کیا کہ وہ جوابوں کو پہلی بار تشکیل دے رہا ہے۔ اچھے طالب علم کی طرح میں اسے اکسا اکسا کر غور و فکر کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے بہترین رویہ اپنائے رکھا۔ وہ مکمل شوہر اور مکمل باپ تھا۔ مکمل رہنما تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جسے میں اپنا قائد تسلیم کروں اس کے لیے مثالی انسان ہونا کتنا اہم ہے۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ سیاست اور آدرش پسندی کے لبھاؤ نے مجھے واپس آنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ میری اشتہا کو بڑھاتا رہا۔

تاج الملک کے گھر کی انیکسی میرے حوالے کر دی گئی اور میں نے اسے دفتر میں تبدیل کر لیا۔ این پی پی کے کارکن جوق در جوق میرے پاس آنے لگے۔ پارٹی کو ایسا مرکزی نقطہ مل گیا جس کی اسے انتہائی شدید ضرورت تھی۔ جیسا کہ مصطفیٰ نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کارکن چوہدری حنیف اور چوہدری ارشاد سے بدظن ہو چکے تھے۔ ان کے بارے میں لچر سے لے کر زیادہ سنجیدہ نوعیت کی طرح طرح کی کہانیاں سننے میں آ رہی تھیں۔ تمام کارکن میرے گرد جمع ہونے شروع ہو گئے۔ مجھے کسی ایسے آدمی کی ضرورت پڑی جو تجربہ کار بھی ہو اور وفادار بھی۔ میں نے ساتھ مل کر کام نمٹانے کے لیے ملتان سے میاں ساجد پرویز کو بلا لیا۔ اسے 1967ء سے بھٹو صاحب اور مصطفیٰ کے ساتھ کام کرنے کا جو تجربہ تھا وہ اس مرحلے پر میرے لیے بے بہا ثابت ہوا۔ ساجد وہاں میری رہنمائی کرنے اور مصطفیٰ کی چالوں گھاتوں پر عمل درآمد میں میرا ہاتھ بٹانے کے لیے موجود تھا۔ وہ سارے وقت میرے پاس رہا۔ میں چوہدری مختار اور رانا ایوب کو بھی تنظیم میں لے آئی جنھوں نے سیاست کا درس بطور طالب علم رہنما حاصل کیا تھا۔ میں انہیں اس وقت سے جانتی تھی جب میری مصطفیٰ سے نئی نئی شادی ہوئی تھی۔

ہم نے این پی پی کے ان ارکان سے رابطہ کیا جو مالدار تھے۔ ہم انہیں ایسے پوسٹر

چھپوا کر دینے پر آمادہ کرنا چاہتے تھے جن میں مصطفیٰ کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہو۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ مصطفیٰ کی رہائی کے لیے میڈیا میں مسلسل مہم چلانے کا وقت آ پہنچا ہے۔ ان رہنماؤں کی طرف سے دیے گئے اشتہار اخباروں میں شائع ہوئے۔ مصطفیٰ کے کاز کو زندہ رکھنا اہم تھا۔

کارکنوں میں میری روز افزوں مقبولیت بعض رہنماؤں پر گراں گزری۔ وہ میرے اور مصطفیٰ کے بارے میں افواہیں اڑانے لگے۔ انھوں نے کارکنوں سے کہا کہ میرے گرد جمع نہ ہوں کیونکہ مصطفیٰ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔ انھوں نے مجھ پر نکتہ چینی کی کہ میں مصطفیٰ کو چھوڑ کر چلی گئی تھی اور الزام لگایا کہ میں فوج سے ساز باز کر رہی ہوں تاکہ مصطفیٰ ساری عمر جیل ہی میں سڑتا رہے۔ "وہ چاہتی ہے کہ مصطفیٰ کھر مر جائے۔" انھوں نے کہا۔ کارکن پھر بھی میرے پاس آتے رہے۔ جب میں مصطفیٰ کو چھوڑ کر چلی گئی تھی تو انہیں خاصا صدمہ پہنچا تھا۔ ان میں سے بعض کو اب بھی میری نیت پر شک تھا۔ رہنماؤں نے شکوک کی فصل بونے کے لیے زرخیز خطۂ زمین چنا تھا۔ میری توقیر اور اہمیت گھٹانے کی اس سازش سے مصطفیٰ کو مطلع کر دیا گیا۔ اس نے بیان جاری کیا۔ "میری بیوی میری نمائندگی کر رہی ہے۔ یہ وہی کچھ کہتی اور کرتی ہے جو میں چاہتا ہوں۔"

میرے حریفوں کا منہ بند تو ہو گیا مگر وہ زیادہ دیر چپ نہ رہے۔ وہ میری روز افزوں طاقت سے خائف تھے۔ ان کے حملوں نے ثابت کر دیا کہ وہ سنجیدگی سے یہ سمجھتے ہیں کہ میری وجہ سے ان کے اقتدار کی اساس خطرے میں پڑ گئی ہے۔

مصطفیٰ کے بھائی بھی میری سیاست آرائی کے خلاف تھے۔ مرتضیٰ کھر جونیجو کی حکومت میں قومی اسمبلی کا رکن تھا۔ ربانی کھر بھی پارلیمنٹ کا رکن اور میاں نواز شریف کا ساتھی تھا۔ غلام عربی این پی پی میں تھا اور اس سے میری دوستی قائم رہی۔

میں نے اپوزیشن کے رہنماؤں سے ملنا شروع کیا تاکہ ان سے کہوں کہ وہ مصطفیٰ کو رہا کرنے کا تقاضا کریں۔ ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں نے 1985ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور وہ پارلیمنٹ سے باہر تھیں۔ ملک میں حقیقی اپوزیشن انہیں جماعتوں پر مشتمل تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ سیاسی قیدیوں کے مسئلے پر ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں کو سخت رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ان قیدیوں کو چھڑانے کی کوشش کرنا ان کا اخلاقی فرض تھا۔ مصطفیٰ سیاسی قیدی تھا۔ وہ جمہوریت کی بحالی اور مارشل لا اٹھائے جانے کے لیے بڑی کٹھن جنگ لڑتا رہا تھا۔ اسے جلاوطن ہونا پڑا تھا اور فوجی عدالت کی طرف سے بحال رکھی ہوئی سزا کی وجہ سے جیل میں پڑا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

جن اپوزیشن رہنماؤں سے میں ملی ان میں سے بیشتر مجھ سے بہت خوش اخلاقی اور تلطف سے پیش آئے۔ ان تمام باتوں سے جو میں نے ان سے کیں انھوں نے اثر قبول کیا لیکن ان میں سے کسی نے مدد کرنے میں زیادہ تردد سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے بیانات بے شک جاری کیے جنھیں برسر اقتدار سیاست دانوں اور جنرلوں نے حقارت سے نظر انداز کر دیا۔

جے یو آئی کے سربراہ، مولانا فضل الرحمن، سے میری ملاقات یادگار ثابت ہوئی۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ جوان نکلے۔ میں نے ان کے دفتر میں قدم رکھنے سے پہلے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ صحیح قسم کا لباس پہنے ہوئے ہوں اور میرے سر پر دوپٹہ ہے۔ مجھے اس امر کا شدت سے احساس تھا کہ میں مصطفیٰ کی ناموس ہوں اور کسی مولانا کی خدمت میں حاضر ہو رہی ہوں۔ وہ انتہائی احترام سے پیش آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں بیان دیں اور مصطفیٰ کے لیے ان سے جو بن پڑے وہ کریں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ مولانا صاحب چاہتے تھے کہ میں ان کے اہلِ خانہ سے ملاقات کروں۔ جب میں ان سے رخصت ہو کر زنان خانے میں جانے لگی تو مولانا نے کہا۔ "آج مصطفیٰ صاحب کو ایسی بیوی کی ضرورت ہے جو ان کا ساتھ دے۔ اگر آپ ان کے لیے مسائل پیدا نہ کریں تو وہ آزمائش کے اس دور کو کہیں زیادہ آسانی سے برداشت کر لیں گے۔" انھوں نے کہا تو یہ سنجیدگی سے اور تاثر یہ دینا چاہا کہ وہ مذاق کر رہے ہیں۔

میں اندر پہنچی جہاں ان کی دونوں بیویوں نے میرا استقبال کیا۔ دونوں نے بالکل یکساں لباس پہن رکھے تھے۔ مجھے ان کی زندگیوں کے بارے میں بڑا تجسس تھا۔ ان خواتین کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ مولانا نے وہ طعن آمیز جملہ کیوں کہا تھا۔ میں انھیں بہت ہی آزاد عورت معلوم ہوئی ہوں گی۔ میں اپنے شوہر پر مقدمہ دائر کر چکی تھی۔ میں نے پولیس سے کہا تھا کہ اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے جائیں۔ میں تین مرتبہ طلاق حاصل کرنے کے لیے درخواست دے چکی تھی۔ میری فوراً سمجھ میں آگیا کہ عورتوں کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے۔ انھیں میرے بارے میں بہت کم معلوم تھا۔ ان دونوں خواتین کو، جنھوں نے یکساں لباس پہن رکھے تھے، اگر ویسی زندگی جھیلنی پڑتی جیسی میرے حصے میں آئی تھی تو وہ شاید اپنے میاں کا اس طرح ساتھ نہ دے پاتیں جیسے میں دے رہی تھی۔

نوابزادہ نصر اللہ نے میرے خیالات کی سب سے زیادہ پذیرائی کی اور اپنی بساط سے بڑھ کر مجھے مدد دی۔ ائیر مارشل اصغر خاں نے اپنا مافی الضمیر بڑی عمدگی سے بیان کیا اور بہت دل آویز شخصیت ثابت ہوئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لیے ایک تحریک چلانے کا منصوبہ تیار کر رہی ہوں۔ ان کا احساس تھا کہ ایسی تحریکوں کو شروع کرنا اور جاری رکھنا بہت مشکل ہے! انھوں نے یقین دلایا کہ مجھے ان کی اخلاقی حمایت حاصل رہے گی۔

مجھے زندگی میں جو صبر آزما تجربے ہوئے ہیں ان میں سے ایک منصورہ میں جماعت اسلامی کے امیر سے میری ملاقات ہے۔ اگر یہ ملاقات صبر آزما ثابت ہوئی تو اس میں میاں طفیل کا کوئی قصور نہ تھا۔ میں ان کے سامنے خود کو مجرم محسوس کر رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ میاں طفیل کی انتہا سے زیادہ رسوائی اور تذلیل کا حکم خود مصطفیٰ کھر نے دیا تھا۔ میاں طفیل کے ساتھ جیل میں وہ سلوک کیا گیا جو صرف چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ ان کو پہنچائی جانے والی اذیت اتنی ہولناک تھی کہ اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ خصوصاً ایک عورت کے لیے تو بہت مشکل ہے۔

مصطفیٰ کے علم میں تھا کہ جماعت اسلامی جنرل ضیاء کے بہت قریب ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جنرل ضیاء کو نظریاتی گولا بارود جماعت کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے کا ایک اور عنصر یہ امر تھا کہ میاں طفیل جنرل ضیاء کے عزیز بھی تھے۔

میں جانتی تھی کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ جو صاحب میرے سامنے بیٹھے تھے وہ مجھے معاف کر کے خدا رسیدہ ہونے کا ثبوت بھی دے سکتے تھے یا مجھ سے انتقام لے کر اپنی حمیت کو برقرار بھی رکھ سکتے تھے۔ میں ان سے صرف یہی التجا کر سکتی تھی کہ ہمیں معاف کر دیا جائے اور ہمارے لیے کچھ کیا جائے۔ مجھے لگا جیسے کوئی چھچھوری حرکت کر رہی ہوں اور احتیاط سے چنے ہوئے الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت تھوڑی بہت پُر وقار نظر آنے کی جان توڑ کوشش کرتی رہی۔ "میں یہاں مصطفیٰ کی طرف سے آئی ہوں۔ اسے پتہ ہے کہ اس کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں۔ آج اس نے اپنی بیوی کو اپنی ناموس کو آپ کے پاس بھیجا ہے کہ..." میاں طفیل نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ کہنے لگے کہ وہ بات سمجھ گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ مصطفیٰ سے کوئی عداوت نہیں رکھتے لیکن انھیں دکھ یہ ہے کہ مصطفیٰ اور اس جیسے لوگ کبھی بدلتے نہیں۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ مصطفیٰ اپنے کیے پر پشیمان ہے۔ اس نے اللہ تعالیٰ سے رجوع کیا ہے۔ وہ ان تمام ناشائستہ حرکات کا اعتراف کرتا ہے جن کا وہ مرتکب ہوا تھا۔

میاں طفیل کا صاحب زادہ بھی وہاں موجود تھا۔ مصطفیٰ نے اس کے والد کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا اس پر وہ اب تک غصے سے کھول رہا تھا۔ "آپ کو تو علم ہی نہیں کہ آپ کے شوہر نے میرے والد صاحب کے ساتھ کیا کیا تھا۔" ایک بار پھر میاں طفیل

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نے ہاتھ بلند کیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو تاکید کی کہ وہ خاموش رہے۔ میں ان کی قابل احترام مہمان تھی۔ اس کے بعد میاں طفیل نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مصطفیٰ کی زیادتیوں کو معاف فرما دے گا بشرطیکہ اس کے دل میں آنے والی تبدیلی حقیقی ہو۔ "اللہ دلوں کے بھید جانتا ہے۔" میں نے کہا کہ مصطفیٰ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے اور رو رو کر عفو کا طلبگار ہوتا ہے۔ میں نے میاں طفیل سے کہا کہ مصطفیٰ کی مدد فرمائیں۔ انہوں نے نہایت خوش خلقی سے وعدہ کیا کہ وہ ایسا کریں گے۔

میں نے امیر جماعت سے "تفہیم القران" کے سیٹ کی فرمائش کی جو جماعت کے بانی، مولانا مودودی کا عمر بھر کا کام ہے۔ میں نے کتاب کی تعریف کی اور میاں طفیل سے کہا کہ یہ قرآن کی سب سے عمدہ تفسیر ہے۔ وہ مسکرائے۔ میں نے کہا کہ مصطفیٰ اسے پڑھنا چاہتا ہے۔ وہ دوبارہ مسکرائے۔ اس مسکراہٹ میں زہریلا پن نہ تھا۔ ان کے تبسم سے طمانیت جھلکتی تھی۔

انہوں نے بس اتنا کہا۔ "مجھے یہ سن کر مسرت ہوئی۔" انہوں نے ازراہ کرم گھر کے اندر چلنے کی دعوت دی اور مجھے گھر کی خواتین سے متعارف کرایا۔ وہ سب مجھ سے بہت شفقت سے پیش آئیں، میری بڑی عزت کی۔ میاں طفیل نے مجھے مولانا مودودی کی تفسیر کا ایک سیٹ عنایت کیا۔ میں ان سے رخصت ہوئی۔ ان سے زیادہ مہربان انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ان کی شفقت چہرے سے نمایاں تھی۔ اس وقت بھی جب ان کا حریف ان کے رحم و کرم پر تھا انہوں نے اسے معاف کرنا ہی احسن سمجھا۔ یہ ان کے خدا رسیدہ ہونے کی دلیل ہے۔

میں "تفہیم" اٹھائے مصطفیٰ سے ملنے پہنچی۔ بعض صحافیوں نے دیکھ لیا کہ میرے ہاتھ میں "تفہیم" ہے۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا تفسیر کی فرمائش مصطفیٰ نے کی ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اخبار والے تو ایسی خبروں کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہ خبر ان کے لیے سکوپ سے کم نہ تھی۔ مجھے مصطفیٰ کا ایک خط ملا جس کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ لکھا تھا کہ میں نے اسے ایسا ضرر پہنچایا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ نجی طور پر وہ خواہ کچھ پڑھے اسے مشتہر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مصطفیٰ نہیں چاہتا تھا کہ اسے ایسے شکست خوردہ انسان کے روپ میں پیش کیا جائے جو اپنے دشمن سے مدد کا طالب ہو۔ اس طرح اس کا امیج خراب ہو جائے گا۔ میرے لیے زیادہ اہم یہ تھا کہ میاں طفیل کو مایوس نہ ہونے دوں۔ وہ یہ خبر پڑھ کر ضرور اسی شفقت بھرے انداز میں مسکرائے ہوں گے جو ان کا خاصہ ہے۔

آزاد کشمیر کا صدر، سردار قیوم، اس طرح معاف کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ میں اس

سے اسلام آباد میں کشمیر ہاؤس جا کر ملی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جنرل ضیاء کا پکا ساتھی ہے۔ ہم نے مجموعی سیاسی صورت حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس نے میری پیش گوئی سے اختلاف کیا کہ پیپلز پارٹی برسراقتدار آجائے گی۔ میرے خیال میں اسے زیادہ اختلاف اس بنا پر تھا کہ کسی عورت سے بحث کرنی پڑ رہی ہے۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ مصطفےٰ کھر کی بیوی سے مل کر اسے مایوسی ہوئی۔ اس کی رائے میں میں ضرورت سے زیادہ مغرب زدہ تھی۔ اگرچہ میں نے اپنا سر ڈھک رکھا تھا لیکن میرے خیالات کی چمک کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ سیاسی قیدیوں کی حالت زار پر ایک سیمینار کا اہتمام کرنا چاہیے۔ میں نے معراج محمد خاں سے ملاقات کی جو ازراہ کرم سیمینار میں تقریر کرنے کراچی سے لاہور آئے۔ صدارت نوابزادہ نصر اللہ نے کی۔ سیمینار میں لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور اخباروں نے اسے خاصا اچھالا۔ اس کا کوئی ٹھوس نتیجہ نہ نکل سکا۔ یہ احساس تو موجود تھا کہ سیاسی قیدیوں کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے لیکن اس احساس کے پیچھے اتنا زور نہ تھا جو حکمرانوں کو باز آجانے پر مجبور کر سکتا۔ جتوئی صاحب جنرل ضیاء سے مسلسل کہتے رہتے تھے کہ مصطفےٰ کو رہا کر دیا جائے۔

کوئی زیادہ ڈرامائی حرکت کرنی ضروری ہو گئی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ این پی پی کے کارکنوں کو بھوک ہڑتالوں کے سلسلے کا آغاز کرنا ہو گا۔ دباؤ ڈالنے کا یہ حربہ بعض دوسرے مقاصد کے ضمن میں کامیاب ثابت ہو چکا تھا۔ ہم نے بندوبست کیا کہ این پی پی کے پچاس کارکن سینیٹ کے سامنے بھوک ہڑتال کریں۔ حکام نے بھوک ہڑتالیوں کے پہلے دستے کو خودکشی کرنے کے الزام میں فی الفور گرفتار کر لیا۔

ہم نے سینیٹ کی طرف مارچ کرنا چاہا جس کا اجلاس جاری تھا۔ پولیس نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ جتنے زیادہ سے زیادہ حفاظتی انتظامات ممکن تھے کیے جا چکے تھے۔ اسسٹنٹ کمشنر موقع پر موجود تھا تاکہ پوری کاروائی پر نظر رکھی جا سکے۔ کارکن کسی طور سینیٹ تک پہنچ ہی نہ سکتے تھے۔ پولیس نے انہیں آدبوچا اور وہ پولیس سے ہاتھا پائی اور مارشل لا کے خلاف اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کے حق میں نعرے لگانے لگے۔ آخر کار پولیس انہیں پکڑ کر لے گئی۔

میں صرف مصطفےٰ کی رہائی کی بات نہ کر سکتی تھی۔ مارشل لائی عدالتوں سے سزا یافتہ ہزاروں قیدیوں کو کسی ایسے فرد کی تلاش تھی جو ان کے لیے آواز بلند کر سکے۔ میں ان سب کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔

میں نے سینیٹر جاوید جبار اور سینیٹر طارق چوہدری سے درخواست کی کہ باہر آ کر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہم سے ملیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ہماری بہت مدد کی۔ وہ ہمیں سینیٹ کے اندر لے گئے تاکہ ہم وہاں اپنے نقطۂ نظر کے حق میں رائے ہموار کر سکیں۔ میں جن سینیٹروں سے ملی ان میں سے بیشتر نے ہماری باتوں پر بہت مثبت انداز میں توجہ دی۔ سینیٹر عبدالحمید جتوئی نے ہمارے معاملے میں گہری دلچسپی لی۔ میں نے سینیٹ میں جاکر سیاسی قیدیوں کا مسئلہ اٹھایا اور اچھی بھلی کھلبلی مچا دی۔ میں چوہدری شجاعت سے ملی اور اس سے کہا۔ "اگر آپ کی بیوی یہاں ہوتی اور آپ کی جگہ مصطفیٰ گھر ہوتے تو بلاشبہ ان کی طرف سے اس مسئلے کے بارے میں کوئی مثبت جواب ملتا۔" میں وزیرِ قانون، وسیم سجاد، سے ملی اور کہا کہ میری مدد کی جائے۔

بھوک ہڑتالیں جاری رہیں۔ این پی پی کے پچاس کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ ہم نے کوشش کی کہ میڈیا کے ذریعے، جس حد تک ممکن ہو لوگوں کو اس مسئلے کی طرف راغب کیا جائے۔ ہم حکومت کو شرمندہ کرنا چاہتے تھے لیکن اس نے اپنا کام معمول کے مطابق جاری رکھا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ بھوک ہڑتال کے لیے ہم نے ایک زیادہ ڈرامائی جگہ کا انتخاب کیا۔ کارکنوں سے کہا گیا کہ وہ اسلام آباد کی فیصل مسجد میں بھوک ہڑتال کریں۔ ہم نے محسوس کیا کہ ایسی حکومت کے کارندے، جو ہر وقت اسلام کی خدمت کی رٹ لگائے رکھتی ہے، شاید بھوک ہڑتالیوں کو گرفتار کرنے کے لیے مسجد کے تقدس کو پامال نہ کریں۔ اگر پولیس نے مسجد میں قدم رکھا تو ہمیں یقین تھا کہ پریس اسے خوب لعن طعن کرے گا اور خبر کا سیکنڈل بنتے دیر نہ لگے گی۔

کارکن مسجد میں جاکر عبادت کرنے لگے۔ پولیس بھی جمع ہوگئی۔ میں نے پولیس والوں سے کہا کہ جب تک کارکن عبادت کر رہے ہیں وہ انہیں گرفتار نہیں کر سکتے۔ پولیس والے ہچکچائے اور انتظار کرنے لگے کہ کارکن کب اپنی عبادت ختم کرتے ہیں۔ کارکنوں نے ایسا نہ کیا۔ عبادت ختم ہونے میں نہ آئی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ فریقین میں کس کا ضبط پہلے جواب دے جائے گا۔ کارکنوں کے پائے ثبات کو ذرا لغزش نہ ہوئی۔ ان کی عبادت نے ختم ہونے کا نام نہ لیا۔ پولیس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ انھوں نے کارروائی شروع کر دی۔ یہ شرمناک حرکت تھی۔ بھوک ہڑتالیوں کو مسجد سے کھینچ کر نکالا گیا اور پولیس انہیں گرفتار کر کے لے گئی۔ ہم نے اس امر کو یقینی بنا دیا کہ پوری قوم سن لے کہ ایک نام نہاد اسلامی حکومت اور اس کی انتظامیہ نے کس طرح مسجد کی حرمت پامال کیا ہے۔

ہم نے بھوک ہڑتالوں کے لیے ایسے مقامات چنے جہاں یا تو لوگوں کا ہر وقت آنا جانا تھا یا جو تقدس کے حامل تھے۔ سینیٹ، صدر کی رہائش گاہ، شاپنگ سنٹرز اور مسجدیں

سب ہماری ہڑتالوں کا مرکز بن گئے۔ دارالحکومت جو بیشتر وقت پر امن اور پُرسکون رہتا ہے یکایک پُرامن احتجاج کا منظر پیش کرنے لگا جس میں سٹیج پر مرکزی مقام مجھے حاصل تھا۔ پولیس کی دخل اندازی پر ناراض ہو کر بعض اوقات ہجوم ایسا ردعمل ظاہر کرتا جو بھڑک کر کوئی بھی صورت اختیار کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفیٰ کے دو بیٹوں، عبدالرحمٰن اور بلال، کو بھی بھوک ہڑتال کرنی چاہیے۔ وقت آگیا تھا کہ قائد کے اپنے گھر والے بھی قربانیاں دیں۔ میں اس بات پر ناخوش تھی کہ صرف غریب کارکن خود کو گرفتاریوں کے لیے پیش کر رہے تھے۔ قیادت نے ہدایات دینے اور مذمت کرنے کو کافی سمجھ لیا تھا۔ لڑکوں نے میرے دلائل مان لیے اور دلیرانہ انداز میں اپنے والد کے حق میں آواز بلند کرنے میدان میں اتر آئے۔ انہیں سینیٹ کے باہر سے گرفتار کر لیا گیا۔

عین اس وقت جتوئی صاحب نے ایسا قدم اٹھایا کہ ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ این پی پی کو اسلامی جمہوری اتحاد کا حصہ بنا دیا گیا۔ یہ ایک انتخابی اتحاد تھا جس کا مقصد پی پی پی کا مقابلہ کرنا تھا۔ ہم ایک ایسے نظام کے خلاف لڑ رہے تھے جس میں اب خود ہماری سیاسی جماعت شامل ہو چکی تھی۔

اس مرحلے پر میں نے مصطفیٰ کے سامنے تجویز رکھی کہ میں تامرگ بھوک ہڑتال کرتی ہوں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میری ہڑتال میں قوم اور بین الاقوامی میڈیا کو اپنی دلچسپی کا سامان نظر آئے گا اور ہم اس کی توجہ سیاسی قیدیوں کے کاز پر مرکوز کر سکیں گے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ حکومت مجھے بھوکوں نہیں مرنے دی گی اور شاید دباؤ میں آکر قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

سچ کی بات یہ ہے کہ مصطفیٰ کو اور مجھے معلوم تھا کہ میرے والد مجھے اس طرح گھل گھل کر مر جانے سے بچانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ فوج میں ان کے متعدد دوست، مثلاً جنرل جیلانی، جنرل عارف اور جنرل فضل حق، اہم عہدوں پر فائز تھے۔ سینیٹ کا چیئرمین، غلام اسحاق خاں، بھی ان کا دوست تھا۔ میرے بھوک ہڑتال کرنے سے شاید اس بند گلی میں کوئی راستہ نکل آئے۔

پی پی پی بھی، جو سیاسی قیدیوں کے مسئلے پر اپنے سکوت پر شرمسار تھی، سرگرم عمل ہو گئی۔ اس نے ایک احتجاجی مارچ کا اعلان کیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مارچ کی قیادت میں کروں گی۔ ہم ایک ہی پلیٹ فارم پر تھے۔ اس مسئلے پر ہمارے مابین اتحاد ضروری تھا۔

میری بھوک ہڑتال کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ ہم نے اس کا پکا بندوبست کیا کہ جب آخر کار مجھے جیل لایا جائے تو ڈاکٹروں کی ایک ٹیم میری دیکھ بھال کے لیے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

موجود ہو۔ مصطفیٰ نے اصرار کیا کہ ڈاکٹر سلطان کو، جو اڈیالا جیل سے منسلک تھے، ٹیم میں رکھا جائے۔ ہڑتال شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر سلطان مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے میرے سامنے ایک بھیانک تصویر کھینچی۔ "چوبیس گھنٹے کے اندر اندر آپ کو تناؤ محسوس ہونے لگے گا۔ آپ مریں گی تو نہیں لیکن ممکن ہے آپ کے اعضائے رئیسہ کو گزند پہنچے۔ مثال کے طور پر آپ کے گردے کام کرنا چھوڑ سکتے ہیں۔ ہڑتال کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ آپ کے دماغ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آپ پر گہری بے ہوشی طاری ہو جائے گی۔ ہم آپ کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔" میں بہت خوف زدہ ہوئی لیکن تہیہ کر چکی تھی کہ پیچھے نہیں ہٹوں گی۔

جب ہم اس بھوک ہڑتال کی آخری جزئیات کی نوک پلک سنوار رہے تھے تو تقدیر نے اڑنگا لگایا۔ جنرل ضیاء جو گیارہ سال سے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا۔ اس کا طیارہ فضا میں پھٹ گیا تھا۔ اس طیارے پر ایسے لوگ بھی سوار تھے جن کو میں جانتی تھی، جن سے مل چکی تھی۔ لیکن اس امید کے زیرِ اثر کہ اب سیاسی قیدیوں اور میرے شوہر کے رہا ہونے کا وقت آپہنچا ہے میں پیش آنے والے انسانی المیے کو بھول گئی۔

ڈاکٹر سلطان نے فون پر مجھے مصطفیٰ کا پیغام پہنچایا۔ انھوں نے کہا کہ مصطفیٰ کے خیال میں صورت حال بہت سیمابی ہے اور کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی ہے۔ "اس مرحلے پر ہمیں فوج کو طیش دلانے والی کوئی حرکت نہ کرنی چاہیے۔ ہمارے حق میں سب سے بہتر یہی ہے کہ دیکھتے رہیں، ہوتا کیا ہے۔" مارشل لا کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میرا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ مجھے ہوائی حادثے میں ہلاک ہونے والی دو شخصیتوں، جنرل اختر عبدالرحمٰن اور بریگیڈیئر خورشید کا خیال آیا۔ میں مصطفیٰ کو رہا کرانے کی مہم کے دوران ان دونوں سے مل چکی تھی۔

میں نسیم لیر سے بھی ملی تھی، جو جونیجو کی کابینہ میں وزیر داخلہ تھا، اور اس سے کہا تھا کہ مصطفیٰ کی رہائی کے کیس کا کچھ کریں۔ ممتاز تارڑ نے بہت مدد کی۔ وہ قومی اسمبلی کا رکن تھا اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کے لیے زور دے رہا تھا۔ وہ اس بارے میں اسمبلی میں ایک قرار داد منظور کرانے میں بھی کامیاب ہو چکا تھا۔

میں جتنے زیادہ ارکان پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر بیٹھی اپوزیشن کی شخصیات سے ملی مجھے اتنا ہی زیادہ یقین آتا گیا کہ ان کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کی اتنی حیثیت ہی نہ تھی کہ کچھ مدد کر سکتے۔ اہم فیصلے کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا۔ صدر اور اس کے حلقۂ انتخاب یعنی فوج کے علاوہ کسی سے کوئی امید رکھنا بیکار تھا۔

وہی درحقیقت ملک کے حکمران تھے۔ پارلیمنٹ تو محض دکھاوا تھی۔ صرف فوج اور صدر کو علم تھا کہ ملک کے مستقبل کے لیے کیا بلیو پرنٹ تیار کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنا کھیل جاری رکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا سیاسی قیدیوں کی رہائی اس کا حصہ نہ تھی۔ ہر کام ان کے اشارے پر موقوف تھا۔ میری سمجھ میں آگیا کہ مجھے فوج میں نفوذ کر کے جنرلوں سے بات کرنی پڑے گی۔ مصطفیٰ کو میری بات سے اتفاق تھا ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم کچھ لو کچھ دو کی پالیسی اپنا کر فوج کا دل جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں مصطفیٰ کے پرانے ساتھی، میر افضل خاں سے ملی تاکہ وہ فوج کے جنرلوں تک پہنچنے میں میری مدد کریں۔ میر افضل مصطفیٰ کے بارے میں جنرل ضیاء سے بات کر چکے تھے لیکن انھوں نے دیکھا کہ جنرل ضیاء کو اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میرا پہلا رابطہ جنرل اختر عبدالرحمٰن سے ہونا تھا جو اس وقت چیئرمین آف دی جوائنٹ چیفز آف سٹاف اور جنرل ضیاء کا دست راست تھا۔ میں نے فون کیا اور اس سے ملاقات کا وقت طے کر لیا۔ مجھے بتایا گیا کہ میں اسلام آباد میں ہولیڈے ان کی لابی میں خورشید نامی کسی بریگیڈیر سے ملوں۔ اس کے بعد وہ مجھے جنرل صاحب سے ملانے کا بندوبست کرے گا۔

میں جنرل سے اس کی قیام گاہ پر ملی۔ ہماری ملاقات، جو ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی، بڑی ٹیڑھی ثابت ہوئی۔ جنرلوں اور ان کی حکومت سے تنفر میرے رگ وپے میں سما چکا ہے۔ مجھے ان کے ساتھ گفت و شنید کرنے کا خیال ہی ناگوار تھا۔ مجھے اس بات پر بڑی خفت محسوس ہو رہی تھی کہ ہاتھ میں کشکول لیے میز پر ان کے سامنے بیٹھی ہوں اور ظاہر یہ کر رہی ہوں کہ بھیک مانگنے نہیں آئی۔ علاوہ ازیں مصطفیٰ کی رہائی کے بدلے میں دینے کے لیے پاس کچھ ایسا زیادہ تھا بھی نہیں۔ مجھے اندازہ لگانا تھا کہ انہیں مصطفیٰ سے کتنی دلچسپی ہے۔ بظاہر انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شاید یہ بے اعتنائی اداکاری ہو۔ میں اپنی بات پر قائم رہی۔ انہیں معلوم تھا کہ ضیاء حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں مصطفیٰ ملوث تھا۔ بیشتر تفصیلات ان کے پاس موجود تھیں۔

مصطفیٰ نے مجھے سکھا پڑھا کر بھیجا تھا۔ میں نے انہیں اس بات کا قائل کرنا چاہا کہ مصطفیٰ کو احساس ہے کہ سیاسی عمل میں فوج کی شمولیت ناگزیر ہے۔ وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ اقتدار میں فوج کو حصہ ملنا چاہیے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ترکی میں حکومت کا جو بندوبست کیا گیا ہے بہترین ہے اور اسے ہمارے ملک میں رواج دینا چاہیے۔

اختر عبدالرحمٰن نے میری بات کاٹ دی۔ کہنے لگا کہ بھٹو صاحب نے جنرل گل

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

حسن کے ساتھ اسی قسم کا معاہدہ کیا تھا۔ سویلین حکومت اس معاہدے سے مکر گئی تھی۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ اسی طرح کا واقعہ دوبارہ پیش نہیں آئے گا؟ میں نے جنرل کو بتایا کہ مصطفٰے بھٹو نہیں۔ وہ بھٹو صاحب کے بہت سے خیالات کا مخالف ہے۔ اس نے اپنے قائد کی مخالفت کی تھی۔ وہ بھی کھلم کھلا۔ میں نے جنرل سے وعدہ کیا کہ مصطفٰے جو بھی، جیسا بھی عہد کرے گا اس پر قائم رہے گا۔

اس کے بعد میں نے پیپلز پارٹی اور درپیش سیاسی منظر نامے کے بارے میں تقریر کی جس کی میں اچھی طرح تیاری کر کے آئی تھی۔ مصطفٰے نے کہا تھا کہ فوج پیپلز پارٹی سے خائف ہے۔ اس حوالے سے انہیں ڈرا کر اپنا کام نکالنا چاہیے۔ میں نے جنرل کو بتایا کہ مستقبل کے کسی بھی الیکشن میں پیپلز پارٹی کی جیت یقینی ہے۔ پنجاب اس کے سامنے بے دست وپا ہے۔ میاں نواز شریف عوام کا آدمی نہیں۔ وہ پی پی پی کے ریلے کے سامنے کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ لوگ پھر بھٹو صاحب کے لیے ووٹ ڈالیں گے۔ بھٹو کی افسانوی شخصیت میں دوبارہ جان پڑ جائے گی۔ فوج کو انتقام کا نشانہ بنایا جائے گا۔ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ انہیں جنرل ضیاء کی حمایت کرنے والی طاقتوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع کب ملتا ہے۔ اس مرحلے پر فوج کو ایک درمیانی طاقت کی ضرورت ہے جو بیچ میں آ کر فوج اور عوام کو آپس میں ٹکرانے نہ دے۔ کوئی ایسا شخص درکار ہے جو ریلے کے سامنے ڈٹا رہے اور طوفان کا منہ پھیر دے۔ فوج کے لیے یہ کردار صرف ایک ہی آدمی ادا کرسکتا ہے۔ وہ آدمی جس کی جڑیں پنجاب کے عوام میں ہیں۔ ایسا سیاست دان جو اقتدار کی سیاست کے حقائق کو سمجھتا ہے۔ یہ آدمی مصطفٰے کھر ہے۔ جنرل نے مجھ سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی اور یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ میں فوج والوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے میں کامیاب رہی تھی۔

جنرل اختر عبدالرحمن ضیاء کے بڑے کٹر حامیوں میں تھا۔ جب میں نے آمر کو جنرل ضیاء کہا تو اس نے معاً میری تصحیح کی۔ "صدر ضیاء"

ہماری ملاقاتیں جاری رہیں۔ میں ہر ملاقات کے بعد مصطفٰے کے پاس جاتی، ملاقات میں ہونے والی باتوں پر تبادلۂ خیال کرتی اور تازہ ہدایات اور تجاویز لے کر لوٹتی۔ میں اختر عبدالرحمن سے پانچ بار ملی۔ ہر بار ملاقات کا انتظام بریگیڈیر خورشید نے کیا مجھے محسوس ہوا کہ میں بات آگے بڑھانے میں کامیاب رہی ہوں۔ اب زیادہ باتیں جنرل خود کرتا۔ پہلے وہ میری باتیں سنتا رہا۔ اب وہ گفتگو کرنے پر زیادہ مائل نظر آنے لگا۔ ہمارے مابین دلچسپ ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ جنرل رحمن اب کسی درمیانی راستے کی تلاش میں تھا۔ ہمیں درپیش بے ڈھب مسئلے کا کوئی حل نکالنا چاہتا تھا۔ مجھے وہ دوسروں کا

خیال رکھنے والا، حساس طبع انسان معلوم ہوا۔

جنرل سے چوتھی بار ملاقات اس وقت ہوئی جب جنرل ضیاء جونیجو حکومت کو برطرف کر کے اسمبلیاں توڑ چکا تھا۔ میں نے بتایا کہ مصطفٰے نے صورتِ حال کا کیا اندازہ لگایا ہے۔ مصطفٰے کے خیال میں صدر کی اس کارروائی سے مسئلہ حل نہ ہو سکا تھا۔ ایک خلا وجود میں آگیا تھا۔ ایسے ادارے تشکیل نہیں دیے گئے تھے جو اسمبلیوں کی جگہ لے سکیں۔ نگران حکومت غیر مؤثر ثابت ہوگی۔ پرانے چہرے اپنی ساکھ کھو چکے تھے اور اقتدار کا جو خلا پیدا ہوگیا تھا اسے پر کرنے کے لیے پی پی پی آگے آجائے گی۔ اس نے تجویز کیا کہ اب ایسے اقدام کا وقت آگیا ہے۔ جن کے ذریعے اسے پی پی پی کا مقابلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔ 1990ء میں آخر کار فوج اس پر رضا مند ہو گئی۔

ہم جنرل اختر کی قیام گاہ پر ملے اور میں نے اس کے اور بیگم اختر کے ساتھ چائے پی۔ اس ملاقات میں جنرل بہت پُر امید نظر آیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ جنرل ضیاء سے مصطفٰے کے بارے میں بات کرے گا۔ وہ اس بات کا کم و بیش قائل ہو چکا تھا کہ فوج کے خفیہ اتحادی کے طور پر مصطفٰے مؤثر کردار ادا کر سکے گا۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہوا۔ گفت و شنید کے دوران خاصے سخت مقام آئے تھے اور میں جنرل کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

ایک ہفتے بعد بہاولپور کے پاس، ایک سی130 طیارہ پُر اسرار طور پر فضا میں پھٹ گیا۔ اختر عبدالرحمن اس طیارے پر سوار تھا۔ بریگیڈیر خورشید بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں جہاں سے چلی تھی ہر پھر کر وہیں واپس پہنچ گئی۔

میں شوکت گورایا سے ملی جس کے فوج کے اعلیٰ افسروں سے مراسم تھے۔ ڈاکٹر محمد حسین سے بھی کہا گیا کہ وہ مدد کرے۔ وہ آئی ایس آئی کے سربراہ، جنرل حمید گل کو جانتا تھا۔ اس کے ذریعے جنرل تک پیغام پہنچایا گیا۔

میں نے آئی ایس آئی سے رابطہ قائم کر کے بریگیڈیر امتیاز سے بات کی۔ میں نے کہا کہ میں جنرل حمید گل سے ملنا چاہتی ہوں۔ بریگیڈیر امتیاز نے کہا کہ جنرل کے بجائے وہ خود مجھ سے ملے گا۔ آئی ایس آئی کے دفتر میں میری اور اس کی ایک انتہائی طویل ملاقات ہوئی جو صبح گیارہ بجے سے سہ پہر چار بجے تک جاری رہی۔ بیچارہ ساجد جو میرے ساتھ تھا باہر بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ مجھ پر بڑے تسلسل سے اور جارحانہ انداز میں جرح کی گئی۔ بریگیڈیر امتیاز قائل نہ ہو سکا۔ اسے پتہ تھا کہ مصطفٰے بھارتیوں کے ساتھ مل کر سازش کرتا رہا تھا۔ آئی ایس آئی کے پاس مصطفٰے کے بارے میں خاصی ضخیم فائل موجود تھی۔ میں نے مصطفٰے کو ایک مختلف قسم کا محب الوطن بنا کر پیش کرنا چاہا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

بریگیڈیر امتیاز کی نظر میں وہ غدار تھا۔ میں نے مصطفےٰ کی افادیت کی وضاحت کرنی چاہی اور بتانے کی کوشش کی کہ وہ ان کے بڑے کام آئے گا لیکن بریگیڈیر کو مصطفےٰ کی نیک نیتی پر شک تھا۔ میں نے بریگیڈیر سے جنرل اختر عبدالرحمن سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ وہ یہ بات سن کر خاصا متحیر ہوا آئی ایس آئی کو اس بات کا علم نہ تھا۔ اس نے مجھ سے ان ملاقاتوں کے بارے میں بہت سے سوال کیے۔ اسے زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ میں جنرل سے کہاں، کب اور کیسے ملی تھی۔ میں نے اسے بتایا۔ وہ قائل ہو گیا۔

بریگیڈیر سے میری متعدد بار ملاقات ہوئی۔ میں نے جنرل حمید گل تک پہنچنے کی کوشش کی۔ خاموشی چھائی رہی جو اچھا شگون نہ تھا۔ نسیم آہیر نے اپنے دفتر میں مجھے بتایا تھا کہ مصطفےٰ کو کبھی رہا نہیں کیا جائے گا۔ کم از کم جب تک ضیاء موجود ہے اس کے رہا ہونے کی امید نہیں۔ میں نے جونیجو سے ٹیلی فون پر بات کی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سپیکر ناصر حامد چٹھہ سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن وہ بھی کچھ نہ کر سکا۔ میں جنرل جیلانی اور جنرل فضل حق سے ملی جنہوں نے کہا کہ وہ مدد کرنے کوشش کریں گے۔ حقیقت میں ان ملاقاتوں سے کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے نہ آیا۔ مصطفےٰ کے کیس میں کوئی امید نہ ہی تھی۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں، کیا نہ کریں۔ میں نے پیر پگاڑا سے بات کی اور کہا کہ مصطفےٰ کی مدد کی جائے۔ پیر پگاڑا نے جواب دیا۔ "مصطفےٰ غدار ہے۔ میں ایسے آدمی کی مدد نہیں کر سکتا جس نے میرے ملک سے غداری کی ہو۔"

انتخابات کا اعلان ہوا۔ جتوئی صاحب آئی جے آئی میں شامل ہو چکے تھے۔ مصطفےٰ سے بھی کہا گیا کہ وہ چاہے تو آئی جے آئی میں شامل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ہامی بھر لیتا تو اسے فوراً رہا کر دیا جاتا۔ مصطفےٰ قید سے باہر آکر انتخابات لڑنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ وہ ہر قیمت پر، خواہ وہ کتنی ہی بھاری ہو، رہائی حاصل کرنے کو تیار تھا۔ میں نے اختلاف کیا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ آئی جے آئی میں شامل ہو کر مصطفےٰ ان تمام باتوں کو جھٹلا دے گا جن کا وہ اب تک علم بردار چلا آرہا تھا۔ اس فیصلے سے مارشل لا کے خلاف اس کی کشمکش اور جمہوریت کے لیے اس کی جدوجہد، سب کی نفی ہو جائے گی۔ جو سال اس نے جلاوطنی میں گزارے تھے ان کے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے۔ مارشل لا کی باقیات میں شامل ہو کر وہ جمہوریت کے کاز سے بے وفائی کرے گا۔ آئی جے آئی کا سربراہ میاں نواز شریف تھے جسے کھر بالشتیا سمجھتا تھا۔ یہ ایک ذلت آمیز فیصلہ ہوگا۔

میرے نزدیک قابل ترجیح یہ تھا کہ میرا شوہر اصولوں کی خاطر زندان میں رہے نہ کہ بکاؤ مال بن کر آزادی حاصل کرے اور اقتدار میں آجائے۔ مصطفےٰ نے اندازہ لگایا کہ

اس کے اختیار میں کیا کیا ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے میں جیل سے باہر آسکتا تھا یا بیوی کو زندگی بھر کے لیے اپنی بنا سکتا تھا۔ اس نے جو فیصلہ کیا اس کا مقصد مجھے مرعوب کرنا تھا۔ جتوئی صاحب کی پیشکش ٹھکرادی گئی۔ وہ اکیلا ہی میدان میں اترے گا۔ "تمہاری استقامت نے مجھے یہ فیصلہ کرنے کا موقع دیا۔ یہ فیصلہ کر کے میں خوش ہوں۔ چور راستوں سے اقتدار تک پہنچنا باعث ننگ ہے۔"

جب میں اس کے ساتھ نہ تھی تو مصطفےٰ نے اقتدار تک پہنچنے کے لیے انہیں چور راستوں سے کام لیا۔ ان حرکتوں کی وجہ سے پوری قوم کے سامنے رسوا ہوا۔

ملاقاتیوں کی پوری فوج مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ وہ سب مجھے قائل کرنا چاہتے تھے کہ میں کسی طرح مصطفےٰ کو آئی جے آئی میں شامل ہونے پر آمادہ کر لوں۔ ان آنے والوں میں اقبال لکا بھی تھا جو مصطفےٰ کی گورنری کے دنوں میں مصطفےٰ کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ اگر مصطفےٰ آئی جے آئی میں شامل نہ ہوا تو کبھی جیل خانے سے باہر نہ آسکے گا۔ "مصطفےٰ صاحب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیل میں سڑتے رہیں گے۔"

اس وقت مجھ پر انکشاف ہوا کہ بہت سے لوگوں کو یہ حقیقت تسلیم ہے کہ میں مصطفےٰ پر اثر انداز ہوتی ہوں۔ جتوئی صاحب تک کا یہی خیال تھا۔ پرانی افواہوں نے دوبارہ سر ابھارا۔ کہا جانے لگا کہ میں اپنے شوہر کی آزادی کی خواہاں ہی نہیں۔ اگر وہ آزاد ہو گیا تو میری پہلی سی اہمیت نہ رہے گی۔ سمجھا جارہا تھا کہ میں آپ قائد بننے کی متمنی ہوں۔ قیادت کا شرف مجھے مصطفےٰ کی موت کے بعد ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ مصطفےٰ مر جائے۔ اسے میری خوش قسمتی گردانیے کہ بہت کم لوگوں نے ان افواہوں پر کان دھرا اور مصطفےٰ نے تو سب سے کم توجہ دی۔ وہ مجھے بخوبی جانتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مصطفےٰ کو لاہور میں میاں نواز شریف سے ٹکر لینی چاہیے۔ اسے قید میں رہتے ہوئے وزیراعلیٰ وقت سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس کی نیابت کرتے ہوئے انتخابی مہم بھی چلاؤں گی اور انتخاب بھی لڑوں گی۔ مصطفےٰ نے انتخاب لڑنے کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کی بہت پذیرائی ہوئی۔ وہ پنجاب کے بہادر شیر کے روپ میں سامنے آیا جو سلاخوں کے پیچھے سے دہاڑ رہا تھا۔

اہم کام یہ تھا کہ ہم لاہور میں اپنی طاقت کا اندازہ لگائیں۔ میں نے واپس آکر اپنی پارٹی کے رہنماؤں سے بہت سی ملاقاتیں کیں جو بہت خوش تھے کہ کھر صاحب آئی جے آئی میں شامل نہیں ہوئے۔ بہت سے کارکن محسوس کرتے تھے کہ ہمیں پی پی پی کے ساتھ اتحاد کر لینا چاہیے۔ بعض کی رائے تھی کہ اتحاد قائم کرنے کے لیے جونیجو سے رابطہ کیا جائے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

چہدری حنیف نے ہمارے پہلے انتخابی اتحاد کا انتظام کیا۔ یہ اتحاد ایک سنی گروپ کے ساتھ تھا۔ اگلے دن مصطفےٰ نے اخبار دیکھے تو وہ دہل گیا۔ میرے ساتھ جنرل ٹائیگر نیازی بیٹھا تھا جس نے بطور فوجی ڈھاکے میں بھارتیوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر قومی سطح پر خواری کمائی تھی۔ میں پہلے کبھی اس سے نہ ملی تھی۔ میرے لیے وہ گروپ فوٹو میں بس ایک چہرہ تھا۔ یہ ایسی فاش غلطی تھی جسے ہمالیائی ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ مصطفےٰ بھنا کر رہ گیا۔

اس نقصان کی تلافی کے طور پر ہم نے طاقتور شیعہ پریشر گروپ "تحریکِ نفاذ فقہ جعفریہ" سے انتخابی اتحاد قائم کر لیا۔

ضرورت اس کی تھی کہ ہم کسی مضبوط سیاسی پارٹی سے متعلق ہوں۔ مصطفےٰ نے مجھ سے کہا کہ بے نظیر سے بات کی جائے۔ میں ایک بار پہلے بے نظیر سے بات کر چکی تھی اور اس نے کہا تھا۔ "لوگوں نے میرے اور انکل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا تھا۔" بے نظیر نے غلام غازی کھر کی وفات ہمیں تعزیت کا تار بھجوایا تھا اور میں نے تار کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے فون کیا تھا۔

میں نے پیار علی الانا سے بات کی اور اس کے ساتھ مذاکرات کا دور شروع کیا پیار علی نے بے نظیر سے مشورہ کیا۔ وہ یہ جواب لے کر میرے پاس آیا۔ "میرا خیال ہے ہمیں کھر صاحب کے رہا ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔"

صاف ظاہر تھا کہ مصطفےٰ کی رہائی فوج کی مرضی پر موقوف تھی۔ پی پی پی اسے اپنی صفوں میں شامل کرنے سے گھبراتی تھی۔ پیپلز پارٹی والوں کو یقین نہ تھا کہ اسے رہا کر دیا جائے گا۔ وہ کسی ایسے شخص کو ساتھ ملانا چاہتے تھے جس کی فوج مخالف ہو۔

مصطفےٰ کے مقدمے کی سماعت شروع ہو چکی تھی۔ مصطفےٰ کے وکیل، ایس ایم ظفر، جتوئی صاحب کے ساتھ آئی جے آئی میں شامل ہو چکے تھے۔ انتخابات میں صرف پندرہ دن باقی تھے۔ میں نے اعتزاز احسن کو فون کیا۔ اعتزاز مجھ سے بہت مہربانی سے پیش آتا رہا تھا۔ ایک بار میں کسی قانونی معاملے پر اپنے کچھ ٹائپ شدہ کاغذات لے کر اس کی پاس گئی تھی۔ اعتزاز نے میری مدد کی تھی اور بعض چیزیں خود ٹائپ کر دی تھیں۔ میں نے اسے اسلام آباد بلا کر اس امکان پر تبادلۂ خیال کیا کہ کیا ایس ایم ظفر کے سیاسی رجحانات اور ہمارے مفادات آپ میں ٹکرا سکتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آئی جے آئی شاید ایس ایم ظفر پر اثر انداز ہوتا کہ مصطفےٰ کا مقدمہ طول کھینچے اور یوں انتخابی مہم کے دوران اس کی موجودگی خارج از امکان ہو جائے۔ اس تعصب کو بے اثر بنانے کے لیے اعتزاز نے چند بیش بہا مشورے دیے۔ جب میں رخصت ہونے لگی تو اس نے کہا۔

"تہمینہ، یہ میں تمہاری خاطر کر رہا ہوں۔ تمہارے شوہر کے لیے میں یہ سب کچھ کرنے سے رہا۔"

مصطفےٰ کو میری صورت میں ایک ایسی سفیر مل گئی تھی جس نے اسے دشمنی کا نشانہ بننے سے بچائے رکھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ مجھ سے بہت مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ جو کچھ میں کر رہی تھی اسے تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ میرے ساتھ پریس کا رویہ، مدیروں سے رپورٹروں تک، انتہائی ہمدردانہ رہا۔ انہوں نے ایسے وقت میں، جو فیصلہ کن تھا، میرا حوصلہ بڑھایا۔ میرے خیال میں اپنے شوہر کی رہائی کے لیے جدوجہد کرنے والی بیوی کا جو کردار میں ادا کر رہی تھی وہ لوگوں کو بھلا لگتا تھا۔ بار بار قلابازیاں کھاتے رہنے سے میں خاصی نزاع انگیز شخصیت بن چکی تھی۔ پریس ہر وقت میرے کندھے پر سے جھانک جھانک کر میری اگلی چال کے پہلے سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ مصطفےٰ کی رہائی کے لیے چلائی جانے والی مہم کے دوران مجھے صحافیوں کی ایک نئی نسل سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، جوان اور اپنے پیشے سے پوری طرح وابستہ تھے۔ وہ ضمیر نیازی کے یادگار لفظوں میں "ٹائپ رائٹر چھاپہ مار" تھے۔ یہ الگ بات کہ اب ان میں سے بہت سے ورڈ پروسیسروں پر کام کرتے تھے۔

میں مجید نظامی صاحب سے ملتی رہی اور جونیجو حکومت کی برطرفی کے مصطفےٰ کا ایک پیغام لے کر ان کے پاس پہنچی۔ یہ پیغام کیوں بھجوایا گیا تھا، اس کی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکیں۔ مصطفےٰ نے نظامی صاحب سے پوچھا تھا کہ "کیا مسلم لیگ میں شامل ہونا میرے مستقبل کے لیے ٹھیک اور پاکستان کے مفاد میں ہوگا؟ یہ فیصلہ میں نظامی صاحب پر چھوڑتا ہوں۔" میں نے مصطفےٰ سے دریافت کیا کہ نظامی صاحب اس کی سیاسی آئیڈیالوجی اور آئندہ کے لائحۂ عمل کا تعین کیسے کر سکتے ہیں؟ مصطفےٰ نے صرف اتنا کہا۔ "یہ ضروری ہے۔" میں نے یہ پیغام "نوائے وقت" کے مدیر کو ان کے دفتر جا کر پہنچا دیا۔ میں ایسا کرتے ہوئے جھینپی بھی اور کچھ بے عقل بھی دکھائی دی۔ نظامی صاحب پیغام سن کر بظاہر الجھن میں پڑ گئے۔ انہوں نے کہا۔ "یہ فیصلہ کرنا مصطفےٰ صاحب کا کام ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

میں "دی نیشن" کے مدیر، عارف نظامی، اور "جنگ" کے نوجوان شکیل الرحمٰن سے زبردست ذہنی ربط ضبط قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ چاہے میں مصطفےٰ کی خاطر لڑائی میں مشغول ہوتی یا اس سے قطع تعلق پر تل جاتی، وہ مجھ سے بہر صورت بڑے اخلاص سے پیش آتے۔ وہ میرے مستقل نوعیت کے الٹ پلٹ مسائل میں ذاتی سطح پر دلچسپی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

لیتے۔ مجھے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ پریس نے مجھے لتاڑا ہے۔ میڈیا میں میرے حق میں ایک نرمی تھی۔ میں محسوس کرتی تھی کہ وہ میرے حالِ زار سے واقف ہیں اور اس لیے ان کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ "فرنٹیئر پوسٹ" کے مدیر اور مالک، رحمت شاہ آفریدی، کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مجھے جتنی بار بھی ان کے اخبار سے واسطہ پڑا انھوں نے میرے ساتھ انتہا کا تعاون کیا۔

آخرش مجھے جنرل حمید گل کی خدمت میں باریابی کا اذن مل گیا۔ میں اس سے ملنے اسلام آباد پہنچی۔ جب بریگیڈیر امتیاز مجھے کار میں بٹھا کر ملانے لے جارہا تھا تو میں نے اسے بتایا کہ میری امریکی قونصل جنرل سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے اندازہ لگایا ہے کہ امریکی پی پی پی کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ سن کر بریگیڈیر کے ہوش اڑ گئے۔ مجھ سے کہنے لگا کہ جنرل حمید گل کو یہ بات ضرور بتائی جائے۔ میں اس طاقتور اور پُر اسرار شخصیت سے ملنے پہنچی۔ اس وقت تک حالت یہ ہو چکی تھی کہ میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ مجھے پانچ انتخابی مہمیں چلانی تھیں۔ ان میں سب سے سخت مہم لاہور کی تھی۔ مصطفیٰ کے اپنے علاقے میں بھی انتخابات میں کامیابی کوئی آسان نہ تھی۔ اس کے اپنے بھائی مقابلے میں کھڑے تھے اور انہیں برسر اقتدار گروہوں کی تائید حاصل تھی۔ میں مصطفیٰ کی نامزدگی کے کاغذات جمع کرا چکی تھی اور مظفر گڑھ کے عوام نے پُر زور انداز میں میری حمایت کی تھی۔ لیکن ضرورت اس امر کی تھی کہ مصطفیٰ آزاد ہو۔ میرے کندھوں پر یہ بہت بڑی ذمے داری آ پڑی تھی اور دشمن بھی بہت تھے۔ جس آدمی سے میں ملنے گئی تھی وہ میری آخری امید تھا۔ میں بولتی رہی۔ وہ سنتا رہا۔ میں نے اس کے بارے میں اندازہ قائم کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ یہ ایک مشکل ملاقات تھی۔

میں نے جنرل حمید گل سے کہا کہ وہ مصطفیٰ سے مل کر تو دیکھے۔ ایک بار ہی مل لے۔ میں اس کی پوری طرح قائل تھی کہ مصطفیٰ میں دوسروں سے اپنی بات منوانے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ غضب کا چرب زبان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ محض چکنی چپڑی باتیں بنا کر جیل سے باہر آسکتا ہے لیکن لازم تھا کہ اسے خود گفتگو کرنے کا موقع دیا جائے۔ میں نے جنرل سے التجا کی آخر کار اس نے آمادگی ظاہر کر دی۔

ضروری تھا کہ ملاقات کو خفیہ رکھا جائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ہم نے طے کیا کہ اس رات بارہ بجے الگ الگ اڈیالا جیل پہنچ جائیں گے۔ بریگیڈیر امتیاز نے مجھے پک کیا۔ اس رات ہم جیل کے ویٹنگ روم میں ملے۔ مصطفیٰ کو علم نہ تھا کہ ہم آنے والے ہیں۔ ملاقات انتہائی مایوس کن ثابت ہوئی۔ میں بیٹھی یہی سوچتی رہی کہ چلو بھئی، مصطفیٰ! اب لازم ہے کہ جو بات تم کرو وہ نشانے پہ جا لگے۔ ضروری ہے کہ ایسی

سخن سازی کرو کہ وہ تمہیں رہا کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ ایسا موقع تمہیں پھر نہ ملے گا۔ اسے آخری موقع سمجھو۔

مصطفیٰ مجھے بہت ہی ہیچمدان معلوم ہوا۔ اس نے کوئی کام کی بات نہ کی۔ جانے کیوں وہ جعلی آدمی نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ سامنے بیٹھا ہوا شخص اس کے دلی رازوں سے واقف ہے۔ وہ جھینپا جھینپا دکھائی دیا۔ پہلی بار اسے کسی کے رعب میں آتے دیکھا۔ جنرل سحر انگیز شخصیت کا مالک اور تر زبان تھا۔ وہ راست گو، دو ٹوک بات کرنے والا، کھرا اور گہرا تھا۔ اس نے شاید ہی کوئی بات کی ہو۔ سنتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا قدرت نے اسے بنایا ہی قیادت کے لیے ہے۔ شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی شخص ہمارے درمیان موجود ہے۔

مصطفیٰ کی باتیں سطحی تھیں۔ مجھے مایوسی ہوئی اور میں بے یقینی کا شکار ہو گئی۔ یہی دعا مانگتی رہی کہ مصطفیٰ کی سطحیت جنرل کے مشاہدے میں نہ آئے لیکن مجھے ڈر تھا کہ آئی ایس آئی کے چیف کو ایسی چیزوں کا نوٹس لینے کی تربیت تو ضرور ملی ہو گی۔ میں نے اپنے شوہر، اپنے قائد کو چُرمر ہوتے دیکھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک دیوزاد شخصیت کی ترکی تمام ہوتے ملاحظہ کی۔ میں نے کبھی مصطفیٰ کو اس طرح اردب میں آتے نہ دیکھا تھا۔ شاید یہ سب کچھ جنرل کی زبردست شخصیت کی وجہ سے ہوا۔

جب وہ رخصت ہونے لگے تو بریگیڈیر نے مڑ کر مصطفیٰ سے کہا۔ "آپ کو تہمینہ سے بہتر سفیر کوئی نہیں مل سکتا۔" مصطفیٰ کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے رو کر کہا۔ "تہمینہ کے بغیر میں کہیں کا نہ رہتا۔"

مصطفیٰ نے کہا۔ "اگر میں نے کبھی اپنی خود سوانح لکھی تو میں اقرار کروں گا کہ تم میری سب سے دانش مند سیاسی مشیر تھیں۔"

اگلے دن مارشل لا کے تمام قیدیوں کو رہا کر دینے کے فیصلے کو عدالت نے برقرار رکھا۔ آخر کار مصطفیٰ کے رہا ہونے کا وقت آپہنچا۔ اس پر اور بھی بہت سے مقدمات چل رہے تھے۔ ہمیں تیرہ دوسرے مقدمات میں اس کی ضمانت دینی پڑی۔ مجھے خبر ملی کہ میاں نواز شریف ہر ممکن کوشش کر رہا ہے کہ مصطفیٰ جیل سے باہر نہ آنے پائے۔ اس نے اپنے کارندے بھیجے تاکہ مصطفیٰ کے خلاف بھولے بسرے مقدمات کو از سر نو شروع کروایا جا سکے۔ وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ مصطفیٰ کھر کو آخر کار رہا کر دیا گیا۔

عملی سیاست میں ٹھہرے رہنے کے دوران میں نے دیکھا کہ میں اس روبوٹ سے، جسے مصطفیٰ نے پروگرام کیا تھا، ترقی کرتے کرتے ایک ایسی سوچنے سمجھنے والی ہستی بن گئی ہوں جو آزادانہ عمل کی اہلیت رکھتی ہے۔ ابتدا میں میرا رویہ اسی جیسا تھا، میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اسی کی طرح باتیں کرتی تھی اور کلی طور پر اس کی ہدایت پر تکیہ کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آیا کہ اس کی سیاست کے اسلوب میں اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ عورت کا ہاتھ لگنے کی دیر تھی کہ اسلوب میں وہ مطلوبہ ملائمت اور خلوص پیدا ہو گیا جس کی ان مشکل دنوں میں ضرورت تھی۔ مجھے اس کے کاز پر یقین تھا لیکن میں نے دیکھا کہ میں مصطفیٰ کے سیاسی وژن کا ایک آدرش پسندانہ روپ لوگوں کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں۔ اس طرح میں نے حقیقت کو شاید مسخ کر دیا لیکن یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہی کہ یہ آدرش قابل عمل ہے۔

باب - ۹

بے وفائی

(1988ء - 1990ء)

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

4 نومبر 1988ء کو مصطفیٰ کھر، آزاد فرد کی حیثیت میں، اڈیالا جیل سے باہر آیا۔ وہ اپریل 1987ء سے قید چلا آرہا تھا۔ اس نے سر بلند کر کے جیل سے باہر قدم رکھا۔ میرے لیے ایک طویل اور صبر آزما کشمکش اختتام کو پہنچی۔ اگر میں نے ہمت نہیں ہاری تو اس کی وجہ ایک تو کارکنوں کا سدا بلند رہنے والا جذبہ تھا اور دوسرے مجھے یقین تھا کہ قدرت انصاف کر کے رہے گی۔

ہم اپنے فاتحانہ سفر پر پہلے راولپنڈی اور پھر وہاں سے لاہور روانہ ہوئے۔ مصطفیٰ کے لیے یہ سفر گویا پرانی یادوں کی تجدید کا سامان تھا۔ اس نے گیارہ برس اسی لمحے کے خواب دیکھنے میں بسر کیے تھے۔ جو دیکھنے کو ملا وہ اس کے خواب و خیال کے عین مطابق تھا، بس زیادہ حقیقی نکلا۔

ہم ایک پجیرو میں کھڑے تھے۔ ہمارے سر چھت سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ہجوم اپنے لوٹ کر آنے والے قائد کی جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ مصطفیٰ کے اصرار پر میں اس کے پہلو میں کھڑی ہو گئی۔ بچوں سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ ہجوم کی عقیدت مندی اور جوش و خروش کو دیکھ کر کھڑے کے کھڑے بلکہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ہم نے بہت آہستہ آہستہ ڈرائیو کیا۔ ہر طرف لوگ کاروں کے جلوس کے ساتھ ساتھ دوڑتے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

رہے، ہاتھ بڑھا کر مصطفٰے کو چھونے، اور اس سے مصافحہ کرنے میں مشغول رہے یا انہوں نے اپنی امید کو اقتدار کی نئی علامت پھیرو میں سامنے سے خراماں خراماں گزرتے دیکھنے پر اکتفا کی۔ راستے بھر ہر چھت سے، ہر کھڑکی سے، جوش بھرے چہرے ہماری طرف تک رہے تھے۔ ہم پر گلاب کی اتنی پتیاں نچھاور کی گئیں کہ ہم ان کی خوشبو میں بھیگ گئے۔ مصطفٰے اور میں لوگوں کو دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلاتے رہے۔ عوام اور ان کے قائد کے درمیان یہ وہ مقام تھا جہاں توازن مکمل ہو جاتا ہے۔ قائد عوام سے بندھا ہوا اور عوام قائد سے بندھے ہوئے۔ زمانے کا ایک گریزاں لمحہ جو بدقسمتی سے ووٹ پڑنے سے پہلے وجود میں آتا ہے اور ووٹ ڈالے جانے کے بعد اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

لوگ جشن منا رہے تھے۔ پنجاب کے مشہور لوک ناچ، بھنگڑا اور لڈی، ناچنے میں مصروف تھے۔ ڈھولکی فتح کا آہنگ، سنا رہی تھی۔ ہم نیشنل پیپلز پارٹی کے دفتر پر رکے۔ مصطفٰے نے لوگوں سے خطاب کیا۔ تقریر مارشل لا کے خلاف اور عوام کے حق میں تھی۔ اس میں ان کے اجتماعی خوابوں کا خاکہ کھینچا گیا تھا۔ مصطفٰے جذباتی ہو رہا تھا۔ بار بار اس کی آواز رندھ جاتی تھی۔ سننے والوں میں کم ہی ایسے ہوں گے جو ضبط کا دامن چھوڑ کر رو نہ دیے ہوں۔ یہ مصطفٰے کا دن تھا۔

آخر کار ہم صدیق بٹ کے گھر پہنچے جو ہزاروں رنگین قمقموں سے منور تھا۔ اخبار والے انتظار کر رہے تھے۔ سینیٹر نبی بخش زہری، جو مصطفٰے کی اسیری کی پوری مدت میں میرے پکے اتحادی اور دوست رہے تھے، اپنی بگڑتی ہوئی صحت کے باوجود مصطفٰے کو خوش آمدید کہنے آئے تھے۔ مصطفٰے نے عوام سے خطاب کیا جو اس کی آواز سننے کو ترس گئے تھے، اس کے لفظوں کے بھوکے تھے۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اس نے پریس سے خطاب کیا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کا بیان ہر اخبار کے صفحۂ اول پر چھپے گا۔ مصطفٰے کھر نے ثابت کر دیا کہ وہ چلا ہوا کارتوس نہیں۔

ہم جسمانی اور ذہنی طور پر تھک کر چور ہو چکے تھے۔ نیند آئی تو اس وقت بھی ہم پر سرخوشی طاری تھی۔ اس کے بعد پھر روانگی۔ صبح سویرے۔ لاہور کی طرف۔

ہم گوجر خاں رکے۔ مصطفٰے نے اس ننداے شہر کی سڑکوں کو اپنی سٹیج میں تبدیل کر دیا۔ لوگ دکانیں چھوڑ کر چلے آئے۔ کام بند ہو گیا۔ جو لوگ اس کی باتیں سننے کے لیے ہجوم در ہجوم ارد گرد جمع ہوئے تھے وہ محض تجسس کے مارے اٹھ کر نہیں آئے تھے۔ یہ وہ سامعین تھے جو مصطفٰے کا لوہا مان چکے تھے۔ مصطفٰے کھر نے مدتوں پہلے یہاں آ کر انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ وہ اسے جانتے بھی تھے اور چاہتے بھی تھے لیکن اب وہ بعض مطالبے لے کر آئے تھے۔ وہ سیاسی طور پر باشعور تھے۔ وہ اپنی

حمایت کا یقین دلا رہے تھے لیکن غیر مشروط طور پر نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مصطفٰے ان رنجشوں کو بھلا دے جو اسے پی پی پی سے تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مصطفٰے دوبارہ اپنی اصل پارٹی میں لوٹ آئے۔ معنی خیز بات یہ تھی کہ یہ جذباتی مطالبہ نہ تھا۔ اقتدار کے نقشے کے جو خدوخال ابھر کر سامنے آ رہے تھے یہ مطالبہ ان کا اندازہ لگانے کے بعد کیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف مصطفٰے کھر ہی سیل کا رخ ان کے حق میں پھیر سکتا ہے۔ وہ اسمبلی میں دم دبائے دبے پاؤں جانے کے خواہاں نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فاتحانہ انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے اسمبلی میں داخل ہوں۔ ہجوم نے پارٹی کے حق میں، بھٹو صاحب اور بے نظیر اور شیرِ پنجاب کی حق میں نعرے بلند کیے۔ وہ سوچ کر آئے تھے کہ مصطفٰے کو تن تنہا اپنا سفر جاری نہ رکھنے دیں گے۔ ہمارے جھنڈوں کے مقابلے میں پی پی پی کے جھنڈوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ لوگ جیپ پر چڑھ آئے اور انہوں نے مصطفٰے سے کہا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ پارٹی کو اس کی انتہائی شدید ضرورت ہے۔ یہ ایسا مظہر تھا جس سے ہمیں اپنے مہتم بالشان سفر کے دوران راستے بھر دوچار ہونا پڑا۔

ہمارا اگلا سٹاپ جہلم تھا۔ مصطفٰے نے ایک اور جذباتی تقریر کی۔ میں میجر آفتاب کے گھر والوں سے ملنے چلی گئی۔ وہی نوجوان افسر جس نے ہماری ناکام فوجی بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ اس کی بربادی کے ذمے دار ہم تھے۔ میں میجر آفتاب کی بیوی اور والدہ سے ملی۔ میرا دل ان کے لیے تڑپ تڑپ اٹھا۔ جو کچھ ان پر بیتی تھی انہوں نے اس کی دل ہلا دینے والی تفصیل مجھے سنائی۔ ان کا ڈراؤنا خواب ابھی اس سہانے سپنے میں نہیں بدلا تھا جس کے لیے وہ دعائیں مانگتی رہی تھیں۔ میجر آفتاب ابھی قید تھا۔

کاروں کا جلوس گوجرانوالے کی طرف رینگتا رہا۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک رات کا اندھیرا چھا گیا۔ لیکن گوجرانوالے میں مصطفٰے کا ورود ان چیزوں میں تھا جو صرف خوابوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ پورا شہر فخر و انبساط کی ایک ارتجالی موج پر ڈول رہا تھا۔ چوہدری ارشاد ہمارے ساتھ تھا۔ وہ انتخابات میں گوجرانوالے سے این پی پی کے امیدوار کے طور پر حصہ لے رہا تھا لیکن لوگ ہجوم کر کے مصطفٰے کو دیکھنے آئے تھے۔

اسے جوش سے پاگل حامیوں میں سے دھنس دھنسا کر گزرنا پڑا۔ وہ اسے چھونے، اس کی پیٹھ تھپکنے یا بغل گیر ہونے کے لیے دھکا پیل کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ان کا "یار" تھا مصطفٰے آخر کار خاص طور پر تعمیر کیے ہوئے پلیٹ فارم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہجوم نے بلند بانگ اور انبساط انگیز نعرہ لگا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ وہ شام چھ بجے سے مصطفٰے کا انتظار کر رہے تھے۔ اب ساڑھے نو بجے تھے۔ لیکن ساڑھے تین گھنٹوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ گیارہ سال انتظار کرتے رہے تھے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اُدھر مصطفیٰ تو تقریروں سے ہجوم کا دل بہلا رہا تھا، اِدھر میں آٹوگراف دے رہی تھی۔ میرے اردگرد پرستاروں کی فوج اکٹھی ہو چکی تھی جس میں لڑکیاں بھی شامل تھیں اور لڑکے بھی۔ سب نوجوان لڑکے میری طرف کاغذ کے پرزے، نوٹ بکیں اور روپے روپے کے نوٹ بھجوا رہے تھے۔ میں راولپنڈی سے لاہور تک سارے راستے دستخط کرتی آئی تھی۔ یہ لڑکے بالے، سینکڑوں کی تعداد میں، آٹوگراف کتابیں اور کاغذ کے پرزے ہاتھ میں پکڑے، مجھ پر ٹوٹ پڑتے اور انہیں میری طرف بڑھاتے رہتے۔ ان من موجی لڑکوں کے کبھی ختم نہ ہونے والے تقاضوں کو پورا کرنا ناممکن تھا۔ انہیں مصطفیٰ کے آٹوگراف سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ سب نوجوان لڑکے اور طالب علم تھے۔ وہ سب اجتماعی طور پر میرے شیدائی بن بیٹھے تھے۔ میں ان سے کہتی رہتی کہ شور مچانا بند کریں اور مصطفیٰ کی تقریر سنیں۔ انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

لاہور، پاکستان کا دل۔ یہ گھر کی طرف ایک جذباتی واپسی تھی۔ یہی وہ شہر تھا جس پر اس نے راج کیا تھا۔ یہی شہر اس وقت اس کے گرد جمع ہو گیا تھا جب اس نے بھٹو صاحب سے ٹکر لی تھی۔ اس شہر نے اس رات خود کو مصطفیٰ کے حوالے کر دیا۔ مصطفیٰ کسی بچے کی طرح روتا رہا۔

ہم ایک ٹرک پر سوار ہوئے۔ لاؤڈ سپیکر دہاڑ رہے تھے۔ شیر پنجاب کا استقبال کرنے کے لیے نعرے باز ہجوم سے نعرے لگوا رہے تھے۔ میں نے اردگرد نظر ڈالی۔ ہر طرف بینرز لگے ہوئے تھے۔ بعض میں مجھے مخاطب کیا گیا تھا۔ میں نے دھندلی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کی تو لکھا نظر آیا۔ "پنجاب کی شیرنی، مبارک باد۔ تم شیر کو چھڑانے میں کامیاب رہیں۔" کارکنوں کی سیاسی سوجھ بوجھ کی اتنی بڑی شہادت کے سامنے دفتر کے دفتر ہیچ تھے۔ انہوں نے میرے کردار کا اعتراف کیا تھا۔ میرا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔ یکایک مجھے نظر آیا جیسے میں سچ مچ شیرنی بن کر ٹہلتی پھر رہی ہوں۔

داتا دربار حضرت علی ہجویری کا مزار مبارک۔ اس شہر کے لوگ جسے انہوں نے اپنے ورود مسعود سے افتخار بخشا تھا انہیں پیار سے داتا صاحب کہتے ہیں۔ مصطفیٰ نے مزار کا رخ کیا۔ اپنے تاریک لمحات میں وہ داتا صاحب کی خدمت میں التجا کرتا رہا تھا۔ اب وہ اپنی احسان مندی کا اظہار کرنے حاضر ہوا تھا۔

ایک بار پھر اسی جانے پہچانے مطالبے کی گونج سنائی دی: پیپلز پارٹی میں شامل ہو جاؤ: اکٹھا ہونے والا ہجوم کبھی مصطفیٰ کھر سے جذباتی وفاداری پر مائل نظر آتا تھا، کبھی اپنی پارٹی سے کیا ہوا سیاسی عہدوپیمان نبھانا چاہتا تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ مصطفیٰ ان کے دل اور دماغ میں پھوٹ ڈالنے والے اس تناؤ کو کسی حد تک رفع دفع کر دے۔ پی پی پی

کے بعض حامی بے نظیر کی بہت بڑی تصویر لے کے آئے تھے۔ انہوں نے تصویر مصطفیٰ کے پہلو میں رکھ دی۔ فلیش بلب چٹاچٹ جلنے لگے۔ کارکنوں نے اصرار کیا کہ مصطفیٰ ان کی جواں سال رہنما کی تصویر اٹھا لے۔ مصطفیٰ نے ایسا ہی کیا۔ اسے زبردست داد ملی۔ یہ ایک علامتی حرکت تھی۔ میں نے مصطفیٰ کی بے اطمینانی کو محسوس کیا۔ لوگ اس کے رہنما بن گئے تھے۔ اسے مجبور کر رہے تھے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی کو جو اسے انکل کہتی تھی، اپنا قائد تسلیم کر لے۔

داتا دربار میں اس نے ہجوم سے خطاب کیا۔ "میں عوام کے لیے، کارکنوں کے لیے جنہوں نے مجھے سیاسی طور پر زندہ رکھا، جو بھی مجھ سے بن پڑا کروں گا۔ پیپلز پارٹی میری پارٹی ہے۔ اس پارٹی کے کارکن میرے دوست ہیں، میرے بھائی ہیں۔ مجھے پارٹی سے یا کارکنوں سے کوئی شکایت نہیں۔ میرے پارٹی کی قیادت کے ساتھ اختلافات ہیں۔ ان اختلافات کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔" مصطفیٰ کے مصالحت آمیز لہجے سے کچھ امید بندھی۔

ہمیں ایک زیارت اور کرنی باقی تھی۔ نانی اماں کے گھر کی زیارت جو جائے امن و سلامتی تھا۔ ان کی طبیعت کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھی لیکن ہم دونوں کو دیکھتے ہی ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہیں مجھ سے پیار تھا اور میرا دکھ انہیں اپنا دکھ لگتا تھا۔ جس طرح انہوں نے مصطفیٰ کی رہائی کے لیے دعائیں مانگی تھیں کسی اور نے کب مانگی ہوں گی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت یہی دعائیں مانگتے گزارا تھا کہ مجھے خوشیاں نصیب ہوں اور میری زندگی جو ہلچل مچی رہتی ہے وہ ٹھنڈی پڑ جائے۔ ہماری واپسی کے بعد اور اس تمام عرصے میں، جو مصطفیٰ کی آزمائش کا دور تھا، ان کا بیشتر وقت جانماز پر گزرا تھا۔ وہ جانماز پر بیٹھی، سجدہ ریز ہو کر، آہ وزاری کر کے، اللہ کے حضور میں گڑگڑاتی رہتیں کہ ہماری مشکل آسان ہو جائے۔

ہم نے نانی اماں کے ساتھ کھانا کھایا۔ تھکن کے باوجود آخرکار امن چین سے بیٹھنا نصیب ہوا۔ گلاب کی مسلی ہوئی پنکھڑیوں سے ہمارے کپڑے لال ہو گئے تھے۔ ہم پر اتنی دھول پڑ چکی تھی کہ لگتا تھا جیسے بہت دن سے نہائے نہ ہوں۔ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ آنکھوں کے گرد کلولس جم کر ہمارے پسینے میں گھل مل چکی ہے۔ اس کے باوجود ہم گھر لوٹ آئے تھے۔ اب اور کس بات کی پروا ہو سکتی تھی۔

اگلے دن علی الصبح مصطفیٰ اور میں اس حلقے میں گئے جہاں سے اس نے میاں نواز شریف کے خلاف انتخابی جنگ لڑنی تھی۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکی تھی۔ میں نے گردو پیش کا جائزہ لیا تھا اور یہ دیکھ کر میرا حوصلہ ڈگمگا گیا تھا کہ میرے سامنے کس قدر زبردست

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کام ہے۔ در در ووٹ مانگنے کے خیال سے مجھے خفت اور گھبراہٹ ہونے لگی۔ مصطفےٰ نے کہا کہ عوام کی حمایت حاصل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ علاقے کے لوگ مجھ سے ناواقف تھے۔ انہیں میرے بارے میں گرم جوشی ظاہر کرنے میں کچھ وقت لگا۔ مصطفےٰ ان کے حقوق کا علم بردار تھا۔ اس کے ان کے درمیان موجود ہونے سے جو جوش و خروش پیدا ہو سکتا تھا اسے مصطفےٰ کی بیوی کی موجودگی کہاں سے پیدا کرتی۔ اصل امیدوار کی نقل بن کر میدان میں اترنا نہایت مشکل کام ثابت ہوتا۔ اس بار مصطفےٰ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ہر چیز آسان لگ رہی تھی۔

مصطفےٰ کے آنے کی خبر آن کی آن میں پھیل گئی۔ لوگ اس سے ملنے کے لیے جمع ہو گئے۔ مصطفےٰ کے جوہر تو ایسے ہی ماحول میں کھلتے تھے۔ وہ لوگوں سے اس طرح گفتگو کرتا رہا جیسے ان کے تعلقات کے تسلسل میں کوئی وقفہ نہ آیا ہو۔ اس نے ہر کسی کے بارے میں نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور لگتا تھا کہ وہ ان سب کا بہت قریبی واقف ہے۔ اس میں نہ کوئی تکبر تھا نہ عوام سے الگ نظر آنے کی خواہش۔ وہ بس ہجوم میں گھل مل گیا جو اس کا احترام بھی کر رہا تھا اور گہری رفاقت کا احساس بھی دلا رہا تھا۔ اسے لوگوں سے یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ ووٹ اسی کو دیا جائے۔ ان سے مل لینا ہی کافی تھا۔ اس سے پہلے جب میں یہاں آئی تھی تو مجھے دہری خفت اٹھانی پڑی تھی۔ ایک تو میں جس سے بھی ملتی پہلے اس سے اپنا تعارف کرانا پڑتا۔ اس کے بعد میں کہتی کہ میرے اسیر شوہر کو ووٹ دیا جائے۔ انہیں لوگوں نے، جواب اسے بغل گیر ہو رہے تھے۔ اور ماتھا چوم رہے تھے، مجھ سے اس وقت ایسا سلوک کیا تھا جیسے میں کوئی غیر ملکی ہوں۔

اگلے دن بھی ہم نے حلقہَ انتخاب کا دورہ کیا۔ مصطفےٰ نے اپنا مشہور بیان دیا کہ وہ یہاں بھٹو صاحب کے خادم کی حیثیت میں آیا ہے۔ وہ امید کر رہا تھا کہ حلقے سے پی پی پی کا امیدوار اس کے حق میں دست بردار ہو جائے گا تاکہ اس کے اور وزیر اعلیٰ کے درمیان براہ راست مقابلے کے لیے میدان خالی ہو جائے۔ اسے پتہ تھا کہ اس کے بیشتر ووٹر پیپلز پارٹی کے پکے ساتھی ہیں۔ اس کے میدان میں آنے سے یہ ووٹ بٹ جائیں گے۔ نواز شریف آسانی سے جیت جائے گا۔ جب پی پی پی نے مصطفےٰ کھر کی امیدواری پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کر دیا تو مصطفےٰ نے کاغذات واپس لے لیے وہ نواز شریف، سے اپنے ناگزیر ٹکراؤ کو کسی اور دن، کسی اور جگہ کے لیے ملتوی کر رہا تھا۔

مصطفےٰ کی نظر میں مظفر گڑھ زیادہ فیصلہ کن تھا۔ اس نے قومی اسمبلی کی دو اور صوبائی اسمبلی کی دو نشستوں کے لیے کاغذات نامزدگی داخل کیے تھے۔ ہم مظفر گڑھ جانے

کے لیے ملتان روانہ ہوئے۔ مصطفےٰ کے اپنے شہر میں ہماری تاریخی آمد کو ریکارڈ کرنے کے لیے پریس موقع پر موجود تھا۔ میں کار میں جا بیٹھی اور انتظار کرنے لگی کہ وہ پریس سے مل ملا کر فارغ ہو گا تو میرے پاس آجائے گا۔ مصطفےٰ نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے بڑے پُراعتماد لہجے میں گفتگو کی۔ "قومی سیاست میں حصہ لینے کے لیے مجھے بہت دیر میں رہا کیا گیا۔ میں اس ملک میں سیاست کا رخ بدل دوں گا۔" پھر اس نے اپنی توپوں کا رخ پنجاب کے تخت و تاج کے دعوے دار، نواز شریف کی طرف پھیر دیا۔ "نواز شریف نے پنجاب جنرل جیلانی سے خریدا ہے، بعینہ کشمیر مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے خریدا تھا۔ میں عوام کی حمایت سے پنجاب کو آزاد کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں صوبے کو غاصبوں سے چھین کر رہوں گا۔" یہ تقریر میاں صاحب کو ضرور چبھی ہو گی۔ نواز شریف کو چونکہ کشمیری نژاد ہونے پر بڑا ناز تھا اس لیے کشمیر کی طرف اشارہ اسے اکھرنا ہی چاہیے تھا۔

مظفر گڑھ پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہم ان کیچڑ بھرے کچے راستوں سے گزرے جنہیں سڑک کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن تاریکی کے باوجود ہمیں شکلیں نظر آرہی تھیں۔ ہم بھنبھناہٹ سن سکتے تھے۔ یہ شادمان ہجوم تھا۔ لاکھوں آدمی، جن کے صرف سیاہ خاکے نظر آرہے تھے، ناچنے، تالیاں بجانے اور نعرے لگانے میں مصروف تھے۔ لالٹینیں روشن تھیں، مشعلیں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔ جیسے ازمنہَ وسطیٰ کے ماحول میں کوئی جدید ڈرامہ دکھایا جارہا ہو۔ مشعلوں کی جھلملاتی قطاروں میں اب دھندلی، غیر واضح شکلیں نظر آنی شروع ہوئیں۔ یہ تیسری مرتبہ تھا کہ وہ اپنے کھنڈلوں سے، اپنی بھوک، اپنی محتاجی کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ جس منبع سے وہ جوش و خروش اور محبت حاصل کر رہے تھے وہ اتھاہ معلوم ہوتا تھا۔

پھٹے پرانے کپڑوں سے محض ان کے ننگے جسم ہی نمایاں نہ تھے۔ ہمیں ان کے دل بھی نظر آرہے تھے۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہی وہ چہرے ہیں جو مایوسی بھرے کینوس سے میری طرف تکتے رہتے تھے۔ لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر۔ اور بھی دکھ ہیں۔ اور بھی دکھ۔ میں اپنی زندگی ان گلیوں کوچوں میں بھرے مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے وقف کر چکی تھی جنہوں نے خوف پر فتح پالی تھی، جنہوں نے اس رواج کو للکارا تھا جو کہتا تھا کہ ظلم کو چپ چاپ سہتے رہنا چاہیے۔ وہ اس وقت سر اٹھائے، سینہ تانے چل رہے تھے۔ ان کا محافظ ان کے درمیان تھا۔ مظفر گڑھ میں ان ہجوموں کو دیکھ کر مجھے پاکستان لوٹ آنے کا جواز ہاتھ آگیا۔

مصطفےٰ گھر لوٹ آیا تھا۔ عوام نے اس کے قدموں کے نقوش کو محفوظ رکھا تھا۔ وہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اپنے عوام سے مل رہا تھا۔ وہ ان کے ناموں سے واقف تھا۔ جب اسے کوئی مانوس چہرہ نظر آتا تو وہ ہجوم میں غائب ہو جاتا۔ وہ کسی بوڑھے آدمی کو گلے لگا لیتا اور آپس میں پندونصائح کا تبادلہ ہوتا۔ یہ دیکھ کر میرے دل پر بہت اثر ہوا کہ مصطفیٰ کو خوش آمدید کہنے کے لیے عورتیں سخت پردے سے باہر آگئی تھیں۔ اس سے پردہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ان کا باپ تھا، بھائی تھا، بیٹا تھا۔ مردوں نے اپنی عورتوں کی موجودگی کا برا نہ مانا۔ اس طرح مرد گویا یہ بیان جاری کر رہے تھے: مصطفیٰ ایک عزت دار آدمی ہے جو ان کی عورتوں کی آبرو اور عصمت کی حفاظت کرے گا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مصطفیٰ حقیقی اسلامی حکم کی پابندی کرتے ہوئے عورتوں کی موجودگی میں اپنی نظر نیچی رکھے گا۔ نجات کا وقت قریب تھا۔ نجات دہندہ آپہنچا تھا۔ ان کی قسمت معجزاتی طور پر بدلنے والی تھی۔ ہمارا جلوس اپنے پیچھے بہت سی گرد اور امید چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

ہم آخر کار غلام غازی کھر کے گھر پہنچے۔ غلام غازی فوت ہو چکا تھا اور مصطفیٰ اس کے گھر ٹھہرنا چاہتا تھا۔ یہ گھر آنے والے دنوں میں مصطفیٰ کا انتخابی ہیڈکوارٹر بن گیا۔

مصطفیٰ نے کوئی انتخابی مہم نہیں چلائی۔ عوام تو پہلے ہی ووٹ دے چکے تھے۔ مصطفیٰ کو فتح کا یقین تھا۔ وہ ان نشستوں سے جب جی چاہے جیت سکتا تھا۔ اس نے دورے ضرور کیے لیکن ووٹ لینے کے لیے نہیں، لوگوں سے ملنے کے لیے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہجوم کے ہجوم نہ جانے کہاں سے نمودار ہو جاتے۔ کوٹ ادو، سناواں، چھوٹے چھوٹے قریے، جنہیں اس نے ایک امتیازی شناخت عطا کی تھی۔ یہ اس کا جاگیرستان تھا۔ بغیر کسی تردد کے خود بخود منعقد ہونے والے جلسے۔ جیسے ہی مصطفیٰ ان سیدھے سادے، راست باز سامعین سے خطاب کرنے کو کھڑا ہوتا ہر طرف سے لوگ دوڑ دوڑ کر اس کے گرد اکٹھے ہونے لگتے۔ مصطفیٰ نے خاص خیال رکھا کہ اپنے حلقے کا کوئی بعید ترین گوشہ بھی ایسا نہ رہے جہاں اس کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ وہ ان علاقوں میں آباد کار پٹھانوں سے مخاطب ہوا اور اپنے مجبور سامعین کو مسحور کرتا رہا۔

مصطفیٰ کے تین بھائی میدان میں اتر چکے تھے۔ صوبائی اسمبلی کا سابق رکن، غلام ربانی کھر، صوبائی نشست پر کھڑا ہوا تھا اور غلام مرتضیٰ کھر قومی اسمبلی میں نشست حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ مصطفیٰ نے اپنے بھائیوں کے خلاف مہم چلانے مجھے بھیج دیا۔ میں نے دیکھا کہ ہجوموں نے میرے لیے بھی اسی جوش اور جذبے کا مظاہرہ کیا جو وہ مصطفیٰ کے لیے کرتے آئے تھے۔ میں مصطفیٰ کی بیگم ہونے کے ناطے احترام کی مستحق ٹھہری۔ میری وجہ سے ان کی بڑی عزت افزائی ہوئی۔ ایسے ماحول میں جہاں عورتیں زنان خانے میں پیدا ہوتی ہیں، وہیں زندگی گزار دیتی ہیں، وہیں فوت ہو جاتی ہیں، میں

انہیں ضرور بہت انوکھی معلوم ہوئی ہوں گی۔

میری تقریروں کا مرکزی موضوع بے وفائی تھا۔ مصطفیٰ کے بھائیوں کا خون سفید ہوگیا ہے۔ وہ دشمن کے ڈیرے میں جا بیٹھے ہیں۔ انہوں نے ان لوگوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے جو ان کے بھائی کو قید میں ڈالے رکھنے کے ذمے دار تھے۔ میں نے اپنے پُرشوق اور جذبات سے بھرے سامعین کو بتایا کہ انہوں نے جیل میں پڑے اپنے بھائی سے باقاعدگی سے ملاقات کرتے رہنے کی زحمت تک نہ کی تھی اس لیے مجھے، ایک عورت کو، جو مصطفیٰ کی ناموس ہے، مجبوراً گھر سے نکل کر مصطفیٰ کی خاطر جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ میں نے مسلم لیگ کو ضیاء کی تخلیق قرار دے کر برا بھلا کہا اور حاضرین کو بتایا کہ مصطفیٰ کے بھائی اس کے دشمنوں سے جا ملے ہیں۔ "کیا وہ اسے معاف کر سکتے ہیں؟" پھر بھی 1985ء کے انتخابات میں انہیں محض اس لیے ووٹ ملے تھے کہ ان کے نام اور مصطفیٰ کے نام میں کھر جزوِ مشترک تھا۔ میں نے کہا کہ مسلم لیگ کو ووٹ دینا ایک ایسی حکومت پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے مترادف ہوگا جس نے مصطفیٰ سے اس کی زندگی کے گیارہ سال چھین لیے تھے جس نے اس کی ساری املاک ضبط کر لی تھی، جس نے اسے اپنے عوام سے جدا کر دیا تھا۔

غلام ربانی اچھا پارلیمنٹیرین ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنے حلقے میں کام کر کے دکھایا اور اس کی مقبولیت میں فرق نہ آیا تھا۔ عوام اس خواب غفلت سے بیدار ہو چکے تھے جس میں وہ نیند میں چلنے والوں کی طرح ووٹ ڈالنے جایا کرتے تھے۔ اب وہ سوچ سمجھ کر ووٹ ڈالتے تھے۔ وہ مرتضیٰ کھر کو ووٹ دینے کو تو تیار نہ تھے کیونکہ مصطفیٰ بذات خود مرتضیٰ کے مقابلے میں کھڑا تھا لیکن ربانی کو اس کے سابقہ ریکارڈ کی بنا پر، ووٹ دے کر دوبارہ جتوانا چاہتے تھے۔ ربانی کے مقابلے میں کھڑا ہونے والا این پی پی کا امیدوار حلقے کے ووٹروں کو قبول نہ تھا۔ مصطفیٰ نے اپنے بھائی عربی سے مقابلہ کیا جو این پی پی جتوئی گروپ کی طرف سے امیدوار تھا۔ عربی ہار گیا۔

مصطفیٰ کا بیٹا عبدالرحمن بھی صوبائی اسمبلی کی نشست کا انتخاب لڑ رہا تھا۔ اس کا مقابلہ دستی سے تھا۔ مصطفیٰ نے اپنے بیٹے کی انتخابی مہم میں حصہ نہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلام عربی کی سرگرم حمایت کی وجہ سے دستی جیت گیا۔ مجھے افسوس ہوا کہ مصطفیٰ نے قومی اسمبلی کی نشست کے لیے عربی کے خلاف انتخاب لڑا۔ غلام عربی اس نشست سے کامیاب ہونے کا مستحق تھا۔

انتخابات کا دن اکتا دینے والا ثابت ہوا۔ اتنے کم تناؤ کی صورت میں اور کیا ہوتا۔ مصطفیٰ کو معلوم تھا کہ وہ جیت جائے گا۔ ہوا بھی یہی۔ وہ اپنی تمام نشستوں پر کسی وقت

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کے بغیر کامیاب ہو گیا۔ قومی اسمبلی کی نشست تو اس نے ساٹھ ہزار ووٹوں کے فرق سے جیتی۔ غلام مرتضیٰ کے اپنے ملازموں نے اس کے خلاف ووٹ ڈالے۔ شور اتنا تھا پر تماشا نہ ہوا۔ اس رات میں ٹی وی دیکھنا چاہتی تھی تاکہ پتہ چلے کون کون سی پارٹی کامیاب ہوئی ہے۔ مصطفیٰ سونا چاہتا تھا۔ نتائج معلوم کرنے کی جلدی ہی کیا تھی۔

ہم نے کوٹ ادو میں دو دن اور قیام کیا جن کے دوران مصطفیٰ گھوم پھر کر لوگوں کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ اتنی زیادہ دوڑ دھوپ سے اس کے اعصاب پر جو بوجھ پڑا تھا اس کے اثرات اب ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ اس کی قوت ارادی، جو اس طوفانی انتخابی مہم کے پورے عرصے میں اسے آگے ہی آگے بڑھنے پر اکساتی رہی تھی، اب کمزور پڑنے لگی۔ وہ وائرس سے پیدا ہونے والے فلو میں مبتلا ہو گیا اور اسے نشتر ہسپتال میں داخل ہونا پڑا لیکن اب اس نے آزاد فرد اور عوام کے منتخب نمائندے کے طور پر وہاں قدم رکھا۔ دو دن بعد اسے فارغ کر دیا گیا۔ ہم لاہور واپس آ گئے۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، اتنی رفعتوں کو چھونے کے بعد ہمیں پستی سے دوچار ہونا پڑا۔

مصطفیٰ کے ساتھ پاکستان آنے کے بعد میرا اپنے خاندان سے کوئی رابطہ نہ رہا تھا۔ میرے بے یارو مددگار بچوں کے ساتھ لندن میں میرے گھر والوں نے جو سلوک کیا تھا اس کی وجہ سے میرا دل اب تک جل رہا تھا۔ اب خوشی اور غم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہمارے سامنے ظاہر ہوئے۔ جس روز مصطفیٰ کو جیل سے رہائی ملی اسی دن زرمینہ اور رو بینہ نے مجھے فون کیا جسے سن کر میں بہت شرمندہ ہوئی۔ والد صاحب نے کسی اور عورت سے تعلق پیدا کر لیا تھا اور امی ذہنی طور پر تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ والد صاحب ذرا سی چھوٹ دینے کو بھی تیار نہ تھے۔ میری بہنیں چاہتی تھیں کہ ہم مل بیٹھیں اور ان کی ازدواجی زندگی اور اپنے خاندان کو بچانے کی کوشش کریں۔ عین اس وقت جب مصطفیٰ جیل کے دروازوں سے باہر قدم رکھ رہا تھا میرا ذہن ڈانواں ڈول تھا۔ خوشی اور حزن کے اس عجیب اتصال پر میں حواس باختہ ہو کر رہ گئی تھی۔ میری زندگی کیا تھی ایسی سیربین تھی جو کسی نچلے نہ بیٹھنے والے لڑکے کے ہاتھ آ گئی ہو۔

جو ناگزیر تھا وہ ہو کر رہا۔ سالہا سال جبر سہنے کے بعد والد صاحب نے کہا بس بہت ہو گیا اور امی سے منہ موڑ کر چل دیے۔

بہت برس بعد امی نے آخر کار جی کڑا کر کے ایسا راز ظاہر کیا جسے انتہائی احتیاط سے چھپایا گیا تھا۔ امی کو معلوم تھا کہ ہمیں یہ بات ناگوار ہے کہ وہ والد صاحب کے سر پر سوار رہتی ہیں اور ان کے سرکاری کام کاج میں دخل دیتی ہیں۔ امی نے بتایا کہ اگر وہ والد صاحب کو کھلی چھٹی دے دیتیں تو وہ اپنا بیڑہ غرق کر لیتے۔ ان کا جسمانی نظام الکحل کو

بالکل برداشت نہ کر پاتا تھا۔ جب بھی کسی بحران کا سامنا ہوتا والد صاحب، دنیا و مافیہا کو بھلانے کے لیے، شراب کا سہارا لینے کی طرف مائل ہو جاتے۔ ایسا کرنا ان کے حق میں سخت نقصان دہ تھا۔ الکحل انہیں مفلوج کر سکتا تھا۔ بحران کے وقت امی کو ان کی تمام حرکتوں کو کنٹرول کرنا پڑتا تھا، ان پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔ یہ بات امی ہر کسی سے چھپائے رہیں۔ امی ان پر کسی شکرے کی طرح نظر جمائے رکھتیں۔ جب لندن میں چارٹر کلینک کے نفسیاتی معالج نے آخر کار امی اور زرمینہ سے بات کی تو کہنے لگا۔ "مسز درانی، آپ نے نہ صرف اپنی زندگی کی بنیاد جھوٹ پر رکھی بلکہ خود جھوٹ بن گئیں۔ آپ نے ایک لنگڑے آدمی کو لنگڑانے کا موقع نہیں دیا۔" ہم سب امی کو بہتر طور پر سمجھنے لگے۔ انہوں نے خاندان کی نیک نامی کی خاطر عظیم ترین قربانی دی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی جبلی نرمی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں۔ شوہر کی بیساکھی بننے کے لیے انہوں نے اپنی پوری شخصیت بدل ڈالی تھی۔

جب وہ شوہر کو کھو بیٹھیں اور وہ انہیں چھوڑ کر کسی اور عورت کے پاس چلا گیا تو اپنے دفاع میں کچھ کہنے کا وقت ہی گزر چکا تھا۔ جو کچھ ہمارے ساتھ بیتی تھی اس کے لیے سب نے امی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ کسی نے یہ نہ دیکھا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ میں انہیں کی بیٹی تھی۔ جس شخص سے مجھے محبت تھی اسے بچائے رکھنے کی ضرورت سے زیادہ کوشش کرتی تھی۔ میں بھی یہ سمجھ کر اس کی کوتاہیوں اور نقائص پر پردہ ڈالتی رہی کہ ایسا کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔ میں نے دکھ سے لیکن اپنے ظاہر سے، اپنے رویے سے، کسی کو ہرگز جو پتہ چلنے دیا ہو کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔

امی کو یہ سب کچھ ہمیں بتانے میں اڑتیس برس لگے۔ بتایا تو اتنی دیر ہو چکی تھی کہ کوئی مداوا ممکن نہ تھا۔ مجھے سب کچھ بتا دینے میں کم عرصہ لگا ہے۔ ہم دونوں جب اپنی ریاکاری اور جھوٹے امیج کے خول سے باہر آئیں تو ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں اور دنیا نے ہمارے بارے میں غلط رائے قائم کر لی۔ جس بات کا ہم دوسروں کو یقین دلاتے رہے تھے ہم نے خود بھی اس پر یقین کرنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہمارے شوہر جو ہیں وہ عظیم انسان ہیں۔

قومی اسمبلی کے سیشن سے پہلے ہم نے فیصلہ کیا کہ والدین سے ملنے کراچی چلتے ہیں۔ میں ان تمام تکلیفوں کو بھلا دینے کے لیے تیار تھی جو امی نے مجھے پہنچائی تھیں۔ میں نے انہیں معاف کر دیا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ ان آدمیوں میں سے ہیں جو ظاہری آن بان کے سہارے جیتے ہیں اور اس سے بڑی رسوائی ان کے حصے میں کیا آ سکتی تھی کہ والد صاحب انہیں ٹھکرا کر چلے گئے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ جب میرا آپریشن ہو رہا تھا تو

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

انہوں نے کتنی سنگدلی کا ثبوت دیا تھا اور جب میرے بچے لندن گئے تھے تو وہ ان کے ساتھ کس طرح پیش آئی تھیں۔ اس کے باوجود جانے کیوں میرا دل چاہا کہ ساتھ دوں گی تو انہیں کا دوں گی۔

ہوائی اڈے پر روبینہ اور عدیلہ ہمیں لینے آئیں۔ میری عدیلہ سے مدتوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ لینہ اور محمد۔ اس کا شوہر، مطلوب، بھی موجود تھا۔

ہم امی سے ملنے گئے۔ وہ غم کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ ان کی استقامت اور بارعب وضع قطع سب ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ ان کی خود پسندی خاک میں مل گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ والد صاحب نے صبیحہ حسن سے شادی کر لی ہے۔ جب وہ سٹیٹ بینک کے گورنر تھے تو صبیحہ ان کے ساتھ کام کرتی رہی تھی۔ وہ پچاس برس کی تھی۔ والد صاحب ساٹھ کے تھے۔

اس بات سے مجھے زبردست صدمہ پہنچا۔ ان مسائل کے باوجود، جو ہمارے خاندان کو کسی موذی مرض کی طرح چمٹے رہتے تھے، ہمارے والدین کی شادی بظاہر نہایت مضبوط اساس پر قائم تھی۔ دنیا کے سامنے انہوں نے اپنا یہی امیج پیش کیا تھا۔ ہمیں کبھی پتہ نہ چلنے دیا گیا تھا کہ کتنے بدنما داغوں پر لیپاپوتی کی گئی ہے اور زخموں کے کتنے نشانوں کو چھپایا گیا ہے۔ والد صاحب کی اس حرکت سے امی کو بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ وہ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھیں۔ میں نے جبلی طور پر امی کا ساتھ دیا۔ میں ایسی عورت کے ساتھ ہمدردی کر سکتی تھی جسے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ہو۔

میں نے والد صاحب سے بات کی۔ انہوں نے الزام لگایا کہ امی ان پر حکم چلاتی رہتی تھیں اور ان پر اتنی بندشیں عائد کر دی گئی تھیں کہ ان کے لیے اپنی مرضی کی زندگی گزار نا محال ہو چکا تھا۔ انہوں نے والد صاحب کو زبردستی وہ کچھ بنا دیا جو وہ نہیں تھے۔ "آدمی کو کبھی اپنے سے اونچے خاندان کی عورت سے شادی نہ کرنی چاہیے" انہوں نے وضاحت کی۔

امی نے انہیں اپنے پٹھان ماضی سے رشتہ منقطع کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہیں اپنے رشتے داروں سے ملنے، اپنے آبائی گھر جانے سے باز رکھا جاتا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ والد صاحب بھول جائیں کہ وہ ایک ادنیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ والد صاحب کو فوج سے الگ ہونا گراں گزرا تھا۔ فوجی زندگی کی یاد انہیں ستاتی رہتی تھی۔ انہیں اپنی زندگی سے نفرت تھی۔ زندگی کیا تھی ایک مسلسل بہروپ تھی۔ ریاکار بنے رہنے سے اپنا اور دوسروں کا احتساب کرتے رہنا بہتر تھا۔ صبیحہ حسن نے انہیں جوں کا توں قبول کر لیا

تھا۔ دونوں کے تعلق میں کوئی دباؤ کوئی تناؤ نہ تھا۔ "میرے لیے اتنا عظیم آدمی بن کر رہنا ضروری نہیں جو تمہاری امی نے مجھے بنا دیا۔ میں بڑا آدمی نہیں تھا۔"

ان کی یہ سیدھی سادی سوچ میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ زندگی کے آخر میں برپا ہونے والے بحران سے گزر رہے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے اچانک اپنی بیگم کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر کے غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تھا، خصوصاً ایسی صورت میں کہ ان کی تمام اولاد شادی شدہ تھی اور وہ پندرہ بچوں کے نانا دادا بن چکے تھے۔ میں ان کی یہ دلیل قبول نہ کر سکی کہ انہوں نے ساٹھ برس میں صرف ایک دفعہ ردعمل ظاہر کیا ہے۔ کہنے لگے کہ اگر انہیں صرف پانچ برس اور جینا ہے تو وہ یہ مدت ہنسی خوشی گزارنے کو ترجیح دیں گے۔ "تم لوگ چاہتے ہو کہ میں اپنا امیج بنائے رکھنے کی خاطر ایک جھوٹ کو جیے جاؤں۔ میرے لیے اپنی زندگی زیادہ اہم ہے۔ یہ اہم نہیں کہ تم میرے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہو۔"

بظاہر والد صاحب نے اس دباؤ میں آ کر امی کے ساتھ رہنے پر آمادگی ظاہر کی تھی کہ اگر وہ الگ ہو گئے تو بیٹیوں کے مستقبل کا کیا بنے گا۔ زرمینہ اور عدیلہ دونوں کی شادیاں والدین کی پسند سے ہوئی تھیں۔ دونوں مشہور جاگیردار خاندانوں میں بیاہی گئی تھیں۔

ہم نے سوچا کہ والد صاحب نے بہت خود غرضی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو ایسی مشکل میں ڈال دیا جہاں ان کا اس لگاوٹ بازی کے ذکر سے شرمندہ ہونا لازمی تھا۔ امی انہیں معاف نہ کر سکیں۔

اس بہت ہی اجیرن سفر کا واحد مثبت پہلو عدیلہ تھی۔ ہمارے تعلقات میں تبدیلی آ گئی۔ مجھے اس کی صورت میں وہ چھوٹی بہن مل گئی جس کی میں ہمیشہ آس لگائے رہتی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی۔ اس نے بتایا کہ وہ مجھ سے اتنی ہی قریب ہونا چاہتی ہے جتنی زرمینہ اور منو ہیں۔ وہ میرے ساتھ لاڈ کرتی۔ چاہتی کہ میں زیادہ دلکش نظر آؤں۔ اسے میرا نیا امیج ناپسند تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں نے اپنے "خوبصورت" لباس کیوں تہ کر کے رکھ دیے ہیں اور سفید سوتی کپڑوں اور چاندی کے زیورات پر اکتفا کیوں کرتی ہوں۔ اس نے سفید رنگ کے بارے میں میری سوچ کو بدلنا چاہا۔ مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ضد کرتی رہی کہ میں چہرے پر سرخی اور پاؤڈر لگایا کروں اور ناخنوں کو پینٹ کرتی رہوں۔ عدیلہ مجھے منانے کی کوشش کر رہی تھی۔ منانے کا اور کوئی طریقہ اسے آتا نہ تھا۔

مصطفٰے کے ساتھ اس کا رویہ بہنوں کی سی محبت والا تھا۔ یہ رویہ واضح تھا۔ وہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مصطفیٰ سے دُور دُور رہتی اور یہ فاصلہ بڑے لطیف انداز سے قائم رکھا جاتا۔

میں بڑے چین سے رہ رہی تھی۔ میرا خاندان مجھے واپس مل گیا تھا۔ میرے خاندان نے مجھے میری شرائط پر واپس قبول کیا تھا۔ میں ایک مختلف حیثیت میں لوٹی تھی۔ اب میں کوئی کیڑا مکوڑا نہ تھی جو رینگتا پھر رہا ہو اور کچلا جانے والا ہو۔ انہوں نے مجھے تہمینہ کھر کے روپ میں دیکھا۔ ایسی عورت کے روپ میں جو کامیاب تھی۔ جس نے اپنے شوہر کے لیے ایک ایسی مسلسل جنگ لڑی تھی جس میں ذراسی بھی رو رعایت نہ برتی گئی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ میں اس کی سیاسی زندگی میں حصہ لے رہی ہوں۔ میرا اعتماد امتحان میں پورا اترا تھا۔ یہ اعتماد میرے اندر سے پھوٹا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کون ہوں، مجھے معلوم تھا میں کتنی مضبوط ہوں۔ مصطفیٰ کو معلوم تھا کہ میں اپنی شناخت رکھتی ہوں۔ اسے معلوم تھا کہ میں اپنا پتہ چلانے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ میں جو کچھ ہوں اسے تحسین کی نظر سے دیکھتی ہوں، اپنا احترام آپ کرتی ہوں۔ مصطفیٰ بھی مجھے تحسین کی نظر سے دیکھتا تھا، میرا احترام کرتا تھا۔ اس نے مجھے ڈھیر سارا پیار دیا، عزت دی۔ یہ بات میرے خاندان والوں کے مشاہدے میں آئی۔

گھریلو بحران سے نمٹنے کے بعد ہم سیاسی معاملات کی طرف متوجہ ہوئے۔ خاندان اور سیاست نے بعد میں یکجا ہو کر آفت ڈھائی تھی۔

جتوئی صاحب انتخابات میں نہ صرف ہار گئے تھے بلکہ سیاسی رہنما کے طور پر ان کی شہرت بھی خاک میں مل چکی تھی۔ نواب شاہ کو روایتی طور پر ان کی محفوظ نشست سمجھا جاتا تھا لیکن اندرون سندھ پی پی پی کے حق میں جس لہر نے زور باندھا تھا اس کے سامنے جتوئی صاحب کے قدم اکھڑ گئے۔ مصطفیٰ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پرانے دوست اور ساتھی کو سہارا دے گا۔

ہم لاہور واپس پہنچے اور مصطفیٰ نے میاں نواز شریف کے ساتھ گفت و شنید کا آغاز کیا۔ پہلی ملاقات کے بعد مصطفیٰ نے وزیر اعلیٰ کے بارے میں اپنے تاثرات میرے سامنے بیان کیے۔ "میاں صاحب بہت نروس تھے۔ میری موجودگی سے ان پر گھبراہٹ طاری تھی۔ انہوں نے مجھے بہت کچھ دینے دلانے کی پیشکش کی۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں آئی جے آئی کی حمایت کروں۔ انہیں خدشہ ہے کہ میں پی پی پی میں شامل ہو جاؤں گا۔ لیکن وہ مجھے دے ہی کیا سکتے ہیں؟ میں صرف ایک ہی عہدے میں دلچسپی رکھتا ہوں اور وہ وزیر اعلیٰ کا عہدہ ہے۔ یہ میاں صاحب کو بھی پتہ ہے۔"

پاکستان کے صدر کے لیے انتخابات ہو رہے تھے۔ غلام اسحاق خاں اور نوابزادہ نصر اللہ خاں دونوں امیدوار تھے۔ میں سمجھتی تھی کہ مصطفیٰ اپنا ووٹ ثانی الذکر کو دے گا۔

نوابزادہ ہمارے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے رہے تھے اور کھرے جمہوریت پسند تھے۔ مصطفیٰ نے کوئی واضح جواب نہ دیا۔ ووٹ دینے چلا گیا۔ واپس آیا تو میں نے پوچھا کہ کسے ووٹ دے کر آئے ہو۔ کہنے لگا کہ نوابزادہ کی حمایت کی ہے۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ غلام اسحاق خاں کا فون آیا۔ مصطفیٰ نے اسے ووٹ دیا تھا اور وہ شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ مصطفیٰ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن زیادہ بڑی بات یہ کہ اس نے سمجھوتہ کرنے کی خاطر اپنے اصولوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس کی سیاسی بصیرت پر مجھے جو اعتماد تھا اس میں یہ پہلا ڈبکا پڑا۔

مصطفیٰ کو قومی اسمبلی کی ان دو نشستوں میں سے، جو اس نے جیتی تھیں، ایک خالی کرنی تھی۔ ضمنی انتخابات ہونے والے تھے۔ ہم مصطفیٰ کے گاؤں واپس چلے گئے۔ مصطفیٰ نے فیصلہ کیا کہ کوٹ ادو سے جتوئی صاحب امیدوار ہوں گے۔ مصطفیٰ نے جتوئی صاحب کو فون کر کے اپنے فیصلے سے مطلع کیا اور حیرت زدہ جتوئی صاحب کو بتایا کہ وہ پنجاب سے ایک سندھی کو پارلیمنٹ میں بھجوا کر ہی دم لے گا۔ اس نے کہا کہ پی پی پی کو لگام دینے کے جو منصوبے انہوں نے بنائے ہیں ان کی تکمیل کے لیے پارلیمنٹ میں جتوئی صاحب کی موجودگی اشد ضروری ہے۔ مصطفیٰ نے پی پی پی میں شامل ہونے کے خیال کو مسترد کر دیا تھا۔ اسے اس "ذراسی چھوکری" پر کوئی اعتماد نہ تھا جو صرف خاندانی نام کے بل بوتے پر ملک کی وزیر اعظم بن گئی تھی۔ مصطفیٰ ٹیلی وژن پر بے نظیر کی پہلی تقریر سنتا اور ہنستا رہا تھا۔ "یہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ پھسپھسے انداز میں سامنے آئی ہے اور متوقع وزیر اعظم کے لیے کسی قسم کا جذبہ ابھارنے میں ناکام رہی ہے۔"

اس نے آئی جے آئی کی طرف جھکنا شروع کر دیا تھا۔ مصطفیٰ کو معلوم تھا کہ اس دفعہ زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ جتوئی صاحب قطعی طور پر باہر کے آدمی تھے۔ اسے اپنے عوام کو پوری طرح صف بند کر کے میدان میں لانا پڑے گا تاکہ وہ اس کے دوست کو ووٹ دیں۔ یہ اس کی عزت کا سوال تھا۔

اس مرحلے پر میں مصطفیٰ کی سیاست کے بارے میں غیر یقینی پن کا شکار تھی۔ میں محسوس کرنے لگی تھی کہ کیا میں اور کیا میرے سیاسی نقطہ ہائے نظر، دونوں اسے زہر لگنے لگے تھے۔ جب بھی کوئی اخبار والا اس سے میرے متعلق یا سیاست میں میرے مستقبل کے کردار کے بارے میں سوال کرتا تو وہ کسمسانے لگتا اور بات ٹال دیتا۔ "ڈان" سے وابستہ انیس مرزا نے اس کے پاس آکر میرے اس کردار کو سراہا جو میں نے اسے رہا کرانے کے ضمن میں ادا کیا تھا۔ صاف نظر آیا کہ مصطفیٰ یہ سن کر چڑ گیا ہے۔ اسے بالکل پسند نہ تھا کہ اس کا اپنی بیوی سے موازنہ کیا جائے۔ اگرچہ میری طرف سے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اسے کوئی خطرہ نہ ہو سکتا تھا پھر بھی یہ مسابقت اس کی برداشت سے باہر تھی۔ میں پس منظر کے سایوں تک محدود رہ کر خاصی مطمئن تھی۔

مصطفیٰ کی کسی پریس کانفرنس کے بعد ایک غیر ملکی صحافی نے اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔ "آپ کی بیگم کو بات کرنے کا فن آتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان کی ایک پریس کانفرنس میں موجود تھا۔ مسٹر کھر، وہ آپ سے بدرجہا بہتر کانفرنس کرتی ہے۔" اگر صرف نگاہوں نگاہوں میں کسی کو ملک بدر کیا جاسکتا تو یہ غیر ملکی صحافی پہلے دستیاب طیارے پر اس ملک سے دفع ہو چکا ہوتا۔

اس نے اپنا یہ وعدہ کبھی پورا نہ کیا کہ وہ پریس کو فخریہ انداز میں بتائے گا کہ اسے جلاوطنی سے واپس میں لائی تھی۔ جو میں نے کیا تھا وہ اس کے نزدیک کسی شمار قطار میں نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں رفتہ رفتہ ملک کے حافظے سے محو ہو جاؤں۔ میرے ذکر یا میرے کارنامے کے ذکر پر وہ جھلا اٹھتا۔ کارکن بھی محسوس کر رہے تھے کہ مصطفیٰ رخ بدل رہا ہے، کسی اور سمت چل نکلا ہے۔

میاں ساجد، چوہدری حنیف اور چوہدری مختار جیسے لوگوں کو فراموش کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کے کیمپ میں نئے چہرے، نرے موقع پرست، چلے آرہے تھے۔ ہم سب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ہمارے حصے میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں آیا۔

جتوئی صاحب کے انتخاب نے میرے ذہن میں کئی سوالوں کو جنم دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دباؤ ڈالنے کی ایک چال ہے۔ مقصد یہ ہے کہ پی پی پی کو سکھ کا سانس نہ لینے دیا جائے۔ یہ پی پی پی کے منہ پر تھپڑ رسید کرنے کے مترادف بھی تھا کیونکہ پی پی پی نے اس کے ساتھ گھٹیا سلوک کیا تھا۔ وہ سگنل بھیج رہا تھا۔ میں، مصطفیٰ کھر، یہ اہلیت رکھتا ہوں کہ کسی سندھی کو پنجاب سے الیکشن جتوا دوں۔ محترمہ بھٹو میں جتوئی صاحب کو تمہارے کارگر متبادل کے طور پر پارلیمنٹ میں بھیج رہا ہوں۔ کھر جتوئی کی یکجائی تمہارے حق میں مہلک ثابت ہو گی۔

سیاسی سطح پر یہ سب کچھ خاصا با معنی تھا۔ لیکن آئی جے آئی کے ساتھ پینگ بڑھانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مصطفیٰ کو میاں نواز شریف کی قیادت پر یقین نہ تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ دباؤ ڈالنے کے لیے کوئی ایسی چال چلنا غلط ہے جس کا حساب آئیڈیالوجی سے اپنی پکی وابستگی ختم کر کے چکانا پڑے۔ ایسی پارٹی میں شامل ہونا جس پر آپ کو یقین ہی نہ ہو موقع پرستی ہے۔

میرے خیال میں مصطفیٰ بالغ نظر اور سنجیدہ سیاست دان تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بالآخر وہ کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟ کیا وہ کسی طاقتور اپوزیشن پر پہنچنے

کے بعد پی پی پی میں شامل ہونا چاہتا ہے؟ کیا وہ جتوئی صاحب پر احسان کر رہا ہے؟ یا آئی جے آئی کو مضبوط بنانا مقصود ہے تاکہ پارٹی کے پاس اسمبلی میں ایک طاقتور اپوزیشن رہنما ہو؟ بعد میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ مصطفیٰ اپنے تینوں مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ لیکن محض اتفاقاً۔

اس وقت مصطفیٰ کے ذہن پر ابتری چھائی ہوئی تھی۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا اس کے تمام پہلوؤں پر ابھی اس نے غور نہ کیا تھا۔ اس وقت میری سمجھ میں یہ تو آگیا کہ وہ کسی نرم دلی کے تحت جتوئی صاحب کا گاڈ فادر نہیں بنا ہوا۔ وہ اپنے حریفوں کو الجھن میں ڈالنے اور گڑبڑانے کے لیے ایسا کھیل کھیلنے میں مشغول تھا جس کا کوئی قاعدہ قانون نہ ہو۔ اس عمل کے دوران وہ خود بھی زیادہ سے زیادہ بدحواس ہوتا گیا۔ میں سمجھ گئی کہ مصطفیٰ کی سیاست سے الگ ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔

جیل سے رہا ہونے کے فوراً بعد مصطفیٰ اصرار کرتا رہتا تھا کہ سیاسی طور پر جو شہرت وہ کمائے گا اس میں میرا بھی حصہ ہو گا۔ جب وہ پریس سے باتیں یا لوگوں سے خطاب کرتا تو مجھے بلا کر اپنے ساتھ بٹھاتا۔ لیکن میں اس کی بے آرامی محسوس کر سکتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میری موجودگی میں اسے کھل کر بات کرنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔ میں نے طے کیا کہ اس کے معاملات میں دخل نہ دوں گی۔ مجھے معلوم تھا کہ مصطفیٰ سمجھوتے بازی پر اتر آیا ہے۔ مجھے اس کی کمزوریاں نظر آنے لگی تھیں۔ جہاں تک میں دیکھ سکتی تھی اس کی شخصیت کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہو چکا تھا اور اس بات کا اسے خود بھی علم تھا۔ جب میں اس کے ساتھ ہوتی تو وہ پُراعتماد نظر نہ آتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس پر سے میرا یقین اٹھ چکا ہے۔

اسے موقع پرستی کی جو لت پڑ گئی تھی وہ میں چھڑانے کی کوشش کر چکی تھی۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ خود کو دونوں جماعتوں سے دور کر لے۔ میں نے اسے آزادانہ موقف اختیار کرنے کو کہا۔ میں نے کہا کہ وہ ان مسائل پر توجہ مرکوز کرے جو اس کے عہد سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ صحیح صحیح بتائے کہ سیاسی ڈھانچے میں کیا کیا نقائص ہیں اور دونوں جماعتوں کو ان کی بیوقوفیوں سے آگاہ کر کے لتاڑے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ اقتدار کے پیچھے دوڑتے رہنے سے باز آگیا تو سچا سیاسی مدبر بن کر ابھر سکتا ہے۔ اس کی طاقت اس امر میں مضمر ہو گی کہ لوگ اس کی آراء کو قابلِ اعتبار سمجھیں گے۔ یہ تو اس وقت بھی ظاہر تھا کہ دونوں بڑی سیاسی جماعتیں ایسی راہ پر چل پڑیں گی جہاں ان کا تصادم ناگزیر ہو جائے گا۔ مصطفیٰ ثالث کا کردار ادا کر سکتا تھا۔ وہ سچ بول سکتا تھا۔ ایک اخلاقی خلا پیدا ہو چکا تھا جسے وہ خاصی آسانی سے پُر کر سکتا تھا۔ لیکن مصطفیٰ کو جے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

پرکاش نرائن یا قوم کا ضمیر بننے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ کردار اس نے غلام اسحاق خاں کو ہتھیا لینے دیا۔ مصطفیٰ کھر اقتدار کا بھوکا تھا۔

جتوئی صاحب کی انتخابی مہم کا آغاز ہوا۔ مطلوب کے بھائی رئیس وزیر کی جتوئی خاندان سے رشتے داری تھی اس کا بیٹا جتوئی صاحب کی بھانجی سے بیاہا ہوا تھا۔ عدیلہ ملتان میں تھی اور اسے بڑا شوق تھا کہ کوٹ ادو آئے اور انتخابی مہم بچشم خود دیکھے۔ اسے کبھی انتخاب کی گہما گہمی کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ مطلوب آکر مصطفیٰ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا جو بادشاہ گر کے طور پر ابھر رہا تھا اور جتوئی صاحب میں طاقتور اپوزیشن رہنما بننے کا زبردست امکان موجود تھا۔ میں نے زرمینہ سے بات کی اور کہا کہ اس دن وہ بھی اپنے شوہر ریاض کے ساتھ آجائے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ عدیلہ اور مطلوب تو آجائیں مگر کوئی اور نہ ہو۔ زرمینہ کہنے لگی کہ اس کے میاں کو اپنی بیوی کو ایسی جگہ بھیجنے کا کوئی اشتیاق نہیں جہاں اتنے بہت سے مرد ہوں۔ میں نے زرمینہ سے کہا کہ ریاض نے جو وجوہ پیش کی ہیں اس کی مدد سے وہ عدیلہ کو بھی آنے سے باز رکھے۔ زرمینہ نے کوشش کی۔ میں چاہتی تھی کہ عدیلہ کو یہ نہ پتہ چلے کہ اس کا آنا مجھے منظور نہیں۔ عدیلہ بضد رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ زرمینہ بھی ساتھ چلے۔ کہنے لگی کہ مرد تو انتخابی مہم پر نکل جائیں گے اور تینوں بہنوں کو مل بیٹھنے کا وقت مل جائے گا۔ اس نے بڑے قائل کن انداز میں گفتگو کی۔ بار بار کہتی رہی کہ مجھ سے صلح صفائی کرنا چاہتی تھی۔ وہ مجھے مطلوب سے اپنی شادی اور مطلوب کے خاندان کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ مجھے اس کا آنا سرے سے منظور ہی نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ مصطفیٰ کے خاندان میں بہت زیادہ لوگوں کو ماضی کے بارے میں پتہ ہے، گو اس سلسلے میں کبھی کسی سے بات چیت نہ ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دونوں طرف عشق کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ میں محسوس کرتی تھی کہ عدیلہ مطلوب کے ساتھ خوش ہے جو اس کی ناز برداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اس کے باوجود۔۔۔۔۔

مجھے ہار ماننی ہی پڑی۔ دوپہر کو عدیلہ آپہنچی۔ اس نے شفون پہن رکھی تھی۔ بالوں کو خاص انداز میں سنوارا گیا تھا۔ اس نے تازہ ترین فیشنی وبا کی تقلید میں رنگین کنٹیکٹ لینز لگا رکھے تھے۔ اس کا حلیہ دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں نے کوشش کی کہ میری حیرت ظاہر نہ ہونے پائے۔

مطلوب انتخابی مہم میں مصروف ہوگیا۔ شام ہونے پر مرد سیاست میں غرق لوٹتے اور ہم سب مل کر کھانا کھاتے۔

عدیلہ روز صبح سویرے آموجود ہوتی۔ وہ ہمارے بیڈروم میں آکر بستر پر بیٹھ جاتی

اور مجھ سے باتیں کرنے لگتی۔ مصطفیٰ بھی کمرے میں موجود اپنی یوگا کی ورزش کر رہا ہوتا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب کچھ پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔ میں نے بھول جانے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن حال جو تھا وہ دھیرے دھیرے ماضی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

ہم نے اپنے اس حلقۂ بے تکلف کو وسعت دی۔ مصطفیٰ کے خاندان کی دوسری عورتیں بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتیں اور ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنے اپنے تجربات بیان کرتے۔ بالعموم شادیوں اور بچوں اور گھریلو بحرانوں کا ذکر کرتے کرتے خوب مزے سے وقت گزر جاتا۔

میں نے دوبارہ مصوری میں پناہ لینی شروع کر دی۔ فن میری ذہنی حالت کا آئینہ دار تھا۔ میں تصویر بناتی رہی۔ کینوس پر ایک عورت کی شبیہ نے ابھرنا شروع کیا۔ وہ جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مرکز سے دور ہٹ گئی تھی اور خود کو سایوں میں گم کر چکی تھی۔ میں مکمل تصویر کو تکتی رہی۔ میں جانتی تھی کہ میں نے اپنی ہی تصویر بنائی ہے۔ عنوان تھا: "اندھیروں میں۔"

مردوں کے آنے سے ذرا پہلے عدیلہ غائب ہو جاتی۔ جب دوبارہ سامنے آتی تو اس کا حلیہ ہی بدلا ہوتا۔ بال بنے ہوئے، رنگین کنٹیکٹ لینز زیب چشم، چہرہ سرخی پاؤڈر سے آراستہ۔ بن سنور کر شام باہر گزارنے کے لیے تیار۔ میں غسل خانے میں جاتی، منہ ہاتھ دھوتی اور اپنی سی شکل صورت لے کر باہر آجاتی۔ میں عدیلہ سے کہتی کہ اتنے اہتمام سے کپڑے پہننا اور میک اپ کرنا ضروری ہے کیونکہ رات کے کھانے پر خاندان کے گنے چنے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ اسے کپڑے بدلنے اور بننے سنورنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ "ڈنر پر بڑھیا لباس پہننا اچھا رہتا ہے۔ تم بھی ایسا ہی کیا کرو۔"

رفتہ رفتہ میں بہتر نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ عدیلہ سب سے نمایاں نظر آئے۔ یہ بہت تھکا دینے والا عمل تھا۔

صبح کو ہم اپنی اپنی زندگی کے بارے میں باتیں کرتے۔ ایک دفعہ ہمارے درمیان جو بات چیت ہوئی میں نے اس کے بارے میں عدیلہ سے خاص طور پر کہا کہ وہ اسے کسی کے آگے، خصوصاً مصطفیٰ کے سامنے، بالکل نہ دہرائے۔ جب مرد واپس آئے تو میں غسل خانے میں مختلف نظر آنے کے لیے جان مار رہی تھی۔ مصطفیٰ نے روا روی میں عدیلہ سے پوچھا کہ دن بھر کیا باتیں ہوتی رہی ہیں۔ عدیلہ نے بڑے اطمینان سے وہ سب کچھ بک دیا جو میں نے اسے اعتماد میں لے کر بتایا تھا۔

مصطفیٰ نے بہت سمجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور بعد میں مجھ سے کہنے لگا۔ "میرا خیال ہے کہ عدیلہ ہم دونوں میں فساد ڈلوانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہم آپس

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں لڑ پڑیں۔ دیکھو ہمیں لڑنا نہ چاہیے۔"

میں نے دیکھا کہ عدیلہ میں تبدیلی آنے لگی ہے۔ مجھے یہ بھی نظر آیا کہ مصطفیٰ کا رویہ بھی بدلنے لگا ہے۔ مجھے گھبراہٹ اور بے چینی محسوس ہونے لگی۔ پھر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ مجھے پتہ تھا۔ میں ٹھیک ٹھیک انگلی نہیں رکھ سکتی تھی کہ بات کیا ہے۔ یہ بہت ہی گریزاں سا کوئی احساس تھا مگر تھا ضرور۔ اسے میری سہیلی شاہدہ بھی، جو ساجد کی بھاوج تھی، محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

عدیلہ پھر اپنی چال بازیوں پر اتر آئی۔ جب ہم مطلوب کو کہلواتے کہ آ کر ہمارے ساتھ لنچ کھائے تو عدیلہ باہر جا کہ ہمارے پیام کو راستے میں روک لیتی۔ وہ ملازمہ سے کہتی تھی کہ پیغام نہ پہنچائے بلکہ تھوڑی دیر بعد آ کر کہہ دے کہ وہ مطلوب صاحب کو تلاش نہیں کر سکی۔ میری ملازمہ کو یہ ساری باتیں بہت عجیب معلوم ہوئیں۔ اتنی عجیب کہ اس نے مجھے بتا دیں۔

میرے دیکھتے دیکھتے مصطفیٰ اور عدیلہ میں گٹھ جوڑ ہو گیا۔ وہ ایک ٹیم، ایک پارٹی بن چکے تھے۔ مصطفیٰ نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور میرا سفید لباس، جسے وہ پہلے اس قدر تحسین کی نظر سے دیکھتا رہا تھا، یکایک اس کے لطیفوں کا نشانہ بننے لگا۔

انتخاب کے دن عدیلہ کا دل چاہا کہ پولنگ سٹیشنوں کی سیر کی جائے۔ مجھے کوئی شوق نہ تھا۔ مطلوب بھی آمادہ نہ تھا۔ عدیلہ اور مصطفیٰ اصرار کرنے لگے کہ ضرور جانا چاہیے۔ جانے کیوں پولنگ بوتھوں کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی۔ عدیلہ کسی لاڈ پیار سے بگڑی بچی کی سی حرکتیں کرنے لگی۔ "میری خاطر چلے چلیں۔ پلیز اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ میں گھما گھمی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

مطلوب نے اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہار مان لی۔

مصطفیٰ کار چلا رہا تھا۔ مطلوب اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دونوں بیویاں پچھلی سیٹ پر تھیں۔ تمام پولنگ سٹیشنوں پر مجھے ایک مختلف مصطفیٰ دیکھنے کو ملا۔ وہ ظاہر یہ کرنا چاہتا تھا جیسے وہ کوئی بڑی شے ہے۔ وہ ایک رول نبھا رہا تھا اور اداکاری کرتے ہوئے بہت زور لگا رہا تھا۔ وہ عدیلہ کی نظر میں جچنے کے لیے اپنی کرشمہ سازی، اپنی مقبولیت، اپنی طاقت، سب کی نمائش کرنا چاہتا تھا۔ یہ تمام حرکتیں کسی نیا.تی اداکار کی سی تھیں جو ڈرامے میں ایک بار موقع ملتے ہی، ایڑی چوٹی کا زور لگا، اپنے تمام کمالات ایک ہی بار دکھا دینے کے لیے مضطرب ہو۔ وہ ضرورت سے زیادہ طاقت صرف کر رہا تھا۔ وہی باتیں، جو فطری انداز میں کر سکتا تھا، پُر تصنع اور گھسی پٹی معلوم ہو رہی تھیں۔ عدیلہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ اقتدار کے سحر کے زیر اثر تھی۔ اسے یہ گلیمر، یہ جوش و خروش چاہیے

تھا۔ یہ سب کچھ مصطفیٰ اسے بہم پہنچا سکتا تھا۔ اگر صرف ------ وہ میری طرف اپنی نقلی آنکھوں، اپنے رنگین کنٹیکٹ لینزوں سے دیکھ رہی تھی۔

واپس ہوئے تو لگا کہ راستہ کبھی ختم ہی نہ ہو گا۔ میں اپنے خول میں واپس چلی گئی تھی۔ میں کسی سے بات نہ کرنا چاہتی تھی۔

مصطفیٰ نے دیکھ لیا کہ میرا موڈ بدل گیا ہے۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں منہ تھما کر اس رومان میں کھنڈت ڈال دوں جس کی ہوا کچھ کچھ بندھنے لگی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مجھے اس بات کا پتہ ہی نہ چلے۔ اس نے جارحانہ رویہ اختیار کر لیا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم ہمیشہ گندے موڈ میں نظر آتی ہو۔ ہر وقت جھینکتی اور شکایت کرتی رہتی ہو۔ کبھی خوش تو ہوتیں ہی نہیں۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "بات یہ نہیں ہے۔ جس طرح کی تم حرکتیں کر رہے تھے وہ مجھے اچھی نہیں لگیں۔ میں احمق نہیں ہوں۔ میں بتا سکتی ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے میری طرف دیکھا اور کمرے سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنا حلیہ درست کرنے اندر گئی۔ عدیلہ نے ساٹن کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اگر اس کی آنکھوں میں کوئی احساسِ جرم تھا تو اسے رنگین کنٹیکٹ لینزوں نے چھپا لیا تھا۔ وہ اندر آئی۔ مصطفیٰ نے مجھ سے کہا کہ باہر آ جاؤ۔ کمرے میں بہت زیادہ لوگ جمع تھے۔ میں باہر نہ آنا چاہتی تھی۔ میں رو رہی تھی۔ میں نے مصطفیٰ سے کہا کہ لوگوں سے کہو کہ کسی اور کمرے میں جا کر انتظار کریں۔ وہ مصر تھا کہ نہیں، وہ کمرے ہی میں رہیں گے۔ مجھ پر دباؤ ڈالنے کے حربے آزمائے جا رہے تھے۔ اسے پتہ تھا کہ میں رو رہی ہوں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں رونا دھونا بند کر دوں۔ اسے پتہ تھا کہ اگر میں لوگوں کے درمیان آؤں گی تو میرا رونا دھونا خود ہی بند ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ مجھے کسی سے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ ہمارے کمرے میں نہ آئے۔ عدیلہ بول اٹھی۔ "کیوں نہیں؟ یہ اس کا اپنا بیڈروم ہے۔ (دیدہ و دانستہ وقفہ)۔ نہیں ہے کیا؟"

جس انداز سے یہ بات کہی گئی اس نے سب کچھ واضح کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی تماشا دکھا رہی ہو۔ جیسے نخرے کر رہی ہو۔ میں نے ان دونوں کی آنکھوں میں چمک دیکھی۔ میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔

مجھے ان تمام خواتین کے پاس بیٹھ کر شائستہ گفتگو میں حصہ لینا پڑا، جب کہ حالت یہ تھی کہ میرے دل و دماغ میں ایک طوفان پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ گھنگھور، منحوس گھٹائیں۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ گھٹائیں مجھے ایزا پہنچائیں گی۔ مجھے پتہ تھا کہ میں بھیگے بغیر گھر نہ پہنچ سکوں گی۔ ہر بار جب میں دروازے تک پہنچنے والی ہوتی کوئی میرے گھر کو ذرا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اور آگے کھسکا دیتا۔

یہ سب کچھ پل بھر میں ہوگیا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ انہیں ایک دوسرے سے دور نہ رکھا جا سکتا تھا۔ ان کی روحوں نے پھر ہم بستری شروع کر دی تھی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ مجھے عدیلہ کو آنے کی اجازت ہی نہ دینی چاہیے تھی۔ لیکن ---- پھر تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مجھے اسے معاف ہی نہ کرنا چاہیے تھا۔

خواتین، میرے ذہنی خلفشار سے بے خبر، میرے اردگرد بیٹھی تھیں۔ مصطفیٰ مجھے چھیڑ رہا تھا۔ "سچ سچ، تہمینہ، تم تو سفید لباس میں کوئی راہبہ لگ رہی ہو۔" وہ مجھے طعنے دے رہا تھا۔ "راہبہ" کے لفظ کا استعمال جنسی تلازمہ بھی رکھتا تھا۔ وہ عدیلہ کو کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ یعنی یہ کہ جہاں تک تہمینہ کا تعلق ہے میں مردِ مجرد ہوں۔ عدیلہ نے تمسخر آمیز انداز میں میرا دفاع کیا۔ "نہیں، راہبہ تو نہیں لگ رہی۔" اصل کھیل لہجے کا تھا۔ یہ مصطفیٰ کے لب و لہجے سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھا۔

خواتین رخصت ہوئیں۔ مصطفیٰ کے اور میرے درمیان بڑی خوفناک تُو تُو میں میں ہوئی۔ جس کے آخر میں میں رو پڑی۔ عین اسی وقت ہم نے سنا کہ جتوئی صاحب نے انتخاب جیت لیا ہے۔ بینڈ نے دھن چھیڑی۔ ڈھولکی بجنے لگی۔ نعرے بلند ہوئے۔ جشن کا سا سماں نظر آنے لگا۔ جیت کے وہی تمام لوازم۔ میں رو رہی تھی۔ یہ عجیب بات تھی۔ جانے کیوں جتوئی صاحب کے لیے کامیاب یا خوش ہونے کا موقع ہمیشہ عین اس وقت آتا تھا جب میں کسی روح خراش سانحے سے دوچار ہو چکی ہوتی تھی۔ مجھے شیریں کا بچہ اور اپنے آنسو یاد آ گئے۔ اب یہ واقعہ ہوگیا۔ 6اگست 1990ء کو جب جتوئی صاحب نگران وزیراعظم کا حلف اٹھا رہے تھے تو میں ان کی خاطر بہت خوش تھی۔ پھر ٹی وی کیمرے نے آہستہ آہستہ حرکت میں آ کر ان کی نئی کابینہ کے چہرے دکھانے شروع کیے۔ کیمرا افسوس انداز میں ایک چہرے پر ذرا دیر کو رکا۔ یہ مصطفیٰ کا چہرا تھا۔ میں دم بخود رہ گئی۔ کہتے ہیں کہ یہی حال جتوئی صاحب کا ہوا تھا۔ مصطفیٰ پھر میری مسرت کا رنگ پھیکا کرنے اور خوشی کو مسخ کرنے کے لیے آ دھمکا تھا۔

ہمارا لڑائی جھگڑا اکیلے میں نہیں ہوا۔ عدیلہ ہمارے پاس ٹھہر کر سب کچھ سنتی اور دیکھتی رہی۔ مصطفیٰ نے اسے سنانے کے لیے کہا۔ "تہمینہ، میں تمہارے ساتھ مزید نہیں رہنا چاہتا۔ تم نے میری زندگی برباد کر دی۔ تمہارے ساتھ رہنا میرے لیے دوبھر ہو چکا ہے۔" یہ مصطفیٰ کا اصل رنگ نہ تھا۔ یہ باتیں وہ مجھ سے نہیں کر رہا تھا۔ مقصد عدیلہ کو کچھ سنانا تھا۔ اس تک یہ پیغام پہنچایا جا رہا تھا کہ مصطفیٰ معاشقے کے لیے تیار ہے۔ اس کی شادی ختم ہونے والی ہے۔ عدیلہ نے پیغام وصول کر لیا۔ مصطفیٰ چلا گیا۔

جب وہ لوٹا تو اور ہی مصطفیٰ تھا۔ وہ پھر منت سماجت کرنے، رونے اور گڑگڑانے لگا۔ پنڈولم جھول کر اب دوسری طرف چلا گیا تھا۔ "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اب کبھی غلط رویہ اختیار نہ کروں گا۔ یہ لمحہ تمہارا تھا۔ تم نہ ہوتیں تو جو کچھ ہوا یہ بھی نہ ہونے پاتا۔ جتوئی صاحب کامیاب نہ ہوسکتے۔ یہ تمہاری فتح ہے۔ میں ہر بات کے لیے تمہارا احسان مند ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میں گڑبڑا گیا تھا۔ شاید عدیلہ کی موجودگی کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ شاید ماضی کی نحوست دوبارہ ہمارے ذہنوں میں حلول کر گئی ہو۔ اس سے ہم دونوں کے دل میں پرانی ہولناکی کی یاد تازہ ہو گئی۔ آؤ اس عورت سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ یہ فتنہ پرداز عورت ہے۔ آؤ، ہم اپنی زندگیوں کو ازسرِنو شروع کریں۔" میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنی شادی کو بچانا چاہیے۔

میں نے عدیلہ اور مطلوب کو اس رات رخصت ہونے سے روک لیا۔ میں چاہتی تھی کہ عدیلہ دیکھ لے کہ مصطفیٰ اور مجھ میں صلح ہو گئی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے خوش ہیں۔ وہ ٹھہر گئے۔ ہم فتح کا جشن منانے غلام ربانی کے گھر گئے۔ جتوئی صاحب ساٹھ ہزار ووٹوں سے جیتے تھے۔ یہ مصطفیٰ کی طاقت اور عوام پر اس کی گرفت کا کھلا ثبوت تھا۔ اس نے عوام سے کہہ دیا تھا کہ اسے مایوس نہ کریں۔ جتوئی صاحب اس کے مہمان ہیں۔ انہیں اپنی نشست بالکل اتنے ہی ووٹ لے کر جیتنی چاہیے جتنے مصطفیٰ کو ملے تھے۔ عوام نے اس امر کو یقینی بنا کر چھوڑا۔ پنجاب کی مہمان نوازی پر حرف کیسے آنے دیا جا سکتا تھا۔

اگلے روز ہم سب کوٹ ادو سے ملتان روانہ ہوئے۔ مصطفیٰ ڈرائیو کر رہا تھا۔

جتوئی صاحب اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مطلوب، عدیلہ اور میں پیچھے تھے۔ مصطفیٰ کی کوٹ ادو میں بعض نہایت اہم مصروفیات تھیں۔ اسے عوام کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ اوپر سے وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ہمارے ساتھ رہے۔ اس ذہنی کشاکش سے اس کی توجہ دونیم ہو گئی۔ ملتان کی طرف یہ ڈرائیو عجیب و غریب ثابت ہوئی۔ عدیلہ کو چھوڑ کر، ہم سب، مع جتوئی صاحب، مصطفیٰ پر جھنجلاتے رہے۔ مصطفیٰ زیرِ لب بڑبڑاتا رہا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ وہ ڈرائیو کرتا رہتا اور پھر کار روک لیتا۔ "مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں یا پیچھے رک جاؤں؟ میرا ٹھہرنا اہم ہے۔ مجھے کچھ کام ہیں۔ لیکن ---- نہیں، آئیے، چلتے ہی ہیں۔ میرا خیال ہے میں آپ لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔"

صاف ظاہر تھا کہ مصطفیٰ عدیلہ کے ساتھ ہونے کا یہ موقع کھونا نہ چاہتا تھا۔ اس کا دل اسے ورغلا رہا تھا۔ سیاست کی حیثیت ثانوی رہ گئی تھی۔ اس کی ترجیحات الٹ پلٹ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہو چکی تھیں۔

اس نے اپنے بھائی غلام میلادی کھر سے کہا تھا کہ وہ کار میں ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔ خیال یہ تھا کہ مصطفیٰ ہمیں ایک خاص مقام تک پہنچا دے گا اور پھر میلادی کے ساتھ کوٹ ادو لوٹ جائے گا۔ ہماری کار میں اس کی جگہ شوفر سنبھال لے گا۔ جب ہم طے شدہ مقام پر پہنچے تو مصطفیٰ ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس پر پس و پیش کا ایک اور دورہ پڑا۔ کیا میں واپس چلا جاؤں ؟ کیا میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں؟ جتوئی صاحب کو طیش آگیا۔ "مصطفیٰ ، تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ سوچ لو تمہیں کیا کرنا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں کوٹ ادو واپس جانا چاہیئے۔ یہ ہمارے لیے اہم ہے۔ کار سے اترو اور واپس چلے جاؤ۔" مصطفیٰ ہچکچایا۔ پھر اتر گیا۔ بادلِ ناخواستہ۔

ملتان روانہ ہونے سے ذرا پہلے مصطفیٰ کے سکریٹری نے مجھے کئی ہوائی ٹکٹ تھما دیے۔ جو ٹکٹ میرے اور مصطفیٰ اور جتوئی صاحب کے لیے تھے ان کی تو تک سمجھ میں آتی تھی۔ عدیلہ اور مطلوب کے لیے ملتان-لاہور-ملتان ٹکٹوں کی کوئی تک نہ تھی۔ میں نے مطلوب سے پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ اسے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ ضرور کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ میں نے سکریٹری سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے بتایا کہ کھر صاحب نے یہ ٹکٹ لانے کو کہا تھا۔ مجھے شرمندگی ہوئی کہ میرے شوہر نے میری بہن اور اس کے شوہر کے لیے ہوائی سفر کا بندوبست محض اس واسطے کیا ہے کہ اگر وہ اچانک ہمارے ساتھ لاہور چلنے کا فیصلہ کر لیں تو کوئی دقت نہ ہو۔ مصطفیٰ نے اس سارے معاملے کو بیچارے سکریٹری کی ضرورت سے زیادہ مستعدی کا نتیجہ قرار دیا۔

ہم ملتان پہنچے۔ عدیلہ کے بچے کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ وہ اپنے گھر اور میں شاہدہ کے گھر چلی گئی۔ اسی شام عدیلہ نے یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ وہ اور مطلوب آ رہے ہیں۔ میں اس سے ملنا نہ چاہتی تھی۔ میں نے بچے کا پوچھا۔ کہنے لگی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ آ رہے تھے۔

مصطفیٰ اپنا کام نمٹا چکا تھا اور وہ بھی ملتان آ رہا تھا۔

میں نے زرمینہ کو فون کیا اور کہا کہ وہ کسی طرح عدیلہ کو سمجھائے کہ بچے کی بیماری کی وجہ سے اسے ہماری طرف نہ آنا چاہیے۔ میں بے طرح خوف زدہ تھی کہ کہیں عدیلہ کو یہ پتہ نہ چل جائے کہ میں اس کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہی ہوں۔ اسے روکنا ممکن ہی نہ تھا۔ وہ آ گئی۔ مطلوب ساتھ تھا۔ عدیلہ نے زمردی ساٹن کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اس کے گلے میں بھی زمردوں کا ہار تھا اور کان کی بالیاں بھی زمرد کی تھیں۔ رنگین کنٹیکٹ لینز بھی حسب معمول اپنی جگہ پر تھے۔ صاف عیاں تھا کہ

1988 میں مصطفیٰ کھر کی رہائی کے بعد ملتان پہنچنے پر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

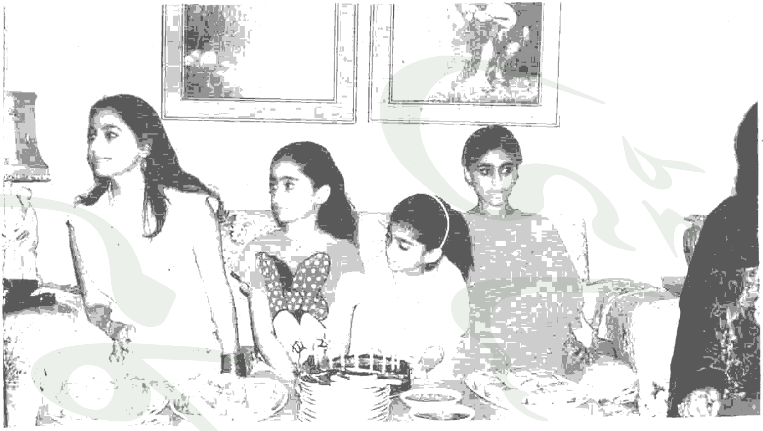

اپنی بیٹیوں، ثانیہ، نعیمہ اور نشا کے ساتھ

مصطفےٰ کھر کی رہائی کے بعد راولپنڈی میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

1990ء میں جب میں نے مسلم لیگ میں شمولیت کی

رہائی کے موقعہ پر

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

خوش لباسی کا کچھ زیادہ ہی اہتمام کیا گیا ہے۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ جب مصطفٰے کی نظر اس پر پڑے گی تو وہ خوش ہوگا، اگرچہ اس موقع پر بظاہر اسے پتہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ مصطفٰے کی آمد متوقع ہے۔ اس کی پوشاک اور زینت نے راز فاش کر دیا۔

مصطفٰے واپس آیا۔ اس پر عجیب موڈ طاری تھا۔ اس نے مجھ سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ وہ ایک بار پھر دیکھنے والوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اوچھی حرکتیں کر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک عورت کے سوا کوئی تماشائی نہ تھا۔ وہ عدیلہ کو باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے ناخوش ہے۔ اس کی منت کر رہا تھا کہ اپنا سلگتا ہوا معاشقہ دوبارہ شروع کیا جائے۔ مصطفٰے کا یہ انداز شاہدہ اور اس کے بیٹے تک سے چھپا نہ رہ سکا۔

مصطفٰے عدیلہ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی تعریف کرنے میں لگا ہوا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ عدیلہ کمرے میں آئی۔ کہنے لگی کہ باہر کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ ملاقاتی کو اندر بھیج دو۔ عدیلہ بولی کہ اس نے یہی کہا تھا کہ اندر چلی جاؤ لیکن وہ بضد ہے کہ مجھ سے باہر ہی ملے گی۔ عدیلہ چاہتی تھی میں کمرے سے چلی جاؤں۔ میں ان دونوں کو تنہا نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کے باوجود میں یہ بھی نہ چاہتی تھی کہ اپنے خدشات کو صاف ظاہر کر دوں۔ میں اسی دبدھے میں گرفتار باہر پہنچی میں نے شاہدہ کو کمرے میں بھیج دیا۔ وہ دو منٹ میں ان کے پاس پہنچ گئی تاکہ درمیان میں حائل ہو سکے۔ لیکن دو منٹ ہی میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان دو منٹوں میں کوئی بات ہو گئی۔ کچھ کہہ دیا گیا۔ شاہدہ کو پتہ چل گیا۔ اس کے کمرے میں قدم رکھتے ہی یک لخت خاموشی چھا گئی۔

میرے اور مصطفٰے کے درمیان سرد جنگ چھڑ چکی تھی۔ لاہور واپس جاتے ہوئے ہوائی سفر کے دوران، ان دو منٹوں سے حوصلہ پا کر جو اس نے عدیلہ کے ساتھ اکیلے میں گزارے تھے، مصطفٰے ناشاد و نامراد شوہر میں تبدیل ہو گیا۔ "تم پھر مجھ پر شک کر رہی ہو۔ میں اس طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ امن چین سے رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے الٹ کے جواب دیا۔ "جب تمھاری وجہ سے غیر ضروری روح فرسا واقعات پیش آتے رہتے ہیں تو تمھیں امن چین کی زندگی گزارنی کیسے نصیب ہو گی۔ تمھیں پتہ ہے کہ میں ناخوش ہوں۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ تم مجھے اعتبار کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتے۔ تمھاری ساری حرکتیں مشکوک ہیں۔" اس نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو۔ پتہ ہے کل رات کمرے سے تمہارے جانے کے بعد عدیلہ نے کیا کہا تھا؟" میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ اس نے کیا کہا تھا۔ "عدیلہ کہہ رہی تھی کہ اگر تہمینہ تمھیں کوئی چیز کھانے کے لیے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

دے تو مت کھانا۔ تم مجھے زہر دے دو گی۔"

میں ہکا بکا رہ گئی۔ جو بات ہم سب نے مذاق میں کہی تھی اسے عدیلہ نے مسخ کر کے پیش کر دیا۔ کوٹ ادو میں ہم سب اپنے شوہروں کے بارے میں بات کر رہے تھے اور تقریباً یہ طے کیا تھا کہ ان سب کو ویلیم کی ایک ایک گولی کھلا دیں گے تاکہ پھر ان کی طرف سے بے فکر ہو کر رات بھر اپنی گپ شپ جاری رکھ سکیں۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ عدیلہ کو علم تھا کہ ہم مذاق کر رہے ہیں۔ وہ خود مذاق میں شامل تھی۔ مجھے جھٹکا لگا۔ عدیلہ بدلی نہیں تھی۔ وہ میرے میاں کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میری تمام قربانیوں کے باوجود مصطفٰے کی مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ عدیلہ پھر اپنی پُر فریب دلربائیوں کو بروئے کار لا رہی تھی۔ اس بات پر میں بے حد پریشان تھی کہ ہمارے ساتھ کچھ نہیں ہوا اور اس کے باوجود مصطفٰے پہلے کی طرح آسانی سے چوٹ کھا جاتا تھا، پہلے کی طرح آسانی سے دام میں آ جاتا تھا۔ مجھے گھن آنے لگی۔ اس نے عدیلہ کو اتنی ڈھیل دے رکھی تھی کہ وہ آسانی سے جو چال چاہے چل سکتی تھی۔ میں اپنی پینٹنگ کے اندھیروں میں اور بھی پیچھے ہٹتی چلی گئی۔

امی کی خستہ دلی میں فرق نہ آیا تھا۔ ہم بیٹیوں نے فیصلہ کیا کہ اس دوسری عورت سے جا کر ملتے ہیں جو والد صاحب کی زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔ زرمینہ اور میں کراچی پہنچے۔ کوٹ ادو میں جو کچھ ہوا تھا اس پر ہم نے روبینہ کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ اس نے تسلیم کیا کہ میرے اندیشے درست ہیں۔ ہم عدیلہ کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے دیر کر دی تھی۔ (ہم نے اس کے نمبر پر فون کیا۔ نمبر مصروف تھا۔ ہم نے مصطفٰے کو فون کیا۔ اس کا نمبر بھی مصروف تھا۔) دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔ ایک جمع ایک کا مطلب ہے ایک ذلیل جوڑا۔ بالاخر جب میں مصطفٰے سے بات کرنے میں کامیاب ہوئی تو میں نے بتا دیا کہ مجھے معلوم ہے وہ کس سے بات کر رہا تھا۔ اس کا جرم چھپائے نہ چھپتا تھا۔ اس کی وضاحتوں سے ماضی میں پیش کی جانے والی وضاحتوں کی بساہند آ رہی تھی۔

ہم صبیحہ حسن سے ملنے گئے۔ ہم نے اسے بتانا چاہا کہ وہ ہمارے گھر کو، جسے امی نے اتنے جتن سے اور اتنی مدت تک بنائے رکھنے کی سعی کی تھی، بگاڑنے میں لگی ہوئی ہے۔ یہ مشکل ملاقات تھی۔ ہمیں ڈپلومیٹک انداز میں بات کرنی تھی۔ عدیلہ بدتمیزی پر اتر آئی۔ اس نے صبیحہ حسن کو غصہ دلا دیا اور وہ برانگیختہ ہو کر سخت رویہ اپنانے پر مجبور ہو گئی۔

واپس آتے ہوئے ہم نے عدیلہ کی خوب خبر لی۔ ہمیں معلوم تھا کہ عدیلہ کے

ذہن میں ایک پیچ در پیچ منصوبہ ہے۔ اگر والد صاحب امی کو چھوڑ کر چلے گئے تو عدیلہ کو مصطفٰے سے اپنا معاشقہ دوبارہ شروع کرنے اور میرا گھر اجاڑنے کا بہانہ ہاتھ آ جائے گا۔ اپنی وضاحت میں کہے گی کہ وہ تو انتقام لے رہی ہے۔ کہے گی کہ وہ اس خاندان کو جسے والد صاحب چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے تھے، افراتفری کا نشانہ بنا کر والد صاحب کو تباہ کرنے میں مصروف ہے۔ اس نے یہ جواز خوب سوچ سمجھ کر گھڑا تھا۔ یہ اثر انداز ہونے کی ایک چال تھی۔ نشانہ والد صاحب کو بننا تھا۔ میں تو بس اتفاق سے دونوں طرف سے ہونے والی فائرنگ کی زد میں آ گئی تھی۔

میں لاہور واپس آئی۔ ہم عمرہ کرنے چلے گئے۔ جتوئی صاحب اور ان کے بھائی ہمارے ساتھ تھے۔ مصطفٰے کے بھائی اور ان کے اہل خانہ بھی ہمراہ تھے۔ مجھے یاد ہے میں سارے وقت روتی دھوتی رہی۔ میں نے اللہ سے مدد کی التجا کی تاکہ میں اس چھوٹ بالو سے نکل سکوں۔ کعبہ کا امیج میرے ذہن پر بڑی مضبوطی سے نقش ہے۔ اس کے بعد ہم لندن چلے گئے اور وہاں ہفتے بھر قیام کیا۔ اپنے شوہر سے میرے تعلقات میں سرد مہری آ گئی تھی۔ ہم کھنچے کھنچے رہے۔

واپسی پر ہمیں خبر ملی کہ نانی اماں بہت بیمار ہیں۔ ان کے بچنے کی امید نہ رہی تھی۔ پھیپھڑے سرطان سے گل گئے تھے۔ اگلے دو مہینے میں نے نانی اماں کے پاس گزارے۔ پورا خاندان ان کے بیٹے سردار اسد حیات کے گھر جمع ہو گیا۔ نانی اماں کی زندگی کے گنتی کے دن رہ گئے تھے۔ خاندان کی جدہ اعلیٰ مرض میں گھلی جا رہی تھی۔ ہم سب اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے آئے تاکہ ان کی خدمت میں حاضر رہ سکیں۔ میرے والدین بھی وہاں تھے اور روبینہ اور زرمینہ بھی۔ مصطفٰے بھی موجود تھا اور جلد ہی عدیلہ بھی، مطلوب کے بغیر، آ پہنچی۔

عدیلہ کو موقع محل کی کوئی تمیز نہ تھی یا اگر تھی تو بظاہر کوئی پرواہ نہ تھی۔ ادھر تو نانی اماں کی زندگی دھیرے دھیرے اختتام کو پہنچ رہی تھی، اُدھر اسے نت نئی پوشاکیں پہننے سے فرصت نہ تھی۔ وہ بالوں کو گھنگھریالے بنواتی۔ رنگین کنٹیکٹ لینز لگانا کبھی نہ بھولتی۔ اس نے پورا اہتمام کر رکھا تھا کہ اس کے خوبصورت لباسوں سے میچ کرنے والے باقی تمام لوازم موجود ہوں۔ یہ بھونڈا پن تھا، بے حسی تھی۔ اسی کا نام عدیلہ تھا۔

ایک روز مصطفٰے نے مجھ سے کہا کہ وہ شام پانچ بجے اسد ماموں کے گھر مجھے لینے آئے گا۔ بعد میں اس نے وقت کی تبدیلی سے مطلع کرنے کے لیے فون کیا۔ اسے دیر ہو جائے گی۔ اہم کام تھا۔ سیاست۔ عدیلہ کسی کو بتائے بغیر نانی اماں کی کار لے کر شام، پانچ بجے گھر سے نکل گئی۔ کار واپس آئی تو عدیلہ اس میں نہ تھی۔ زرمینہ اور میں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نے ڈرائیور کو طلب کیا۔ اس نے بتایا کہ عدیلہ لبرٹی مارکیٹ میں کتابوں کی ایک دکان کے نزدیک اتر گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خود ہی واپس آ جائے گی۔ یہ ہمیں بہت عجیب معلوم ہوا۔ ہم بھی جو لاہور میں رہتے ہیں اس طرح بے دھڑک بازار میں نکل جانے کا کبھی سوچتے تک نہیں۔ زرمینہ کے اور میرے پاس اپنے وجدان پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی ۔ اس بات کے پیچھے مصطفٰے کے سوا کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

ہم نے عدیلہ کی نند تسنیم کو فون کیا۔ ساڑھے سات بجے تھے۔ عدیلہ ابھی واپس نہ آئی تھی۔ آخرکار وہ گھر پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد مصطفٰے بھی آ گیا۔ اس کا سامنا کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں ادھر ادھر کھسک گئی اور جا کر دو لیکسوٹینل کھا لیں۔ والد صاحب کہنے لگے کہ تم ایسی نظر آ رہی ہو جیسے تمہیں کسی نے نشہ آور دوا کھلا دی ہو۔ میں سچ مچ نشے میں تھی۔

نانی اماں نے محسوس کر لیا کہ میرے ساتھ کچھ گڑ بڑ ہے۔ پوچھنے لگیں کہ کیا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے بہت اچھی طرح واقف تھیں۔ دنیا میں ان کے سوا کوئی نہ تھا جو میرے چہرے پر لکھی عبارت پڑھ سکتا۔ میں اپنے جذبات کو لاکھ احتیاط سے چھپاتی لیکن وہ میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہی معمے کی تہ تک پہنچ جاتیں۔ میں انھیں پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے ان سے صرف اس قدر کہا کہ "میرے لیے دعا کیجیے۔ مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

وہ بالکل چپ رہیں۔ یکایک ان کے چہرے پر سیاہی مائل زردی کھنڈ گئی۔ وہ زیادہ نحیف اور خوف زدہ نظر آنے لگیں۔ وہ سمجھ گئیں کہ کیا ہوا ہے۔ وہ محسوس کر رہی تھیں کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوا چاہتی ہے۔ عدیلہ ایک بار پھر اپنا چکر چلا رہی تھی۔ میں نانی اماں کی بیچارگی محسوس کر سکتی تھی۔ انھیں پتہ تھا کہ وہ مرنے والی ہیں۔ انھیں پتہ تھا کہ ان کے رخصت ہونے کے بعد میں بے یارومددگار رہ جاؤں گی۔ اکیلی رہ جاؤں گی۔ وہ دونوں بہیمانہ انداز میں میرے ذہن پر یلغار کریں گے اور میں اپنا بچاؤ نہ کر سکوں گی۔

مجھے پتہ تھا کہ امی عدیلہ کو تحفظ دیں گی۔ راہ راست سے بھٹک جانے والے والد صاحب کے خلاف محاذ آرائی میں انھیں بطور اتحادی اپنی صرف ایک ہی بیٹی پر اعتبار تھا اور وہ عدیلہ تھی۔ مصطفٰے نانی اماں کی وفات کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ حملے کا آغاز کرے گا اور میں نے سالہا سال کی کوشش کے بعد اپنا جو تشخص پیدا کیا تھا اسے منہدم کرنے پر تل جائے گا۔ وہ مجھے ایسی اعصاب زدہ، سہمی سہمی عورت بنا کر چھوڑے گا جسے ایک بار پھر خود اپنے ہی ذہن سے خوف آنے لگے گا۔ ماضی کے واقعات کا اعادہ کافی ہو

گا۔ ساتھ میں میری بہن اور اہل خاندان میری بنیادوں کو جھٹکے پر جھٹکا دینے میں معروف ہو جائیں گے اور میں اور بھی جلد دھڑام سے نیچے آ رہوں گی۔ مصطفٰے طے کر چکا تھا کہ وہ کسی بالغ عورت کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا۔ میں اس سے زیادہ بالغ ہو چکی تھی۔ اس کی نظر میں عدیلہ مکمل ترین آلہ کار تھی۔ وہ نوجوان اور دلکش تھی اور وہی ایسی ہستی تھی جو مجھے ریزہ ریزہ بکھیر سکتی تھی۔ بکھر جانے کے بعد میں ویسی ہی عورت بن جاؤں گی جیسی مصطفٰے کو پسند تھی۔

نانی اماں سسک سسک کر موت کے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اسی آہستہ روی سے میری شادی بھی اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ان کے انتقال سے ایک دن پہلے میں نے ہسپتال سے گھر فون کیا۔ مجھے اپنی لائن کے ساتھ کوئی لائن بھی مل گئی۔ مصطفٰے کسی سے بات کر رہا تھا۔ جس سے بات ہو رہی تھی اس کی آواز مجھے سنائی نہ دی۔ مصطفٰے نے کہا۔ "کسی کا فون آیا ہے۔ میں تمھیں بعد میں فون کروں گا۔" مجھ پر عیاں تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے۔ میں نے زرمینہ اور ریاض کو گھر بھیجا۔ زرمینہ سے کہا کہ اوپر کی منزل میں جا کر ایکس ٹینشن اٹھا کر سنے اور میرے شبہات کی تصدیق کرے۔ میں ہسپتال میں بیٹھی دعا مانگتی رہی کہ کاش میرے شبہات غلط ثابت ہوں۔

میں نانی اماں کے پاس بیٹھی انتظار کرتی رہی جو تکیوں کے سہارے بستر پر نیم دراز تھیں۔ آخری مرتبہ۔ زرمینہ واپس آئی ۔ کہنے لگی کہ عدیلہ نہیں تھی۔ اس نے جلد ہی نظر چرا لی۔ میں نے اس کا رنگ بدلتے دیکھا۔ وہ بہت پیلی پڑ گئی تھی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے نانی اماں کی پیٹھ پیچھے سرگوشیاں کرتے ہوئے تقاضا کیا کہ سچ سچ بات بتائی جائے ۔ براہ کرم مجھے بتا دو۔ زرمینہ میری طرف تکتی رہی۔ اس پر ابھی تک صدمے کا اثر تھا۔ جب اس نے بتایا تو اس کا جی متلانے لگا۔ "یہ سچ ہے۔ وہی تھی۔ دونوں آج شام ملنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔"

وہ دوڑتی ہوئی غسل خانے میں گئی اور الٹی کر دی۔ نانی اماں نے جنبش کی۔ انھیں پتہ چل گیا تھا کہ بہت سخت گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ جن دو نواسیوں سے انھیں محبت تھی، جنھیں انھوں نے پالا پوسا تھا، وہ دونوں برباد ہو چکی تھیں۔ انھیں پتہ تھا کہ غم صرف یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو رہی ہیں۔ غم یہ ہے کہ بعد میں ہم پر کیا گزرے گی۔ وہ دونوں ہسپتال--- نانی اماں اور مصطفٰے --- جن کے گرد میری زندگی گردش کرتی رہی تھی میرا ساتھ چھوڑنے والی تھیں۔ اس بار غم آیا تو غم کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نانی اماں کو محسوس ہوا کہ ان کا وقت آ پہنچا ہے۔ انہوں نے سارے خاندان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اپنی وصیت لکھوا رہی تھیں۔ زبانی۔ وہ ہمارے دلوں پر نقش ہو کر رہ گئی۔ انہوں نے سب سے کہا۔ "جو کوئی تہمینہ کو دکھ پہنچائے گا میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ اسے سزا دے۔ اس کا دل پک کر پھوڑا ہو جائے۔ ایسی اذیت اس کے حصے میں آئے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں تہمینہ کو خدا کے حوالے کیے جا رہی ہوں۔"انہوں نے چھت کی طرف اور چھت سے کہیں بہت آگے دیکھا۔ وہ مجھے اللہ کے سپرد کر گئیں۔" میں تہمینہ کو تیرے حوالے کرنے لگی ہوں۔ یا اللہ یہ تیرے پاس میری امانت ہے۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔ کسی کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ میری امانت کو دھونس جما جما کر، ذلیل کرتا رہے۔ وہ کبھی تنہا محسوس نہ کرے۔ اس کی حفاظت کرنے والا اور کوئی نہیں۔ اب تو میرا بلاوا بھی آ گیا ہے اور میں تیرے حضور میں برضاو رغبت پیش ہو رہی ہوں لیکن میری روح یہ ضمانت چاہتی ہے کہ تہمینہ سدا تیری اماں میں رہے۔"

انہوں نے مصطفیٰ سے کہا کہ ان کے قریب آ جائے۔ انہوں نے مصطفیٰ کا ہاتھ تھام لیا۔ "مصطفیٰ، میں نے تمہارے لیے دعائیں مانگیں۔ تمہاری رہائی کے لیے۔ میں نے جتوئی صاحب کے انتخاب جیتنے کی دعا بھی کی۔ میں بیمار تھی پھر بھی درگاہ بابا شاہ جمال، کی سیڑھیاں چڑھ کر دعا مانگنے گئی کیونکہ تمہاری عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ جب سے تمہاری شادی ہوئی تہمینہ تمہارے پاس بہت ناخوش رہی ہے۔ لیکن جب تم پر برا وقت آیا تو اس نے تمہارا ساتھ دیا اور تمہارے لیے جدوجہد بھی کی۔ آج، اپنی تمام دعاؤں کے بدلے، میں تم سے اتنی سی عنایت کی طلبگار ہوں۔ مہربانی کر کے اس کے ساتھ بھلائی کرنا۔ اچھا شوہر بن کر دکھاؤ۔ اسے ہرگز ہرگز دوبارہ ناخوش نہ ہونا پڑے۔ یہ تم سے میری آخری درخواست ہے۔ اس دنیا میں کسی سے بھی یہ میری آخری درخواست ہے۔"

نقاہت بڑی تیزی سے ان پر غالب آتی جا رہی تھی۔ آخری چند سانسوں میں انہوں نے یہ الفاظ کہے۔ "اگر تم نے تہمینہ کے بغیر اکیلے کوئی قدم اٹھایا تو ہر وہ قدم جو تم یہ سوچ کر اٹھاؤ گے کہ اس سے تمہاری عزت بڑھے گی تمہارے لیے رسوائی کا باعث ہو گا۔ تم شہرت اور اقتدار اور احترام کے طلبگار ہوگے لیکن تمہارے حصے میں خجالت کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ اگر تہمینہ تمہارے ساتھ ہوگی تو اللہ کے حکم سے ہر طرف تمہارا بول بالا ہو جائے گا۔ تمہارے لیے میری یہ دعا ہے۔" مصطفیٰ نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں تہمینہ کا خیال رکھوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔"

نانی اماں پر غشی طاری ہو گئی۔ ہم باری باری ان کے سرہانے بیٹھتے رہے۔ ہم

میں سے ہر کوئی اپنی جگہ تنہا۔ اس حالت میں بھی ان کے گوش گزار کرنے کے لیے ہمارے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہم سب کی رازداں چلی آ رہی تھیں۔ ہمارے حق میں چٹان۔ میں ان کے پاس گئی۔ میں نے ان کے سرہانے بیٹھ کر ہر بات بتادی۔ میں روتی رہی۔ میں نے ان سے کہا۔ "آیندہ آپ یہاں نہ ہوں گی۔ اب کبھی مجھے آپ کی دعاؤں کا سہارا نہ ملے گا۔ اب کبھی میں آپ کے پاس گھر نہ آسکوں گی۔ میں کہاں جاؤں گی؟ کہاں؟" میں نے پکار کر ان سے کہا۔ "آپ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ عین اس وقت جب ساری بدمزگی دوبارہ شروع ہونے کو ہے۔ میں اتنی اکیلی ہوں۔ آپ آخر کیوں جا رہی ہیں؟ کیوں؟"

میں نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ تاثر سے خالی تھا۔ اور پھر ان کی آنکھوں سے سیال چٹانیں لڑھکنے لگیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ میں اپنی تکلیف بھول گئی۔ میں نے انھیں دکھ پہنچایا تھا۔ وہ میری باتیں سن سکتی تھیں۔ میرے لفظ ان کے غش آلودہ ذہن میں سرائیت کر گئے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ وہ بوجھ واپس لے لوں جو میں نے اس موقع پر ان کے کندھوں پر رکھ دیا تھا جب وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہونے والی تھیں۔ میں نے انھیں ڈھارس دینے کی کوشش کی۔ "پریشان نہ ہوں۔ خدا کے لیے روئیں مت۔ آپ نہ روئیں۔ میں کسی طرح نمٹ لوں گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔ میں مضبوط ہوں۔ آپ کو پتہ تو ہے میں مضبوط ہوں۔" آنسو آہستہ آہستہ تھم گئے۔

عدیلہ اندر گئی۔ عین اس وقت کمرے میں کچھ پیش آیا۔ عدیلہ دوڑتی ہوئی باہر آئی۔ "ان کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ سر ادھر ادھر ہلا رہی ہیں۔ وہ ہاتھ پیر پٹک رہی ہیں۔ غشی کے عالم میں۔ بڑا بھیانک لگ رہا ہے۔ آؤ دیکھو۔" نانی اماں عدیلہ کی موجودگی کی تاب نہ لا سکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ مجھے اور زرمینہ کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہم اپنے والدین کے جیتے جی یتیم ہو گئیں۔ وہ مجھے چھوڑ گئیں تاکہ میں اپنے طور پر سب سے روح خراش اور سب سے اذیت ناک صورت حال کا مقابلہ کروں۔ زندگی میں اس جیسی صورت حال سے میرا کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنے والدین کی طرف سے نہ کوئی تحفظ ملے گا نہ کوئی جذباتی تقویت۔ ان کے نزدیک معاشرے میں اپنا امیج برقرار رکھنا اور کذب اور ریاکاری کا علم بلند کیے رہنا زیادہ اہم تھا۔

ہم نانی اماں کو نانا کے آبائی گھر لے چلے جو واہ میں تھا۔ امی چاہتی تھیں کہ عدیلہ ہماری کار میں مصطفیٰ، زرمینہ اور ریاض کے اور میرے ساتھ بیٹھے۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس متانت آمیز سفر کے دوران اسے اپنے پہلو میں جگہ دینا میری برداشت سے باہر تھا۔ عدیلہ نے دیکھ لیا کہ میں اس کی دشمن بن چکی ہوں۔ وہ میری خالہ کے ساتھ چلی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

گئی۔ امی بہت پریشان ہوئیں۔ ان کے خیال میں میں نے انکار کرکے بے حسی کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ ان پر "لوگ کیا کہیں گے" والا مرض اپنی تمام علامتوں کے ساتھ حملہ آور ہوچکا تھا۔ "تم عدیلہ سے اپنے عناد کا کھلم کھلا اظہار کر رہی ہو۔ ہمارے گھر میں جو ہوتا رہے وہ اور بات ہے۔ لوگوں کے سامنے تمہیں اس کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آنا ہوگا۔ سکینڈل ہمیں بہت مہنگا پڑے گا۔ ہمیں دنیا کے سامنے یہی تاثر دینا ہے کہ ہم بالکل راضی خوشی ہیں۔"

میں ان کی طرف بس دیکھتی رہ گئی۔ میں یہی دیکھتی رہ گئی کہ انہوں نے خود کو کیا بنا لیا ہے۔ ان پر دنیا کے سامنے اپنا امیج بنائے رکھنے کا ایسا خبط سوار تھا کہ انہوں نے اپنی گھریلو زندگی کے ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جانے کی بھی پرواہ نہ کی تھی۔

زرمینہ اور میں نے پیاری نانی اماں کو اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ انھیں دفنا دیا گیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ دفنانے کے بعد ہم سب واہ میں سردار برکت حیات کے گھر لوٹ آئے۔ اس رات زرمینہ اور میں نے فیصلہ کیا کہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم نے خواب آور گولیاں کھالی ہیں۔ ہم مصطفیٰ اور عدیلہ پر نظر رکھنا چاہتے تھے۔

توقع کے عین مطابق رات کے پچھلے پہر ایک سایہ لپک کر ہمارے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ مصطفیٰ جاگ اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔ اپنی غیر حاضری کی وضاحت کے لیے اس کے پاس اچھا بہانہ موجود تھا سحری۔

مجھ میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ اٹھوں اور اچانک انھیں جالوں اور وہ ہکے بکے رہ جائیں۔ میں کوئی فضیحت آمیز ہنگامہ برپا نہ کرنا چاہتی تھی۔ میری طبیعت متلانے لگی۔ یہ کسی اور کا گھر تھا۔ میں بس لیٹ کر نانی اماں کو یاد کرتی اور روتی رہی۔

ہم لاہور واپس آگئے۔ عدیلہ اپنی نند کے گھر ٹھہری ہوئی تھی۔ میں نے پھر جانماز سنبھال لی۔ قرآن شریف اور اللہ کی طرف رجوع کیا۔ میری زندگی میں اب سیاست کی گنجائش نہ رہی تھی۔ میں اب آرکلے لین کی پرانی تہمینہ بن چکی تھی۔ میں ٹیلی فون کے ایکس ٹینشن اٹھا کر سنتی، عدیلہ کی خوشبوؤں کے لیے مصطفیٰ کی قمیضیں سونگھتی، دیکھتی کہ کہیں ان پر لپ سٹک کے دھبے تو نہیں۔ میرے دل میں مصطفیٰ کے لیے سرد مہری آگئی تھی۔ مجھے اس سے نفرت تھی مگر چاہتی تھی کہ وہ میرے پاس رہے۔

میں نے عدیلہ کی نند سے بات کی۔ یہ بڑا نازک معاملہ تھا۔ میں نے اسے اپنے خدشات اور شبہات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ مجھے اپنے شوہر پر شک ہے۔ وہ کہنے لگی کہ اسے معلوم ہے۔ "وہ عدیلہ کو لینے بھی آتا ہے اور چھوڑنے بھی جاتا ہے۔"

اگلے دن عدیلہ اور مصطفیٰ نے ملنے کا پروگرام طے کیا۔ ملاقات کا وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ عدیلہ کا اضطراب بڑھتا گیا۔ ہم گھر والوں کے ساتھ تھے۔ وہ ادھر ادھر ٹہلتی رہی اور گھر سے باہر جانے کا بہانہ آزما کر دیکھتی رہی۔ آخر کار وہ نکل بھاگی۔ کہنے لگی کہ اسے اپنی سہیلی سے ملنے جانا ہے جو کراچی سے آئی ہوئی ہے۔ میں نے تسنیم کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ جس "سہیلی" کا نام لیا گیا ہے وہ لاہور میں نہیں ہے۔ مصطفیٰ بھی رفو چکر ہوچکا تھا۔ میں نے نصی کو فون کیا اور کہا کہ وہ ہمارے اس گھر تک چلی جائے جو کنال پر ہے۔ شاید وہ دونوں وہیں ہوں۔ نصی کو اس کی کار نظر نہ آسکی۔ نصی نے فون کرکے بتایا دیا۔ آخر وہ گئے تو کہاں گئے؟

رات ساڑھے دس بجے میں نے تسنیم کو فون کیا۔ کہنے لگی کہ عدیلہ ابھی ابھی پہنچی ہے۔ "اس کی گت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینے میں نہائی ہوئی ہے۔ کپڑے بدلنے دوڑتی ہوئی اوپر گئی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد مصطفیٰ بھی آپہنچا۔ اس کی بھی وہی حالت تھی جو عدیلہ کی بتائی گئی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ پر تھے جہاں بہت گرمی ہوگی۔ شاید وہ کار میں بیٹھے رہے ہوں۔ کالج کے لڑکے لڑکیوں کی طرح ۔ اس کی قمیض پر ہلکی گلابی لپ سٹک کے دھبے شرمناک حد تک نمایاں تھے جن کی اسے خبر تک نہ تھی۔ کہنے لگا کہ وہ ایک عام جلسے میں گیا ہوا تھا۔ "گرمی اتنی تھی کہ میرے جوتے تک تر بتر ہیں۔" وہ پڑکر سو گیا۔ میں لیٹی حیران ہوکر یہی سوچتی رہی کہ کیا رد عمل ظاہر کروں۔ رات کے تین بجے وہ اٹھا۔ غسل خانے میں گیا۔ نہایا اور پھر جا نماز بچھا کر نماز پڑھنے کھڑا ہوگیا۔ ذرا جو اسے شرم آئی ہو۔ میں دیکھتی رہی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ "میں سمجھتی تھی کہ تم مجھے بیوقوف بنانے میں لگے ہوئے ہو۔ لیکن بات یہ نہیں۔ تم اللہ تعالیٰ کو جھانسا دینا چاہتے ہو۔ پہلے تو تم اس کے احکام پر عمل کرنے کے بجائے عین ان احکام کے الٹ کرتے رہے اور یہ سب کچھ کرچکنے کے بعد ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ آج تم نے جو حرکت کی ہے اس کی اللہ بڑی سختی سے ممانعت کرچکا ہے۔ تم نے ایک بار پھر اپنے مذہب سے بے وفائی کی ہے۔ تم اللہ سے کیا کہہ رہے ہو مصطفیٰ؟ یہ کہ تمھیں اپنے کیے پر افسوس ہے؟ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ اللہ کو بیوقوف بنایا جاسکتا ہے؟ کیا تم یہ سمجھے بیٹھے ہو؟ ہیں؟ اگر تم سمجھتے ہو کہ اللہ کو بیوقوف بنا سکتے ہو تو پھر میں تو کوئی شے نہیں۔ مجھے تم سے مزید لڑنا جھگڑنا بھی منظور نہیں۔ یہ لڑائی تو اب میں نے اللہ پر چھوڑی۔ میری توہین ہوئی سو ہوئی۔ زیادہ گستاخی تم نے اللہ کی شان میں کی ہے۔"

وہ نماز پڑھتا رہا۔ نماز ختم کرکے مجھ پر گرجنے لگا۔ "یہ بکواس بند کرو۔ تم پاگل ہو

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

چلی ہو۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تمہارے ذہن کے پیچ ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ تمہیں نہ جانے کیا کیا دکھائی دیتا رہتا ہے۔"

اسلام میں رسول کریمؐ اور ان کے صحابہ کی تصویریں یا مجسمے بنانے کی ممانعت ہے۔ یہ پابندی اس لیے لگائی گئی ہے کہ کہیں کسی شخصیت سے پُر غلو ارادت مندی بگڑ کر بت پرستی کا روپ اختیار نہ کر لے۔ اسلام کے عظیم فنکاروں اور ہنر مندوں کے تخلیقی محرکات کا رخ خطاطی اور فن تعمیر کی طرف موڑ دیا گیا۔ شعیوں میں" خصوصاً ایران میں، رواج ہے کہ حضرت علی کی تصویر ضرور پاس رکھتے ہیں۔ حضرت علی کا اسلام کے تمام فرقے احترام کرتے ہیں۔ وہ قوت کی علامت ہیں اور جب قسمت کی خرابی سے کشتی طوفانی پانیوں میں گھر جاتی ہے تو اہل ایمان کے لبوں پر اکثر انھیں کا نام آتا ہے۔ وہ مشکل کشا ہیں۔ وہ عظیم رستگار ہیں اور مسلمان انتہائی جوش اور جذبے سے انہیں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ میرے لیے حضرت علی تحفظ کی علامت ہیں۔ جب مجھ پر سب سے مشکل وقت آیا تھا تب میں نے ان سے مدد چاہی تھی اور ان کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔

مصطفےٰ نے جیل کی کوٹھری میں حضرت علی کی تصویر لگا رکھی تھی۔ اپنی بیچارگی کے تمام عرصے میں وہ حضرت علی کی طرف رجوع کرتا، روتا اور سسکیاں لیتا اور ان کے آگے ہاتھ جوڑتا کہ شفاعت فرمائی اور جیل سے رہائی دلادیں۔ وہ مجھے بتاتا رہتا کہ کس طرح حضرت علی کے طفیل اسے وہ طاقت اور قوت برداشت نصیب ہوئی جس نے اسے قیدو بند کی ہولناکیاں سہنے کے قابل بنا دیا۔" اگر حضرت علی کا سہارا نہ ملتا تو میں ہار مان جاتا۔ ان کا سایہ میرے سر پر رہا۔ ان کا اسم گرامی بذاتِ خود قوت کا سرچشمہ ہے۔ انہیں کے نام نے مجھے زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کیا۔

جیل سے چھوٹنے کی دیر تھی کہ مصطفےٰ بھول بھال گیا کہ وہ حضرت علی کا احسان مند ہے۔

اس نے دیکھا تھا کہ میں حضرت علی کے آگے ہاتھ پھیلاتی ہوں۔ اس نے دیکھا تھا کہ حضرت علی نے مجھے شر کا مقابلہ کرنے کے لیے کتنی طاقت عطا کی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میرا ایمان وقتی ترنگ نہیں نہ اس میں موقع پرستی کی کوئی لاگ ہے۔ اس نے بے حرمتی کی کارروائی کر کے مجھے ایمان سے محروم کرنا چاہا۔

مصطفےٰ میرے کمرے میں آیا۔ میں حضرت علی کی تصویر تھامے آنسو بہا رہی تھی۔ عدیلہ اور مصطفےٰ کے بارے میں میرے شکوک کی تصدیق ہو چکی تھی۔ میں اپنے ایمان کے سوا کس کا سہارا ڈھونڈتی ۔ وہ کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ پھر دھمکانے والے انداز

میں میری طرف بڑھا اور تصویر میرے ہاتھ سے چھین لی۔ اس نے حقارت بھرے انداز میں تصویر کو گھورا۔" یہ۔ کیا یہ تمہیں بچا لے گی؟ یہ تصویر!"

اس نے تصویر پھاڑ کر پرزے پرزے کر دی۔ میں نے ان مقدس پرزوں کو اٹھا کیا۔ میں روئی اور اللہ کے حضور میں گڑگڑا کر کہا کہ مجھے بخش دیا جائے۔ میں بے جانے بوجھے اس بے حرمتی میں شریک ہوئی تھی۔ اب میں سمجھی کہ مصطفےٰ کے نزدیک مذہب اس کی عذاب میں مبتلا روح کے لیے تریاق تھا۔ برے وقتوں میں کام آنے والا رفیق۔ وہ بھکاری بن کر، ملتجی بن کر، اللہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جب اسے نعمتوں سے نوازا گیا تو فرعون بن بیٹھا۔

کوئی اور ہوتا تو زیادہ احتیاط سے کام لینا شروع کر دیتا۔ لیکن مصطفےٰ سے یہ توقع کہاں۔ اگلی شام وہ سات بجے گھر سے روانہ ہوا۔ کہنے لگا کہ نو بجے تک واپس آجائے گا۔ میں نے تسنیم کو فون کیا۔ عدیلہ نے اپنی روانگی اور واپسی کا یہی وقت بتایا تھا۔ میں دوستوں کو ساتھ لے کر گئی اور ہم نے گاڑی تسنیم کے گھر کے نکڑ پر کھڑی کر دی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ عدیلہ کو گھر چھوڑنے کون آتا ہے۔ شاید ساجد ہو یا شاید عربی۔ پونے نو بجے ایک کار تسنیم کے گھر کے پھاٹک کے ٹھیک سامنے آکر رکی۔ عدیلہ اتری اور دوڑ کر اندر چلی گئی۔ کار کو روانہ ہونے سے پہلے ریورس کیا گیا۔ یہ ہماری شتری پجیرو تھی۔ عدیلہ میری سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مصطفےٰ گاڑی چلا رہا تھا۔ تسنیم اپنی کھڑکی میں پردوں کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ ہم بہت تیز ڈرائیو کرتے ہوئے واپس ہوئے اور میں مصطفےٰ کے آنے سے پہلے گھر پہنچ گئی۔ میں مصطفےٰ سے دو بدو نہ ہوئی۔

اگلے روز ہم سب نانی اماں کے چہلم پرواہ چلے گئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سارا معاملہ، الف تا یے، امی کو بتا دیتی ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنی آنکھوں سے کیا دیکھ چکی ہوں۔ اس رات امی نے عدیلہ سے بات کی۔ انہوں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ انہیں خبر کس نے دی ہے۔ عدیلہ نے تسلیم کر لیا کہ وہ مصطفےٰ کے ساتھ گئی تھی۔ لیکن ان کے درمیان ہوا کچھ بھی نہیں تھا۔ جب نانی اماں کا ختم دلایا جارہا تھا تو امی سے میری بات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ عدیلہ نے کیا کہا ہے۔ وہ عدیلہ کی بات ماننے پر مائل تھیں۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں غصے سے پھٹ پڑی۔ "کچھ بھی نہیں ہوا سے عدیلہ کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے یہ بات کیسے مان لی؟ آپ وہاں بیٹھ کر اس کی باتیں کیسے سنتی رہیں جن میں وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ گھومنے پھرنے کا جواز پیش کر رہی تھی؟ آپ اس قدر نارمل اور مردہ دل کب سے ہو گئیں؟ آپ کو معلوم ہے وہ اپنے بہنوئی سے عشق لڑاتی رہی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو چکا ہے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اور اس کے باوجود آپ اس کے کہے پر یقین لے آئی ہیں، حالانکہ میں نے آپ کو ثبوت بھی فراہم کر دیا تھا۔ میں تو حیران ہو گئی ہوں ۔ اس نے چوری چھپے پھر وہی حرکتیں کی ہیں اور ڈھیٹ اتنی ہے کہ کہتی ہے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔" میں جس طرح روئی دنیا میں کم ہی لوگ اس طرح روئے ہوں گے۔ میرے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ سب نے مجھے روتے دیکھا۔ رونے سے باز رہنا میرے بس میں نہ تھا۔

میرا اور عدیلہ کا آمنا سامنا ہوا۔ امی کی موجودگی میں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ مجال ہے جو وہ ذرا سٹپٹائی ہو۔ اس نے اپنا سر اس طرح جھٹکا جیسے "اونہہ" کہہ رہی ہو۔ "تمہیں پتہ بھی ہے میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے؟ اگر پتہ ہو تو تم مجھے بہن نہ کہو فرشتہ کہنا شروع کر دو۔ تمہاری شادی کو بچائے رکھنے کی ذمے دار میں ہوں۔"

یہ واضح تھا کہ وہ اشارتاً کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ مصطفیٰ اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ اس کی بات ماننے کو تیار نہ ہوئی تھی۔ صرف میری خاطر۔ مصطفیٰ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرا بسا بسایا گھر اجاڑنا نہ چاہتی تھی۔

کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟ میں نے آئینے میں اپنے پر نظر ڈالی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بدلنا پڑے گا۔ مجھے ضرور عدیلہ جیسی نظر آنا چاہیے۔ مجھے ضرور اس جیسے ملبوسات پہننے چاہئیں۔ مجھے ضرور اپنی پوری شخصیت کو بدلنا چاہیے۔ ایک یہی راستہ رہ گیا تھا۔ ایسا کروں تو شاید میری شادی کامیاب ہو جائے۔ مصطفیٰ عدیلہ کو چاہتا ہے، تمہیں نہیں۔ تم اپنی طرف دیکھو تو سہی۔ یہ تمہارے سفید کپڑے، یہ تمہارے بلند آدرش۔ تم اس کے مطلب کی عورت نہیں۔ عدیلہ ہے۔ اور اس کے باوجود--- اسے تم سے پیار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیار ہے۔ سارے وقت یہی کہتا رہتا ہے ۔ آئینے نے جواباً میری طرف دیکھا۔ میں سامنے سے ہٹ گئی۔ اس میں میری شبیہ کے علاوہ بھی کچھ نظر آرہا تھا۔ اس میں میرے ذہن کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے مصطفیٰ کی آواز سنی۔ نامبارک آواز۔ "کوئی اور عورت تم جیسی نہیں ہو سکتی لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم سولہ سال کی لڑکی بن کر رہو۔ میں پھر سے رومان کا تمنائی ہوں۔"

مجھے دھکا لگا۔ یہ تو میں نہیں کر سکتی۔ میں سولہ برس کی نہیں۔ پانچ بچوں کی ماں ہوں۔ سینتیس سال کی ہو چکی ہوں۔ اس شخص کے بارے میں رومانی تصورات کیسے رکھ سکتی ہوں جو میری بہن سے عشق لڑا رہا ہو؟ کیسے؟

میں اس ازخود رفتگی کی کیفیت سے باہر آئی۔ اپنے ہوش و حواس ہرگز نہیں کھوتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں نے اللہ کے آگے، محبوبِ خدا اور حضرت علی اور بی بی

فاطمہ کے آگے ہاتھ پھیلائے اور دعا کی۔ میں مزاروں پر جانے لگی۔ ان لوگوں سے بات کی جو خدا رسیدہ تھے۔ میں چاہتی تھی کہ اللہ میری فریاد سن لے۔ کسی طرح۔ کسی بھی صورت۔ مہربانی کرو، میرے گھر کو اجڑنے نہ دو۔ مہربانی کرو، میرے بچوں کی زندگی تباہ نہ ہونے دو۔ میں گھٹنوں کے بل کھڑی ہو کر، سر جھکا کر، منت کرتی رہی، کرتی رہی، کرتی رہی۔ رو رو کر، سسکیاں بھر بھر کر، سارے وقت منت کرتی رہی۔ منت کرتی رہی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ سکوت ہی سکوت۔ وہی میری منت سماجت، وہی خامشی۔

ہم اسلام آباد میں صدیق بٹ کے گھر میں تھے۔ مصطفیٰ بہت پریشان نظر آرہا تھا۔ آخر کار اس نے مجھے بتادیا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ عدیلہ کی وجہ سے پریشان ہوں۔ وہ یہاں آگئی ہے اپنے شوہر سے لڑکر آئی ہے۔ میری کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے مجھے کوئی بات بتانا چاہتی ہے--- تمہارے بارے میں"۔ میں نے امی کو فون کیا۔ امی نے عدیلہ کو فون کر کے حکم دیا کہ یا تو فوراً کراچی واپس آجائے یا وہ خود اسے لے جانے کے لیے اسلام آباد پہنچ جائیں گی۔ عدیلہ چلی گئی۔ مصطفیٰ کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ طوفانی گھٹائیں بس ذرا سی بوندیں برسا کر پاس سے گزر گئیں۔

میرا ذہن یہ کہتا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر کے لیے کہیں دُور نکل جاؤ۔ چیزوں کو دُور ہٹ کر دیکھنا تمہارے لیے ضروری ہے۔ اس گھر سے چلی جاؤ۔ اس سے بہت زیادہ یادیں وابستہ ہیں۔ یہی وہ کمرا ہے جہاں سے میں نے مصطفیٰ کی رہائی کی مہم چلائی تھی۔ جہاں میں نے اس کی رہائی کی دعائیں مانگی تھیں۔ جہاں میں نے انتظار کرتے کرتے کتنی بہت سی راتیں آنکھوں میں کاٹ دی تھیں۔ یہی وہ کمرا ہے جہاں راتوں کو سوتے سے اٹھ بیٹھی تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا کیونکہ مصطفیٰ اسیر تھا اور اسے کچھ کرنے جوگا نہ چھوڑا گیا تھا۔ یہی وہ کمرا ہے جہاں میں قید خانے میں اس سے مل کر آنے کے بعد عبادت کرتی تھی کیونکہ اس کی بیچارگی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ یہی وہ کمرا ہے جہاں میں نے ہر اس شخص سے ٹکر لی تھی جو مصطفیٰ کے خلاف تھا، خواہ وہ جتوئی صاحب ہوں، جن کی میں بڑی عزت کرتی ہوں، خواہ مصطفیٰ کے بھائی ہوں، جو میرا خاصا احترام کرتے تھے، خواہ جنرل ضیاء ہو۔ مصطفیٰ کے آنسو میری آنکھوں سے بہے تھے۔ میں مصطفیٰ کھر کی طرح کارگزاری دکھاتی رہی تھی۔ میں نے مصطفیٰ کھر کی طرح محسوس کیا تھا۔ آج وہ جسمانی طور پر موجود ہوتے ہوئے بھی مجھے اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ اب میں زیادہ تنہا تھی۔

ہمارے اردگرد ہر کسی نے، صدیق بٹ اور اس کے گھر والوں نے، تمام کارکنوں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نے، میرے تمام پرانے سیاسی رفقاء نے مجھے آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے دیکھا۔

میں نے نصیبہ اور نشا کو مری میں اپنے پرانے سکول میں داخل کرا دیا۔

میں علی اور حمزہ کو لے کر مری چلی گئی۔ میں نے تصویریں بنانے کی کوشش کی میں چہروں کی تصویریں بنانی نہ چاہتی تھی۔ ان میں افسردگی اور بوجھل پن کے سوا کیا دکھائی دے گا۔ میں نے ارد گرد فطرت کی فراوانی پر نظر دوڑائی۔ چہروں کے بجائے بطخوں کی تصویر بنائی۔ جو تصویر بن کر سامنے آئی وہ اذیت ناک انداز میں اس مثلث کی یاد دلانے لگی جس میں میری زندگی تبدیل ہو چکی تھی۔ میں نے تصویر میں ایک بطخا اور دو بطخیں دکھائی تھیں۔ ایک بطخ نے اپنا سر پروں میں چھپا رکھا تھا۔ مری میں قیام کرنا میرے لیے ممکن نہ رہا۔ میں پھسل کر دیوانگی میں غوطہ کھانے ہی والی تھی۔ میں نے مصطفیٰ کو فون کیا کہ وہ آ کر مجھے فوراً لے جائے۔ میں مصطفیٰ کھر سے الگ ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس بار علیحدہ ہونے کی وجوہ بھی معقول تھیں اور جو وقت چنا گیا تھا وہ بھی موزوں تھا۔ جلد ہی ہمارا دوبارہ مری آنا ہوا۔ میں بہت زیادہ اپنے آپ میں گم تھی۔ ہم بھوربن میں وزیرِ اعلیٰ کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔

اس رات مصطفیٰ نے مجھ سے ہم بستر ہونا چاہا۔ مجھے اس کے رویے سے پتہ چل گیا تھا کہ وہ انکار سننے کے لیے تیار نہیں۔ جو ہونا تھا میں نے ہونے دیا۔ میں نے اپنی نفرت کو قابو میں رکھا۔ میں نے خود کو مکمل طور پر لاتعلق رکھنا چاہا۔ مصطفیٰ کے کندھے پر سر رکھ کر میں اللہ سے دعا مانگتی اور منت کرتی رہی کہ مصطفیٰ پر عذاب نازل کیا جائے۔ وہ ایسی عورت سے زنا کا مرتکب ہوا تھا جو اس کی بہن کا درجہ رکھتی تھی۔ الٰہی، کیا یہ سب تجھ پر عیاں نہیں؟ تو اس کی ممانعت کر چکا ہے۔ تو نے کہا ہے کہ کوئی مرد بیک وقت دو سگی بہنوں سے جنسی تعلقات نہیں رکھ سکتا۔ یہ تیرے قرآن میں ہے۔ اگر یہ قانون تو نے بنایا ہے، اگر یہ ضابطہ تیری طرف سے نافذ ہوا ہے تو پھر تو کبھی یہ اجازت نہیں دے گا کہ میرے ساتھ ایسی بات ہو۔ اس آدمی کو کبھی مجھ پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہ ملنا چاہیے۔ اس آدمی کو کبھی تیری نافرمانی کرنے کی جسارت کا موقع نہ ملنا چاہیے۔ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ تو ہی اس بات کو روک سکتا ہے۔ اور جب میں یہ دعا مانگ رہی تھی تو میں نے تصور کیا کہ کعبہ شریف میرے سامنے موجود ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کعبے کو ہاتھ لگا سکتی ہوں۔ یہ ایسا وقت نہیں ہوتا جب آدمی کو اللہ کا خیال آئے۔ آدمی خود کو اتنا صاف ستھرا محسوس نہیں کرتا کہ اللہ کے روبرو ہو سکے۔ اللہ کو اس مرد کی آلودگی مجھ سے دور کرنی تھی جس نے مجھے استعمال کیا تھا مجھ سے ناجائز

کام لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے وہ لعنت، وہ گندگی، وہ غلاظت مجھ سے دُور کرنی ہو گی جو ملک غلام مصطفیٰ کھر نے میرے جسم و جان میں انڈیل دی تھی۔

ایک معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ میری دعا قبول ہو گئی۔

ہم نے مری میں آٹھ دن قیام کیا۔ اس کے بعد بھی میں دو مہینے مصطفیٰ کے ساتھ رہی۔ لیکن اس نے مجھے ایک بار بھی ہاتھ نہ لگایا۔ اس نے یہ موضوع کبھی چھیڑا تک نہیں۔ یہ اس کے مزاج کے منافی تھا۔ وہ مجھ سے پرے پرے رہا۔ وہ بستر پر آتے ہی تکیے پر سر رکھتا اور سو جاتا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ وہ اس بارے میں کوئی بات تک نہ کرتا۔ اس بارے میں مجھ سے لڑا جھگڑا بھی نہیں۔ اس بات کا کبھی ذکر تک نہ آیا۔ بس کسی طرح یہ صورت حال پیدا ہو گئی۔ مجھے پتہ ہے کہ یہ سب اللہ کی مہربانی تھی۔

ہمارے خاندان میں شادی کی ایک تقریب آ گئی۔ میری بہن روبینہ کی بیٹی خالہ ثمر کے بیٹے سے بیاہی جانے والی تھی۔ روبینہ اور اس کے شوہر کمال، خالہ ثمر اور ان کے میاں خالو اختر نے ہم سب کا بڑا خیال رکھا تھا۔ وہ چٹان بن کر ہمیں سہارا دیتے رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفیٰ سے علیحدگی کو فی الحال ملتوی کیے دیتی ہوں۔ شادی کے بعد دیکھا جائے گا۔ میں ان کی خوشی میں کھنڈت ڈالنا نہ چاہتی تھی۔ ہم 15 جولائی 1989ء کو کراچی گئے اور اپنے والدین کے پاس ٹھہرے۔ امی مصطفیٰ سے بات کرنے کی روادار نہ تھیں۔ میری عدیلہ کی ایک بار اور مڈھ بھیڑ ہوئی۔ کہنے لگی کہ اسے اپنے کیے پر افسوس ہے۔ مجھے بتانے لگی کہ اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ مصطفیٰ ہر وقت اسے فون کر کے کہتا رہتا تھا کہ میرے ساتھ اس کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ وہ بتاتا کہ اسے میری جیسی بیوی نہیں چاہیے تھی۔ اسے عدیلہ کی ضرورت تھی۔ عدیلہ کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔

میں چاہتی تھی کہ مجھے ہر بات بتائی جائے۔ "جب تک تم مجھے ہر بات نہیں بتاؤ گی میں تمہارے ساتھ کسی قسم کا تعلق قائم نہ کر سکوں گی۔ میں اس قابل تو ہو جاؤں کہ اپنے شوہر کو بتا سکوں کہ میرے اور تمہارے درمیان اب کوئی راز نہیں رہا۔ میں چاہتی ہوں کہ مصطفیٰ کو پتہ چل جائے کہ تمہاری زبانی مجھے مصطفیٰ کے اور تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ صرف اس کے بعد میں تمہیں معاف کروں گی۔"

عدیلہ مجھے سب کچھ نہ بتا سکی۔ میں اسے معاف نہ کر سکی۔

مصطفیٰ اور میں نے شادی میں شرکت کی۔ ولیمہ لاہور میں تھا۔ اگلے دن میں نے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھے۔ غلام ربانی کی بیوی کو بلا کر اپنے بچے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اس کے حوالے کیے۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا کہ میرے بچوں کو ایک اور اغوا کی صعوبت سے گزرنا پڑے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مفروروں کی طرح زندگی بسر کریں۔ میں چاہتی تھی کہ وہ آزاد رہیں، سکول جائیں اور جس طرح کے حالات تھے ان میں، جس حد تک ممکن ہو، نارمل رہنے کی کوشش کریں۔ ان کی زندگی میں پہلے ہی ضرورت سے زیادہ "ڈرامے" پیش آ چکے تھے۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ صورت حال ان پر واضح ہو جائے۔

زرمینہ مجھے پک کرنے آئی اور میں مصطفیٰ کھر کے گھر سے چوتھی اور آخری بار رخصت ہوئی۔ مصطفیٰ اس شام گھر پر نہ تھا۔ شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ یہ 24 جولائی 1989ء کی بات ہے۔ اس کی اڈیالا سے رہائی اور میری بعد ازاں "اسیری" کو ابھی سال بھر بھی نہ ہوا تھا۔

میرے مسائل ابھی ختم کہاں ہوئے تھے۔ ہر کوئی میرے خلاف ہو گیا۔ انتہا یہ کہ امی تک ان باتوں سے مکر گئیں جو پہلے ہو چکی تھیں۔ صاف انکار کر دیا کہ میرے اور ان کے درمیان کبھی عدیلہ کے حوالے سے کوئی گفتگو ہوئی تھی۔ وہ سب زور دے کر کہہ رہے تھے کہ میں اپنی طرف سے باتیں گھڑتی رہتی ہوں۔ میں صرف مصطفیٰ سے الگ ہونے کے لیے بہانے تلاش کر رہی ہوں اور شامت خواہ مخواہ عدیلہ کی آئی رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی شادی ختم کرنے پر بالکل راضی نہ تھی۔ میری ایک عمر کی جذباتی کمائی اس شادی میں لگی ہوئی تھی۔ اگر مصطفیٰ کسی اور عورت سے شادی کر کے اسے گھر لے آتا تو مجھے وہ بھی قبول تھا۔ لیکن اپنی بہن کو قبول کرنے کے لیے میں تیار نہ تھی۔ اُدھر یہ عالم کہ عدیلہ کے سوا کوئی منظور ہی نہیں۔ یہ ان سب کو معلوم تھا لیکن جان بوجھ کر انجان بنے ہوئے تھے جیسے بات کچھ اور ہو۔

جب ہم گھر سے روانہ ہوئے تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ مصطفیٰ نفسیاتی طور پر رجعت کر رہا ہے۔ وہ اپنی جوانی سے چمٹے رہنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ اسے یہ قبول نہ تھا کہ وہ ادھیڑ ہو چکا ہے۔ اسے رومان کی طلب تھی۔ اس نے پھر اپنی ٹی شرٹیں، جینز، مگرمچھ کی کھال کے جوتے اور سفاری سوٹ پہننے شروع کر دیے۔ وہ اپنی ہونڈا اکارڈ اور پیجرو گاڑیاں لیے لیے پھرنے لگا۔ وہ اپنے دو کروڑ کی مالیت کے گھر کی طرف لوٹ گیا۔ وہی گھر جسے میں نے جلاوطنی کے دنوں میں اپنے خوابوں میں آراستہ کیا تھا، نئی شکل دی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس گھر کو کسی کی بد دعا لگ گئی ہے۔ اس میں کبھی قہقہوں کی گونج سنائی نہ دے گی۔ اس میں مایوسی کی چیخیں بسی ہوئی ہیں۔ کسی بیوی کو وہاں قدم جما کر رہنا نصیب نہ ہوا تھا۔ کسی عورت کا بھوت اس گھر میں منڈلاتا رہتا تھا۔

اس نے عروسی جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں لال تھیں اور ان سے غصے کے مارے شعلے نکلتے رہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔

اس کے بھائی ٹھیک ہی کہتے تھے۔ مصطفیٰ کبھی بدل نہیں سکتا۔

میں خالہ ثمر کے گھر چلی گئی۔ انہوں نے مجھے پیار دیا، میرا خیال رکھا۔

میرے ماموں اسد حیات نیشنل پیپلز پارٹی کی تشکیل کے وقت سے ہمارا ساتھ نباہتے چلے آ رہے تھے اور مصطفیٰ کے سیاسی حلیف بن چکے تھے۔ میں مصطفیٰ کو رہا کرانے کی جدوجہد کے دوران ان کے گھر سیاسی جلسے کرتی رہی۔ جتوئی صاحب بارہا وہاں میرے پاس آئے۔ اسد ماموں اکثر میرے ساتھ جیل میں مصطفیٰ سے ملنے جایا کرتے۔ اس موقع پر امی ان کے ہمارے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے سخت خلاف تھیں۔ اسد ماموں نے ان پر واضح کر دیا کہ اس مرحلے پر وہ ہمارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ کہنے لگے کہ "مصطفیٰ میرا دوست ہے اور تہمینہ کا یہ فیصلہ کہ ہر طرح کی مشکلات کے باوجود مصطفیٰ کا ساتھ دے گی میری نظر میں قابل احترام ہے۔"

یکایک میں ان پر بوجھ بن گئی۔ جیسا کہ مجھے پتہ چل چکا تھا سیاست کے تقاضوں کے سامنے خونی رشتے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اپنے سیاسی کیریر کو آگے بڑھانے کے لیے اسد ماموں کو مصطفیٰ کی ضرورت تھی۔ میں ان کی راہ کا کانٹا تھی۔ میرے بغیر کام چل سکتا تھا۔ ماموں کو پتا تھا کہ ہماری علیحدگی کی اصل وجہ کیا ہے لیکن اس پر یقین لانے کو تیار نہ تھے۔ وہ مصطفیٰ کے ساتھی بنے رہے حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ خاندان کی عزت ڈبو چکا ہے۔ ان کی دو بھانجیوں کو بے آبرو کر چکا ہے۔ اس کے باوجود اسد ماموں مصطفیٰ کے حلیف بنے رہے۔ اب میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ انگریزی راج میں حیات خاندان کے افراد کو عروج کیوں حاصل ہوا تھا۔

اسد ماموں مصطفیٰ کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ وہ ان کے ذریعے مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خالہ ثمر کو فون کیا اور ان سے کہا کہ مجھے گھر سے نکال دیں۔ میں نے ان سے بات کی۔ اختر خالو نے ان پر بالکل واضح کر دیا کہ وہ کبھی مجھے اپنے گھر سے چلے جانے کے لیے نہیں کہیں گے۔ سردار اسد حیات اپنی بات پر اڑے رہے۔ بدتمیزی ملاحظہ ہو کہ مجھ سے کہنے لگے۔ "تم کسی ہوٹل میں اٹھ جاؤ۔ تمہارا بل میں ادا کر دوں گا۔" "مجھے اپنا بل ادا کرنے کے لیے آپ کی ضرورت نہیں۔ لیکن یاد رکھیں، جو کچھ آپ آج میرے ساتھ کر رہے ہیں، اسے میں کبھی بھلاؤں گی نہیں۔"

میں کسی اور جائے اماں کی تلاش میں اپنی پہلی پناہ گاہ سے نکل پڑی۔ ایک اور خالو، عزیز خاں، نے مجھے اپنے گھر میں جگہ دی۔ وہ بہت شفقت سے پیش آئے۔ انہوں

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

نے کوشش کی کہ وہ مجھے نانی اماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیں۔ ان کے گھر میں مجھے ایک کمرا دیا گیا۔ اس کی دیواریں مجھ پر تنگ ہونے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بُری بن چکی ہوں۔ مجھ سے اس عورت جیسا سلوک کیا جارہا تھا جو اپنے بہنوئی سے معاشقہ لڑاتی رہی ہو! یہ اس طرح کا سلوک تھا جو شائستگی کے تقاضوں کو پامال کر دینے والی عورت کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ یہ کیوں؟ مجھے معلوم تھا کہ میں اب مصطفےٰ کھر کی بیوی نہیں۔ مجھ سے بد سلوکی کی جاسکتی ہے۔ مصطفےٰ اغماض سے کام لیتا رہے گا۔

مصطفےٰ گشت پر نکلا۔ میرے تمام رشتے داروں سے جاکر ملا۔ وہ امی تک سے ملنے چلا گیا۔ اس نے مالی طور پر میرا ناطقہ بند کر دیا (جب میں اس سے الگ ہوئی تھی تو میرے بیگ میں سو روپے تھے!) مجھ میں اتنی عقل نہ تھی کہ ہمارے مشترکہ اکاؤنٹ سے اپنے حصے کی کچھ رقم نکلوا لیتی۔ یہ رقم مصطفےٰ نے نکلوا لی۔ وہ میری چالوں کا پہلے سے اندازہ لگا کر میری تمام راہیں مسدود کرتا جارہا تھا۔ اس نے میری رقم بھی ہتھیا لی۔ وہ مجھے بے دست و پا کر دینا چاہتا تھا۔ مجھ پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مصطفےٰ کھر سے الگ ہونے کے بعد زندگی میں کچھ باقی نہیں رہتا۔

لیکن وہ اللہ پر میرا ایمان مجھ سے نہ چھین سکا۔ یہ وہ جائے امان تھی جس کے گرد مصطفےٰ حصار قائم کرنے سے قاصر تھا۔ میں رات دن جانماز پر بیٹھی رہتی اور اللہ کے حضور میں دعا کرتی کہ مجھے سمجھوتہ کرنے سے محفوظ رکھے۔ میں نے اللہ سے التجا کی کہ اس جہنم میں دوبارہ جانے پر مجبور نہ کرے جسے میں چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ مجھ جیسی عورت کو غربت سے کب سابقہ پڑا تھا۔

مصطفےٰ بچوں کو ساتھ لے کر میرے والدین سے ملنے کراچی پہنچا۔ میرے سننے میں آیا کہ وہ ان کے پاس بیٹھ کر ہماری شادی کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ عدیلہ بھی اسی گھر میں موجود تھی۔ مجھے اس بات پر صدمہ پہنچا کہ جب مصطفےٰ ان سے ملنے گیا تو میرے والدین نے عدیلہ کو گھر سے کہیں اور چلے جانے کو نہ کہا۔ ان کی توقیر میری نظر میں اور کم ہو گئی۔ بچے نانا نانی کے گھر میں حیران پریشان اور کھوئے کھوئے ادھر ادھر پھرتے رہے۔ انہیں وہاں اپنی خالہ نظر آئی۔ وہ اس کے پاس چلے گئے۔ وہ ان کے پاس آبیٹھی۔ ان کے ساتھ کھیلتی رہی۔ میرے بچے معصوم تھے۔ وہ معصوم نہ تھی۔ اس سارے معاملے کی ناانصافی پر میں کانپ جاتی ہوں۔ میں نے پندرہ دن سے اپنے بچوں کو نہیں دیکھا تھا۔

مصطفےٰ ان سے مل چکا تو والد صاحب مجھ سے ملنے لاہور آئے۔ مصطفےٰ نے

انہیں راضی کرنے کی کوشش کی تھی کہ کسی طرح مجھے واپس آجانے پر آمادہ کریں۔ والد صاحب میرے مزاج سے بخوبی آشنا تھے۔ انہوں نے مصطفےٰ سے کہا کہ وہ مجھے طلاق دینے پر سنجیدگی سے غور کرے۔ مصطفےٰ ایسا کرنے سے انکار کر چکا تھا۔

میری بیٹی، نصیبہ، کی سال گرہ آگئی۔ وہ فون پر روتی رہی۔ وہ فون پر روتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ جب اپنا کیک کاٹے تو میں وہاں موجود ہوں۔ مصطفےٰ کہیں گیا ہوا تھا۔ میں نے سال گرہ کی دعوت میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے چھوٹے سے گھر واپس آگئی۔ نصیبہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس نے کیک تراشا۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ میرے دل نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہے۔

اتنے میں مصطفےٰ آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ "تم ذرا اوپر آؤ گی؟ تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ارد گرد نظر ڈالی۔ گھر میں بہت زیادہ مہمان جمع تھے۔ میں کوئی ایسی حرکت نہ کرنا چاہتی تھی کہ سب لوگوں نظر میں تماشا بن جاؤں۔ مصطفےٰ کو کیا پروا تھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اوپر پہنچی۔ ہم نے کمرے میں قدم رکھا۔ مصطفےٰ تیزی سے مڑا اور اس نے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ میں نے چٹخنی لگنے کا کھٹکا سنا۔ مجھے پتہ چل گیا کہ میں جال میں پھنس چکی ہوں۔ مصطفےٰ نے دھمکی بھرے لہجے میں بات کی۔ صاف نظر آتا تھا کہ میری خیر نہیں۔ "تم اب یہاں سے نہیں جاسکتیں۔ اب تمہیں دو مہینے میرے پاس رہنا پڑے گا اور میں اس عرصے میں اس بات کا پکا بندوبست کر لوں گا کہ تم ہمیشہ میرے پاس رہو۔ کل میں تمہیں گاؤں واپس لے جاؤں گا۔"

سراسیمگی۔ مجھے اغوا کیا جارہا ہے۔ قبل ازیں وہ میرے بچوں کو اغوا کر چکا تھا۔ یہ سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا؟ خدایا! یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ میں نے اپنے اندیشوں کو چھپانے کی کوشش کی۔ ہمت سے کام لو۔ گھبراؤ نہیں۔ "مصطفےٰ، دروازہ کھول دو۔ ابھی، ورنہ میں شور مچا کر گھر سر پر اٹھالوں گی۔" "چیخو چیخو۔ مجھے پروا نہیں۔" مجھے یہ خیال نہ آیا کہ میں ایسے شخص کو دھمکا رہی ہوں جو رائے عامہ کو کبھی خاطر میں نہ لایا تھا۔ اگر نچلی منزل میں مہمان جمع ہیں تو پھر کیا ہوا۔ میں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس نے میری کلائیاں دبوچ کر مجھے غسل خانے میں دھکیل دیا۔ میں نے دروازہ بند ہونے کا کھٹکا سنا۔ میں مدد کے لیے شور مچاتی رہی۔ میں چاہتی تھی کہ میری چیخ پکار کسی کے ضمیر میں تو سرایت کر جائے۔ ضمیر کسی کا بھی سہی۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ مصطفےٰ مجھے اغوا کر لے گا۔ وہ گیدڑ بھبکی نہیں دے رہا تھا۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

مصطفےٰ کے بھائی اور ان کی بیویاں نچلی منزل میں تھیں۔ وہ دوڑے ہوئے اوپر آئے۔ مصطفےٰ کی بہو مریم، بھی لپکی چلی آئی۔ وہ صدمے سے دم بخود کھڑی رہ گئی۔ اس نے اپنے خسر کو گھور کر دیکھا اور ہمت کر کے چلائی۔ "ڈیڈی، آپ یہ نہیں کر سکتے!" مصطفےٰ اس پر برس پڑا۔ "نکل جاؤ کمرے سے"۔ وہ دوڑ کر باہر چلی تو گئی لیکن جو کہنا چاہتی تھی بہر حال کہہ گئی۔

میں نے مصطفےٰ سے بات کی۔ "مصطفےٰ، تم میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتے۔" "میں کر سکتا ہوں اور کروں گا۔ تمہارے والدین میری پشت پر ہیں۔" میں نے کہا کہ مجھے ان سے بات کرنے دو۔ مصطفےٰ اس پر تیار نہ ہوا۔

اس اثنا میں میری خالہ میرے بارے میں فکر مند ہو چکی تھیں۔ میں گھر واپس نہ آئی تھی۔ لندن سے میری بہن منو کا فون آیا تھا۔ ادھر میں اپنے پاؤں ایک زخمی درندے کے کچھار میں جا گھسی تھی۔ میری زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ انہوں نے مصطفےٰ کو فون کیا۔ مصطفےٰ نے اختر خالو سے بات کی۔ "تہمینہ واپس نہیں جارہی۔ اس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" "کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟" "نہیں۔ وہ مصروف ہے --- نصیبہ کے لیے کچھ کر رہی ہے۔"

اختر خالو کو دال میں کالا نظر آیا۔ انہوں نے لندن منو کو مطلع کر دیا۔ منو نے فوراً جوابی کارروائی شروع کر دی۔ اس نے وزیر اعلیٰ کے گھر فون کیا۔ اخبار والوں سے بات کی۔ میرے دوستوں، جگنو اور نجم سے رابطہ کیا جو "فرائیڈے ٹائمز" نکالتے ہیں۔ یہ سب کچھ لانگ ڈسٹینس کے محفوظ فاصلے سے ہوتا رہا۔ خبر پھیل گئی۔ میری وکیل عاصمہ جہانگیر سے رابطہ کیا گیا۔ وہ اگلی صبح تک انتظار کرنا چاہتی تھی تاکہ مجھے حبس بیجا میں رکھنے اور اغوا کرنے کی کوشش کے الزام میں مصطفےٰ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے جاسکیں۔ میں بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس موقع پر قانونی باریکیوں کو سمجھنا میرے بس میں نہ تھا۔ میں چاہتی تھی کہ رہا ہو جاؤں۔ اُدھر باقی لوگ تو میری رہائی کے لیے گفت و شنید میں مصروف تھے، ادھر مصطفےٰ کا بیٹا، بلال، اس کار کا بندوبست کر رہا تھا جس میں ڈال کر مجھے کوٹ ادو پہنچایا جانا تھا۔

مصطفےٰ نے ویلیم کی شیشی اٹھائی، پیچ دار ڈھکنا کھولا، دو گولیاں ہتھیلی پر الٹیں اور میرے حوالے کر دیں۔ جب میں نے کھانے سے انکار کیا تو مجھے انہیں نگل جانے پر مجبور کیا گیا۔ گولیاں زبردستی میرے منہ میں ٹھونس کر وہ اوپر سے پانی انڈیلنے لگا۔ یہ وہی ترکیب تھی جو انگلستان میں اپنے کتوں کے ساتھ استعمال کرتا رہا تھا۔ مجھے اچھو لگ گیا۔ ویلیم کی گولیوں سے میرے اعصاب کو کوئی تسکین نہ ملی۔ میرا تناؤ شدید سے شدید تر ہو

گیا۔

مصطفےٰ سمجھا کہ میں خاصی پُر سکون ہو چکی ہوں۔ وہ دوائیوں کی اثر آفرینی پر خاصا یقین رکھتا تھا۔ اس نے مجھے اجازت دی کہ امی سے فون پر بات کر لوں۔ "انہیں بتاؤ کہ تم میرے پاس رہنے پر راضی ہو گئی ہو۔" میں نے جھوٹ بولا۔ اس کی بات دہرانے کی ہامی بھر لی۔ اس نے فون ملایا۔ میں اپنے قول سے پھر گئی۔ "اگر آپ نے مجھے اس شخص کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ آپ کیسی ماں ہیں؟ میں ساری دنیا کو بتا دوں گی کہ مجھے آپ کے جبر کے سبب خودکشی کرنی پڑی۔"

جب مصطفےٰ کہیں ادھر ادھر ہوا تو میں نے ایک چھوٹا سے رقعہ لکھا۔ وہ میں نے شیری کی پندرہ سالہ بیٹی، آمنہ، کے حوالے کیا۔ پلیز، کہیں جاکر اس نمبر پر فون کرو۔ ان سے کہو کہ یہاں آکر مجھے بچالیں۔"

بیچاری ننھی سی جان آمنہ۔ ایسی خفیہ کارروائی اس کے مزاج سے بالکل مناسبت نہ رکھتی تھی۔ جب وہ میرا رقعہ ہاتھ میں پکڑے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے یہ دعا مانگ رہی تھی کہ کسی طرح رقعے کو گھر سے باہر سمگل کرنے کا موقع مل جائے تو اس کا خون خشک ہوا جارہا تھا۔ اس کا چہرہ کہے دیتا تھا کہ وہ کوئی غلط کام کر رہی ہے۔ وہ مصطفےٰ کی نظر میں آگئی۔ اس نے آمنہ کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے رقعہ چھین لیا۔ رقعہ پڑھنے کے بعد اس نے آمنہ کی خوب خبر لی۔ وہ میری طرف آنسو بھری آنکھوں سے غم زدہ ہو کر دیکھتی رہی۔ "کم از کم میں نے کوشش تو کی۔"

والد صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے کہ ایک سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ مصطفےٰ نے ان سے کہا تھا کہ اگر اسے موقع دیا جائے وہ مجھے اس کے پاس ہنسی خوشی لوٹ آنے پر راضی کر لے گا۔ میں چیخ چیخ کر کہتی رہی کہ مجھے بالجبر روکا جارہا ہے۔ میری مرضی کے خلاف۔ والد صاحب نے مصطفےٰ سے بات کی۔ دو ٹوک لہجے میں۔ "اسے چھوڑ دو۔ اسی وقت۔"

اس حکم کے فوراً بعد مصطفےٰ نے مجھے چھوڑ دیا۔ مجھ پر ابھی صدمے کی کیفیت تھی۔ میں باہر آئی اور دروازہ بند کر دیا۔ مصطفےٰ کسی کا نمبر ملا رہا تھا۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ کسے فون کر رہا ہے۔ ضرور کسی اہم شخص سے بات کرنا چاہتا ہو گا۔ وہ امی کو فون کر رہا تھا۔ "ماں جی، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تہمینہ آپ سے اتنی جلتی کیوں ہے۔ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ آپ اس کے لیے مسئلہ کیوں بنی ہوئی ہیں۔ میں چونکہ آپ کا احترام کرتا ہوں اس لیے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔ میں آپ کا احترام کرتا ہوں وہ اس سے برداشت نہیں ہوتا۔"

میرا جی متلانے لگا۔ یہ شخص بیمار تھا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ اس نے جلدی سے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

فون واپس رکھ دیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا اور وہ جھینپا جھینپا نظر آرہا تھا۔ "میری بیچاری امی۔ تم نے انہیں اور میرے گھر والوں کو جی بھر کے بیوقوف بنایا ہے۔" میں باہر آگئی۔

میں سچ مچ قلاش ہو چکی تھی۔ میرے پاس نام کو پیسے نہ تھے۔ میں نے زرمینہ سے بات کی اور کہا کہ مجھے تھوڑے سے روپے ادھار دے دو۔ زرمینہ کے خسر، صادق حسین قریشی، کو میری مالی حالت کا پتا چلا تو انہیں صدمہ پہنچا۔ انہوں نے مجھے دس ہزار روپے بھجوا دیے۔ مجھے یاد ہے کہ میں جانماز پر بیٹھی رو رو کر انہیں دعائیں دیتی رہی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنے رحمدل ہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان میں کتنی نجابت ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اصول پرست آدمی ہیں جو حق کا ساتھ دیتے ہیں، باطل کا نہیں۔ یہ توفیق تو والد صاحب کو بھی نہیں ہوئی تھی۔

اب مجھے طلاق اور صرف طلاق درکار تھی۔ اس سے کم پر میں کسی طرح راضی نہ ہو سکتی تھی۔ میں مصطفٰے کھر کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کا ایک ایک لفظ، ہر لفظ کا ایک ایک رکن کئی کئی بار پڑھ چکی تھی۔ اب زندگی کے اس باب پر تمت لکھنے کا وقت آگیا تھا۔ والد صاحب مصطفٰے سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھے طلاق دے دے۔ مصطفٰے تیار ہو گیا لیکن بعض شرطیں عائد کر دیں۔ وہ چاہتا تھا کہ لندن میں جو املاک ہے وہ اسے مل جائے۔ بچے اس کے پاس رہیں۔ میں نے اسلام آباد میں اپنی جائیداد بیچ کر لاہور میں جو مکان خریدا تھا وہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ مجھے بالکل محتاج کر دینا چاہتا تھا والد صاحب نے اتفاق کیا۔ "تہمینہ کے پاس پھوٹی کوڑی نہ چھوڑو۔"

اپنی بیٹی کے لیے کچھ مانگنا والد صاحب کے لیے باعث عار تھا۔ وہ میرا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔ میرے بچوں کو مصطفٰے کھر لے گیا۔ لندن میں جو املاک تھی اس کے لیے وہ مختار نامہ حاصل کر چکا تھا۔ میرے چھوٹے سے گھر میں وہ آج مقیم تھا۔ میرے پاس سر چھپانے کی جگہ نہ تھی۔ والد صاحب کے گھر کے دروازے تو خود بخود مجھ پر بند ہو گئے تھے کیونکہ وہ عدیلہ کے لیے کھلے تھے۔ امی کی خواہش تھی کہ میں اس سلسلے میں کوئی سمجھوتا کر لوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں مطلوب اور اس کے گھر والوں سے ملوں اور انہیں قائل کروں کہ میں پاگل ہو گئی تھی اور اسی دیوانگی کے عالم میں میں نے "بیچاری بے گناہ عدیلہ" پر کیچڑ اچھالا تھا۔ عدیلہ کے معاشقے کی خبر باہر نکل گئی تھی اور اس کی شادی کھٹائی کا شکار تھی۔ امی چاہتی تھیں کہ میں انہیں جا کر بتاؤں کہ میں مصطفٰے کو چھوڑنے کے لیے بہت بے قرار تھی۔ اسی لیے میں نے اتنی رکیک حرکت کی اور عدیلہ کی عشق بازی کا سارا قصہ خود ہی گھڑ لیا۔ میں اس مضحکہ خیز تجویز پر ایک لمحے

کے لیے بھی غور کرنے کو تیار نہ تھی۔ مجھے متنبہ کیا گیا کہ اگر میں نے ان کے کہے پر عمل نہ کیا تو وہ مالی طور پر میری مدد نہیں کریں گی۔ میں نے اپنی "بیچاری ننھی بہن" کی خاطر مزید جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا۔

میں نے اخباروں کو ایک بیان جاری کیا جس میں بتایا کہ میں طلاق اس بنا پر لے رہی ہوں کہ ہم دونوں میں مطابقت کا فقدان ہے۔ اس کے بعد مصطفٰے اور میں نے اتفاق کر لیا کہ آئندہ ایک دوسرے کے بارے میں یا اپنی شادی کے متعلق اخباروں کو مزید کوئی بیان جاری نہیں کریں گے۔ میں نے یہ سب کچھ طلاق کی خاطر منظور کر لیا۔ میں مجبور تھی۔ مصطفٰے کھر، شیرِ پنجاب، کا ایک بار پھر بال تک بیکا نہ ہو سکا۔

وہ طلاق کے کاغذات پر دستخط کرنے آیا۔ میں والد صاحب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ عربی اور تاج الملک اس کے ہمراہ گواہوں کے طور پر آئے تھے۔ مصطفٰے آکر بیٹھ گیا۔ اس نے میرے بچوں کو کمرے میں بلا لیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے بچوں سے کہا۔ "میرے بچو، میں چاہتا ہوں کہ تم گواہ رہو کہ میں تمہاری امی سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔ میری خواہش ہے کہ وہ میری گھر والی بنی رہیں۔ مجھے تمہاری امی سے محبت ہے۔ لیکن تمہاری امی مجھ سے الگ ہونا چاہتی ہیں۔"

جوڑ توڑ کا استاد۔ بے حیائی کا برقع اوڑھنے والا سیاست دان جھوٹ موٹ کے آنسو بہا کر میرے بچوں کی عقل پر پردہ ڈالتا رہا۔ میں نے دل میں کہا، مصطفٰے، تم کس غضب کے اداکار ہو۔ میرا چہرہ تاثر سے عاری تھا۔ میری آنکھوں سے کوئی آنسو نہ ٹپکا۔ مصطفٰے نے دستخط کر دیے۔ بچے رونے لگے۔ انہوں نے میری منت کی کہ میں ان کے ابو سے الگ نہ ہوں۔ ان کو ابھی ان باتوں کی سمجھ کہاں تھی۔ میں نے دستخط کر دیے۔ میرے کندھوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں اب بیگم مصطفٰے کھر نہ رہی تھی۔ بس فقط تہمینہ۔ والد صاحب کا نام اب بھی میری ذات کو کسی تیزابی مادے کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

ہم بطور میاں بیوی آخری بار ہم کلام ہوئے۔ تاج اور عربی اور میرے بچے ہمارے ارد گرد کھڑے تھے۔ "مصطفٰے، امید کرتی ہوں کہ تم اپنی کوئی چیز یہاں بھولے تو نہیں جا رہے۔ پندرہ برس گزر جانے کے بعد مجھے امید ہے کہ میں نے تمہاری کوئی چیز رکھ نہیں لی ہوگی۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ شکست خوردہ۔ "تہمینہ مجھ سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئی ہو۔" "آج بطور انسان تم نے وہ کچھ کھو دیا جس کی، خواہ تمہیں کتنا کچھ اور مل جائے، کبھی تلافی نہیں ہو سکے گی۔ تمہارے پاس اور سب کچھ ہے۔ تم نے مجھ سے سب

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کچھ چھین لیا ہے۔ لیکن آج کے بعد تم یہ کبھی نہ کہہ سکو گے کہ تہمینہ تمہاری بیوی ہے۔ تم نے مجھے کھو دیا۔ میں نے اپنی ذات کے سوا تمہیں کسی چیز سے محروم نہیں کیا۔ یہ ہے وہ چیز جو تم آج چھوڑ کر جا رہے ہو۔" وہ بچوں کو لے کر چلا گیا۔ میرے خالو نے کہا کہ میں بہت سرد مہر اور سنگدل ثابت ہوئی اور مصطفیٰ نرم دل انسان ہے۔ انہیں حقیقت کا کیا پتہ۔

اخباروں نے عدیلہ اور مصطفیٰ کے بارے میں ایک بیہودہ سی کہانی چھاپ دی۔ انہوں نے کہا کہ یہ کہانی انہیں مجھ سے ملی ہے۔ میں نے اس کی تردید کی۔ میں نے حقائق پر پردہ ڈالنا چاہا۔ میں نے عدیلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایسی بہن ہے جس سے میں پیار کرتی ہوں، جس کا خیال رکھتی ہوں۔ جھوٹ بول کر مجھے سخت اذیت پہنچی۔ لیکن عدیلہ کی شادی کی خاطر میں جھوٹ بولنے پر مجبور تھی۔ مطلوب نے مجھے برا بھلا کہا۔ کہانی عام ہو چکی تھی۔ لوگوں نے عدیلہ کو مصطفیٰ کے ساتھ دیکھا تھا۔ ان کی عاشقانہ ملاقاتیں اتنی خفیہ نہ تھیں جتنی وہ سمجھے بیٹھے تھے۔ ہماری طلاق سے قیاس آرائیوں کا سیلاب امڈ آیا۔ میں نے بند باندھنے کی کوشش کی تاکہ نقصان کم ہو۔ تسنیم نے مطلوب کو بتایا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سچ ہے۔ مطلوب کو عدیلہ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ اس کی کائیاں بیوی نے اس پر خوب منتر پھونکا تھا۔ اسے کسی بات پر یقین ہی نہ آتا تھا۔ لیکن اسے جلدی پتہ چلنے والا تھا کہ جسے وہ سچ سمجھتا رہا تھا وہ جھوٹ ہے اور جسے جھوٹ سمجھتا رہا تھا وہ سچ ہے۔

زرمینہ، منو اور روبینہ نے چٹان بن کر میرا ساتھ دیا۔ میرے خالو عزیز، ان کی بیگم خالہ یاسمین، خالہ ثمر اور میری رشتے زاد، نگین، سب نے بڑی استقامت دکھائی اختر خالو کے پاؤں تو خاص طور پر ایک دفعہ بھی نہ لڑکھڑائے۔ مجھے اپنی زندگی دوبارہ شروع کرنی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں سے اور کیسے آغاز کروں۔

عاشورہ کے روز میں نے امی کو فون کیا اور کہا۔ "میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ آج محرم کی دس تاریخ ہے۔ میں ان سب لوگوں کو بددعا دیتی ہوں جنہوں نے مجھ پر ظلم ڈھائے۔ میں خدا سے دعا کروں گی کہ جس طرح یزید کو امام حسین پر ظلم ڈھانے کی سزا ملی تھی اسی طرح انہیں بھی سزا ملے جنہوں نے مجھے ستایا۔" میں نے والدین کو بتایا کہ میں ان سے تعلق ختم کر رہی ہوں۔ میں ان کا نام بھی سننا نہیں چاہتی۔

میں نے مصطفیٰ کو فون کیا اور یہی باتیں اس کے آگے دہرائیں۔ میں نے اسے بتایا۔ "والد صاحب نے تمہیں جو مختار نامہ دیا تھا اسے منسوخ سمجھو۔ میری مسٹر

درانی سے اب کوئی شناسائی نہیں۔ میں یہ ماننے سے انکاری ہوں کہ میرا بھی کوئی خاندان ہے۔ ہم سے متعلق ان کے ساتھ تم جو بھی معاملات طے کرتے رہے ہو گے وہ کالعدم قرار پاتے ہیں۔ اب ایسی کسی بات کی کوئی حیثیت نہیں رہی جسے والد صاحب تمہاری خاطر انجام دینے کو اپنی اخلاقی ذمے داری سمجھتے ہوں۔"

میں انکل صادق حسین قریشی سے ملی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ مصطفیٰ سے کہیں کہ وہ لاہور میں میرا مکان خالی کر دے۔ مصطفیٰ انکل صادق سے ملنے آیا۔ سودے بازی کرنے لگا۔ کہنے لگا کہ اگر لندن والی املاک اسے دے دی جائے تو اس کے بدلے مکان خالی کر دے گا۔ میں نے بھی اسی جیسے ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ میں بھی بہت کچھ سیکھ چکی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مصطفیٰ کھر بن کر دکھاؤں گی۔ ایک دفعہ اور سہی۔ اب کسی بات کی اہمیت تو رہی نہ تھی۔ ذاتی مفاد اور بقائے ذات کو اولیت حاصل تھی۔ سچ ثانوی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ میں بزور اسے مکان سے بے دخل نہیں کر سکتی۔ مکان میری بیٹیوں کے نام تھا۔ بیٹیاں اس کی تحویل میں نہیں اور مکان پر وہ قابض بھی تھا۔ نواب صادق حسین قریشی نے ضمانت دی کہ میری لندن کی املاک مصطفیٰ کے حوالے کر دی جائے گی۔ میں نے مختار نامے پر دستخط کر کے مصطفیٰ کو تھما دیا۔ میں نے مختار نامے کی برطانوی سفارت خانے سے تصدیق نہیں کرائی۔ جہاں تک برطانوی قانون کا تعلق ہے یہ دستاویز کاغذ کے بیکار پرزے سے زیادہ نہ تھی۔

عدت کے تین مہینوں کے دوران مصطفیٰ مجھے بے وقر کرنے میں مصروف رہا۔ اس نے ان تمام جگہوں کو نشانہ بنایا جہاں سے مجھے مالی طور پر سہارا مل سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر میں نے خود کو مالی اور جذباتی طور پر غیر محفوظ محسوس کیا تو پھر اس کے در پر حاضر ہو جاؤں گی۔ اسے یقین تھا کہ بعض لوگ رفتہ رفتہ مجھ سے کنارہ کر لیں گے اور بہت سے اچانک میرا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ ایک اور سطح پر وہ چاہتا تھا کہ مجھے اس اہانت کا تجربہ ہو جو مطلقہ کے حصے میں آتی ہے۔ اسے پتہ تھا کہ میرے گھر والوں کو میری نئی حیثیت سے جلد ہی گھن آنے لگے گی اور وہ مجھ پر مصطفیٰ کے پاس لوٹ جانے کے لیے دباؤ ڈالیں گے۔

مصطفیٰ اب مجھے دق کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے میری کار چھین لی۔ اب ایک ہی مالی سہارا رہ گیا تھا جس پر میں اس وقت تکیہ کر سکتی تھی جب بچاؤ کی اور کوئی صورت نظر نہ آئے۔ مصطفیٰ اس مالی سہارے کی بیخ کنی میں مصروف ہو گیا۔ وہ بار بار میرے والدین کے پاس گیا اور انہیں قائل کر کے چھوڑا کہ عدیلہ کے بارے میں ساری کہانی

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

من گھڑت تھی۔ اسے میں نے بیٹھ کر گھڑا تھا۔ وہ یہی تو سننا چاہتے تھے۔ فوراً یقین لے آئے۔ ان کے سینے سے بوجھ اتر گیا۔ امی کو عدیلہ اور اس کی شادی کو ہر قیمت پر بچانے کے چکر میں کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اس لیے وہ مصطفیٰ کے کہے پر ایمان لے آنے کے لیے اور بھی زیادہ بے قرار تھیں۔ وہ ہنسی خوشی اس کے جھکے میں آگئیں۔ والد صاحب الگ تھلگ رہے۔ زرمینہ، منو اور روبینہ اس سیاسی ڈھونگیے کے ہاتھوں جھانسا کھانے کے لیے تیار نہ ہوئیں۔ مجھے نانی اماں کی کمی پہلے سے بھی زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ان لوگوں کے دام میں نہیں آؤں گی۔ امی امید لگائے بیٹھی تھیں کہ میں پھنسی کہ پھنسی۔

نعمیٰ اور جیلو لندن گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں جگنو اور نجم نے ان کی جگہ پر کی جو "فرائیڈے ٹائمز" نامی ہفت روزہ کے کرتا دھرتا ہیں۔ انھوں نے میرے پاس باقاعدگی سے آتے رہنے کا خاص خیال رکھا حالانکہ ان پر اہل لاہور کو اپنے حکمرانوں کی کارستانیوں سے باخبر رکھنے کا بڑا دباؤ تھا۔ وہ اپنے قارئین کو بتاتے رہتے تھے کہ حکمرانوں نے کتنے کام بنائے، کتنے بگاڑے۔

اپنی وکیل عاصمہ سے مجھے بڑی تقویت ملی۔ میں نے طلاق کے سلسلے میں دوبارہ اسی سے رجوع کیا تھا۔ اس نے اپنی حیرت کا زبانی اظہار کیا۔ پوچھنے لگی کہ کیا اس بار میں واقعی طلاق لینا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ میرے چہرے کے تیور دیکھ کر بھانپ گئی کہ میں کچھ ٹھان کر آئی ہوں۔ اس نے میرا مقدمہ لے لیا اور میری جانب سے مصطفیٰ کا مقابلہ کرنے میدان میں اتر آئی۔

دن گزرتے گئے۔ اس اثنا میں میں نے اپنے ان تمام تعلقات کا جائزہ لینا شروع کیا جو آج تک میں نے قائم کیے تھے۔ مجھے یہ بات خاص طور پر محسوس ہوئی کہ ناانصافی کرنے میں میرے گھر والے مصطفیٰ سے کم نہ تھے۔ کوئی میری مدد کرنے کے لیے آگے نہ آیا تھا۔ ایک وہ وقت تھا جب میں ننھی سی تھی اور گرتی پڑتی پھرتی تھی اور انھوں نے بڑے فخر سے مجھے چلنا سکھایا تھا اور میں بے یقینی کے عالم میں پہلی بار چند قدم چلی تھی۔ اب وہ مجھے رینگتے دیکھ رہے تھے اور اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔

زرمینہ کی حیثیت خصوصی تھی۔ اس نے نانی اماں کی کمی پوری کرنے کی کوشش کی۔ وہ جبلی طور پر سمجھ جاتی کہ اس سے کس بات کی توقع کی جارہی ہے اور اپنا کردار پوری طرح نباہتی۔ نانی اماں نے ہمیں ایک رشتے میں پرو دیا تھا۔ ہم ساتھ ساتھ رہے، ہمیں کوئی جدا نہ کر سکتا تھا کیونکہ ہم دونوں کو نانی اماں سے محبت تھی جو آج بھی ہماری نگہبان ہیں، ہمیشہ کی طرح، ہمیشہ کے لیے۔

جس دوران میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی، لڑکھڑاتی تھی، گر پڑتی تھی اور پھر، ذرا گڑبڑا کر، اٹھ کھڑی ہوتی تھی، مصطفیٰ برابر مجھ سے ملتا رہا۔ ایک بار وہ اپنے بھائیوں اور ان کی بیگمات کا وفد لے کر میری پاس آیا۔ انھوں نے مجھے پر چانا شروع کیا تاکہ میں اپنا ارادہ بدل لوں اور لوٹ آؤں۔ بھائیوں نے مصطفیٰ کی وکالت کی۔ میں ان کا مطالبہ تسلیم نہ کر سکی۔ میں نے اپنی طرف سے ایک مطالبہ پیش کر دیا ۔ میں چاہتی تھی کہ مصطفیٰ اپنے اہل خاندان کی موجودگی میں اعتراف کرے۔ میں چاہتی تھی کہ جو کچھ اس کے اور عدیلہ کے درمیان ہوا تھا سچ سچ بیان کر دے۔ اپنی سالی سے زنا کاری کی گھٹیا تفصیلات سے پردہ اٹھا دے۔ مصطفیٰ یہ اعتراف کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

وہ ایک بار اور مجھ سے ملنے آیا۔ اکیلا۔ اس ملاقات کے دوران جب اس کے اپنے ضمیر، میرے اور اللہ کے سوا کوئی گواہ نہ تھا اس نے سب کچھ پوست کندہ بیان کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ عدیلہ سے تین بار ملا تھا۔ اس میں وہ موقع بھی شامل ہے جب میں نے ان دونوں کو ساتھ واپس آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مان لیا کہ وہ اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی اس پر شیطان چڑھ گیا تھا اور اسے معصیت پر اکساتا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شہوت کی وجہ سے اسے اپنے پر قابو نہ رہا تھا اور اس نے میرے ردعمل کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ یہاں تک کہ میں واقعی اسے چھوڑ گئی۔ وہ رو پڑا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اسے معاف کر چکی ہوں۔ اس نے میری طرف دیکھا اور فوراً مجھ سے واپس آجانے کے لیے کہا۔ میں شاید کمزوری دکھا جاتی لیکن اس فوری ردعمل نے مجھے بچالیا۔ اس طرح کے ردعمل سے مجھے بارہا سابقہ پڑ چکا تھا۔ جب بھی وہ کوئی غلط حرکت کرتا تو بعد میں آکر میرے قدموں میں لوٹنے لگتا اور میرے جذبۂ ترحم کو ابھار کر اپنا کام نکالنا چاہتا۔ جونہی میں اسے معاف کرتی، وہی پرانا مصطفیٰ دوبارہ جی اٹھتا۔ جس معاملے پر ناچاقی ہوئی تھی اسے بھلا دیا جاتا۔ اس کی زندگی پرانے ڈھرے پر چلتی رہتی۔ وہ ایسا مرد تھا جو اجتماعی شعور سے محروم تھا۔ اس کی یادداشت تختۂ سیاہ جیسی تھی اور میری معافی بھیگی ہوئی پوچھن۔ میں نے مصطفیٰ پر واضح کر دیا کہ میں نہ تو کبھی لوٹ کر آؤں گی نہ اسے معاف کروں گی نہ ان زیادتیوں کو بھلاؤں گی جو میرے ساتھ روا رکھی گئی تھیں۔ خواہ کچھ ہو جائے۔

اس نے اپنے حملے کا رخ اب میرے کردار کی طرف موڑ دیا۔ وہ لوگوں سے ملتا، اہل خاندان اور احباب کے پاس جاتا اور انہیں بتاتا کہ میرے الگ ہونے کے وجہ یہ ہے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کہ میں "مادر پدر آزاد" عورت بننے کی خواہاں ہوں۔ اس نے یہ بے پر کی بھی دہرائی کہ اسے چھوڑ جانے کے لیے مجھے کوئی بہانہ درکار تھا۔ میں نے عدیلہ کو بدنام کر کے اپنا کام نکال لیا۔ ہوا اصل میں کچھ بھی نہ تھا۔ سب میرے ذہن کی اختراع تھی۔

اس نے مجھ پر یہ چھپی ہوئی چوٹیں اس وقت کیں جب یہ سب کچھ کہنے سے پہلے وہ میرے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر چکا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے جو رہی سہی عزت باقی ہوگی اسے بھی مصطفےٰ نے خود اپنی کارستانی سے خاک میں ملا دیا میری نظر میں مصطفےٰ کھر بے معنی ہو کر رہ گیا۔ میں اسے کیا سمجھتی رہی اور وہ کیا نکلا۔ میری سمجھ میں آنے لگا کہ وہ میرے ذہن میں قائم تصور کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

میرا گھر مجھے واپس مل گیا تھا۔ اس بات سے مجھے بڑا سکون پہنچا۔ مجھے دوسروں کے گھروں میں رہنا ناپسند تھا۔ مجھے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے میں ازسرِ نو جلاوطن ہو گئی ہوں۔ بچوں کی خاطر میں نے مصطفےٰ کے ساتھ شریفانہ تعلق برقرار رکھا۔ میں علی کی سالگرہ کے موقع پر اس کے کینال بینک والے گھر گئی۔

ہماری لنچ پر ملاقات ہوئی۔ مصطفےٰ چاہتا تھا کہ میں آؤں اور بچوں سے ملوں۔ یہ اہم ملاقات ثابت ہوئی۔ میں نے خود ترحمی کے بغیر، اپنے پر رقت طاری کیے بغیر، اس سے بات کی۔ "مصطفےٰ، تمہیں پتہ بھی ہے کہ تم مجھ سے سب کچھ چھین چکے ہو۔ پندرہ سال پر محیط جدوجہد۔ میرا خاندان، میرے بچے، میری جوانی، تم خود اور ہر وہ چیز جس پر مجھے یقین تھا۔ مجھے ازسرِ نو زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں نے جو کچھ تم سے سیکھا ہے اسے کام میں لانا چاہیے۔" مصطفےٰ نے سیاست دانوں والا رویہ اپنا لیا۔

جواب ندارد۔

وہ آخر کار پی پی پی میں شامل ہوگیا۔ پارٹی میں شامل ہونے سے پہلے اس نے مجھ سے مشورہ کیا۔ اسلام آباد سے فون پر مجھ سے کہا کہ داتا صاحب جا کر اس کے لیے دعا کروں۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمہاری دعا یہی ہوگی کہ میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔" میں نے اللہ سے دعا کی کہ مصطفےٰ کو سیدھی راہ دکھائی جائے۔ میں نے خلوص سے دعا مانگی۔ میرے دل میں کوئی چھل کپٹ نہیں تھی۔ میں قدرت کو فریب دینے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔

ایک اور مرتبہ اسلام آباد سے جب مصطفےٰ نے مجھے فون کیا تو لگتا تھا۔ اس کا اضطراب دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ وہ فون پر سسکیاں لیتا رہا۔ "پلیز، یاد رکھنا، میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جس طرح میں نے تمہیں چاہا ہے اس طرح کسی عورت کو نہ چاہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں گنوا بیٹھا ہوں۔

مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

میں اسے کوئی امید نہ دلانا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ ذرا ہوش میں آئے اور اس حقیقت کو قبول کر لے کہ ہمارے درمیان تعلق ختم ہو چکا۔ لنچ پر میں بار بار مصطفےٰ سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوال کرتی رہی۔ میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ میرا مستقبل اسے کیسا نظر آ رہا ہے۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ شاید میں کہیں پر کام کرنے لگوں۔ سماجی بہبود میں خود کو مشغول کر لوں۔ میں نہیں چاہتی کہ جو کچھ میں نے سیکھا اور محسوس کیا ہے وہ رائیگاں چلا جائے۔" اس نے میری طرف رخ کیا اور تحقیر آمیز لہجے میں بڑے سکون سے کہا۔ "تہمینہ، تم اب کچھ بھی نہیں۔ کسی زمانے میں تھیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تم بیگم تہمینہ مصطفےٰ کھر تھیں۔ اب تم محض تہمینہ درانی ہو۔ حد یہ کہ جب تم لوگوں کو فون کرتی ہو تو خود کو میری سابقہ بیوی کے طور پر متعارف کرانے پر مجبور پاتی ہو۔ تمہیں دوسروں کو بتانا پڑتا ہے کہ تم ایک زمانے میں مصطفےٰ کھر کی بیوی رہ چکی ہو۔ تم مسز کھر ہوا کرتی تھیں۔ لوگ تم سے ملتے ہیں کیونکہ تم انہیں میرے بارے میں دلچسپ قصے سنا سکتی ہو تمہاری ان کہانیوں کا ذخیرہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ شاید ایک سال تک کام دے جائے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ پھر تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ اس کے بعد تم اپنے تمام نام نہاد دوستوں سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ وہ تم سے اکتا جائیں گے۔ عورتیں تمہیں اپنے گھروں میں قدم نہ رکھنے دیں گی کیونکہ انہیں تم سے ڈر لگتا رہے گا۔ تم ان کی شادیوں کے لیے خطرہ ہو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ سیاسی طور پر کام کر سکتی ہو اور اس میدان میں قدم رکھنا تمہارے لیے ممکن ہے تو بھی تم سے دفتروں کے باہر گھنٹوں انتظار کرایا جائے گا۔ وجہ یہ کہ تم نے اپنے نام سے میرا نام الگ کر دیا ہے۔"

میں آنسو پی کر یہ تجزیہ سنتی رہی۔ غالب کا ایک شعر بھٹک کر میرے ذہن میں آ نکلا:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

میں نے جو باتیں سنیں ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ وہ دستانہ اتار کر میرے مقابلے میں ڈٹ گیا تھا۔ اس نے میرے منہ پر اس دستانے سے طمانچہ رسید کیا تھا۔ میں گھر لوٹی تو اس کے الفاظ بدستور میرے کانوں کو ڈس رہے تھے۔ میں نے اپنی زندگی پر دوبارہ غور کیا، کسی زخمی پرندے کی طرح آخری بار فضا میں بلند ہوئی اور نیچے اتر آئی۔ حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے۔

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

میں بے قید تھی۔ میں آزاد تھی۔ مسز کھر نہ رہی تھی۔ مجھے استعمال کیا جا چکا تھا۔ اب مجھے بیکار سمجھ کر پھینکا جارہا تھا، جیسے گنّے کے چبائے ہوئے پھوک کو تھوک دیا جاتا ہے۔ اس نے میری طاقت سے جلاوطنی اور اسیری کے دوران کام لیا تھا۔ اس وقت میں اس کی واحد حلیف تھی۔ اسے میری ضرورت تھی۔ وہ اپنی محرومیوں کا غصہ مجھ پر نکالا کرتا تھا تاکہ پُرسکون پبلک امیج کے ساتھ دنیا کا سامنا کر سکے۔

میں نے عدیلہ کے ساتھ اس کے تعلقات پر غور کیا۔ میرے لیے ان تعلقات کی وجوہ سمجھنا ضروری تھا۔ وہ اس کی زندگی میں ہمیشہ ایسے وقت نمودار ہوئی جب اس پر اپنی حد سے بڑھی ہوئی توانائی کا دورہ پڑا ہوتا تھا۔ کتے یا کنیریاں یا کبوتر نہ سہی، عدیلہ سہی، اس بات سے کہ ایسا تعلق رکھنا حرام ہے اسے اور انگیخت ہوتی۔ اس فعل کی نری خباثت اسے زیادہ بڑے پیمانے پر توانائی خارج کرنے کا موقع فراہم کرتی تھی۔ یوں وہ ہمارے طبقے سے اپنا انتقام لے رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ عدیلہ کی جو کھم بھری دلکشی کا نتیجہ ابتری کی صورت میں برآمد ہوگا۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں موجود ہوں ۔ اور میں استحکام پیدا کرنے والے عامل کا کام انجام دوں گی۔ ایک انتہا درجے کی صابرو شاکر عورت جو شہوت کا طوفان گزر جانے کے بعد ہمارے بگڑے ہوئے گھر کی تعمیر نو میں چپ چاپ منہمک ہو جائے گی۔ صبر شاید میرے اوصاف حمیدہ میں شامل ہو لیکن وہ یقیناً لامحدود نہیں تھا۔ میں نے چار دفعہ اس سے قطع تعلق کیا۔ ہر بار اس نے مختلف انداز میں میرے خلاف انتقامی کارروائی کی جب اس نے میرے بچوں کو اغوا کر کے مجھے واپس آنے پر مجبور کیا تھا تو اسے ایسا کرنے پر اس کے "بھارتی رابطے" نے اکسایا اور ورغلایا تھا۔ میں اچانک اس کی سلامتی کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔ اس نے ٹھیٹ جاگیر دار کا سا ردعمل ظاہر کیا جس کے لیے تاوان کی غرض سے اغوا کرنا زندگی بسر کرنے کا ایک انداز ہے۔ جیل میں رہ کر اسے لگا کہ وہ بالکل غیر محفوظ ہے اور اس کیفیت کے زیرِاثر مجھے کھو بیٹھا۔ وہ مجھ سے ضرورت سے زیادہ کام لینا چاہتا تھا۔ جب میں خود اپنے سیاسی عہد و پیمان کے بھکائے میں آکر اس کے پاس لوٹ آئی تو وہ سمجھ گیا کہ مجھے اپنے پہلو میں رکھنا ضروری ہے۔ اس نے اپنے عدم تحفظ کے احساسات پر قابو پایا اور مجھے مردوں کی اسی دنیا میں بھیج دیا جس کے خیال سے اس کے دل میں اندیشے جنم لیتے تھے۔ یہ مصطفیٰ کا "نظریۂ ضرورت" تھا۔ کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچائے رکھنے کی جبلت نے اسے میرے ذہن کو اپنے ڈھب کا بنانے پر مجبور کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اس کے کہے پر اسی صورت میں عمل کروں گی جب مجھے اس پر یقین ہوگا۔ اس نے صحیح اندازہ لگایا تھا۔ میرے یقین محکم اور اصول پسندی کی بدولت اسے رہائی نصیب ہوئی ورنہ

عالم یہ تھا کہ اسے خود بھی رہا ہونے کی امید نہ رہی تھی۔ رہائی کے بعد اسے وہی پر قینچ کرنے پڑے جو اس نے میرے لیے وضع کیے تھے۔ اب میں ایک نئی عورت تھی۔ لیکن پہلے سے مختلف مجھے ان مقاصد پر یقین تھا جو وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں محسوس کرتی تھی کہ انہیں حاصل کرنا ممکن ہے۔ میں ذہنی طور پر اس سے زیادہ بالغ ہو چکی تھی۔ مجھے نیچا دکھانا اس کی ضرورت بن چکا تھا۔ اسے عدیلہ درکار تھی جس پر اس کا رعب رہے گا جیسے میں بائیس برس کی عمر میں اس کے رعب میں رہتی تھی۔

محفوظ ہونے کا احساس اور محنتِ شاقہ۔ مصطفیٰ کے ہاں دونوں کا فقدان تھا۔ وہ کسی شارٹ کٹ سے اقتدار تک پہنچنا چاہتا تھا۔ جب آدمی شارٹ کٹ سے اقتدار حاصل کرنے کا متمنی ہو تو سب سے پہلے اس کی اصول پسندی مجروح ہوتی ہے۔ مصطفیٰ کے آدرش محض چارا تھے جن سے سادہ لوحوں کو پھنسانا مقصود تھا۔ عوام بیلٹ بکس کا پیٹ بھرنے کے لیے تھے۔ انہیں ایک دفعہ الو بنانا کافی تھا۔ وہ اپنے کو غیر طبقاتی بنانا نہ چاہتا تھا۔ اس کے پاس معاشرے کے ڈھانچے کی تنظیم نو کرنے کی فرصت نہ تھی۔ اسے پتہ تھا کہ جس نئے نظام کا وہ رندھی ہوئی آواز میں ذکر کرتا رہتا ہے اس میں اس جیسوں کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ میں اس کے ضمیر میں چبھنے والا کانٹا تھی۔ میں اس کے حلق میں پھنس گئی تھی۔ میں اسے ہر وقت یاد دلاتی رہتی تھی کہ کیا کرنا ہے۔ میں بوجھ بن گئی تھی۔ وہ اس طرح اپنا کام نہیں چلا سکتا تھا کہ میں اس کے کندھوں پر سے یا میز کے نیچے جھانکتی رہوں۔ اس کی خواہش بس اتنی تھی کہ آخر کار اسے وزارت، جھنڈے والی کار اور پروٹوکول مل جائے۔ چاہے یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے اپنے حلیفوں سے بے وفائی کرنی پڑے اور حلیفوں کے جسموں کو روندنے کے بعد اقتدار کے بابِ عالی میں نگران کی حیثیت سے قدم رکھنے کا موقع ملے۔

مجھے تباہ کرنا مصطفیٰ کے لیے ضروری ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی اور عورت آجاتی تو مجھے تباہ نہ کر سکتی تھی۔ میں اس سے نمٹ لیتی۔ لیکن عدیلہ! بات صرف اتنی نہ تھی کہ عدیلہ کو وہ اس لیے کام میں لانا چاہتا تھا کہ وہ نوجوان اور خوبصورت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بھی الٹے قدموں چل کر ماضی کی تہمینہ بن جاؤں۔ بات بات پر سمجھوتہ کرنے والی، خوف زدہ، فرماں بردار اور دامن سے چمٹی رہنے والی تہمینہ۔ ایسی تہمینہ جس میں اعتماد نام کو نہ ہو۔ وہ کامیاب رہا۔ عدیلہ کے منظر پر دوبارہ ظاہر ہونے سے میری ازدواجی زندگی کی بنیادیں ہل گئیں۔ لیکن اس بار میں زیادہ مضبوط تھی۔ مجھے اپنا کردار بنانا تھا۔ یہ میں ان آنکھوں میں دیکھ چکی تھی جن کی میں نے تصویریں بنائی تھیں۔ ہمارے وطن کے ایمان دار، سادہ اور افلاس زدہ عوام کی آنکھوں میں، جن کی بدنصیبی یہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

ہے کہ انہیں مصطفےٰ کھر جیسے رہنما ملے ہیں۔

جو ضربیں خوب تاک تاک کر اس نے مجھ پر لگائی تھیں میں ان کے نتیجہ میں تقریباً چت ہوگئی۔ ویسی ہی بن گئی جیسی وہ مجھ سے توقع رکھتا تھا۔ میں نے اس سے علیحدگی اختیار نہ کی۔ میں نے ان کی عشق بازی کو روکنا چاہا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی شادی کو بچانے کی سعی کی۔ اپنے مقام سے گر کر پھر وہی قابل رحم، شبہات کی ماری، حاسد اور ناشاد و نامراد بیوی بن کر رہ گئی۔ مجھ سے نامعقول حرکتیں سرزد ہوئیں، مثلاً عدیلہ سے دو بدو ہوئی، مصطفےٰ کو یہ ثابت کرنے پر مجبور کیا کہ وہ مجھے عدیلہ پر ترجیح دیتا ہے اور اپنے خاندان سے ٹکرا گئی۔ میری سمجھ میں آگیا کہ مصطفےٰ کتنا خبیث ہے، وہ کس طرح میری شخصیت کو کچل رہا ہے، اس عفریت کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کر رہا ہے جسے اس نے خود خلق کیا تھا۔ لیکن وہ یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ مجھ میں کتنی لچک ہے۔ میں دل میں یہی دہراتی رہی کہ لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر، کیا کیجے۔ میں غیظ و غضب کے ایسے پیکر میں تبدیل ہوگئی جس پر وہ قابو نہ پاسکا۔ غیظ و غضب کا ایسا پیکر صرف وہی عورت بن سکتی ہے جس کی تذلیل کی گئی ہو۔ اگر میری نفرت مجھے دھکیل کر اس کے گھر سے باہر لے گئی تو اپنے آدرشوں سے میری محبت نے مجھے اس کے دروازے سے دور نکل جانے کا رستہ دکھایا۔ میں بچ گئی ورنہ زہر میری رگ و پے میں سرایت کر جانے کو تھا۔ زہر کی چند خوراکیں اور ملتیں تو میری روح مردہ ہو جاتی۔ ہمیشہ کے لیے۔

میرے بارے میں مصطفےٰ کھر نے جتنے تخمینے لگائے تھے سب غلط نکلے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے حصے میں جو عظمت آئے گی میں بھی اس میں شریک ہونا چاہوں گی۔ اس نے میرے کردار کا جو اندازہ لگایا تھا وہ سطحی اور بھونڈا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میرا ردعمل بھی اس کے اپنے ردعمل جیسا ہوگا اور اقتدار کے ان روکھے سوکھے ٹکڑوں کو دیکھ کر، جواب اسے ڈالے جارہے تھے، میری رال ٹپکنے لگے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جس پوزیشن پر فائز ہے اس کا مستحق نہ تھا۔ اس مقام تک وہ سمجھوتوں اور شارٹ کٹوں کے ذریعے پہنچا تھا۔ عوام کو فریب دے کر پہنچا تھا۔ ایسے آدمی سے مزید راہ و رسم رکھنا میرے لیے ناممکن ہوگیا تھا۔ ہم نے علیحدگی اس بنا پر اختیار کی تھی کہ ہم میں مطابقت موجود نہیں۔ زیادہ جچے تلے انداز میں کہا جاسکتا ہے کہ ہم میں کیا ذہنی، کیا سیاسی، کیا اخلاقی، کسی قسم کی ہم آہنگی نہ پائی جاتی تھی۔ اگر وہ جلا وطن ہوتا یا جیل میں پڑا ہوتا یا اپنے عوام کے ساتھ ہوتا تو میں بدستور اس کا ساتھ دیتی رہتی۔ لیکن میں اس بنا پر نہیں رہ سکتی تھی کہ اس کے پاس اقتدار ہے، دولت ہے، اثر و رسوخ ہے۔ میری نظر میں یہ وقتی فائدے کی خاطر اپنی اہلیت کا سستا سودا کرنے کے مترادف تھا۔

میں سہمی سہمی، بے گھر، بچوں کے بغیر، کنگال، اکیلی اسے چھوڑ کر چل دی لیکن شکر ہے، ہر طرح کے بگاڑ سے بچی رہی۔ میں نے عین وقت پر رشتہ توڑ لیا تھا۔

اکیلے میں جب میں اپنے تتر بتر خیالات کو یکجا کرنے لگی تو پتہ چلا کہ مصطفےٰ ایک بار پھر صاف بچ نکلا۔ اسے جھوٹوں بھی سزا نہ ملی۔ مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ قسمت نے ایک خاص مقصد کے لیے مجھے اس پُرپیچ راہ پر لاکھڑا کیا ہے۔ میں مصطفےٰ کو مکافات کو پہنچاؤں گی۔ اس کی آخری تباہی کا ذریعہ بنوں گی۔ میرا ہتھیار میری سچائی ہوگی۔ ہمارا بندشوں میں جکڑا معاشرہ بہت گھٹا ہوا ہے۔ یہاں اگر کوئی عورت اپنے بہت ہی نجی رازوں سے پردہ اٹھا دے تو یہ حرکت بہت سوں کو فحش معلوم ہوگی۔ لیکن خاموش رہنا زیادہ بڑا جرم ہے۔ خاموش رہ کر آپ ناانصافی کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے ہم میں خوئے غلامی پرورش پاتی ہے اور ایک ناپاک منافقت پروان چڑھتی ہے۔ مصطفےٰ کھر اور دوسرے جاگیردار ہماری خاموشیوں کی وجہ سے پنپتے رہتے ہیں۔

میں نے اس کی سیاسی لگاوٹ بازیوں کا حساب لگایا۔ جو تصویر سامنے آئی وہ ایک بزدل، ناکام اور غلطیوں پر غلطیاں کرنے والے انسان کی تھی۔ لاہور کے حلقہ چھ سے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے والا، 1977ء کے انتخابات میں باہر بیٹھا رہنے والا، جنرلوں سے سودہ بازی کرنے کے بعد جلاوطن ہو جانے والا، جنرلوں کے ساتھ کیے ہوئے عہد و پیمان سے پھر جانے والا، بھارتی جاسوسی ایجنسیوں سے اٹکھیلیاں کرنے والا، ہماری فوج کو ہرانے کی سازش کرنے والا، پی پی پی کو ہائی جیک کرنے کا منصوبہ بنانے والا، ایک اور سودے بازی کے بعد پاکستان لوٹ آنے والا، کیونکہ اس کے سوا چارہ کار نہ تھا، جیل جانے والا، فوج سے سمجھوتے بازی کرنے والا، بے نظیر کے عروج پر منہ پھلا لینے والا، عدم اعتماد کے ووٹ سے ذرا پہلے اپنے دوست جتوئی صاحب سے بے وفائی کرنے والا، دوبارہ پی پی پی میں شامل ہونے والا اور آخر کار اپنا خنجر، جس سے پہلے ہی لہو ٹپک رہا تھا، پارٹی کی پیٹھ میں گھونپنے والا۔ اس نے خطابت کے زور شور سے ان تمام کارناموں اور غلط کاریوں پر پردہ ڈال دیا۔ جو اس پر یقین رکھتے تھے ان کے دل سے مصطفےٰ بالکل اتر گیا۔ اس نے ایک قابل حصول آدرش کو غیر مخلصانہ خواب میں تبدیل کر دیا تھا۔

جس روز مصطفےٰ نے میرے سفید لباس کا مذاق اڑایا تھا میں اسی دن سمجھ گئی تھی کہ اس کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں۔ وہ محض اور نرا موقع پرست ہے، ایک بونا پارٹمنٹ جسے تاج کا لالچ محض اس لیے ہے کہ وہ اس کے سر پر خوب سجے گا۔ جسے ذہانت اور بصیرت سے تعبیر کیا جارہا تھا وہ حیلہ سازی اور مکاری کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ملک کے ساتھ وہی سلوک کرے جو میرے اور بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ کر چکا تھا

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اسے روکنا ضروری تھا۔

میں نے آخر کار اس کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی ٹھان لی۔ میں نے میاں نواز شریف سے رابطہ قائم کیا۔ جب میں اس کے دفتر میں داخل ہوئی تو مجھ پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ وہ ہمارا سب سے بڑا دشمن رہ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "کیسی ستم ظریفی ہے کہ میں اس حیثیت میں آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ایک دن مصطفیٰ آپ کی جگہ پر ہوگا اور میں اس کے پہلو میں۔" میں نے اسے بتایا کہ میں جاگیردارانہ ذہنیت اور عورتوں کے استحصال کے خلاف میدان میں اترنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے کسی سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ مصطفیٰ نواز شریف کا سب سے کٹر دشمن تھا۔ صوبے پر وزیر اعلیٰ کی مضبوط گرفت ختم کرنے کے لیے مصطفیٰ ایڑی چوٹی کا زور لگانے کو تیار تھا۔ مصطفیٰ کو اپنے رقیب کے خلاف پی پی پی نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ پی پی پی اس پوزیشن کو دوبارہ حاصل کرنے کی خواہشمند تھی جو نواز شریف نے اپنی فراست سے پنجاب میں جیت لی تھی۔

نوازشریف جاگیردار طبقے کے لیے بالعموم اور مصطفیٰ کھر کے لیے بالخصوص خطرہ بن چکا تھا وہ نوجوان تھا اور اس نے خود کو اہل منتظم ثابت کیا تھا۔ پاکستانی سیاق و سباق میں، طبقاتی اصطلاح میں، وہ ترقی پسند تھا کیونکہ بورژوا اور چھوٹے بورژوا طبقے کی نمائندگی کرتا تھا۔ وہ خود صنعت کار تھا جس نے سیاست میں قدم رکھا تھا، اسی سیاست میں جسے کسی زمانے میں ہمارے ملک کے اندرونی زرعی علاقے کے فارغ البال صاحبان کا کھیل تماشا سمجھا جاتا تھا۔ بطور سیاست دان وہ رو بہ ترقی تھا، رو بہ زوال نہیں۔

عورتوں کے بارے میں اس کے کیا خیالات ہیں، اس سلسلے میں مجھے کچھ تشویش تھی۔ میں آزاد خیال انگریزی اخبارات پڑھتی رہی تھی۔ ان کا نواز شریف کو پیش کرنے کا جو انداز تھا اس میں مدح و ثنا کا کوئی پہلو نظر نہ آتا تھا۔ میں نے دیکھا عورتوں کے موضوع پر نوازشریف کے نقطہ ہائے نظر ترقی پسندانہ اور جدید ہیں۔ مجھے ایک مضبوط پلیٹ فارم مل گیا۔ مجھے تحفظ دینے کے لیے اتنا کافی تھا۔ اب میں مصطفیٰ کھر اور ان تمام چیزوں سے ٹکر لے سکتی تھی جن کی وہ نمائندگی کرتا ہے میں مسلم لیگ میں شامل ہوگئی۔ یہی وہ جماعت تھی جو پاکستان بنانے میں پیش پیش رہی تھی۔ وہ قائداعظم کے آدرشوں کی امین تھی۔ میں مصطفیٰ پر جتا دینا چاہتی تھی کہ میں اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ اسے پتہ چل جائے کہ میں اس کے دشمنوں کے ساتھ ہوں، دوستوں کے ساتھ نہیں۔

میرے فیصلے پر مصطفیٰ جھینپا بھی گھبرایا بھی۔ اس کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ میں میاں

نواز شریف کے ہاتھوں بک گئی ہوں۔ مصطفیٰ نے اس بازار میں خاصی عمر گزاری ہے جہاں اصولوں کے سودے ہوتے ہیں۔ میاں نواز شریف نے نہ تو مجھے کوئی پیشکش کی تھی نہ میں نے کہا تھا کہ میری مادی یا کسی اور قسم کی مدد کی جائے۔ میں مصطفیٰ اور اس ذہنیت کے خلاف، جس کی وہ علامت بن چکا ہے، نبرد آزما ہو گئی۔

اس اثنا میں عدیلہ کے شوہر مطلوب کو اپنی بیوی اور مصطفیٰ کے یارانے کا ٹھوس ثبوت مل گیا۔ جب شبہات نے مطلوب کو زیادہ برانگیختہ کیا تو اس نے اپنا ٹیلی فون ٹیپ کرنا شروع کر دیا۔ مصطفیٰ اور عدیلہ کی گھنٹوں لمبی گفتگو مقناطیسی ٹیپ پر منتقل ہو گئی۔ مطلوب روز گھر آتا، کیسٹ نکالتا، اسے اپنی کار کے کیسٹ پلیر میں ڈالتا اور کراچی میں بے مقصد ڈرائیونگ کرتے ہوئے سنتا رہتا کہ کس طرح وہ دونوں اس کی شادی کو تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں، سازشیں کر رہے ہیں۔ جب آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے ہوتے تو اس کے لیے خود کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ آنسوؤں کی تپش سے اس کے رخسار سلگ اٹھتے۔ کسی کی بے وفائی پر بہنے والے آنسو ہی اس طرح رخساروں کو جلا سکتے ہیں۔ مطلوب نے مصطفیٰ سے ٹکر لینے کی ٹھان لی۔ اس نے یہ ٹیپیں اپنی بیوی اور میری امی کو سنائیں پھر زنا کاری کے ثبوت سے لیس ہو کر لاہور آگیا۔

اس نے عدالت میں ایف آئی آر درج کرائی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ زنا کاری کے مقدمے میں کوئی جاگیر دار کسی دوسرے جاگیردار کو عدالت میں کھینچ لایا ہو۔ یہ بھی پہلی بار تھا کہ حدود آرڈیننس کے تحت زناکاری کا مقدمہ ایسی عورت کے خلاف درج ہوا جو ہمارے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔

مطلوب نے ترقی پسندانہ موقف اختیار کیا تھا۔ اپنی عزت آبرو کی بحالی کے لیے اس نے غصے سے اندھے ہو کر کوئی جرم کرنے کے بجائے عدالت سے رجوع کیا تھا۔ جیسا کہ عموماً ہوتا ہے انصاف کی ترازو طاقتور اور بااثر فریق کے حق میں جھک گئی۔ مصطفیٰ کھر کو داد و تحسین سے نوازا گیا اور پی پی پی کے کارکن اسے کندھوں پر اٹھا کر عدالت کے کمرے سے باہر لائے۔ پی پی پی کے رہنما، طارق رحیم، احمد سعید اعوان اور سلمان تاثیر اس کے جلو میں تھے۔ مصطفیٰ کی زنا کے مقدمے میں ضمانت ہو گئی تھی۔ پاکستان میں غریب اور مراعات سے محروم طبقے کے افراد کو اسی طرح کے مقدمات میں فوراً حوالات بھیج دیا جاتا ہے۔ بد قسمتی سے مطلوب نے غلط وقت چنا تھا۔ مصطفیٰ اس وقت پی پی پی کا اہم ترین رہنما تھا۔ وہ پنجاب میں، لاہور۔99 سے، ایک ایسے الیکشن میں مشغول تھا جس میں ہر فریق یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کا زور زیادہ ہے۔ مصطفیٰ یہ عذر لایا کہ مقدمہ اس کے سیاسی حریف، میاں نوازشریف، کے اکسانے پر دائر کیا گیا تھا۔ اس نے

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کہا کہ مخالفین فاؤل کھیل پر اتر آئے ہیں اور اب وہ زخمی شیر کی طرح لڑے گا۔ مقدمے کی ایسی تیسی ہو گئی۔ مصطفیٰ کھر پھر بچ نکلا لیکن نجمیں آج تک چیخ چیخ کر کہتی ہیں "مجرم، مجرم"۔

مطلوب بہت افسردہ خاطر ہوا۔ اسے اپنے قدامت پسند خاندان اور قبیلے کے قہر کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے خاندان والوں نے الزام لگایا کہ وہ میرے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ کہنے میں نے مصطفیٰ اور عدیلہ سے انتقام لینے کے لیے مطلوب کو مہرے کے طور پر ستعمال کیا۔ مجھے پتہ نہیں کہ ایف آئی آر میں کیا لکھوایا گیا تھا۔ مصطفیٰ نے مطلوب پر الزام لگایا کہ اسے میاں نواز شریف نے خرید لیا ہے، حالانکہ مطلوب وزیر اعلیٰ سے ملا تک نہیں تھا۔ کیچڑ اچھالنے کی اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ ٹھوس ثبوت کو غیر معتبر بنا دیا جائے۔

میں نے طے کیا کہ کھری کھری سنانے کا وقت آگیا ہے۔ تباہ حال مطلوب میرے پاس آیا۔ وہ برباد ہو چکا تھا۔ بے وفائی کی وجہ سے پہنچنے والے دکھ نے اسے معقول انداز میں سوچنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ وہ اب بھی اپنی بیوی سے پیار کرتا تھا اور اس وجہ سے اس کا کرب کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ عدیلہ اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے خاوند کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ ہم اس مستطیل کے وہ دو ضلع تھے جنہیں بڑی بے دردی سے کھاڑ پھینکا گیا تھا۔ ہمارے ساتھ ہونے والی "بے وفائی ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔

مصطفیٰ بڑی بے حیائی سے اکڑتا اتراتا پھرتا رہا۔ پی پی پی کا ہیرو جو ٹھہرا۔ آزاد خیال لوگ اس کی حمایت کرنے لگے اور اس کی ہر خطا معاف کرنے کو تیار ہو گئے۔ ان کی نظر میں مصطفیٰ وہ آدمی تھا جو پنجاب سے ضیاء حکومت کی باقیات کا صفایا کرنے آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دوست پیچھے ہٹنے لگے ہیں۔ مصطفیٰ سیاسی طور پر ہر کسی کے لیے اتنا اہم ہو چکا تھا کہ انہیں توفیق ہی نہ ہوئی کہ ٹھہر کر ذرا سوچ لیں کہ اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے مجھ پر الزام لگا کہ میں اپنے خود غرضانہ اور ہیچ پوچ مقاصد کے لیے جمہوریت کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہوں۔ مطلوب کی کارروائی کا ان دانشوروں نے مذاق اڑایا جو ہماری رائے عامہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ "نواز شریف جانے نہ پائے" کی مہم کہیں زیادہ اہم تھی۔ مجھ پر الزام لگا کہ نواز شریف کا چھچھورے کرتبوں والا بریگیڈ میری مدد اور مجرمانہ اعانت کر رہا ہے۔

میں نے تیرہ سال میں پہلی بار پریس کانفرنس طلب کی۔ وہ بات جو محض افواہ تھی میں نے اس کی سچائی کی تصدیق کر دی۔ میں نے سب کچھ پوست کندہ بیان کر

دیا۔ میں نے کہا کہ مطلوب سچ بول رہا ہے۔ میں نے مصطفیٰ اور عدیلہ کی وجہ سے طلاق لی تھی۔ پہلے ان باتوں سے میں اپنی بہن کا گھر بار اور خاندان کی خاطر انکار کرتی رہی تھی۔ میں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ مصطفیٰ نے اپنی سالی سے زنا کر کے نہ صرف قرآن کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے بلکہ از روئے قانون زنا بالجبر کا مرتکب بھی ہوا ہے۔ اس نے عدیلہ سے جنسی تعلقات تیرہ سال پہلے قائم کیے تھے۔ اس وقت میری بہن ابھی بچی تھی۔ میری باتوں کا بہت برا مانا گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ مجھے پُر وقار رویہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے معاشرے کی ان لاکھوں عورتوں کی طرح محسوس کیا جن کے ساتھ زبردستی زنا کیا جاتا ہے اور وہ جائے واردات سے اٹھ کی چلی جاتی ہیں، محض اس لیے کہ کسی سے کہیں گی تو جگ ہنسائی ہو گی۔ کسی پاجی کو ہرگز یہ اجازت نہ ملنی چاہیے کہ اس کے جرم پر صرف اس لیے پردہ پڑا رہے کہ معاشرہ بہت نازک مزاج ہے اور ایسی باتیں سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ عورتوں کو چاہیے کہ یا تو آواز بلند کریں یا پھر جوتیاں کھاتی رہیں۔

عدیلہ بچ گئی۔ خاندان نے اسے تحفظ دیا۔ سب کے سب وہی پرانا راگ الاپتے رہے۔ میں پاگل ہو چکی ہوں۔ دل سے باتیں گھڑتی رہتی ہوں۔ مجھے اور مطلوب کو میاں نواز شریف نے خرید لیا ہے۔

ان سب نے وہ ٹیپیں سنی تھیں۔ اتنی بار سنی تھیں کہ ان کی طبیعتوں کی حساسیت بھی، کند اور سخت ہو جانے کے باوجود، پکار اٹھی تھی کہ "بس" میں نے یہ ٹیپیں سنی تھیں۔ جب ٹیپیں گھوم گھوم کر الزام کی تصدیق کرنے والی گواہی اگل رہی تھیں تو میری انتڑیاں الٹنے لگیں۔ مجھے لگا کہ میں قے کرنے والی ہوں۔

مصطفیٰ نے انتقامی کارروائی کی۔ مجھے بچوں سے ملنے سے روک دیا۔ میں نے اخباروں کے ذریعے ان کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ میں نے وزیراعظم کو تار بھیجا۔ وہ خود بھی ماں ہے۔ بات اس کی سمجھ میں آنی چاہیے۔ اگر وہ اپنے پلیٹ فارم پر جمع رہنماؤں کا کنٹرول نہیں کر سکتی تو اسے چاہیے کہ انہیں اس بنا پر اپنی نام نہاد جمہوری پارٹی سے نکال دے کہ وہ قانون اور میرے قانونی حقوق کا پاس نہیں کرتے۔ مصطفیٰ راضی ہو گیا کہ بچے محدود وقت کے لیے مجھ سے مل سکتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ مصطفیٰ ایک نہ ایک دن ٹھوکر کھائے گا۔ میں اس کا ذہن پڑھ سکتی تھی۔ میں پی پی پی کے اعلیٰ عہدے داروں کو خبردار کر چکی تھی۔ کہ وہ پارٹی کو ہائی جیک کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور یہ کہ اگر وہ اس مساعی میں ناکام رہا تو پارٹی کے دشمنوں کی طرف دست تعاون بڑھا کر پارٹی کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

اپنی بت سے باہر ہوا جارہا تھا۔ وہ جتوئی صاحب کو دغا دیتے ہوئے ذرا نہ ہچکچایا حالانکہ وہ اس کے وفادار دوست تھے۔ انھوں نے سالہا سال اس کا ساتھ دیا تھا۔ عدم اعتماد کی تحریک سے ذرا پہلے وہ بک گیا اور اس طرح اس نے جتوئی صاحب کو آئینی ذرائع سے وزیراعظم بننے سے محروم کر دیا۔ اس نے اپنی قلابازی کے جواز میں کہا کہ بے نظیر کو ہٹانے کی تحریک جمہوریت کے خلاف ووٹ ڈالنے کے مترادف تھی۔ جب وہ اسمبلی ٹوٹنے اور اپنی قائد کی وزیراعظم کے عہدے سے برطرفی کے بعد جتوئی صاحب کے ماتحت نگران حکومت کے وزیر کے طور پر کھڑا حلف اٹھا رہا تھا تو میں حیران ہو کر خود سے پوچھنے لگی۔ "جمہوریت آخر کہاں گئی؟"

مجھ سے اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ میں اتنی آسانی سے بیوقوف کیوں بنتی رہی؟ اس کی دروغ گوئیوں، بے وفائیوں اور تشدد کے باوجود مصطفیٰ پر میرا یقین متزلزل کیوں نہ ہوا؟ مصطفیٰ کے جال میں پھنسنے والی صرف میں ہی نہیں ہوں۔ اسے دوسروں کو قائل کرنا کل بھی آتا تھا، آج بھی آتا ہے اس نے بھٹو صاحب، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، جنرل ضیاء، بے نظیر بھٹو، غلام مصطفیٰ جتوئی اور غلام اسحاق خاں کو قائل کر کے چھوڑا۔ یہ کل ملا کے پانچ وزرائے اعظم اور دو صدر ہوئے۔ حکومتوں اور ملکوں کے ان سربراہوں کے علاوہ مصطفیٰ ان لوگوں کو بھی اپنا وفادار بنائے رکھنے میں کامیاب رہا جنھوں نے برسہا برس تعذیبی کیمپوں اور قید خانوں میں گزارے۔ اس کی باتیں عوام کے ایک بہت بڑے حصے کو قابل اعتبار معلوم ہوتی رہیں۔ گو وہ بڑی ڈھٹائی سے دائیں بائیں ہوتا رہا ہے لیکن عوام نے اس کے بارے میں گرم جوشی ظاہر کی ہے۔ میں تو آخر اس کی بیوی تھی۔

اس بیہودہ الجھیڑے سے اڑنے والی گرد ابھی بیٹھی نہ تھی کہ مصطفیٰ نے ایک اور شادی کر لی۔ یہ حرکت سوچ سمجھ کر کی گئی تھی تاکہ اپنے اوپر لگنے والے الزاموں اور تہمتوں کا رخ موڑا جاسکے۔ دیدہ دلیری دیکھیے کہ اپنی بہت سی شادیوں کے جواز میں کہا کہ رسولؐ اللہ نے بھی بہت سی شادیاں کی تھیں۔ اس کی نئی بیوی بائیس برس کی تھی۔

اس کی شادی سے ذرا پہلے ہم نے بچوں کے مستقبل پر بات چیت کرنے کے لیے ملاقات کی۔ اس نے پیشکش کی کہ کہو تو بے نظیر سے بات کر کے تمہیں کوئی کام دے کر باہر کے کسی ملک بھجوا دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں نے امید ظاہر کی کہ یہ اس کی آخری شادی ثابت ہوگی۔ کہنے لگا۔ "جس لڑکی سے شادی کر رہا ہوں اس میں مجھ سے پیار کرنے کی جتنی صلاحیت ہے تم میں کبھی نہ تھی۔" میں اس کی سطحیت پر ششدر رہ گئی۔ میں نے اس شخص سے محبت کی تھی، یہ پروا کیے بغیر کہ وہ میرے ساتھ

Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint

کیا کرتا رہا ہے۔ میں نے اس شخص سے محبت کی تھی، یہ خیال کیے بغیر کہ وہ اصل میں کیا ہے۔ ہم نے ابتلا کے پندرہ سال ساتھ گزارے تھے۔ اس بیچاری معصوم لڑکی کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مصطفیٰ ہے کیا بلا۔ اسے مصطفیٰ کے بارے میں وہی کچھ پتہ تھا جو مصطفیٰ نے خود بتا دیا تھا۔ ان کی صرف ایک مہینے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اس دن میں نے دو فیصلے کیے۔ میں نے اسے بتایا۔ "اب میں تمہارے بارے میں کوئی بیان جاری نہیں کروں گی۔" وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ "میری شادی کے بارے میں بھی کچھ نہ کہو گی؟" میں نے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔"

دوسرا فیصلہ اس دن میں نے یہ کیا کہ یہ کتاب لکھوں گی۔ میں نے طے کیا کہ اپنی زندگی کے ان پندرہ برسوں کو رائیگاں نہ جانے دوں گی۔ میں نے اپنی زندگی میں اوروں کو شریک کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ شاید ہمارے لوگوں کو ہماری سیاست سے، ہماری قیادت سے، قائدین کی اقدار، ذہنیت، ان کے اسلامی اصولوں اور عورتوں کے بارے میں ان کے خیالات سے آگاہی حاصل ہو جائے۔ میں نے سوچا کہ اس ریاکاری کو پہلا پتھر میں ماروں گی جو ہمارے خاموش رہنے کی وجہ سے بیماری کی طرح ہمیں چمٹ گئی ہے۔

میں بیٹھ گئی۔ میں نے لکھنا شروع کر دیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
Scanned By Waqar Azeem Paksitanipoint